جلد :- ۳۲
شمارہ :- ۱

زندگی رامپور

(مدیر:- سید احمد قادری)

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور ۔ یوپی
● زر سالانہ — پانچ روپے ۔ ششماہی :- تین روپے — فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے
● ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمارے پاس بھیج دیں
منیجر ہفت روزہ شہاب ۱۱/c شاہ عالم مارکیٹ لاہور

[illegible] اسلامی ہند ۔ ایڈیٹر ۔ سید احمد عروج قادری ۔ پرنٹر پبلشر ۔ ساجد حسن ۔ مطبع ۔ دلی پرنٹنگ ورکس [illegible]
دفتر اشاعت :- ماہنامہ "زندگی" رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

یہ کام امت مسلمہ کا تھا کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق سے مستفید ہونے کے مواقع مہیا کرتی اس لیے کہ اسی کے پاس اس دین کی امانت محفوظ ہے جس نے انسان کے بنیادی حقوق کا بے مثل احترام سکھایا ہے اور یہ امت مبعوث ہی اس لیے کی گئی ہے کہ حق و عدل کی علمبردار بن کر ظلم و جور کا استیصال کرے، لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ یہ امت بحیثیت مجموعی خود ہی اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہو گئی ہے اور اس صورت حال کا بہت ہی دردناک و عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ اس امت کے سربراہ طبقے میں ایسے لوگ بھی پائے جارہے ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ اسلام نے انسان کے بنیادی حقوق کے بارے میں ہدایات دی ہیں یا نہیں، ان کے خیال میں انسان کو بنیادی حقوق، یورپ و امریکہ اور اقوام متحدہ نے عطا فرمائے ہیں۔ ناطقہ سربہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

۱۰ دسمبر کو "یوم حقوق انسانی" منانے کی خبر پڑھ کر، دماغ میں خیالات کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تصور سیکڑوں سال پیچھے خلفائے راشدین کے عہد سعادت میں جا پہنچا۔ عہد رسالت اپنی تمام درخشانیوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آگیا۔ بنیادی حقوق سے متعلق قرآن کی آیتیں جگمگانے لگیں، فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے خطبات نبوی کانوں میں رس گھولنے لگے اور قریش کے پہلو بہ پہلو، بلال حبشی، صہیب رومی اور سلمان فارسی جلوہ فگن نظر آئے۔ کتنا سکون پرور اور کس قدر حوصلہ افزا ہے یہ تصور، یہ شاعری نہیں حقیقت ہے۔ اگر کہیں ہم سے یہ تصور بھی چھن جاتا تو بحیثیت امت، ہمارا نام و نشان مٹ گیا ہوتا۔ یہی وہ تصور ہے جو ہمیں اس عہد کو واپس لانے کی جد و جہد میں سرگرم رکھتا ہے۔ یہ وہ یاد ہے جس سے ہماری رگوں میں حرکت و عمل کی برقی رو دوڑتا ہے۔ جو کچھ حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کرکے

تشریف لے گئے اور جو کچھ خلفائے راشدین آخری لمحۂ حیات تک کرتے رہے وہی کچھ ہمیں کرنا ہے کل ڈیوٹی پر وہ تھے اور آج ڈیوٹی پر ہم ہیں، ہمارا مالک حی و قیوم ہے جس نے ہمارے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی ہے اور ہر آن وہ دیکھ رہا ہے کہ ڈیوٹی پر متعین کیے ہوئے لوگ کیا کر رہے ہیں اور کس طرح کر رہے ہیں۔

میں نے اخبار میں پڑھا:۔

حکومت ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ "منشور حقوق انسانی" کے اعلان کی پندرھویں سالگرہ کے موقع پر ۱۰ دسمبر کو ملک بھر میں "یوم حقوق انسانی" منایا جائے ـــــ اس روز ایک مخصوص ڈاک کا ٹکٹ جاری کیا جائے گا اور ریڈیو سے ایک خاص پروگرام نشر کیا جائے گا۔

پندرہ برس ہوئے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو متحدہ اقوام کی جنرل اسمبلی نے اعلان حقوق انسانی کی توثیق کی تھی اور دو برس بعد جنرل اسمبلی نے تمام ممالک اور اداروں کو دعوت دی تھی کہ وہ ہر سال ۱۰ دسمبر کو یوم حقوق انسانی منائیں۔ اس سال سے ہر برس ۱۰ دسمبر کو تمام دنیا میں یوم حقوق انسانی منایا جاتا ہے۔"

گویا "منشور حقوق انسانی" کی توثیق پر ابھی کل پندرہ سال گزرے ہیں آئیے یہ دیکھ لیجیے کہ خود امریکہ کی نگرانی میں جس منشور کی متحدہ اقوام نے توثیق کی ہے اس کی تاریخ کیا ہے۔

"دنیائے مغرب میں بنیادی حقوق کے شعور و ارتقاء کی تاریخ کا طول و عرض ـــــ بتمام و کمال یہ ہے:۔

(۱) کنگ جان نے ۱۲۱۵ء میں اپنے امراء (BARONS) کے دباؤ پر میگنا کارٹا جاری کیا جس کی حیثیت بادشاہ اور امراء کے درمیان ایک قرارداد کی سی تھی اور زیادہ تر امراء ہی کے مفاد میں اسے مرتب کیا گیا تھا۔

(۲) ٹامس پین کے پمفلٹ حقوق انسانی (RIGHTS OF MAN) کے ذریعہ مغربی ممالک میں انسانی حقوق کے تصور کی عام اشاعت ہوئی (۱۷۹۱ء)

(۳) انقلاب فرانس کے "منشور حقوق انسانی" (DECLARATION OF THE RIGHTS OF MAN)

میں ۱۷۸۹ء ۔ ۱۷۹۱ء قوم کی حاکمیت، آزادی، مساوات، اور ملکیت کے فطری حقوق کا اثبات کیا گیا۔

(۴) امریکہ کی دس ترامیم میں بڑی حد تک وہ تمام حقوق گنوائے گئے جو برطانوی فلسفۂ جمہوریت پر مشتمل تھے۔

(۵) بگوٹا کانفرنس میں امریکی ریاستوں نے انسانی حقوق و فرائض کا ایک اہم منشور منظور کیا (۱۹۴۸ء)

(۶) ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ء تک اقوام متحدہ نے انسانوں کی "نسل کشی کے انسداد" سے لیکر "انسانی حقوق کے احترام" کے لیے مختلف قراردادیں پاس کیں۔ (ایشیا لاہور، ۸ دسمبر ۱۹۶۳ء)

یہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یورپ میں انسانی حقوق کے شعور کی ابتدا زیادہ سے زیادہ ۱۷۵ سال پہلے ہوئی تھی اور "منشور حقوق انسانی" کی عالمی توثیق پر تو ابھی صرف پندرہ سال گزرے ہیں۔ اس بحث کو چھوڑیے کہ یہ ابتدائی شعور بھی کس طرح پیدا ہوا اور کہاں سے آیا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے اعلان کا عملی ظہور کہاں کہاں ہوا اور کس درجے میں ہوا۔ اقوام متحدہ کے ماتحت مختلف کمیٹیاں اور ادارے دنیا بھر میں معلوم نہیں کن کن چیزوں کے جائزے اعداد و شمار کے ساتھ لیتے رہتے ہیں، کیا اس کی کسی کمیٹی یا ادارے نے اعداد و شمار کی زبان میں یہ جائزہ لیا ہے کہ "منشور حقوق انسانی" پر کہاں عمل ہو رہا ہے اور کہاں نہیں ہو رہا ہے۔ ہو رہا ہے تو کس درجے میں اور نہیں ہو رہا ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ وہ جائزہ لے تو اسے معلوم ہوگا اور کہنا چاہیے کہ جائزہ لیے بغیر ہی اسے معلوم ہے کہ یہ منشور صرف کاغذی پھول کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر سال ۱۰ دسمبر کو اس کاغذی پھول کی دنیا میں نمائش ہوتی ہے اور پھر سال بھر کے لیے اسے اقوام متحدہ کی آہنی الماری میں بند کر دیا جاتا ہے۔

عملی تاثیر کا حال یہ ہے کہ اس سالانہ نمائش سے صرف ۱۷-۱۸ دن پہلے مسٹر کینیڈی کو اس لیے گولی مار دی گئی کہ وہ کالی چمڑی کو گوری چمڑی کے برابر درجہ دینے پر مصر کیوں تھے۔ گولی مارنے والے کا خیال یہ ہوگا کہ اقوام متحدہ نے منشور پاس کر لیا، اس کی توثیق کر دی، اس کی سالانہ نمائش کر لیتی ہے۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن عملاً اسے بروئے کار لانے کی "حماقت" برداشت نہیں کی جا سکتی، ایسے "احمقوں" کا گولی کے سوا کوئی علاج نہیں، چنانچہ امریکہ والوں نے خود اپنے ملک کے ایک بہترین فرد کو اس جرم میں گولی سے اڑا دیا اور آج جنوبی امریکہ کی ریاستیں امتیاز رنگ و نسل کی لعنت کے لیے علامت (سمبل) بنی ہوئی ہیں اور شمالی امریکہ پر بھی اس لعنت کے اثرات نمایاں گہرے ہیں۔ جی چاہے تو جنوبی افریقہ کو بھی سامنے رکھ لیجیے۔

اس موقع پر صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنے پیغام میں کہا:۔

آج سے پندرہ سال قبل، اس دن اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کے عالمی منشور کا اعلان اور اسے منظور کیا تھا۔ آزادی، وقار، مساوات اور انصاف کے اپنے پیدائشی حقوق کو تسلیم کرانے کے لیے، انسان کی جدوجہد کی تاریخ میں یہ ایک سنگ میل تھا........ درحقیقت یہ منشور تمام ملکوں پر زبان، جنس، نسل یا مذہب کے امتیاز کے بغیر لوگوں کے لیے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کی ادائیگی اور تعظیم کے احساس کو صدق دلی سے بڑھانے کا مقدس فرض عائد کرتا ہے۔

انھوں نے اس مقدس فرض کی ادائیگی میں ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:۔

"دنیا میں بہت سے ایسے علاقے بھی ہیں جہاں کے حکمراں طاقت کے اندھا دھند استعمال کے ذریعہ ان بنیادی حقوق کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جنھوں نے اپنی سرکاری پالیسی کے طور پر رنگ یا نسل کی بنیاد پر امتیاز کا اعلان کر دیا ہے۔ عالمی سماج نے بجا طور پر ایسی پالیسیوں اور ایسے معمولات کی مذمت کی ہے اور ہم سب کو امید ہے کہ انسانی حقوق کا عالمی منشور تمام قوموں کے لیے ایک مشترک معیار بن جائے گا۔"

لیکن ہم دنیا کے ان خوش نصیب علاقوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں کے حکمراں اس منشور پر واقعی عمل کر رہے ہیں اور اسے فراموش کیے ہوئے نہیں ہیں۔ کیا اپنے ملکی دستور میں انسان کے بنیادی حقوق کو صرف درج کر دینا ان کو یاد رکھنے کے مترادف ہے؟ اور کیا وہ علاقے جنھوں نے اپنی سرکاری پالیسی کے طور پر رنگ یا نسل کی بنیاد پر امتیاز کا اعلان کر دیا ہے صرف اس لیے قابل مذمت ہیں کہ انھوں نے منافقت کا لبادہ اتار کر اپنی سرکاری پالیسیوں میں وہی کچھ درج کر دیا ہے جو ان کے دلوں میں ہے اور جس پر وہ عمل کر رہے ہیں۔

صدر جمہوریہ ہندستان کا ذکر خیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"ہندستان کا آئین بنانے والوں نے بھی یہ مسئلہ بطور ایک جزو ایمان کے حل کیا ہے۔ ہمارے آئین میں بنیادی حقوق پر ایک باب بھی شامل ہے۔ تمام ہندستانی باشندوں کو بلا امتیاز ان حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔"

بلاشبہ یہ بات صحیح ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا واقعی آئین کے اس باب پر عمل بھی ہو رہا ہے

صرف زبان کے مسئلے کو لے لیجیے تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اردو کے حق میں لاکھوں دستخطوں کا ایک بھاری طومار اب بھی شاید کہیں صدر جمہوریہ کے آس پاس ہی پڑا ہوا ہو جس کا کوئی باضابطہ جواب بھی آج تک نہیں مل سکا ہے۔

ان سطور کی تحریر کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اقوام متحدہ کے اعلان منشور حقوق انسانی کو بے کار ثابت کیا جائے یا اس کی تنقیص کی جائے کیونکہ اچھی بات بذات خود اچھی ہوتی ہے، کوئی اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔ بلکہ میرا مقصد ان تمام قوموں کو جنھوں نے یہ منشور پاس کیا ہے یا اس کی تائید کی ہے اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ جب تک وہ اس کا احترام اور اس پر مخلصانہ عمل نہ کریں، ان کا خلوص مشکوک رہے گا۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاقی بات ہے کہ ۱۰ دسمبر کو "یوم حقوق انسانی" منایا جانے والا تھا اور ۸ دسمبر کو سابق مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر کے۔ ایل۔ شریمالی نے وکرم یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کو خطاب کرتے ہوئے کچھ ایسے حقائق کا اعلان کیا جن کا حقوق انسانی کے منشور اور بھارت کے آئین پر عمل سے گہرا تعلق ہے۔ مثلاً انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

"یہ لوگ (بھارت کے سربراہ کار اور رہنما) ذات پات اور فرقہ پرستی کی مذمت تو کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی جہاں اپنا مطلب سامنے آجاتا ہے تو اس کے لیے انھیں کو استعمال کرتے ہیں"

قومی آواز ۹ دسمبر ۱۹۶۳ء

یہ بیان نہ کانگرس کے کسی مخالف کا ہے اور نہ کسی ایسے شخص کا جو "اندرون خانہ" سے ناواقف ہو بلکہ اس شخص کا ہے جو ابھی چند دنوں پہلے مرکزی حکومت کے ایک اہم منصب پر فائز تھا۔ یہ بیان ان رہنماؤں کے خلوص پر ایک زبردست ضرب لگاتا ہے جو نہ صرف منشور حقوق انسانی کے مؤید ہیں بلکہ آئینِ ہند کے مصنف بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے خطاب میں یہ بھی کہا :-

"ملک کے آلام و مصائب مثلاً بدعنوانی، دھڑے بندی، حرص طاقت وغیرہ کی جڑ اس لیے کی وجہ سے ہے کہ سیاست، اخلاق سے بے تعلق ہو گئی ہے۔ سیاست داں طاقت کی بھوک کے ہاتھوں اخلاقی اقدار کے معاملے میں بے حس ہو کے رہ گئے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان رہنماؤں کو

اس تخلیقی کام میں لگنا چاہیے تھا کہ عوام سے بہتر سے بہتر کام لیں لیکن وہ اس کے بجائے عوام کے
سامنے اکثر پست مقاصد رکھ دیتے ہیں تاکہ اس سے خود ان کے معمولی معمولی مقاصد پورے ہو جائیں۔
دین و مذہب چونکہ ان دنوں بہت مطعون ہے اس لیے ڈاکٹر شریانی نے اس کے بجائے اخلاق کا لفظ
استعمال کیا ہے ورنہ حقیقت کے لحاظ سے بات انھوں نے وہی کہی ہے جو اقبال نے کہی تھی۔

ع جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اور یہی بات جب جماعت اسلامی کہتی ہے تو اسے تخریبی اور جنونی جماعت قرار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر
شریانی کے اس بیان میں انقلاب قیادت کی ضرورت کا احساس بھی موجود ہے اور اس حقیقت کا اعتراف
بھی کہ جب تک سیاست کو بلند مقاصد اور اخلاقی اقدار کے ساتھ ہم رشتہ نہ کیا جائے بدعنوانیاں ختم نہیں
ہو سکتیں، انھوں نے یہ بھی کہا کہ :-

"ملک میں موجودہ معاشرتی بے چینی نتیجہ ہے بے یقینی کا اور اس میں قصور عوام کا نہیں بلکہ ان
رہنماؤں کا ہے جنہوں نے انہیں دھوکا دیا ہے۔"

اس بات سے بحث نہ کیجیے کہ ان کا اشارہ کن رہنماؤں کی طرف ہے، نہ اسے چھیڑیے کہ کل تک خود
موصوف جب منصب وزارت پر فائز تھے تو ان کا حال کیا تھا اور نہ یہ سوال کیجیے کہ خود آپ بھی تو بھارت
کے ایک نیتا ہی ہیں، بلکہ صرف یہ دیکھیے کہ جو باتیں انھوں نے کہی ہیں وہ صحیح ہیں یا نہیں۔ اکثر یہی ہوتا ہے
اور ہوتا رہا ہے کہ جب انسان پر چوٹ پڑتی ہے تو وہ اپنے دل میں چھپی ہوئی حقیقتیں اگل دیتا ہے۔ کل تک
ڈاکٹر شریانی اس طرح کی باتیں کہنے والے کو گردن زدنی قرار دے رہے تھے اور آج خود خلوت میں نہیں،
مجمع عام میں ان کا اعلان کر رہے ہیں، ان کا یہ بیان موجودہ قیادت و سیاست دونوں ہی پر عدم اعتماد کا ووٹ ہے

یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ تقریباً چودہ سو برس پہلے عرب کا ملک نہ صرف امتیاز رنگ و
نسل کی لعنت میں گرفتار تھا بلکہ وہاں احترام جان و مال کا بنیادی انسانی حق بھی ہر طرف پامال تھا۔ اس کے ساتھ
ہی ساتھ یہ بھی ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ نہ صرف امتیاز رنگ و نسل کی
لعنت سے نجات پا گیا بلکہ خوں ریزی و غارت گری کو کھیل سمجھنے والے عربوں میں ایک دوسرے کے جان و مال
کا ... احترام ... سوچنے کی بات نہیں ہے کہ اس ملک میں یہ انقلاب کس طرح آیا اور وہ ...

اسباب کیا تھے، وہ کیا ہدایات تھیں جنھوں نے تمام باشندگان ملک کو بنیادی انسانی حقوق عطا کیے اور ہر طرف عدل و انصاف اور امن و امان کی بہار آگئی۔ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جو بحیثیت مجموعی پوری انسانی تاریخ میں بے مثل تھا۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں آج جو مسلمان موجود ہیں وہ اخلاق و کردار کی جس پستی میں بھی ہوں کم سے کم امتیاز رنگ و نسل کی اس لعنت میں گرفتار نہیں ہیں جس میں دوسری قومیں گرفتار ہیں ـــ اس کی وجہ نہ اتنی باریک ہے کہ اسے خوردبین سے دیکھنے کی ضرورت ہو اور نہ اتنی گم شدہ ہے کہ اس کی تلاش کے لیے موجودہ فن ریسرچ کے سراغ رسانوں کو مدد کے لیے پکارنا پڑے۔

اسلامی معاشرے کی اس خوبی کا صاف اور واضح سبب یہ ہے کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کے دلوں میں چار حقیقتیں پوری طرح اتار دی ہیں۔ پہلی یہ کہ اللہ تمام انسانوں کا خالق و معبود بھی ہے اور ان کا بادشاہ بھی، وہی مالک ہے اور تمام انسان اس کی رعیت ہیں ـــ دوسری یہ کہ دنیا کی تمام انسانی نسلیں آگے بڑھ کر صرف دو انسان ـ آدم و حوا میں مل جاتی ہیں۔ دنیا میں جو انسان بھی پایا جاتا ہے وہ آدم کی اولاد ہے اس لیے نسل و نسب کا گھمنڈ اور اس کی بنا پر کسی انسان کو اس کے بنیادی انسانی حقوق سے محروم کرنا انتہائی احمقانہ اور ظالمانہ فعل ہے ـــ تیسری یہ کہ اللہ کے نزدیک انسان کی قدر و قیمت کا معیار اس کا رنگ اور نسل نہیں ہے بلکہ اس کا ایمان و عمل ہے۔ جو انسان جس قدر خدا کا فرماں بردار ہوگا اسی قدر وہ مکرم و محترم ہوگا اور جس قدر خدا کا نافرمان ہوگا اسی قدر وہ ذلیل و حقیر ہوگا ـــ چوتھی یہ کہ زندگی کا معاملہ صرف اسی دنیا میں ختم نہ ہوگا، بلکہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا اور اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی آکر رہے گی جس میں اپنی پہلی زندگی کا حساب دینا ہوگا اور وہ دوسری زندگی ابدی زندگی ہوگی اس لیے انسان کا مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ اس آنے والی زندگی میں عزت کا مقام حاصل کرے۔

یہ ہیں وہ حقیقتیں جو کسی انسان کو دوسرے انسانوں کے بنیادی حقوق کے احترام پر آمادہ کرتی ہیں ـــ اگر یہ حقیقتیں خلوص کے ساتھ تسلیم نہ کی جائیں تو پھر حقوق انسانی کا کوئی منشور، دنیا کے حکمراں طبقوں کو عملاً اس بات پر برضا و رغبت آمادہ نہیں کر سکتا کہ وہ دوسرے پس ماندہ اور مغلوب و مقہور انسانوں کو ان کے بنیادی انسانی حقوق عطا کریں ـ نسل پرستی، قوم پرستی، استحصال اور ظلم و جور کا یہ چکر اسی طرح چلتا رہے گا تا آنکہ دنیا کے انسان ان حقیقتوں کو عقیدۃً و عملاً تسلیم کرلیں۔

اسلامی اخلاقیات کی دینی بنیادیں

قسط (۲)

(جناب عبدالحق انصاری ایم۔اے)

رسالت تیسرے معنی میں خدا کی حکومت تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس کی بھیجی ہوئی ہدایت کی اطاعت کرے۔ اسلام کا نظریہ ہے کہ حاکم حقیقی اپنے مرضیات سے لوگوں کو واقف کرنے کے لیے ہر قوم اور ہر دور میں انسانوں ہی میں سے برگزیدہ افراد بھیجے ہیں، لوگوں کو اللہ کی مرضی معلوم کرنے کے لیے ان کے علاوہ کوئی دوسرا معتبر ذریعہ نہیں ہے۔ وحیِ الٰہی ہی واحد اور تنہا ذریعہ ہے جس سے ہمیں اپنے خالق و مالک اور بادشاہ وحاکم کے احکامات، ہدایات اور مرضیات یقینی طور پر معلوم ہوتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلۂ رسل کی ایک آخری کڑی ہیں اور آپ پر اللہ تعالیٰ نے جو وحی فرمائی ہے، وہ قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے احکامات و مرضیات کا ایک مجموعہ ہے۔ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولوں میں سے ایک رسول ہی نہیں قرار دیتا، بلکہ آخری رسول کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور آپ پر نازل شدہ کتاب کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کا آخری مجموعہ بتاتا ہے۔ ختم نبوت کا یہ عقیدہ اسلامی اخلاق کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس عقیدے کا نتیجہ ہے کہ قرآن وسنت نبوی میں جو اخلاقی احکامات ملتے ہیں وہ آخری ہیں۔ ان میں نہ کوئی کمی ہوگی اور نہ کوئی اضافہ۔ ان کی حیثیت اب ایک اٹل غیر متبدل اور ابدی ضابطے کی ہے۔

قرآن مجید میں جو آیات اخلاقیات سے براہِ راست متعلق ہیں یا اخلاقی فکر اور زندگی جن سے متاثر ہوتی ہے انھیں چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پہلی قسم ان آیات کی ہے جن میں مختلف اخلاقی احکامات، اصول اور ضوابط دیے گئے

ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیات:۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ
اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا
يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ
اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ
لَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ
الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا
رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا
فِيْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ
فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝ وَ
اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَ
ابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝
اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ
الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ
كَفُوْرًا ۝ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ
رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ
قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً
اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ
فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ اِنَّ رَبَّكَ
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ
اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۝
وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ

تیرے رب نے فیصلہ کردیا ہے کہ تم
لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر اُس کی۔ والدین کے
ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں
سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں
اف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو۔ بلکہ
ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی و رحم کے
ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ
"اے پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے
رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔
تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے
اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے
درگزر کرنے والا ہے۔ جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی
کے رویہ کی طرف پلٹ آئیں۔ رشتہ دار کو اس کا
حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق، فضول خرچی
نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور
شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ اگر ان (یعنی حاجتمند
رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا
ہو اس بنا پر کہ ابھی تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم
امیدوار ہو تلاش کر رہے ہو تو انھیں نرم جواب دے
دو۔ نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اسے
بالکل کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر
رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ

نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ ۖ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا ۝ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۚ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ۝ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝ كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ۝ ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (۲۳-۳۹)

کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انھیں دیکھ رہا ہے۔ اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی۔ درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔ زنا کے قریب نہ پھٹکو وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔ قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور جو شخص ظلماً قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کا حق عطا کیا ہے پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی۔ مال یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔ عہد کی پابندی کرو بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو۔ یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے۔ کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔ زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ ان احکامات میں سے ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

قرآن مجید کے اخلاقی احکامات و ہدایات کسی ایک جگہ جمع نہیں کر دیے گئے بلکہ مختلف سورتوں

...میں ظاہر ہوئے ہیں۔

(۲) مختلف احکامات کے ساتھ ساتھ قرآن مجید میں ان کی اہمیت، فرضیت یا حرمت، استحباب و کراہت، اباحت یا رخصت کا ذکر بھی ہے۔ بعض افعال یکساں حسن ہیں لیکن ان میں کوئی فرض ہوتا ہے اور کوئی مستحب اور کوئی محض مباح۔ بعض افعال یکساں قبیح ہوتے ہیں لیکن ان میں کوئی حرام ہوتا ہے اور کوئی مکروہ۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض افعال یکساں حرام ہوتے ہیں لیکن ان کی حرمت اور شناعت کے درجات مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح بعض افعال یکساں فرض ہوتے ہیں لیکن ان کی فرضیت کے مراتب میں فرق ہوتا ہے۔ اس طرح کے فروق اور امتیازات کا ذکر قرآن مجید کی بعض آیات میں صراحۃً کر دیا گیا ہے، بعض میں اشارۃً اور بعض آیات سے قیاساً مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات بہت واضح ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی آیات پر غور کیجیے۔

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ۝ (نساء: ۹۳)

وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝ (بقرہ ۲۷۸-۲۷۹)

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کر لو۔ (اور سود چھوڑ دو) تو اصل لینے کے لیے تم حق دار ہو، نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

حرام بہت سی چیزیں ہیں لیکن قتل عمداً اور اکل ربوٰ کی حرمت کی طرح ہر حرام فعل کی حرمت نہیں ہے۔

یا مثلاً فتنہ انگیزی اور قتل دونوں حرام افعال ہیں لیکن ذیل کی آیت میں فتنہ کو قتل سے شدید تر قرار دیا گیا ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ	لوگ پوچھتے ہیں ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟
قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ	کہو، اس میں لڑنا بہت برا ہے۔ مگر راہِ خدا
كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ	سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور
اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ	مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور
الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ	حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ
عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ	کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے اور
مِنَ الْقَتْلِ.... (البقرۃ: ۲۱۷)	فتنہ خوں ریزی سے شدید تر ہے۔

انتقام اور عفو و درگذر دونوں کام جائز ہیں، لیکن عفو انتقام کے مقابلے میں زیادہ محمود اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے۔

اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ	اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر جس
مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ	قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو لیکن اگر تم صبر کرو تو
خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ (النحل: ۱۲۶)	یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔

خیرات و صدقات کے معاملے میں میانہ روی اچھی اور زیادہ قابلِ عمل صورت ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی جن آیات کا ترجمہ اوپر کیا گیا ہے ان میں اس کی تعلیم ملتی ہے لیکن بسا اوقات اپنی ضروریات کو نظر انداز کر کے دوسروں کی ضروریات پوری کر دینا بہتر اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ	اور ترجیح دیتے ہیں اپنے مقابلے میں اوروں کو
كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ	کو اگرچہ ان کو فاقہ ہی کیوں نہ ہو اور جو لوگ اپنی
شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝	طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھے جائیں وہی فلاح پانے
(الحشر: ۹)	والے ہیں۔

قرآن مجید کی طرح احادیث نبویہ میں بھی مختلف اعمال کی شناعت اور مختلف اعمال کی بھلائی اور حسن کے مراتب کا ذکر ہے۔ گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ، رخصت اور عزیمت، واجب اور مستحب وغیرہ

تصورات انھیں فروق پر مبنی ہیں۔ اگرچہ دوسرے اسباب بھی ہیں اور ہوتے ہیں جن کی بنا پر اعمال کی قوت اور قدر اثباتاً یا نفیاً متعین کی جاتی ہے، لیکن یہاں ان کا تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ بات کہنی مقصود ہے کہ قرآن و سنت نہ صرف بعض اعمال کو برا یا بھلا قرار دیتے ہیں بلکہ ان کی برائی اور بھلائی کے درجات کا عمومی اعتبار سے تعین بھی کرتے ہیں۔ دنیا اور آخرت میں ثواب اور عذاب، انعام و تحسین، یا سزا اور ملامت کے مختلف اسباب میں سے ایک اہم سبب افعال کی بھلائی اور برائی کے درجات میں فرق بھی ہے۔ اس لیے جن افعال کے مراتب کا صراحتہ ذکر نہیں آیا ہے ان کے اوپر مرتب ہونے والے ثواب یا عذاب، اجر یا سزا سے (جن کا ذکر آیا ہو) ان کے مراتب اور اہمیت کا استنباط کیا جاسکتا ہے۔

یہ معاملہ نہ صرف اعمال اور افعال ہی تک محدود ہے بلکہ فضائل اور رذائل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ قرآن و سنت انسان کی بعض کیفیات کو نہ صرف تحسین یا حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ ان کے حسن و قبح کے درجات کی طرف بھی بسا اوقات اشارہ کرتے ہیں۔ عادل اور محسن دونوں طرح کے افراد محمود ہیں لیکن محسن عادل کے مقابلے میں محمود تر ہے۔ سارق اور زانی دونوں ہی مذموم اور قابلِ ملامت ہیں لیکن زانی سارق کے مقابلے میں زیادہ ملامت کا مستحق ہے۔

اس فرق کی اتنی وضاحت کرنا بظاہر ایک غیر اہم کام معلوم ہوتا ہے لیکن اس وضاحت کی اہمیت اس لیے ہے کہ مختلف نظام ہائے اخلاق کے فروق و امتیازات کے مطالعہ میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر مغربی دنیا میں اگرچہ اب بھی سارق اور زانی دونوں کو عموماً برا سمجھا جاتا ہے لیکن سارق کو زانی کے مقابلے میں زیادہ برا خیال کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام اقدار میں یہ بات بالکل الٹی ہے۔ کسی ذی نفس کو ایذا پہنچانا برا ہے۔ یہ اصول ہر مذہب میں مسلّم ہے لیکن بدھ مت اور بالخصوص جین مت میں اس اصول کو آخری حد تک پہنچا دیا گیا ہے۔ ایسا یقیناً اسلام اور بعض دوسرے مذاہب میں نہیں ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مختلف نظامہائے اخلاق میں برے اور بھلے افعال اور کیفیات کی فہرست میں اختلاف بہت ہی کم ملے گا لیکن ان افعال اور کیفیات کی بھلائی اور برائی کے مراتب اور ان کے اضافی قدر و قیمت کے بارے میں مقابلۃً بہت زیادہ اختلاف نظر آئے گا۔ اگر

بے انسانی نظام اخلاق یا کسی اور نظام اخلاق کو سمجھنے کے لیے یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا
ل ہے۔

ایک دوسرے اعتبار سے غور کرنے سے یہ مسئلہ اور بھی اہم بن جاتا ہے۔ اقدار کی ذاتی یا
مافی اہمیت کے تعین کرنے میں آخری فیصلہ عقلی دلائل نہیں کرتے بلکہ دوسری مافوق العقلی قوتیں
رتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مسئلہ لیجیے۔ زوج کے انتخاب کے مسئلے میں کس بات کو کتنی اہمیت حاصل
ہے۔ ہونے والے شوہر یا بیوی کو یا ان کے والدین کو اگر انفرادی آزادی اور والدین کی اتھارٹی
مسئلے میں ایک دوسرے کے مخالف ہوں۔ دونوں باتوں کی اہمیت اور قدر و قیمت سے
ید ہی کوئی انکار کرے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے اور دونوں کی اضافی
یت و قدر متعین کرنے کے سلسلے میں مختلف رائیں رکھی جاسکتی ہیں اور رکھی گئی ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے
ہر رائے کی پشت پر کچھ دلائل بھی رہے ہیں لیکن انفرادی آزادی اور والدین کی اتھارٹی کے بارے
اضافی اور ترجیحی فیصلہ بالآخر فوق العقلی بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی انفرادی آزادی کو قدر
سمجھے تو ہم کسی بھی عقلی دلیل سے اسے قائل نہیں کرسکتے اور یہی حال والدین کی اتھارٹی کو ترجیح دینے
کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

مختصر یہ کہ اقدار کے تعین اور ان کی اضافی اہمیت کا مسئلہ خاصا اہم ہے اور اسلام کے ماخذ
ن و سنت میں بہت سی باتیں صراحۃً و اشارۃً مل جاتی ہیں جو اسلامی اخلاق کے تصور قائم کرنے کے
اتنی ہی ضروری ہیں بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہیں جتنی کہ مختلف انفرادی اخلاقی احکامات اور اصول

(۳) قرآن مجید میں تیسری طرح کی آیات جو اسلامی اخلاق کے تصور کے لیے ضروری ہیں وہ ہیں جو
(good) اور اس کے مراتب اور خیر اعلیٰ کی نشان دہی کرتی ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی
وہ کون سے عناصر ہیں اور وہ کون سی کیفیات اور تجربات ہیں جو خیر ہیں۔ وہ بلند ترین زندگی جو مقصود
ہے کیا ہے۔ اس کے کیا عناصر ہیں اور ان عناصر میں کیا تعلق ہے۔ قرآن مجید انسان کی بلند ترین زندگی
ت کی زندگی کو قرار دیتا ہے۔ اس زندگی کا نقشہ جن آیات میں پیش کیا گیا ہے ان میں سے چند یہاں
ج کی جاتی ہیں:۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ — بلاشبہ متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے

عُيُوْنٍ ۝ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝

(حجر:- ۴۸)

اور ان سے کہا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ ان میں سلامتی کے ساتھ بے خوف و خطر ان کے دلوں میں جو تھوڑی بہت کھوٹ کپٹ ہوگی اسے ہم نکال دیں گے وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے انھیں نہ وہاں کسی مشقت سے پالا پڑے گا اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ۝ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ۝ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ۝ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ۝

(یٰسٓ:- ۵۵-۵۸)

بلاشبہ آج کے دن جنت کے لوگ اپنے مشغلوں میں خوش دل ہوں گے وہ اور ان کی بیویاں سایوں میں مسہریوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے ان کے لیے وہاں ہر طرح کے میوے ہوں گے اور جو کچھ مانگیں گے ان کے لیے ہوگا ان کو پروردگار رحیم کی طرف سے سلام فرمایا جائے گا۔

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (یونس: ۱۱)

ان کے منہ سے یہ بات نکلے گی کہ سبحان اللہ اور ان کا باہمی سلام یہ ہوگا سلام ہے۔ اور ان کی آخری بات یہ ہوگی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(التحریم:- ۸)

ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا ہوگا اور وہ یوں دعا کرتے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارے لیے ہمارے اس نور کو مکمل کر دیجیے اور ہماری مغفرت فرما دیجیے آپ ہر شے پر قادر ہیں۔

قرآن وسنت میں اہل جنت کی زندگی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ لذات جسمانی اور روحانی حسن وعلم، صحت وتندرستی، خاندانی مشاغل اور سماجی روابط، تسبیح وحمد اور اللہ کی قربت وخوشنودی سبھی پر حاوی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے خیر کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں یہ سب عناصر داخل ہیں۔ ان مختلف عناصر کی باہمی اہمیت اور قدر وقیمت میں یقیناً تفاوت ہے لیکن اس مسئلے سے یہاں بحث کرنی مقصود نہیں ہے، اس کا موقع پھر آئے گا۔ یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام کے تصور میں یہ ساری چیزیں داخل ہیں۔

ان آیات کے علاوہ قرآن مجید میں ایسی آیات بھی ملتی ہیں جو براہ راست اسلام کے تصور خیر پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مثال کے طور پر۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ (البقرہ: ۱۷۹)	عقل وخرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔

اس آیت میں یہ بات پنہاں ہے کہ زندگی خیر ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (المائدہ: ۹۰-۹۱)	اے ایمان لانے والو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہوگے؟

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عداوت وبغض اور اللہ کی یاد سے غفلت شر ہیں اور محبت اور مودت اور ذکر الٰہی خیر ہیں۔ اسی لیے جو اعمال ان برائیوں سے بچاتے اور ان بھلائیوں کی طرف لے جاتے ہیں وہ صائب ہیں اور ان کے مخالف اعمال غیر صائب۔

(۴) قرآن مجید میں چوتھی قسم کی آیات جو اسلام کے اخلاقی تصورات اور نظریات کی تشکیل کے

مضروری ہیں وہ ہیں جن میں انسانیت کے اکابر اور صالحین کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ اور ان
مختلف اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ جن سے اس اخلاقی زندگی کا آئیڈیل سامنے آجاتا ہے
اسلام کو مطلوب ہے۔ ایسے بزرگ اور مقدس ہستیوں کی فہرست میں انبیاء و رسل کے علاوہ
ملت انبیاء کے حوارین واصحاب، اصحاب کہف، اصحاب الاخدود، لقمان، ذوالقرنین، مریم
بنت عمران اور اہلیہ فرعون شامل ہیں۔

اگرچہ ان صلحائے انسانیت کے تذکرے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسلامی اخلاق کے نمونے
پیش کیے جائیں اور لوگوں کو ان کے اسوے کی اتباع کی ترغیب دی جائے لیکن بعض آیات
میں اس مقصد کی طرف صاف صاف اشارہ فرما بھی دیا گیا ہے۔ مثلاً:۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (الممتحنہ ۴)	ابراہیم اور اس کے ساتھیوں (کی زندگی) میں تمہارے لیے اسوہ حسنہ ہے۔
ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝ (التحریم:۔ ۱۱-۱۲)	اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال بیان کی ہے۔ جب اس نے کہا کہ اے میرے پروردگار میرے واسطے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا دیجیے اور مجھے فرعون اور اس کے کام سے نجات دیجیے اور مجھے ظالم لوگوں کے اندر سے نکال لیجیے۔ اور مریم بنت عمران کی مثال بیان کی جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی، پھر ہم نے اس میں پھونک دی اپنی طرف سے ایک جان۔ اس نے اپنے رب کی باتوں کو اور اس کی کتابوں کو سچا جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی۔

اخلاقی مسائل میں رسول کی اتھارٹی

قرآن مجید کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاقی احکامات کا قاصد
یا مبلغ بنا کر ہی نہیں بھیجا بلکہ آپ کے بارے میں دو چیزیں فرمائیں جو اخلاقی فکر اور عمل دونوں کے لیے

بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

(۱) پہلی بات یہ کہ رسول اللہ صلعم کے اخلاقی ارشادات اور احکامات بھی آپ کے دوسرے احکامات کی طرح واجب الاطاعت ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف قرآن مجید کے اخلاقی احکامات اور اصول ہی اسلامی اخلاق کی تشکیل میں بنیاد ہیں بلکہ رسول اللہ کے فرمودات بھی بنیاد ہیں۔ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ سنت نبوی بھی اسلامی اخلاق کا ماخذ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی فرمودات کے واجب الاطاعت ہونے کے لیے قرآن مجید میں الگ سے آیات نہیں ہیں بلکہ اس کے لیے وہی آیات نقل کی جا سکتی ہیں جو آپ کے دوسرے احکامات کی اطاعت کے لیے سند کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ اس لیے ان آیات کا یہاں دہرانا غیر ضروری ہے۔

(۲) قرآن مجید نے نہ صرف یہ کہ آپ کے اخلاقی احکامات کی پابندی اور التزام کے لیے سند عطا کی ہے بلکہ آپ کی زندگی کو اخلاق کا بلند ترین آئیڈیل بتایا ہے اور اس کی اتباع کو لازم قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی آیات ملاحظہ ہوں:۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم: ۴) — اور بے شک تم (محمد) اخلاق کے اعلیٰ درجے پر ہو۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (الاحزاب: ۲۱) — تمہارے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں اسوۂ حسنہ ہے جو کوئی اللہ اور یوم آخر کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہو۔

انہیں باتوں کو حضورؐ نے خود ان الفاظ میں فرمایا ہے:۔

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ — مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔

اور

اِنَّ خَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ — زندگی کا بہترین طریقہ محمد کا طریقہ ہے۔

ربوبیت اور الوہیت

خدا کی تخلیق، ملکیت، حاکمیت اور اس کے مظہر کے طور پر رسالت کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اب خدا کی صفات کے ایک اور پہلو کی طرف توجہ مبذول کرائی جا رہی ہے جس کا اخلاقی فکر اور عمل سے بہت گہرا تعلق ہے۔ خدا کی صفات کا یہ وہ پہلو ہے جو اس کی رحمت و عنایت، اس کے لطف و کرم، اس کے انعامات و اکرامات، اس کی محبت و شفقت

اس کی خبر گیری اور دیکھ بھال، اس کی پرورش اور کفالت، اس کی تہذیب اور تربیت، اس کی مرکزیت اور کشش، اس کی سبوحیت اور قدوسیت، اس کے کمال و جمال پر حاوی ہے۔ قرآن و سنت میں ان صفات کے لیے مختلف نام آئے ہیں، مگر ربوبیت اور الوہیت کے الفاظ بڑی حد تک ان صفات کو سمیٹ لیتے ہیں۔

خدا کی مالکیت و حاکمیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان بے چون و چرا اس کی اطاعت کرے، اس کے احکامات کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ اس کی بندگی کو ایک فرض تصور کرے، اس کی مرضیات کی تعمیل کے لیے اپنے کو پابند کرے۔ اسی میں اپنی نجات جانے اور اس سے انحراف میں اپنی تباہی سمجھے، نجات کی ہی امید اور عذاب کا ہی خوف اس کی اطاعت کا محرک ہو۔

لیکن ان صفات کا جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے اور جنھیں ربوبیت اور الوہیت کے الفاظ سمیٹ لیتے ہیں تقاضا یہ ہے کہ انسان کے سر کے بجائے اس کا دل اللہ کی اطاعت میں جھک جائے، خوف کے بجائے اللہ کی محبت، اس کے اعمال کی محرک بن جائے۔ اس کے انعامات و عنایات کا احساس قلب کو تشکر و امتنان کے جذبہ سے لبریز کر دے، اس کی محبت اور خبر گیری اس کا عاشق بنا دے، اس کی کفالت و پرورش، اس کی راہ میں سب کچھ نثار کر دینے کے لیے آمادہ کر دے۔ اس کا لطف و کرم ہر قربانی کے لیے تیار کر دے۔ اس کی کشش کی تاثیر ایسی ہو کہ اعضاء و جوارح سے نیک عمل ہی سرزد ہوں، اس کی قدوسیت کے اثر سے برائی سے نفرت اور بھلائی کی رغبت پیدا ہو جائے۔ مختصر یہ کہ خدا کی حاکمیت، مالکیت اور جبروت کے اثر سے جو عمل خارجی تھا وہ داخلی ہو جائے جو اطاعت فرض کے احساس کے تحت کی جا رہی تھی وہ تقاضائے طبیعت بن جائے۔ خوف و اندیشہ، کی جگہ محبت لے لے۔ رضائے الٰہی کی طلب میں خوشی محسوس ہونے لگے اور اس کی نافرمانی میں دل کو اذیت اور بے چینی ہونے لگے۔

ربوبیت اور الوہیت کے تصورات اخلاق کو واقعی بنا دیتے ہیں اور بغیر ان کے گہرے شعور کے اخلاق کے بلند مراحل طے نہیں ہو سکتے۔ ذیل کی آیات میں خدا کی صفات کے انھیں پہلوؤں کو ابھارا گیا ہے اور اخلاقی زندگی پر ان کے مطلوبہ اثرات کی وضاحت کی گئی ہے:۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا	اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو۔ اسی نے دن کو

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝ ذٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَأَنَّى تُؤْفَكُونَ ---- اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ ذٰلِكُمُ اللَّهُ فَتَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ هُوَ الْحَيُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

(المومن: ۶۱-۶۵)

روشن بنایا۔ بے شک اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر بڑا فضل ہے لیکن اکثر انسان شکر نہیں کرتے۔ یہ اللہ ہی ہے تمہارا رب وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں سو تم لوگ کہاں الٹے چلے جا رہے ہو۔ اللہ ہی ہے جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا، آسمان کو چھت بنایا اور تمہاری صورت گری کی سو عمدہ صورت بنائی اور تم کو اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دیں۔ یہ اللہ ہی تمہارا رب ہے بڑا عالی شان ہے اللہ جو سارے جہان کا پروردگار ہے، وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں سو تم عقیدہ خالص کر کے اس کو پکارو تمام خوبیاں اسی اللہ کے لیے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہان کا۔

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

(الانفال: ۲۶)

یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا تم ڈرتے رہتے تھے کہ لوگ کہیں تمہیں مٹا نہ دیں پھر اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا تاکہ تم شکر گزار رہو۔

أَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ (القصص:)

• اور احسان کر جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے۔

ربوبیت اور الوہیت کے تصورات اخلاقی زندگی کو متاثر کرنے کے علاوہ اخلاقی تصورات کو بھی متاثر کرتے ہیں مثال کے طور پر محرک عمل کا ان سے اس طرح متاثر ہوتا ہے کہ صحیح معنوں میں ایک فعل اخلاقی قدر و قیمت کا مستحق اسی وقت ہوتا

ہو جب کہ رضائے الٰہی کے لیے کیا جائے اور اس کے ساتھ دل کی رغبت شامل ہو یہ وہ بات ہے
کی طرف ذیل کی آیات و احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ
حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ
ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا
مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا
(النساء:۔ ۶۵)

(اے محمد!) تمہارے رب کی قسم یہ کبھی
مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات
میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو
کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی
تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ
الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ
وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ
وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ
(حجرات:۔ ۱)

لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت
دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا
اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تم کو نفرت
دے دی۔ ایسے لوگ ہی خدا تعالیٰ کے فضل
اور انعام سے راہ راست پر ہیں۔

حدیث نبوی ہے

اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ
سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ [احمد: جلد ۵ صفحہ ۲۵۲]

جب نیک کام سے تجھے خوشی ہو اور
برے عمل سے تکلیف پہنچے تو تو مومن ہے۔

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَكَرِهَهَا حِيْنَ
يَعْمَلُ وَعَمِلَ حَسَنَةً فَسُرَّ فَهُوَ
مُؤْمِنٌ [مستدرک حاکم کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۴]

جس نے برائی کرتے وقت اسے ناپسند
کیا اور بھلائی کرتے وقت خوشی محسوس کی
وہ مومن ہے۔

محرک کی طرح بعض دوسرے اخلاقی تصورات بھی ربوبیت اور الوہیت کی صفات سے م
ہوتے ہیں مگر ان کی تفصیل یہاں بیان کرنی مقصود نہیں ہے۔

قرآن مجید نے خدا کی بہت سی دوسری صفتیں اور بھی بتائی ہیں جو انسان کی بالخصوص اخلاقی
کی تعمیر میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا علیم و حکیم اور حق پسند ہونا انسانی
عمل کے مقابلہ میں اٹل اور بے خوف کر دیتا ہے اور مستقبل کے سلسلے میں پُر امید بنا دیتا ہے۔

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (احزاب:۔ ۱-۳)

اے نبی اللہ سے ڈرتا رہ اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مان۔ بے شک اللہ علیم اور حکمت والا ہے اور تیرے پروردگار کی طرف سے جو تجھ پر وحی ہوتی ہے اس کی پیروی کر۔ بے شک اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ اور اللہ پر بھروسہ کر۔ اللہ کافی کارساز ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (عنکبوت: ۶۹)

جو لوگ ہماری راہ میں محنت کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستے بتاتے ہیں اور بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مثلاً قدر کا عقیدہ ایک طرف انسان کو فخر و تکبر سے اور دوسری طرف مایوسی اور غم سے بچاتا ہے

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ (الحدید:۔ ۲۲-۲۳)

کوئی آفت نہیں آتی زمین میں اور نہ تمہاری جانوں پر جو لکھی نہ ہو ایک کتاب میں پہلے اس سے کہ پیدا کریں ہم اس کو دنیا میں۔ بے شک یہ اللہ کے لیے آسان ہے۔ تاکہ تم غم نہ کرو اس پر جو ہاتھ نہیں آیا اور نہ شیخی کرو اس پر جو تم کو اس نے دیا۔ اللہ کو پسند نہیں آتا کوئی اترانے والا اور شیخی کرنے والا۔

گناہ کس سے نہیں ہوتا لیکن سچی توبہ کرنے والا اللہ کی مدد اور رحمت سے نوازا جاتا ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (الزمر:۔ ۵۳)

کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے سارے گناہوں کو معاف فرمادے گا۔ وہی وہ بڑا بخشنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

رضائے الٰہی کی طلب اور اس کی ناخوشی سے گریز مسابقت فی الخیرات سکھاتا ہے۔

سابِقُوا اِلٰی مغفرۃٍ مِنْ رَّبِکُمْ
وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ
اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ
رُسُلِہٖ ذٰالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ
مَنْ یَّشَاءُ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ
الْعَظِیْمِ ۝ (الحدید: ۲۰-۲۲)

سبقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور جنت
کی طرف جس کا پھیلاؤ آسمان و زمین کے پھیلاؤ
جیسا ہے جو تیار کی گئی ہے اللہ اور اس کے
رسول پر ایمان رکھنے والوں کے لیے یہ اللہ کا
فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ
بڑے فضل والا ہے۔

خدا کا خوف اور اس کی محبت بے لوث خدمت، ایثار و قربانی اور اخلاص کی اونچی منزلوں تک پہنچاتی ہے۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ
مسکینًا ویتیمًا واسیرًا ۝ اِنَّمَا
نطعمکم لوجہ اللّٰہِ لا نرید منکم
جزاءً ولا شکورًا ۝ اِنَّا نخاف
من ربنا یومًا عبوسًا قمطریرا
(الدھر: ۸-۱۰)

اور وہ لوگ خدا کی محبت سے غریب،
یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم تم کو محض
خدا کی رضا جوئی کے لیے کھانا کھلاتے ہیں نہ
ہم تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ ہم
اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ
دن کا اندیشہ رکھتے ہیں۔

(باقی)

اقامتِ دین

(حضرت شاہ ولی اللہؒ کے افکارِ عالیہ کی تلخیص و توضیح)

(مولانا عبد العلیم اصلاحی)

[...]ن کا تصور

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:- "انسان کی حقیقی سعادت یہ ہے کہ اس
کی قوتِ بہیمیہ (حیوانی قوت اور خواہش) اس کے نفس ناطقہ (روحانی قوت)
[...]ابع ہو جائے، اس کی (مادی) خواہشیں عقل سے مغلوب اور اس کی مطیع بن جائیں"۔

اس سعادت کے حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں:- ایک تو یہ کہ قوتِ بہیمیہ ناپید ہی ہو جائے۔
انسان مؤثر تدبیریں اختیار کرکے اپنی مادی خواہشوں کی آگ بالکل بجھا کر رکھ دے۔ حیوانی رجحانات کو
[...]ڈالے، اور اس دنیا سے نظریں ہٹا کر عالم جبروت کی طرف پوری طرح متوجہ ہو رہے اور ان
[...]کے حصول میں غرق ہو جائے جن کا اس زمان و مکان سے کوئی تعلق نہ ہو، یہاں تک کہ اپنے ہم جنسوں
[...]ملنا جلنا بھی یک لخت ترک کر دے، اس کی طلب ان کی طلب سے بالکل مختلف ہو جائے، اور جن
[...]کا انھیں خوف و اندیشہ ہوا کرتا ہے ان سے کوئی خوف اور اندیشہ رکھنے کا اس کے لیے کوئی
[...]ی باقی نہ رہ جائے۔ مختصر یہ کہ وہ انسانی بستیوں سے نکل کر کوسوں دور چلا جائے ـــــ یہ طریقہ
[...]ہ اشراقیین اور مجذوب صوفیا کا اختیار کیا ہوا طریقہ ہے۔ بلاشبہہ یہ راہ چل کر ان میں سے
[...]زلِ مراد تک پہنچ بھی گئے۔ لیکن ان کی تعداد بہت ہی محدود رہی ہے، ورنہ اکثریت کا حال یہ رہا ہے
[...]ن کی نگاہیں منزل کے انتظار ہی میں رہ گئیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قوت بہیمیہ کو فنا کر ڈالنے کے
[...]اس کی اصلاح کر لی جائے اور اس کی کجی کو دور کر دیا جائے۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کا
[...]ن اصولوں پر قائم کیا ہے کہ زیادہ قریب اور سہل راستے کو اختیار کیا جائے اور کچھ مخصوص افرا[...]
[...]ئے عام افرادِ انسانی کے مصالح ملحوظ رکھے جائیں، اور دنیا و آخرت دونوں کی مصلحتوں کو برقرار

[illegible]

رکھا جائے، اس لیے اس کے فضل وکرم کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ اپنے پیغمبروں کو اصلاً و بالذات اسی دوسرے طریقے کے نافذ کرنے اور اسی کی طرف لوگوں کو بلانے کے لیے مبعوث کرے۔[1]

"اس طریقے کو اختیار کرکے مطلوبہ سعادت جن چیزوں کے ذریعے حاصل ہوا کرتی ہے ان کی تعداد بہت بڑی ہے، لیکن ان کو چار بنیادی اور کلی صفات میں سمیٹا جا سکتا ہے، اور یہی وہ صفات ہیں جن کی دعوت دینے کے لیے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے تھے، اور ہر شریعت دراصل انہی کی تفصیل ہوا کرتی تھی۔ یہ بنیادی صفات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) طہارت۔ جس کا مطلب نجاستوں اور مادی کثافتوں سے اپنے کو پاک کر لینا اور پاک رکھنا ہے۔ جب انسان ان نجاستوں اور کثافتوں کا ازالہ کر لیتا ہے تو اپنے اندر واضح طور پر ایک طرح کا روحانی انبساط اور سرور محسوس کرتا ہے، اور اس کے اندر سے انقباض و تکدر دور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔ الطھور شطر الایمان (طہارت نصف ایمان ہے)۔ "اِنَّ اللّٰہَ نَظِیْفٌ یُحِبُّ النَّظَافَۃَ (اللہ پاک ہے اور پاکی کو پسند کرتا ہے)

(۲) اخبات۔ یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہو رہنا۔ انسان جب ذہنی یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور اس کی صفتوں کا تذکر کرتا ہے تو اس کا اندرون بیدار ہو جاتا ہے، اور اس کے سارے حواس اور اعضاء و جوارح اللہ تعالیٰ کے روبرو جھک پڑتے ہیں۔ "حدیث احسان" میں اسی صفت کا ذکر ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں" الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ وان لم تکن تراہ فانہ یراک" (احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

(۳) سماحت۔ سماحت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل قوت بہیمیہ کے مطالبات کی غلامی سے آزاد ہو رہے۔ سخاوت، عفت، صبر اور تقویٰ کی صفتیں اسی ایک بنیادی صفت کی مختلف شکلیں ہیں۔

(۴) عدالت۔ عدالت سے مراد انسان کے باطن کی ایسی خاص کیفیت یا قوت ہے جس سے وہ اعمال صادر ہوتے رہیں جن کے ذریعے انسان کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کو صالح اور

---
[1] حجۃ اللہ البالغہ، ج اول، ص ۹۲-۹۳

والانہ نظام میسر ہوتا ہے۔ یہ صفت عدالت بھی ایک بڑی جامع صفت ہے۔ جب اس کا تعلق
انسان کی نشست و برخواست سے، اس کے سونے اور جاگنے سے، اس کی چال ڈھال سے، اس
کے تن اور لباس سے اور اسی طرح کے دوسرے انفرادی اور ذاتی نوعیت کے طور طریقوں سے ہوتا
ہے تو اس وقت اسے 'ادب' کہا جاتا ہے، دولت کمانے اور صرف کرنے کے معاملے میں اسے
"کفایت" سے تعبیر کیا جاتا ہے، گھریلو نظم و انصرام کے سلسلے میں اسے "حریت" کا نام دیا جاتا ہے
دوسرے افراد انسانی سے تعلقات کے باب میں اسے "حسن معاشرت" کہا جاتا ہے، اور ملکی نظم و
نسق میں وہ "سیاست" کہلاتی ہے۔[1]

شاہ صاحب کے ان ارشادات سے دین کا جو تصور متعین ہوتا ہے ہر صاحب نظر دیکھ سکتا ہے
کہ وہ پوری طرح متوازن اور ہر پہلو سے جامع و ہمہ گیر ہے۔ ان کی رو سے اخبات اور توجہ الی اللہ
کی صفت انسان کی مطلوبہ سعادت کے حصول کے لیے اگر بنیادی اہمیت رکھتی ہے تو اس کے
پہلو بہ پہلو پوری انسانی زندگی میں —— ذاتی طور طریقوں میں بھی اور گھریلو معاملات میں بھی، معاشی امور
میں بھی اور پھیلے ہوئے معاشرتی تعلقات میں بھی، اجتماعی مسائل میں بھی اور سیاسی میدان میں بھی ——
اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ راہوں پر چلنا بھی، جسے انھوں نے 'عدالت' کے ایک جامع لفظ سے تعبیر کیا ہے،
بجائے خود ایک بنیادی اہمیت کی چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر انسان ایسے حالات میں گھرا ہو
جن میں وہ اس صفت 'عدالت' کو پوری طرح اپنا نہیں سکتا۔ تو وہ اپنی مطلوبہ سعادت کے حصول میں
پوری طرح کامیاب بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اجتماعی اور سیاسی زندگی میں دین کی بتائی اور متعین کی
ہوئی راہوں پر چلنا صرف کچھ مخصوص حالات ہی میں مطلوب نہیں ہے، بلکہ اصلاً مطلوب ہے کیونکہ جن
باتوں پر اس کی حقیقی سعادت کا کامل حصول موقوف ہے۔ انہی میں سے ایک جزیہ 'عدالت' بھی ہے
اور ظاہر ہے کہ موقوف علیہ کی حیثیت یہ نہیں ہوا کرتی کہ اگر سازگار حالات موجود ہوں تب تو اس کی
عملی اہمیت ہو، ورنہ نہیں، اور ایسی شکل میں وہ اس قابل نہیں کہ اس کی کوئی پروا کی جائے، حصول سعادت
کی تکمیل اس کے بغیر ہی ہو جائے گی۔

مصالح شریعت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ، ج اول، ص ۵۳، ۵۴

"ہر وہ مصلحت جس کے حاصل کرنے پر شریعت نے ہمیں ابھارا ہے، نیز ہر وہ مفسدہ جس سے اس نے ہمیں باز رہنے کی تلقین کی ہے، درج ذیل تین اصولی باتوں میں سے کسی ایک سے لازماً اس کا تعلق ہوتا ہے۔

(۱) ان چار بنیادی اور جامع صفات (طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت) کے ذریعہ، جو آخرت میں کام آنے والی ہیں؛ یا ان تمام اچھی خصلتوں کے ذریعہ جو دنیا میں فلاح پہنچانے والی ہیں، نفس کی اصلاح و تہذیب سے ——— یا

(۲) اللہ کے کلمے کی بلندی، احکام دین کی پابجائی اور ان کی اشاعت سے ——— یا

(۳) انسانی معاملات کے انتظام، ان کے اصول کار کی اصلاح، اور رسوم و عادات کی درستی سے[۱]

مصالح شریعت کی یہ وضاحت بھی صاف بتاتی ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک دین و شریعت کے دائرۂ مقاصد سے حیات انسانی کا کوئی گوشہ بھی باہر نہیں رہ گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو چیز دین کے مصالح و مقاصد میں شامل ہو وہ مجبوری کے حالات میں معطل اور متروک تو ہو سکتی ہے، مگر کسی حال میں بھی نامطلوب اور غیر ضروری نہیں ہو سکتی۔

نماز باجماعت اور نماز جمعہ کی حکمتیں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اعلاء کلمۃ الحق اور غلبۂ اسلام کے لیے ضروری تھا کہ خاص و عام، چھوٹے اور بڑے، دیہاتی اور شہری، سارے کے سارے مسلمانوں کے لیے کسی ایسے دینی شعار اور عمل طاعت کی خاطر ایک جگہ اکٹھے ہونے کا ضابطہ مقرر کر دیا جاتا جو دین کا عظیم ترین شعار اور نمایاں ترین عمل ہو۔ یہی ضرورت تھی جس کے پیش نظر جمعہ اور جماعت کو مشروع فرمایا گیا ہے[۲]

زکوٰۃ کے مصالح بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"زکوٰۃ کی دو مصلحتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس سے نفس کی اصلاح ہوتی ہے، دوسری یہ کہ اس سے مملکت کی لازمی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں؛ اور یہ اس طرح کہ ایک طرف تو اس مال زکوٰۃ سے محتاجوں

---

[۱] حجۃ اللہ البالغۃ ج اول ص ۴۳، ۴۴، ۵ اور جلد دوم ص ۶۷، ۹۹

[۲] " ج اول ص ۱۲۹

[…]مکز وروں کو زندگی کا سہارا ملتا ہے' دوسری طرف ملکی نظم و نسق اور اس کی دفاعی ضرورتوں کے [لئ]ے وہ مال و اسباب فراہم ہوتا ہے جس پر اس کی بقا موقوف ہے[1]۔"

اسی طرح حج کے مصالح واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"حج مسلمانوں کی قوت و عظمت کا مظہر ہے' اس سے ان کی اجتماعیت اور اجتماعی شوکت کا [اظہ]ار ہوتا ہے' وہ ان کے لشکروں کا ذریعہ اجتماع بنتا ہے اور ان کی ملی شانِ عظمت کو جلا دیتا ہے۔ حج میں جو مصلحت مدنظر رکھی گئی ہے وہ اعلاء کلمۃ اللہ کی مصلحت ہے[2]۔"

نماز' زکوٰۃ اور حج' دین کے ارکان ہیں' ان ارکان دین میں ان مصالح کا وجود بتا کر شاہ صاحب[نے] یہ حقیقت واضح سے واضح تر کر دی ہے کہ اسلام کا تصور دین کتنا جامع اور کتنا انقلابی قسم کا [ہ]ے' چنانچہ جن امور کو لوگ عام طور سے مذہب اور حرم کی حدود سے باہر اور "دنیوی" امور [قرار] دیتے ہیں' وہ اسلام میں خالص دینی امور ہیں' حتیٰ کہ دین کے ارکان اور اس کی بنیادی عبادا[ت] میں ان کی مصلحتوں کو سمو لیا گیا ہے۔

[بعث]تِ محمدی کا مقصد　حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ضرورت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"دنیا کے حالات تقاضا کر رہے تھے کہ ایک ایسا امام رشد و ہدایت مبعوث کیا جائے جو [ا]ن مختلف قوموں اور ملتوں کے ساتھ وہی معاملہ کرے جو خلیفہ راشد ظالم حکمرانوں کے ساتھ کیا [کرتا] ہے۔ ایسا امامِ رشد و ہدایت' جسے دنیا کی تمام قوموں کو ایک ہی دین پر جمع کرنا تھا اس کے لیے [خاص] طور پر ضروری تھا کہ وہ عام باتوں کے علاوہ حسب ذیل چند خاص اصولی امور پر بھی کاربند ہو۔

(۱) وہ پہلے ایک گروہ کو راہ راست کی طرف بلائے' پھر (جب وہ ایمان لا چکے تو) پوری [طرح] سے اس کی اصلاح و تربیت کر کے اسے اپنا دست و بازو بنائے' اس کے بعد دوسرے [لوگوں] سے جہاد کرے۔ یہی منشا ہے آیت كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ [وَتَنْهَوْ]نَ عَنِ الْمُنْكَرِ کا۔

(۲) اپنے دست و بازو بننے والے اس گروہ کو دین کی جو تعلیم دے اس میں "خلافت عامہ [اسلا]می" کے قیام کی بات بھی سموئی ہوئی ہو۔ اور وہ اپنے ہونے والے خلفاء کو دین کی اقامت

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم صفحہ　[2] ایضاً صفحہ ۵۸

اور اشاعت کی تاکید فرما جائے۔

(۳) اپنے دین کو دوسرے تمام دینوں پر غالب کردے، اور کسی شخص کو اس کے غلبہ و اقتدار سے آزاد نہ رہنے دے[1]:

ایک اور جگہ نبوتِ عامہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جب اللہ تعالیٰ کسی نبی کو مبعوث فرماتا ہے تاکہ وہ اس کے دین کو قائم کرے اور لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے، اور لوگ عدل پر قائم ہو جائیں، تو جو کوئی اس نور کے پھیلانے میں سعی و جہد کرتا ہے اور اس کے لیے لوگوں کے اندر راہ ہموار کرتا ہے وہ رحمت کا مستحق ٹھیرتا ہے، اور جو اس نور کو بجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ ملعون و راندۂ درگاہ قرار پاتا ہے۔"[2]

ایک دوسرے مقام پر خاص نبوت محمدی کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

"جان لو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ساری خلق کی طرف مبعوث تھے تاکہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کردیں، صاحب عزت کی عزت کے ساتھ یا صاحب ذلت کی ذلت کے ساتھ، اس لیے آپ کے دین میں مختلف قسم کے لوگ داخل ہو گئے الخ[3]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"معلوم ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم "خلافتِ عامہ" (اقتدار اسلامی) کے ساتھ مبعوث کیے گئے ہیں اور آپ کے دین کا دوسرے تمام دینوں پر غالب ہونا جہاد اور سروسامان جہاد کے بغیر ممکن نہیں ہے[4]

شاہ صاحب کے ان ارشادات میں یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت اور آپ کا مشن دین حق کی مکمل اقامت تھا، ایسی مکمل اقامت جو دوسرے تمام دینوں کی مغلوبیت اور ان کے ماننے والوں کی سرافگندگی کو لازم ہو۔

یہ حقیقت حضرت شاہ صاحب نے جن آیتوں سے اخذ کی ہے ان میں سے ایک هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ کی آیت ہے۔ اس آیت کے سلسلے میں موصوف اپنی کتاب "ازالۃ الخفاء" میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول ص۱۱۱ ۔ [2] جلد اول ص۵۴، ۵۵ ۔ [3] جلد اول ص۱۲۲
[4] جلد دوم ص۱۶۸

"جب دنیا میں الوہیت کے متعلق غلط تصور اور رجائی عقیدہ پھیل گیا یعنی اعمال کی اہمیت ختم ہوگئی اور انجام بد کا خوف دلوں میں باقی نہ رہ گیا، جو تمام انبیاء کی تعلیمات کے خلاف بات تھی، تو غضب الٰہی جوش میں آیا اور عالمِ ملکوت میں انتقام کا ارادہ پیدا ہوا۔ پھر ایسے لوگوں کو ہلاک کر دیے جانے کا حسبِ قانونِ الٰہی لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ ایک وقت مقرر ہوگیا۔ چنانچہ جب وہ وقت آگیا تو حق تعالیٰ نے نوعِ انسانی کے سب سے افضل فرد، ذات اقدس خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور اپنی وحی آپ پر نازل فرمائی۔ آپ نے انتہائی کوشش کے ساتھ اس ہدایت اور دین الحق کی طرف لوگوں کو بلایا۔ قبول حق کی صلاحیت رکھنے والے اس سعادت سے بہرہ ور ہوئے اور بدبخت ہمیشہ کے لیے ملعون قرار پائے۔ اس بعثت میں ان لوگوں سے انتقام لینے کا ارادہ پوشیدہ تھا جو الوہیت کے متعلق فاسد خیالات رکھتے تھے۔ اس انتقام کے معاملے میں آپ کی اور آپ کے اصحابؓ کی حیثیت "جارحہ" (آلے اور ذریعے) کی قرار پائی، جس طرح کہ حضرت جبریلؑ قوم ثمود کے لیے چیخ والے عذاب کے وقت قدرت کا "جارحہ" بنے تھے۔ اسی بنا پر جو غزوے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہوئے ان میں شرکت کرنے والوں کے لیے وہ غزوے نزولِ برکات کا سبب ہیں، اور ان لڑائیوں میں ایک گھڑی کی شرکت باطن کا تزکیہ کرنے میں صد سالہ عبادت کے برابر ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شریعت میں جہاد کا ثواب تمام عبادتوں کے ثواب سے افضل ہے، اور اہلِ بدر، اہلِ احد اور اہلِ حدیبیہ کی فضیلت ثابت شدہ اور قطعی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اصلاحِ عالم کی اور انتقام اعدائے دین کی ایک خاص شکل اللہ تعالیٰ کے نزدیک طے پائی، جو یہ نہ تھی کہ یہ لوگ زمین میں دھنسا دیے جائیں، یا ان پر آسمان سے پتھر برسا دیے جائیں، یا کسی چیخ سے ہلاک کر دیے جائیں، اس خاص شکل کے تعین کا کیا سبب تھا، اسے اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ بہرحال وہ خاص شکل یہ تھی کہ ادیان باطلہ کے حامیوں اور داعیوں کو قتل اور قید و بند کرکے یا انھیں سرافگندگی کے ساتھ خراج اور جزیہ دینے پر مجبور کرکے، اور اس طرح ان کی شوکت کو پامال و بے حقیقت بنا کر آپ کے دین کو غالب کر دیا جائے۔ یہ خاص شکل آپ کی بعثت کے ساتھ وابستہ تھی اور آپ کی بعثت اس صورتِ خاص کو حاوی تھی۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا کہ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى الخ (وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں

پر غالب کردے) اور یہی مدعا ہے اس حدیث قدسی کا کہ "اے محمد میں نے تم کو اس لیے بھیجا ہے کہ تمہاری آزمائش کروں اور تمہارے ذریعے لوگوں کی آزمائش کروں[1]"

اس موقع پر اگر یہ سوال اٹھ رہا ہو، حالانکہ اسے اٹھنا نہ چاہیے کہ غلبۂ دین سے شاہ صاحب کی مراد کیا ہے؟ تو اس کا جواب خود ان کی اپنی تحریروں میں پوری صراحت سے موجود ملے گا۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"دین اسلام کا دوسرے تمام دینوں پر غلبہ چند باتوں سے متحقق ہوتا ہے۔

(۱) اسلامی شعائر کے اعلان و اظہار کو دوسرے دینوں کے مقابلے میں فوقیت حاصل ہو۔

(۲) دین و ملت کا سربراہ لوگوں کے ہاتھ دوسرے ادیان کے شعائر کا (اسلام کے بالمقابل) اعلان و اظہار کرنے سے روک دے۔

(۳) قصاص، دیت، نکاح اور سربراہی کے مناصب میں وہ اسلام کے منکروں کو مسلمانوں کے برابر نہ رکھے۔

(۴) لوگوں کو اس بات کا سختی سے پابند بنائے کہ دین میں نیکی اور بدی کے متعینہ قالبوں کو (یعنی احکام شریعت کو ان کی متعینہ شکلوں کے ساتھ) لازماً ملحوظ رکھیں اور ان میں سے کسی کو اس خیال یا تاویل کے تحت نظر انداز نہ کر دیں کہ دین کے حقیقی مصالح کے پیش نظر عمل کے اس مخصوص قالب کی کوئی اہمیت نہیں۔

(۵) چونکہ قوت کے ذریعہ حاصل کیے جانے والے غلبۂ دین کے زیر اثر قبول ایمان عموماً باطنی کثافت سے پاک نہیں ہوا کرتا اور اس امر کا امکان موجود رہتا ہے کہ ایسے لوگ کفر کی طرف پھر لوٹ جائیں گے، اس لیے سربراہ ملت کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے برحق اور قابل اتباع دین ہونے اور دوسرے دینوں کے باطل اور ناقابل اتباع ہونے کی حقیقت کو مدلل طور سے واضح کرتے رہنے کا اہتمام رکھے[2]"

ایک اور مقام پر، اور خود اسی آیت پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"جان لینا چاہیے کہ اس آیت کے سلسلے میں صحیح توجیہ یہ ہے کہ دین حق کو جس قدر بھی غلبہ

[1] اقتباس از مقصد طی صفحہ ۹ [2] حجۃ اللہ البالغۃ، جلد اول صفحہ ۱۹۱

حاصل ہوا وہ سب لیظہرہ میں داخل ہے۔ اور وہ سب سے بڑا غلبہ جو کہ کسریٰ اور قیصر کی
حکومتوں کے زیر و زبر کر دیے جانے کی شکل میں ظاہر ہوا' اس لیظہرہ کے اندر بدرجہ اولیٰ داخل ہے
اس تصرف کے حامل خلفائے راشدین تھے' اور ان حضرات کی یہ مساعی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی بعثت کا مقتضا تھیں' اور اس کے عملی پروگرام میں شامل تھیں۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے آیت هُوَ الَّذِیْ
أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ الخ سے یہ سمجھا ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت بعثت اسلام کا کامل
غلبہ تھا اور یہ غلبہ صرف قریش یا بنی اسمٰعیل یا اہل عرب کی مغلوبیت ہی تک محدود نہ تھا بلکہ اس کی حدود
میں قیصر و کسریٰ کی عظیم ترین شہنشاہیتوں کی سرنگوں ساری بھی شامل تھی' جو آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے
کے بعد خلفائے راشدین کے عہد میں ظہور میں آئی۔ اس طرح خود خلافتِ راشدہ گویا بعثتِ محمدی کا تتمہ
تھی۔ بلاشبہ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ عرب و ایران اور روم کی پامالیاں اور سرنگوں ساریاں
عالمِ ملکوت کے ارادے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلۂ انتقام کے تحت ظہور میں آئیں' لیکن اسی کے ساتھ
لازمی طور سے ان کا کہنا یہ بھی تو ہے کہ اس ارادے اور فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کسی مافوق الاسباب
طریقے سے کام نہیں لیا گیا' بلکہ ٹھیک اسی طرح یہ سب کچھ دنیائے عمل کے اندر ظہور میں آیا جس طرح
اس عالمِ اسباب کے اندر دوسرے واقعات ظہور میں آیا کرتے ہیں۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ
کے اصحاب کے ذریعہ ہی اس ملکوتی ارادے اور خداوندی فیصلے کو جامۂ عمل پہنایا گیا' اور دشمنانِ
حق کی ہلاکت یا ان کی محکومی و باج گزاری کا' اور اسلام کے غلبے کا جو واقعہ ظہور میں آیا وہ اسبابِ ظاہری
کے نقطۂ نظر سے قطعی طور پر نبی و اصحابِ نبی کی کوششوں اور قربانیوں ہی کا نتیجہ تھا۔ اس لیے یہ کہنا
کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد اور آپ کی آمد کا مشن دنیا میں اللہ
کے دین کا غلبہ و نفاذ تھا۔ کیونکہ شاہ صاحب کی اس توضیح کے مطابق تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی بعثت اسی ارادۂ الٰہی کو عملی جامہ پہنانے ہی کی خاطر ہوئی تھی' اور آپ اس واقعے کے لیے جارحہ
اور آلہ کی حیثیت میں بھیجے گئے تھے جو غلبۂ اسلام کی شکل میں ظہور میں لایا جانے والا تھا۔ آخر آپ کو
اور آپ کے اصحاب کو اس مقصد کے حصول کے لیے آلہ اور ذریعہ مقرر کیا جانا اس کے سوا اور کیا

---

[1] ازالۃ الخفاء' مقصد اول' ص۹۳

معنی رکھتا ہے کہ یہی بات آپ کی بعثت کی غایت تھی۔ کیونکہ جہاں تک 'ارادے' اور 'آلے' کی بحث کا تعلق ہے وہ صرف اسی ایک معاملے کے ساتھ مخصوص تو نہیں ہے، بلکہ فی الاصل وہ ایک عام اور ہمہ گیر نوعیت رکھتی ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ بھی ظہور میں آتا ہے وہ سب کا سب ارادۂ الٰہی کی بنا پر ہی ظہور میں آتا ہے، اور اس کا مؤثر حقیقی قطعی طور پر اللہ ہی ہوا کرتا ہے، اور وہ شخص جس کی عملی جد وجہد کے نتیجے میں کوئی واقعہ وجود پذیر ہوتا ہے وہ اس کا فاعل حقیقی اور مؤثر واقعی ہرگز نہیں ہوتا بلکہ ارادۂ الٰہی کے لیے صرف 'آلے' کی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن اگر ہم اس فلسفے کو بنیاد بنا کر اس طرح سوچنے لگیں کہ چونکہ انسان اپنے جمیع اعمال میں ارادۂ الٰہی کے صرف 'آلے' کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کسی عمل کے بارے میں بھی اس کو ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا، تو ظاہر ہے کہ یہ ایک سراسر بے عقلی کی بات ہوگی۔ اس کے بخلاف ہر شخص بالبداہتہ محسوس کرتا ہے اور اس امر کا یقین رکھتا ہے کہ جس کسی کے ذریعے یعنی جس کی عملی جد وجہد کے نتیجے میں کوئی فعل یا واقعہ وجود میں آتا ہے وہی اس کا فاعل کہا جاتا اور اس کا ذمہ دار قرار پاتا ہے، اور اس کے بارے میں یہی کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ کام اس شخص کے ارادہ وعمل کا نتیجہ ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کارناموں کے بارے میں فکر وتعبیر کا یہ اصول باقی نہ رہ جائے۔

چنانچہ شاہ صاحب نے قوم ثمود کے معاملے میں حضرت جبریلؑ کی حیثیت کو مثال کے طور پر پیش کر کے اس بات کو خود بھی صاف کر دیا ہے۔ فرمایا ہے کہ فاسد عقائد رکھنے والوں سے انتقام کے معاملے میں اللہ تعالےٰ نے آپ کی حیثیت 'جارحہ' (آلے اور ذریعے) کی قرار دی تھی جس طرح کہ ثمود پر چیخ کا عذاب نازل کرنے میں حضرت جبریلؑ 'جارحہ' کی حیثیت رکھتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ جبریلؑ کے جارحۂ الٰہی ہونے کی واقعاتی شکل یہی تھی کہ انہیں اللہ تعالےٰ نے اس بات پر مامور کیا تھا کہ جا کر اس قوم کو اپنی چیخ کے ذریعہ ہلاک کر دو۔ دوسرے لفظوں میں حضرت جبریلؑ کی یہ ڈیوٹی مقرر کی گئی تھی اور وہ اس 'مشن' پر بھیجے گئے تھے کہ ثمود کو ہلاک کر دیں۔ اس لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا 'جارحۂ الٰہی' ہونا بھی یہی معنی رکھتا ہے کہ آنحضرتؐ کی یہ ڈیوٹی اور آپ کا یہ مشن تھا کہ آپ اہل کفر وضلال کو پامال کر کے یا انہیں باج گزار بنا کر اللہ کے دین کو غالب کر دیں۔

دوسری آیت جس سے حضرت شاہ صاحب نے بعثت نبوی کی یہ غایت سمجھی اور متعین فرمائی ہے، سورۂ شوریٰ کی آیت شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ

وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۔ ہے چنانچہ
یہی وجہ ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ مقصدِ بعثت کے اظہار و بیان کے لیے 'غلبۂ دین' کے علاوہ 'اقامتِ
دین' کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کرتے ہیں، جو واضح طور پر اسی آیت سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ایک جگہ
یہ آیت درج کر کے اس کے منشا کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اصل دین (ہمیشہ) ایک ہی رہا ہے، جس پر تمام انبیاء علیہم السلام متفق رہے ہیں، اختلاف
صرف شرائع اور مناہج میں رہا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سارے انبیاء اس بات پر متفق رہے
ہیں کہ عبادت اللہ واحد ہی کی کرنا چاہیے اور مدد بھی صرف اسی سے مانگنا چاہیے، اسے ہر نقص سے
پاک یقین کرنا اور اس کی صفات میں الحاد کو حرام سمجھنا چاہیے، بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اس
کی پوری پوری تعظیم کریں، اور اس میں ذرہ برابر کوتاہی سے کام نہ لیں، اس کے حضور اپنے چہروں
اور دلوں کو جھکا دیں، اس کے شعائر کے ذریعہ اس کی نزدیکی چاہیں، یہ یقین رکھیں کہ وہ واقعات کو وجود
میں لانے سے پہلے ہی انہیں مقدر کر چکا ہوتا ہے، اس کے فرشتے اس کے تابع فرمان ہیں، کبھی اس کی
نافرمانی نہیں کرتے، وہ اپنی کتاب جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے اور اس کی اطاعت بندوں پر
واجب قرار دے دیتا ہے، قیامت کا آنا، مرنے کے بعد اٹھایا جانا اور جنت و دوزخ سب برحق ہیں
اسی طرح یہ حضرات انبیاء "بِرّ" (خیر و صلاح) کی تمام قسموں — طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج نیز
دعا، ذکر اور تلاوت کتاب جیسی نفل عبادتوں کے ذریعہ اللہ کی قربت کے حصول — پر متفق ہیں۔ پھر اسی
طرح نکاح کی مشروعیت، زنا کی حرمت، لوگوں کے درمیان عدل کے قیام، مظالم کی حرمت، مجرموں پر
حدود اللہ (اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں) کے نفاذ، دشمنانِ خدا کے خلاف جہاد اور اللہ تعالیٰ
کے احکام اور اس کے دین کی اشاعت کی جدوجہد پر بھی ان سب حضرات کا اتفاق رہا ہے —
بس یہ وہ امور ہیں جو اصل دین ہیں۔ چونکہ یہ سب امور ان سب لوگوں کے درمیان مسلّم تھے جو قرآن
کے مخاطب تھے، اس لیے اس نے ان کی لمیت کے بارے میں بہت کم گفتگو کی ہے۔ اختلاف (حضرات
انبیائے کرام کے دینوں میں جو کچھ تھا وہ) ان اصولی امور کی صرف صورتوں اور قالبوں میں تھا۔ مثلاً
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں قبلہ بیت المقدس تھا اور شریعت محمدیہ میں کعبہ ہے، ان کے یہاں
زانی کی سزا صرف رجم تھی، ہمارے یہاں شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہے اور دوسروں کے لیے سو کوڑے

کی مار۔ ان کے یہاں صرف قصاص کا حکم تھا، ہمارے یہاں قصاص اور خوں بہا دونوں مشروع ہیں۔ اسی طرح عبادتوں کے اوقات، ان کے آداب اور ان کے ارکان مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں۔[1]

شاہ صاحب کے ان ارشادات کا مفہوم بالکل واضح ہے، یعنی یہ کہ آپ کے نزدیک آیت مذکورہ بالا (شَرَعَ لَکُم مِّنَ الدِّینِ الخ) میں جس 'الدین' کی اقامت کا حکم ہے وہ اپنی منطقی عملی تفصیل میں دین و شریعت کے پورے مجموعے پر حاوی ہے۔ اور اس کے 'اصل دین' یا تمام انبیاء کا متفقہ دین ہونے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اس کی حدیں صرف ایمانیات اور ایمانی صفات تک، یا ان سے کچھ اور آگے بڑھ کر اخلاق حسنہ اور معروف عبادات تک ہی محدود ہیں، بلکہ 'اصل دین' ہونے کے باوجود اس کی حدود میں "اقامۃ العدل بین الناس" (معاشرے کے اندر عدل و انصاف کا قیام) "تحریم المظالم" (مظالم کی حرمت اور ممنوعیت) "اقامۃ الحدود علی اہل المعاصی" (مجرموں پر حدود اللہ اور شرعی سزاؤں کا اجراء و نفاذ) "الجہاد مع اعداء اللہ" (دشمنان خدا سے جہاد) جیسے احکام و ہدایات بھی شامل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ انتہائی قسم کے اجتماعی اور سیاسی احکام بھی اگر اس 'الدین' میں شامل ہیں جس کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے تو اقامت دین کے اس حکم خداوندی کی تعمیل منطقی طور پر پورے دین کی اقامت کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سوال کا جواب کہ سارے کے سارے اجتماعی اور سیاسی احکام بھی 'اصل دین' نہ ہونے اور تفصیلی احکام ہونے کے باوجود اقامت دین کے اس حکم میں کس طرح شامل ہیں، یہ ہے کہ 'اصل دین' میں جو چیز شامل نہیں ہے وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے نازل ہونے والے اصولی احکام کی صرف وہ تفصیلی شکلیں ہیں جو مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہیں نہ کہ فی نفسہٖ یہ اصولی احکام، کیونکہ مختلف انبیاء کے لائے ہوئے دینوں میں جو اختلاف تھا وہ ان اصولی احکام کی تفصیلی شکلوں ہی میں تھا، ان احکام میں ہرگز نہ تھا۔ مثلاً یہ اختلاف اس بات میں تھا کہ لوگوں کے نزاعی معاملات کا عادلانہ فیصلہ کرنے میں عدالتی ضوابط کیا ہوں؟ فی نفسہٖ فیصلہ اور عادلانہ فیصلہ کیے جانے میں نہ تھا، اس بات میں تھا کہ کس مجرم کو کیا سزا دی جائے؟ فی نفسہٖ مجرم کو سزا دیے جانے کے بارے میں نہ تھا ـــــ ٹھیک اسی طرح جس طرح نماز کے اوقات اور اس کی اشکال، زکوٰۃ کا نصاب اور اس کی شرائط

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول، صفحہ ۸۶

روزے کے ایام اور اس کے اوقات، حج کے مقامات اور اس کے مراسم میں اختلاف رہا ہے، لیکن نفس
نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج کی فرضیت میں کوئی اختلاف نہیں رہا ہے۔ اس لیے جس طرح تمام انبیاء
کے دینوں میں یہ بات مشترک اور متفق علیہ رہی ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے، آخرت پر یقین رکھا جائے
رسول کو تسلیم کیا جائے، نماز پڑھی جائے، زکوٰۃ دی جائے، روزے رکھے جائیں اور حج کیا جائے، اسی
طرح یہ بات بھی مشترک اور متفق علیہ ہی رہی ہے کہ معاشرے میں عدل قائم کیا جائے، چوروں، ڈاکوؤں
زانیوں اور قاتلوں پر حدود اللہ جاری کی جائیں، اعلائے دین سے جہاد کیا جائے، مختصر یہ کہ انسانی
زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کے جو احکام بھی ہوں ان کی پیروی کی جائے۔ اس حقیقت
کے واضح ہو جانے کے بعد ایک معمولی عقل و فہم کے انسان پر بھی یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ پھر عمل کی دنیا
میں اس حقیقت کے معنی کیا نکلیں گے؟ امت جب اس 'اصل دین' اور 'متفقہ دین' کی اقامت کرنا
چاہے گی تو اسے کیا کچھ کرنا ہوگا؟ یقیناً اور لازماً اسے یہی کرنا ہوگا کہ دین کے ایک ایک حکم کی تعمیل کرے،
اصولی اور بنیادی احکام کی بھی اور تفصیلی احکام کی بھی۔ کیونکہ اصولی احکام کی پیروی اس کے بغیر ہو ہی
نہیں سکتی کہ اس کی متعلقہ تفاصیل و اشکال کی پیروی کی جائے، دوسری طرف ان اصولی اور متفقہ احکام
دین کا حال یہ ہے کہ وہ صرف ایمانیات اور اخلاق اور بنیادی عبادات ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ تمدنی
اور سیاسی معاملات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے 'اصل دین' یا دین کے سارے اصولی و متفقہ احکام
کی پیروی و اقامت پورے دین کی اقامت کے ہم معنی ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی یہ بات جو انھوں نے آیت شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ الخ کا مدعا و مقتضا
بیان فرماتے ہوئے کہی ہے، عقل کا صریح تقاضا ہے۔ کیونکہ اگر اسے تسلیم نہ کیا جائے تو اس کا منطقی
نتیجہ نہایت عجیب و غریب اور نامعقول شکل میں ظاہر ہوگا۔ اس کے تسلیم نہ کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ
آج اگر کوئی مسلمان عشاء کی نماز نہیں پڑھتا، نمازوں میں کعبے کی طرف رخ نہیں کرتا، روزے رکھنے
کے لیے رمضان کے تیس دنوں کا تعین نہیں کرتا، حج خانہ کعبہ کا نہیں کرتا، تو بھی وہ اس اقامت دین کا
حق ادا کر دینے والا قرار پا سکتا ہے جس کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے۔ کیونکہ پچھلے انبیاء کے دینوں
میں ان امور کی ہدایات موجود نہ تھیں، اس لیے وہ 'اصل دین' اور 'متفق علیہ دین انبیاء' سے بہر حال
باہر ہیں اور جب 'اصل دین' سے خارج ہیں تو ان کی تعمیل بھی 'أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ' کے حکم میں شامل

نہیں ہو سکتی۔ غور کیجیے بات کہاں پہنچ رہی ہے! اس لیے بھی اس آیت کا کوئی اور مفہوم و مدعا ہرگز نہیں لیا جا سکتا۔ چنانچہ صرف حضرت شاہ صاحب ہی پر کیا موقوف ہے، جس مفسر قرآن کو دیکھیے وہ اپنے الفاظ میں ٹھیک یہی بات کہتا دکھائی دے گا۔ وہ اصل اور متفق علیہ دین کی وضاحت کرتے ہوئے جہاں دوسری بنیادی باتوں کا ذکر کرے گا وہیں "طاعتہ سبحانہ" (اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت) یا "طاعۃ اللہ فی اوامرہ ونواہیہ" (اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی میں اس کی فرماں برداری) کا نام بھی ضرور دے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ سارے ادیان میں جس طرح یہ بات اصولی اور مشترک رہی ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے، آخرت و نبوت پر ایمان لایا جائے، نماز و زکوٰۃ کی ادائیگی کی جائے، وغیرہ، اسی طرح یہ بات بھی اصولی اور مشترک ہی رہی ہے کہ جس نبی اور جس امت کو اللہ تعالیٰ کے جو اوامر و نواہی بھی ملیں وہ ان کی اطاعت کرے۔ جس کی عملی شکل اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ امت اپنے پیغمبر کی معرفت ملنے والی پوری شریعت کی پیروی اور اقامت کرے۔ ورنہ 'طاعۃ اللہ سبحانہ' کا تحقق ہرگز نہ ہو سکے گا۔

موصوف نے اقامتِ دین کے مفہوم کی بھی وضاحت اپنی کتاب "ازالۃ الخفاء" میں ایک اور انداز سے کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب عامۃ الخلائق کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے تو آپ نے ان کے ساتھ ت سے معاملات و تصرفات کیے، اور اس سلسلے میں اپنے نائب مقرر کیے، اور ہر معاملے میں بڑا اہتمام سے م لیا۔ ان سارے امور کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں اور جزئیات (جزئی معاملات و مسائل) سے کلیات صولی امور) کی طرف، پھر ان کلیات سے ایک ایسی کلی کی طرف آتے ہیں جو ساری کلیات کو حاوی اور سب ہا جامع ہو، تو ان سب کی جنس عالی (یعنی ان ساری کلیات پر حاوی ہونے والی اور سب کی جامع کلی) اقامت ین متعین ہوتی ہے، جو ساری کلیات کو محیط ہے، اور اس کے تحت دوسری جنس (یعنی ذیلی امور اصولیہ) ہا... ان میں سے ایک جنس (ذیلی اصولی بات) دینی علوم کی اشاعت ہے"۔ .... دوسری نس ارکان اسلام کی اقامت ہے۔ کیونکہ یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ، بدین اور پنج وقتی نمازوں کی امامت پورے اہتمام سے خود کرتے تھے اور مختلف مقامات میں اس کے لیے ائمہ مقرر فرماتے، زکوٰۃ وصول کرتے اور اس کے مصارف میں اسے خرچ کرتے اور ان کاموں کے

ے عامل مقرر فرماتے۔ اسی طرح ہلال رمضان اور ہلال عید کی رویت پر شہادتیں سنتے اور اس کے بعد روزہ
رکھنے یا نہ رکھنے کا حکم فرماتے۔ علیٰ ہذا القیاس آپؐ نے حج کی اقامت کی (یعنی اپنی امامت میں لوگوں کو
کرایا) اور ۹ھ میں جب آپ مکہ مکرمہ تشریف نہ لے جا سکے تو حضرت ابوبکرؓ کو بھیجا تاکہ وہ حج
رائیں۔ اسی طرح آپؐ کا جہاد کو قائم کرنا، سرداروں کا مقرر کرنا، فوجوں اور فوجی دستوں کا بھیجنا، نزاعات
فیصلے کرنا، بلاد اسلامی میں قاضیوں کا تقرر کرنا، شرعی سزاؤں کا نافذ کرنا، اچھے کاموں کا حکم دینا
ر برے کاموں سے روکنا محتاج بیان نہیں۔ پھر جب آپ نے رفیق اعلیٰ کی طرف انتقال فرمایا تو اس
ت بھی اقامتِ دین اسی تفصیل مذکورہ کے ساتھ واجب رہی[1]۔

شاہ صاحب نے اپنی اس تقریر میں بھی یہ بات بالکل صاف کر دی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ
لم نے اپنی پوری مدت نبوت میں جو کچھ کیا، تبلیغ دین سے لے کر انتظام مملکت اور قیام جہاد تک، وہ
ب کا سب اقامت دین تھا، دین و شریعت کے مجموعۂ احکام کا کوئی جزو بھی اس سے خارج نہیں ہے۔

ت مسلمہ کا مقصدِ وجود

شاہ صاحب نے بعثت محمدی کی جو غرض و غایت بتائی ہے، اس
کے معلوم ہو جانے کے بعد امت مسلمہ کے وجود کی غرض و غایت خود
دم و متعین ہو جاتی ہے لیکن مناسب یہی ہے کہ یہ بات بھی موصوف کے اپنے لفظوں میں سن لی جائے۔
مانوں کے لیے خلیفہ کی ضرورت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: ۔

"ایسے مصالح کی بنا پر، جو ایک خلیفہ کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے، مسلمانوں کے اندر ایک خلیفہ کا
واجب ہے۔ یہ مصالح تعداد میں بہت زیادہ ہیں، جن کو دو اصولی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔
، وہ قسم جس کا تعلق ملکی نظام سیاست سے ہے۔ مثلاً مسلمانوں سے در پے جنگ ہونے والی فوجوں
مقابلہ، ظالموں کو مظلوموں پر ظلم کرنے سے روکنا، مقدمات کا فیصلہ وغیرہ۔ دوسری وہ جس کا تعلق
سے ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دین اسلام کی شان و عظمت کا دوسرے سارے دینوں
مقابلے میں اظہار برتری اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ مسلمانوں میں ایک خلیفہ ہو، جو ان لوگوں کے خلاف
نہ اقدامات کرتا رہے جو ملت سے علیحدگی اختیار کریں، حرام کاموں کا ارتکاب کریں اور فرض کاموں
وڑ بیٹھیں، دوسرے تمام اہلِ مذاہب کو سرنگوں بناکر رکھے اور ان سے جزیہ وصول کرے۔[2]"

---

[1] ازالۃ الخفاء، مقصد اول صفحہ ۔ [2] حجۃ اللہ البالغۃ، جلد دوم، صفحہ ۱۴۹

اس اقتباس کو غور سے پڑھیے۔ اس سے جہاں ایک طرف یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک مسلمان اس وقت تک اسلامی زندگی بسر ہی نہیں کر سکتے جب تک کہ پورا اسلامی نظام قائم نہ ہو کیونکہ اسلامی اقتدار و دینی نظام کی عدم موجودگی میں بے شمار دینی مصالح ایسے ہوں گے جن کے پورے ہونے کی صورت ہی نہیں پیدا ہو سکتی، دوسری طرف اس اقتباس سے یہ حقیقت بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ موصوف کے نزدیک ملت اسلامیہ کا مقصد وجود اور اس کی غایت منصبی دین کا ایسا غلبہ ہے جس کے سامنے دنیا کے سارے ادیان پست اور ساری ملتیں سرنگوں ہوں، سیاسی بالاتری اسلام کے لیے مخصوص ہو اور جو قومیں اس پر ایمان نہ لائیں وہ اس کی باج گزار ہو کر رہیں۔ چنانچہ ایک اور جگہ پوری صراحت کے ساتھ کہتے ہیں:۔

"اس امت کے نصب کرنے سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اللہ ہی کا کلمہ بلند رہے اور زمین پر اسلام سے اونچا کوئی دین نہ ہو۔"[1]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، جلد دوم ص۲۵

شرائطِ ایجنسی

(۱) ایجنسی کم سے کم پانچ رسائل پر دی جائے گی۔

(۲) رسائل حسب ضرورت لیے جائیں۔ اگر فروخت نہ ہوئے تو واپس نہیں لیے جائیں گے۔

(۳) کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔ البتہ پچاس یا زائد رسالوں کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی ہوگا

(۴) رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری یا وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔

(۵) رقم ہر حال میں پیشگی آنی چاہیے یا پھر وی پی بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی کے مصارف زیادہ ہوں گے۔

مینیجر رسالہ "زندگی" رامپور، یوپی

ختمِ نبوّت

(مولانا سید جلال الدین عمری)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں اور آخری رسول ہیں۔ آپ کی رسالت قیامت تک کے لیے ہے اور تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اب نہ تو کوئی رسول آئے گا اور نہ کسی سابق رسول کی اتباع جائز ہوگی۔ جو شخص آپ کو رسول مانتا ہے لیکن آخری رسول نہیں مانتا وہ حقیقت میں آپ کی رسالت کا آدھا اقرار اور آدھا انکار کرتا ہے اور یہ چیز انکار ہی کے ہم معنی ہے۔ آپ کی رسالت کے دو جزء ہیں ایک آپ کا رسول ہونا اور دوسرا آپ کے ذریعے رسالت کا ختم ہونا۔ کیونکہ آپ نے صرف اپنی نبوت ہی کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ ختم نبوت کا بھی دعویٰ کیا تھا۔ آپ کی رسالت پر ایمان اسی وقت مکمل ہو سکتا ہے جب کہ ہم دونوں اجزاء کا اقرار کریں۔ ان میں سے کسی بھی جزء کو اپنے عقیدے سے الگ کرنے کے بعد انسان مومن نہیں رہ سکتا۔ قرآن نے ایک خاص موقع پر صاف الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ رسالت کا جو سلسلہ حضرت آدم سے شروع ہوا تھا وہ آپ تک پہنچ کر ختم ہو گیا ہے اور آپ کے بعد کوئی نبی آئے گا۔

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب:۔ ۴۰)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس حیثیت کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ہم یہاں چند روایات نقل کرتے ہیں:۔

اِنَّ مَثَلِیْ وَمَثَلَ الْاَنْبِیَاءِ	میری اور مجھ سے پہلے دوسرے پیغمبروں
مِنْ قَبْلِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی بَیْتًا	کے فرق کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک
فَاَحْسَنَهٗ وَاَجْمَلَهٗ اِلَّا مَوْضِعَ	شخص نے ایک مکان تعمیر کیا اور اسے خوب
لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِیَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ	آراستہ پیراستہ کیا۔ البتہ کونے میں ایک اینٹ

يَطُوفُونَ بِهِ وَيَتَعَجَّبُونَ لَهُ وَيَقُولُونَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ قَالَ فَأَنَا اللَّبِنَةُ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ[1] وفي رواية لمسلم جئت فختمت الأنبياء عليهم السلام[2]

کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ اس مکان کو دیکھ کر حیرت اور تعجب کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آخر یہ اینٹ کیوں نہیں لگا دی گئی۔ چنانچہ میں وہی اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔ مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ میں آیا اور پیغمبروں کی آمد روک دی۔

کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبياء كلما هلك نبي خلفه نبي وانه لا نبي بعدي[3]

بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء علیہم السلام کرتے تھے۔ جب ایک نبی وفات پاتا تو دوسرا نبی آتا لیکن اب میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا

انا العاقب الذي ليس بعده نبي[4]

میرا نام 'عاقب' ہے یعنی وہ جس کے بعد کوئی دوسرا نبی نہیں ہے۔

ختم نبوت کا اعلان حقیقت میں اس بات کا اعلان ہے کہ آپ کی رسالت عالمگیر رسالت ہے آپ صرف اس دور کے پیغمبر نہیں ہیں جس دور میں آپ پیدا ہوئے بلکہ ہر دور میں آپ کی اتباع فرض ہے۔ آپ کی بعثت کسی خاص خطۂ زمین اور کسی خاص قوم کے لیے نہیں ہوئی تھی بلکہ آپ کو ہر خطۂ زمین اور ہر قوم کے لیے بھیجا گیا تھا۔ آپ تمام عالم کے ہادی و راہنما ہیں اور آپ ہی سے دنیا راہ راست پا سکتی ہے۔ آپ کے ذریعہ خدا کی ہدایت آخری بار نازل ہو چکی ہے۔ اب نہ کسی ہدایت کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی کے حق میں مفید ہو سکتی ہے۔ ختم نبوت کا تصور اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا کہ آپ کو ساری دنیا کا پیغمبر مانا جائے اور آپ کی ہدایت کو عالمی و ابدی ہدایت تسلیم کیا جائے۔

قرآن و حدیث میں بار بار اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ آپ کی رسالت تمام زمانوں اور تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اور اب جس کسی کو بھی ہدایت مل سکتی ہے آپ ہی سے مل سکتی ہے۔

---

[1] بخاری کتاب المناقب، باب خاتم النبیین۔ [2] مسلم کتاب الفضائل، باب ذکر کونہ خاتم النبیین۔ [3] بخاری کتاب الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔ [4] مسلم کتاب الفضائل، باب فی اسمائہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِىِّ الْاُمِّىِّ الَّذِىْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (الاعراف: ۱۵۸)

اے محمد! ان سے کہو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں۔ اس خدا کا پیغمبر جس کے ہاتھ میں آسمان اور زمین کی سلطنت ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی زندگی عطا کرتا اور مارتا ہے۔ پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر جو اللہ اور اس کے کلمات کو مانتا ہے۔ اور اس کی پیروی اختیار کرو امید ہے کہ تم ہدایت پاؤ گے۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۤفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

(السبا: ۲۸)

ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لیے (اللہ کے انعامات کی) خوش خبری دینے والا اور (اس کے عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

كان النبىُّ يبعث الى قومه خاصة وبعثت الى الناس عامة[1]

ہر نبی مخصوص طور پر اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا لیکن میری رسالت عام ہے اور مجھے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے

كان كل نبى يبعث الى قومه خاصة وبعثت الى كل احمر واسود[2]

ہر نبی مخصوص طور پر اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا لیکن مجھے تمام سرخ و سیاہ انسانوں (عرب و عجم) کی طرف بھیجا گیا ہے۔

ایک اور موقع پر آپ فرماتے ہیں:۔

ارسلت الى الخلق كافة

مجھے تمام خلق خدا کی طرف بھیجا گیا ہے اور

---

[1] بخاری کتاب التیمم۔ [2] مسلم کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ

(ختم بی النبیون [1] میرے ذریعہ نبیوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے آخری رسول ماننے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ نجات کے لیے آپ کی اتباع کو ضروری قرار دیا جائے۔ لیکن بعض لوگ اس معاملے میں ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک نجات صرف آپؐ کی اتباع میں نہیں ہے بلکہ کسی بھی رسول کے پیچھے چل کر انسان نجات پاسکتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی کام انجام دیا ہے جو کام آپ سے پہلے دوسرے رسول انجام دیتے رہے ہیں۔ اس لیے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی پیروی انسان کو خدا تک پہنچاتی ہے لیکن یہ دعویٰ صحیح نہ ہوگا کہ آپ کے علاوہ کسی دوسرے رسول کی اتباع انسان کو خدا سے دور کردے گی۔ خدا کے رسولوں کے ذریعہ مختلف قوموں اور ملکوں میں ہدایت کے چراغ روشن ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے جس کسی کی بھی کوئی اتباع کرے وہ ہدایت سے محروم نہیں رہ سکتا۔ ہر پیغمبر کی راہ خدا کی راہ ہے اس راہ کا راہی ناممکن ہے کہ اپنی منزل سے بھٹک جائے۔"

اس استدلال کی خامی یہ ہے کہ اس میں آپ کی رسالت کا مطالعہ ایک غلط رخ سے کیا گیا ہے۔ آپ نے انسانوں کو خدا کی بندگی کی دعوت دی، اور اس میں شک نہیں کہ یہ دعوت کوئی نئی دعوت نہیں ہے بلکہ یہ نوعِ انسانی کو اس وقت سے مل رہی ہے جب سے وہ اس زمین پر آباد ہے لیکن یہ ایک اصولی بات ہے۔ جب آپ اس کی تفصیل میں جائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اب آپ ہی کی اتباع تمام انسانوں پر واجب ہے۔ اس کے دو خاص وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ دنیا کی وہ عمومی حالت ہے جو آپ کی بعثت کے وقت تھی۔ آپ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جس میں نہ کوئی آسمانی کتاب اپنی صحیح شکل میں موجود تھی اور نہ کسی پیغمبر کا اسوہ محفوظ تھا۔ دنیا گرفتارِ جہالت تھی اور ہدایت کے چشمے خشک ہوگئے تھے۔ آپ نے انسانوں کو خدا کا پیغام اس وقت سنایا جب کہ وہ مٹ چکا تھا۔ جو شخص خدا تک پہنچنا چاہے اس کے لیے صحیح راہ مفقود تھی، آپ نے اسے صحیح راہ دکھائی۔ انسان خدا کو بھولا ہوا تھا، آپ نے اس کے اندر خدا کی یاد پیدا کی۔ خدا سے بندوں کا تعلق ٹوٹ چکا تھا۔ آپ نے اس تعلق کو پھر سے مضبوط کیا۔ اب انسان کو خدا کی معرفت صرف آپ ہی کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ جو شخص خدا کو پانا چاہے اس کے لیے صرف ایک ہی راہ کھلی ہے اور وہ آپ کی بتائی ہوئی راہ ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ

ی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

یٰۤاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَکُمْ	اے اہل کتاب! یقیناً اب تمہارے
رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ عَلٰی فَتْرَۃٍ	پاس ہمارا رسول آچکا ہے جو تمہیں کھول کھول کر
مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا	دین کی باتیں بتارہا ہے۔ اس کی آمد ایک ایسے
مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ فَقَدْ جَآءَکُمْ	وقت میں ہوئی ہے جب کہ مدت سے خدا کے
بَشِیْرٌ وَّنَذِیْرٌ وَاللّٰہُ عَلٰی	رسول نہیں آرہے تھے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ کوئی خوشخبری
کُلِّ شَیْءٍ	دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا ہمارے پاس
قَدِیْرٌ ؁	نہیں آیا۔ پس اب تمہارے پاس خوشخبری دینے والا اور عذاب
(المائدہ: ۱۹)	سے ڈرانے والا آگیا۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

آپ کی اتباع کو ضروری قرار دیئے جانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خدا کا پیغام آپ کے انسانوں کو آخری بار ملا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اب وہ تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں پ سے پہلے نازل ہوئی تھیں۔ کیونکہ خدا کی طرف سے کسی شریعت کا نفاذ صرف اسی وقت تک ہے ہوتا ہے جب تک کہ اس کے بعد کوئی نئی شریعت نہ آجائے۔ اور جب وہ آجاتی ہے تو کسی بھی شخص کو ات کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ اس نئی شریعت کو چھوڑ کر سابقہ شریعتوں کی اتباع کرے ب کہ خدا کا آخری رسول آگیا اور اس کے ساتھ خدا کی شریعت بھی آخری بار نازل ہو گئی تو پھر ا دوسری شریعت پر عمل کر کے انسان کیسے نجات پاسکتا ہے؟ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ صَلَّی	قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں
اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِیَدِہٖ لَا یَسْمَعُ	محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے، خواہ
بِیْ اَحَدٌ مِّنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ یَھُوْدِیٌّ	کوئی یہودی ہو یا نصرانی جو بھی میری آمد کے
وَلَا نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ	بارے میں سنے اور پھر میرے لائے ہوئے دین
بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِہٖ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ	پر ایمان لائے بغیر مرجائے تو وہ قطعاً جہنمی ہوگا

ایک اور موقع پر آپ فرماتے ہیں:۔

کتاب الایمان، باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا محمد الی جمیع الناس و نسخ الملل بملتہ

وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَوْبَدَا لَکُمْ مُوْسٰی فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَ تَرَکْتُمُوْنِیْ لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِیْلِ وَلَوْ کَانَ حَیًّا وَ اَدْرَکَ نُبُوَّتِیْ لَاتَّبَعَنِیْ [1]	قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر آج موسیٰؑ بھی تمہارے سامنے نمودار ہو جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرنے لگو تو راہ راست سے بھٹک جاؤ گے۔ اگر وہ بھی زندہ ہوتے اور میرے دور نبوت کو پاتے تو میری ہی اتباع کرتے۔

اسی بات کو آپ نے ان الفاظ میں بھی ظاہر فرمایا ہے:۔

لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ [2]	اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ میری اتباع کریں

ان تصریحات کا حاصل یہ ہے کہ نجات صرف آپ کی پیروی میں ہے۔ جو شخص بجائے آپ کی پیروی کے کسی دوسرے رسول کی پیروی کو نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے وہ آپ کی رسالت کا منکر ہے اس کے لیے خدا کی رحمت کے دروازے بند ہیں۔

---

[1] رواہ احمد و البیہقی فی شعب الایمان (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الایمان بالکتاب والسنۃ)

[2] رواہ الدارمی (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان)

قرآنی تعلیمات

(قسط ۵)

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

عورتوں کی دلجوئی کرو

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ	اے نبی! کیوں حرام کرتے ہیں وہ
اللّٰہُ لَکَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ	چیز جو اللہ نے آپ کے لیے جائز ٹھہرائی
وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (تحریم ۱۰)	اپنی بیویوں کی رضاجوئی میں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار کسی بیوی کی خوشنودی اور دل جوئی میں شہد کھانا چھوڑ دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی رحمت اپنی بیویوں کی رضاجوئی اور دلداری کا کس درجہ خیال رکھتے تھے۔ اس میں امت کے لیے یہ ترغیب ہے کہ وہ بھی بیویوں کے معاملے میں اسی طرح، ایثار، مہربانی اور دل داری سے کام لیں لیکن یہ اصولی حقیقت بہر حال سامنے رکھیں کہ رضاجوئی اور دل داری میں اس حد تک نہ بڑھ جائیں جس سے دین کا نقصان ہونے لگے۔ دین بہر حال ہر چیز پر مقدم ہے، کسی کی خاطر ایسی قربانی جس سے دین پر زد پڑتی ہو، قرآنی تعلیم کے قطعاً منافی ہے۔

عورتوں کو احکامِ الٰہی کا پابند بناؤ

وَاْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ	اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو
وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا (طٰہٰ ۱۳۲)	اور اس پر جمے رہو۔

عورتوں کی مادی ضرورتوں کا اہتمام، ان کے آرام و آسائش کا خیال، ان کے جذبات و احساسات کا احترام ۔۔۔ بلاشبہ یہ شوہروں کے فرائض ہیں لیکن ان سب سے بھی بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ انہیں دینی احکام کا پابند بنائیں۔ ان کے اندر دین کی محبت پیدا کریں اور انہیں برابر اسلامی احکام کی تاکید کرتے رہیں، اپنا اثر، قوت اور بلند تر حیثیت سے کام لے کر گھر والوں کو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور

دوسرے ارکان دین کا پابند بنائیں۔ قرآن حکیم نے اس کا تاکیدی حکم بھی دیا ہے اور انبیاءؑ کی زندگی سے اس کی شہادت بھی پیش کی ہے :-

نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرو

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ۝ (مریم ۵۵)

اور حضرت اسمٰعیل اپنے گھر والوں کو برابر نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتے تھے اور وہ خدا کے بڑے ہی پسندیدہ بندے تھے۔

نماز اور زکوٰۃ کی تاکید سے مراد محض ان دو ارکان کی تاکید ہی نہیں ہے بلکہ دین کے تمام ہی احکام کی تاکید ہے، دراصل نماز اور زکوٰۃ تمام دینی احکام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ نماز آدمی کو تیار کرتی ہے کہ وہ خدا کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کرے، خدا سے صحیح تعلق استوار کرے اور بندگی کے گہرے جذبات سے اپنی زندگی کو سنوارے، زکوٰۃ آدمی کو تیار کرتی ہے کہ وہ مال و دولت اور دنیا کی بے جا محبت سے اپنے دل کو پاک کرے، خدا کے بندوں کے حقوق کا واقعی احساس پیدا کرے، اور ان کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک کرے۔ غور کیجیے اگر واقعتاً کوئی شخص صحیح جذبات کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کرے تو وہ دین کے کس حکم میں کوتاہی کرے گا؟ نہ وہ خدا کے حقوق میں کوتاہی کرے گا اور نہ ہی بندوں کے حقوق میں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر یہاں ان دو اہم ترین اسلامی ارکان کا ذکر ہے اور اشارہ دین کے تمام ہی احکام کی طرف ہے۔ آیت کی روشنی میں ہر مرد کی یہ ذمہ داری قرار پاتی ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو دین کے احکام کا پابند بنانے کی پوری پوری کوشش کرے۔

عورتوں کے سچے خیر خواہ ہو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

خانگی زندگی کی خوشگواری کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ زوجین اسلامی تعلیمات سے واقف ہوں، خدا اور بندوں کے حقوق جانتے ہوں اور اپنے اپنے فرائض سے بخوبی واقف ہوں، جہاں تک عورت کا تعلق ہے، مرد کی ذمہ داری صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس کے نان و نفقہ اور مادی ضرورتوں ہی کا انتظام کرے بلکہ مرد کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس کی اچھی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرے۔ اسے ایک صالح بیوی کے فرائض بتلائے۔ ایک اچھی ماں کے فرائض بتائے

خدا اور رسول کے احکام اور حقوق بتائے تاکہ وہ ایک صالح بیوی کی حیثیت سے خوشگوار ازدواجی زندگی گذار سکے۔ اور جہنم کی تباہی سے بچ سکے۔ یہی عورت کی سچی خیرخواہی ہے۔

عورتوں کا نان نفقہ ادا کرو

وَبِمَآ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ (النساء)

(مرد کو عورت کا نگراں اس لیے بنایا گیا ہے) کہ وہ اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں۔

مال خرچ کرنے میں مہر اور نان نفقہ وغیرہ سب کچھ شامل ہے، خوش گوار تعلقات کے لیے انتہائی ضروری ہے، کہ عورت نے جب خود کو مرد کے حوالے کر دیا ہے تو وہ خوش دلی اور فیاضی کے ساتھ اس کی تمام ضروریات پوری کرے، اور کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اُسے آرام پہنچائے۔

بیوی پر زیادتی نہ کرو

وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ فَتَذَرُوۡهَا كَالۡمُعَلَّقَةِ

(النساء:- ۱۲۹)

اور بیویوں کے درمیان پورا پورا انصاف تو تمہارے بس ہی میں نہیں ہے تم اگر کرنا بھی چاہو تو نہیں کر سکتے۔ پس (حکم خداوندی کا منشا پورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے) کہ کسی ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ مائل ہو جاؤ کہ دوسری کو (کس مپرسی کی حالت میں) لٹکتا چھوڑ دو۔

یہ تو صحیح ہے کہ ایک سے زائد بیویوں کی شکل میں سب کی طرف طبیعت کا یکساں میلان نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آدمی تمام حیثیتوں سے عورتوں کے درمیان برابری کر سکے۔ اور نہ ہی اس کا مطالبہ ہے، مطالبہ صرف یہ ہے کہ مرد اپنی سب بیویوں کی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھے، ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک کرے، کوئی ایسی روش اختیار نہ کرے جس سے عورت پر زیادتی ہو، اور نکاح کے باوجود عورت سے اس طرح بے تعلق نہ ہو جائے کہ گویا اس کا شوہر ہی نہیں ہے، کسی عورت کو نکاح میں لینے کے بعد مرد کی یہ ذمہ داری ہے، کہ وہ امکانی حد تک عورت کو زندگی سے لطف اندوز ہونے کا موقع بہم پہنچائے۔

عورتوں کی نگہبانی کرو اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (النساء ۳۴) — مرد عورتوں کے نگران اور محافظ ہیں۔

عورت طبعی طور پر کمزور مخلوق ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مرد کو اس کا نگہبان اور محافظ بنایا ہے کہ وہ اس کے حقوق، جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرے، اور ہر نقصان اور خطرے سے اس کو بچانے کی کوشش کرے۔

عورتوں کو نصیحت کرو وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ (النساء ۳۴) — اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی اور نافرمانی کا اندیشہ ہو تو نصیحت کرو۔

نہ مانیں تو خلوت سے محروم کردو وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ (النساء ۳۴) — خوابگاہوں میں ان سے علیحدہ رہو۔

پھر بھی نہ مانیں تو مارو وَاضْرِبُوْهُنَّ (النساء ۳۴) — اور (اگر باز نہ آئیں) تو انہیں مارو۔

اگر عورت نادانی میں سرکشی اور نافرمانی کی روش اختیار کرکے خانگی زندگی کے سکون کو برباد کرنے لگے تو مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ اصلاح اور تنبیہ کی ان ہدایات اور تدبیروں پر عمل کرکے اس خانگی سکون کو برباد نہ ہونے دے اور ازدواجی زندگی کو خوش گوار رکھنے کی انتہائی کوشش کرے۔

پہلے مرحلے میں تو وہ نہایت سوز محبت کے ساتھ عورت کو سمجھائے، سرکشی کے برے نتائج سے ڈرائے، اس کی ذمہ داریاں یاد دلائے اور نہایت نرمی اور خلوص سے نیک رویے کی تلقین کرے، لیکن اگر وہ باز نہ آئے تو پھر تنبیہ کرے۔ تنبیہ کی پہلی شکل یہ ہے کہ اس سے تعلقِ زن و شو منقطع کرلے۔ اگر عورت میں کچھ بھی احساس ہے اور اس نے اپنی فطرت کو مسخ نہیں کرلیا ہے تو شوہر کا یہ قطع تعلق اس کی اصلاح کے لیے بالکل کافی ہے، لیکن اس تنبیہ کے باوجود بھی اگر وہ اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہ کرے، تو پھر اس کو مارے، ہوسکتا ہے کہ اس آخری تدبیر ہی سے اس کی اصلاح ہوجائے۔ لیکن یہ ایک آخری اور ناپسندیدہ چارۂ کار ہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات سے اس حکم کی جو تشریح ملتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے

مارنے کی جب کبھی اجازت دی ہے بادلِ ناخواستہ ہی دی ہے اور پھر بھی اسے ناپسند ہی فرمایا ہے اور یہ بھی ہدایت فرمائی کہ اگر اس تدبیر پر عمل کرنا ہی پڑے تو مارنے میں پوری پوری احتیاط کی جائے۔ منہ پر نہ مارا جائے۔ بے رحمی سے نہ مارا جائے۔ اور کسی ایسی چیز سے بھی نہ مارا جائے جس سے جسم پر نشان پڑ جائیں یا شدید ضرب آئے۔

ستانے کے بہانے نہ ڈھونڈھو

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (النساء۔ ۳۴)

پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو خواہ مخواہ ان کو ستانے کے بہانے نہ تلاش کرو۔

اگر ان تدبیروں سے عورتیں اپنے رویے میں تبدیلی کرلیں اور اطاعت گزار بن کر رہنے لگیں تو پھر مردوں کو چاہیے کہ ان کی طرف سے دل صاف کریں۔ ان کی پچھلی غلطیوں سے درگزر کریں اور محبت وسلوک سے ان کے ساتھ زندگی گزاریں، پچھلی بھڑاس نکالنے کے لیے خواہ مخواہ بہانے بنا بنا کر ان کو ستانے کی راہیں تلاش نہ کی جائیں۔

حقِ زوجیت ادا کرتے رہو

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (البقرۃ: ۲۲۳)

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں تمہیں اختیار ہے کہ جس طرح چاہو اپنی کھیتیوں میں جاؤ۔

مرد اور عورت کا تعلق کسان اور کھیت جیسا ہے، کسان کبھی بھی اپنے کھیت سے غافل ہو کر اسے یوں ہی نہیں چھوڑ دیتا بلکہ اس سے پیداوار حاصل کرنے کے لیے برابر اس میں مشغول رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح مرد کو عورت کی فطری خواہش سے غافل ہو کر اس کو یوں ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیے بلکہ برابر حقِ زوجیت ادا کرتے رہنا چاہیے۔

جائز طریقے کا اہتمام رکھو

فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ۔ (البقرۃ۔ ۲۲۲)

تو عورتوں کے پاس اس فطری طریقے سے جاؤ جس کا حکم اللہ نے تمہیں دیا ہے۔

اللہ کے حکم کے مطابق عورتوں کے پاس جانے سے مراد وہ فطری طریقہ ہے جو انسان اور حیوان سب کو فطری طور پر اللہ تعالیٰ نے ودیعت کیا ہے اور جو بقائے نسل کا ذریعہ ہے

رسائل و مسائل

عقیقہ اور اس کے متعلق چند مسائل

ل :- میرے خاوند مبلغ چالیس روپے کے ملازم ہیں اور یہاں ایک بکرا ساٹھ ستر روپے میں ملتا ہے میرے ایک بچے کی ولادت کے بعد خاوند نے والدین کو لکھا کہ آپ عقیقہ غائبانہ طور پر اس کے نام پر کر دیں چنانچہ اس طرح عقیقہ ہو گیا۔ میرا آبائی مسلک اہل حدیث ہے۔ اب کچھ لوگ طرح طرح کے اعتراضات کر رہے ہیں اور میں اور میرے خاوند سخت ذہنی الجھن میں مبتلا ہیں آپ کی بڑی عنایت ہوگی اگر آپ ماہنامہ زندگی میں مندرجہ ذیل باتوں کی مدلل وضاحت فرما دیں گزارش یہ ہے کہ چاروں مذاہب کو سامنے رکھ کر جواب دیں اور عربی عبارتیں بھی نقل کر دیں، میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی۔

۱- عقیقہ کی شرعی حیثیت کیا ہے آیا یہ واجب ہے یا سنت یا مستحب؟

۲- کیا ہر حال میں عقیقہ کرنا لازم ہے مالی گنجائش ہو یا نہ ہو؟

۳- کیا غائبانہ عقیقہ درست نہیں ہے؟

۴- کیا عقیقے کے جانور میں قربانی کے جانور کی تمام شرطیں ضروری ہیں؟

۵- کیا بچے کے والدین کے علاوہ کوئی دوسرا عزیز قریب عقیقہ کر دے تو ادا نہ ہوگا؟

۶- کیا یہ بات ثابت کی جاسکتی ہے کہ صحابہ نے سفر میں عقیقہ نہیں کیا ہے؟

ج

محترمہ! آپ کے دو خط ملے، ذیل میں سوالات کے مختصر جوابات درج ہیں

۱) عقیقہ اصحاب الظواہر اور حضرت حسن بصریؒ کے نزدیک واجب، اہل بیت، ائمہ ثلثہ اور جمہور فقہاء

کے نزدیک سنت اور مذہب حنفی میں نفل یا مستحب ہے۔ شوکانی لکھتے ہیں:۔

القائلون بانہا واجبۃ ہم الظاہریۃ والحسن البصری وذھب الجمہور من العترۃ وغیرہم الی انہا سنۃ وذہب ابو حنیفۃ الی انہا لیست فرضا ولا سنۃ وقیل انہا عندہ تطوع (نیل الاوطار ج ۵)

اصحاب الظاہر اور حسن بصری عقیقہ کے واجب ہونے کے قائل ہیں اور جمہور فقہاء اہل بیت وغیر اہل بیت اس کو سنت کہتے ہیں اور ابو حنیفہ کے نزدیک نہ وہ فرض ہے اور نہ سنت، ایک قول یہ ہے کہ عقیقہ ابو حنیفہ کے نزدیک نفل ہے۔

علامہ شامی نے شرح طحاوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ عقیقہ تطوع (نفل) ہے لیکن راقم الحروف نے ہندستان کے علماء کی کتابوں میں پڑھا ہے کہ وہ اس کو مستحب کہتے ہیں، اس سلسلے میں جو احادیث آئی ہیں ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عقیقہ زیادہ سے زیادہ سنت یا مستحب ہے، موطا امام مالک کی ایک حدیث یہ ہے:۔

سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن العقیقۃ فقال لا احب العقوق وکانہ انما کرہ الاسم وقال من ولد لہ ولد فاحب ان ینسک عن ولدہ فلیفعل۔ (موطا، کتاب العقیقہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیقہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں عقوق (نافرمانی) کو پسند نہیں کرتا گویا آپ نے اسم عقیقہ کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ جس کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوا اور وہ اپنے بچے کی طرف سے جانور ذبح کرنا پسند کرے تو اسے چاہیے کہ ایسا کرے۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عقیقہ کوئی دینی فریضہ نہیں ہے بلکہ کرنے والے کی مرضی پر موقوف ہے وہ چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے اسی مضمون کی حدیث ابوداؤد نے ایک دوسری سند سے روایت کی ہے اس میں بھی یہی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے نومولود بچے کی طرف سے جانور ذبح کرنا چاہے تو کرے، عقیقے کے شرعی حکم کا امام بخاری کے اس ترجمہ باب سے بھی پتہ چلتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جس بچے کا عقیقہ نہ کیا جائے اس کا نام پیدائش کے دوسرے ہی دن رکھ دینا چاہیے اس باب کی شرح میں علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وعلیہ من یراد ان یعق عنہ لا یؤخر تسمیتہ الی السابع کما وقع فی قصۃ ابراھیم بن ابی موسی و عبد اللہ بن ابی طلحۃ وکذالک ابراھیم بن النبی صلی اللہ علیہ وسلم و عبد اللہ بن الزبیر فانہ لم ینقل انہ عق احد منھم ومن ارید ان یعق عنہ تؤخر تسمیتہ الی السابع	جس بچے کے عقیقے کا ارادہ نہ ہو اس کا نام رکھنے میں ساتویں دن تک تاخیر نہ کی جائے گی جیسا کہ ابراہیم بن ابی موسیٰ اور عبداللہ بن ابی طلحہ کے قصے میں واقع ہوا اور اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیمؓ اور عبداللہ بن زبیر کے قصے میں واقع ہوا اس لیے کہ ان میں سے کسی کے بارے میں یہ منقول نہیں ہے کہ اس کا عقیقہ کیا گیا ہو اور جس بچے کے عقیقے کا ارادہ ہو اس کا نام رکھنے میں ساتویں دن تک تاخیر کی جائے گی۔
(فتح الباری ج ۹ کتاب العقیقہ)	

علامہ ابن حجر کی یہ عبارت عقیقے کے مسئلے میں خاصی اہمیت رکھتی ہے اس لیے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں ہر بچے کا عقیقہ نہیں ہوتا تھا اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ حضورؐ نے خود اپنے صاحبزادے کا عقیقہ نہیں کیا۔ اگر حضورؐ ان کا عقیقہ کرتے تو پھر یہ بات ناقابل فہم ہے کہ احادیث وسیر میں اس کا ذکر نہ آتا جبکہ حضرت حسنؓ حسینؓ کے عقیقے کا ذکر متعدد احادیث میں آتا ہے۔ یہی دلائل ہیں جن کی بنا پر جمہور فقہائے مجتہدین نے عقیقے کے واجب ہونے کی نفی کی ہے، لیکن بعض حدیثوں سے عقیقے کے حکم کی تاکید ثابت ہوتی ہے اس لیے تمام احادیث کو سامنے رکھ کر انھوں نے اس کو سنت قرار دیا ہے۔

(۲) آپ کا یہ سوال سمجھ میں نہ آیا۔ کیا کسی شخص کا خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عقیقہ ہر حال میں لازم ہے چاہے مالی گنجائش ہو یا نہ ہو؟ اگر کوئی یہ خیال رکھتا ہے تو اس کا خیال بے تکا اور بے دلیل ہے، اسلامی شریعت کا یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ جن واجبات وسنن کی ادائیگی مال پر موقوف ہے اس کے مکلف وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی لابدی ضروریات سے زیادہ اتنا مال رکھتے ہوں کہ ان واجبات وسنن کو ادا کر سکیں۔ اگر بالفرض عقیقے کو دینی فریضہ، واجب اور اسلامی شعار بھی مان لیا جائے تو اس کی ادائیگی اسی شخص پر ضروری ہوگی جس کے مال میں اس کی گنجائش موجود ہو، مالی گنجائش موجود نہ ہوتے ہوئے اس کو واجب قرار دینا شرعی احکام سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

(۳) اگر کسی مجبوری کی وجہ سے کوئی شخص اپنے بچے کا عقیقہ غائبانہ کرادے تو میرے نزدیک عقیقہ ہو جائے گا اور سنت ادا ہو جائے گی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مالی واجبات و سنن کی ادائیگی کے لیے اس مقام پر اس شخص کی موجودگی ضروری نہیں ہے جہاں کوئی سنت یا واجب اس کی طرف سے ادا کیا گیا ہو، مثلاً کوئی شخص اگر سفر میں ہو اور اس کی اجازت سے کوئی دوسرا شخص اس کے وطن میں اس کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر دے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ یہی مسئلہ قربانی کا بھی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کسی مسلک میں بھی یہ بات لازمی اور ضروری قرار دی گئی ہو کہ جس کی طرف سے قربانی کی گئی ہو اس کا اس مقام پر موجود ہونا ضروری ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے ان لوگوں کی طرف سے بھی قربانی کی تھی جنھوں نے خود قربانی نہ کی ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ تمام لوگ جن کی طرف سے آپ نے قربانی کی مدینے میں موجود نہ تھے۔

عن جابر بن عبد اللہ قال	جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے وہ کہتے
شهدت مع رسول الله صلى الله عليه	ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
وسلم الاضحى في المصلى فلما قضى	ساتھ عید گاہ میں عید اضحی کی نماز پڑھی، جب
خطبته نزل من منبره واتي بكبش	حضورؐ خطبے سے فارغ ہوئے تو منبر سے اترے
فذبحه رسول الله صلى الله عليه	اور آپ کے پاس ایک مینڈھا لایا گیا تو آپ
وسلم بيده وقال بسم الله والله	نے اپنے دست مبارک سے اسے ذبح کیا اور
اكبر هذا عني وعن من	کہا بسم اللہ واللہ اکبر یہ میری طرف سے
لم يضح من امتي	ہے اور میری امت کے ان لوگوں کی طرف سے
(ابوداؤد)	جنھوں نے قربانی نہیں کی۔

صاحب عون المعبود نے ابن ابی شیبہ اور ابو یعلیٰ موصلی کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں یہ ہے کہ آپ نے دو مینڈھے ذبح کیے ایک اپنی اور اپنی آل کی طرف سے اور ایک اپنی امت کی طرف سے۔ اہل حدیث حضرات اس حدیث کو بھی ایک مینڈھے یا ایک بکرے میں متعدد افراد کی شرکت کو جائز قرار دینے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ پھر کوئی اہل حدیث یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ جس کی طرف سے قربانی کی جائے اس کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا ہو تو پھر نعوذ باللہ لوگوں

کی طرف سے حضور کی قربانی صحیح نہ رہے گی جو مدینے میں موجود نہ تھے اور جب قربانی غائبانہ ادا ہو جاتی ہے تو پھر عقیقہ غائبانہ کیوں صحیح نہ ہوگا جب کہ نومولود بچے کی موجودگی اور عدم موجودگی اس لحاظ سے برابر ہے کہ اس کو اس کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ یہ خیال رہے کہ گفتگو یہ نہیں ہو رہی ہے کہ بہتر کیا ہے بلکہ یہ ہو رہی ہے کہ کسی معذوری کی بنا پر اگر عقیقہ غائبانہ کرا دیا جائے گا تو وہ ادا ہو جائے گا یا نہیں؟ اوپر کے دلائل سے ثابت ہوا کہ ادا ہو جائے گا۔

(۴) جمہور فقہاء مجتہدین کے نزدیک عقیقہ کے جانور کو ان عیوب سے خالی ہونا چاہیے جن سے قربانی کے جانور کا خالی ہونا ضروری ہے۔ ان کے مسلک کی دلیل قربانی کے جانور پر قیاس ہے۔ امام شوکانی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور انہیں کی رائے صاحب تحفۃ الاحوذی نے بھی اختیار کی ہے مولانا مبارک پوری لکھتے ہیں:۔

قلت لم یثبت الاشتراط بحدیث صحیح اصلا ولا بحدیث ضعیف ...... قال الشوکانی فی النیل ھل یشترط فی العقیقۃ ما یشترط فی الاضحیۃ وفیہ وجھان للشافعی وقد استدل باطلاق الشاتین علی عدم الاشتراط وھو الحق لکن لا لھذا الاطلاق بل لعدم ورود ما یدل ھھنا علی تلک الشروط والعیوب المذکورۃ فی الاضحیۃ وھی احکام شرعیۃ لا تثبت بدون دلیل

(تحفۃ الاحوذی ج۲ ص۳۶۵)

میں کہتا ہوں کہ اشتراط بالکل ثابت نہیں ہے نہ کسی صحیح حدیث سے اور نہ کسی ضعیف حدیث سے ...... شوکانی نے نیل الاوطار میں کہا: کیا عقیقہ کے جانور میں بھی وہ شرط لگائی جائے گی جو قربانی کے جانور میں ہے؟ امام شافعی کے اس مسئلے میں دو قول ہیں۔ عقیقہ کی حدیث میں بغیر کسی قید کے دو بکریاں ذبح کرنے کو کہا گیا ہے اس اطلاق سے استدلال کیا گیا ہے کہ عقیقہ کے جانور میں قربانی کے جانور کی شرط نہ ہوگی اور یہی حق ہے لیکن اس اطلاق کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ عقیقہ کی احادیث میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ان شرطوں اور عیوب پر دلالت کرے جو قربانی کے جانور میں ذکر ہوئیں اور یہ شرعی احکام ہیں

ائمہ مجتہدین کی طرف سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ قیاس بھی تو ایک دلیل شرعی ہے اور جب قیاس سے شرط ثابت ہو رہی ہے تو اسے بلا دلیل کہنا کس طرح صحیح ہے؟ اس کے باوجود اہل حدیث حضرات کے لیے

اس کی گنجائش موجود ہے کہ وہ شوکانی اور مولانا مبارک پوری کی رائے پر عمل کریں۔

(۵) اگر ماں باپ کی اجازت سے کوئی دوسرا شخص عقیقہ کر دے تو ہو جائے گا۔ اس کی ایک دلیل تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے کہ آپ نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے عقیقہ کیا تھا۔ دوسری دلیل حدیث کا یہ ٹکڑا ہے جس میں یُذْبَحُ عَنْهُ یَوْمَ سَابِعِهٖ کا جملہ آتا ہے۔ یعنی ساتویں دن بچے کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے گا، کون ذبح کرے گا اس کا ذکر نہیں ہے چنانچہ یُذْبَحُ کے فعل مجہول سے اس پر استدلال کیا گیا ہے۔ شوکانی اس جملے کی شرح میں لکھتے ہیں:

وفیہ دلیل علی انہ یصح ان	اور اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ
یتولی ذالک الاجنبی کما یصح ان	عقیقہ کوئی اجنبی شخص بھی بچے کی طرف سے
یتولاہ القریب عن قریبہ والشخص	کر سکتا ہے جس طرح یہ صحیح ہے کہ کوئی رشتہ
عن نفسہ	اپنے رشتہ دار کی طرف سے کر دے یا کوئی
(نیل الاوطار ج ۵)	شخص اپنا عقیقہ خود کرے۔

اپنا عقیقہ خود کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کا عقیقہ نہ ہوا ہو تو بالغ ہونے کے بعد اس کی گنجائش ہے کہ وہ خود اپنے عقیقے میں ایک جانور ذبح کرے، شوکانی کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کسی بچے کے باپ کی ذمہ داری اگر کوئی دوسرا شخص اٹھائے تو جائز ہے۔

(۶) یہ سوال بھی سائل کی مسائل شرعیہ سے ناواقفیت کی دلیل ہے سفر میں تو بہت سے فرائض وواجبات میں بھی تخفیف پیدا کی گئی ہے اور ان کی ادائیگی کو مؤخر کرنے کی رخصت دی گئی ہے، کیا عقیقہ، روزے، نماز اور قربانی سے بھی بڑھ گیا ہے۔ اس کے علاوہ جو شخص اس کا مدعی ہو کہ صحابہ سفر میں بھی عقیقہ کیا کرتے تھے تو ثبوت اس کو پیش کرنا چاہیے۔ اوپر آچکا ہے کہ صحابہ بلکہ خود حضور نے حضر میں بھی عقیقے کو ترک کیا ہے۔ سفر کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

سید احمد قادری

تنقید و تبصرہ

۲۴۲

تاریخ تصوف (قبل از اسلام) مصنفہ جناب بشیر احمد ڈار، کاغذ، کتابت، طباعت اوسط، صفحات مجلد مع گردپوش، قیمت چار روپے ۲۵ پیسے۔ ناشر:۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ۔ لاہور۔

ایک تصوف تو وہ ہے جس کی تعبیر "احسان" سے کی جاتی ہے۔ اس تصوف سے نہ کسی عالم دین نے اختلاف کیا ہے اور نہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ کیونکہ "احسان" نہ صرف یہ کہ کتاب و سنت میں منصوص ہے بلکہ وہ عبادت و اطاعت کی روح اور اس کا جوہر ہے۔ اور ایک تصوف وہ ہے جو فلسفۂ یونان کی روشنی میں باضابطہ ایک "فن" بن گیا ہے۔ اس میں ذات و صفات کی فلسفیانہ مباحث ہیں۔ بیسیوں دقیق اصطلاحیں ہیں۔ مقامات ہیں، تنزلات ستہ ہیں۔ ابن عربی کا وحدۃ الوجود ہے اور منصور کا نعرہ اناالحق ہے۔ یہ تصوف، سیکڑوں برس سے علماء کے درمیان "مختلف فیہ" بنا ہوا ہے تصوف کی اس قسم کو سمجھنے کے لیے زیر تبصرہ کتاب، ایک اچھا مقدمہ، عمدہ دیباچہ اور بہتر تعارف ہے، اس سے فلسفیانہ تصوف کے اصل مآخذ کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں یونانی تصوف۔ یہودی تصوف عیسائی تصوف اور چینی تصوف کو بڑی قابلیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اگر اس کتاب میں ہندو تصوف یا ویدانت کا بھی ایک باب ہوتا تو کتاب جامع ہو جاتی۔ فاضل مصنف نے کتاب بڑی محنت سے مرتب کی ہے اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔ عام لوگ جو فلسفہ اور فلسفیانہ تصوف سے واقفیت نہیں رکھتے ان کے لیے اس کتاب سے فائدہ اٹھانا دشوار ہے۔

فاضل مصنف نے یونانی، یہودی، عیسائی اور چینی تصوف کے تنقیدی اور تاریخی جائزے سے پہلے پندرہ صفحات کا ایک پیش لفظ بھی لکھا ہے اور اس میں تصوف اور مذہب کے فرق کو واضح کیا ہے نیز یہ بات بھی واضح کی ہے کہ چند چیزوں میں اشتراک کے باوجود مسلمانوں کا تصوف دوسرے تصوفوں

سے الگ بھی پہچانا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ فلسفیانہ تصوف کو پسند کرنے والے صوفیہ کے نزدیک مابہ الاشتراک کو اصل کی حیثیت حاصل ہے اور مذہبی مابہ الامتیاز کو وہ ثانوی درجہ دیتے ہیں اور یہیں سے علماء کے درمیان اختلاف و نزاع کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

ایک جگہ مذہب اور تصوف کے باہمی تعلق کی وضاحت کے لیے لکھا گیا ہے:۔

"سوال یہ ہے کہ وہ کون سے حالات ہیں جن کے زیر اثر کسی مذہب اور خاص کر توحیدی مذاہب میں تصوف نمودار ہوتا ہے؟ اکثر تصوف کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہر مذہب حقیقی معنوں میں تصوف ہے یا تصوف پر مبنی ہے۔ اگر تصوف سے مراد خدا سے بلا واسطہ تعلق کا احساس ہے تو ہر مذہب کی بنیاد اس اساس پر قائم ہے۔

جہاں خدا اور انسان کے درمیان جذبۂ اتحاد اور محبت موجود نہیں۔ مذہب محض چند بے جان رسوم کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم مذہب اور تصوف میں تمیز کرتے اور کر سکتے ہیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کی زندگی کے حالات بائبل اور قرآن میں تفصیل سے مذکور ہیں اور ان کے تجربات اور خدا سے تعلق کی نوعیت اس تعریف کے مطابق تصوف کے دائرے میں آتی ہے لیکن کوئی بھی انہیں صوفی نہیں کہتا۔ وجہ یہ ہے کہ صحیح مذہب انسان کے تمام داعیات کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے اس میں جہاں عقل و دانش کے سرچشموں کو کبھی خشک نہیں ہونے دیا جاتا وہاں جذبات و عمل کے داعیات کی تسکین کا سامان بھی موجود ہوتا۔ اگر حضرت موسیٰ (اور حضرت ابراہیم) کی زندگی میں جذبۂ محبت و الفت اس مادی دنیا کے تمام پردوں کو یک قلم ہٹا کر جمال حیات آفریں کا متمنی نظر آتا ہے تو وہیں یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ ان کا فہم ذات خداوندی بھی اتنا ہی گہرا، ہمہ گیر اور واضح ہے جس میں ریب و شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ پھر اس جذبۂ الفت اور فہم مستقیم کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی سراپا عمل و حرکت نظر آتی ہے، گویا وہ داخلیت اور خارجیت دونوں کے علمبردار ہیں۔ مذہب کے مقابلے پر تصوف کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی صرف جذباتی اور داخلی زندگی کے پہلو پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے اور اسی کو اجاگر کرنے کو اپنا نصب العین قرار دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بلند پایہ صوفیہ میں اس داخلیت کے ساتھ فہم و دانش اور عمل و حرکت کے آثار بھی پائے جاتے ہیں لیکن یہ صرف مذہب کے اثرات کے باعث یا انسان کی

زندگی کے عام تقاضوں کا نتیجہ ہے۔ تصوف صرف جذباتیت اور داخلیت کا ہی نام ہے عام طور پر جب کہا جاتا ہے کہ فلاں مذہب میں تصوف کا کم یا زیادہ عنصر ہے تو درحقیقت یہ سوال ہی صحیح نہیں۔ ہر مذہب میں چونکہ زندگی کے جذباتی داعیات کی تسکین کا سامان موجود ہے اس لیے بظاہر نظر یہی آتا ہے کہ اس میں تصوف کے عناصر کارفرما ہیں حقیقت اس کے برعکس ہے، کوئی مذہب تصوف سے متاثر نہیں چونکہ تصوف تاریخی طور پر بعد کی پیداوار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تصوف مذاہب کے جذباتی عناصر کو ایک علیحدہ اور منفرد شکل دینے کی کوشش کا نام ہے۔" (صفحہ ۴۰۲)

یہ اقتباس مصنف کے گہرے مطالعہ کی دلیل ہے۔ ان کے خیال سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن آسانی سے اسے رد نہیں کیا جاسکتا۔

الفخری مترجمہ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری۔ صفحات ۴۱۶ مجلد مع گرد پوش قیمت پانچ روپے چار آنے۔
ناشر:۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور۔ پاکستان۔

یہ کتاب ساتویں صدی ہجری کے مورخ محمد بن علی بن طباطبا (جو ابن طقطقی کے نام سے مشہور ہے) کی تاریخ الفخری فی الاداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ کا ترجمہ ہے۔ اس کے فاضل مترجم ہند و پاک کے اہل علم و اہل تصوف کے درمیان ایک معروف و مشہور شخصیت ہیں۔ انھوں نے اس قدیم تاریخ کا ترجمہ کرکے اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے اس کو شائع کرکے ایک علمی خدمت انجام دی ہے۔ فاضل مترجم نے دیباچے میں اس تاریخ کی حیثیت اور اس کی خصوصیات پر گفتگو کی ہے اور اس کے ایک انگریزی ترجمے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس انگریزی ترجمے کی چند فاحش غلطیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ تبصرہ نگار کے پاس اصل کتاب موجود نہیں ہے ویسے مترجم کے علم پر بھروسہ کرکے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا ترجمہ درست ہی ہوگا۔ ترجمے کی زبان شستہ، شگفتہ اور رواں ہے۔

تبصرہ نگار کے نزدیک مصنف کا دیباچہ اور تاریخ کی فصل اول جو سلطانی امور اور فرماں روایانہ سیاست سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے۔ اس کتاب میں خلافت راشدہ سے لےکر خلافت بنی عباس کے خاتمے تک کے واقعات درج ہیں۔

فاضل مترجم نے اپنے دیباچے میں ابن خلدون پر ایک واقعے کے سلسلے میں تنقید فرمائی ہے لکھتے ہیں :

"ابن خلدون تاریخ کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں اور فی الواقع ہیں بھی لیکن وہ اپنے "مقدمے" میں جعفر و عباسہ کی داستان معاشقہ کے متعلق لکھتے ہیں :۔ نعوذ باللہ، عم رسول اللہ، عباس بن عبدالمطلب کے خاندان میں بھلا ایسا واقعہ ہو سکتا تھا؟"

ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ واقعہ ضرور صحیح تھا، ہو سکتا ہے کہ فی الواقع غلط ہو اور محض اتہام ہو لیکن اس کے غلط ہونے کی یہ کیا دلیل ہوئی کہ بھلا آل عباس میں ایسا واقعہ ہو سکتا ہے؟" کیوں نہیں ہو سکتا؟ دنیا بھر کی حرکات شنیعہ ہو سکتی ہیں اور یہ معمولی و فطری واقعہ نہیں ہو سکتا؟ تردید دوسری عقلی شہادتوں سے ہونی چاہیے نہ کہ جذباتی و عصبیاتی دلیل سے "

تبصرہ نگار یہ نہیں کہتا کہ ابن خلدون تعصب سے پاک تھے لیکن اس معاملے میں ان پر فاضل مترجم کی تنقید صحیح نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن خلدون نے اس واقعے کی تردید میں صرف وہی جملہ نہیں لکھا ہے جس کا اظہار یہاں مترجم نے کیا ہے بلکہ بہت سی خالص عقلی شہادتیں اس نے جمع کی ہیں، نیز یہ کہ اصول درایت کے خلاف جو چند تاریخی واقعات کی مثالیں اس نے پیش کی ہیں ان میں سے ایک یہ واقعہ بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابن خلدون نے اصولِ درایت کے لحاظ سے اس کو غلط قرار دیا ہے نہ کہ جذباتی و عصبیاتی دلیل سے۔ افسوس ہے کہ مختصر تبصرے میں ابن خلدون کے پورے بیان کا تجزیہ پیش نہیں کیا جا سکتا اس لیے میں یہاں صرف اسی زیر تبصرہ کتاب سے وہ ایک الزام نقل کرتا ہوں جو برامکہ کی تباہی کے سلسلے میں ہارون الرشید پر لگایا جاتا ہے۔ ابن طقطقی لکھتے ہیں :۔

"سیر و تاریخ والوں کا زوال برامکہ کے اسباب میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ رشید کو نہ اپنی بہن عباسہ کے بغیر چین آتا تھا، نہ جعفر بن یحییٰ کے بغیر۔ اس لیے رشید نے کہا کہ: "میں تمہارا عباسہ سے نکاح کر دیتا ہوں تاکہ تمہارے لیے اس کا دیکھنا جائز ہو جائے مگر اس سے جنسی تعلق قائم نہ کرو۔" یہ دونوں جوان تھے اور جب یک جا ہوتے تو رشید وہاں سے ان دونوں کو تنہائی میں چھوڑ کر اٹھ جاتا آخر ایک دن جعفر نے عباسہ سے جنسی تعلق قائم کر ہی لیا۔ عباسہ حاملہ ہو گئی۔ اس طرح اس نے دو بچے جنے مگر انہیں پوشیدہ رکھا آخر رشید کو علم ہو گیا۔ گویا یہ سبب ہوا برامکہ کا " ص ۲۵۳

فاضل مترجم نے یہاں بھی فٹ نوٹ میں ابن خلدون پر تنقید کی ہے۔ اب ناظرین خود فیصلہ کریں

کیا اس واقعہ کو عقلِ سلیم تسلیم کرتی ہے؟ اس واقعے کو صحیح تسلیم کرنے کے لیے کئی باتوں کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ (۱) ہارون رشید دینی مسائل سے بالکل ناواقف تھا۔ (۲) بے غیرت تھا۔ (۳) وہ جعفر و عباسہ کو فرشتہ سمجھتا تھا۔ (۴) انتہائی احمق تھا۔ (۵) اپنے گھر بلکہ اپنی اس بہن کے حالات سے بھی بالکل بے خبر تھا جس کے بغیر اس کو چین نہ آتا تھا اور اسی لیے اس نے عجیب و غریب نکاح کی احمقانہ حرکت کی تھی — حالانکہ تاریخ ان میں سے ہر بات کی تردید کرتی ہے۔ اگر اس طرح کے واقعات میں صرف امکان کو کافی سمجھ لیا جائے تو پھر کس کی عزت محفوظ رہ سکتی ہے؟ (ع۔ق)

فہرست مندرجات ماہنامہ "زندگی"

از جولائی ۱۹۶۳ء تا دسمبر ۱۹۶۳ء

اشارات

ارشادات رسول ؐ

مقالات

نمبر شمار	لکھنے والے	عنوانات	جلد	شمارہ	مہینہ
۲	مولانا ابو اللیث ندوی اصلاحی	خطبۂ افتتاحیہ (مسلم پرسنل لاکنونشن)	۳۱	۳	ستمبر ۶۳ء
۳	جناب افضل حسین صاحب ایم اے	طریقۂ تعلیم	۳۱	۴	اکتوبر ۶۳ء
۴	مولانا جلال الدین عمری	خدا کیا چاہتا ہے	۳۱	۲	اگست ۶۳ء
		خدا کا آخری رسول	〃	۴	اکتوبر ۶۳ء
		〃	〃	۵	نومبر ۶۳ء
		〃	〃	۶	دسمبر ۶۳ء
۵	مولانا حامد علی شاہجہاں پوری	کارکنان تحریک اسلامی کے لیے لمحۂ فکریہ	۳۱	۲	اگست ۶۳ء
۶	مولانا سلیمان فرخ آبادی	فوز و فلاح اور قرآن کریم	۳۱	۵	نومبر ۶۳ء
		〃	〃	۶	دسمبر ۶۳ء
۷	مولانا صدر الدین اصلاحی	روح القرآن	۳۱	۵	نومبر ۶۳ء
۸	جناب عبد الباری ایم اے	بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ اور اسلام (آخری قسط)	۳۱	۱	جولائی ۶۳ء
۹	جناب عبد الحق انصاری ایم اے	اسلامی اخلاقیات کی دینی بنیادیں	۳۱	۶	دسمبر ۶۳ء
۱۰	جناب وحید الدین خاں صاحب	الحاد یا خدا پرستی	۳۱	۱	جولائی ۶۳ء
۱۱	مولانا محمد یوسف اصلاحی	قرآنی تعلیمات	۳۱	۳	ستمبر ۶۳ء
	〃	〃	〃	۴	اکتوبر ۶۳ء
	〃	〃	〃	۵	نومبر ۶۳ء
	〃	〃	〃	۶	دسمبر ۶۳ء
		تراجم و اقتباسات			
۱	ادارہ	اشتراکی الحاد اور اس کے اثرات (محمد عبد اللہ العربی کے مقالے کا ترجمہ)	۳۱	۱	جولائی ۶۳ء
		〃	〃	۲	اگست ۶۳ء
		تقویت دین و ملت سے اونچا کوئی کام نہیں (شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے ایک مکتوب کا ترجمہ)	〃	۳	ستمبر ۶۳ء
		ایک الزام کا جواب — مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے دو خطوط کا اقتباس	〃	۵	نومبر ۶۳ء
		اخبار و افکار			
۱	ادارہ	۱- پاکستان دینی نقطۂ نظر سے ۲- مشرقی پاکستان کا طوفان — عائلی قوانین	۳۱	۱	جولائی ۶۳ء اگست ۶۳ء
		رسائل و مسائل			
۱	سید احمد قادری	لونڈیوں سے فائدہ اٹھانے کا مطلب کیا ہے	۳۱	۳	ستمبر ۶۳ء
		بینک کا سود — پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ کا مسئلہ	〃	۴	اکتوبر ۶۳ء
		مجبوری کی توضیح — معمہ بازی کا کاروبار	〃	۵	نومبر ۶۳ء
۲	مولانا صدر الدین اصلاحی	امرنا مترفیہا ففسقوا کی صحیح تاویل — اسلامی حکومت کے قیام کی جد و جہد	〃	۲	اگست ۶۳ء
		روداد مجلس شوریٰ			
۱	قیم جماعت اسلامی ہند	روداد مجلس شوریٰ منعقدہ ستمبر ۶۳ء	۳۱	۵	نومبر ۶۳ء

ماہ نامہ

زندگی رامپور

جلد: ۳۲ — رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ
شمارہ: ۲ — فروری ۱۹۶۴ء

مدیر: سید احمد قادری

- خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور۔ یوپی
- زر سالانہ: — تین روپے۔ فی پرچہ: — پچاس نئے پیسے
- ممالک غیر سے: — دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱۲/ج شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

ناشر: جماعت اسلامی ہند۔ اڈیٹر: سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر: ساجد حسن۔ مطبع: دہلی پرنٹنگ ورکس [illegible]
مقام اشاعت: دفتر زندگی، رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سید احمد قادری

وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہیں جو رمضان المبارک کی رحمتوں، برکتوں اور نعمتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ یہ مہینہ، اللہ رب العلمین کی رحمتوں کا ایک ایسا گل کدہ ہے جس میں ہزار طرح کے خوش رنگ و خوشبو پھول کھلتے ہیں اور ان کی فراوانی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وسیع سے وسیع دامن بھی تنگ ہو جاتا ہے۔ آخر بندے کے دامنِ تنگ اور آقا کی رحمت بے کراں میں کوئی حسابی نسبت، کب ممکن ہے کہ کوئی شخص اسے بتا سکے، لینے والا جس قدر لینا چاہے، لے لے، دینے والے کے خزانے میں کمی کا کوئی سوال نہیں، شرط صرف یہ ہے کہ لینے والا اپنے آپ کو مالک کی نگاہ میں مستحق ثابت کر دکھائے۔

یہ جس لین، دین کا ذکر ہے وہ دنیوی بیوپار نہیں، اخروی کاروبار ہے۔ دنیوی خرید و فروخت نہیں، اخروی تجارت ہے، یہ تجارت کی وہ قسم ہے جس کے بارے میں قرآن نے کہا ہے۔ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ (میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتاتا ہوں جو تمہیں عذاب الیم سے نجات بخشے گی) اور جس کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: يَرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ (وہ ایسے بیوپار کے امیدوار ہیں جس میں کوئی خسارہ نہیں)

ہر عبادت کے حقیقی اور کامیاب عبادت بننے کے لیے پہلی ضروری چیز حسن نیت ہے۔ مالک روزِ جزا کی نگاہ سب سے پہلے اپنے بندے کی اس قلبی کیفیت اور اس نیت پر پڑتی ہے جس نے اسے کسی عبادت پر ابھارا ہے۔ دوسری چیز صحت عبادت ہے۔ خدا یہ دیکھتا ہے کہ بندے نے عبادت اس طرح کی یا نہیں جس کا طریقہ اس نے اپنے رسول کے واسطے سے سکھایا ہے۔ من مانی عبادت،

خدا کی نگاہ میں دو کوڑی کا مول بھی نہیں رکھتی۔ تیسری چیز روحِ عبادت ہے۔ عبادت جاندار بھی ہوتی ہے اور بے جان بھی۔ ہر عبادت کا ایک مخصوص اثر اور اس کی ایک مخصوص روح ہوتی ہے۔ اگر جسمِ عبادت میں وہ روح نہ دوڑ رہی ہو تو دیکھنے میں وہ عبادت ہوگی لیکن حقیقت میں ایک بے اثر اور بے روح ڈھانچہ ہوگا۔ اور چوتھی چیز غایتِ عبادت ہے۔ اللہ نے جس غرض و غایت سے جو عبادت فرض کی ہے اگر وہ حاصل نہ ہو رہی ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بندے نے اس کی حدود و شروط کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔

عبادتِ صوم جس غرض سے فرض کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ روزے رکھنے والے بندگانِ خدا متقی بن جائیں۔ اللہ کے اوامر کی تعمیل اور اس کے نواہی سے اجتناب، ان کی عادت، خصلت اور صنعت بن جائے۔ ان کے اندر ضبطِ نفس اور صبر کی قوت اتنی ترقی کر جائے کہ ارتکابِ معصیت ایک سخت مشکل کام بن جائے۔ اس غرض و غایت کو سامنے رکھ کر ہمیں آپ کو اور ہر روزہ دار کو اپنا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر ہم میں تقویٰ کی یہ صفت پیدا نہیں ہوئی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارے روزے ناقص ہیں۔ پھر سوچنا چاہیے کہ نقص کو دور کرنے کی تدبیر کیا ہے؟ اس کی تدبیر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہم اپنے احتساب کو سخت کر دیں۔ فریضۂ صوم کی غرض و غایت کو سامنے رکھیں، اپنے شعور کو بیدار کریں، روزوں کو مکمل کرنے والی عبادتوں کو، دل کی پوری رغبت اور شوق کے ساتھ ادا کریں۔ انہیں خراب کرنے والی چیزوں سے بالکلیہ پرہیز کریں اور ساتھ ہی ساتھ خدا سے دعا کرتے رہیں کہ وہ ادائے عبادت میں ہماری مدد فرمائے اور ہمیں کامیاب کرے۔

عبادت کوئی بھی ہو حقیقت یہ ہے کہ جب تک معبود کی محبت اور اسے راضی کر لینے کی لگن پیدا نہ ہو، اس کے فوائد حاصل نہیں ہوتے، نہ اس میں جان آتی ہے اور نہ لذت، وہ ایک بے کیف رسم بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی بات ہے جسے اقبال نے یوں کہا ہے:

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق　　　کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

"یہ جذبِ اندروں" وہ چیز ہے جو عبادت کو عبادت بناتی ہے۔ یہ باقی نہ رہے یا پیدا ہی نہ ہو سکے تو مقصدِ عبادت فوت ہو جاتا ہے۔ نمازوں میں حضورِ قلب اور خشوع نصیب نہیں ہوتا، ادائے زکوٰۃ سے مال کی محبت کم نہیں ہوتی، روزوں سے تقویٰ پیدا نہیں ہوتا اور حج سے خدا کی محبت میں اضافہ نہیں ہوتا۔

ہم نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں، صاحب نصاب ہوں تو زکوٰۃ بھی دیتے ہیں اور حج بھی کرتے ہیں لیکن جس چیز کو حدیثوں میں "حلاوتِ ایمان" کہا گیا ہے وہ بہت کم نصیب ہوتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "جذبِ اندروں" کیسے پیدا ہو، اور اگر قدرے قلیل موجود ہو تو کیسے باقی رہے اور کس طرح ترقی کرے۔ اس سوال کے جواب میں متعدد تدبیریں بتائی جاتی ہیں اور یقیناً مفید بھی ہیں لیکن تمام تدبیروں کی افادیت موقوف ہے دو چیزوں پر تذکّر اور تفکّر، وہ تذکّر و تفکّر جن کی تاکید قرآن کرتا ہے اور جن کی عملی تفصیل حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفائے راشدین کی سیرتوں میں ملتی ہے ـــــ رمضان کا مبارک مہینہ، روزوں کا مہینہ تو ہے ہی۔ یہ نمازوں کی کثرت اور تلاوت واستماعِ قرآن کی کثرت کا مہینہ بھی ہے۔ ہمیں اور آپ کو یہ غور کرنا چاہیے کہ قرآن کہاں کہاں اور کس کس انداز میں تذکر و تفکر کی دعوت دیتا ہے۔ انہیں نوٹ کیجیے، سمجھیے اور ان پر غور کیجیے، ذہن میں اسے جمائیے اور پھر عملاً تذکر و تفکر کر کے دیکھیے۔ سوچیے کہ اقامتِ دین کو نصب العین تسلیم کر لینے اور عملاً غلبۂ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد میں لگ جانے کے بعد بھی کیا ہمیں "جذبِ اندروں" کی دولتِ بے بہا حاصل ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیوں اور حاصل ہے تو کس درجے میں؟

"ارشاداتِ رسول" کے تحت آگے کے صفحات میں جو حدیثیں آپ پڑھیں گے وہ ایک تربیتی اجتماع کے لیے منتخب کی گئی اور اس میں سنائی گئی تھیں۔ مناسب معلوم ہوا کہ اس مبارک مہینے میں انہیں شائع کیا جائے تاکہ ہم خود اور قارئین زندگی اس سے استفادہ کر سکیں۔ ان صفحات کو اس مہینے کے اشارات کا جزو سمجھنا چاہیے۔

تین چیزیں ہیں جن سے حلاوتِ ایمان نصیب ہوتی ہے۔

(۱) اللہ و رسول ہر ما سویٰ سے زیادہ محبوب ہوں۔

(۲) اللہ کے جس بندے سے بھی محبت ہو اللہ کے لیے ہو۔

(۳) کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اس کی طرف پلٹنا ایسا ناگوار ہو جیسا آگ میں ڈال دیا جانا۔

اسلامی تعلیمات کے سات نکات

(سید احمد قادری)

حسنِ نیت اور اخلاص فی العمل

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: - اللہ تمہارے جسموں اور صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔

(ریاض الصالحین بحوالہ مسلم)

اس حدیث میں جو بات بتائی گئی اور تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی نگاہ میں کسی شخص اور اس کے عمل کی مقبولیت و نامقبولیت کا دارومدار اس کے ظاہر پر نہیں بلکہ اس باطنی کیفیت اور نیت پر ہے جو قلب میں چھپی ہوئی ہے۔ نیت اور اخلاص کا محل چونکہ قلب ہے اس لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تمہارے جسموں اور صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ تمہارے عمل کا محرک کیا ہے اور تم نے جو کام انجام دیا ہے اس میں تمہاری نیت کیا ہے اور اس سے مقصد کیا ہے۔ اگر تمہارے عمل کا محرک، رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اگر تمہاری نیت یہ ہے کہ خدا اس کام سے خوش ہو اور اگر تمہارا مقصد یہ ہے کہ آخرت میں تمہیں سرخ روئی اور کامیابی نصیب ہو تو بے شک تمہارا عمل مقبول عنداللہ مستحق اجر و ثواب ہے اور اگر تم اپنے عمل سے صرف دنیا کی کوئی غرض حاصل کرنا چاہتے ہو، رضائے الٰہی اور اطاعت امر تمہارے عمل کا محرک نہیں ہے۔ آخرت کی عظیم کامیابی تمہارا مقصد نہیں ہے تو تمہارا عمل نامقبول، بے وزن اور لائق وزر و عتاب ہے۔

پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی واضح کی گئی ہے کہ خدا کی بارگاہ میں تمہاری مقبولیت و محبوبیت کا مدار تمہارے جسم اور تمہاری صورت پر نہیں ہے بلکہ تمہارے قلب پر ہے۔ اگر تمہاری صورت بڑی حسین و جمیل، تمہارا جسم بہت قوی و توانا اور تمہارا رنگ بغایت سرخ و سفید ہو لیکن تمہارا دل کالا میلا اور گندہ

ہو' برے عقائد وخیالات اور برے جذبات سے بھرا ہوا ہو تو تم خدا کی نگاہ کرم کے نہیں' اس کی نگاہ غضب کے مستحق ہو' اس کی رحمت سے دور اور اس کی بارگاہ سے مردود ہو اور اگر تمہاری صورت قبیح تمہارا جسم کمزور اور تمہارا رنگ سیاہ ہو' لیکن تمہارا دل روشن صاف اور پاکیزہ ہو' اچھے عقائد وخیالات اور اچھے جذبات سے مملو ہو تو تم خدا کی نگاہ کرم کے مستحق' اس کی رحمت سے قریب اور اس کی بارگاہ میں مقبول ہو' ابولہب' اپنے سرخ گالوں اور سفید رنگ کے، باوجود خدا کی نگاہ میں مبغوض ہے اور بلال اپنے کالے رنگ کے ساتھ خدا کے محبوب ہیں۔ جسم کی قوت' چہرے کا جمال اور رنگ روغن کا حسن' ایمان وتقویٰ کے ساتھ بے شک خدا کی ایک نعمت اور قابل تحسین وتعریف ہے لیکن ایمان وتقویٰ کے بغیر خدا کی نگاہ میں اس کی قیمت ایک کوڑی بھی نہیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: کوئی شخص اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ہے اور کوئی قومی وخاندانی حمیت کے جوش میں نبرد آزما ہوتا ہے اور کوئی دکھاوے کے لیے جنگ کرتا ہے' ان میں سے کس شخص کی جنگ فی سبیل اللہ شمار ہوگی؟ آپ نے فرمایا۔ "جو شخص اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے لڑتا ہے صرف اسی کی جنگ فی سبیل اللہ شمار ہوگی"

(بخاری ومسلم)

اوپر کی حدیث میں جو بات ایک قاعدۂ کلیہ کے طور پر کہی گئی ہے۔ اس حدیث نے اس کو ایک مثال سے واضح کر دیا ہے۔ اللہ کے راستے میں جہاد وقتال انسانی اعمال خیر میں بہت بڑا عمل خیر ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اسے حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ انجام دیا جائے۔ اگر اس جنگ کا محرک یہ ہے کہ اللہ کا دین غالب اور سربلند ہو تو بے شک یہ قتال' قتال فی سبیل اللہ ہے' راہ خدا کی جنگ ہے لیکن اگر محرک یہ نہیں ہے' بلکہ لڑنے والے کے دل میں کوئی دوسری نیت' کوئی دوسرا ارادہ اور کوئی دوسرا مقصد چھپا ہوا ہو تو اس کی جنگ فی سبیل اللہ شمار نہ ہوگی' دوسرے مقاصد ومحرکات میں سے بطور مثال تین چیزوں کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے۔ جو شخص نام ونمود کے لیے جنگ کرتا ہے یا قومی اور خاندانی حمیت کے جوش میں لڑتا ہے وہ در اصل اپنا اجر انہیں لوگوں سے حاصل کرنا چاہتا ہے جن کی خوشنودی کے لیے وہ لڑا' اس کا مقصود رضائے الٰہی اور ثواب آخرت کا حصول نہیں' اس لیے وہ اللہ کے یہاں کسی اجر کا مستحق نہیں ہے وہ ناشکری اور کفرانِ نعمت کا مجرم اور اللہ کے غضب کا مستحق ہے۔ چنانچہ ایسے شخص کا

عبرت ناک انجام صحیح احادیث میں مذکور ہے۔ جو لوگ اقامت دین اور کلمۃ اللہ کو بلند کرنے کی جدوجہد میں شریک ہیں انہیں خصوصیت کے ساتھ اس حدیث کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

ایک بات اور جو اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کی نیت اور رضائے الٰہی و ثواب آخرت کے حصول کی نیت میں فرق نہیں ہے دونوں حکماً ایک ہیں لہٰذا تمام کام جو اللہ و رسول کے احکام کی تعمیل کی نیت سے کیے جائیں حسن نیت اور اخلاص فی العمل کے تحت داخل ہیں کیونکہ محض امر الٰہی کی تعمیل کی نیت سے جو کام کیے جاتے ہیں ان کی غرض یہی ہوتی ہے کہ اللہ راضی ہو۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ سے پہلے کسی امت میں جو نبی بھی مبعوث ہوا اس کی امت میں اس کے کچھ مخصوص اعوان و انصار اور اصحاب ہوتے جو اس کی روش اختیار کرتے اور اس کے احکام کی پیروی کرتے پھر ایسا ہوتا ہے کہ ان کے بعد ناخلف لوگ ان کے جانشیں ہوتے ہیں، وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں اور ایسے کام کرتے ہیں جن کا انہیں حکم نہیں، تو جس شخص نے ان لوگوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے اپنے دل سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور اس کے بعد ایمان، ایک رائی کے دانے کے برابر بھی باقی نہیں رہتا۔ (مسلم)

اس حدیث سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی اس مشہور حدیث کی توضیح ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم میں سے جو شخص کسی منکر (برائی) کو دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دینا چاہیے اور اگر اس کی قدرت نہ ہو تو اپنی زبان سے اور اگر اس کی قدرت بھی نہ ہو تو اپنے دل سے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔ اوپر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی جس حدیث کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے اس سے کئی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جہاد اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ دوسری یہ کہ صرف کفار و مشرکین ہی سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اپنی قوم و ملت کے ان افراد سے بھی جہاد کا حکم دیا گیا ہے جو اپنے قول و عمل سے خرابیاں پھیلا رہے ہوں، بدعتیں ایجاد کر رہے ہوں، جن کے قول و فعل میں تضاد پیدا ہو گیا ہو اور جن کا وجود دین و ملت کے ضعف کا سبب بن گیا ہو اور واقعہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے جہاد بسا اوقات کفار و مشرکین کے ساتھ جہاد سے بھی زیادہ

اور کٹھن ہوتا ہے۔
تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی حیثیت نفلی واستحبابی طور پر محض [illegible]جی کی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ایمان کی سلامتی و عدم سلامتی سے ہے۔ یہ ایک ایسا فرض و واجب ہے [illegible] ادا نہ کیا جائے تو انسان کا ایمان ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس حدیث اور دوسری صحیح احادیث [illegible]صراحت یہ بات بتا دی گئی ہے کہ اگر کسی مومن کے دل سے بدعت و معصیت کی کراہت و نفرت [illegible]اس کو مٹانے اور مٹانے کا جذبہ بھی نکل جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے دل سے ایمان نکل گیا' [illegible]یمان کے سلامت رہنے کی یہ کم سے کم شرط ہے۔
جو لوگ کفر و شرک اور بدعت و معصیت کے خلاف جہاد کو محض استحبابی و نفلی حکم سمجھتے ہیں انہیں [illegible]اس حدیث پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے۔

حضرت نعمان بن بشیر رض کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حدود اللہ کو قائم و نافذ کرنے والے اور معصیتوں کا ارتکاب کرنے والے کی مثال اس گروہ جیسی ہے جس نے ایک کشتی میں سفر کرنے کے لیے قرعہ اندازی کی۔ کچھ لوگوں کو اوپر کا درجہ ملا اور کچھ لوگوں کو نیچے کا' نیچے کے لوگ اوپر پانی کے لیے جاتے' ان کے آنے جانے سے اوپر والوں کو تکلیف پہنچی' نیچے قیام کرنے والوں میں سے ایک شخص نے ارادہ کیا کہ کلہاڑی سے کشتی کے تختے کو پھاڑ کر پانی حاصل کرے۔ یہ سن کر اوپر والے نیچے آئے اور انہوں نے کہا' تو کیا کرنا چاہتا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ہمارے اوپر جا کر پانی لانے سے تم لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے اور ہمارے لیے پانی حاصل کرنا ضروری ہے۔ تو اگر اوپر والوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو اسے بھی نجات دی اور خود بھی نجات پائی اور اگر اس کو چھوڑ دیا تو اسے بھی ہلاک کیا اور خود بھی ہلاک ہوئے۔

یہ حدیث امام بخاری نے کتاب الشرکۃ اور کتاب الشہادات میں روایت کی ہے اور امام ترمذی [illegible]کتاب الفتن میں' ترمذی کی روایت میں کچھ اور وضاحت ہے اس لیے اس کا ترجمہ بھی پیش کر رہا ہوں

نعمان بن بشیر رض نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ منہیات و معاصی سے منع کرنے والے اور اس میں مداہنت کرنے والے کی مثال یوں سمجھو جیسے ایک جماعت ہے جس نے کشتی میں قیام کرنے کے لیے قرعہ اندازی کی بعضوں نے اوپر کا درجہ پایا اور بعضوں نے نیچے کا (باقی صفحہ [illegible] پر ملاحظہ

پیغمبروں کی دعوت

مولانا سید جلال الدین عمری

ہم مسلمان ہیں. ہمیں وہ کام انجام دینا ہے جو کام خدا کے پیغمبر مختلف زمانوں میں انجام دیتے رہے ہیں. یہ بہت ہی مشکل اور کٹھن کام ہے لیکن ہم نے اپنے رب سے عہد کیا ہے کہ زندگی کی آخری سانس تک اسے کرتے رہیں گے۔

خدا کے پیغمبروں کی مثال اس دنیا میں بہتے ہوئے چشمے کی ہے، جس سے ہزاروں اور لاکھوں انسان سیراب ہوتے ہیں. انسانیت کی کھیتی جب بھی سرسبز و شاداب ہوئی ہے ان ہی سے ہوئی ہے۔ وہ نہ پیدا ہوتے تو انسانیت جل کر راکھ ہو جاتی۔ دنیا ان کو کچھ دیتی نہیں بلکہ ان سے پاتی ہے۔ آپ مادی لحاظ سے دیکھیں تو ان کا وجود اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کے لیے ہوتا ہے۔ وہ کسی سے کچھ وصول کرنے نہیں آتے بلکہ سب پر احسان کرنے آتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ وہ اپنا سب کچھ لٹانے کے باوجود قلبی راحت اور سکون محسوس کرتے ہیں، ان کو اطمینان ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی قوتوں کو ضائع نہیں کیا بلکہ انہیں صحیح جگہ میں صرف کیا ہے۔ یہ وہ حقیقی انعام ہے جو انہیں اپنی خدمات کے صلے میں یہاں ملتا ہے۔

عام طور پر جو لوگ انسانیت کے خیر خواہ سمجھے جاتے ہیں اور جن کے پیچھے چلنے میں دنیا فخر محسوس کرتی ہے، وہ کسی نہ کسی عنوان سے انسان کی دنیاوی کامیابی چاہتے ہیں. ان میں سے کسی کے سامنے معاشی اسکیم ہے، کوئی تعلیمی منصوبہ رکھتا ہے، کوئی آزادی کی تحریک کا حامل ہے. کسی کو سائنس کی ترقی کی فکر ہے اور کوئی تمدن و معاشرت میں انقلاب لانا چاہتا ہے لیکن خدا کے رسول اس نوع کی کوئی تحریک اور منصوبے کر نہیں اٹھتے، بلکہ وہ اس لیے آتے ہیں تاکہ انسانوں کو ان کے رب کا پیغام پہنچائیں اور انہیں اس حقیقت سے آگاہ کریں کہ وہ سب کے سب خدا کے بندے اور اس کے غلام

دیں اور انہیں اپنے تمام معاملات میں خدا کی بندگی کرنی چاہیے۔ اس پیغام کو جو شخص قبول کرتا ہے وہ خدا کی نعمتوں کا مستحق ہوتا ہے اور جو اسے رد کر دیتا ہے وہ خدا کی رحمتوں سے دور ہو جاتا ہے۔ خدا کے پیغمبروں کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کے اعتراف سے بھی ہم اور آپ عاجز ہیں۔

انسان کا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یہاں معاشی توازن قائم ہو جائے یا تعلیم اس قدر پھیل جائے کہ ہر شخص پڑھ لکھ سکے، یا صنعت و حرفت اتنی ترقی کر جائے کہ ضرورت کی تمام چیزیں بآسانی دستیاب ہونے لگیں یا غربت و افلاس ختم ہو اور کوئی شخص کسی کا محتاج اور دست نگر نہ رہے۔ میرا یہ دعویٰ آپ کے لیے یقیناً حیرت انگیز ہوگا اور کچھ بعید نہیں کہ آپ اسے میری جہالت اور ناواقفیت پر محمول کریں۔ کیونکہ دنیا ہمیشہ ان ہی مسائل کو انسان کے بنیادی مسائل سمجھتی رہی ہے اور آج بھی ان ہی مسائل کو سب سے زیادہ اہمیت دے رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں اور ایک بنیادی مسئلے کی شاخیں ہیں۔ جو لوگ ان شاخوں کی خراش تراش اور ان کے بنانے اور سنوارنے میں مصروف ہیں وہ بہت ہی سطحی اور معمولی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی نظر اس اصل پر نہیں ہے جہاں سے یہ شاخیں پھیلتی اور پوری زندگی پر چھا جاتی ہیں۔ اس اصل کی نشان دہی وہ چند افراد کرتے ہیں جن کو خدا کی طرف سے خاص بصیرت حاصل ہوتی ہے اور جو صحیح معنی میں دنیا کے قائد اور امام بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔

انسان کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے آغاز اور انجام سے بے خبر ہے۔ وہ اپنے اس خدا کو بھولا ہوا ہے جس نے اسے پیدا کیا اور جس کی طرف اسے پلٹ کر جانا ہے۔ وہ خدا کا بندہ ہے لیکن اپنے آپ کو ہر بندش سے آزاد سمجھتا ہے۔ وہ اس طرح کام کر رہا ہے گویا آخرت نہیں آنے والی ہے اور حساب کتاب نہیں ہونے والا ہے۔ خدا کی نافرمانی اس کے لیے ایک عذاب ہے لیکن وہ اپنے آپ کو اس عذاب سے قریب کر رہا ہے۔ اسے خدا کے غضب سے بچنا چاہیے، لیکن وہ اپنی بدعملیوں سے خدا کے غضب کو مسلسل دعوت دے رہا ہے۔ غرض یہ کہ اس نے خدا کے بارے میں انتہائی غلط رویہ اختیار کر رکھا ہے جو کہ اسے کسی بھی حال میں اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

دنیا و آخرت میں انسان کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ خدا کا بندہ بن جائے اور اس کی غلامی قبول کر لے۔ اسی سے اس کی جد و جہد نتیجہ خیز ہوگی اور اس کے تمام الجھے ہوئے مسائل حل ہوں گے

خدا کو ماننا انسانی زندگی کے لیے صحیح ترین اساس فراہم کرتا ہے اور خدا کو نہ ماننا اس کی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس شخص کی قسمت میں نامرادی لکھ دی گئی ہے جو خدا کی اطاعت سے انحراف کرے اور اس کی پکڑ سے غافل ہو جائے۔ یہاں ظلم کا وجود اس لیے ہے کہ خدا اور آخرت پر انسان کا یقین نہیں ہے، یہاں سیاست اور معیشت میں بگاڑ اس لیے ہے کہ وہ خدا کے قانون سے آزاد ہے، یہاں غربت و افلاس اس لیے ہے کہ لوگوں کے اندر خدا کے بتلائے ہوئے اخلاق نہیں ہیں، یہاں تعلیم کے باوجود جہالت اس لیے عام ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی روشنی سے محروم ہے۔ اسی لیے خدا کے پیغمبر پوری قوت کے ساتھ ایک ہی بنیادی مسئلے کو چھیڑتے ہیں، وہ یہ کہ خدا کو مانو اور اس کی بندگی کرو۔

جب انسان کھلم کھلا خدا سے بغاوت کرتا ہے اور جب اپنے انجام سے اس کی غفلت حد سے بڑھ جاتی ہے تو وہ خدا کی زمین پر ایک بوجھ بن جاتا ہے اور اس قابل ہوتا ہے کہ اسے مٹا دیا جائے۔ لیکن خدا چاہتا ہے کہ اس کا عذاب آنے سے پہلے انسان آگاہ ہو جائے۔ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور اسے کدھر جانا چاہیے۔ اس کی بدکاریوں پر گرفت اس وقت ہو جب کہ اسے ان کے نتائج کا اچھی طرح علم ہو چکا ہو۔ اسی مقصد کے لیے وہ اپنے رسول بھیجتا ہے۔ خدا کے رسول انسان کی اس باغیانہ روش پر گہری تنقید کرتے ہیں۔ وہ اسے بتاتے ہیں کہ سرکشی اسے زیب نہیں دیتی، کیونکہ اس کے خدا نے اسے اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ وہ بہترین ترغیب و ترہیب کے ذریعے اسے خدا کی طرف بلاتے ہیں اور آخری حد تک کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے انجام سے واقف ہو جائے اور خدا کے عذاب سے بچنے کا سامان کرے۔ وہ اس کی نجات کے لیے اپنی زبردست قوتیں اور غیر معمولی صلاحیتیں صرف کر دیتے ہیں اور اسے خدا سے جوڑنے کی جو ممکن تدبیریں ہو سکتی ہیں ان سب کو کام میں لاتے ہیں، وہ اس کے سامنے مضبوط دلائل پیش کرتے ہیں تاکہ اسے اطمینان کی دولت نصیب ہو، وہ اس کی نفسیات سے اپیل کرتے ہیں تاکہ ان کی بات اس کے دل میں اتر جائے، وہ اس کے ضمیر کو جھنجوڑتے ہیں تاکہ اگر وہ موت کی نیند نہ سو چکا ہو تو بیدار ہو جائے، اور اسے تاریخ کی طرف متوجہ کرتے ہیں تاکہ وہ ماضی سے سبق حاصل کرے اور ان غلطیوں سے بچے جو اس سے پہلے ہو چکی ہیں۔ یہ صبر آزما کام ہے جسے خدا کے رسول ایک لمبی مدت تک انجام دیتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ حقیقت انسان پر پوری طرح کھول دیتے ہیں کہ نجات کی راہ صرف خدا کی غلامی میں ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ خدا کی

طرف سے پہنچ تو کل قیامت کے روز اس کا کوئی عذر نہ سنا جائے گا۔ یہ صرف اس کی اپنی بدبختی ہے کہ جگائے جانے کے باوجود وہ غفلت میں پڑا رہا کامیابی و ناکامی کی راہ اس پر کھل چکی لیکن اس نے ناکامی کو پسند کیا۔

خدا کا رسول جب اس طرح انسانوں پر حجت تمام کر دیتا ہے تو وہ کامیاب ہے۔ خواہ اس زمین پر وہ اکا و تنہا کام کرتے ہوئے خدا کے حضور پہنچ جائے اور کوئی ایک متنفس بھی اس کا ساتھ نہ دے حق اگر واضح ہو گیا ہے اور رسول پورے دلائل کے ساتھ انسانوں کو ان کے انجام کی اطلاع دے چکا ہے تو کسی کی باطل پرستی کے لیے کل خدا کے ہاں کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔ اب اگر لوگ رسول کی بات مان نہیں رہے ہیں تو یہ اس کی کوتاہی نہیں ہے بلکہ نہ ماننے والوں کی ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔ خدا کا رسول اپنے مولی سے صاف عرض کر دے گا خدایا میں نے ان کو تیری طرف بلانے میں اپنی ساری کوشش صرف کر دی لیکن ان کے دلوں کے دروازے نہیں کھلے۔ میں ان سے مایوس ہوں اب تو ان پر اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "رسولوں میں بعض ایسے بھی گزرے ہیں کہ ان کی قوم کے ایک فرد نے بھی ان کی تصدیق نہیں کی" کون کہہ سکتا ہے کہ ان رسولوں میں سے کوئی رسول ناکام رہا۔ ہمارا ایمان ہے کہ خدا کے نزدیک رسول کا مقام ہر اس شخص سے بلند ہے جو رسول نہیں ہے۔ اس نے خدا کی راہ میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں اور جد و جہد کا حق ادا کر دیا اس لیے خدا کی نعمتوں کا وہ سب سے زیادہ حق دار ہوگا خواہ دنیا کے کسی ایک فرد نے بھی اسے خدا کا رسول نہ مانا ہو۔

کسی داعی کی کامیابی و ناکامی کو جانچنے کے دو معیار ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس نے انسانیت کو اوپر اٹھانے کے لیے کیا نظریہ پیش کیا۔ یہ نظریہ جتنا بلند ہوگا اس کے پیش کرنے والے کا مقام بھی اتنا ہی بلند ہوگا کچھ لوگ انسانیت کی جزوی اصلاح چاہتے ہیں اور ان کی تگ و دو انسان کی چھوٹی چھوٹی بھلائیوں کے لیے ہوتی ہے۔ ان کے مقابلے میں کچھ دوسرے لوگ ہر پہلو سے انسانیت کی بھلائی کے طالب ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں قسم کے افراد نوع انسانی کے خیر خواہ ہیں لیکن دونوں کی حیثیتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پہلا گروہ اس "فوز عظیم" کا حق دار نہ ہوگا جس کا حقدار دوسرا گروہ ہے۔

دوسرا معیار جس سے داعی کی کامیابی و ناکامیابی کو جانچا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ اس کے پیغام اور

نظریے سے دنیا کو کتنا فائدہ پہنچا۔ اس نے جو چشمہ جاری کیا اس سے پیاس بجھانے والوں کی تعداد کیا تھی اور اس کے لگائے ہوئے درخت کے سایے میں کتنے مسافروں نے آرام کیا؟ لیکن یہ کامیابی و ناکامی کو جانچنے کا حقیقی معیار نہیں ہے۔ سچائی اس کی قطعاً محتاج نہیں ہے کہ کوئی اسے اپنائے۔ وہ فی نفسہ خوبی اور کمال ہے۔ اسی طرح سچائی کا علمبردار ایک اونچا انسان ہے۔ خواہ دنیا اس کی دعوت کو قبول کرے یا رد کردے۔ ہاں اگر کوئی شخص اس کی کوشش سے سچائی کو اختیار کرتا ہے تو یہ اس کی بڑائی کا ایک ظاہری ثبوت ہوگا اور اس کا اجر اسے خدا کے ہاں ملے گا۔

پھر یہ کہنا بتانا بھی بہت مشکل ہے کہ اس دنیا میں کس پیغام کے کیا نتائج نکلے؟ کیونکہ اس کے ناپنے کا ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ تاریخ میں ایسے کتنے افراد گزر چکے ہیں جنہوں نے صداقت، اخلاص، امانت، خدا ترسی اور تقوی و طہارت کی دعوت دی لیکن دنیا نے ان کی دعوت کو ٹھکرا دیا۔ اس کے باوجود یہ ان ہی کی دعوت کی زبردست تاثیر ہے کہ آج یہ تعلیمات ہماری انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں گھسی ہوئی ہیں، پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ناکام رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی جان دار دعوت اٹھتی ہے تو لازماً اپنے اثرات چھوڑ جاتی ہے بعض اوقات یہ اثرات ٹھوس اور مادی شکل میں ہمارے سامنے نہیں ہوتے لیکن وہ انسان کی رگوں میں خون بن کر اس طرح دوڑتے رہتے ہیں کہ اسے خبر تک نہیں ہوتی۔ وہ اس کے جذبات و احساسات میں شامل ہو جاتے ہیں اور وہ محسوس بھی نہیں کرنے پاتا۔

خدا کے پیغمبروں کے پاس انسانیت کے لیے بہت بڑا پیغام ہوتا ہے۔ ان کی کامیابی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اس پیغام کے داعی ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کی دعوت سے انحراف کرتا ہے تو خود ناکام ہے، وہ ناکام نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے پیغمبر کبھی اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے۔ وہ سب سے زیادہ کامیابی کے مستحق تھے اور سب سے زیادہ کامیاب رہے۔

کامیابی و ناکامی کی یہ بحث اس صورت میں پیدا ہوتی ہے جب کہ دنیا رسولوں کی دعوت کو عملاً رد کر دے لیکن اگر وہ ان کی دعوت کو رد نہیں کرتی بلکہ اس کی طرف جھکتی اور اسے قبول کرتی ہے تو وہ یہاں خدا کی حکومت قائم کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے باطل مٹتا اور حق ابھرتا ہے۔ اس وقت ان کی یہ دعوت محض تبلیغ و ارشاد ہی نہیں رہے گی بلکہ جیسے جیسے پھیلتی جائے گی اس کی ظاہری شکلیں بدلتی رہیں گی لیکن اس سے اس کی اصل حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ شروع میں بھی دعوت ہی ہوتی ہے اور آخر میں

کی دعوت ہی ہوتی ہے۔

اگر آپ کسی نظریے کے داعی ہیں اور وہ نظریہ محض خیالی فلسفہ نہیں ہے بلکہ اس کا عملی زندگی سے بھی تعلق ہے تو لازماً وہ بہت سے سوالات پیدا کرے گا۔ یہ سوالات نظری بھی ہوں گے اور عملی بھی ہوں گے۔ اس نظریے کے ماننے والے مطالبہ کریں گے کہ آپ اس کی عملی وضاحت کریں اور جن لوگوں نے ابھی اس نظریے کو قبول نہیں کیا ہے وہ اسے فکر و فلسفے کے میدان میں سمجھنا چاہیں گے۔ آپ کے لیے ضروری ہوگا کہ اس نظریے سے متعلق فکری و عملی دونوں طرح کے سوالات کا جواب دیں۔ اس وقت آپ اس نظریے کے شارح بن کر لوگوں کی فکری الجھنیں بھی رفع کریں گے، سیاست داں بن کر ان کے معاملات کو حل بھی کریں گے اور معمارِ تہذیب بن کر ایک نئی تہذیب کی تعمیر میں مصروف بھی ہوں گے، لیکن ان مختلف کاموں میں آپ کے داعی ہونے کی حیثیت ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ اور زیادہ مستحکم ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح خدا کو ماننا محض کوئی نظریاتی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک خاص فکر ہے جو پوری زندگی میں مخصوص طرزِ عمل کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر صرف خدا کی غلامی کے جذبات موجود ہوں، وہ اسی کو اپنا معبود سمجھے اور اپنے احساساتِ عبودیت کو اسی کے لیے مخصوص کر دے، اسی کو اپنا حاکمِ برحق مانے اور زندگی کے ہر معاملے میں اس کے حکم کے سامنے اس طرح جھک جائے کہ اس کے اخلاق و عادات، اس کی سیاست و معاشرت، اس کا علم و فن، غرض اس کا ہر کام خدا کی مرضی کا پابند ہو جائے۔

اسی فکر کی طرف خدا کا ہر ایک رسول دنیا کو دعوت دیتا ہے۔ یہ ایک بہت ہی وسیع اور مختلف الاطراف کام ہے۔ اس کا آغاز 'تبلیغ' سے ہوتا ہے اور پھر یہ پھیل کر کئی کاموں کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ خدا کا رسول پہلے دلائل کے ذریعہ انسانوں کو خدا کی طرف بلاتا اور انہیں ان کے انجام سے باخبر کرتا ہے۔ اس کی یہ دعوت جب وسعت اختیار کرتی ہے تو اس کے سامنے بے شمار سوالات کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے ماننے والوں کی تہذیب، معاشرت، اخلاق اور معاملات میں کون سی چیز اس دعوت سے مطابقت رکھتی ہے اور کون سی چیز اس سے ٹکرا رہی ہے، ان کے لیے زندگی کا کون سا نقشہ صحیح ہے اور کون سا نقشہ غلط ہے؟ جو لوگ اس دعوت کو مان رہے ہیں ان کے ساتھ وہ کیا معاملہ کرے اور جو اس کے مخالفین ہیں وہ کس برتاؤ کے مستحق ہیں؟ صلح کے کیا اصول ہیں اور جنگ کن بنیادوں پر ہو؟ خدا کا رسول ان سوالات

سے صرف نظر نہیں کرتا بلکہ ان کا اطمینان بخش جواب دیتا ہے۔ اس وقت اس کی دعوت میں اخلاق و معاشرت
کی تعلیم بھی ہوتی ہے، لین دین کے اصول بھی ہوتے ہیں، حدود و تعزیرات کی تفصیل بھی ہوتی ہے اور
صلح و جنگ کے قواعد بھی ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ اس مرحلے میں خدا کا رسول خدا کی طرف سے تہذیب و
تمدن کا پورا نقشہ پیش کرتا ہے اور اسی لحاظ سے اس کے کام میں تنوع بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اب آپ
دیکھیں گے کہ وہ انذار و تبشیر بھی کر رہا ہے، اپنے افراد کو منظم بھی کر رہا ہے، ان کے ذریعے اپنا پیغام
دوسروں تک پہنچانے کا کام بھی لے رہا ہے، ان کے درمیان عدالت بھی قائم کیے ہوئے ہے اور خدا
کے دشمنوں سے صلح اور جنگ بھی کر رہا ہے۔ لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھیے کہ وہ پہلے کچھ تھا اور اب
کچھ ہو گیا ہے۔ یہ سب کام وہ اپنے داعی ہونے کی حیثیت ہی میں انجام دیتا ہے، کبھی اس کی کوئی
دوسری حیثیت نہیں ہوتی۔ خدا کا رسول مبلغ ہو، قاضی اور حاکم ہو، معلم اخلاق اور معمار تہذیب ہو،
سپہ سالار اور قائد ہو، ہر حال میں خدا کا داعی ہوتا ہے۔ اس کی دعوت ہزار قالب اختیار کرے، اس کا ہر
قالب دعوتی قالب ہوگا۔ اگر خدا کے رسول کی پکار کا ایک انسان بھی جواب نہ دے اور وہ قتل کر دیا جائے
تو بھی وہ دعوت ہی کا کام کرتے ہوئے دنیا سے جاتا ہے اور اس وقت بھی وہ دعوت ہی کا کام کرتا ہے
جب کہ وہ قاضی بن کر انسانوں کے درمیان خدا کی مرضی کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔ کوئی بھی دعوت اگر
کسی مرحلے میں دعوت نہ رہے تو سمجھیے کہ اس نے اپنی اصل حیثیت کھو دی۔ اب اس کے سامنے وہ مقصد
نہیں رہا جس کے لیے وہ وجود میں آئی تھی۔ بہت سے لوگ خدا کے رسول کو محض مبلغ اور اس کی دعوت کو
محض وعظ و نصیحت کے ہم معنی خیال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی انھوں نے دعوت کا صحیح مفہوم
نہیں سمجھا ہے اور اس کے وسیع تقاضے ان کے سامنے نہیں ہیں۔ ان کو سنجیدگی سے دعوت کے صحیح
مفہوم اور اس کے وسیع تقاضوں پر غور کرنا چاہیے۔

میں نے آپ کے سامنے کار نبوت کی تشریح کی ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں صرف خدا کے پیغمبر ہی ہمارے
لیے اسوہ ہیں۔ ان ہی کے کام کی روشنی میں ہمیں اپنا کام انجام دینا ہے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے اندر
چند بنیادی باتوں کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ پہلی بات یہ کہ اس وقت ہم ایک ایسے ماحول میں گھرے ہوئے ہیں جس کی تعمیر خدا کے دشمنوں
نے کی ہے۔ اسے جن ہاتھوں نے رنگ و روغن عطا کیا ہے وہ پہلے دن سے خدا کے دین سے لڑتے رہے ہیں

بھی اس کی ایک ایک اینٹ خدا سے بغاوت کے جذبے کے تحت رکھی گئی ہے۔ اس ماحول میں ان لوگوں کو صحیح معنی میں قیادت کا منصب حاصل ہے جو خدا سے غافل اور آخرت فراموش ہیں۔ ان میں سے کسی کو اس بات کی فکر نہیں ہے کہ انسان اپنی صحیح حیثیت سے واقف ہو جائے اور اپنے آغاز و انجام کو سمجھ لے۔ موجودہ دور کی تہذیب، اس کی معاشرت، اس کی حکومت و سیاست، اس کا قانون اور اس کا تصورِ اخلاق ہر چیز خدا سے بے نیازی پر مبنی ہے۔ خدا کو زندگی سے اس طرح خارج کر دیا گیا ہے کہ کسی بھی موقع پر اور کسی بھی کام میں اس کا نام نہیں لیا جاتا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ خدا سے یہ بغاوت از خود نہیں پھوٹ پڑی ہے۔ بلکہ اس کے لیے اس کے علم برداروں نے زبردست محنت کی، اپنی بہترین قوتیں صرف کیں، اپنی جانیں کھپا دیں، رات دن اس کام میں لگے رہے، نئے نئے علوم ایجاد کیے اور ہر علم کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نہ خدا ہے اور نہ ہم اس کی ہدایت کے محتاج ہیں۔ تب وہ انسانوں کو خدا سے دور کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ موجودہ انسان خدا سے بغاوت کے لیے جس قدر مسلح ہے اس قدر شاید ہی کسی دور کا انسان مسلح رہا ہو۔

اس ماحول میں ہم اس ارادے سے اٹھے ہیں کہ خدا کا دین اس کے بندوں تک پہنچائیں گے اور اسے غالب و سربلند کریں گے۔ یہ کام اس طرح انجام نہیں پا سکتا کہ ہم محض یہ اعلان کرتے رہیں کہ خدا ہے اور وہی انسان کا معبودِ برحق ہے۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر ہر میدان میں موجودہ دور کی فکری و عملی خامیاں نمایاں کی جائیں۔ جب تک ہم ان استدلات کو رد نہیں کریں گے جن پر اس دور کی عمارت اٹھی ہے اس کی جگہ خدا پرستی کے دور کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ آج صرف یہی نہیں کہ دنیا خدا کی راہنمائی نہیں چاہتی بلکہ خدا کے وجود ہی سے انکار کر رہی ہے۔ آپ کو نعروں سے نہیں بلکہ دلائل و براہین کی قوت سے ثابت کرنا ہوگا کہ خدا فی الواقع موجود ہے اور ہماری نجات اسی کی غلامی کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ ایک طرف تو خالص علمی کام ہے اور دوسری طرف بڑا صبر و ضبط چاہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اتنے اونچے کام کی صلاحیت ہر شخص میں نہیں ہوتی لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ہمیں اس کی اہمیت کا صحیح احساس نہیں ہے۔ کیونکہ انسان کے اندر کسی کمی کا احساس اسے بے چین کر دیتا ہے اور وہ اسے دور کرنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ ہماری علمی زندگی کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جس حد تک ہمارا فکری ارتقاء ہو چکا ہے ہم اس سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے اور ہمارے اندر دشمن کے نئے نئے حربے فنون

سے واقفیت کا جذبہ نہیں ہے۔ آپ کا دشمن علم کے ہر گوشے میں تیار ہے اور آپ بغیر تیاری کے اس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھیے! اس شان کے ساتھ آپ کبھی اپنے دشمن پر غالب نہیں آ سکتے۔ خدا کا حکم ہے کہ دشمن کے مقابلے میں جتنی بھی طاقت فراہم کر سکتے ہو کرو۔ لہذا ہم میں سے کوئی بھی شخص اپنی اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا کہ اسے آخری حد تک تیاری کرنی ہے اور اپنی پوری قوت اس راہ میں لگانی ہے۔

خدا کے پیغمبر اس طرح اپنی دعوت پیش کرتے ہیں کہ ان کی مخالفت کے لیے کسی کے پاس کوئی حجت باقی نہیں رہتی۔ آج ہم یہی کام کرنے کھڑے ہیں تو ہمیں بھی دلائل سے اسی طرح مسلح ہونا چاہیے کہ حق کھل جائے اور سوائے ہٹ دھرموں کے کوئی اس کا انکار نہ کر سکے۔

دوسری بات جو میں اس وقت یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جو کام ہمیں کرنا ہے اس کا آغاز ہماری اپنی ذات سے ہونا چاہیے۔ جس دین کی دعوت ہم دنیا کو دے رہے ہیں اس کے سب سے پہلے مخاطب خود ہم ہیں۔ ہمیں دوسروں کو خدا پرست بنانے سے پہلے اپنے آپ کو خدا پرست بنانا ہے۔ جس چیز کو ہم نے حق سمجھ کر قبول کیا ہے اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ ہماری زندگیاں اس کی گواہی دیں۔ اگر ہم نے نفاق کی روش اختیار کی تو نہ دنیا میں کامیاب ہوں گے اور نہ آخرت میں۔ آپ خدا کی پکڑ سے اس لیے محفوظ نہیں ہوں گے کہ اس کے دین کے داعی ہیں بلکہ اس کے ہاں آپ سے لازماً یہ سوال ہوگا کہ جس دین کی تم دنیا کو دعوت دے رہے تھے اس کا کتنا حصہ تمہاری زندگی میں موجود تھا اور کتنا حصہ ناموجود تھا؟ خدا کی رحمت اس کے فرماں برداروں کو ملتی ہے۔ اگر آپ نے اپنی فرماں برداری کا ثبوت نہ دیا تو پھر کیسے اس کی رحمت کے مستحق ہوں گے؟ آپ خدا کے دین کی گواہی دینے اٹھے ہیں اس لیے آپ کو یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ کوئی بے عمل شخص خدا کی طرف سے انسانوں پر حجت قائم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ عمل کا کھوکھلا پن بات کو بے وزن بنا دیتا ہے۔ دنیا آپ کی نصیحت سے زیادہ آپ کے کردار کو دیکھتی ہے۔ اگر آپ کا عمل آپ کے قول کے خلاف ہے تو آپ اس کی قبولیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ آپ کی بات کو رد کرنے کے لیے لوگوں کے نزدیک یہ دلیل کافی ہوگی کہ آپ کی روش اس سے ٹکرا رہی ہے۔ جب آپ نے دعوت دین کا کام شروع کیا ہے تو دنیا آپ کی کسی چھوٹی سے چھوٹی غلطی کو بھی معاف نہیں کرے گی۔ وہ آپ کی معمولی کوتاہی کو بھی دعوت ہی کے

بنیاد کا نتیجہ قرار دے گی اور اسے بدنام کرے گی۔ آپ کی دعوت اسی وقت لوگوں کے لیے قابل قبول ہو سکتی ہے جب کہ آپ کا عمل اس کی شرح و تفسیر بن جائے۔ اگر آپ کی شخصیت پر خدا کی حکومت نہیں ہے تو آپ قیامت تک دوسروں پر اس کی حکومت قائم نہیں کر سکتے۔ دین کی قدر و قیمت جس چیز نے گھٹائی ہے وہ یہی بے عمل دعوت ہے لیکن سوچیے! ہم میں سے کتنے ہیں جن کے لیے دین شب و روز کا موضوع سخن بنا ہوا ہے اور کتنے ہیں جن کی زندگیوں میں وہ فی الواقع اترا ہوا ہے۔ دین کا نام لینے والے دین کو بہت رسوا کر چکے اب ہمیں اس سے بچنا ہے۔

تیسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر اس شخص سے جو اس کی وفاداری کا دعوےٰ کرے یہ کام لینا چاہتا ہے کہ وہ گمراہ انسانوں کو اس کی راہ دکھائے۔ اس لیے اسلام قبول کرنے کے بعد یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اسے دوسروں تک پہنچائیں۔ یہ احساس ہمیں شب و روز بے چین کیے رہنا چاہیے کہ انسان جسے خدا کی ہدایت کے تابع ہونا چاہیے اس کی ہدایت سے بے نیاز پھر رہا ہے۔ یہ کام ٹھیک اسی ڈھنگ سے انجام پا سکتا ہے جس ڈھنگ سے خدا کے پیغمبروں نے اسے انجام دیا ہے۔ اس کے لیے وہی خلوص، وہی محنت اور وہی دردمندی چاہیے جو خدا کے پیغمبروں میں ہوتی ہے۔ اسے ہماری زندگی کا بہترین مصرف اور ہماری جدوجہد کا حقیقی مقصد بن جانا چاہیے۔ اس وقت دنیا اپنے تاریک ترین دور سے گزر رہی ہے۔ آئیے کہ اسے خدا کے نور سے بھر دیں۔ لیکن یہ کام فرصت کے اوقات میں کرنے کا نہیں ہے بلکہ یہ ہر وقت ہماری توجہ چاہتا ہے۔ اس کے لیے ہم اپنے دوسرے کاموں کو چھوڑ دیں لیکن دوسرے کسی بھی کام کے لیے اسے نہ چھوڑیں جس کام کو ہم جو اہمیت دیں گے زندگی میں اسے وہی مقام دیں گے۔ اگر دعوت کا یہ کام ہماری تمام مصروفیات میں مقدم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی اہمیت سے غافل نہیں ہیں۔ لیکن اگر دوسری مصروفیات نے ہمارے اوقات کو اس طرح گھیر لیا ہے کہ ہم اس کام کے لیے کوئی وقت نہیں نکال سکتے تو گویا ہمارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی، خواہ ہم اپنی زبان سے اس کی اہمیت کا دس ہزار بار ہی کیوں نہ اقرار کریں۔ یہ کام اسی وقت انجام پا سکتا ہے جب کہ ہمیں اس سے محبت اور دلی لگاؤ ہو، اس میں جو وقت صرف ہو اسے ضائع نہ سمجھیں بلکہ اپنی زندگی کا حاصل تصور کریں۔ اس کے بارے میں ہمارا یہ خیال نہ ہو کہ یہ کوئی غیر ضروری بوجھ ہے جو ہمارے اوپر لاد دیا گیا ہے بلکہ اسے انجام

دے کر سکون اور راحت محسوس کریں۔ یہی نہیں بلکہ اس کام کے لیے اپنی آسائش و راحت کی اپنے وقت اور فرصت کی، اپنے مال اور دولت کی، غرض ہر اس چیز کی جس کے ہم مالک ہیں قربانی دیں۔ دنیا میں جو لوگ بھی انسانیت پر کسی نوعیت کا احسان کرتے ہیں وہ ہم ہی جیسے انسان ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہماری ہی طرح جذبات و احساسات رکھتے ہیں ان کی بھی خواہشیں ہوتی ہیں، ان کو بھی جان و مال سے محبت ہوتی ہے لیکن وہ اس لیے انسانیت کے محسن سمجھے جاتے ہیں کہ وہ دوسروں کے فائدے کے لیے اپنے جذبات و احساسات کو مسلسل نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ خود کو فنا کر لیتے ہیں تاکہ دوسرے زندگی پا سکیں، ان کا سینہ ظلم کے تیروں سے چھلنی ہو جاتا ہے اور وہ خوشی سے ظلم سہتے ہیں تاکہ ان کی ذات پر دنیا کا سارا ظلم ختم ہو جائے اور ان کے بعد کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے، وہ بھوکے رہتے ہیں اور فقر و فاقہ ان کی قوتوں کو کمزور کر دیتا ہے تاکہ دنیا فقر و فاقہ کی مار سے محفوظ رہے جب آپ بھی ایک کارِ عظیم انجام دینا چاہتے ہیں تو اس کے پیچھے اپنے آپ کو گھلا دیں اور اپنا سب کچھ اس کی راہ میں قربان کر دیں۔ اس کے بغیر اس کام کا حق نہ ادا ہوا ہے اور نہ ادا ہو سکے گا۔

(جماعت اسلامی حلقہ رامپور کے اجتماع منعقدہ ۱۹ اکتوبر بمقام کانٹھ ضلع مراد آباد میں پڑھا گیا)

شرائطِ ایجنسی

(۱) ایجنسی کم سے کم پانچ رسائل پر دی جائے گی۔

(۲) رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں۔ اگر فروخت نہ ہوئے تو واپس نہیں لیے جائیں گے۔

(۳) کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔ البتہ پچاس یا زائد رسالوں کی خریداری پر کمیشن ۳۰ فی صدی ہوگا۔

(۴) رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری یا وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا

(۵) رقم ہر حال میں پیشگی آنی چاہیے یا پھر وی پی بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی کے مصارف زیادہ ہوں گے۔

مینیجر رسالہ زندگی رامپور۔ یوپی

اسلامی اخلاقیات کی دینی بنیادیں

(آخری قسط)

(جناب عبدالحق انصاری ایم اے)

انسان اسلام ہر انسان کو خواہ مرد ہو یا عورت ایک اخلاقی شخصیت قرار دیتا ہے۔ انسان کو اخلاقی شخصیت قرار دینے کا مفہوم یہ ہے کہ انسانیت کا ہر فرد اپنے افعال کا انتخاب اور ارادہ خود کرتا ہے، اور اپنے افعال کا جواب دہ ہے۔ ان کے عواقب و نتائج کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے، ان کے ثمرات جزا اور سزا عذاب و ثواب کا وہی مستحق ہے کوئی دوسرا نہیں۔

اس توضیح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کا ہر ہر فعل اس کے انتخاب و ارادے سے ہوتا ہے، نہ یہ معنی ہیں کہ وہ افعال جو اس کے انتخاب و ارادے سے نہیں ہوتے وہ ان کا بھی ذمہ دار اور جواب دہ ہے نہ اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا کی قدرت اور فعالیت کا کوئی دخل انسانی زندگی میں نہیں ہے۔ یہ بحث یہاں اٹھانی پیش نظر نہیں کہ انسانی ارادہ و تقدیر میں کیا تعلق ہے۔ اس کے لیے کوئی دوسرا موقع آئے گا۔ اس توضیح کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ایک فرد کے فعل میں اگر دوسرے بھی کسی طرح بھی شامل ہیں تو وہ اس فعل کی ذمہ داری اور جواب دہی میں شریک نہیں ہیں۔ یہاں صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ انسان کے بعض افعال ایسے ہوتے ہیں جن کا انتخاب و ارادہ خود کرتا ہے جن کا وہی فاعل ہوتا ہے اور جن کی ذمہ داری اسی پر آتی ہے، جن کے ثمرات خود اسی پر مرتب ہوں گے اور کوئی دوسرا جو ان افعال کے کرنے میں اس کا شریک نہیں ہے ان کے لیے کسی طرح ذمہ دار نہیں ہے۔

انسان کو ایک اخلاقی شخصیت قرار دینے کا ایک دوسرا اہم مفہوم ہے اور وہ یہ کہ ہر انسان کی ایک جداگانہ شخصیت ہوتی ہے جو ہر دوسرے فرد یا انا دشخصیتوں سے ممتاز اور علیحدہ ہوتی ہے۔

انسانی سماج کے جو بھی معنی ہوں لیکن اس قدر طے ہے کہ وہ اخلاقی شخصیت کا حامل نہیں ہوتا، اور فرد سماج کا اس معنی میں عضو نہیں ہوتا، سماج فرد کی شخصیت کی تعمیر میں بلاشبہہ بہت بڑا پارٹ ادا کرتا ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ فرد کا کوئی مستقل اخلاقی وجود نہیں اور نہ یہ معنی ہیں کہ سماج کی کوئی اخلاقی شخصیت کسی معنی میں ہوتی ہے۔ اخلاقی شخصیت کا تصور فرد اور محض فرد سے متعلق ہے۔

انسان کو اخلاقی شخصیت قرار دینے کا اسلام کے دینی تصورات کی روشنی میں یہ مفہوم بھی ہے کہ ہر فرد بشر کی شخصیت غیر فانی ہے۔ موت زندگی کے خاتمے کا نہیں دوسری زندگی کے آغاز کا نام ہے ہر فرد اپنی شخصیت میں نہ صرف دوسرے افراد کی شخصیتوں سے ممتاز اور مستقل ہوتا ہے بلکہ خدا کی ذات سے بھی علیحدہ اور اس سے بھی ممتاز ہے، اور یہ امتیاز و استقلال دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں باقی رہتا ہے، کبھی بھی انسان کی شخصیت خدا کی ذات میں مدغم نہیں ہوتی۔ بندہ اور آقا، عبد و معبود، حاکم و محکوم، خالق و مخلوق کا امتیاز لازوال ہے

اس معنی میں انسانی شخصیت کو مستقل اور جداگانہ قرار دینے سے انسانی زندگی کے آغاز و ماخذ، اس کی مابعد الطبیعیاتی حیثیت کے بارے میں کسی ایک رائے کا تسلیم کرنا لازم نہیں آتا۔ انسان کی مابعد الطبیعیاتی حیثیت کے بارے میں مختلف رائیں رکھی جاسکتی ہیں جن کی صحت اور عدم صحت کے دوسرے معیار ہوں گے۔ البتہ بعض ایسے مابعد الطبیعیاتی نظریات ہوسکتے ہیں جو انسان کی اخلاقی شخصیت کے اس تصور سے متصادم ہوں جسے اوپر پیش کیا گیا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ایسے متصادم ہونے والے مابعد الطبیعیاتی نظریات صحیح نہ ہوں گے

انسان کو اخلاقی شخصیت قرار دینے کے مفہوم میں ذیل کی باتیں داخل ہیں:۔

(۱) انسان اپنے اعمال کا انتخاب و ارادہ خود کرتا ہے۔

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (حٰمٓ سجدہ: ۴۰)	جو بھی چاہے تمہارا کرو۔ وہ تمہارا کیا ہوا سب کچھ دیکھتا ہے۔
قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف: ۲۹)	اور کہہ دو "یہ سچائی تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے اب جو چاہے مانے اور جو چاہے نہ مانے۔

قُلِ اللّٰهَ اَعۡبُدُ مُخۡلِصًا لَّهٗ دِیۡنِیۡ ۙ فَاعۡبُدُوۡا مَا شِئۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ ؕ (الزمر: ۱۴-۱۵)	کہہ دو کہ میں تو اللہ ہی کی عبادت کروں گا اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرکے۔ سو خدا کو چھوڑ کر جس کو تمہارا جی چاہے اس کی عبادت کرو۔

اس مفہوم کی بہت سی آیات ہیں۔ مزید آیات کے لیے ملاحظہ ہو۔ الدھر: ۳۰، المزمل: ۲۰، النباء: ۴، المدثر: ۵۰، عبس: ۱۲، تکویر: ۲۹ وغیرہ۔

(۲) انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا ۞ (بنی اسرائیل ۳۶)	یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی بازپرس ہوگی
تَاللّٰهِ لَتُسۡـَٔـلُنَّ عَمَّا كُنۡتُمۡ تَفۡتَرُوۡنَ ۞ (النحل: ۵۶)	خدا کی قسم! ضرور تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ جھوٹ تم نے کیسے گھڑ لیے تھے۔
وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَـعَلَـكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰـكِنۡ يُّضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَلَـتُسۡـَٔـلُنَّ عَمَّا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۞ (النحل: ۹۳)	اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی (کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے اور ضرور تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس ہوگی

(۳) ہر شخص اپنے ہی اعمال کا ذمہ دار ہے۔ دوسرے کے اعمال کی ذمہ داری اس پر نہیں آتی اور نہ اس کے اعمال کی ذمہ داری دوسروں پر عائد ہوتی ہے۔

تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡـَٔـلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۞ (البقرۃ: ۱۳۴ اور ۱۴۱)	وہ کچھ لوگ تھے جو گزر گئے جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کے لیے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمہارے لیے ہے۔ تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔

قُلْ لَا تُسْأَلُونَ عَمَّا أَجْرَمْنَا — کہہ دو ہمارے گناہوں کی پوچھ تم سے
وَلَا نُسْأَلُ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ (السبا: ۲۵) — نہ ہوگی اور تمہارے کیے کی پوچھ ہم سے نہ ہوگی

(۴) ہر شخص کو اپنے اعمال کا صلہ ملے گا اور اپنے اعمال کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ کوئی دوسرا نہ
میں شریک ہو سکتا ہے اور نہ عذاب میں۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا — ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا اثر اسی کی
عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ — ذات پر مرتب ہوگا۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا
أُخْرَى (الانعام: ۱۶۳) — دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى ۝ — کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں
وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى ۝ (النجم) — لے سکتا اور ہر شخص کو وہی نیکی ملے گی جو اس نے کمائی ہے

اس مضمون کی دوسری آیات کے لیے ملاحظہ ہو الاسراء: ۱۵، الزمر: ۷، الفاطر: ۱۸ وغیرہ

(۵) انسان کے اندر خیر و شر، نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت بخشی گئی ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا — پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری اس
(الشمس: ۸) — کو القا کی۔

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا — ہم نے اس کو راستہ بتلایا وہ (چاہے)
شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝ (الدہر: ۳) — شکر گزار بنے یا ناشکرا

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝ (البلد: ۱۰) — ہم نے اس کو دونوں راستے بتائے

بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَى نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ — بلکہ انسان اپنی ذات پر خوب مطلع ہے خواہ معذرتیں
وَلَوْ أَلْقَى مَعَاذِيرَهُ (القیمۃ: ۱۴-۱۵) — ہی کیوں نہ پیش کرے۔

انسان میں برائی اور بھلائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت و قوت کا ذکر ان آیات میں صراحۃً موجود ہے
صلاحیت کے عمل کے کیا حدود ہیں اور وحی الٰہی اور اس قوت کا باہمی تعلق کیا ہے۔ یہ وہ مسئلہ
یہاں چھیڑا نہیں جا سکتا۔

(۶) انسان برائی اور بھلائی، خبیث و طیب، اثم و تقویٰ دونوں کے لیے داعیات رکھتا ہے اور
طرف لپکتا ہے۔

إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ — بلاشبہ نفس بری بات کا حکم کرنے والا ہے

لَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ — قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ (التین: ۴-۵) — ہم نے انسان کو بہت اچھے سانچے پر ڈھالا ہے۔ پھر ہم اس کو پستی والوں سے بھی زیادہ پست کر دیتے ہیں۔

(۷) اگرچہ انسان برے اور بھلے دونوں طرح کے کام کے داعیات رکھتا ہے لیکن وہ بھلائی کے کام کرنے اور برے کام سے بچنے کی ذمہ داری محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ ذمہ داری کا احساس ہے جسے لفظ امانت یا "حمل امانت" کے الفاظ سے قرآن و سنت میں تعبیر کیا گیا ہے

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا — ہم نے امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی مگر کسی نے اسے اٹھانا قبول نہ کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھالیا وہ بڑا ظالم اور نادان ہے۔ (الاحزاب: ۷۲)

عن حذیفة قال حدثنا رسول الله حدیثین: قد رأیت احدهما وانا انتظر الاخر۔ حدثنا ان الامانة نزلت فی جذر قلوب الرجال ونزل القرآن فعلمنا من القرآن وعلمنا من السنة ثم حدثنا عن رفعها فقال ینام الرجل النومة فترفع الامانة من قلبه فیظل اثرها کاثر — حضرت حذیفہ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (امانت کے بارے میں دو باتیں بیان فرمائیں) میں نے ان دو باتوں میں سے ایک کو دیکھ لیا ہے اور دوسری کا منتظر ہوں۔ پہلی بات حضور نے یہ فرمائی کہ امانت لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں نازل ہوئی اور قرآن نازل ہوا تو ہم نے قرآن سے سیکھا اور سنت سے دیکھا پھر آپ نے دوسری بات امانت کے اٹھ جانے کے بارے میں بیان فرمائی۔ آپ نے فرمایا آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے

الوکت ثم ینام النومة	اٹھائی جائے گی تو اس کا اثر ایک سیاہ دھبے
تنزع الامانة من قلبه فیظل	یا نقطے کی طرح باقی رہ جائے گا' وہ پھر سوئے گا
اثرها مثل اثر المجل کجمر	اور رہی سہی امانت بھی چھین لی جائے گی اور اس
دحرجته علی رجلك فنفط فتراه	کا اثر آبلے کی طرح باقی رہ جائے گا جیسے کوئی
منتبراً ولیس فیه شیئ الخ	چنگاری جسے تم اپنے پاؤں پر لڑھکا دو اور جلد پر
(ابن ماجه' کتاب الفتن' باب ذہاب الامانۃ)	ایک بلند آبلہ پڑجائے جس میں کوئی مفید شے نہ ہو

اس حدیث کا جو حصہ اوپر نقل کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاس عہد' ادائے حقوق
ورانسان کے اپنے ایک مکلف وجود ہونے کا احساس' بالکل فطری ہے جسے قرآن وسنت نے جلا بخشی
ہے لیکن جیسے جیسے کتاب وسنت کے احکام پر عمل اور اپنے مکلف وجود ہونے کا احساس کم ہوتا
ائے گا' پاس عہد اور ادائے حقوق میں کمی آتی جائے گی' یہاں تک کہ انسانوں کے دل' ایمان کے نور
ور ذمہ داری کے احساس سے خالی ہو جائیں گے۔

ذمہ داری کا یہ احساس ہی ہے جس کی وجہ سے انسان برائی کے ارتکاب کے بعد پشیمان ہوتا ہے
ر اپنے ضمیر کی ملامت اٹھاتا ہے۔ یہ بات اتنی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم اس آیات میں
ائی ہے۔

لَا اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ	میں قسم کھاتا ہوں' ملامت کرنے والے
(القیمة: ۲)	نفس کی۔

انسان کی اخلاقی شخصیت کے تصور میں یہ ساری باتیں شامل ہیں' ان میں سے کوئی ایک بات
اگر خارج کر دی جائے تو یہ تصور ناقص ہو جاتا ہے بلکہ بسا اوقات بے معنی بن کر رہ جاتا ہے' مگر
بات ہے جس کی تفصیل کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔

فت انسانی خدا کے تعلق سے انسان زمین میں اس کا نائب یا خلیفہ ہے۔ قرآن مجید میں
اللہ تعالیٰ نے آدم کی تخلیق کے وقت اپنا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ	اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے
جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۔۔	رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں

ایک خلیفہ بنانے والا ہوں (البقرۃ: ۳۰)

انسانی خلافت کا یہ تصور ان باتوں کا مشترک نتیجہ ہے جو اوپر پیش کی گئی ہیں دراصل یہ تصور چار نظریات سے مل کر بنا ہے۔

(۱) خدا ہی ساری کائنات کا بشمول انسان خالق، مالک اور حاکم ہے۔

(۲) ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے تابعِ فرمان ہے اور انسان بھی دوسری مخلوقات کی طرح اس کے فرمان کا تابع ہے۔

(۳) انسان کو اپنی اختیاری زندگی میں دوسری مخلوقات کے برخلاف اللہ کی اطاعت کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، مگر اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اطاعت کرے اور نافرمانی سے بچے اور اپنے تصرفات میں اس کے حدود کا خیال رکھے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی صلاحیت بخشی ہے کہ وہ خدا کی مخلوقات میں مختلف طریقوں سے تصرف کر سکتا ہے۔

پہلی تین باتیں اوپر بیان کی جا چکی ہیں اور چوتھی بات اتنی واضح ہے کہ اس کی وضاحت کرنے یا اس کے لیے دلیل دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کے لیے ساری چیزیں مسخر کر دی ہیں۔ آسمان اور زمین، چاند اور سورج، رات و دن، جاندار اور بے جان، مویشی اور طائر وغیرہ۔

انسانی خلافت کے نظریے کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان زمین و آسمان کی کسی قوت، کسی بھی ذی حیات نفس، کسی بھی بے جان شے، حتیٰ کہ خود اپنے جسم و جان، اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کا مالک نہیں ہے، ان سب کا مالک اور حقیقی حاکم خدا ہے، مگر انسان کو ان میں تصرف کے وسیع اختیارات دیے گئے ہیں، تصرف کی یہ قوت اور کائنات کی یہ ساری چیزیں جن میں وہ تصرف کرتا ہے یا کر سکتا ہے اس کے پاس امانت ہیں، ان میں حقیقی متصرف تو خدا ہے اس لیے انسان کو اپنا تصرف اس کی مرضیات کے تابع رکھنا چاہیے اور اپنے اعمال و کردار میں، اپنے فکر و تخیل میں، اپنے ارادہ و اختیار میں، اپنی پسند و ناپسند میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنی چاہیے۔ یقیناً اسے اس اطاعت اور طلب رضامندی میں مجبور نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسے آزادی دی گئی ہے اور یہ کام اس کی قوت عقل و تمیز، اس کے ضمیر

اور احساس ذمہ داری پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

انسانی خلافت کے حدود انسانی قوتوں کے استعمال کے حدود تک وسیع ہیں۔ ذیل کی آیات میں اس خلافت کی وسعتوں کو واضح کیا گیا ہے

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝
(الجاثیہ: ۱۲-۱۳)

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے دریا کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کی روزی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو اور جتنی چیزیں آسمانوں میں اور زمین میں ہیں سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا۔ بے شک ان باتوں میں ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً
(لقمٰن: ۲۰)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے کام میں لگا دیے ہیں جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے اور تم پر اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی پوری کر دیں

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ
(یونس: ۱۴)

پھر ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝
(انعام: ۱۶۵)

وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔

قُلْ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ

کہہ دو وہی اللہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (الملک ۲۳)

اور تمہیں کان آنکھیں اور دل دیے، تم بہت کم شکر کرتے ہو۔

ایک مشہور حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی خلافت اور ذمہ داری کو تفصیل سے واضح کیا ہے :-

عن ابن عمر یقول سمعت رسول الله يقول كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته الامام راع و مسئول عن رعيته والرجل راع في اهله ومسئول عن رعيته والمراة راعية في بيت زوجها و مسئول عن رعيتها والخادم راع في مال سيده و مسئول عن رعيته قال وحسبت ان قد قال والرجل راع في مال ابيه ومسئول عن رعيته فكلكم راع ومسئول عن رعيته

(بخاری، کتاب الجمعۃ فی المدن والقریٰ)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ کہا کہ میں نے رسول اللہ کو یہ کہتے سنا کہ تم میں سے ہر ایک راعی (نگہبان) ہے اور تم سے تمہاری رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ امام نگہبان ہے (اپنی حکومت کی رعایا کا) اور اس کے بارے میں جواب دہ ہے۔ مرد اپنے اہل و خاندان کا نگراں ہے اور اس کے لیے جواب دہ ہے عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے اور اس کے لیے جواب دہ ہے۔ خادم اپنے آقا کے مال کا نگراں ہے اور اس کے لیے جواب دہ ہے۔ حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ شاید آپ نے یہ بھی فرمایا کہ آدمی اپنے باپ کے مال کا نگراں ہے اور اس کے لیے جواب دہ ہے۔ تم میں سے ہر ایک کسی نہ کسی چیز کا نگراں ہے اور اس کے لیے جواب دہ ہے۔

خلافت کی باز پرس

انسان کی خلافت کی ایک مدت متعین ہے۔ افراد کے معاملے میں یہ مدت خلافت ان کی موت پر ختم ہوتی ہے، معاشروں کو بھی اللہ تعالیٰ خلافت کے مواقع دیتا ہے اور اس کے علم میں اس کام کے لیے بھی مدت متعین ہوتی ہے۔ یہاں گفتگو افراد کی مدتِ خلافت سے متعلق ہے۔ موت کے بعد جب کہ افراد کی خلافت کی مدت ختم ہوتی ہے ان سے ان کے اعمال کی باز پرس ہوگی۔ خلافت کے ساتھ باز پرس کا اور ذمہ داری کے ساتھ جواب دہی کا تصور وابستہ ہے۔ یہ وہ بات ہے

جس کی تصریح قرآن مجید نے مختلف آیات میں کی ہے۔

سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○	وہ جو کچھ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ پاکر
(الاعراف: ۱۸۰)	رہیں گے۔
لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ	اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے
لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا	اور زمین میں ہے تاکہ وہ بدلہ دے برائی والوں کو
وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى	ان کے کیے کا اور بدلہ دے بھلائی والوں کو ان
(النجم: ۳۱)	کے کیے کا بھلائی کے ساتھ۔

اگر انسان کو جواب دہی نہ کرنی پڑے اور اپنے اعمال کا بدلہ اسے نہ ملے تو انسان کی تخلیق ہی عبث ہو کر رہ جائے گی۔

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ	کیا انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ یوں ہی
سُدًى ○ (القیٰمۃ: ۳۶)	مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟

ایسا کرنا اللہ کی حکمت کے خلاف ہے۔

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ	کیا ہم اطاعت شعاروں اور نافرمان مجرمین
مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ○ (القلم ۳۵-۳۶)	کے ساتھ یکساں سلوک کریں گے؟ تمہیں کیا ہو گیا
(القلم: ۳۵-۳۶)	ہے کہ تم اس طرح سوچتے ہو۔

اگر اعمال کا بدلہ نہ دیا جائے تو نہ صرف انسان کی تخلیق عبث ہو جاتی ہے بلکہ کائنات بھی ایک حد تک اپنی معنویت اور مقصدیت کھو بیٹھتی ہے۔ یہی بات ہے جسے اس آیت میں کہا گیا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ	اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت
وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ	اور مقصد کے ساتھ پیدا کیا اور تاکہ ہر شخص کو اس
وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○	کے کیے کا بدلہ دیا جائے ان پر ذرا بھی ظلم نہ کیا
(الجاثیہ: ۲۲)	جائے گا۔

آخرت

ذمہ داری اور مکافات دونوں لازم و ملزوم ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مکافات اور یہ جزا و سزا اسی دنیا میں کیوں نہیں پوری ہو جاتی؟ اسلام کا نظریہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ

اگرچہ اس دنیا میں بھی برے اعمال پر ایک حد تک سزا ملتی ہے اور ایک حد تک اچھے اعمال پر اچھا بدلہ بھی ملتا ہے لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر اس دنیا میں مکافاتِ اعمال مکمل نہیں ہو سکتی

پہلی وجہ جو بہت صاف ہے، یہ ہے کہ خلافت کی مدت موت تک باقی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کامل مکافات کا موقع اسی وقت آسکتا ہے جب کہ یہ مدت ختم ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ عالم اور اس عالم کی زندگی کی بعض محدودیتیں ایسی ہیں کہ بہت سے اعمال کا بدلہ خواہ اچھے ہوں یا برے یہاں نہیں دیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک انسان اپنے ایک مجبور اور لاچار پڑوسی کی بے لوث خدمت کرتا ہے اور ساری زندگی اس کا یہی مشغلہ رہتا ہے۔ کوئی سوچے کہ ایسے انسان کی خدمات کا اس دنیا میں کیا صلہ دیا جا سکتا ہے اور کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا انسان مختلف طریقوں سے اپنے پڑوسی کو اذیتیں دیتا ہے مگر اس طرح کہ قانون اس کی گرفت نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ اس کا پڑوسی اس اذیت میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ کوئی بتائے کہ اس دنیا میں اس کے جرم کی کیا سزا دی جا سکتی ہے۔ اس طرح کے اور اس سے مختلف آئے دن بے شمار واقعات ہوتے رہتے ہیں کوئی ان پر غور کر کے بتائے کہ کیا یہ دنیا مکافات اعمال کے لیے کسی معنی میں بھی کافی ہو سکتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جب انسان کو ایک کارِ عظیم کی ذمہ داری دی گئی ہے تو انصاف وعدل کا تقاضا ہے کہ اسے یہ موقع دیا جائے کہ غلطی کرنے کے بعد اس کی اصلاح کر سکے، گناہ کرنے کے بعد توبہ کر سکے، کوتاہی کی تلافی کر سکے، نقص کا ازالہ کر سکے، کیونکہ انسان سے غلطی ہوتی ہی ہے وہ اول روز سے ہر کام ٹھیک طرح نہیں کر سکتا، سیکھتے سیکھتے اسے کرنا آئے گا، غلطی کر کے صحیح کرنے کی عادت پڑے گی، لیکن اگر یہ حقیقت ہے تو سوال یہ ہے کہ کسی فرد کی زندگی میں وہ دن یا وقت کب اور کیسے متعین کیا جا سکتا ہے جس کے بعد یہ کہا جا سکے۔ اب انسان کو اصلاح وتلافی، توبہ اور رجوع کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ کب اس کے بارے میں یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے سیکھنے کا وقت ختم ہو گیا اب قاعدے کے مطابق اس سے کوئی بھول چوک، کوئی غلطی، کوئی گناہ نہیں سرزد ہونا چاہیے۔ اگر کسی فرد کی زندگی میں اس دن کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ اگر معقول طریقے سے سوچنے کے بعد معلوم ہو کہ غلطی اور گناہ کے امکانات تاحیات باقی رہتے ہیں تو موت سے پہلے اس کے لیے اصلاح وتلافی کا دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر مکافات اعمال دنیا میں مکمل نہیں ہو سکتی۔

قرآن و سنت نے صراحت کر دی ہے کہ اعمال کی جزا اور سزا کے لیے آخرت مخصوص ہے اگرچہ اس کے معنی نہیں ہیں کہ اس دنیا میں کوئی جزا یا سزا کسی حد تک بھی نہیں مل سکتی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے دنیا میں بھی بعض اعمال کی ایک حد تک جزا اور سزا ملتی ہے۔

ابتلاء انسان کی اخلاقی شخصیت، خلافت اور آخرت میں مکافات عمل کے نظریات سے یہ نظریہ نکلتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی زندگی ایک امتحان اور آزمائش ہے۔ آزمائش اس لیے ہے کہ انسان کو ایک ان دیکھے مالک، حاکم پر ایمان لا کر اس کی خلافت کے سارے فرائض انجام دینے ہیں۔ اس کام میں اپنے نفس، اپنے اعزا و اقارب، اپنے اہل قوم و ملک سب کی خواہشات سے بے پروا ہو کر ہمہ تن لگ جانا ہے۔ ایک وفادار غلام کی طرح اپنے آقا کو خوش کرنے کے لیے ہر جتن کرنا ہے۔ صرف اس امید پر کہ اس زندگی میں نہیں بلکہ موت کے بعد اسے اس کا صلہ ملے گا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا آزمائش ہو سکتی ہے۔ اتنی وسیع، اتنی ہمہ گیر، اتنی طویل، اتنی محنت طلب، اتنی کٹھن اور اتنی اہم۔

اسلام کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ اس ابتلا سے انسان ایک بار اور صرف ایک بار گزرتا ہے دوبارہ اس کی نوبت نہیں آتی ہے۔ دنیا میں زندگی انسان کو صرف ایک بار ملتی ہے اور اس کی کمائی ہمیشہ کے لیے فیصلہ کن ہوتی ہے۔ موت کے بعد انسان کی زندگی عمل کے لیے نہیں جزا کے لیے ہے اور یہ ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اسلام آواگون کا قائل نہیں کہ دوسری یا تیسری یا کسی اور زندگی میں سب کی تلافی کر لی جائے۔ اسلام میں انسان کو زندگی فنا کرنے اور معدوم محض ہو جانے کے لیے نہیں ملی ہے بلکہ تکمیل و اتمام کے لیے ملی ہے جو اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت ہی میں ممکن ہو۔

روزہ

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

"قرآنی تعلیمات" کی ترتیب میں رمضان المبارک کی وجہ سے فرق پیدا کرکے روزے کا حصہ شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

قرآن حکیم کی شہادت ہے کہ روزہ تمام آسمانی شریعتوں میں فرض رہا ہے اور ہر امت کے نظام عبادت میں اس کو ایک لازمی جزو کی حیثیت حاصل رہی ہے، دراصل نفس انسانی کی تربیت میں روزے کو خصوصی دخل ہے اور کوئی نظام تربیت اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا کیونکہ روحانی تزکیے میں کوئی بھی دوسری عبادت اس کا بدل نہیں ہوسکتی۔

روزے کے لیے قرآن نے صوم و صیام کے الفاظ استعمال کیے ہیں جس کے معنی ہیں "کسی شے سے رک جانا اور اس کو ترک کردینا"۔ قرآن کی اصطلاح میں صیام سے مراد یہ ہے کہ صبح صادق نمودار ہوتے ہی آدمی کھانے پینے اور جنسی ضرورت پوری کرنے سے رک جائے اور سورج غروب ہونے تک رکا رہے۔

فلاح و کامرانی یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کو تقویٰ کے بندھنوں میں جکڑے اور خواہشات کی پیروی سے اسے روک دے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى o	رہا وہ شخص جو ڈرتا رہا کہ اسے اپنے رب کے حضور کھڑا ہونا ہے اور اس نے اپنے نفس کو خواہشات کی پیروی سے روکے رکھا تو یقیناً اس کا ٹھکانا جنت ہے۔
(النّٰزعٰت: ۴۰-۴۱)	

غور کیجیے تو انسانی زندگی میں یہی تین خواہشیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن سے رک جانے کا نام

روزہ ہے، یہ خواہشیں بھی ہیں اور بنیادی ضرورتیں بھی۔ انہی پر بقائے حیات کا دار و مدار ہے، کھانے پینے پر زندگی کا انحصار ہے اور جنسی ملاپ پر بقائے نوع کا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان میں انتہائی زور اور بے پناہ قوت رکھی ہے، روزہ انہی خواہشات کو قابو میں رکھنے اور ان کے طغیان و ہیجان کو اعتدال میں لانے کے لیے فرض کیا گیا ہے، ان خواہشات پر قابو رکھنے والا ہی اپنے ارادوں میں اٹل، قوتِ برداشت میں قابلِ اعتماد، راہِ حق کی صعوبتیں جھیلنے میں ثابت قدم، دینی احکام کی پابندی میں گرم جوش اور جہادِ زندگانی اور جہاد فی سبیل اللہ میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

روزہ آدمی پر دو پہلوؤں سے اثر ڈالتا ہے اور اس کا یہ اثر اتنا گہرا، ہمہ گیر اور بے بدل ہوتا ہے کہ کسی بھی دوسرے ذریعے سے اس کا حصول ممکن نہیں۔

چند گھنٹے مسلسل اپنی بنیادی اور انتہائی ضروری خواہشات سے رکا رہنا آدمی پر یہ اثر چھوڑتا ہے کہ وہ انتہائی مجبور، محتاج اور واقعی عاجز و درماندہ ہے۔ وہ زندگی کے ایک ایک نفس کے لیے خدا کا محتاج ہے۔ اس عجز و احتیاج کا حقیقی احساس ہی بندگی کی روح ہے اور اس احساس کا تقاضا ہے کہ وہ بندہ بن کر زندگی گزارے۔

روزے کے اثر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب آدمی اپنی انتہائی پُرزور اور ہیجانی خواہشات سے رکا رہتا ہے اور تنہائی کے ان گوشوں میں بھی رکا رہتا ہے جہاں اس پر خدا کے سوا کسی کی نظر نہیں پڑتی، تو اس سے خدا کا یقین پختہ سے پختہ تر ہو جاتا ہے اور اس کے خوف اور ہیبت کا سایہ دل پر اس طرح چھا جاتا ہے، اس کی عظمت و جلال اور خدائی جبروت دل و دماغ کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں کہ پھر بندۂ مومن نافرمانی کے تصور سے کانپنے لگتا ہے ــــــ روزے کے انہی بے بدل اثرات کی وجہ سے خدا نے ہر قوم کی تربیت اور ترقی کے لیے اس کو ضروری قرار دیا اور تقویٰ کے معراج پر پہنچنے کے لیے اسے ایک لازمی ذریعہ قرار دیا۔

روزے کی فرضیت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ۚ — اے ایمان والو! تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا۔

روزے کی فرضیت کے لیے تاکید و اہتمام کا جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اس سے روزے کی اہمیت اور دین میں اس کی اہم حیثیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ روزہ نماز کی طرح ہر عاقل بالغ مسلمان

پر فرض ہے۔

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ — جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

روزہ ہمیشہ فرض رہا ہے

یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ روزے کو نفس انسانی کی تربیت سے خصوصی تعلق ہے اور تزکیہ قلوب میں اس کو ایک فطری دخل ہے' ــــــ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تربیت و تزکیہ کا کورس اس کے بغیر پورا ہو ہی نہیں سکتا یہی وجہ ہے کہ خدا نے اس کو تمام انبیاء کی شریعتوں میں ہمیشہ فرض رکھا ہے' ــــــ اس کے احکام مختلف شریعتوں میں حالات اور ضرورت کے لحاظ سے ضرور مختلف رہے ہیں لیکن بحیثیت ایک اہم رکن کے یہ ہمیشہ آسمانی شریعتوں میں شامل رہا ہے۔

روزوں کی مدت گنتی کے چند دن

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ — گنتی کے چند دنوں میں۔

ان دو لفظوں میں روزے کی ترغیب دی گئی ہے کہ روزے کے عظیم فوائد اور بے بہا برکتوں کے لحاظ سے یہ ۲۹، ۳۰ دن کے روزے کچھ زیادہ نہیں، گنتی کے چند دن ہیں۔

رمضان بھر کے روزے رکھو

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ (البقرۃ: ۱۸۵) — پس جو شخص بھی تم میں سے اس مہینے کو پائے اس پر لازم ہے کہ وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے۔

یہ آیت وضاحت کرتی ہے کہ اوپر جو ترغیب دی گئی تھی کہ بس چند دنوں کے روزے تم پر فرض کیے گئے ہیں ان چند دنوں سے مراد رمضان کا پورا مہینہ ہے' اس پورے مہینے کے روزے مسلمانوں پر فرض کیے گئے ہیں اور روزے کے بے پایاں اجر و ثواب کے مقابلے میں یہ ایک مہینہ واقعی گنتی کے چند دن ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے" ابن آدم کا ہر نیک عمل بڑھایا جائے گا دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ روزے کا معاملہ کچھ جدا ہے روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اپنے ہاتھوں اس کا اجر دوں گا کیونکہ بندہ صرف میری ہی خاطر اپنی خواہشوں اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے" ــــــ نیز اس ٹکڑے میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے کہ پورے مہینے ہی کے روزے فرض ہیں۔ اس میں کمی بیشی

کی کوئی گنجائش نہیں اگر سفر یا بیماری کی وجہ سے کچھ روزے چھوٹ جائیں تو دوسرے دنوں میں قضا روزے رکھ کر مہینہ بھر کے روزے پورے کر لینے چاہیں۔

روزہ نزولِ قرآن پر اظہارِ شکر

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ۔ (البقرہ)

رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے جو تمام انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو سیدھا راستہ دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں بس اب جو شخص بھی تم میں سے اس مہینے کو پائے اس پر لازم ہے کہ وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے۔

یوں تو شب و روز انسانوں پر خدا کے احسانات کی بارش ہو رہی ہے اور اس کی ہر نعمت کا تقاضا بلاشبہ یہی ہے کہ انسان سراپا شکر بن کر بندگی اور بے چارگی سے اس کے سامنے جھک جائے لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ زمین والوں پر خدا کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ان کی ہدایت کے لیے کتاب ہدایت نازل فرمائی۔ یہ وہ عظیم ترین نعمت ہے جو ہر نعمت کے نعمت ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے اور اس کے بغیر واقعتاً ہر نعمت ہیچ ہے۔ آدمی کی سب سے بڑی اور بنیادی ضرورت راہِ حق کی ہدایت ہے، قرآن راہِ حق کی طرف رہنمائی بھی کرتا ہے، حق و باطل میں تمیز کی قوت بھی بخشتا ہے اور باطل کو ٹھکرانے اور حق کو جذب کرنے کی صلاحیت اور جذبہ بھی پیدا کرتا ہے ـــــ خدا کی اس بے بہا نعمت سے واقعی مستفیض ہونے اور اس کا سچا حامل بننے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اس نعمت کی قدر پہچانتا ہو، نعمت پا کر اس کے سینے میں شکر کے جذبات تڑپیں اور اس میں یہ صلاحیت و قوت ہو کہ وہ اس نعمت کے تقاضے اور اس تعلق سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کر سکے ـــــ اسی مقصد کے لیے خدا نے کتاب پانے والوں پر اس پورے مہینے کے روزے فرض کیے جس میں قرآن نازل فرمایا۔ روزہ اس نعمت کے پانے پر خدا کی شکر گزاری بھی ہے اور فی الواقع اس نعمت عظمیٰ کا حامل و امین بننے کے لیے خدا شناسی، خدا ترسی اور صبر و تقویٰ کی بنیادی صفات پیدا

کرنے کا موزوں ترین خدا کا مجوزہ ذریعہ بھی۔

روزے کی اصل غایت

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (البقرۃ) تا کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔

روزہ رکھ کر دراصل آدمی اس قوت و صلاحیت کی تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور جذبات پر قابو پا سکے۔ اسی قوت و صلاحیت کا نام تقویٰ ہے، اور روزے سے ایک مومن میں اسی جوہر کا پیدا کرنا مقصود ہے، لیکن روزے سے یہ حقیقی مقصود اسی وقت حاصل ہوگا جب روزے واقعی ان احساسات کے ساتھ رکھے جائیں جن کی طرف قرآن رہنمائی کرتا ہے اور ان آداب و شرائط کا لحاظ کیا جائے جن کی تاکید شریعت کرتی ہے، جس کا روزہ فی الواقع اس نعمت پر اظہار شکر کے لیے ہو کہ خدا نے ہمیں کتاب ہدایت سے سرفراز فرمایا ہے، اور وہ واقعی اس کا سچا امین بننے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتا ہو تو یقیناً وہ اپنے روزے سے اس غایت کو پالے گا لیکن اگر کوئی ان احساسات سے خالی ہو کر محض بھوک اور پیاس کی مشق کر رہا ہو تو اس کا روزہ تقویٰ کی آبیاری نہ کر سکے گا۔ اور رمضان کا موسم بہار پانے کے باوجود تقویٰ کی کھیتی کو لہلہاتا نہ دیکھ سکے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جس[1] شخص نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس سے کیا سروکار کہ وہ بھوکا اور پیاسا رہا۔" ایک اور موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا۔ "کتنے[2] ہی (بدنصیب بظاہر) روزے دار ایسے ہیں جن کو اپنے روزے سے بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اور کتنے ہی (بدنصیب) ایسے ہیں جن کو اپنے قیام اور تراویح سے جاگنے کے سوا کچھ نہیں ہاتھ آتا۔" روزے کے آداب بتاتے ہوئے ایک بار آپ نے ارشاد فرمایا۔ "روزہ[3] ڈھال ہے، اور جب تم میں سے جب کوئی کسی دن روزے سے ہو تو اسے چاہیے کہ زبان کو کسی فحش بات سے آلودہ نہ کرے شور و ہنگامہ نہ کرے اور اگر کوئی اس سے گالم گلوچ کرنے پر اتر آئے یا لڑائی کی ٹھانے تو اسے دل میں سوچنا چاہیے کہ میں تو روزے سے ہوں (بھلا میں کیسے لڑ سکتا ہوں)"

مسافر اور مریض کے لیے سہولت

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔

---

[1] بخاری، [2] ترمذی [3] بخاری، مسلم

خدا نے بندوں پر جو کچھ بھی فرض فرمایا ہے اس میں بندوں کی کمزوریوں اور معذوریوں کو ملحوظ پیش نظر رکھا ہے۔ مسافر اور مریض کو یہ رعایت دی گئی ہے کہ وہ روزہ چھوڑ دیں اور دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر اپنے چھوڑے ہوئے روزوں کو پورا کریں تاکہ وہ سہولت کے ساتھ خدا کے فرض کردہ حکم کو بھی بجالائیں اور روزے کے بے بہا اجر و ثواب سے بھی محروم نہ رہیں۔

عارضی سہولت

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ	اور جو لوگ (ایک مسکین کو کھلانے کی)
فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ	طاقت رکھتے ہوں ان پر ایک روزے کا
فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ	بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے اور جو کوئی دل
وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ	سے مزید بھلائی کرے تو وہ اس کے حق میں اور
كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ٥	زیادہ اچھا ہے اور تمہارا روزہ رکھنا ہی تمہارے
(البقرۃ ۲: ۱۸۴)	حق میں زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھ سے کام لو۔

ابتدائی[1] ایام میں مریض اور مسافر کے لیے ایک اور رعایت بھی تھی جو بالکل عارضی تھی' اس کے عارضی ہونے کی دلیل خود اس رعایت کے الفاظ میں موجود ہے' یہ رعایت فدیہ کی تھی یعنی جو بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے پورے نہ کرسکیں وہ ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دے کر ان روزوں کا بدل پورا کردیں' پھر جس کو توفیق ہو اور وہ اپنی خوشی سے کچھ زیادہ دینا چاہے' تو اور بہتر ہے —— لیکن پسندیدہ بات یہی ہے کہ مریض اور مسافر بھی چھوٹے ہوئے روزوں کی تلافی دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر ہی کریں —— یہی سمجھ بوجھ کی بات ہے' خدا نے جن حکمتوں کے ساتھ روزہ فرض فرمایا ہے اور جن مقاصد کے لیے فرض فرمایا ہے ظاہر ہے وہ اسی شکل میں ٹھیک ٹھیک حاصل ہوسکتے ہیں جب اس فرض کو ادا کیا جائے۔ یہ انداز بیان خود بتاتا ہے کہ فدیہ کی یہ رعایت اور سہولت بالکل وقتی تھی —— اور اصل حکم جس کو باقی رکھنا تھا وہ یہ کہ چھوٹے ہوئے روزے

---

[1] یہ حقیر آیت کی اس تفسیر سے متفق نہیں ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح احادیث سے اس واقعہ کا ثبوت ملتا ہے کہ ابتدا میں تندرست اور مقیم مسلمانوں کو بھی یہ رخصت دی گئی تھی کہ وہ روزوں کے بدلے فدیہ ادا کرسکتے ہیں' اس کے بعد فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ کی آیت سے یہ رخصت منسوخ ہوگئی۔ اکثر مفسرین اور جمہور علمائے امت کی رائے انہیں صحیح احادیث پر مبنی ہے۔ باقی رہے آیت صوم کے علمی اشکالات تو وہ اس تفسیر سے بھی حل نہیں ہوتے جسے فاضل مقالہ نگار نے اختیار کیا ہے' تفصیل

بھی یہ رعایت اور سہولت بالکل وقتی تھی ـــــ اور اصل حکم جس کو باقی رکھنا تھا وہ یہ کہ چھوٹے ہوئے روزوں کی تلافی دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر کی جائے چنانچہ اس سے اگلی آیت میں اس وقتی رعایت کو ختم کرکے اصل حکم ہی بیان کیا گیا اور اصل حکم کی حکمتیں بیان کرکے یہ وضاحت بھی کردی گئی کہ قرآن نے کیوں دوسرے دنوں میں روزہ رکھنے ہی کی صورت کو باقی رکھا۔

مستقل سہولت کی حکمتیں

وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

(البقرۃ: ۱۸۵)

اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی گنتی پوری کرے، خدا تمہارے لیے سہولت چاہتا ہے تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا اور چاہتا ہے کہ تم (اپنے روزوں کی) تعداد پوری کرلو اور اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اس کی بڑائی بیان کرو اور اس کے شکر گزار بنو۔

روزے کی قدر وقیمت جاننے والا جب بیماری اور سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے نہ رکھ سکے گا تو اسے ضرور کڑھن ہوگی کہ میں حکم خداوندی کی تعمیل نہ کرسکا اور روزے کی بے بہا برکتوں سے محروم رہ گیا۔ خدا نے بندۂ مومن کی اس کڑھن کو دور کرنے کے لیے یہ سہولت پیدا فرمادی کہ تم دوسرے ایام میں اپنے روزوں کی گنتی پوری کرلو، اور اس طرح تعمیل حکم کی سعادت حاصل کرلو رمضان کے روزے آدمی کے دل میں خدا کی بڑائی عظمت، قوت اور جلال کا سکہ بٹھاتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ اس میں خشیت، فروتنی اور بندگی کے جذبات بھی پروان چڑھاتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ جذبات اس وسعت اور استحکام کے ساتھ فدیے کی ادائیگی سے پیدا نہیں ہوسکتے اس لیے خدا نے روزے کی قضا کا حکم دیا تاکہ ان نعمتوں سے بھی بہرہ ور ہونے کا موقع مل جائے۔ رحمتوں کا یہ حکیمانہ نزول اور احکام الٰہی کی یہ حکیمانہ ترتیب اسی لیے ہے کہ بندہ اپنی تربیت کرسکے، اور خدا کا شکر گزار بندہ بن کر زندگی گزار سکے۔

عام معذوروں کی سہولت

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ

اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانیاں چاہتا ہے تمہارے ساتھ سختی کرنا نہیں چاہتا۔

یہ فقرہ تقاضا کرتا ہے کہ روزے کے معاملہ میں دوسرے عام معذوروں کو بھی سہولت ملنی چاہیے جو واقعی روزہ نہ رکھ سکتے ہوں یا جن کو روزہ رکھ کر ناقابل برداشت صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہو۔ یہ معذور کون کون ہو سکتے ہیں اس کے لیے احادیث رسول کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ خدا کے رسولؐ نے اسی ہدایت کی روشنی میں شیخ فانی، حاملہ اور مرضعہ کے لیے رخصتیں بیان فرمائی ہیں۔

روزہ اور تقویٰ کا قرآنی تصور

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ۔ (البقرہ: ۱۸۷)

تمہارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کیا گیا۔ وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اس نے تم پر عنایت کی توجہ فرمائی، تم سے درگزر فرمایا، تو اب تم ان سے (بے کھٹکے) ملو اور اللہ نے جو کچھ تمہارے لیے مقدر فرما دیا ہے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

مسلمانوں کو روزے کی فرضیت کا حکم دیتے ہوئے یہود کے روزے کا حوالہ دیا گیا تھا اور ان کے روزے کا حال یہ تھا کہ وہ افطار کے متأبعد پھر شروع ہو جاتا تھا۔ پھر قرآن کے اس حکم میں بھی یہ وضاحت نہ تھی کہ رمضان کی راتوں میں بیویوں سے لطف اندوز ہونا جائز ہے یا نہیں — اس لیے صحابہ کرامؓ نے بہ نظر احتیاط خود ہی یہ پابندی اپنے اوپر عائد سمجھ لی کہ روزے کی راتوں میں بیویوں سے دور رہا جائے۔ چونکہ ان کی اس از خود عائد کردہ پابندی میں نفس انسانی کی کوئی رعایت ملحوظ نہ تھی، اس لیے بعض لوگ ہیجان میں نفس کی اکساہٹ سے مجبور ہو کر اس کا احترام نہ کر سکے اور اپنے ضمیر کے خلاف ارتکاب کر بیٹھے۔ اسی ارتکاب کو قرآن نے ضمیر سے خیانت قرار دیا — اس صورت حال میں قرآن نے یہ وضاحت فرمائی کہ جو کچھ ہو چکا، ہو چکا۔ اللہ نے تمہاری کوتاہی سے درگزر فرمائی۔

اور اب تمہارے لیے کھلی اجازت ہے کہ رمضان کی راتوں میں اپنی بیویوں سے لطف اندوز ہو اور خدا نے تمہارے لیے جو اولاد مقدر کر دی ہے اس کے طالب بنو ——— خدا تم پر کوئی ایسی پابندی ہرگز عائد نہیں کرتا جو تمہارے فطری مطالبات اور انسانی داعیات کے خلاف ہو۔ خدا کا قانون، نفس انسانی کی کمزوری اور ضرورت کا پورا پورا لحاظ رکھتا ہے۔ تقویٰ یہ نہیں ہے کہ آدمی خود کو لذتوں اور بنیادی ضرورتوں سے یکسر محروم کرلے۔ اور اپنے اوپر ناقابلِ برداشت پابندیاں عائد کرکے نفس کے جائز مطالبات سے بھی ہاتھ کھینچ لے۔ تقویٰ درحقیقت یہ ہے کہ نفس پورے نشاط و رغبت سے احکام الٰہی کا پابند بنے اور اس میں یہ قوت و صلاحیت پیدا ہو کہ وہ برائیوں سے بدکنے لگے اور دینی احکام کی پیروی میں سکون و نشاط محسوس کرنے لگے۔ آسمانی ہدایت سے زائد جو غیر فطری پابندی بھی انسان نے اپنے اوپر عائد کی ہے۔ وہ اس کا حق ادا نہ کر سکا ہے اور خیانت کا مرتکب ہوا ہے۔ تمہارا معاملہ تو تمہارے سامنے ہی ہے۔ نصاریٰ سے بھی یہی کوتاہی ہوئی۔ انھوں نے دین داری کے بے جا زعم میں رہبانیت کی پابندی از خود اوڑھ لی، لیکن وہ اس کا حق ادا نہ کر سکے اور اپنی کوتاہ کاری کا ثبوت دیتے ہی بنی۔ پس تقویٰ کی صاف سیدھی راہ یہ ہے کہ خدا جو انسان کی کمزوری اور صلاحیت سے پورا پورا واقف ہے اور جس کا علم یقینی ہے، اس کے احکام کی کامل پیروی میں فلاح و نجات تلاش کی جائے اور اس سے سرمو انحراف نہ کیا جائے۔

سحر و افطار کے اوقات

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (البقرۃ)

اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ سپیدۂ صبح کی دھاری شب کی سیاہ دھاری سے نمایاں نظر آنے لگے، تب یہ سب کام چھوڑ کر رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔

قرآن نے روزے میں کوئی ناقابل برداشت صعوبت انسان پر نہیں ڈالی ہے۔ کھانے پینے اور جنسی ملاپ کی تمام پابندیاں سپیدۂ صبح سے لے کر رات کی تاریکی شروع ہونے تک ہیں۔ رات کی تاریکی شروع ہوتے ہی تمام فطری مطالبات اور جائز خواہشات پوری کرنے کی کھلی اجازت ہے۔

شبِ قدر

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝

ہم نے اس قرآن کو ایک قدر و عظمت والی رات میں نازل کیا۔ جانتے ہو شب قدر

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

(قدر)

کیا ہے۔ وہ ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں پر فضیلت رکھتی ہے۔ اس رات ملائکہ اور روح کا نزول ہوتا ہے جو اپنے رب کے حکم سے تمام امور (روحانی) انجام دینے کے لیے اترتے ہیں وہ رات طلوع فجر تک سراسر امن و سلامتی ہے۔

حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِينِ ۝ إِنَّآ أَنزَلْنٰهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ ۝ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۝ أَمْرًا مِّنْ عِندِنَا إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ ۝ رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

(الدخان ۱، ۶)

حم۔ قسم ہے واضح کتاب کی۔ بے شک ہم نے اس کو ایک مبارک رات میں نازل کیا۔ بے شک ہم انسانیت کو (اس کے ذریعے) خبردار کرنے والے تھے۔ اسی مبارک رات میں تمام حکمت کے معاملا فیصل کیے جاتے ہیں ہمارے بیان سے حکم ہو کر۔ ہم ہی پیغمبروں کو بھیجنے والے آپکے رب کی رحمت سے بے شک وہ سب کچھ سننے والا اور دانا بینا ہے۔

انسانیت کی تاریخ میں وہ رات سنہری رات ہے جس میں خدا نے زمین والوں کی طرف اپنا صحیفۂ ہدایت نازل فرمایا۔ انسان اس سے زیادہ نہ کسی نعمت کا تصور کر سکتا ہے اور نہ آرزو۔ یہ کتاب نہ ہوتی تو انسانیت کی قسمت تاریک ہوتی، اور اس کی قسمت خیر اور بھلائی سے یکسر محروم ہوتی۔ اس رات کی قدر و عظمت کے لیے یہ دلیل کافی ہے کہ خود قرآن اس کی قدر و برکت کی شہادت دیتا ہے ــــ اور شہادت دیتا ہے۔

قرآن ناطق ہے کہ وہ رمضان میں اتارا گیا۔ ۰ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ اور ان آیتوں میں کہا گیا ہے کہ قرآن شب قدر اور شب مبارک میں نازل کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ قدر و برکت کی رات رمضان کی کوئی رات ہے' اور احادیث سے صراحت ہوتی ہے کہ یہ رمضان کے اخیر عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی رات ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس عشرے میں

(باقی آئندہ صفحہ پر)

ماء اللحم

از محمد اسد (لیوپولڈ ویس)
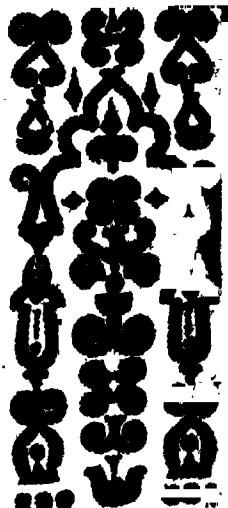
کیا مذہب گزرے زمانے کی چیز ہے؟

(ترجمہ: ش، ن، عثمانی)

ایک جان دار طاقت

انسانی ضمیر کی بالکل ابتدائی مدھم شروعات سے لے کر ہزارہا سال تک مذہب ایک جان دار طاقت بنا رہا ہے جس نے نوع انسان کو کسی نجاتی منزل مقصود کی طرف آگے اور آگے دھکیلا کیا ہے۔ اس کے زیر اثر لوگ پیار اور ایثار کی انتہائی عالی شان بلندیوں تک چڑھ گئے۔ اس نے انسانوں میں تخلیقی قوت کا جوش بھرا اور ناقابل زوال ثقافتی معرکے سر کرنے کی تاب و تواں ان کو بخشی۔

مغرب میں مذہب کا زوال

لیکن اب کیا حال ہے؟

اس واقعہ سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ ہمارے عہد میں مذہب پر زوال آ رہا ہے۔ وقت کی روح مذہبی نظریے کے علی الرغم ہے لیکن یہ وہ روح ہے جو محض مغرب کے تاریخی تجربات سے پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ہے اور جس کا کوئی علاقہ اسلام کے مسئلے سے نہیں۔ کیونکہ اگر مغربی مفکرین مذہب سے پھرتے ہیں تو خود ان کے اپنے مذہب یعنی عیسائیت کے ساتھ ذاتی تجربات کی بنیادوں پر ان لوگوں کی یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے اور انہیں معذور قرار دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے مسلمانوں کے لیے کوئی ایسا عذر قابل قبول نہیں۔ مذہب کے ساتھ مسلمانوں کے تجربات اور مذہب کا اسلامی تصور دونوں بالکل اور ہی نوعیت کے ہیں ــــ اس قدر مختلف کہ پرلے درجے کی بلید الذہنی ہی کسی شخص کو یہ حقیقت سمجھنے میں مانع ہو سکتی ہے کہ نفس مذہب کا اعتبار نہیں اٹھا بلکہ اس مخصوص شکل کا اعتبار اٹھ گیا ہے جو مذہب نے مغرب میں اختیار کر لی ہے۔

اسلام بحیثیت مذہب

اگر مذہب سے مایوسی اور مذہب کے لیے تشکیک زدہ اور متردد ہونے کی شافی وجوہات مغربی مفکروں کے پاس ہیں تو مسلم مفکروں کو

بس ایسی کوئی قابلِ جواز وجہ نہیں، کیونکہ جہاں جہاں مسیحیت کھلے بندوں ناکام ہوئی ہے وہاں اسلام کامیاب رہا ہے۔

— اول یہ کہ انسانی زندگی کو مادی اور روحانی شعبوں میں تقسیم کرنے کی بابت اسلام کچھ نہیں جانتا اور کبھی بھی اس نے مذہب کو محض روحانی حلقہ بنا کر نہیں رکھا۔ وہ نظام جو ہمارے رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی زیست کے ۲۳ برسوں میں پیش فرمایا وہ صرف روحانی امور سے ہی بحث نہیں کرتا اور انفرادی صالحیت ہی کو منزلِ مقصود نہیں بناتا بلکہ تمام تر انفرادی اور سماجی سرگرمیوں کے لیے بھی ایک ڈھانچہ بہم پہنچاتا ہے۔ وہ زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے — اخلاقی، مادی اور اجتماعی — خون اور گوشت پوست کے مسائل — جنس اور روٹی کے مسائل — اخلاقیات اور جمالیات کے مسائل — عبادت اور دینیات کے مسائل کے ساتھ ساتھ ان کو رسولؐ کی تعلیمات میں اصولی مقام حاصل ہے۔ ان کے ذریعہ ہمیں ایک عادلانہ ریاست کی صورت نظر آتی ہے اور اس انداز کے انسان کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو ایک ایسی ریاست کے شایانِ شان ہو۔ ہمیں سیاسی منصوبے کا ایک خاکہ ملا ہے (صرف خاکہ، کیونکہ انسان کی سیاسی اور معاشی ضروریات کی تفصیلات وقت اور زمانے کے ساتھ بدلتی ہیں اور اسی لیے قابلِ اصلاح و ترمیم ہیں) نیز ہمیں فرد کے حقوق اور سماجی فرائض کا ایک ایسا نظام ملا ہے جس میں تاریخی ارتقاء کے تمام امکانات کی پیش بندی کما حقہ کی گئی ہے اور جس طرح مادی شعبوں میں حقیقت کی کوئی تقسیم نہیں ہے اس کا بھی امکان نہیں ہے کہ اس کو فطری اور مافوق الفطرت میدانوں میں بانٹا جائے۔ ایک مومن کے نزدیک ہر وہ شے جو ہے یا جو وقوع پذیر ہوتی ہے دائرۂ فطرت کے اندر ہے۔ کیونکہ فطرت کائنات کی میزانِ کل ہے — خواہ وہ مرئی ہو یا غیر مرئی، ٹھوس یا بسیط۔ اور نام نہاد قوانینِ فطرت اس خاص انداز کے سوا اور کچھ نہیں ہیں جس میں ارادۂ خداوندی منصۂ شہود پر آتا ہے۔ چیزوں کے ایک ایسے نظام میں وجودِ بشر کے اخلاقی اور مادی گوشوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کو الگ الگ کیا ہی نہیں جا سکتا اور اسی لیے وہ "برحق" ہیں۔

کلیسا کا اعتبار شکن رویہ

دوئم یہ کہ یورپ کی سماجی تاریخ میں کلیسا نے جو اعتبار شکن کردار بار بار پیش کیا ہے اسلام کی تاریخ میں اس کا 'ردیف' کوئی نہیں۔

کسی بھی ایک استثناء کے بغیر اسلامی شریعت و فقہ کے ترجمان انسانی حقوق کے انتہائی گرم جوش پاسبانوں میں شامل رہے۔ یہی تھے وہ لوگ جو بار بار شخصی قربانیوں اور کبھی کبھی شہادت کی قیمت پر ظالم و جابر حکمرانوں کے مقابل آئے اور اس طرح اقتدار بر دوش لوگوں کی لوٹ کھسوٹ کے ارادے پر سخت بند لگا ___ یہ علمائے سلف اور اس مذہب کی برکت تھی جس نے مسلم قوموں میں وہ روح دوڑائی کہ وہ اس ذلت و ادبار سے بچی رہیں جو کئی صدیوں تک یورپ میں ہر خاص و عام کا نوشتۂ قسمت بن چکا تھا۔

اسلام میں دین اور سائنس کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہے

سوئم یہ کہ جب کہ عیسائیت اور سائنس کے درمیان ہمیشہ تصادم رہا ہے جس کا مظاہرہ ایک طرف تو ہم کیشانہ، غیر تعقل پسندانہ مذہبی ضابطوں کی شکل میں تو دوسری طرف کلیسا کے ہاتھوں عہد جدید تک سائنٹفک تصور اور سائنس دانوں پر انتہائی سفاکانہ عقوبت کی صورت میں ہوتا رہا ہے۔ ہم اسلام اور سائنس کے درمیان کسی بھی تصادم کا خفیف سے خفیف سراغ لگانے میں قاصر ہیں ___ خواہ وہ تصادم خود تعلیمات میں پایا جاتا ہو یا مسلم علماء کے طرز عمل میں۔

یہ مؤخر الذکر نکتہ ہمارے اس مباحثے میں خاص مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ کیونکہ اس بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ مذہب پر بنیادی مغربی اعتراض عام طور پر عیسائیت کی ماورائیت اور خاص طور پر سائنٹفک ارتقاء کے سلسلے میں اس کی تاریخی مخالفت ہے۔ اگر اس میں ہم اس شدید دباؤ کا بھی اضافہ کرلیں جو اکثر و بیشتر عیسائی احکام شریعت تعقل پسندی پر ڈالتے ہیں تو ہم اس رائج الوقت نعرے "مذہب سائنس کا حریف ہے" کا مفہوم خوب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں لیکن مغربی مفکرین یہ کھوج لگانے کے لیے کبھی نہیں رکتے کہ آیا عیسائی کلیسا کا طرز عمل اور زاویۂ نظر نفس مذہب یعنی ہر مذہب کا خاصۂ طبیعت ہیں کہ نہیں؟ جس تمکنت کے ساتھ وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ تہذیب غرب تمام ممکن تہذیبوں کا بام عروج ہے۔ اسی تمکنت و ناز کے ساتھ وہ یہ بھی ایک امر مسلمہ قرار دیتے ہیں کہ عیسائی اخلاقیات (اگرچہ عملاً خود انھوں نے بھی کبھی اس پر عمل نہیں کیا) وہ بلند ترین اخلاقیات ہیں جو کبھی بھی کسی مذہب کے خواب میں آسکتی ہیں۔ اور صرف کلیسا کی حرکات و سکنات کے سلسلے میں ان لوگوں کے خاص الخاص تعلق خاطر کا ایما ریہ ہے کہ صحیح ہو یا غلط کلیسا کا طور طریق عام پیمانے پر مذہب کو پرکھنے کے لیے کسوٹی کا درجہ رکھتا ہے۔

عیسائیت سائنس کے علیٰ الرغم

اب عیسائیت کیسے جو اقرار یہ طور پر عرصہ دراز تک سائنٹفک تصور سے اختلاف کرتی رہی ہے اور ہمارے زمانے ہی میں شکست خوردگی کے نتیجے میں پیدا شدہ دباؤ میں آکر یہ انکشاف کرنا شروع کیا ہے کہ سائنس اور مذہب میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ دوسرے مذاہب کسی ثقافتی ہار کے نتیجے میں نہیں بلکہ ابتدا ہی سے اس نتیجے پر پہنچ چکے ہوں۔ اس کے علاوہ یہ ممکن نہیں ہے کہ دیگر مذاہب یا کسی اور مذہب کی تعمیر ہی اس نظریے پر کی گئی ہو کہ سائنس اور مذہب کے درمیان کوئی تصادم نہیں۔

سائنس کے لیے اسلام کا طرزِ عمل

یہ امر واقعہ ہے کہ میرا اشارہ اسلام ہی کی طرف ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ سائنس کے سلسلے میں ایک ایسی تصویر پیش کرتی ہے جو اس تصویر سے قطعی مختلف ہے جو عیسائی دنیا نے پیش کی ہے۔ بات صرف یہی نہیں کہ اسلام کبھی سائنس کے خلاف نہیں رہا۔ اس نے تو سائنس کو اور بالعموم عقلی کاوشوں کو عبادت کی تقدیس عطا کی ہے۔ عیسائی کلیسا کے ساتھ تابناک تضاد کے طور پر ــــ جہاں علمائے فن کو جلایا اور ستایا گیا' سائنس کی کثیر کتابوں کو بیدردی کے ساتھ غارت کیا گیا ــــ زندگی کے ہر ہر شعبے میں آزادی کو کچلا گیا ــــ کلیسا کی ان ہولناک کارروائیوں کے برخلاف تاریخ کسی ایک بھی ایسے سائنس داں کی مثال پیش نہیں کر سکتی (خواہ وہ سائنس داں کسی بھی قبیل کا کیوں نہ ہو) جس کو اس کی عالمانہ دریافتوں کے باعث مسلم حکومت کے سلسلے میں عقوبت کا شکار کیا گیا ہو۔ علمائے دین پر عقوبتیں ضرور وارد ہوئیں ــــ یعنی وقتاً فوقتاً ان لوگوں کو کچلنے کی کوششیں ہوئیں جنھوں نے وقت کے کٹر عقائد سے انحراف کیا لیکن سائنس دانوں کو عقوبت کبھی نہیں دی گئی محض اس لیے کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں میں علوم کا عظیم ترین احترام پیدا کیا اور تلاش علم کو ہر ہر مسلمان کا "فریضہ" ــــ مقدس فرض بنا دیا۔ لہٰذا یہ محض کوئی اتفاق کی بات نہیں کہ علم و فضل کے بہت سے مسلمان نقیب جن کے نام اب تمام دنیا میں گھریلو الفاظ کا درجہ اختیار کر چکے ہیں ایک ہی وقت میں سربرآوردہ علمائے دین اور فقیہ تھے انہیں صرف قرآن و سنت ہی اس لیے نظر رکھنی پڑتی تھی کہ وہ یہ پتہ چلا سکیں کہ سائنٹفک معلومات حاصل کرکے وہ اپنے مولا کی حقیقی پرستش کر سکیں گے جب انھوں نے یہ حدیث رسول پڑھی (جس کو البخاری نے نقل کیا ہے) کہ خدا کوئی ایسا مرض نہیں اتارتا جس کا کوئی علاج بھی اس نے نہ اتار دیا ہو۔ تو انھوں نے سمجھ لیا کہ نامعلوم علاجوں کو ڈھونڈھ کر وہ مشیت الٰہی

کو پورا کرنے پر حصہ لینے لگے۔ چنانچہ علمی تحقیقات میں ایک مذہبی فرض کی پاکیزگی داخل ہو گئی۔ انھوں نے یہ آیت پڑھی: "ہم نے ہر شے کو پانی سے پیدا کیا" (قرآن: ۲۱:۳۰) اور ان الفاظ کی گہرائیوں میں اتر جانے کے لیے اپنی کاوشوں میں انہوں نے ذی حیات نامیاتی اجسام کا مطالعہ شروع کیا اور حیاتیات کے علم کی بنیاد ڈال دی۔ قرآن نے ستاروں اور ان کی رفتار میں توافق و ہم آہنگی کو ان کے خالق کی عظمت و کبریائی کے گواہوں کی حیثیت سے پیش کیا اور اس پر ریاضیات اور افلاکیات کے علوم کو مسلمانوں نے بے شک اسی گرم جوشی سے اختیار کیا جو دوسرے مذاہب میں عبادت کے لیے خاص ہے۔ اور اسی طرح انھوں نے عضویات، کیمیائیات اور حیوانیات کو اور ان تمام دوسرے علوم کو اختیار کیا جن میں مسلم زیرکی و فراست کو اپنے انتہائی لازوال آثار چھوڑنے تھے۔

علم و ثقافت کے لیے اسلام کی سرپرستی

اس دور افتادہ زمانے میں ہر مسلمان میں یہ نظریہ رچا بسا ہوا تھا کہ "اہل علم لوگ راہِ خدا کے سالک ہیں" جیسا کہ پیغمبر نے بڑے حسین انداز میں ظاہر فرمایا۔ اور مسلم سماج اور مسلم حکمرانوں کی طرف سے سائنٹفک حقائق کے متلاشیوں کو دیے گئے عظیم ترین اعزاز اور اس عظیم ترین علمی ہمت افزائی کی مثالیں جو سائنسی تحقیقات پر ارزاں کی گئیں گنتی کی سرحدوں کے اس پار پہنچتی ہیں۔ مسلم معاشرے کے تمام تر تخلیقی دور میں یعنی کہنا چاہیے ہجرت کے بعد کی پہلی پانچ صدیوں کے دوران میں سائنس کے پاس مسلم تہذیب سے زیادہ بڑا کوئی ہیرو نہیں تھا۔ اور نہ کوئی اتنا محفوظ تھا جتنے کہ وہ ممالک جہاں اسلام کی حکمرانی تھی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ اسلام ہی تھا جس نے ان ثقافتی کارناموں کا ولولہ پیدا کیا جو نوعِ انسان کی تاریخ کے ایک انتہائی قابلِ فخر صفحہ کو ترتیب دیتے ہیں اور اس نے یہ ولولہ زندگی کے اثبات اور نفس کشی کی نفی — فکر و تدبر کے اثبات اور تاریک خیالی کی نفی، عمل کے اثبات اور ٹھیراؤ کی نفی کر کے پیدا کیا۔

سائنسی علوم حاصل کرنے کی قدر و قیمت

اسلام کا رجحان یہ نہیں کہ مادی دنیا اور عملی سماجی کارکردگی سے لوگوں کے ذہن کو ہٹایا جائے بلکہ اس کے برخلاف اس کا اصرار یہ ہے کہ یہ مادی دنیا تخلیق کا ایک مثبت رخ ہے اور اس کے نتیجے میں سماجی سرگرمیِ عمل یعنی اپنے حالات زندگی کو سدھارنے کے لیے انسانی کوششوں کو اپنے مذہبی مسلمات کا ایک جزو لاینفک بنا دیتا ہے۔ "لاسکافی اور ابدی" میں غیر معمولی شغف کے بجائے اسلام جیسا کہ ہم دیکھ چکے

[illegible] حیات انسانی پر بے حد زور دیتا ہے اور اس طرح وہ عمل کے لیے وہ ولولہ اور ساطی و سماجی پیش رفت کا وہ جواز بہم پہنچاتا ہے جس کو عہد جدید کا اصل تقاضا قرار دیا جاتا ہے اور جس کو تاریخ کے سنگین تحریف کے نتیجے میں تنہ نئے مغرب کا مخصوص ذاتی کارنامہ تسلیم کیا جائے۔

اسلام میں کوئی ٹکراؤ نہیں خلاصہ یہ ہے کہ اسلام اور سائنس کے درمیان نہ کبھی کوئی تصادم تھا اور نہ ہے —— محض اس لیے کہ فطرت انسانی اور اسلام کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں۔ حیات جسمانی۔ حیات ذہنی۔ سماجی نشوونما کے نظام حیات —— زندگی کے تمام ہی مظاہروں پر اس کی تعلیمات مثبت انداز میں کلام کرتی ہیں۔ اور اسی لیے سچائی اور خوشی کو تلاش کرنے میں انسانی سعی کو ہر ممکن عظیم ترین تحریک عطا کرتی ہیں۔

حاصل کلام یہ نعرہ کہ "مذہب گئے گزرے زمانے کی چیز ہے" اپنی روح کے اعتبار سے مغربی دنیا کا نعرہ ہے۔ عالم اسلام میں اس کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ جو لوگ مغربی تہذیب کو "اصل تہذیب" (زمانے جلی کے ساتھ) سمجھ بیٹھنے کے عادی ہو گئے ہیں صرف ان ہی کی کوتاہ نظری نے یہ مان لینا ممکن بنا دیا ہے کہ مذہب پر مغرب کی تنقید جس میں ظاہر ہے مغرب کے تجربات کی کارفرمائیاں ہیں اسلام اور اس کی "صغریٰ کبریٰ" پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ ہم یہ سراغ لگانے سے یکسر قاصر ہیں کہ اسلام کی کوئی بھی اصل تجویز انسانی ضروریات کے فیصلے کے سامنے کسی بھی رخ سے تہی مایہ ثابت ہوئی ہو۔

(الاسلام (انگریزی پندرہ روزہ) کراچی سے ترجمہ کیا گیا)

بقیہ صلا

اعتکاف فرماتے، اور راتوں کو زیادہ سے زیادہ جاگ کر عبادت الٰہی میں مشغول ہوتے۔

حضرت عائشہ رضؓ کا بیان ہے کہ نبی علیہ السّلام رمضان کے آخر عشرے میں راتوں کو زیادہ سے زیادہ شب بیداری فرماتے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے اور اس عشرے میں آپ خدا کی عبادت کے لیے کمر کس لیتے"۔

تنقید و تبصرہ

اسلام اور تعمیر شخصیت

میاں عبدالرشید مدیر ماہنامہ جاوداں۔ صفحات ۳۱۲ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت چار روپیے پچاس پیسے۔ ناشر:- ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور۔

اس کتاب کے بارے میں تبصرہ نگار کا تاثر یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ ایک قابل مطالعہ کتاب ہے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ نے اسے شائع کرکے اچھی خدمت انجام دی ہے۔ اس کتاب کے متعدد پیراگراف مؤثر ہیں اور قاری کے ذہن کو اسلام اور اس کی تعلیمات کی طرف کھینچتے ہیں۔ پوری کتاب پر اسلام پسندی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ اس کتاب کا خاتمہ بھی مؤثر ہے جس میں اہل پاکستان کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اپنے قول و عمل سے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ مصنف کا خیال یہ ہے کہ سائنس کی ترقی نے اسلام کے لئے زمین ہموار کر دی ہے اب یہ اہل پاکستان کا کام ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

کتاب کے دوسرے رخ کی طرف بھی مصنف کو متوجہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے امید ہے کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے۔ سب سے پہلی بات تو یہ محسوس ہوتی ہے کہ اس کتاب میں فنی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے اور کتاب معلومات کا ایک کشکول بن گئی ہے اس میں بہت سے مضامین ایسے داخل کر لیے گئے ہیں جن کا تعلق موضوع کتاب سے بہ تکلف ہی جوڑا جا سکتا ہے۔

دوسری بات، جو مسلمان ذہن کو کوفت میں مبتلا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مصنف نے تخلیق انسانی کے سلسلے میں سائنس کے نظریۂ ارتقاء کو قبول کر لیا ہے اور اس کو قرآن کی بعض آیات سے مستنبط کرنے کی سعی کی ہے حالانکہ یہاں اس استنباط کی گنجائش موجود نہیں ہے۔ اس کوشش [illegible] اس تضاد کو بھی محسوس نہیں کر سکے ہیں جو ان کے کلام میں پیدا ہو گیا ہے۔ ان کی خدمت میں تبصرہ نگار

عرض کرنا ہے کہ اگر آپ انسانی تخلیق کا ابتدائی سرا امیبا اور بوزنہ کے ساتھ جوڑ دیں گے تو شخصیت کی تعمیر کے لیے سامان، انسانیت کے بجائے حیوانیت بن جائے گی۔ انسان فطری و طبعی تقاضے کے تحت اپنے آباء واجداد سے محبت اور ان پر فخر کرتا ہے۔ اگر انسان کو سمجھا دیا جائے کہ اس کے آباء و اجداد اصل میں بندر اور لنگور تھے تو پھر وہ انہیں کو اپنی زندگی کے لیے آئیڈیل بنائے گا اور اس کی شخصیت حیوانیت، مادیت، عریانیت اور مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کے اساسات پر تعمیر ہوگی۔ ایک طرف ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو قبول کرنا اور دوسری طرف انسانوں کو تعمیر شخصیت کے اسلامی اصولوں کی طرف دعوت دینا، اجتماعِ ضدین کی ایک مثال ہے۔ مصنف اگر اپنی کتاب کو اس سے پاک رکھتے تو اچھا تھا اور اب تو نظریہ ارتقاء کے غبارے سے بھی ہوا نکلنے لگی ہے خواہ مخواہ اس کو ڈھوئے پھرنا کیا ضروری ہے۔

تیسری بات یہ کہ آیات قرآنی کے متعدد حوالے صحیح نہیں ہیں۔ یہ بات کتاب کی افادیت کے لیے سخت مضر ہے۔ میں یہاں دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ص۹ پر لکھا گیا ہے۔ "اسی لیے فرماتے ہیں کہ انسانوں کی فطرت، اللہ کی فطرت کے مطابق بنائی گئی ہے" اس عبارت کے لیے سورہ ۳۰ آیت ۳۲ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ حوالہ غلط ہے۔ اس کے علاوہ معلوم نہیں اس عبارت کا مفہوم کیا ہے۔ ص۱۱ پر ہے: "یہاں تک کہ جنین میں کچھ عرصے کے لیے گلپھڑے بھی نمودار ہوتے ہیں جن کی جگہ بعد میں پھیپھڑے لے لیتے ہیں" اس عبارت کے لیے سورہ ۵۳ آیت ۳۵-۲۹ کا حوالہ دیا گیا ہے حالانکہ وہاں اس طرح کی کوئی بات سرے سے موجود نہیں ہے۔ ص۹۶ "وہ جزئیات میں پھنس کر اپنا ایمان ضائع نہیں کرتے۔ اس عبارت کے لیے سورہ ۴۲ آیت ۱۳ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ حوالہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس آیت سے غلط استدلال کیا گیا ہے اور بات اس طرح کہی گئی ہے جیسے یہ اس آیت کا ترجمہ ہو۔ اس طرح کی روش کئی جگہ مصنف نے اختیار کی ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ بعض مقامات پر انھوں نے فقہی مسائل اس انداز میں لکھے ہیں کہ اس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے صدر مملکت اور رہنما کے امام میں جو مشابہت پیدا کی ہے اور اس سلسلے میں جو فقہی مسئلہ لکھا ہے اس میں بہت جھول ہے۔ صفحہ ۱۰۴ ــــــ اسی طرح

صفحہ ۲۰۰ پر قرض دار کی نماز جنازہ کے بارے میں مسئلہ غلط لکھا ہے۔ صفحہ ۲۱۸ پر موت کے وقت ایمان لانے کے بارے میں انھوں نے غلط بات لکھی ہے۔ عذاب میں گرفتار ہو جانے کے بعد ایمان لانے اور موت کے وقت ایمان لانے کے درمیان وہ فرق نہیں کر سکے ہیں۔ صفحہ ۲۲۷ پر انھوں نے بڑے بڑے زاہد اور بظاہر شریعت کے پابند لوگوں کی طرف غلط بات منسوب کی ہے اور ان پر اپنے غصے کا اظہار کر کے ان کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ جو مسئلہ قرآن و حدیث کی نص کی بنیاد پر مختلف فیہ ہو اس میں اپنے سے اختلاف رکھنے والے علماء کی نیت پر حملہ کرنا قرین انصاف نہیں ہے۔ صفحہ ۲۶۳ پر تعدد ازدواج کی آیت کے بارے میں یہ لکھنا کہ وہ یتیموں کے مسئلے کو حل کرنے کی شرط کے ساتھ مشروط ہے آیت کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ صفحہ ۱۷۹ پر انھوں نے علامہ اقبال کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے کہ وہ ملکیت زمین کو جائز نہیں رکھتے تھے اور اس کے لیے "الارض للہ" کو بطور دلیل پیش کرتے تھے۔ یہ انتساب محل نظر ہے۔

امید ہے کہ مصنف آئندہ اڈیشن میں ان مقامات پر نظر ثانی کر کے کتاب شائع کریں گے۔

الرحیم

مدیر محمد سرور۔ چندہ سالانہ آٹھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی۔ صدر حیدرآباد۔ مغربی پاکستان۔

یہ ماہنامہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ ہے جو ۸۰ صفحات پر عمدہ کاغذ اور عمدہ کتابت و طباعت سے آراستہ ہر ماہ شائع ہوتا ہے اور اب تک اس کے سات شمارے نکل چکے ہیں۔ حیدرآباد سندھ میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام اور اس علمی مجلے کی اشاعت سے ہر اس شخص کو خوشی ہوگی جو حضرت شاہ ولی اللہ کی قدر و قیمت سے واقفیت رکھتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب مختلف حیثیتوں سے اپنے وقت کے ان عبقری اساطین علم دین میں تھے جو پوری امت مسلمہ کے لیے سرمایۂ فخر ہوا کرتے ہیں۔ متاخرین کے دور میں حضرت شاہ صاحب تنہا وہ شخص ہیں جنھوں نے اسلام کو ایک ہمہ گیر نظام زندگی کی حیثیت سے سمجھا ہے اور اس کی انقلابی دعوت کو پوری قوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ انہیں کے فیض علم کا ثمرہ تھا کہ ہندستان میں اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد عملاً ایک تحریک بن کر ابھری اور سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت و امارت میں مجاہدین کی وہ مقدس جماعت منظم ہوئی جس نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یاد تازہ کر دی اور جس کی تاریخ، تاریخ ہند کا سب سے روشن اور تابناک حصہ ہے۔

[illegible] مقاصد کو سامنے رکھ کر قائم کی گئی ہے ان میں کا پہلا مقصد یہ ہے "شاہ ولی اللہ کی تصنیفات ان کی اصل زبانوں میں اور ان کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا"

اگر صرف یہی مقصد کما حقہ حاصل ہو جائے تو یہ ایک بڑا کارنامہ اور بہت ہی مفید علمی و دینی خدمت ہوگی جو لوگ عربی اور فارسی زبان جانتے ہیں وہ براہ راست استفادہ کر کے سمجھ لیں گے کہ شاہ صاحب کیا کہتے ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ وہ ان تشریحات کے محتاج نہیں رہیں گے جو مختلف لوگ مختلف انداز میں کر رہے ہیں۔ جب کتاب و سنت کی تشریحات اصل حقیقت کے برعکس کی جا رہی ہیں تو کیا عجیب ہے کہ شاہ صاحب کے مقالات کی تشریح میں الٹی گنگا بہائی جائے اور کیا تعجب ہے کہ ان کے شارحوں اور عقیدت مندوں کا کوئی گروہ، تحریک اقامت دین سے اختلاف کرنے لگے۔ راقم الحروف نے جب الرحیم کے بعض اداریوں میں باشارہ و کنایہ جماعت اسلامی پاکستان کی جدوجہد اور اس کے خیالات پر حرف گیری دیکھی تو حیرت نہیں ہوئی اس لیے کہ محترم مدیر الرحیم جناب محمد سرور صاحب کے خیالات سے واقفیت پہلے سے تھی۔ اسی طرح جب انھوں نے دسمبر ۶۳ء کے شمارے میں "تعبیر کی غلطی" کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا تو اس پر بھی کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اس کتاب کو دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی باچھیں کھل گئی ہوں۔ ۷ صفحات میں اس کی عبارتیں نقل کر کے اس کا تعارف کرایا گیا ہے لیکن آخر میں انھوں نے شاید غیر شعوری طور پر حرف شرط "اگر" کا استعمال کر کے اس بلیغ تعارف پر خود پانی پھیر دیا ہے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں

> "قرآن مجید کی جن آیات پر جماعت اسلامی کے نصب العین، دستور اور مقاصد کا تعین ہوا ہے اور اس کی دعوت کو دین اسلام کا اصل مقصود بنا کر پیش کیا گیا ہے، ان پر بحث ہے اور مفسرین کرام کے بیانات سے ثابت کیا گیا ہے کہ ان آیات کا وہ مفہوم ہی نہیں جو مولانا مودودی نے اخذ کیا ہے۔ اور اگر یہ بات صحیح ہے تو یقیناً جماعت اسلامی کی وہ دینی و فکری بنیاد ڈھ جاتی ہے جس پر کہ اس کی موجودہ عمارت کھڑی ہے۔"

خط کشیدہ عبارت پڑھیے۔ یہ "اگر" ایک اور "اگر" کا متقاضی تھا جسے فاضل مدیر نے لکھنا پسند نہ کیا۔ وہ "اگر" یوں ادا کیا جا سکتا ہے "اور اگر یہ بات صحیح نہیں ہے تو یقیناً "تعبیر کی غلطی" ایک بے معنی اور لا حاصل کتاب ہے جس کی کوئی علمی اساس موجود نہیں ہے"۔ اس کے بعد راقم الحروف سرور صاحب کی

خدمت میں عرض کرتا ہے کہ اگر "تعبیر کی غلطی" والی بات صحیح ہو تو صرف جماعت اسلامی کی دینی و فکری بنیاد نہیں ڈھے گی بلکہ تصورِ دین کی وہ عمارت بھی زمین پر آرہے گی جو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء میں تعمیر کی ہے۔ زندگی، جنوری ۱۹۶۴ء میں ایک مقالہ "اقامت دین ـــ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے افکارِ عالیہ کی تلخیص و توضیح ـــ" شائع ہوا ہے۔ عرض ہے کہ سرور صاحب اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں ـــ ایک بات اور قابل لحاظ یہ نظر آئی کہ فاضل مدیر نے "تعبیر کی غلطی" کے اس حصے سے ایک سطر بھی نقل نہیں کی جس میں مصنف نے اپنا تصورِ دین اور پروگرام پیش کیا ہے۔ کسی کتاب کے تعارف کا آخر یہ کون سا طریقہ ہے، کیا سرور صاحب کو صرف جماعت اسلامی کی تخریب سے دلچسپی ہے؟

بہرحال میں "الرحیم" کا خیر مقدم کرتا ہوں اور یہ حقیر مشورہ بھی دیتا ہوں کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کو غلط رنگ میں پیش کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

تعمیر حیات

ایڈیٹر: محمد الحسنی۔ معاون مدیر سعید الرحمٰن الاعظمی۔ سالانہ چندہ پانچ روپیے۔ فی پرچہ ۲۵ نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

پندرہ روزہ تعمیر حیات کے تین شمارے اب تک نکل چکے ہیں۔ ندوہ کے شعبۂ تعمیر و ترقی نے یہ پندرہ روزہ اخبار شائع کر کے ایک مفید اور ضروری قدم اٹھایا ہے۔ تبصرہ نگار کو شعوری زندگی کی ابتدا ہی سے جب وہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے دلچسپی رہی ہے جن مقاصد کو سامنے رکھ کر اس کی بنیاد ڈالی گئی تھی ان سے کسی ایسے شخص کو اختلاف نہیں ہو سکتا یا نہیں ہونا چاہیے جو اسلام کو وقت کی ایک متحرک اور کارآمد قوت دیکھنے کا متمنی ہو۔ موجودہ دور کے علوم و فنون حالات اور فضا سے آنکھیں بند کر کے فرسودہ نصاب تعلیم پر اصرار پہلے بھی مضر تھا اور اب بھی مضر ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی قیادت میں ندوہ کی گزشتہ تاریخ اور کارناموں کا جائزہ لے کر آئندہ کے لیے نقشۂ عمل کی ترتیب کا آغاز کر دیا گیا ہے اور خود ندوہ کے نصاب پر بھی نظر ثانی کی جا رہی ہے ـــ وہاں چند سال سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام بھی کام کر رہی ہے اور اب مجلس تحقیقات شرعیہ کی داغ بیل بھی

...اس نے بھی کام شروع کردیا ہے' اس لیے ضرورت تھی کہ وہاں سے کوئی اخبار نکالا جاتا تاکہ ان سب کے بارے میں تازہ بتازہ خبریں بھی ملتی رہیں اور اس سے ان سب کی ترقی کے لیے بھی کام لیا جاسکے۔ ماشاءاللہ یہ پندرہ روزہ اپنی کتابت وطباعت اور مضامین کے اعتبار سے ندوہ کے شایانِ شان ہے۔ امید ہے کہ یہ ترقی ہی کی طرف قدم بڑھاتا رہے گا۔ ہم اپنے اس معاصر کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

پندرہ روزہ "وفاق" کراچی مدیر اعلیٰ شجاعت علی صدیقی۔ چندہ سالانہ آٹھ روپے ششماہی چار روپے۔ فی پرچہ ۲۵ نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر وفاق، ۱۴ ایسٹ بلاک، پی' ای' سی' ایچ' ایس' کراچی ۲۹ مغربی پاکستان۔

جناب شجاعت صدیقی نے جو ریٹائرڈ ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل ہیں' یہ دینی وعلمی پندرہ روزہ نکالا ہے' اس کے اب تک آٹھ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ فوجی ملازمین میں صحیح دینی عقائد وخیالات رکھنے والے آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ وفاق کے مطالعے سے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اس کے مدیر اعلیٰ صحیح دینی عقائد وخیالات رکھتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ دین کی سربلندی اور اس کی اشاعت کے لیے بھی کوشش کر رہے ہیں۔ آٹھویں شمارے میں انھوں نے اسلامی وشرعی بینک کی ایک اسکیم پیش کی ہے۔ "اقتصادیات" سے دلچسپی اور اس کا علم رکھنے والوں کو اس اسکیم کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ بحیثیت مجموعی یہ پندرہ روزہ لائقِ مطالعہ اور مستحق تعاون ہے۔

صدیق حسن نمبر صفحات ۴۰ رنگین منقش ٹائٹل' قیمت پچاس نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر ندائے ملت' باغ گونگے نواب۔ لکھنؤ۔

ریاست اترپردیش کے سینیر ممبر بورڈ آف ریونیو سید صدیق حسن مرحوم کی یاد میں یہ نمبر شائع کیا گیا ہے۔ تبصرہ نگار ذاتی طور پر مرحوم سے واقف نہیں' لیکن یہ نمبر پڑھنے کے بعد ان کی زندگی کا ایک جیتا جاگتا نقشہ نگاہوں کے سامنے آگیا۔ وہ اپنے ذاتی اوصاف کے لحاظ سے ضرور اس لائق تھے کہ اس سے بھی ضخیم نمبر ان کی یاد میں شائع کیا جاتا۔ تمام مضامین میں تین باتیں مشترک ہیں۔ مرحوم کا تواضع

خوش اخلاقی اور جذبۂ خدمت خلق۔ جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں حبیب احمد صدیقی صاحب کا مضمون تبصرہ نگار کو بہت مؤثر اور پُرسوز محسوس ہوا۔

موجودہ نظام حکومت میں اتنے اونچے منصب کے ساتھ جس پر مرحوم فائز تھے، ان صفات کے افراد نادر الوجود کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ جب مذہب کے ساتھ ان کی وابستگی اور ان کے جذبۂ دینی کا حال ہم پڑھتے ہیں تو ان کی موت ایک بڑا سانحہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ بھارت میں وہ مسلمان ملازمین حکومت ہی کے لیے نمونہ نہ تھے بلکہ ان کی اصولی اور جرأت مندانہ زندگی میں اسمبلی اور پارلیمینٹ کے مسلمان ممبروں کے لیے بھی سبق موجود ہے۔

تبصرہ نگار کی رائے میں خصوصیت کے ساتھ ہر سرکاری ملازم اور اسمبلی اور پارلیمینٹ کے ہر مسلمان ممبر کو یہ نمبر پڑھنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ایک شخص سیکولر نظام کے عین منجدھار میں رہتے ہوئے کس طرح ایک مذہبی اور ہر دلعزیز انسان بن سکتا ہے۔ دنیا میں رائج سیکولر نظام حکومت بے شمار خرابیوں کی جڑ ہے لیکن اس نظام کی ملازمت کرتے ہوئے بھی اگر نیکی، انسانیت اور شرافت کا ثبوت دیا جائے تو یہ چیز یقیناً قابل قدر ہی ہوگی۔ ندائے ملت کے سالنامہ نمبر میں مرحوم کی طنزیہ نظم پڑھ کر ان کی شاعرانہ صلاحیت اور اچھے خیالات کا اندازہ ہوا تھا اور اب اس نمبر میں ان کا جو مقالہ چھپا ہے اور معارف میں جو بسیط مقالہ شائع ہو رہا ہے اس سے ان کے دینی ذوق اور کتاب و سنت کے مطالعہ سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ مرحوم نے سالہا سال سے جس درس قرآن کا اہتمام کر رکھا تھا وہ ان کی وفات کے بعد بھی جاری رہے گا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی کوتاہیوں کو معاف اور ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے۔

مخزن الولایۃ (اردو ترجمہ) صفحات ۲۰۰، کتابت، طباعت، کاغذ بہتر قیمت مجلد تین روپیہ
ناشر: پاک اکیڈمی ۱/۴۸ وحید آباد، گولی مار، کراچی ۱۸

پاک اکیڈمی جناب محمد ایوب قادری ایم اے کی رہنمائی میں صوفیہ کرام کے سوانح حیات اور ان کی تصنیفات شائع کر کے مفید خدمت انجام دے رہی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب شاہ خادم صفی محمدی

حسنی پربات الملتوفی... کے فارسی ملفوظات کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ملفوظات جناب منشی ولایت علی عزیز صفی پوری نے مرتب کیے تھے اور اس کا ترجمہ جناب محمد خصلت حسین صابر ڈپٹی انسپکٹر مدارس پنشنر نے کیا ہے۔ جناب مترجم نے ابتدا میں ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ ان کے خلفا نیز بزرگان سلسلہ صفویہ مینائیہ کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ اس سے صاحب کتاب حضرت شاہ خادم صفی کے حالات بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔ مخزن الولایت کی تقریظ اور مقدمہ جو عربی زبان میں لکھا گیا تھا اس کے بارے میں مترجم نے لکھا ہے کہ اس کو علیحدہ ایک کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا

صوفیہ اپنے ملفوظات میں جو کچھ فرماتے ہیں ان سب سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔ اصل معیار تو کتاب و سنت ہے جو کچھ اس کے مطابق ہو لائق اخذ ہے۔ راقم الحروف کو پوری کتاب پڑھنے کی فرصت نہیں ملی اس لیے یہ مختصر تعارف لکھنا پڑا ورنہ تبصرے میں بہت دیر لگتی۔

ہمارا تعلیمی مسئلہ تقریباً ۱۶ صفحات کا یہ مختصر پمفلٹ مدھیہ پردیش دینی تعلیمی کانفرنس بھوپال نے پیش کیا ہے۔ اس پمفلٹ پر بقامت کہتر، بقیمت بہتر کا محاورہ پوری طرح صادق آتا ہے۔ حالات کا گہرا جائزہ، اہمیت تعلیم کا بصیرت افروز تجزیہ اور دینی تعلیم کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے مفید تدابیر۔ یہ ہے اس پمفلٹ کا خلاصہ۔ سونے پر سہاگہ اس کی ادبی زبان ہے۔ فکر و فن کے سانچے میں ڈھل کر مؤثر بن گئی ہے اور عقل کے ساتھ جذبات کی آمیزش نے اسے دو آتشہ بنا دیا ہے جو لوگ ہندستان میں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے مسئلے سے دلچسپی رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ دلچسپی مسلمانوں میں عام ہو، ان کے لیے اس پمفلٹ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

رسول نمبر مرتبہ محمود الحسن بدایونی صفحات ۲۲ قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ:۔ دفتر ماہنامہ "مومن" ناہر خاں، بدایوں۔

ماہنامہ مومن بدایوں جناب محمود الحسن بدایونی کی ادارت میں بہت عرصے سے نکل رہا ہے۔ اس نمبر میں ان کا فوٹو بھی شائع کیا گیا ہے اور اس کے نیچے ذیل کی عبارت ادارۂ مومن کی طرف سے درج ہے

"یہ اس دیوانے محمود کی شبیہ ہے جو کس مپرسی کے عالم میں کامل تیس سال سے مومن کو

کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور جس نے اپنی زندگی کے پورے پچاس سال قوم کی بے لوث خدمت میں گزارے ہیں۔ کاش! قوم اس دیوانے کا کچھ خیال کرے اور دوام و درم اور قلم و کرم سے اس کا کچھ ساتھ دے۔"

مسلمانوں میں پیدائش سے لے کر موت تک جو مسرفانہ اور غیر مشروع رسوم رائج ہیں ان کی قباحت و شناعت پر ہر دین دار اور صاحب علم مسلمان متفق ہے لیکن اس کے باوجود ان رسوم کی انجام دہی میں کوئی خاص کمی نہیں ہو رہی ہے۔ اس کے اسباب پر غور کرنا چاہیے ——— ادارۂ "...." نے یہ نمبر شائع کر کے مفید خدمت انجام دی ہے۔ (ع ق)

ماہنامہ "انوار اسلام" کی پانچ خصوصی اشاعتیں

(مؤلفہ: ابو محمد امام الدین رام نگری)

- حقیقت جزیہ نمبر ——— جزیہ سے متعلق مخالفین اسلام کے تمام اعتراضوں کا مکمل جواب۔ قیمت ۶۲
- آواگمن کا تحقیقی جائزہ نمبر ——— ہندو شاستروں کے مستند حوالوں سے آواگمن یعنی عقیدہ تناسخ کا مدلل رد۔ قیمت ایک روپیہ۔
- عقیدۂ آخرت کے عقلی دلائل نمبر ——— کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ آواگمن کا تحقیقی جائزے ساتھ تقابلی مطالعہ کیجیے۔ قیمت اسی پیسے
- دلائل القرآن نمبر حصۂ اول
- 〃 حصۂ دوم
- 〃 حصۂ سوم (زیر طبع)

} بانیِ آریہ سماج سوامی دیانند کے قرآن مجید سے متعلق دل آزار گمراہ کن اعتراضوں کا قرآن مجید ہی سے محققانہ جواب۔ قیمت دو حصے ایک روپیہ ساڑھے نئے پیسے

چار روپیہ سالانہ چندہ منی آرڈر سے بھیج کر "انوار اسلام" کے خریدار اپنے چندے ہی میں یہ پانچوں اشاعتیں جلد از جلد منگا لیں ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

پتہ:- دفتر "انوار اسلام" رام نگر، بنارس

بقیہ ارشادات رسولؐ (مشعلؐ)

جو لوگ نیچے کے درجہ میں تھے وہ اوپر چڑھتے اور سمندر سے پانی حاصل کرتے، پانی نیچے کے درجے میں لانے سے اس کی کچھ چھینٹیں اوپر کے درجے والوں پر پڑ جاتیں۔ اس تکلیف کی وجہ سے اوپر والوں نے کہا۔ ہم تمہیں اجازت نہ دیں گے کہ تم اوپر چڑھو اور ہمیں تکلیف پہنچاؤ یہ سن کر نیچے کے درجے والوں نے کہا۔ تب ہم اپنے حصے میں سوراخ کر کے پانی حاصل کریں گے۔ تو اگر اوپر والوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے اور ان کو روکا تو سب سلامت رہے اور اگر انہیں چھوڑ دیا تو سب ڈوبے۔

"حدود اللہ کو قائم کرنے والے سے مراد وہ شخص ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے رہا ہو جیسا کہ محدثین نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت و اہمیت واضح کرنے کے لیے یہ تمثیل ایک انتہائی بلیغ تمثیل ہے۔ اس پیرایۂ بیان میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر معروف کو پھیلانے اور منکر کو مٹانے کی کوشش ترک کی گئی تو اس کا اثر صرف انہیں لوگوں پر نہیں پڑے گا جو منکرات میں مبتلا ہوں گے بلکہ پورا معاشرہ متاثر ہوگا، بگڑے گا اور خدا کے غضب کا مستحق قرار پائے گا۔ کشتی کی مثال دے کر اس حقیقت کو مشاہدے کی حد تک واضح کر دیا گیا ہے۔ امت مسلمہ ایک کشتی کی مسافر ہے اور اس کی سلامتی موقوف ہے کشتی کی سلامتی پر جب تک تمام مسافر کشتی کو تباہ کرنے والی ہر حرکت پر کڑی نظر نہ رکھیں وہ سلامت نہیں رہ سکتی۔ وہاں ایسی حرکتوں سے غفلت کے معنی موت ہیں۔

اس تمثیل سے ضمنی طور پر چند اور باتیں واضح ہو رہی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر معاشرے کی طرح، مسلم معاشرہ بھی خواص و عوام سے مرکب ہے۔ اوپر کے درجے والے" خواص ہیں اور نچلے درجے والے عوام ہیں خواص میں امراء و حکام، علماء و مشائخ، صلحاء و اتقیاء سبھی داخل ہیں۔ عوام ان کے پاس مادی و معاشی ہر طرح کی ضروریات کے لیے جاتے ہیں ان کی تمام ضروریات کے مرجع در اصل یہی لوگ ہوتے ہیں۔ طبقہ خواص کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ عطا فرماتا ہے اس میں عوام کے حقوق کا بھی ایک بڑا حصہ ہوتا ہے عوام ان سے اپنے حقوق کا مطالبہ ضرور کریں گے اور اس سے طبقہ خواص کو ایک طرح کی تکلیف بھی پہنچے گی۔ اب اگر وہ عوام کے حقوق ادا نہیں کرتے، انہیں جھڑک دیتے ہیں، اپنے پاس انہیں نہیں آنے دیتے

تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے غلط طریقے اختیار کریں اور جرائم کا ارتکاب کریں ـــــ دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام کو درست اور نافذ رکھنا اہل طبقۂ خواص کا کام ہے حکومت کی ذمہ داری ہے جب تک کوئی ایسی قوت حاکمہ موجود نہ ہو جو مجرموں کے ہاتھ پکڑ سکتی ہو اس وقت تک مسلم معاشرے کی کشتی سلامت نہیں رہ سکتی۔ تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ طبقۂ خواص اور حکومت کو جیسے ہی یہ خبر ملے کہ معاشرے کے کچھ لوگ ارتکاب جرم کا ارادہ کر رہے ہیں۔ فوراً انہیں اپنے بلند درجے سے نیچے اتر کر ان کے پاس پہنچنا چاہیے اور اصلاح حال کی سعی کرنی چاہیے۔ اوپر بیٹھے بیٹھے محض حاکمانہ ڈر کافی نہیں ہے اگر انھوں نے اس سے غفلت برتی تو ان کی بلندی بھی پستی میں بدل کر رہے گی۔

دعوت الی الخیر کی بہترین ترغیب

حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس کسی نے کسی خیر کی طرف رہنمائی کی تو اس کو اس خیر کے فاعل کے مثل اجر ملے گا۔ (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث اسی مضمون کی یہ ہے:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی ہدایت کی طرف لوگوں کو دعوت دی تو اس کا اجر اس ہدایت پر عمل کرنے والوں کے مثل ہوگا اور اس سے ان کے اجر و ثواب میں کچھ بھی کمی واقع نہ ہوگی اور جس نے کسی گمراہی کی طرف لوگوں کو بلایا تو اس کا گناہ اس کی پیروی کرنے والوں کے مثل ہوگا اور اس سے ان کے گناہوں میں کچھ بھی کمی واقع نہ ہوگی۔

(مسلم)

یہ دونوں حدیثیں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے بے انتہا کرم کی دلیل ہیں اور دوسری طرف دعوت الی الخیر کی بہترین ترغیب۔ خیر و ہدایت کے الفاظ میں ایمان و اسلام سے لے کر راستے سے کانٹے ہٹانے تک کی نیکی داخل ہے۔ یہ حدیثیں آخرت کے بلند سے بلند درجات اور وہاں کے بے حساب اجر و ثواب پر یقین رکھنے والے مومن کے دل میں دعوت و تبلیغ کی بے انتہا ترغیب پیدا کرتی ہیں۔ تصور تو کیجئے کوئی ایک کافر بھی اگر کسی مومن کی دعوت و تبلیغ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا تو اس مومن کے اجر کا حساب کون لگا سکتا ہے۔ کوئی ایک فاسق بھی اپنے فسق و فجور سے تائب ہو کر [illegible]

کسی خواندہ مسلمان کو قرآن پڑھنا سکھادیا۔ اب غور کیجیے کہ یہ ایک نیکی کتنی نیکیاں سمیٹ لائے گی۔ قرآن پڑھانے والے کے لیے یہ نیکی ایک خیر جاری ہے جس کا سلسلہ اس کے مرنے کے بعد تک دراز ہو سکتا ہے۔ اب ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم دنیا کی تجارت اور اس کے کاروبار کے لیے تو ایک ایک پیسے اور اس کے نفع کا حساب لگاتے ہیں لیکن آخرت کی تجارت کے حساب کتاب سے یا تو بے خبر رہتے ہیں یا اس کے جوڑ گھٹاؤ سے دلچسپی نہیں لیتے۔

[illegible] جماعت کی وحدت دینے والے کے ثواب کی مقدار کیا ہوگی کیا اسے دنیا کے کسی پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے؟

وحدت واجتماعیت

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن، مومن کے لیے ایسا ہے جیسے عمارت کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے یہ کہہ کر آپ نے اپنی انگلیوں کے درمیان تشبیک فرمائی (یعنی ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیں) (بخاری و مسلم)

اسی طرح کی ایک حدیث حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے:۔

مومنوں کی مثال ان کے آپس کی مودت و رحمت اور مہربانی و شفقت میں ایسی ہے جیسے انسان کا جسم جب اس کا کوئی عضو بیمار ہوتا ہے تو جسم کے باقی اعضا اس کے لئے بیداری اور بخار کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

یہ دونوں تمثیلیں امت مسلمہ کی وحدت واجتماعیت کو واضح کرنے کے لیے بہترین ادبی تمثیلیں ہیں۔ بنیان (عمارت) اور جسد (جسم) کی تمثیل سے اسلامی اجتماعیت کی نوعیت اور اس کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

مغربی دانشوروں اور فلسفیوں نے "فرد" اور "جماعت" کی حیثیت اور ان کے درمیان تعلق کے بارے میں اعتدال و توسط کی راہ ترک کردی ہے۔ کہیں تو فرد کو جماعت میں اس طرح ضم کردیا گیا ہے کہ اس کا اپنا تشخص و انفرادیت گم ہو کر رہ گئی ہے اور کہیں اس کو اتنی آزادی بخش دی گئی ہے کہ وہ جماعت کے لیے مضر اور نقصان دہ بن گیا ہے۔ یہ دونوں تمثیلیں اسلامی اجتماعیت کی جو نوعیت ہمارے سامنے لاتی ہیں

ویہ ہے کہ مسلمان فرد نہ تو جماعت میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اس کا اپنا تشخص و امتیاز غائب ہو جائے
رنہ اس کی انفرادیت اتنی آگے بڑھتی ہے کہ وہ جماعت کے لیے خطرہ بن جائے بلکہ مسلمانوں کا ہر فرد
باعلیحدہ تشخص و امتیاز رکھتے ہوئے پوری جماعت کا ہمدرد و غمخوار اور دمساز و مددگار ہوتا ہے۔

کسی عمارت کے تمام اجزاء مل کر وحدت کا رنگ اختیار کرتے اور "واحد عمارت" بنتے ہیں لیکن
کے باوجود ہر حصہ دوسرے حصے سے ممتاز بھی ہوتا ہے' یہی حال انسانی جسم کا بھی ہے۔ اتحاد و اتفاق
لیے "شیر و شکر" کی تمثیل بھی مستعمل ہے لیکن اسلامی اجتماعیت و اتحاد کو واضح کرنے کے لیے یہ تمثیل ناقص ہے
جسد کی تمثیل سے ایک اور حقیقت سمجھ میں آتی ہے جسم کے مختلف اعضاء میں اللہ تعالٰے نے مختلف صلاحیتیں
ہیں اور اپنی صلاحیت کے مطابق ہر ایک کا ایک مخصوص کام ہے۔ آنکھیں دیکھتی ہیں اور سن نہیں
تیں، کان سنتے ہیں اور دیکھ نہیں سکتے۔ معدے کا کام غذا کو ہضم کرنا ہے اور دماغ کا کام غور
رکرنا۔ اسی طرح اللہ تعالٰے نے انسانوں کو مختلف صلاحیتیں دی ہیں اور ہر ایک وہی کام اچھی طرح
ام دے سکتا ہے جس کی وہ صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک شخص غور و فکر کی قوت کم رکھتا ہے اور جسم
وت زیادہ۔ دوسرا شخص جسمانی قوت کے لحاظ سے کمزور ہے لیکن اس کی قوتِ فکر یہ بہت بڑھی
ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں شخص ایک ہی نوعیت کے کام بہتر طور پر انجام نہیں دے سکتے۔ اجتماعی
وبار کو درست رکھنے کے لیے افراد کی فطری صلاحیتوں کا لحاظ ضروری ہے۔

ـت دین

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی طریقے کی پیروی کرنی ہی چاہے تو اسے
اس کی پیروی کرنی چاہیے جو وفات پا چکا۔ اس لیے کہ زندہ انسان کے بارے میں یہ اطمینان نہیں ہو سکتا
کہ وہ فتنے میں مبتلا نہ ہوگا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اصحاب (جو وفات پا چکے) اس امت کے
سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والے لوگوں میں تھے۔ ان کے دل سب سے زیادہ نیک، ان کا علم
سب سے زیادہ گہرا اور ان کی زندگیاں تکلف سے خالی تھیں۔ اللہ نے انھیں اپنے نبی کی رفاقت اور
اپنے دین کی اقامت کے لیے منتخب فرمایا۔ تو اے لوگو! ان کے فضل و شرف کو پہچانو، ان کے
نشانات قدم کی پیروی کرو، اور حسب استطاعت ان کے اخلاق اور ان کی سیرتوں کو مضبوطی سے
تھامو اس لیے کہ وہ ہدایت کے سیدھے راستے پر تھے[1] (مشکوٰۃ)

---

[1] حدیث پر مفصل گفتگو زندگی ماہ اکتوبر ۶۲ء میں کی گئی ہے۔

یہ حدیث براہ راست اس مقصد حیات کی تعیین کرتی ہے جس کے لیے امت مسلمہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ہر سوچنے والے مومن کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اسے اپنی تمام جدوجہد کا مرکز کس چیز کو بنانا چاہیے؟ یہ حدیث اس اہم سوال کا جواب مہیا کرتی ہے۔

تمام دنیا کی امت مسلمہ کے اسلاف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ وہی براہ راست وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا اور كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے مخاطب اول تھے۔ انہیں جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا تھا وہی مقصد پوری امت مسلمہ کا نصب العین ہے۔ اسلاف اور اخلاف کے مقصد حیات میں تفریق نہیں کی جا سکتی۔ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ نبی اور اس کی امت کے مقصد حیات میں فرق نہیں ہوتا۔ جس کام کے لیے نبی مبعوث ہوتا ہے اس کے صحابہ اور اس کی امت کے لوگ اس کام میں اس کے معین و مددگار اور نائب ہوتے ہیں۔ اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بصراحت فرما رہے ہیں کہ:۔

اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهِ — اللہ نے ان کو اپنے نبی کی رفاقت اور اپنے

وَلِإِقَامَةِ دِينِهِ - دین کی اقامت کے لیے منتخب فرمایا

اس صراحت کے بعد اس بات میں کیا شبہ باقی رہتا ہے کہ صحابۂ کرام کی زندگی کا مقصد اقامت دین تھا۔ عقلاً تو یہ بات ثابت ہی ہے کہ نبی اور اس کے ساتھیوں کے کام اور مقصد میں فرق نہیں ہوتا، لیکن اس حقیقت کو صرف عقل کے بھروسے پر نہیں چھوڑا گیا ہے بلکہ آیات و احادیث میں اس کی صراحتیں موجود ہیں اور توریت میں بھی ہیں۔ اس حدیث کے آخری ٹکڑے کا ترجمہ یہ ہے:۔

اللہ اس وقت تک ان کی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی) روح قبض نہ کرے گا جب تک ان کے ذریعہ کج دین کو سیدھا نہ کرے گا اس طرح کہ لوگ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہنے لگیں پس وہ اس دین مستقیم کے ذریعہ بہت سی اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور بند دلوں کو کھولے گا[1]

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ اللہ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جس مقصد کے لیے مبعوث فرمایا تھا وہ اقامت دین کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس وقت اس موضوع پر تفصیلی گفتگو مقصود نہیں ہے اس لیے اتنا اشارہ کافی ہے

---

[1] یہ پوری حدیث متن کے ساتھ مقالہ "بعثت محمدی کا مقصد" میں پیش کی گئی ہے جو زندگی ماہ اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ہے

ان دو احادیث سے ہمیں جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری تمام جد و جہد کا مرکز آخرت

ہونا چاہیے۔

مجاہدہ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو نعمتیں

ایسی ہیں جن میں بہت لوگ گھاٹا اٹھاتے ہیں۔ صحت اور فراغت۔

حدیث شریف میں "مغبون" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ غَبن تجارت اور بیع و فروخت میں گھاٹا اٹھانے کو کہتے ہیں۔ وہ تاجر سخت بے وقوف ہے جو تجارت کی گرم بازاری کے باوجود اپنی پونجی کو بے کار معطل رکھتا ہے۔ اسے تجارت میں لگا کر نفع نہیں کماتا۔ اسی طرح وہ مسلمان بھی بہت احمق ہے جو اپنے فارغ وقت کو صحت کے باوجود بے کار گنوا دیتا ہے اسے اللہ کی عبادت و اطاعت میں لگا کر آخرت کا بے حساب اجر حاصل نہیں کرتا۔ اس حدیث میں صحت و فراغت کو راس المال (پونجی) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ دنیوی تاجر کے مقابلے میں مسلمان کی حماقت اس لیے بڑھی ہوئی ہے کہ دنیا کی تجارت میں نفع کے ساتھ نقصان کا اندیشہ بھی موجود ہے لیکن آخرت کی تجارت میں گھاٹے کا کوئی خطرہ نہیں۔ دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ دنیا کی کوئی تجارت وہ نفع نہیں دے سکتی جو آخرت کی تجارت میں حاصل ہوتا ہے۔ اس کے نفع کی کم سے کم شرح دس گنا ہے۔ ایک نیکی کے بدلے میں دس اجر۔ مثال کے طور پر راہ خدا میں خرچ کیے ہوئے ایک روپیے کے بدلے میں کم سے کم دس روپیہ اور زیادہ کی کوئی حد نہیں، ویسے سات سو گنے تک کا ذکر تو قرآن میں موجود ہے۔ ایک روپیے کے بدلے میں سات سو روپے، کیا دنیا کی کوئی بھی جائز تجارت اتنا نفع دے سکتی ہے؟

یہ حدیث، ثواب آخرت کے طلب گار مومن کو مجاہدے کی ترغیب دیتی اور محنت پر ابھارتی ہے، اسے آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنی صحت و فراغت کے ایک ایک لمحے کو اس سو فی صدی کامیاب تجارت میں لگا دے۔ مومن کو اس مجاہدے کی ترغیب اس حالت میں بھی دی گئی ہے، جب خدا کا دین دنیا میں قائم اور نافذ ہو تو اس سے اندازہ لگانا چاہیے کہ جب وہ قائم و نافذ نہ ہو تو اسے برپا کرنے کے لیے کس محنت و جانفشانی اور کس مجاہدے کی ضرورت پڑے گی۔

استقامت و اعتدال

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعتدال اختیار

کرو اور صحت و استقامت کے ساتھ کام کرو اور یہ جان لو کہ تم میں سے کوئی شخص بھی صرف اپنے عمل سے ہرگز نجات نہیں پائے گا۔ صحابہ نے پوچھا۔ کیا آپ بھی نہیں یا رسول اللہ! فرمایا۔ نہیں، میں بھی نہیں الّا یہ کہ اللہ مجھے اپنے فضل و رحمت سے ڈھانک لے۔ (مسلم)

اس حدیث میں تین باتوں کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ تینوں مومنانہ زندگی کے لیے انتہائی اہم ہیں اعتدال و توازن۔ صحت و استقامت۔ تواضع و عبدیت

اعتدال و توازن اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اپنی زندگی کو افراط و تفریط سے پاک کر لیا جائے اور عبادت و اطاعت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اسوہ بنایا جائے اس لیے کہ دنیا میں اعتدال و توازن کا کامل نمونہ صرف حضور ہی کی زندگی ہے۔

صحت کے معنی یہ ہیں کہ جو عبادت کی جائے ان حدود و شروط کے ساتھ کی جائے جو شریعت نے مقرر کر دی ہیں، جو کام کیا جائے صحیح طور پر کیا جائے اور استقامت کے معنی یہ ہیں کہ ہم اللہ کی عبادت و اطاعت پر جم جائیں۔

تواضع اور عبدیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہزار عبادت و اطاعت کے باوجود گھمنڈ پیدا نہ ہو اور آخرت کی نجات کے لیے صرف خدا کے فضل و کرم پر بھروسہ کیا جائے۔ علم و عبادت کا تکبر بدترین قسم کا تکبر ہے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں :-

تکبر عزازیل را خوار کرد ۔۔۔ بزندان لعنت گرفتار کرد۔

جلد:۔ ۳۲
شمارہ:۔ ۳

شوال ۱۳۸۳ھ
مارچ فروری ۱۹۶۴ء

زندگی رامپور

(مدیر:۔ سید احمد قادری)

• خط و کتابت و ارسالِ زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور۔ یوپی
• زرِ سالانہ ــــ پانچ روپیے ــــ ششماہی ــــ تین روپیے ــــ فی پرچہ ــــ پچاس پیسے
• ــــ ممالکِ غیر سے دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
• پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ شہاب ۱۱/۲ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر:۔ سید احمد صاحب قادری۔ پرنٹر پبلشر:۔ احمد حسن۔ مطبع:۔ دہلی پرنٹنگ پریس
دفتر اشاعت:۔ ماہنامہ زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

کلکتہ اور اس کے آس پاس کے مقامات پر انسان کی حیوانیت و بہیمیت نے جو حملے کیے اور ان کے نتیجے میں جو بھیانک تباہی آئی، اس نے بھوپال، جبل پور، چندوسی، علی گڈھ، میرٹھ اور فیروز آباد کی بربادیوں کو بھی بھلا دیا۔ تا دمِ تحریر اس قیامتِ صغریٰ پر تقریباً ایک ماہ گزر چکا ہے لیکن ذہن پر اس طرح مستولی ہے جیسے اظہارِ خیال کے لیے کوئی دوسرا موضوع موجود ہی نہیں ہے۔ اس غیر معمولی سرد موسم اور رمضان کے مبارک مہینے میں تقریباً دو لاکھ مسلمانوں کا خانماں برباد ہونا بڑا ہی سخت المیہ ہے۔ مسلمان آبادیوں پر بموں کی بارش اور نسلاً بعد نسل کے جمے جمائے کروڑوں روپے کے کارخانوں اور فیکٹریوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دینے کی خبر ایسی نہیں ہے جو انسانی قلب کو برمائے بغیر گزر جائے۔ ابھی تمام تفصیلات معلوم نہیں ہوئی ہیں لیکن جو کچھ اخباروں میں آ چکا ہے اسے بھی یہاں نقل کرنا مشکل ہے۔ کسی ایک شہر اور محدود رقبے میں اتنی بڑی تباہی، چودہ پندرہ برس کی تباہیوں میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔

اس دفعہ رنج و غم اور صدمے کو بڑھانے والی ایک نئی صورت حال یہ سامنے آئی کہ مشرقی پاکستان کی اقلیت پر بھی وہاں کی اکثریت نے ظالمانہ اور بے رحمانہ حملے کیے۔ ان کی دکانوں، مکانوں اور جائدادوں کو برباد کیا۔ انہیں لوٹا اور مارا اور سرد موسم میں انہیں خانماں برباد کر کے آسمان کے نیچے اور کیمپوں میں رہنے پر مجبور کیا۔ اس طرح بھارت کے مسلمان دوگونہ عذاب میں مبتلا ہوئے۔ ایک اپنی تباہی کا عذاب اور دوسرا اس احساس کا عذاب کہ ان کی ہم مذہب اکثریت نے اپنے ملک کی غیر مسلم اقلیت پر ظلم ڈھا کر دنیا کو خود اپنے مذہب پر حرف زنی کا موقع فراہم کیا۔

اس مذہب پر جو ایک [illegible] کے ظالمانہ قتل کو بھی تمام انسانوں کا قتل قرار دیتا ہے۔ اسلامی، نیز عام انسانی، ہر دو نقطۂ نظر سے ان کا یہ رویہ انتہائی ظالمانہ اور غلط تھا —— صرف یہی نہیں بلکہ بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے بھی پاکستانی حکومت اور حملہ آور پاکستانی مسلمانوں کا رویہ بالکل غلط تھا۔ یہ بات ان سے مخفی نہیں ہے کہ بھارت کے مسلمان بغیر کسی پاکستانی ردعمل کے، جبل پور میں، چندوسی میں، علی گڈھ میں، فیروز آباد میں، مبارک پور میں، مالیگاؤں میں اور بیسیوں جگہ قتل ہوتے رہے، لٹتے رہے اور پٹتے رہے ہیں تو کیا وہ اس کا تصور بھی کر سکتے تھے کہ پاکستانی ہندوؤں پر ان کے ظلم و ستم کی آگ، بھارت کے مسلمانوں پر نہ برسے گی ؟ آگ کی وہ گھٹا برسی، خوب برسی اور سیکڑوں جانوں اور کروروں روپے کے مال کو بھسم کرتی ہوئی نکل گئی۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس وقت پاکستان کی حکومت، اپنے اقتدار کی حفاظت اور اجتماعی سیاست کے پیچھے اس قدر بے رحم ہو چکی ہے کہ بھارت کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ جانے کی بھی اسے پروا باقی نہیں رہی ہے۔ یہ بات میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ جس پیمانے پر وہاں فسادات ہوئے وہ حکومت کی ڈھیل یا شہ کے بغیر ممکن نہیں ہیں۔ ہم خود اپنے ملک میں ہمیشہ یہ حقیقت بچشم دیکھتے رہے ہیں کہ پولس کی مدد کے بغیر کہیں بھی کوئی بڑا فساد رونما نہیں ہوا ہے۔

اسلامی، عام انسانی اور سیاسی ہر لحاظ سے پاکستان کی موجودہ حکومت کے دامن پر یہ ظلم ایک سیاہ دھبہ ہے۔ پہلے کی حکومتیں کتنی ہی نالائق سہی لیکن ان کے دامن اس سیاہ دھبے سے صاف ہیں اور اس لحاظ سے وہ موجودہ حکومت سے بدرجہا بہتر تھیں۔ حکومت اور شرپسند عناصر کے اس طرز عمل کے ساتھ جب ہم نے یہ خبر پڑھی کہ غیر مسلم شہریوں کی حفاظت و مدافعت کرتے ہوئے متعدد مسلمان رضاکار بھی شہید ہوئے تو اس سے بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان شہید مسلمانوں کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔ انھوں نے شرافت، انسانیت اور اسلامی تعلیم کی عملی شہادت دے کر اسلام کا نام اونچا کیا۔ فجزاهم الله عنا خير الجزا۔ اسی طرح یہ خبر بھی ملی کہ کلکتہ میں بعض سکھوں اور ہندوؤں نے مظلوم مسلمانوں کی مدد کی اور بعضوں کو آگ کے اندر گھس کر نکال لے گئے اور ان کی جان بچائی۔ وہ شریف سکھ اور ہندو بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ انسانیت و شرافت کی یہ چند مثالیں بھی بڑی تسلی بخش ہیں۔ یہ مثالیں مایوسی کے گھور اندھیرے میں امید کی روشن شمعیں ہیں۔

مغربی بنگال کے اس بھیانک فساد کے اسباب و عوامل کا تجزیہ اور ان کی تفصیل بے کار ہے اس لیے کہ وہ ہر اس شخص کے سامنے ہیں جو عقل کی آنکھیں کھول کر زندگی بسر کر رہا ہے لیکن کھلنا اور جیسور (مشرقی پاکستان) کے فساد پر بھونیشور میں چوٹی کے کانگریسی نیتاؤں نے جو تقریریں کیں ان کا ذکر کیے بغیر رہا نہیں جاتا اس لیے کہ وہ تقریریں کلکتہ کے فساد کا فوری اور مؤثر عامل بنی ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ افسوس شری مرارجی ڈیسائی کی تقریر پڑھ کر ہوا

ان تقریروں کے بعد اگر فساد نہ ہوتا تو تعجب ہوتا ــــ شری مرارجی مرکزی کیبنٹ سے الگ ہونے کے بعد شمالی ہند میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور شمالی ہند میں مقبولیت حاصل کرنے کا سب سے آسان اور سستا نسخہ مسلم دشمنی ہے۔ شری ڈیسائی اور کانگریس کے دوسرے لیڈروں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندستان میں متعدد طاقتور تنظیمیں مسلم دشمنی کی بنیاد پر قائم ہیں اور یہاں ایک بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو مسلمانوں کو بزورِ شمشیر اپنا غلام بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اور توا ور مسجدوں کے اونچے اونچے مینار دیکھ کر، ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے ــــ یہ سب کچھ جانتے ہوئے کانگریس کے سالانہ اجتماع میں جہاں لاکھوں آدمی جمع تھے مشرقی پاکستان کے فساد پر دھمکی سے بھری سے تقریریں کیا معنی رکھتی ہیں یقیناً اس کے معنی وہی تھے جو کلکتہ میں آگ اور خون بن کر ظاہر ہوئے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان نے اپنے یہاں فسادات اسی لیے کرائے کہ ہندستان میں بدامنی پھیل جائے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر شری سین، شری ڈیسائی اور کچھ دوسرے نیتا پاکستان کی اس سیاست سے مات کھا گئے کیونکہ انھوں نے جو تقریریں کیں وہ اس سیاست کو تقویت پہنچانے والی تھیں اور نتیجہ گویا پاکستان کے حسب خواہ نکلا۔

کلکتہ کے فساد میں دو باتیں نئی ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ مرکزی وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندا خود کلکتہ تشریف لے گئے اور انھوں نے سختی اور جرأت کے ساتھ فساد کو روکنے کی کوشش کی اور مظلوم اقلیت کو صرف زبانی نہیں بلکہ عملی دلاسا دیا۔ اس لیے وہ بہر حال ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں دوسری یہ کہ فساد زدہ علاقے میں متعدد مقامات پر اجتماعی جرمانہ بھی عائد کیا گیا ہے۔ ان دو باتوں کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، یہ ہمارے لیے بہر حال خوش آیند ہیں۔ وزیر داخلہ کا یہ اعلان بھی بہت

خوش کن ہے کہ وہ فسادات کو مستقل طور پر ختم کرنے کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھانا چاہتے ہیں۔ یہ اعلان بڑا مبارک اور نئی چیز ہے

بھارت میں بدامنی اور فسادات کے سلسلے کو بند کرنے کی سب سے بڑی ذمہ داری اس جماعت پر ہے جس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہے لیکن وہ اس کے لیے مستقل اور کارآمد تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ جبل پور کے فساد کے بعد کچھ توقع پیدا ہوئی تھی کہ شاید اب کانگرس ادھر متوجہ ہو لیکن توقع پوری نہیں ہوئی، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ ہمیشہ مفید سے مفید مشورے پیش کرتے رہے ہیں لیکن کانگرس کے کانوں تک شاید وہ مشورے پہنچے ہی نہیں۔ اور اب تو راقم الحروف کے نزدیک اس کی توقع پہلے سے بھی بہت کم رہ گئی ہے کہ وہ مفید مشوروں پر کان دھرے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاملے میں کوئی مضبوط قدم اٹھانے کے لیے جس اتحادِ فکر کی ضرورت ہے، کانگرس اس سے محروم ہو چکی ہے اور جہاں تک مسلمانوں کے تحفظِ جان و مال کا مسئلہ ہے تو اس سے واقعی اور حقیقی دلچسپی لینے والے کا وجود وہاں عنقا ہے

چند دن ہوئے مسلمانوں کے ایک محترم رہنما نے کانگرس کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ایک ملک گیر طوفانی مہم آندھی پانی کی طرح اس مقصد سے شروع کرے کہ ہندستان کے مختلف فرقوں اور آبادی کے مختلف عناصر کے درمیان صلح و آشتی اور اتحاد و اعتماد پیدا ہو اور ہندستان کے باشندے انسانی جان کی قدر و قیمت سے واقف ہوں اور وہ انسانیت کا احترام کرنا سیکھیں۔ اس وقت کانگرس کو اپنے تمام وسائل صرف اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے لگا دینے چاہیں۔

اس مشورے کی اصابت و افادیت میں کیا شک ہے لیکن کیا کانگرس اس مشورے کو قبول کرنے کی پوزیشن میں ہے؟ تمام وسائل لگا دینا تو بڑی بات ہے کیا وہ اس کام کے لیے اپنے وسائل کا ایک فی صدی بھی لگانے کے لیے تیار ہوگی؟

فساد کو مستقل طور پر بند کرنے کے لیے اس ضرورت کا بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہندستان کے جو عناصر امن و امان کو تباہ کرتے رہتے اور مسلمانوں کو مارتے کاٹتے رہتے ہیں ان کی کڑی نگرانی ہو، ان کے لیڈروں اور اخبارات کی اشتعال انگیزی پر سخت پابندی عائد کی جائے۔ لیکن کیا کانگرس

ایسا کر سکتی ہے؟

کانگریس نے اب تک جو کچھ کیا ہے اور اس وقت بھی اس کا جو رخ ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے نہ کوئی مہم چلائے گی اور نہ شرپسند لیڈروں اور اخباروں کی اشتعال انگیزی کا کوئی نوٹس لے گی۔ کانگریسی حکومت کی طرف سے تو عملاً تمام جن سنگھی اور مہاسبھائی لیڈروں اور اخبارات کو اس بات کی کھلی چھوٹ حاصل ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اشتعال پیدا کرنے کے لیے جو کچھ لکھنا چاہیں لکھیں، جو کچھ بولنا چاہیں بولیں، کوئی ان سے باز پرس کرنے والا نہیں ہے۔

ابھی مسلمانوں کے ساتھ جس دزندگی کا ثبوت دیا گیا ہے اس کے باوجود ایک کنونشن کا ملاحظہ فرمائیے:۔

کلکتہ میں یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ میں مشرقی پاکستان کی ہندو اقلیت کے تحفظ پر غور کرنے کے لیے مختلف سیاسی پارٹیوں کا جو کنونشن ہوا اور اس میں جس انداز کی تقریریں ہوئیں، اس سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ مشرقی پاکستان کی ہندو اقلیتوں کے سوال پر بنگال میں جوش و جذبات کی ایک عام لہر چل پڑی ہے۔ اس کنونشن میں برسر اقتدار کانگریس پارٹی شریک نہیں تھی البتہ اپوزیشن کی بیشتر پارٹیاں شریک تھیں۔ کنونشن میں جہاں ایک طرف بائیں بازو کی کمیونسٹ پارٹی، انقلابی سوشلسٹ پارٹی، انقلابی کمیونسٹ پارٹی، سوشلسٹ پارٹی وغیرہ موجود تھیں تو دوسری طرف دائیں بازو کی ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ جیسی انتہائی رجعت پسند جماعتیں بھی شریک تھیں۔ قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ یہ فرقہ پرست جماعتیں کنونشن میں محض شریک نہ تھیں بلکہ اپنی روایتی اشتعال انگیزیوں کے ساتھ کنونشن پر چھائی ہوئی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی بنگال کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر جیوتی باسو نے مشرقی پاکستان میں اقلیتی فرقے پر ہونے والے مظالم کی مذمت کے ساتھ جب مغربی بنگال میں مسلم اقلیتوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر کیا تو انتہا پسند عناصر نے یک لخت شور مچا دیا اور انہیں بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔ کئی دوسرے لیڈروں نے بھی جب اپنی تقریروں کے دوران کوئی سنجیدہ اور متین بات کہی تو جوشیلے عناصر نے ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا اور انہیں اپنی تقریریں ادھوری چھوڑ کر بیٹھ جانا پڑا اس کے برخلاف رجعت پسندوں اور فرقہ پرستوں نے اپنی اشتعال انگیز تقریروں پر خوب داد تحسین حاصل کی۔

(مدینہ بجنور ۵ فروری ۱۹۶۴ء بحوالہ آزاد ہند کلکتہ)

یہ جو کچھ کہا گیا اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کانگریس کو اب مشورے نہ دیے جائیں یا فسادات
روک تھام کے لیے مفید تدابیر نہ بتائی جائیں بلکہ غرض صرف اتنی ہے کہ کانگریس سے امید نہ باند
جائے اور اس پر بھروسہ نہ کیا جائے۔

مسلمانوں کو صرف خدا پر بھروسہ کرکے اپنے مسائل سے آپ نمٹنے کی تدابیر اختیار کرنی چا
خدا پر توکل کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے مصائب کو دور کرنے کے لیے اس سے مدد طلب کر رہے
ظاہر ہے کہ حصول امداد کے لیے کچھ شرطیں ہیں جنھیں پورا کرنا ضروری ہے لیکن صورت حال یہ ہے کہ
شرطیں پوری کرنے کو آمادہ نہیں مگر اللہ کی مدد حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہیں —— یہ تما
یکطرفہ حملے، قتل وغارت، جان، مال اور آبرو کے نقصانات ہمارے لیے تنبیہات کی حیثیت رکھے
ہیں۔ کیا ہم ان سے متنبہ ہو رہے ہیں؟ صرف چودہ پندرہ برسوں کے اندر بھارت کے مسلمان، نقصا
جان ومال کی کتنی آزمائشی بھٹیوں میں تپائے گئے لیکن کیا وہ کندن بن کر نکلے؟ واقعہ یہ ہے کہ جان
مال کے تمام نقصانات ایک طرف اور ہماری بے حسی وغفلت ایک طرف اور دراصل یہ دوسری چیز ہی ہما
لیے زیادہ اندوہناک اور تشویشناک ہے۔ ہمارے ان نقصانات کے اندر صرف شر ہی شر نہیں ہے
ان میں خیر کے پہلو بھی ہیں۔ کاش ان پہلوؤں پر ہماری نظر ہوتی اور ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہوتے
اللہ تعالےٰ کی اطاعت اور شرعی احکام کی بجاآوری ہماری عبرت پذیری کی کسوٹی ہے۔ اسی پر
اپنے کو کس کر دیکھنا چاہیے کہ ہم نے ان آزمائشوں سے فائدہ حاصل کیا ہے یا نہیں؟ کیا ایسا ہوا کہ
خدا کی تنبیہ سے متنبہ ہو کر نماز نہ پڑھنے والے، نماز کے پابند ہوگئے، زکوٰۃ نہ دینے والے زکوٰۃ دینے
لگے، روزے نہ رکھنے والے روزہ دار ہوگئے، شعوری طور پر ادائے حج کا جذبہ پیدا ہوا، تجارت
زراعت، صنعت، کاروبار اور عام معاملات میں اسلامی احکام کی پیروی ہونے لگی، برادران وطن
کے سامنے، اخلاق وکردار اور عمل کی زبان سے اسلام کی تبلیغ ہونے لگی، بدکاریوں، بے حیائیوں اور
اللہ کی نافرمانیوں سے عملی نفرت پیدا ہوئی، ملت کے استحفاظ اور اسلام کی سربلندی سے سرگرم دلچسپی
پیدا ہوئی —— ؟ اگر قابل لحاظ حد تک یہ باتیں حاصل نہیں ہوئیں تو اس کے معنی یہی تو ہیں کہ ہم نے
ان آزمائشوں سے فائدہ حاصل نہیں کیا۔ دنیوی شدائد ومصائب کا حال ...

بھی سراوا قدم بڑھے۔ چنانچہ ہم بھارت کے مسلمان اسی طرح کا نقشہ پیش کر رہے ہیں، مصیبتیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں، لیکن ہماری زندگیاں جس حال میں تھیں وہیں رہتی ہیں ان میں کوئی قابلِ ذکر اور خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔

ہم شعوری طور پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی دنیوی و اخروی فلاح، ہمہ گیر انفرادی و اجتماعی صلاح پر موقوف ہے۔ جب تک امت مسلمہ عملاً صالح بن کر اپنے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا ثبوت نہیں دیتی وہ عزت کا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک ہم مسلمان، اسلام کے دیے ہوئے اصول کے تحت منظم ہو کر عزت کا مقام حاصل کرنے کے لیے اجتماعی طور پر سر دھڑ کی بازی نہ لگائیں گے۔ ہم یہاں عزت کا مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر بھارت میں امت مسلمہ کے لیے عزت کا مقام مقدر ہے تو اس کو یہی کرنا ہوگا وہ آج کرے یا کل۔

---

۶ جنوری ۶۴ء کو پاکستان میں جماعت اسلامی غیر قانونی قرار دے دی گئی۔ مولانا مودودی اور جماعت کے دیگر رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ خبر ایک اور تیر ہے جو ہمارے جگر میں ترازو ہوا ہے۔ اگرچہ یہ خبر غیر متوقع نہیں ہے لیکن اس سے واقعہ کی المناکی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جماعت اسلامی کے آل پاکستان اجتماع کا اعلان ہوتے ہی وہاں کی حکومت نے جو رویہ اختیار کیا اور پھر اجتماع کے موقع پر جو حادثہ رونما ہوا اس کے بعد ہر وقت اس کا اندیشہ تھا کہ حکومت، جماعت پر ہاتھ ڈالے گی۔ اس لیے یہ خبر توقع کے عین مطابق ہے۔ مطلق العنان بادشاہوں اور ڈکٹیٹروں نے اپنی آمریت کے خلاف کسی طاقتور آواز یا تحریک کو کب برداشت کیا ہے کہ پاکستان کی آمریت اسے برداشت کر لیتی۔ آمریت جبر و استبداد، ظلم و جور، قید و بند اور قتل و خون کے بغیر قائم رہ ہی نہیں سکتی اور پاکستان ہی پر کیا موقوف ہے آج کون سا اسلامی ملک ہے جو آمریت کے شکنجے میں کسا ہوا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی نے جو راہ اختیار کی ہے اس میں شعب ابی طالب بھی آتا ہے اور مکے کا دارالندوہ بھی۔ اور ان سے گزر کر یہ راہ بدر و حنین کے میدانوں کی طرف بھی مڑتی ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ اب دنیا میں بدر و حنین کے معرکے گرم ہوں گے یا نہیں، لیکن داعیانِ حق کے لیے قید و بند اور دار و رسن کا سلسلہ تو بہرحال آج بھی جاری ہے اور جاری رہے گا

(باقی صفحہ [illegible])

انکارِ خدا کی حقیقت

مولانا سید جلال الدین عمری

تاریخ کا یہ ایک بہت ہی دل چسپ تجربہ ہے کہ بعض اوقات حقیقت کو افسانہ اور افسانے کو حقیقت کا نام دے دیا جاتا ہے۔ غیر عقلی باتیں مسلمات کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور مسلمات کو نامعقول سمجھ کر رد کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح کے بعض مسلمات موجودہ دَور نے خدا کے بارے میں مان رکھے ہیں۔ ان میں کا ایک مسلمہ خدا کا انکار ہے۔ اس مسلمہ کی مخالفت آج کے مفکرین کے نزدیک دلیلِ جہالت ہے اور جو شخص اس کی تردید کرتا ہے اسے بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ گویا کہ جب تک انسان اپنی عقل کھو نہ دے اُسے چیلنج نہیں کر سکتا۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ خدا کے انکار پر اب تک کوئی قطعی دلیل نہیں دی جا سکی ہے جب کہ خدا کے وجود پر بے شمار شہادتیں موجود ہیں۔ انکارِ خدا کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ہم خدا کے بارے میں نہیں جانتے اور ہمارے پاس اس کا کوئی مادی ثبوت نہیں ہے کہ فی الواقع خدا ہے۔ لیکن کسی چیز کے متعلق ہمارا نہ جاننا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم اس کا انکار کر دیں۔ خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس سے کائنات کی معقول توجیہ ہوتی ہے۔ اگر آپ خدا کو نہیں مانتے ہیں تو کائنات کی ایک ہی توجیہ کر سکتے ہیں، وہ یہ کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آ گئی اور آپ سے آپ چل رہی ہے۔ کوئی بھی شخص اس توجیہ کو معقول توجیہ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے برعکس عقل کہتی ہے کہ اس کا ایک خالق اور مدبر ہونا چاہیے جس نے اس کو پیدا کیا ہے اور جو اسے اپنی قدرت سے چلا رہا ہے۔ ایک دعویٰ جسے عقل کی تائید حاصل نہیں ہے اور دوسرا دعویٰ جو عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے، ہرگز یہ دونوں ایک نہیں ہو سکتے۔ عقل کا یہ فیصلہ کہ اس کائنات کا ایک خدا ہونا چاہیے، خدا کے وجود کا زبردست ثبوت ہے۔ اس کی تردید ان ہزاروں دفاتر سے بھی نہیں ہو سکتی

جن کو وہم وقیاس نے پیدا کیا ہے۔ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلے کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں۔

خدا ہے یا نہیں؟ اس سوال پر انسان ہمیشہ غور وفکر کرتا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں کبھی اس نے خدا کا اقرار کیا ہے اور کبھی انکار لیکن عموماً اس کے غور وفکر کا نتیجہ خدا کے اعتراف ہی کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ موجودہ دور میں یہ ترتیب بدل گئی ہے اور اب جن افراد کے ہاتھوں میں علمی دنیا کی قیادت ہے، ان کی اکثریت خدا کا انکار کرنے والوں کی ہے۔ اس کا اقرار کرنے والے ایک طرف تو تعداد میں کم ہیں اور دوسری طرف ان کی آواز اتنی کمزور ہے کہ اس کی گونج علم وفن کے کسی بھی میدان میں سنائی نہیں دیتی۔

اب آپ پوچھیں گے کہ اگر خدا نہیں ہے تو یہ کائنات، جس کی وسعت وعظمت کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے، کیسے وجود میں آگئی؟ اس سوال کے جواب میں موجودہ دور کے منکرین آپ کے سامنے کوئی نہ کوئی 'مادی' توجیہ پیش کریں گے۔ اس توجیہ کے مطابق خالقِ کائنات کا مقام مادّے کو حاصل ہے اور مادہ آپ اپنا خالق ہے۔ ان منکرین کے درمیان اس بات میں تو اختلاف ہے کہ مادّے نے کس طرح موجودہ صورت اختیار کرلی، لیکن فی نفسہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ کائنات خدا کی پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ بے جان مادے سے وجود میں آئی ہے۔ برٹنڈرسل نے تخلیقِ کائنات سے متعلق موجودہ نظریات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

> "اس میں کوئی شک نہیں یہ سارے نظریات متنازع فیہ ہیں مگر ان کا غالب رجحان کائنات کی مادی تعبیر کی طرف ہے اور جو فلسفہ بھی اس توجیہ کو آج تسلیم نہیں کرتا وہ حقائق کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے گا۔"

خدا کی ذات ہمارے حواس کے حدود سے بہت دور ہے۔ ہم نہ تو کسی لیبارٹری میں اس کا تجزیہ کر سکتے ہیں اور نہ کسی خوردبین سے اسے دیکھ سکتے ہیں۔ بلکہ ہمارے سامنے یہ وسیع کائنات پھیلی ہوئی ہے، جو اس کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ اس کی ایک ایک چیز کہتی ہے کہ کسی صاحبِ علم و حکمت ہستی نے اسے پیدا کیا ہے۔ لیکن موجودہ دور کے منکرین کسی ایسے وجود ہی کو ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہیں جس کا نہ تو مشاہدہ کیا جا سکے اور نہ جو تجربات میں آسکے۔ اگر آپ خدا کو دکھا سکیں تو وہ اسے ماننے کے لیے تیار ہیں اور اگر آپ کے اندر اس کی صلاحیت نہیں ہے تو آپ کا ایمان ان کے نزدیک

ایک اندھا یقین ہے جو بغیر دلیل کے پیدا ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا کا وجود اس عالم میں محسوسات سے زیادہ یقینی اور ثابت شدہ ہے۔ خدا کو مانے بغیر اس عظیم واقعہ کی جو کائنات کی شکل میں موجود ہے، کوئی معقول توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے کہ موجودہ دَور کے بعض سوچنے اور سمجھنے والے انسانوں نے اس حقیقت کا کھل کر اعتراف کیا ہے اور اسے پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے[1]

فرینک ایلین[2] نے اعداد و شمار کی زبان میں اس امکان کو صاف رَد کر دیا ہے کہ کائنات اتفاق کے نتیجے میں پیدا ہو سکتی ہے۔

"اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس عالمِ وجود کے پیچھے کوئی منصوبہ اور کوئی کارفرما قوت نہیں تو لامحالہ یہ قرار دینا پڑے گا کہ یہ عالم رنگ و بو محض ایک اتفاقی حادثہ کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو گیا۔ اب دیکھیے بحث اتفاق محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہے جن میں قطعی اور یقینی معلومات ممکن نہیں ہوتیں۔ اس نظریے کے ذریعہ ایسے بے لاگ اصول ہمارے ہاتھ آجاتے ہیں جن کی مدد سے ہم حق و ناحق میں بآسانی امتیاز کر سکتے ہیں اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے امکاناتِ صدور کا حساب لگا کر صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کس حد تک ممکن ہے۔

پروٹین جو تمام ذی حیات خلیوں cells کے لیے اجزائے لازم کی حیثیت رکھتے ہیں پانچ عناصر پر مشتمل ہیں۔ کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن، اور گندھک۔

---

[1] حال ہی میں امریکہ سے ایک کتاب EVIDENCE OF GOD IN AN EXPANDING UNIVERSE کے نام سے چھپی ہے۔ اس کتاب میں اونچے درجے کے چالیس سائنس دانوں نے خدا کی ذات سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ سائنس کے مختلف شعبوں میں کام کے دوران اُن کے اندر یہ پختہ یقین ابھرا ہے کہ یہ کائنات بغیر خدا کے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا ایک خالق و مالک اور منتظم و مدبر ہے جس نے اسے بڑی حکمت سے پیدا کیا ہے اور انتہائی بصیرت کے ساتھ اسے چلا رہا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ عبدالحمید صدیقی ایم اے نے "خدا موجود ہے" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہی ترجمہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس باب کے تمام اقتباسات اسی کتاب سے لیے گئے ہیں۔

[2] ایم اے، پی ایچ ڈی، پروفیسر حیاتی طبیعیات، مینی ٹوبا یونیورسٹی، کینیڈا

پیدائشی سالمہ (Molecule) ان عناصر کے .... ہم ہزار دقیق ذرات یا جواہر Atoms پر مشتمل ہوتا ہے۔

کائنات میں ۹۲ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں۔ اب اس امر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان ۹۲ عناصر کے بے ترتیب ڈھیر سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آسکے، مادہ کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ حاصل ہوسکتا ہو اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو حساب لگا کر معلوم کی جاسکتی ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے ایک حساب داں چارلس ایوجین گائی نے اس کا حساب لگایا ہے اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعے کا امکان 10^{160} کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہوسکتا ہے واضح رہے کہ 10^{160} کا مطلب یہ ہے کہ دس کو ایک سو ساٹھ مرتبہ پے در پے ضرب دی جائے، گویا ایک ایسا بعید از امکان قیاس ہے کہ اعداد کی زبان میں اس کا اظہار بھی مشکل ہے۔

صرف ایک پروٹینی سالمے کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لیے اس پوری کائنات کے موجودہ مادے سے کروڑوں گنا زیادہ مقدار مادہ مطلوب ہوگی جسے یک جا کرکے ہلایا جائے اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ارب ہا ارب (10^{243}) سال کے بعد پیدا ہوگا۔[1]

ڈاکٹر ہنری پوررٹ[2] تخلیقِ کائنات سے متعلق موجودہ نظریات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"کائنات کے بارے میں دو تصورات معروف ہیں۔ اول یہ کہ کائنات ایک تدریجی اور ارتقائی عمل سے وجود میں آئی، اور یہ تصور الفر ALPHER اور گیمو GAMOW نے پیش کیا۔ دوسرا تصور ہوائل HOYLE کا ہے کہ کائنات میں تخلیقی عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔

پہلے نظریے کے مطابق یہ عالم رنگ وبو ایک دھماکے کے ذریعہ وجود میں آیا جو انتہائی حدت و کثافت کے باعث وقوع پذیر ہوا۔ اس تصور کے مطابق درحقیقت ایک بہت ہی سخت گھٹی ہوئی اور انتہائی گرم گیس کے پھٹ پڑنے کے بعد ستارے، اجرام فلکی، ان کو وجود بخشنے والا مادہ اور ان اجرام فلکی کی ظاہری گردش وغیرہ بتدریج ارتقا پذیر ہوئی ہے۔

الفر اور گیمو کے تصور کے مطابق جب اس دنیا کو وجود میں آئے پانچ منٹ ہوئے تھے، اس کا درجہ حرارت ایک ارب ڈگری کے قریب تھا۔ اس سے قبل مادہ صرف پروٹونز، نیوٹرونز اور الکٹرونز

---

[1] خدا موجود ہے، باب ۱
[2] ماہر ریاضی و طبعیات

مشتمل تھا جو غیر معمولی دباؤ اور انتہائی حدت و حرارت کے سبب ایک دوسرے سے علیحدہ اور منتشر تھے۔ جب یہ مادہ انتہائی دباؤ اور حرارت کے باعث پھٹ پڑا اور جب یہ کائنات وجود میں آنے لگی تو اس کے آدھے گھنٹے کے اندر اندر تمام کیمیائی عناصر کی ترکیب ظہور پذیر ہو گئی۔ اس تصور کے مطابق زیادہ کثیف عناصر درحقیقت لطیف عناصر کے مختلف مراحل میں یکے بعد دیگرے ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے سے پیدا ہوئے ہیں۔ اجرام فلکی کی تشکیل بہرحال کسی متعین وقت پر عمل میں آئی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وقت اس دھماکے کے دس لاکھ سال بعد یا اس کے لگ بھگ کوئی وقت ہو اور ان اجرام فلکی کی تشکیل میں مقناطیسی قوتیں بنیادی محرک کی حیثیت سے کارفرما رہی ہوں۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کائنات کا عمل تخلیق شروع ہونے سے پہلے کیا صورت حال تھی اس کے بارے میں یہ قیاس آرائی کی جاتی ہے کہ اس کائنات سے قبل کوئی اور کائنات موجود تھی جو ایک لامحدود زمانے سے بتدریج تحلیل ہوتی چلی جا رہی تھی اور جب اس کو انتہائی حد تک سکیڑ دیا گیا تو اس نے ہماری موجودہ کائنات کی صورت اختیار کر لی۔

اگر اس تصور کو قبول کر لیا جائے کہ اس کائنات کا آغاز انتہائی گھٹن اور سکڑاؤ اور نہایت سخت حدت سے ہوا تو پھر یہ ناگزیر ہو جائے گا کہ خدا کو اس بنیادی مادۂ ترکیب کے اجزا کے خالق اور ایک ایسی قوت کے منبع کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے جس نے یہ انقباض و انحصار کا عمل کیا اور حدت پیدا کی۔ یہاں خدا کی کارفرمائی کا اقرار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

بانڈی، گولڈ اور ہائل کا تصور تخلیق پیہم کا تصور ہے۔ اس کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ اس کائنات میں زمان و مکان کے اصول و قواعد ہم آہنگ اور یکساں ہیں لیکن ان سے جمود و تعطل کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس تصور کے پیش کرنے والے اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ کائنات میں توسیعی عمل جاری ہے اور اجرام فلکی بتدریج ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ اس عمل کے نتیجے میں جو اجرام فلکی دور ہوتے ہوئے حد نظر سے ماورا چلے جاتے ہیں۔ ان کی جگہ لینے کے لیے اور کائنات کی ظاہری صورت و ہیئت کو برقرار رکھنے کے لیے مادہ مسلسل تخلیق اور ارتقائی عمل کے ذریعے نئے نئے اجرام فلکی کی صورت میں تشکیل ہوتا رہتا ہے۔ ہماری نظر روشنی میں کام کرتی ہے اور اگر کوئی چیز روشنی سے زیادہ تیز رفتاری

کے ساتھ ہم سے دور ہوتی جارہی ہو تو ایسی چیز کو ہم عمدہ سے عمدہ اور طاقت ور دوربین سے بھی دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ اندازہ یہ ہے کہ جو اجرام فلکی ہم سے ۲۰ کھرب نوری سال کے فاصلے پر پہنچ جاتے ہیں، ان کی سرعت رفتار اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ روشنی اس کو نہیں پاسکتی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہماری نظروں سے دور ہوجاتے ہیں[۱]۔ واضح رہے کہ یہ فاصلہ اس فاصلے سے دگنا ہے جو ماؤنٹ پلومر پر نصب شدہ دیوقامت دوربین سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس حساب سے اگر کائنات کا توسیعی عمل سورج کی تخمینی مدت کے پانچویں حصے کے برابر بھی جاری رہے تو اس کائنات کی ہر چیز ہماری نظر کی گرفت سے پرے چلی جائے گی۔ اور آفاق میں ایک عظیم خلا رونما ہوجائے گا۔

تخلیق پیہم کے تصور کے مطابق وہ مادہ برابر پیدا ہوتا رہے گا جس سے اجرام فلکی وجود پاتے ہیں اور اس طرح اگر خلا میں کچھ اجرام فلکی نظر سے دور ہوجائیں گے تو نئے اجرام فلکی ان کی جگہ لے لیں گے اور کائنات میں کوئی تغیر رونما نہ ہوگا۔ رہی یہ بات کہ یہ مادہ کس طرح پیدا ہوتا ہے تو اس بارے میں ہوائل کا خیال یہ ہے کہ مادہ کہیں خارج سے نہیں ٹپک پڑتا، بلکہ یہیں سے ابھرتا رہتا ہے۔ اب اگر اس تخلیق پیہم کے تصور کو درست تسلیم کیا جائے تو اس میں بھی خالق کی حیثیت سے خدا کے وجود کا اقرار کیے بغیر بات نہیں بنتی اور خدا کا وجود پھر ایک ناقابل تردید حقیقت کی حیثیت سے ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں آپ فطرت کے قوانین کے بارے میں جو رائے بھی قائم کریں اور اس کائنات کی جو اساس و بنیاد بھی متعین کریں ایک سائنس داں کی حیثیت سے میرے نزدیک وہ تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس میں ناظم و محرک کی حیثیت سے خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔

یہ خدا ہی کی قدرت ہے جو اس کائنات کی ہر شے میں نظر آتی ہے اور ان تمام سوالات کا واحد جواب بن جاتی ہے جن کا ہم کوئی جواب دینے سے قاصر ہیں[۲]۔"

کیمیا کا ایک محقق ایڈمنڈ کارل کونفیلڈ، اس خیال کی پوری قوت کے ساتھ تردید کرتا ہے کہ

---

[۱] نوری سال light year کو جب فاصلہ ناپنے کی حیثیت سے بولا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ روشنی کی اس رفتار کی بنیاد پر کہ وہ ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل کی مسافت طے کرلیتی ہے، وہ فاصلہ جو روشنی ایک سال میں طے کرے گی ظاہر ہے کہ اتنے عظیم فاصلے کو اعداد و شمار کی زبان تو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ (خدا موجود ہے، باب ۵)

[۲] خدا موجود ہے، باب ۵

کائنات بطورِ حادثہ وجود میں آ گئی - وہ لکھتا ہے کہ :-

"پروفیسر ایڈون، ماہر حیاتیات پرنسٹن یونیورسٹی نے اکثر کہا ہے" زندگی کا بطورِ حادثہ وقوع پذیر ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے ایک پریس میں دھماکہ ہو جانے سے ایک ضخیم لغت کا تیار ہو جانا" میں اس سے پوری طرح متفق ہوں - یہ میرا پختہ اعتقاد ہے کہ خدا موجود ہے اور اسی نے کائنات کو پیدا کیا ہے اور وہی اس کا رب اور مدبّر ہے۔"

"اس کائنات کی تخلیق کے متعلق صرف دو نظریات ہی ممکن ہیں - یا تو اسے فطرت میں پوشیدہ ایک اعلیٰ تخلیقی ذہن کی کرشمہ سازی مان لیا جائے یا یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ سب کچھ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے - ایک ایسے شخص کے لیے جس نے حیرت انگیز پیچیدگیوں کو دیکھا ہے اور پھر وہ نامیاتی کیمیا میں تنظیم بھی پاتا ہے خصوصاً ذی حیات اشیاء میں اس کے لیے اس اتفاق کے نظریے کو قبول کر لینا کسی طرح ممکن نہیں - جتنا کوئی شخص سالمے کی ساخت کا سائنسی مطالعہ کرتا ہے اور اس کے ردِ عمل پر غور کرتا ہے وہ اس چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی اعلیٰ مدبر اور عظیم خالق کے وجود پر ایمان لے آئے -

جب میں تجربے کے انتہائی پیچیدہ مشاغل میں گھرا ہوا لا انتہا چھوٹے چھوٹے ذروں کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے میں مصروف ہوتا تو میں اکثر خدا کے گہرے تدبر پر متحیر ہو جاتا - ایک جانور کے عضویاتی نظام میں ایسے پیچیدہ نامیاتی اور کیمیاوی عمل ہوتے رہتے ہیں کہ کوئی انسان نہیں پوری طرح سمجھ نہیں سکتا - آدمی بس دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اتنا پیچیدہ نظام باقاعدہ کام کس طرح کرتا ہے - ان تمام باتوں کا یہی تقاضا ہے کہ ایک مدبر اور ایک بے انتہا ذہین حاجت روا کا وجود تسلیم کیا جائے - میں جس قدر اپنے کام میں آگے بڑھتا جاتا ہوں میرا خدا کی ذات پر اعتقاد پختہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اپنے شرکارکار کی بے اعتقادی کی روش خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں ہو - ایک ناقابلِ تشریح معمہ بن جاتی ہے - انسان کی بنائی ہوئی معمولی مشین کے لیے بھی ایک بنانے والے کی ضرورت ہوتی ہے - پھر یہ دس ہزار گنا زیادہ پیچیدہ مشین کس طرح خود بخود بن سکتی اور کارفرما پذیر ہو سکتی ہے - کم از کم میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں ہے۔[۱]

---

[۱] خدا موجود ہے، باب ۳

اینڈریو کانن ویٹے لکھتا ہے کہ :-

"یہ قول کہ خدا موجود ہے اس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا اور یہ دعویٰ کہ خدا نہیں ہے اس کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ کارل مارکس اور لینن کی طرح بہت سے ملحدین نے باری تعالیٰ کے وجود کی نفی تو کی ہے لیکن اس کے انکار کے لیے وہ آج تک کوئی عقلی ثبوت فراہم نہیں کرسکے۔ ایک آدمی کو اس بات کا پورا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کے متعلق شک و شبہہ کا اظہار کرے لیکن اس کے ساتھ اس کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اپنے اس اشتباہ کے لیے کوئی ٹھوس عقلی دلیل بھی پیش کرسکے۔ میری نظر سے آج تک نہ تو کوئی ایسی تحریر گزری ہے اور نہ ہی میں نے کبھی کوئی ایسی تقریر سنی ہے جس میں علمی استدلال کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا گیا ہو کہ خدا کا وجود محض افسانہ ہے۔ اس کے برعکس بہت سی ایسی کتابیں میرے زیر مطالعہ آئی ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خدا موجود ہے۔ پھر میں نے ان خوش گوار اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے جو ایمان باللہ، لوگوں کے قلب و دماغ پر مرتب کرتا ہے اور ان مضر نتائج سے بھی واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو انکارِ خدا سے پیدا ہوتے ہیں۔"

"کائنات پر ایک نگاہ دوڑائیے تو آپ کو اس میں ایک زبردست نظم و ترتیب نظر آئے گی۔ یہ نظم و ترتیب ایک ناظم اور مرتب کے وجود کی زندہ شہادت ہے۔ اتنی وسیع و عریض کائنات کا نظم و نسق کوئی معمولی شخصیت نہیں سنبھال سکتی۔ لہٰذا اس کائنات کا ناظم وہی قادرِ مطلق ذات ہے جس کی قوتوں کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ اندازِ فکر ہے جس کو اختیار کر لینے کے بعد ایک تین چار سال کا بچہ بھی علت و معلول کے ذریعہ خداوند تعالیٰ کو پہچان سکتا ہے۔"

"میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سائنس کی دنیا میں جتنے نامور لوگ گزرے ہیں اور جنھوں نے انسانیت کو اپنی تحقیقات سے بہرہ مند کیا ان کی ایک عظیم اکثریت خدا کے وجود کی قائل ہے ان میں بعض کے خیالات کو یا تو غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے یا لوگوں کو انہیں سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ انکارِ خدا تو اس اندازِ فکر ہی کے منافی ہے جس کے مطابق ایک سائنس داں سوچتا اور تحقیقات کے میدان میں آگے بڑھتا ہے۔ وہ اپنے کام کا آغاز اس بنیادی تصور سے کرتا ہے کہ کوئی مشین بھی مشین ساز کی قوتِ فکر و عمل کے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ معلوم و معروف حقائق سے استدلال کرتا ہے

---

[1] پی ایچ ڈی، ایم ڈی، ایس سی ایل ایل ڈی، ماہر عضویات۔

اور مرم دتینیکی دولت لیے ہوئے تجربہ گاہ میں داخل ہوتا ہے۔[۱]

یہ طویل اقتباسات ہم نے اس لیے پیش کیے ہیں تاکہ تخلیقِ کائنات کے بارے میں موجودہ دَور کے نظریات اور اُن کی کمزوریاں مغربی مفکرین کے الفاظ میں جو کہ ان نظریات کے آج امام اور علمبردار ہیں، پوری تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے آجائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انکارِ خدا کی عمارت ریت کے ٹیلے پر تعمیر ہوئی ہے وہ قطعاً عقل و دانش کے حملوں کی تاب نہیں لا سکتی۔ آج اگر انکارِ خدا ایک فلسفے کی حیثیت سے زندہ ہے اور ہر طرف اسی کا چرچا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کی بنیادیں بہت مستحکم ہیں بلکہ وقت کی سیاسی حکمتوں اور مصلحتوں نے اسے زندہ رکھا ہے۔ اگر یہ حکمتیں اور مصلحتیں نہ ہوں تو بہت سے وہ لوگ جن کو منکرینِ خدا کی صف میں شمار کیا جاتا ہے خدا کا اقرار کرنے لگیں۔ چنانچہ یہی بات ایک سائنس دان والٹر آسکر لنڈبرگ[۲] نے کہی ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

"سائنسی طریقِ فکر جن اساسی اصولوں پر مبنی ہے، وہ بجائے خود وجودِ باری کے مظہر ہیں اور ایسے لوگ جن کی عمریں سائنسی تحقیقات و تجسس میں گزرتی ہیں، خدا کے وجود کو دوسروں کی نسبت زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اس کی طرف توجہ دیں۔"

"سائنس داں اگر سائنسی اصولوں سے وجودِ باری کو سمجھنے اور اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں تو اس کے مختلف اسباب ہیں جن میں سے ...... پہلا سبب تو یہ ہے کہ اکثر ممالک اور بیشتر شہروں میں اجتماعی اداروں، تنظیموں اور حکومتوں نے الحاد اور خدا سے انکار کو بلا دلیل اور اپنی مرکزی حکمتِ عملی کی حیثیت سے بہ جبر لوگوں پر ٹھونسا ہے اور لوگ انفرادی طور پر اگر مظاہرِ قدرت میں وجودِ باری کا جلوہ دیکھتے بھی ہیں تو لادینی حکومت کے عتاب و سزا اور معاشرتی زندگی میں نکّو بن جانے کے خوف سے اس کا اعتراف اور برملا اظہار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"[۳]

موجودہ دَور میں جب کہ ہر طرف خدا سے بغاوت پھوٹ پڑی ہے، اگر خدا کا اقرار کرنے والوں کی تعداد کم ہے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیونکہ ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں جن کے اندر وقت کے چلتے ہوئے فکر کے خلاف سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس دَور میں زیادہ امکان اسی کا ہے کہ آدمی انکار کی رَو میں بہہ جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ کا سطحی مطالعہ بسا اوقات

---

[۱] [illegible] [۲] [illegible] [۳] [illegible]

انسان کے لیے حجاب بن جاتا ہے۔ وہ بجائے اس کے کہ حقیقت تک رسائی کی کوشش کرے اس پندار میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ اس نے حقیقت کو پا لیا ہے۔ وہ اپنے تھوڑے سے علم کے بارے میں یہ سمجھنے لگتا ہے کہ علم کا بہت بڑا ذخیرہ اس کے ہاتھ آگیا ہے لیکن اگر آدمی کے اندر حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کی صلاحیت ہو تو وہ اس عظیم کائنات کے مطالعہ کے بعد اقرار کرنے پر مجبور ہوگا کہ اس کا ایک خدا ہے اور وہ بغیر خدا کے وجود میں نہیں آسکتی۔ ایک انگریز مفکر اور فلسفی فرانسس بیکن کہتا ہے :-

"فلسفے کا سطحی مطالعہ انسان کو الحاد کی طرف لے جاتا ہے لیکن اسی فلسفے کی گہرائیوں میں اترئیے تو آپ مذہب کے قائل ہو جائیں گے۔"

پال کلیرنس ایبرسولڈ[1] اس قول کو نقل کرنے کے بعد اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتا ہے کہ۔

"سائنس کے مطالعہ کے دوران میں شروع شروع میں میں انسانی عقل و استدلال کی بے پناہ قوت سے اس درجہ مرعوب ہو گیا کہ میں یہ سمجھنے لگا کہ اب کائنات کی کوئی گتھی ایسی باقی نہیں رہے گی جسے عقلِ انسانی سلجھا نہ سکے اور اب سائنس داں زندگی کے منبع و مبدأ، شعور و عقل کے سرچشموں بلکہ اس کائنات کی ہر چیز کی حقیقت اور اس کے مقصد و منشا کے بارے میں مکمل علم حاصل کر لیں گے لیکن جوں جوں میرے علم میں اضافہ ہوا اور سالموں سے لے کر نظامہائے سیارگان تک اور جرثومے سے لے کر حضرت انسان تک ہر چیز کے بارے میں مجھے بہت کچھ معلوم ہو گیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی تو اس کائنات کے اسرار و رموز کی ابجد کی بھی مجھے ہوا نہیں لگی ہے۔ سائنس قرنہا قرن تک بھی اپنے اکتشافات و ایجادات میں کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کرتی چلی جائے، پھر بھی ایک سالمے سے لے کر پوری کائنات تک حیاتِ انسانی اور شعور و ادراک کی تفصیلات کا وہی عالم رہے گا کہ ہم بے اختیار یہی کہنے پر مجبور ہوں گے کہ مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ۔ سائنس داں بہت جلد اس حقیقت کو جان لیتا ہے کہ سائنس کا منتہا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ یہ بتا دے کہ یہ سب کچھ "کیسے" ہوا لیکن اس سے آگے بڑھ کر اس حقیقت کی نقاب کشائی کہ یہ سب کچھ "کیوں" ہوا نہ حضرت انسان کے بس میں ہے اور نہ سائنس ہی اس کی عقدہ کشائی پر قادر ہے۔ سائنس یا بشری قوت استدلال اس کی کوئی توجیہ پیش کرنے سے یکساں قاصر ہیں کہ یہ سالمات، ستارے، نظامہائے سیارگان

[1] [illegible]

یہ انسان اور اس کی بے مثل قوتیں اور صلاحیتیں آخر کیوں ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سائنس کا
کائنات کے عمل آفرینش کے بارے میں کوئی بڑا ممکنہ نظریہ پیش کر سکتی ہے کہ یہ ستارے، یہ
نظامہائے شمسی اور یہ انسان اور یہ رونقیں کس طرح وجود میں آگئیں لیکن اس سوال کا اس کے پاس
کوئی جواب نہیں کہ آخر یہ مادہ و توانائی کہاں سے آگئی اور اس کائنات میں یہ نظم اور حسن ترتیب
کس طرح قائم ہو گیا؟ سلامت فکر اور راستی استدلال کا تقاضا ہے کہ یہاں آکر انسان خدا
کے تصور کو قبول کرے۔[1]

---

[1] خدا موجود ہے باب ۳

خدا کا تصور

یہ حقیقت کہ انسان خدا کے تصور کا حامل ہے، خدا کے وجود کی ایک زبردست دلیل ہے۔
انسان میں خدا کا تصور ایک ایسی خدا داد صلاحیت کا نتیجہ ہے جسے دنیا میں انسان کے سوا کوئی دوسرا
حاصل نہیں کر سکا ہے۔ اس صلاحیت کو "متخیلہ" کے نام سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی نادیدہ
چیزوں کا ثبوت فراہم کرتی ہے اور اسی کی وجہ سے انسان پر صدہا شاہراہوں کا ظہور ہوتا ہے اور
اسے صاف صاف معلوم ہونے لگتا ہے کہ آسمان کے نیچے جہاں جہاں جو کچھ بھی ہے وہ اس وجہ سے
ہے کہ ہر ہر جگہ اور ہر ہر چیز کے اندر خدا موجود ہے اور وہ خود ہمارے دلوں سے اتنا قریب ہے
کہ اس سے قریب تر کوئی چیز نہیں۔

غرض کہ سائنس اور متخیلہ دونوں ہی کا فتویٰ ہے کہ ہمارا یہ کارخانۂ حیات خدا ہی کی وجہ سے ہے
اور اسی کی مرضی کے مطابق چل رہا ہے اور نہ صرف یہ کہ زمین کا گوشہ گوشہ اس کی ربوبیت کا اعلان
کر رہا ہے بلکہ یہ آسمان اور اس پر چمکنے والے ستارے بھی اس کی جلالت و عظمت اور اس کی
عدیم المثال کاریگری کا ڈنکا بجا رہے ہیں۔

اے کریزی ماریسن

مولانا محمد سلیمان فرخ آبادی

خ س ر کا مادّہ ذیل کے معانی پر مشتمل ہے۔

۱۔ خَسِرَ یَخْسَرُ:۔ ضَلَّ وھَلَکَ۔ گمراہ ہوا، بھٹک گیا۔ ہلاک اور تباہ و برباد ہوا

۲۔ خَسَرَ یَخْسِرُ:۔ المیزان نقصہٗ۔ وزن اور تولنے ناپنے میں کمی کی اور گھٹایا

۳۔ ۔ ۔ ۔ :۔ المال ضیّعہٗ۔ مال کو ضائع اور برباد کیا۔

۴۔ خَسَّرَہٗ و اَخْسَرَہٗ:۔ خسارے میں مبتلا کر دیا۔ گمراہ کر دیا۔ تباہ کر دیا۔

۔ اَخْسَرَ الرَّجل:۔ آدمی خسارے اور گھاٹے میں مبتلا ہو گیا۔

ان لغوی استعمالات کے بعد واضح طور پر یہ بات سامنے آگئی کہ فکر و عمل اور دنیا و آخرت کا ہر گھاٹا خسارہ، نقصان اور ٹوٹا، ہر قسم کی تباہی اور گمراہی خُسران کے تحت آجاتی ہے۔

آئیے غور و فکر کی نظر ڈالیں اور بصارت و بصیرت سے کام لے کر دیکھیں کہ قرآن کی نگاہ میں خسران کیا ہے؟ اور کس قسم کے افکار و نظریات اور کس طرح کے اخلاق و کردار اور کون سے اعمال و افعال کو وہ دنیا و آخرت کا خسارہ قرار دیتا ہے تاکہ ہم خود بھی خسران سے بچنے کی فکر کر سکیں اور دوسروں کو بھی اس بد بلا سے بچانے کی کوشش کر سکیں۔

اہلِ فسق خسران سے دوچار ہوں گے۔

بے شمار انسان اللہ تعالیٰ کی کتابوں سے اور خصوصاً قرآن مجید سے فکر و عمل کے میدانوں میں ہدایت یاب ہوئے ہیں، دوسری آسمانی کتابیں منسوخ ہو چکیں مگر اللہ کی آخری کتاب سے تو اب بھی راہ یاب ہو رہے ہیں اور قیامت تک راہ راست پاتے رہیں گے، لیکن ان انسانوں کا بھی

...لوگ شمار نہیں جو اللہ کی کتاب سے ہدایت حاصل کرنے کے بجائے ضلالت کی اندھیاریوں میں
...بلک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں راہ یاب ہونے کے بجائے گمراہیوں کی دلدلوں میں پھنستے ہیں راہ راست
...پا مزن ہونے کے بجائے کج راہی اختیار کرتے ہیں اور فکر وعمل کی ٹیڑھی میڑھی راہوں کو اختیار کرتے
...اور جہنم کی طرف بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی دنیا کو بھی جہنم بنا کر چھوڑتے ہیں ——
...کے یہ نافرمان بندے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارتے ہیں اللہ اور بندوں سے کیے ہوئے عہدوں
...توڑتے ہیں، خالق اور مخلوق سے باندھے ہوئے مواثیق کے پرخچے اڑا ڈالتے ہیں —— خود خیال
...یئے ایسے لوگ جو فطری عہد، عہدِ الست، شعوری عہد (جو انسان اللہ اور بندوں سے کرتا ہے) کسی
...کا پاس نہ کیا کریں۔ قومی وسیاسی مواثیق ومعاہدات، انفرادی اور اجتماعی عہد توڑنے کے جو لوگ
...رہو جائیں، تو ایسے لوگوں کو سوائے خسران کے اور کیا ہاتھ لگے گا، وہ گمراہ بھی ہوں گے اور تباہ بھی،
...کی دنیا اور آخرت دونوں خراب ہوں گی، ان کا فکر وعمل دونوں اکارت جائیں گے۔

جو لوگ خدا اور خلقِ خدا سے تعلق اور ربط استوار کرنے، بڑھانے اور صحیح بنیادوں پر قائم کرنے
...بائے ہر ایک کیساتھ قطع کریں یا غلط طریقوں سے جوڑنے کی ناکام کوشش اور اپنی صلاحیتوں اور
...یوں کو برباد کر کے اللہ کی زمین پر فساد برپا کریں۔ ایسے افراد اور قوموں کا حشر، خسران سے دوچار
...کے علاوہ اور کچھ ہوگا؟ آیا وہ کسی اور انجام کے مستحق ہو سکتے ہیں؟ تباہی اور خسران کے علاوہ
...کے پلے میں اور کچھ آئے گا؟ چنانچہ سورۂ بقرہ آیات ۲۶، ۲۷ رکوع ۳ میں فرمایا: "جو لوگ عہد
...مضبوط باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور اللہ نے جن تعلقات اور امور کو جوڑنے کا حکم دیا ہے ان
...ع کرتے ہیں اور زمین میں (اپنے فکر وعمل اور سعی وجہد سے) فساد برپا کرتے ہیں۔ یہی لوگ خسارے
...رہنے والے ہیں" کیونکہ انہوں نے وفائے عہد کی جگہ عہد شکنی، وصل کی جگہ فصل صلاح کے بجائے
...کی روش اختیار کی لہذا خسران کے سوا اور کچھ نہ پائیں گے۔

...ت خداوندی سے محرومی سب سے بڑا خسران ہے

کائنات اور انسان کا وجود، ان کی بقا اور نشوونما تینوں، اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم اور
...کے فضل پر قائم ہیں ورنہ کائنات اور انسان نہ وجود پذیر ہو سکتے تھے نہ باقی رہ سکتے تھے اور
...ان نشوونما اور ارتقا نصیب ہو سکتا تھا، صرف آخرت نہیں، دنیا میں بھی انسان کا تباہی وبربادی

سے محفوظ رہنا اور کا ئنات ساوی وارضی سے بچا رہنا، یہ سب رب تبارک وتعالیٰ کا فضل اور
کا رحم وکرم ہے ورنہ وہی چیزیں جن پر انسان کی زندگی کا انحصار ہے ذرا سی دیر میں انسان اور
کی کائنات کو تلپٹ کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ ہوا، آگ، پانی اور زمین وغیرہ سب اللہ کی
میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ تھوڑی ڈھیل دیتا ہے تو طوفانِ باد وباراں کی شکل میں، سیلابوں اور زلز
کی صورت میں وہ تباہی آتی ہے کہ برسوں بلکہ صدیوں کا تمدن آن کی آن میں تباہ ہو کر رہ جا
سچ ہے بغیر فضل خداوندی کے انسان خسران سے نہیں بچ سکتا۔ چنانچہ سورہ بقرہ آیت ۶۴
میں فرمایا پس اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم یقیناً خسران میں رہنے والے ہو

کتاب اللہ کا حق ادا کرنے والے خسران میں مبتلا رہیں گے

جو لوگ پاک نگاہ، پاک دل اور پاک نیت کے ساتھ ہدایت اور نور حاصل کرنے کی غرض
قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں، غور وفکر اور تدبر وتفکر سے کام لیتے ہیں تنگ نظری اور ہر قسم کے تعصب
پرہیز کرتے ہیں اور قرآن سے فیض حاصل کرنے کی سعی وجہد کرتے ہیں وہ خوش قسمت ایمان وایقا
اپنا دامن بھر لیتے ہیں لیکن ان کے برعکس جو لوگ تنگ دل اور تنگ نظر ہوں، جن کی نیتوں میں فس
کا پاپ بھرا ہو جو ہدایت حاصل کرنے اور فیض اٹھانے کی غرض سے نہیں، کیڑے نکالنے کے مقصد سے ق
کی ورق گردانی کرتے ہوں۔ وہ قرآن سے، اس کی راہ سے، اس کے نظریہ کائنات سے اور اس کے م
رویہ زندگی سے، کوسوں دور رہتے ہیں، ان کی کوشش رائگاں جاتی اور ان کی سعی نامشکور رہتی۔
وہ الحاد، کفر یا شرک میں لت پت رہتے ہیں اور گمراہیوں اور باطل پرستیوں کی دلدلوں میں اور
پھنستے اور دھنستے چلے جاتے ہیں، کفر وباطل کے یہ پیرو سوائے خسران اور ہمیشہ کی تباہی کے اور
حاصل نہ کر سکیں گے چنانچہ سورۂ بقرہ آیت ۱۲۱ ع ۱۴ میں فرمایا۔ "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی
جو اس کا حق ادا کرتے ہیں وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور جو اس کے ساتھ کفر وانکار کی روش اختیار
کرتے ہیں وہی خسران میں مبتلا رہنے والے ہیں۔

اسلام کے علاوہ ہر مذہب خسران سے دوچار کرنے والا ہے

اللہ تعالیٰ انسان کا خالق، رازق اور مالک ہی نہیں ہے بلکہ وہ رب، شارع اور قانون
کرنے والا حاکم بھی ہے۔ اس نے صرف روشنی، ہوا، پانی اور حرارت، غذا، لباس اور مکان ہی

نہیں فرمایا بلکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے آداب بھی سکھائے ہیں' اس نے صرف دل و دماغ' آنکھ
کان' ناک وغیرہ حواسِ خمسہ ظاہرہ اور حواس خمسہ باطنہ ہی نہیں دیے بلکہ انسان کو اس کے مبدء و معاد
سے بھی آگاہ فرمایا۔ زندگی کا فلسفہ بھی دیا' اور لائحہ عمل بھی عنایت فرمایا۔ صرف نماز روزہ اور
حج و زکوٰۃ یا وضوء اور غسل' طلاق و نکاح کے احکام اور ہدایات ہی نہیں دیں' بلکہ سیاست و تجارت
معاشرت اور معیشت' تہذیب اور تمدن کے میدانوں میں بھی کامل رہنمائی فرمائی۔ نجی پرائیوٹ اور
عائلی زندگی میں رہنمائی دینے کے ساتھ ساتھ قومی اور بین الاقوامی مسائل کا حل بھی سمجھایا۔ اس کا دین کامل
اور جامع دین ہے۔ افراط و تفریط سے پاک معتدل دین ہے۔ زمان و مکان کی قیود سے' نسل و نسب
قوم و وطن' رنگ و زبان کی تنگنائیوں سے' خدا اور اس کا دین دونوں پاک ہیں' اس کی خدائی
تمام مکانوں اور تمام زمانوں پر حاوی ہے۔ اس کا کسی نسل' کسی قوم' کسی وطن اور کسی رنگ و زبان سے
کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ وہ سب کا ہے اور سب اس کے ہیں۔ اسی طرح اس کا دین بھی نہ زمانی ہے
اور نہ مکانی' نہ نسلی ہے اور نہ نسبی' نہ قومی ہے اور نہ وطنی' نہ لونی ہے اور نہ لسانی۔ وہ آفاقی اور
ہمہ گیر ہے۔ انسانیت کی دنیوی اور اخروی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ اس دین کے علاوہ جو دین'
مذہب اور ازم بھی اختیار کیا جائے گا وہ انسان کو تباہی و بربادی سے دوچار کرے گا۔ اسلام کے
علاوہ کسی بھی دین' مذہب اور ازم کو اختیار کرنے کے نتیجے میں خسران اور تباہی و بربادی کی خبر تو قرآن
دے رہا ہے لیکن دنیا میں دوسرے ازموں کے بل بوتے پر انفرادی و اجتماعی زندگی کی تباہی و
بربادی ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ آہ! آج انسانیت کراہ رہی ہے۔ دنیا پرستی کا مزہ بھگت
رہی ہے۔ دینِ حق سے روگردانی کا انجام یہی ہونا تھا۔ چنانچہ سورۂ آل عمران آیت ۸۵ ع ۹ میں
فرمایا جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ ہرگز مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت
میں خسران زدہ لوگوں میں رہے گا۔ نیز سورۂ عنکبوت آیت ۵۲ ع ۶ میں فرمایا:۔ اور جو لوگ باطل پر
ایمان لائے اور اللہ کے ساتھ کفر کیا۔ یہی لوگ خسران میں رہنے والے ہیں

اہل کفر کی اطاعت کرنے والے خسران میں مبتلا ہوں گے

دنیا اور آخرت میں نجات کی راہ صرف یہ ہے کہ انسانی افراد اور گروہ اللہ اور اس کے رسول
کی کامل اطاعت کریں' فکر و خیال میں بھی' عقیدہ و مذہب میں بھی' معاشرت و معیشت میں بھی تہذیب و

تمدن میں بھی تجارت و سیاست میں بھی گھر اور عبادت گاہوں سے لے کر بازاروں اور منڈیوں تک بھی
ملکی اور قومی ایوانہائے سیاست سے لے کر انٹرنیشنل اداروں تک میں بھی صلح و جنگ کے میدانوں
سے لے کر علم و ادب کی محفلوں تک میں، ہر جگہ اور ہر مقام میں، اللہ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت
کی جائے یہی راہ نجات ہے۔ انسان اس راہ نجات کو چھوڑ کر فکر و عمل کی جو راہ بھی اختیار کرے گا
وہ تباہی و بربادی کی راہ ہوگی۔ الحاد، کفر، شرک، فسق و فجور، مادہ پرستی، سیکولرازم، نیشنلزم، سوشلزم،
کیمونزم وغیرہ جتنے بھی دین حق کے علاوہ قدیم مذاہب یا جدید ازمس ہیں وہ سب باطل راہیں ہیں
اور انسان کو جہنم کے گڑھے میں گرا کر تباہی و بربادی کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ اللہ اور رسول کی اطاعت
اور اتباع کے علی الرغم پوری زندگی یا اس کے کسی شعبے میں بھی کسی مردہ یا زندہ انسان کی اطاعت
اور اتباع انسان کو خسران اور بربادی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران آیت ۱۴۹ ع ۱۶
میں فرمایا:۔ "اے ایمان والو! تم اگر اہل کفر کی اطاعت کرو گے تو وہ تم کو الٹے پاؤں واپس (کفر و
شرک کی طرف) لے جائیں گے، اور تم خسران میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

شیطان کو ولی بنانے والے خسران میں مبتلا ہوں گے

دنیا میں آج تک کوئی انسان ایسا پیدا ہوا اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے جس کی باگ ڈور
کسی نہ کسی کے ہاتھ میں نہ ہو۔ ہر انسان کسی نہ کسی کی مٹھی میں ہوتا ہے۔ طبعی اور تکوینی پہلو کا ذکر نہیں ہو رہا
ہے۔ انسان کے انسانی پہلو اور اختیاری حیثیت کی بات ہو رہی ہے۔ کوئی بندۂ خدا ہوتا ہے، تو کوئی
بندۂ نفس اور کوئی بندۂ دام و درم، زر و زن اور زمین کے ہاتھ نقد دل کوئی بار بیٹھتا ہے تو کوئی عہدۂ
اقتدار کا فریفتہ اور دنیوی آرام و راحت کا دلدادہ اور گرویدہ ہوتا ہے۔ کوئی دنیا پر ریجھا ہوا ہے
تو کوئی آخرت کی فلاح و بہبود کے عوض اپنے کو فروخت کر چکا ہے۔ ہر ایک نے سودا کیا ہے اور اپنی
زندگی کو بیچ ڈالا ہے لیکن خدا اور رسول کو چھوڑ کر جس نے ابلیس لعین کے ہاتھ اپنی زندگی کا سودا
چکایا ہے۔ وہ ہمیشہ کے خسارے میں مبتلا اور خسران سے دوچار ہوا۔ چنانچہ سورۂ نساء آیت ۱۱۹ ع ۸
میں فرمایا: "اور جس نے اللہ کے بجائے شیطان کو اپنا سرپرست، ولی اور دوست بنایا پس وہ یقیناً
خسران میں مبتلا ہو گیا۔

کفر و انکار کی روش اختیار کرنے والے خسران سے دوچار ہوں گے

دنیا کے جرائم میں جرم بغاوت اس قدر سخت و شدید ہے، بھیانک اور رذیل ہے کہ اس کی موجودگی میں ایک باغی کی تمام نیکیاں اور بھلائیاں ہیچ بلکہ کالعدم قرار دی جاتی ہیں ــــ ایک وفادار غلام کی حکم عدولیاں، انگیز کی جا سکتی ہیں۔ اس کی نالائقیاں اور نافرمانیاں معاف کی جا سکتی ہیں لیکن ایک باغی اور سرکش غلام کو برداشت نہیں کیا جا سکتا، معاف نہیں کیا جا سکتا ــــ وفاداری اور بغاوت کے مابین یہ فرق و امتیاز صرف بندوں ہی نے نہیں، خدا نے بھی ملحوظ رکھا ہے۔ چنانچہ سچے "خدا پرست" کے تمام گناہ معاف کیے جا سکتے ہیں لیکن کفر و شرک و الحاد (جو دراصل خدا سے بغاوت کے ہم معنی ہیں) کو معاف نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس بغاوت کے ساتھ کچھ اچھے کام بھی کوئی باغی اگر کرے جائے تو وہ بھی سب رائگاں جائیں گے ــــ کفر و شرک اور الحاد آدمی کو ہر قسم کے اور ہمیشہ کے خسران میں مبتلا کر دیتے ہیں اور پھر انسان کہیں کا بھی نہیں رہتا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ آیت ۵ ع ۱ میں فرمایا:- اور جو ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کرے (اور کفر کی روش اختیار کرے) تو اس کا کیا دھرا برباد ہو جائے گا، اور وہ آخرت میں خسران میں رہے گا۔ نیز سورۂ فاطر آیت ۳۹ ع ۵ میں فرمایا اور کافروں کے واسطے ان کا کفر خسارے کے علاوہ کچھ اضافہ نہیں کرتا۔

جہاد سے منہ موڑنے والے خسران میں مبتلا ہوں گے

یہ دنیا عمل کی دنیا ہے، یہ عالم سعی و جہد کا عالم ہے، یہ جہان عمل پیہم اور جہد مسلسل کا جہان ہے یہاں انفرادی زندگی کی کامرانیاں بھی سعی پیہم پر موقوف ہیں اور اجتماعی زندگی کی فلاح و بہبود اور تہذیب و تمدن کا ارتقاء بھی انسان کی تگ و دو اور دوڑ دھوپ پر منحصر ہے لیکن تلوار سے پہلے قلم درکار ہے، قوائے عمل کو حرکت میں لانے سے پہلے قوائے ذہنیہ کا تزکیہ ضروری ہے وہ عمل سے پہلے قوت فکر و نظر ضروری ہے۔ یعنی عمل صالح کا دارومدار ایمان اور یقین کامل پر ہے مگر بسا ایمان جو رگوں میں حرارت پیدا کرنے سے قاصر ہو، کارآمد نہیں ہے۔ ارض مقدس فتح کرنے کے لئے نرا ایمان کام نہیں دیتا۔ جب تک کہ جہاد نہ کیا جائے ایمان کے اس تقاضے سے جس نے جی چرایا وہ خسران میں مبتلا ہوا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ آیت ۲۱ ع ۴ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کا یہ ٹکڑا نقل فرمایا:- اے برادران قوم! ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ (فتح کر لو) جسے اللہ نے تمہارے

کھو دیا ہے اور پیٹھ نہ دکھاؤ ورنہ ناکام و نامراد رہو گے اور خسران سے دوچار ہو گے۔

انسان کی جان کا احترام نہ کرنے والے خسران میں رہیں گے

دنیا کے تمام مظالم انسان کی تمام ستم رانیاں، آدم کے بیٹوں اور حوّا کی بیٹیوں کی داستانہائے خونچکاں اور تاریخ کی تمام خوں ریزیاں اپنے پس منظر میں اغوائے شیطانی، اتباعِ نفس اور حبِ دنیا کے علاوہ تین منفی بنیادیں رکھتی ہیں جو بس بھری ہیں اور زہر ہلاہل سے بھی زیادہ مہلک ہیں۔

(۱) خدا سے بے خوفی، (۲) آخرت سے بے نیازی۔ (۳) انسانی جان و مال کا عدم احترام۔

قابیل دنیا اور آخرت کے خسران میں صرف اس لیے بتلا ہوا کہ اس نے اپنے بھائی کی جان کا احترام نہ کرتے ہوئے اسے قتل کر دیا تھا۔ اس پہلے انسانی خون سے لے کر آج تک جتنے خون ہو چکے ہیں اور اب جو خوں ریزیاں ہو رہی ہیں اور رہتی دنیا تک جس قدر خون بہائے جائیں گے ان سب کا بوجھ قابیل کی گردن پر بھی ہو گا۔ اس سے بڑھ کر بھیانک خسران اور کیا ہو گا جس میں قابیل بتلا ہوا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ آیت ۳۰ ع ۵ میں فرمایا:۔ پس اس کو (قابیل نے) قتل کر دیا پس وہ (قابیل) خسران زدہ لوگوں میں جا شامل ہوا۔

منافقانہ کردار کا آدمی خسران میں بتلا ہو کر رہے گا۔

ناپختہ سیرت، ناقابلِ اعتبار کیرکٹر اور یقین سے محروم کردار کا آدمی نہ دنیا کے مطلب کا ہوتا ہے اور نہ دین کے کام کا، حتیٰ کہ وہ خود اپنے کام کا بھی نہیں ہوتا، ریب و تذبذب اور شک و شبہہ اور نفاق زدہ انسان کسی راہ پر جم نہیں سکتا کسی جگہ استقامت کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ لہذا دنیا و آخرت دونوں میں اس کے حصے میں خسران کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا، خصوصاً وہ انسان جو کفر و اسلام اور حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان ریب و تذبذب اور نفاق میں بتلا ہو۔ ایسا شخص آخرت میں تو جہنم کے درکِ اسفل میں جھونکا ہی جائے گا۔ دنیا میں بھی ایسے آدمی کی بڑی کرکری ہوتی ہے چنانچہ سورۂ مائدہ آیت ۵۳ ع ۸ میں فرمایا: ان کے اعمال اکارت ہو گئے پس وہ (منافقین) ہو گئے خسران میں رہنے والے۔

آخرت کا انکار کرنے والے خسران میں بتلا رہیں گے۔

شترمرغ ریت میں اپنا سر چھپالے اور آنکھیں بند کرے تو اس کے اس احمقانہ عمل سے طوفان

چہ ایک حقیقت ہے فسانے میں تو تبدیل نہیں ہو جائے گا۔ سیلاب جو پہاڑ جیسی لہروں کے ساتھ امنڈتا چلا آ رہا ہو کسی کے اپنے گھر میں گھس کر دروازہ بند کر لینے اور آنکھیں میچ لینے سے اپنا رخ تو نہیں موڑ لے گا اور نہ اس کا پانی ہوا بن کر اڑ جائے گا۔ وہ ایک حقیقت ہے جسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے حقیقت کو تسلیم کر کے اس سے عہدہ برآ ہونے کی سعی و جہد کے ذریعہ اپنا بچاؤ کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ ورنہ حقیقت کے انکار سے آدمی خسران میں مبتلا تو ہو سکتا ہے اس سے محفوظ نہیں ہو سکتا۔ آخرت بھی ایک حقیقت ہے دنیا کے طوفانوں سے زیادہ بڑا طوفان، دنیا کے سیلابوں سے زیادہ حشر خیز اور ہلاکت آفریں سیلاب اپنے دامن میں پوشیدہ رکھنے والی حقیقت، اس کا انکار وہی بدنصیب انسان کرے گا جس نے ہمیشہ کے خسران سے اپنا دامن زندگی آلودہ کر لیا ہو۔ چنانچہ سورۃ الانعام آیت ۱۲ ع ۲ میں فرمایا: "جن لوگوں نے اپنے کو (ابدی) خسران میں مبتلا کر لیا ہے وہ آخرت پر (ہرگز) ایمان نہیں لائیں گے"۔ نیز سورۃ نمل آیت ۴، ۵ میں فرمایا: "یقیناً وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لیے ہم نے ان کے کرتوت کو خوش نما بنا دیا ہے پس وہ دل کے اندھے ہو رہے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے (دنیا اور آخرت میں) برا عذاب ہے اور آخرت میں یہی سب سے زیادہ خسران میں مبتلا ہونے والے ہیں"

حق کو ٹھکرانے والے خسران میں مبتلا ہوئے

جن لوگوں نے سمع، بصر اور فواد کی قوتوں سے غلط کام لیا ہو، تجربے اور مشاہدے سے غلط نتائج اخذ کیے ہوں، آفاق اور انفس کے دلائل کو نظر انداز کیا ہو۔ تنگ نظری اور تعصب کا شکار ہو کر انبیاء علیہم السلام کی دعوت پر کان نہ دھرے ہوں، ہوائے نفسانی اور اتباع شیطانی میں پھنس کر اس حق کا انکار کیا ہو جسے وہ غیر مشتبہ طور پر پہچان چکے ہوں، ایسے ظالموں کو ایمان نصیب نہ ہو گا کیونکہ انہوں نے ہدایت کے واضح راستے کو ٹھکرا کر اپنے پیر میں خود کلہاڑی ماری ہے اور خسران میں جا پڑے ہیں چنانچہ سورۃ انعام آیت ۲۰ میں فرمایا: "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کو مثل اپنے بیٹوں کے پہچانتے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو خسران میں مبتلا کر لیا۔ پس وہ ایمان نہ لائیں گے"۔ نیز سورۃ نحل آیت ۱۰۸، ۱۰۹ میں فرمایا: "یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے یہی لوگ ہیں جو غفلت میں مبتلا ہیں۔ یقیناً یہ لوگ آخرت میں خسران زدہ لوگوں میں ہوں گے"۔

حج

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

حج ایک نہایت جامع اور ہمہ گیر عبادت ہے، اس میں تمام مالی اور بدنی عبادتوں کی روح موجود ہے، عاجزی، احتیاج، بندگی، اطاعت، تقویٰ، سپردگی، قربانی، انابت اور عبدیت کے وہ تمام جذبات جو دوسری مستقل عبادتوں سے الگ الگ نشو و نما پاتے ہیں۔ حج کی ہمہ گیری یہ ہے کہ اس میں بیک وقت وہ تمام کیفیات اور جذبات پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں۔

غور کیجیے نماز جو پورے دین کی عملی بنیاد ہے، اس کی اقامت کے لیے اس سرزمین پر جو سب سے پہلی مسجد تعمیر ہوئی تھی حج میں مومن اسی کے گرد والہانہ طواف کرتا ہے اور زندگی بھر جس پاک گھر کی طرف رُخ کر کے مومن نماز پڑھتا رہا ہے حج ہی میں اس کو یہ سعادت حاصل ہوتی ہے کہ وہ عین اس مسجد میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرے، روزہ جو تربیتِ نفس کا ایک مؤثر ترین لازمی ذریعہ ہے اس میں آدمی تمام مرغوباتِ نفس سے دست کش ہو کر وہ مجاہد سپاہی بننے کی کوشش کرتا ہے جو خدا کی راہ میں صبر و استقلال کے ساتھ سب کچھ برداشت کر سکے، حج میں آدمی احرام باندھنے کے وقت سے لے کر آخر تک اسی مجاہدے میں اپنے شب و روز بسر کرتا ہے۔ صدقہ اور زکوٰۃ میں آدمی اپنا محبوب مال خدا کی راہ میں دے کر اپنے دل کو زرپرستی کے گندے جذبات سے پاک کرتا ہے اور اس میں خدا کی محبت کے بیج بوتا ہے۔ حج میں بھی آدمی برسوں کا جمع کیا ہوا، دل پسند مال دل کھول کر خرچ کرتا ہے، اور دنیا کی محبت سے بے نیاز صرف خدا کی محبت میں ہر طرح کی قربانی پیش کرتا ہے ——— غور کیجیے تو ان عبادتوں کے علاوہ دوسری تمام عبادتوں کی روح بھی آپ کو حج میں موجود ملے گی۔ پھر حج اس پہلو سے بھی بڑی اہم اور جامع عبادت ہے کہ تربیتِ نفس، تزکیۂ اخلاق اور روحانی ارتقا کی تمام ہی ممکن اور مؤثر ترین

تدبیریں حج میں موجود ہیں۔ اور حج کی ایک ایک عبادت ہر حیثیت سے مومن کو واقعی مومن اور مسلم حنیف بنانے کا قطعی ذریعہ ہے۔ اگر حج واقعی حج ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جس نے اس گھر کا حج کیا — اور دوران حج اس نے نہ تو کوئی شہوانی حرکت کی، نہ کوئی گناہ کیا — جب وہ حج کر کے لوٹتا ہے تو ایسا ہوتا ہے کہ گویا آج ہی پیدا ہوا ہے۔"

یعنی آدمی چاہے کیسے ہی گناہوں میں ملوث ہو اگر وہ واقعی حج کو صحیح جذبات کے ساتھ ادا کرے تو یہ حج اس کو صحیح اسلام کی فطرت پر لوٹا دیتا ہے اور وہ گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ پاک و صاف پیدا ہوا تھا۔

حج کے لغوی معنی ہیں "زیارت کا ارادہ کرنا"۔ قرآن کی زبان میں حج اس عبادت کا نام ہے جس میں آدمی کعبہ کی زیارت کا ارادہ کرتا ہے۔ حج زندگی میں ایک بار ہر اس بالغ مسلمان پر فرض ہے جو مکے تک آنے جانے کی قدرت اور وسعت رکھتا ہو، حج کی دینی اہمیت اور فضیلت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جنت کی قطعی ضمانت قرار دیا ہے، اور جو لوگ وسعت اور قدرت رکھنے کے باوجود حج کرنے سے غفلت برتتے ہیں قرآن نے ان کی اس روش کو کفر کی روش قرار دیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ خدا ایسے لوگوں سے بے نیاز اور بے زار ہے، اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح اس طرح فرمائی ہے "اس شخص کو یہودی یا نصرانی مرنا چاہیے (اور آپ نے تین بار یہ الفاظ دہرائے) جو سفر کی وسعت اور راستے کا امن پانے کے باوجود حج کیے بغیر مرگیا۔"

خانۂ کعبہ کی اہمیت

حج کی دینی اہمیت اور فضیلت جاننے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ "حج" جس پاک گھر کی زیارت و طواف کا نام ہے، خدا کی نظر میں خود اس گھر کا کیا مرتبہ اور مقام ہے۔

سب سے پہلی عبادت گاہ

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ (آل عمران ۹۶)

بلاشبہ سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی ہے وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔

اس بحث سے صرفِ نظر کہ اس گھر کی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی یا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی یا خود فرشتوں نے۔ بہرحال یہ قرآن کا صاف صاف اعلان ہے کہ اس سرزمین پر خدا کی عبادت کے

ہے سب سے پہلا جو گھر تعمیر ہوا ہے وہ یہی ہے جو مکہ کرمہ میں واقع ہے اور اسی وجہ سے قرآن حکیم نے اس کو قدیم ترین گھر کہا ہے۔ "وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۝ اور انہیں چاہیے کہ اس قدیم ترین گھر کا طواف کریں۔

ہدایت و برکت کا سرچشمہ

مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (آل عمران ۹۶)	اس کو خیر و برکت دی گئی ہے اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا ہے

حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنی اولاد کو اس مبارک گھر کے پڑوس میں لاکر بسایا تھا۔ اس وقت دل کی گہرائی سے یہ دعا کی تھی ۔" خدایا! میں نے ان کو اس لیے یہاں لاکر ڈالا ہے کہ وہ تیری نماز قائم کرے۔ خدایا! تو لوگوں کے دل ان کی طرف اشتیاق و عقیدت سے جھکا دے، اور ان کو ہر طرح کے پھلوں سے مالا مال فرما دے۔ اسی دعا کی قبولیت کا نتیجہ ہے کہ خدا کا یہ گھر ہمیشہ سے دینی اور دنیوی برکتوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور آج بھی جن کو اس مرکز ہدایت کی زیارت نصیب ہو دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح یہاں سے ہدایت کی شعاعیں پھیلتی ہیں اور کس طرح یہاں دنیوی نعمتوں کی بارش ہوتی ہے۔

ابراہیمؑ کی عبادت گاہ

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۝	اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں ابراہیم کا مقام عبادت ہے۔

یعنی اس میں ایسی کھلی ہوئی علامتیں موجود ہیں جو اس بات کی شہادت ہیں کہ خدا نے اس گھر کو عظمت و حرمت سے نوازا ہے۔ مقام ابراہیم کی موجودگی اس بات کی ایک تاریخی دلیل ہے کہ ابراہیمؑ نے یہاں خدا کی عبادت کی ہے اور خدا کی عبادت ہی کے لیے اس کو تعمیر کیا ہے۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى (البقرہ: ۱۲۵)	اور ابراہیم جہاں عبادت کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اس کو مستقل عبادت گاہ بنالو۔

دین کا منبع

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ	"اور یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی۔ (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف

السُّجُوْدِ ۵ (حج: ۲۶) کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

توحید پر پختہ یقین اور نماز کا قیام — یہی پورے دین کا مغز اور نچوڑ ہے۔ عقیدے کے پہلو سے توحید تمام ایمانیات کی اصل بنیاد ہے اور عمل کے پہلو سے نماز تمام اعمال صالحہ کی جڑ ہے۔ قرآن کی تصریح کے مطابق خانہ کعبہ کی تعمیر انہیں دو اہم ترین امور دین کو انجام دینے کے لیے ہوئی ہے۔ رہتی دنیا تک کے لیے اس پاک گھر سے توحید کی روشنی پورے کرۂ ارضی میں پھیلتی رہے گی اور قیامت تک تمام خدا پرست اپنے خدا کی پرستش کے لیے اسی کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہیں گے۔ پاک جذبات کے ساتھ تعمیر کیا ہوا یہ خدا کا گھر دین کا منبع اور مرکز ہے۔

انسانیت کا مرجع

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا — اور جب ہم نے اس گھر (کعبے) کو تمام انسانوں کے لیے مرجع اور مرکز امن قرار دیا تھا

"انسانیت کا مرجع" ہونے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ حج کے ایام میں اطراف عالم سے خدا پرست یہاں جمع ہوتے ہیں۔ اور اس گھر کا طواف اور زیارت کرکے دین و دنیا کی برکتیں سمیٹتے ہیں بلکہ اس کا وسیع تر مطلب یہ ہے کہ مومن اپنی پوری زندگی میں اسی کے گرد چکر کرتا ہے۔ یہی اس کے ایمان کا مرکز ہے یہی اس کی اصل عبادت گاہ ہے۔ یہیں سے اسے توحید کی غذا ملتی ہے اور اسی کو وہ اپنی پانچ وقت کی نمازوں میں قبلہ بناتا ہے۔

امن عالم کا مرکز

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (ابراہیم ۳۵) — اور جب ابراہیمؑ نے دعا کی، اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے بچا۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا (البقرۃ: ۱۲۵) — اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کے لیے مرجع اور امن کا مرکز قرار دیا تھا۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّیُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ — کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک پرامن حرم بنا دیا ہے۔ حالانکہ ان کے گردوپیش

حَوْلِهِمْ (العنکبوت ۶۷) لوگ اُچک لیے جاتے ہیں۔

وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا (آل عمران ۹۷) اور جو اس میں داخل ہوا مامون ہوا

پہلی آیت میں حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی کہ شہر مکہ کو امن کا شہر بنا دے۔ دوسری آیت میں خدا تعالیٰ نے اولاد ابراہیم کو اپنا یہ احسان یاد دلایا کہ ہم نے کعبہ کو تمام انسانوں کے لیے امن کا مرکز بنایا اور تیسری آیت میں بھی خدا نے اپنے اسی احسان کا ذکر فرمایا ہے کہ ہم نے حرم کعبہ کو ایک پر امن مقام بنایا ہے اور چوتھی آیت میں اس واقعہ کا ذکر ہے کہ جو بھی حرم کعبہ میں داخل ہوا پھر مجال نہیں کہ کوئی اس کا بال بیکا کر سکے۔

آخر کی تین آیتیں بتاتی ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول فرمالی اور حرم کعبہ کو وہ حرمت و فضیلت بخشی کہ روئے زمین پر اس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی، جاہلیت کے اس تاریک ترین دور میں بھی جب کہ ہر طرف لوٹ مار، بدامنی اور فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا، حرم کعبہ کا یہ احترام تھا کہ خون کے پیاسے دشمن یہاں ایک دوسرے کو دیکھتے لیکن کسی کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ دشمن پر ہاتھ اٹھائے۔

ایک بات جو خاص طور پر ناظر کی توجہ کو کھینچتی ہے وہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا یہ فقرہ ہے۔ مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا — امن کی دعا کے بعد یہ فقرہ اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتا ہے کہ دراصل تمام تباہ کاریوں، فتنہ سامانیوں اور فساد انگیزیوں کا سرچشمہ شرک و کفر ہے اور امن عالم کا راز یہ ہے کہ دنیا میں دین توحید قائم ہو، خدا پرستی ہی وہ واحد بنیاد ہے جس پر پوری انسانیت متحد اور متفق ہو سکتی ہے، اور یہ فساد بھری دنیا امن و عافیت کا گہوارہ بن سکتی ہے، شرک و کفر کے اس تاریک دور میں بھی حدود کعبہ حرم آمن تھا جبکہ اس کے ارد گرد لوگ اُچک لیے جاتے تھے۔ یہ معمار کعبہ کے پاک جذبات کی برکت تھی کہ ہر دور میں اس کا یہ احترام باقی رہا اور صرف بنی اسمٰعیل ہی نہیں بلکہ مجوسی اور صابی، یہودی اور نصرانی سب ہی دل سے اس کی عظمت و احترام کے قائل تھے۔

آج کی فتنہ و فساد سے جاں بہ لب دنیا جو امن و عافیت کو ترس رہی ہے۔ کاش کوئی ایسا بندۂ خدا اس کو جھنجوڑے، جس کی آواز میں یقین کی ٹھنڈک، ایمان کا سوز اور کردار کی طمانیت ہو، اور بتائے کہ امن عالم کا مرکز خدا کا وہ گھر ہے جو اس روئے زمین پر خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر ہے اور جس کا معمار انسانیت کا امام ہے — یہ گھر ہر وقت اپنے وجود سے پیغام توحید نشر کر رہا ہے

اور زبانِ حال سے پکار پکار کر انسانیت کو خدا پرستی کی بنیاد پر جمع ہونے کی دعوت دے رہا ہے ایسی دعوت جس کے حق ہونے پر کائنات کا ذرہ ذرہ شہادت دے رہا ہے۔

معمارِ کعبہ کی دعائیں اور تمنائیں

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

(البقرۃ: ۱۲۷-۱۲۹)

اور جب ابراہیم اور اسمٰعیل اس گھر کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں سے یہ خدمت قبول فرمالے تو سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار بنائے رکھ اور ہماری اولاد میں سے ایک ایسا گروہ برپا کر جو تیرا مسلم ہو۔ اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا ہماری حالت پر رحم کی توجہ فرما۔ بلاشبہ تو بہت زیادہ توجہ فرمانے والا اور بڑا ہی مہربان ہے، اور اے پروردگار! ان لوگوں میں خود انہیں میں سے ایک ایسا رسول اٹھائیو جو انہیں تیری آیتیں سنائے ان کو تیرا قانون سکھائے، ان کو حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مقتدر اور حکمت والا ہے۔

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۹۶، ۹۷ شاہد ہیں کہ خدا نے ابراہیم کی یہ دعا قبول فرمائی اور اس گھر کو تمام جہاں کے لیے ہدایت برکت اور امن کا مرکز قرار دیا اور یہ وضاحت فرمائی کہ خود اس گھر کے وجود میں ایسی صریح علامتیں موجود ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ اللہ کی جناب میں مقبول ہے اور البقرہ کی آیت ۱۲۵ میں اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا گھر کہا ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ

پروردگار! میں نے ایک بے آب گیاہ وادی میں اپنی ایک اولاد کو لا بسایا ہے تیرے

عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ...... رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ (ابراہیم ۳۷-۴۱)

محترم گھر کے پاس۔ پروردگار! یہ اس لیے کہ یہ لوگ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے، اور انہیں کھانے کو پھل دے تاکہ یہ تیرے شکر گزار بندے بن کر رہیں —— اے میرے پروردگار! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد کو بھی۔ پروردگار! میری دعا قبول فرما۔ پروردگار! مجھے اور میرے ماں باپ کو اور سب مومنوں کو اس دن معاف کر دیجیو جب کہ حساب قائم ہوگا۔

معماران کعبہ کو وصیت

وَعَهِدْنَآ إِلٰٓى إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (البقرۃ ۱۲۵)

اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو وصیت کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

"پاک رکھو" کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اسے شرک و کفر کی نجاستوں سے پاک صاف رکھا جائے۔ اس میں خدا کے سوا کسی دوسرے کا نام بلند نہ ہو اور اس سے دنیا کو صرف توحید کا پیغام ملے۔ بالکل فطری طور پر خدا کی یہ وصیت آج ان لوگوں کی طرف منتقل ہوئی ہے جو ملت ابراہیمی پر چلنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور خدا کے گھر کو اپنا قبلہ مانتے ہیں بالخصوص وہ افراد جو بیت اللہ کی تولیت اور نگرانی کی عظیم ترین ذمہ داری پر فائز ہیں۔

تعمیر کعبہ کا مقصود

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَأَذِّنْ

اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر (کعبے) کی جگہ تجویز کی تھی (اور یہ ہدایت کی تھی) کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّ	اور لوگوں کو حج (کعبہ) کے لیے اذن عام
عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ	دے دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز
كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝	مقام سے پیدل اور دبلے اونٹوں پر سوار
(الحج ۲۶، ۲۷)	آئیں۔

تعمیر کعبہ کا مقصد روز اول ہی سے یہ تھا کہ خدا کی بندگی کرنے والے یہاں جمع ہوں اور قیام و رکوع اور سجود کر کے توحید کا غلغلہ بلند کریں اور شرک کی گندگیوں سے نہ صرف اس گھر کو پاک رکھیں بلکہ اس کی برکت سے تمام عالم انسانی سے شرک کی نجاستیں مٹا دیں۔ دور دراز سے لوگ شوق و ولولے کے ساتھ اس گھر کی زیارت کو آئیں اور یہاں سے توحید کا پیغام لے کر دور دراز ملکوں میں پھیل جائیں اور اس پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں۔ اسی لیے روز اول سے خدا نے ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں کو یہ اذن عام دے دو کہ وہ اس پاک گھر کا حج کریں اور یہاں جمع ہو کر توحید کے نعروں سے اپنے دلوں کو گرمائیں اور یہ پیغام لے کر زمین کے چپے چپے میں پہنچیں۔

حج کی فرضیت

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ	اور لوگوں پر خدا کا یہ حق ہے کہ جو اس
حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ	گھر تک پہنچنے کی وسعت اور قدرت رکھتا ہو
اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۝ (آل عمران ۹۷)	وہ اس کا حج کرے۔

"خدا کا حق ہونے" کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگوں پر فرض ہے۔ یہی آیت بتاتی ہے کہ حج مسلمانوں پر فرض ہے اور حدیث رسولؐ سے اس کی تشریح ہوتی ہے کہ زندگی میں ایک بار ہر بالغ مسلمان پر حج فرض ہے، بشرطیکہ وہ مکے تک آنے جانے کی وسعت اور قدرت رکھتا ہو[1]

(باقی)

---

[1] وسعت و قدرت رکھنے کا مفہوم فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے ملے گا۔

اسبابِ فساد کا تجزیہ اور ازالے کی تدابیر

(جناب انعام الرحمٰن صاحب بھوپال)

ملک میں فسادات کا جو چکر چل رہا ہے اس کے متعلق خیال تھا کہ یہ وقتی ہیں، ملک کو آزاد کرانے کی کوشش میں جو مختلف قومیتیں ایک دوسرے کے مقابلے میں آگئی تھیں یہ ان کا جوش ہے جو وقت کے ساتھ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا اور یہ سلسلہ برابر چل رہا ہے۔ اور اب اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فسادات ایسے نہیں ہیں کہ پولس کا تشدد یا لیڈروں کی اپیلیں ان کے علاج کے لیے کافی ہوسکیں بلکہ یہ مسئلہ اس قدر نازک اور اہم ہوگیا ہے کہ جو لوگ حقیقتاً اس کی تلخی و ناگواری محسوس کرتے ہیں اور انسانیت کی موت پر راضی نہیں ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپیلیں سننے اور اپیلیں کرنے پر ہی اکتفا نہ کریں اور نہ سرسری نظر سے ان واقعات کو دیکھیں بلکہ سنجیدگی سے ان اسباب کا کھوج لگائیں جنھوں نے یہ صورت حال پیدا کی ہے۔ پھر ان اسباب پر تبصرہ کرکے ہی نہ رہ جائیں بلکہ پوری دردمندی کے ساتھ ان کے علاج کی فکر کریں اور اس سے زیادہ جوش و سرگرمی کے ساتھ میدان میں اتریں جو سرگرمی فسادی عناصر فساد پھیلانے میں دکھاتے ہیں۔

یہ بات ذرا غور کرنے سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ موجودہ صورت حال کے اسباب وعوامل نہ محض تاریخی ہیں اور نہ محض وقتی بلکہ دونوں قسم کے ہیں۔ اس کے کچھ تاریخی و نظریاتی اسباب ہیں جو ایک سلسلے کے ساتھ پیدا ہوتے اور بڑھتے ہوئے ایسا آتش گیر مادہ بن چکے ہیں کہ وقتی و ہنگامی اسباب و محرکات کی چھوٹی چھوٹی چنگاریاں ان کو شعلہ بنا کر بھڑکا دیتی ہیں اور یہ شعلے بڑے بڑے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے ساتھ وسیع ترملکی و قومی مفادات کو بھی غارت کرڈالتے ہیں۔ اب اگر اس صورت حال کو بدل کر امن و آشتی کی فضا بنانا ہے تو اس کے سوا چارہ

نہیں کہ ہم ان پھوڑوں کی مرہم پٹی بھی کریں جو جلد پر نظر آ رہے ہیں اور اس فاسد خون کا بھی علاج کریں جس کے نتیجے میں ملک و ملت کے جسم پر بھی پھوڑے نکل رہے ہیں اور دوسری بیماریاں بھی پرورش پا رہی ہیں

تاریخی اسباب یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہندستان میں سیاسی بیداری کی ابتدا مغربی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر ہوئی۔ اس تعلیم و تہذیب نے جو تحفے ہمارے ملک کو دیے ان میں سے دو تحفے ایسے ہیں جنھوں نے دراصل ہمارے ملک کی صورت گری کی ہے۔ ایک قوم پرستی کا جذبہ اور دوسرا مادہ پرستانہ اخلاق۔ پہلی چیز کو لے کر یہاں کے کارفرماؤں نے "ہندستانی قومیت" کا ایک تخیل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر چونکہ اس کے لیے کوئی حقیقی بنیاد موجود نہیں تھی اس لیے قومیت کی حس کو بیدار کرنے کی جتنی کوششیں کی گئیں۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں ان مختلف گروہوں میں اپنی جداگانہ قومیت کا شعور جاگ اٹھا جن کے اندر قومیت کے فطری عناصر موجود تھے پھر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے برطانوی اقتدار کے خلاف جو جد و جہد ہو رہی تھی اس کا قدم جتنا جتنا آگے بڑھتا گیا ان مختلف قومیتوں کے درمیان آپس کی کش کش اتنی ہی تیز و تلخ ہوتی چلی گئی اس کے بعد جب سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تو حصول اقتدار کی رسہ کشی شروع ہو گئی کیونکہ لادینی جمہوریت کا خاصہ ہی ہے کہ اس میں ووٹ حاصل کرنے کے لیے نئی نئی نفرتیں اور عداوتیں پیدا کی جاتی ہیں۔ اس طرح اس ملک میں ایک کے بجائے بہت سی چھوٹی بڑی قومیتیں پیدا ہو گئیں جن میں سے بعض پوری طرح برسرکار آ کر اپنا کھیل کھیل رہی ہیں اور باقی بہت سی صوبائی و لسانی قومیتیں ابھی دوران تخلیق میں ہیں۔ ان میں سے ایک کی طرف سے دوسرے کے قومی حوصلوں کی مزاحمت جتنی بڑھتی ہے اتنا ہی قوم پرستی کا شعلہ بھڑکتا ہے۔ اور ان کے درمیان عداوت بڑھتی جاتی ہے۔

دوسرا تحفہ یعنی ہمارے ملک نے مادہ پرستانہ اخلاق کا جو درس مغربی تعلیم و تہذیب سے لیا تھا وہ باؤلے کتے کے زہر کی طرح سارے ملک کی رگ رگ میں پھیل گیا۔ اس نے دلوں کو خدا ترسی اور خدا شناسی سے خالی کر دیا شرافت و انسانیت کی جڑیں ہلا دیں اور ان تمام اخلاقی قدروں کو ختم کر دیا جو اس ملک کے لوگوں نے اپنے قدیم مذہب سے پائی تھیں۔ یہ اس نئے اخلاق ہی کا کرشمہ ہے کہ یہاں کی مختلف قومیتیں روز بروز ضلالت کے راستوں پر بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ بڑے بڑے لیڈر بے حیائی کے ساتھ ایمان بیچ بیچ کر قومی خود غرضیوں کے تقاضے پورے کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی ذمہ دار سیاسی جماعتیں

حق و انصاف سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ میں مصروف ہیں۔ بڑے بڑے اخبار انتہائی بے شرمی کے ساتھ جھوٹے پروپیگنڈے اور گالم گلوچ کا طوفان اٹھا کر اور نفرت و عداوت کی شراب پلا پلا کر اپنی اپنی قوموں کو بدمست کیے دے رہے ہیں۔ سرکاری محکموں میں، منڈیوں اور بازاروں میں، اور زندگی کے ہر کاروبار میں جو بے انصافیاں اور بے ایمانیاں ہو رہی ہیں ہر شخص کا معبود اپنا ذاتی و گروہی مفاد بن گیا ہے جس نے ملک کے تمام منصوبوں کو فیل اور حوصلوں کو پست کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ مذہب اور عبادت گاہوں کو بھی جو اخلاق و انسانیت کا سرچشمہ ہیں اپنی اپنی اغراض کا آلہ بنا کر فساد اخلاق سے آلودہ کر دیا گیا ہے یہ سب اسی مادہ پرستانہ اخلاق کے پھل ہیں۔

نظریہ قوم پرستی اور نظریہ اخلاق کے یہ دو تحفے ہیں جو ہمارے ملک نے مغرب سے لیے ہیں اور جنھوں نے ہمارے ملک کو جہنم بنا رکھا ہے اور واقعات کی رفتار صاف بتا رہی ہے کہ یہ اخلاقی زوال ملک کو انتہائی پستی میں ڈھکیل کر رہے گا۔ اگر اس کا علاج نہ کیا گیا اس کا صحیح علاج نہ تو مختلف تہذیبوں کو کوٹ چھان کر ایک معجون بنا دینا ہے جس کا خوشنما نام قومی یک جہتی رکھا گیا ہے نہ معیار زندگی کو بلند کرنے کا نعرہ ہے اس کا صحیح علاج تو یہی ہے کہ ہم قوم پرستی کے بجائے خدا پرستی و انسانیت ورا ستی کا عقیدہ قبول کریں۔ اور مادہ پرستانہ اخلاق کے بجائے خدا پرستانہ اخلاق اپنائیں —— لیکن ساتھ ہی ان اسباب و محرکات کو سمجھ لینا بھی ضروری ہے جو ان مستقل خرابیوں کے ساتھ مل کر طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔

وقتی اسباب ا۔ جہاں تک عوام کی ذہنیت کا تعلق ہے ان کے اندر کہیں بھی فتنہ و فساد کی خواہش نہیں پائی جاتی سان کی فطرت اس بربریت سے انکار کرتی ہے۔ ان کے اندر فساد کا ذوق نہیں بلکہ فساد کا خوف پایا جاتا ہے۔ دوسری طرف اونچے سمجھ دار طبقے کو بھی فساد سے نفرت ہے —— لیکن جب خواص و عوام دونوں فساد کو پسند نہیں کرتے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ فساد ہوتا کیوں ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ ہر گروہ میں ایک ایسا شر انگیز عنصر پایا جاتا ہے جس میں کچھ تو یوں بھی جرائم کا ذوق موجود ہے اور اس کے ساتھ فسادات میں جو لوٹ مار کا موقع ملتا ہے وہ بھی اس کے سامنے ہوتا ہے۔ یہ دونوں محرکات مل کر اس شرارت پسند طبقے کو فتنہ انگیزی پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ فساد کی ابتدا کرنے تک تو یہ عنصر بالکل بیک گراؤنڈ میں رہتا ہے اور نہایت درجہ

پلے چیدہ نفسیاتی تدبیروں سے فضا کو مشتعل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے جاننا اور اس کی کارروائی کو سمجھنا عوام تو کیا خواص کے لیے بھی مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جب فساد پھوٹ پڑتا ہے تو اپنی مخصوص صلاحیتوں کی وجہ سے یہ عنصر یا تو خود بڑھ کر لیڈرشپ سنبھال لیتا ہے یا عوام مجبور ہو کر اسے آگے کر دیتے ہیں اور پھر حالات کی ساری مشین اس عنصر کے قابو میں آجاتی ہے اور سوسائٹی کے اکابر تک اس کے آگے دم نہیں مار سکتے

اشتعال انگیزی کے لیے مختلف وجوہ گھڑنا، ایک فریق کو دوسرے سے ہراس دلانا، اور اس کی تیاریوں کے متعلق جھوٹی اطلاعات فراہم کرنا، اپنی قوم کے لوگوں کو بزدلی کے طعنے دینا، دوسری قوم کی جسارتوں پر تقریریں کرنا اور نتیجہ خیز افواہوں کا پھیلانا۔ اس طبقے کے مخصوص "فنون لطیفہ" ہیں۔

۲۔ بالعموم اس طوفان وحشت کی ابتدا افواہوں سے ہوتی ہے اور افواہوں کے "کارخانوں" کے صناع اتنے ماہر ہوتے ہیں اور عوام کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر ایسی افواہیں وضع کرتے ہیں کہ ان کو سننے کے بعد صبر و تحمل اور غور و فکر سے کام لینا کم از کم سادہ لوح عوام کے لیے بالکل ممکن نہیں رہتا اور افواہوں کی یہ اشتعال انگیزی ایسی قیامت خیز ہوتی ہے کہ اس کی روک تھام سیاست کی نمائشی تنظیموں کے بس میں نہیں رہتی۔

۳۔ خواص و عوام کی ذہنی و عملی تربیت کا نہ ہونا اس فسادی عنصر کو کافی مدد پہنچاتا ہے۔ اکثر لوگ کسی بدنیتی سے نہیں بلکہ ذہنی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے افواہیں پھیلانے میں ان کے سرگرم معاون بن جاتے ہیں۔ اچھے سمجھدار لوگوں کو دیکھا گیا کہ وہ خواہش اور قیاس اور اطلاع میں فرق نہیں کر پاتے اپنے قیاس کو خبر کے طور پر بیان کریں گے۔ اسی طرح دوسرے کے قیاس پر خبر کی طرح یقین کرلیں گے۔

۴۔ اس ذہنی و عملی خام کاری کی ایک شکل خوف اور بزدلی ہے۔ خوف کی حالت قوت واہمہ کو بڑھا کر طرح طرح کے خدشات اور بدگمانیوں کو جنم دیتی ہے۔ ایسے لوگ خیالی اندیشوں سے کانپتے ہوئے تصادم کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو تیاری خوف کے جذبے سے ہو وہ میدان میں نہیں ٹک سکتی۔ اس لیے یہ خوف زدہ اور بزدل طبقہ فسادات میں اہم پارٹ ادا کرتا ہے۔ پہلے تو فساد کی تیاری کرتا ہے اور جب فساد پھوٹ پڑتا ہے تو ان ہیبت زدہ لوگوں میں سے جو شریف ہوتے ہیں وہ تو چپ سادھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور جو شریر ہوتے ہیں وہ اس وبا کو پھیلانے میں طاعون کے چوہوں کا پارٹ

ادا کرتے ہیں۔

۵۔ ہماری سوسائٹی میں ایک عام بیماری احساس کمتری کی ہے۔ یہ احساس کمتری بالعموم ادعائے برتری کا روپ اختیار کرتا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ جو گروہ اکثریت میں ہے، بلکہ جو لوگ برسر اقتدار اور مسلح ہیں وہ تک احساس کمتری کے مرض میں مبتلا ہیں۔ یہ احساس کمتری اپنی طاقت کے مصنوعی مظاہرے کراتا ہے۔ اور دوسروں کو ایسے ہی مصنوعی مظاہروں پر آمادہ کرتا ہے اور جس گروہ کے ہاتھ میں حکومت کی طاقت ہے اسے غلط قسم کے وقار کی حفاظت میں مصروف کر دیتا ہے۔ یہ تہواروں کے موقع پر ہتھیاروں کا مظاہرہ اور برسر عام ہتھیار چلانے کے کرتب دکھانا دراصل احساس کمتری ہی ہے۔ جو ان مظاہروں کی شکل اختیار کر لیتا ہے بالکل اسی نفسیاتی قانون کے مطابق جس کے تحت ایک مفلس آدمی مالداری کا مظاہرہ کرتا ہے۔

۶۔ جب کوئی فساد ہوتا ہے تو قدرتی طور پر تین گروہ فریق بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔ دو گروہ تو وہی ہوتے ہیں جن کے درمیان فساد ہوا اور تیسرا گروہ جو سب سے زیادہ مؤثر طاقت ہے وہ حکومت یا انتظامیہ کا گروہ ہے اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ گروہ بھی جس پر جذبات سے بلند رہنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے انہی تمام آلودگیوں میں آلودہ ہو جاتا ہے جس میں یہ لڑنے والے طبقے آلودہ ہیں۔ چونکہ یہ گروہ بھی اسی سوسائٹی سے بنا ہوا ہے جس میں یہ فسادات ہو رہے ہیں اس لیے ان تمام خرابیوں میں برابر کا شریک ہے جس میں یہ سوسائٹی مبتلا ہے۔ اس لیے یہ تیسرا گروہ بھی یا تو جذباتی طور پر یا کسی مصلحت کے تقاضے سے ایک جانب جھک جاتا ہے اور فساد کو رفع کرنے کے بجائے نظم و کنٹرول کے نام سے خود ایک فریق کی حیثیت سے فساد میں شریک ہو جاتا ہے۔ پھر چونکہ اسے انتظامیہ کی محفوظ پوزیشن حاصل ہوتی ہے اور تمام وسائل سے مسلح بھی ہوتا ہے اس لیے فساد کے دوسرے نہتے فریقوں سے زیادہ مؤثر یہ تیسرا فریق ہوتا ہے۔ پھر اس سے بھی بڑی مصیبت یہ ہے کہ انتظامیہ کے مختلف شعبوں یعنی پولس وغیرہ کی ذہنی و عملی تربیت انگریزوں نے اپنے مفاد کی خاطر اس طرح کی تھی کہ یہ لوگ خود کو حاکم اور عوام کو محکوم سمجھ کر برتاؤ کریں۔ افسوس کہ ان کی تربیت ابھی تک انہی خطوط پر ہو رہی ہے اور یہ لوگ اپنے کو خادم اور عوام کو مخدوم سمجھنے کے بجائے ابھی تک اپنے کو حاکم اور عوام کو محکوم سمجھتے ہیں۔ ملک کے ہر حصے میں جو پولس کا رویہ سامنے آیا ہے اور جس کی شکایت ہر طبقے کے لوگوں نے کی ہے اس کی

بڑی وجہ بھی ہے ـــــ اب ظاہر ہے کہ جس گروہ کے ہاتھ میں پریس سے کر شین گن تک تمام طاقتیں ہوں اور ساتھ ہی اس کا دل و دماغ بھی بیمار ہو تو وہ بڑی آسانی سے اپنی جانب داری کو انصاف کا اور اپنے ظلم و تشدد کو نظم و کنٹرول کا نام دے سکتا ہے اور جب وہ خود کو حاکم اور بڑے بڑے شرفاء اور معززین کو محکوم سمجھ رہا ہو تو وہ ان کی تواضع بوٹ کی ٹھوکر سے نہیں کرے گا تو کیا ان کے سامنے ایڈریس پیش کرے گا؟ پھر اس کے بعد پولس افسران کا شرفاء کو بار بار بلانا ۔ انھیں پکڑ پکڑ کر چھوڑنا اور چھوڑ چھوڑ کر پکڑنا بھی عجیب معاملہ ہے ۔ ان کے اس طرزِ عمل میں جہاں اپنی شوکت کا مظاہرہ، پبلک کو خوف زدہ کرنا، گروہی تعصب اور انگریز کی قائم مقامی کا جذبہ ہوتا ہے وہیں یہ "مجبوری" بھی ہوتی ہے کہ ان بیچاروں کے ساتھ بھی بیوی بچوں کی ضروریات لگی ہوئی ہیں اور پورے ملک کی طرح ان کو بھی اپنا معیارِ زندگی بلند کرنا ہے ۔

۷۔ جمہوری نظام میں عوام ہی طاقت کا سرچشمہ ہوتے ہیں ۔ یا یوں کہیے کہ اقتدار کی کرسی تک انھی کے سروں پر پیر رکھ کر پہنچا جا سکتا ہے ۔ اس لیے یہ فسادات سیاسی کارکنوں اور انفرادی طالع آزماؤں کے لیے زریں مواقع ہوتے ہیں ۔ دبے ہوئے تعصبات کو ابھارنا، پھر ناصح بن کر آ جانا، جہاں آگ لگنے میں کامیابی کی امید ہو وہاں آگ لگانا اور جہاں پانی ڈالنے سے کام بنتا ہو وہاں پانی ڈالنا آج کی لادینی سیاست کا فنِ لطیف ہے ۔ لادینی جمہوریت کا کام اختلافات کے بغیر چل ہی نہیں سکتا ۔ سرمایہ دار و مزدور کی جنگ، علاقائی تعصب، زبان کا جھگڑا، مذہبی عصبیت اور ایسے ہی تمام قضیے دراصل اس جمہوریت کی "ضروریات" ہیں ۔ جمہوریت کے علمبرداروں کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ ہندو مسلمان سے لڑتا ہے یا سکھ عیسائی سے ۔ بنگالی آسامی کو مارتا ہے یا سرمایہ دار مزدور کو انھیں تو بس جھگڑا چاہیے تاکہ ان میں سے کسی ایک کی حمایت کر کے انھیں ملک و قوم کی "خدمت" کا موقع ملے ۔

۸۔ موجودہ ذہنی و اخلاقی حالت میں قدرتی طور پر یہی ہوتا ہے کہ جب کوئی ناخوشگوار صورت پیش آجاتی ہے تو ایک دوسرے پر الزام تراشی کا چکر چل پڑتا ہے ۔ ہر فریق خود کو مظلوم و بے قصور ثابت کرنے اور فریقِ مقابل کو ظالم و قصور وار ٹھیرانے میں اپنی پوری ذہانت صرف کر دیتا ہے اس طرح ایک فساد آئندہ کے لیے بہت سے فسادات کا بیج بو دیتا ہے ۔ پھر جو لوگ فسادات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے وہ بھی تعلقات کو درست رکھنے کی جذباتی اپیلیں کرنے اور امن و آشتی کی دہائی دینے

[illegible] لیتے ہیں اور اس بات کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی اور دوسرے کی پوزیشن میں آکر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی کوشش کریں۔ جہاں دوسروں کی غلطیاں سمجھتا اور بیان کرتے ہیں وہیں اپنے گریبان میں بھی منہ ڈال کر دیکھ لیا کریں ـــــ اتنا ہی نہیں بلکہ اپنوں کی غلطیاں اگر منہ پھاڑ کر سامنے آکھڑی ہوتی ہیں تب بھی ان کے اعتراف و اظہار میں کہیں تو مصلحتیں آڑے آجاتی ہیں اور کہیں جرأت و ہمت جواب دے جاتی ہے۔

یہ اور ایسے ہی بعض دوسرے اسباب و عوامل ہیں جنھوں نے زمانہ غلامی کے سیکھے ہوئے افکار و نظریات کے ساتھ مل کر اس ملک کے جسم و کردار کو داغ دار بنا رکھا ہے۔ ہمارے ملک کی پوزیشن اپنی وسعت اور وسائل و ذرائع کی کثرت اور قدیم مذہبی و اخلاقی مزاج کے اعتبار سے ایسی تھی کہ اگر ان نعمتوں کے ساتھ ایک ترقی یافتہ نظریۂ اجتماع اور ایک صالح نظریۂ اخلاق اور ہوتا تو یہ عظیم ملک مادہ پرستی اور فساد اخلاق سے ماری ہوئی دنیا کو آدمیت کا درس دے سکتا تھا۔ ویسے تو ہم اب بھی بقلم خود اپنے کو ایشیا کا لیڈر اور دنیا کا رہنما کہہ سکتے ہیں کوئی ہماری زبان پکڑنے والا نہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہماری ذہنی غلامی نے اور اس کے نتیجے میں ہونے والے آئے دن کے فسادات نے ہمارے احساس کی گردن جھکا دی ہے اور ہمارے لیڈروں کو بھی باہر کی دنیا میں شرمندہ ہونا پڑتا ہے جن کی عزت ساری دنیا میں کی جاتی ہے۔ اگر حقیقت بیں نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ ہنگامے دراصل ایک آئینہ ہیں جن میں اس ملک میں رہنے والا ہر شخص اور ہر گروہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ پھر یہ دونوں باتیں اس کے اختیار میں ہیں کہ یا تو چہرے پر جو داغ بھی نظر آئے اس کو صاف کرلے یا اس آئینے کو اٹھا کر پھینک دے اور اپنے ضمیر کو تھپکی دے کر سُلا دے۔

اگر کوئی شخص یا گروہ یہ سمجھتا ہے کہ اس بگاڑ کی ذمہ داری خود اس کے علاوہ دوسروں پر ہے تو وہ فریب نفس میں مبتلا ہے اور گروہی تعصب نے اس کے انصاف کی حس کو معطل کر دیا ہے۔ اگر وہ غلط جذبات سے بلند ہو کر دیکھے تو اسے صاف نظر آجائے کہ اس حمام میں جو بھی جاتا ہے اخلاق و انسانیت کے کپڑے اتار کر ہی جاتا ہے۔ ان میں اگر کوئی فرق ہے تو درجات کا ہے نہ کہ نوعیت کا۔

امید کی شعاع

اس تاریکی میں ہمارے لیے امید کی ایک ہی شعاع ہے اور وہ یہ کہ ہماری پوری آبادی بگڑ کر نہیں رہ گئی ہے۔ بلکہ ہر طبقے میں خاصی تعداد ایسے لوگوں کی

پائی جاتی ہے جو عام بداخلاقی سے محفوظ ہے۔ لیکن بدقسمتی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں بدی تو منظم ہے اور پوری باقاعدگی سے اپنا کام کر رہی ہے لیکن نیکی منظم نہیں ہے۔ نیک لوگ موجود ضرور ہیں مگر منتشر ہیں۔ ان کے اندر کوئی ربط و تعلق نہیں۔ ان کا کوئی لائحہ عمل نہیں۔ اسی چیز نے ان کو بالکل بے اثر بنا دیا ہے۔ کبھی کوئی اللہ کا بندہ اپنے آس پاس کی برائیوں کو دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے مگر جب کسی طرف سے کوئی آواز اس کی تائید میں نہیں اٹھتی تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص حق و انصاف کی بات علانیہ کہہ بیٹھتا ہے مگر منظم بدی زبردستی اس کا منہ بند کر دیتی ہے۔ کبھی کوئی شخص انسانیت کا خون ہوتے دیکھ کر صبر نہیں کر سکتا۔ اور اس پر احتجاج کر گزرتا ہے مگر ظالم لوگ ہجوم کر کے اسے دبا لیتے ہیں اور اس کا حشر دیکھ کر بہت سے ان لوگوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں جن کے ضمیر میں ابھی کچھ زندگی باقی ہے۔ یہ حالت اب ختم ہونا چاہیے۔ اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا ملک خدا کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس عذاب میں نیک و بد سب گرفتار ہو جائیں تو ایسے تمام لوگوں کو جن کے دل میں انسانیت کا کچھ بھی نور رہ ہے چونک کر اٹھ کھڑا ہونا چاہیے ——

ہم اپنے ایسے تمام بھائیوں کو جن کا رشتہ نیکی و شرافت سے بالکل کٹ نہیں گیا ہے آواز دیتے ہیں کہ بدی کے اس طوفان کو روکنے کے لیے اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں، اپنے مقام کو پہچانیں، گہرائی میں اتر کر حالات کا بے لاگ جائزہ لیں، اور اپنے سینے کے اندر گھس کر ضمیر سے دریافت کریں کہ حالات کا تقاضا کیا ہے؟ آیا شرارت کے اس طوفان پر دل مسوس کر رہ جانا کافی ہے یا اس کو روکنے کے لیے کچھ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی دیکھیں کہ ہم میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ ذمہ داری کیا ہے؟

اقتدار ملکیت نہیں ہے

ہمارے جو بھائی اقتدار کی کرسی پر براجمان ہیں انھیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس ملک کے مالک نہیں ہیں اور اس کرسی پر ہمیشہ کے لیے ان کا اجارہ نہیں ہو گیا ہے۔ وہ خدا کو مالک الملک سمجھتے ہیں یا عوام کو ہر حال انھیں ایک دن اس کرسی سے ہٹنا ہے۔ اور اس بات کا جواب دینا ہے کہ انھوں نے اس کرسی کا حق کتنا ادا کیا۔ اگر آپ خدا کو ملک کا مالک سمجھیں اور اپنے کو خدا کا نائب اور اس کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہوئے اس کی منشاء کے مطابق کام کریں تو یہ ایک حقیقت کا اعتراف ہو گا۔ آپ کی زندگی ذمہ دارانہ زندگی اور آپ کا رویہ متوازن رویہ ہو گا اور آپ اقتدار کے اس نشے سے کامیابی کے ساتھ بچ سکیں گے جو

... بے ہوش عالم ... کے سر چڑھ کر انھیں مدہوش بنا دیتا ہے لیکن اگر آپ عوام ہی کو مالک الملک مانتے ہیں تب بھی آپ کو عوام کے نائب کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے۔ عوام نے بھی کسی کی بدعملی کو کبھی معاف نہیں کیا ہے۔ مورخ آپ کی کارگزاریوں کا منتظر ہے۔ اس وقت دونوں چیزیں آپ کے اختیار میں ہیں۔ آپ وہ کام بھی کر سکتے ہیں کہ آیندہ نسلیں آپ کے کارناموں پر فخر کریں اور مورخ عزت کے ساتھ آپ کا نام لے اور وہ کام بھی کر سکتے ہیں کہ آنے والی نسلیں آپ کو ملامت کریں اور مورخ آپ کی کارگزاریوں کو سیاہ کارناموں میں درج کرے۔ یاد رکھیے آپ کی اصلی تصویر وہ نہیں ہے جو آج خود آپ کا موئے قلم بنا رہا ہے۔ بلکہ حقیقی تصویر وہ ہوگی جو کل مورخ کا قلم بنائے گا۔

اکثریت کی ذمہ داری

ہمارے جو بھائی اکثریت میں ہیں ان سے یہ کہنا تو شاید بے نتیجہ ہوگا کہ خدا نے اس ملک کو یہ دیکھنے کے لیے آپ کے چارج میں دیا ہے کہ آپ کیا عمل کر کے دکھاتے ہیں۔ آپ تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ عظیم ملک آپ کی قربانیوں کے نتیجے میں آپ کو ملا ہے۔ آپ ایسا ہی سمجھتے رہیے لیکن ذرا ٹھیر کر یہ بھی سوچ لیجیے کہ آزاد اور حکمراں قوم کی کیا ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور ان کے اندر کیا صفات ہونی چاہییں۔ ایک حکمراں قوم میں سب سے پہلی اور سب سے اہم صفت جو ہونا چاہیے وہ ہے عالی ظرفی۔ اس بنیادی صفت کے بغیر نہ شجاعت و ہمت پیدا ہوتی نہ انصاف و رحم اور نہ اور کوئی ایسی صفت پیدا ہو سکتی جو حکومت کرنے کے لیے ضروری ہے اور جس کے بغیر ..... کوئی قوم آج تک غالب و برتر نہیں رہ سکی ہے اور نہ اقتدار کے نشے کو ہضم کر سکی ہے۔ آپ ازراہ عنایت و مصلحت چاہے اقلیتوں کو شریک حکومت بتاتے ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ عملاً آپ ہی حکمرانی کے منصب پر فائز ہیں۔ اس اعتبار سے آپ کی ذمہ داری اس ملک میں رہنے والے تمام گروہوں سے زیادہ سخت ہے۔ اکثریت میں ہونا کوئی کمال نہیں ہے۔ کمال دراصل وہ صفات پیدا کرنا ہے جن سے قومیں عزت و طاقت کا مقام حاصل کرتی ہیں۔ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیے کہ کیا وہ صفات آپ کے اندر ہیں؟ ـــــ اگر ہیں تو خدا کا شکر ادا کیجیے اور بے فکر رہیے۔ کوئی اقلیت تو کیا بڑی بڑی طاقتیں بھی آپ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گی۔ لیکن اگر اس سرمایے سے آپ محروم ہیں تو سب سے زیادہ فکر کی بات یہی ہے۔ قوموں کو مسخر کرنے والے یہ ہتھیار نہ آپ کو امریکہ فراہم کر سکتا ہے اور نہ کوئی اور ـــــ انھیں تو خود آپ کو اپنے سینوں کی بھٹیوں میں ڈھالنا ہوگا۔

اس موقع پر جب کہ آپ تعمیر کے دور سے گزر رہے ہیں آپ کی بہادری یہ نہیں ہوگی کہ آپ اقلیتوں کو کچل دیں اور کمزوروں کو دبالیں۔ آپ کا کمال یہ ہوگا کہ ایک صالح نظریے کو اپنا کر وہ بنیادی صفات اپنی قوم کے اندر پیدا کریں جن سے قوم کی صحیح تعمیر ہوسکے۔ وہ ظرف اپنے اندر پیدا کریں کہ مظلوم لوگ آپ کی پناہ ڈھونڈھنے لگیں۔ دیانت وامانت اور صداقت وحق گوئی کی وہ صفات پیدا کریں کہ آپ کے غیر بھی آپ کے گرویدہ ہوجائیں۔ یقیناً آپ کے یہاں بڑی اچھی اور اعلیٰ صفات کے لوگ موجود ہیں ـــــ اور یہ بات محض رواداری کے طور پر نہیں کہی جارہی ہے بلکہ واقعۃً موجود ہیں ـــــ لیکن معاف کیجیے آپ کا جو مجموعی طرز عمل سامنے آرہا ہے وہ تو یہ ہے کہ جو قومیں آپ کے اندر تقریباً ضم ہوچکی تھیں وہ بھی آپ کا طرز عمل دیکھ کر آپ سے کٹتی جارہی ہیں۔ آپ کے اسی طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مفکر نے کہا تھا کہ "ان کو خدا نے سب کچھ دیا ہے لیکن بڑا دل، وسیع نظر اور فراخ حوصلہ نہیں دیا۔" خیالی خطرات واندیشوں کی بو سونگھ لینے میں آپ کی ضرورت سے زیادہ ذکاوت حس ہی نے لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ "دنیا میں یہی ایک اکثریت ایسی ہے جو اقلیت سے خطرہ محسوس کرتی ہے۔" ذرا چین سے سوچیے کہ کیا وہ تہذیب جس کو آپ زندہ کرنا چاہتے ہیں اس میں کیا کمزوروں کو کچلا جاتا ہے، گلے میں لگایا جاتا ہے؟ اہنسا اور پریم وآشتی جو آپ کی تہذیب کا مخصوص شعار ہے کیا لاٹھیوں اور بھالوں کے ذریعہ ہی پھیلتی ہے؟ آپ کے وہ بزرگ جن کی بہادریوں پر آپ فخر کیا کرتے ہیں کیا اسی طرح خوف زدہ رہا کرتے تھے؟ ہمارے علم کی حد تک تو ان کا تصور اور طرز عمل یہ تھا کہ "جو تلوار لیے ہوئے سر اور کمزور جسم پر اٹھتی ہے وہ بہادر کے ہاتھ میں نہیں ہے۔" ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ آپ اپنے اجتماعی طرز عمل سے اپنا جو تعارف کرا رہے ہیں کیا وہ آپ کی درخشاں تہذیب کا صحیح تعارف ہے؟ اگر یہ تعارف صحیح نہیں ہے تو یہ بھی سوچ لیجیے کہ اس میں نقصان کس کا ہے؟ یاد رکھیے کہ آپ کا پورے ملک کو ایک قوم بنا دینے کا خواب خود آپ کے ہاتھوں پریشان ہوتا جارہا ہے۔ آپ کے خنجر کی نوک سے بہت سے سوتے ہوئے لوگ اٹھ بیٹھیں گے اور آپ کی متحدہ قومیت کو منتشر کرکے رکھ دیں گے۔ اگر آپ کو بڑا بننا ہے تو اس کے لیے صرف کثرت تعداد کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے تو دل کو بڑا اور سینہ کو کشادہ کرنا پڑے گا۔ نہ سہی عفو ودرگذر کا حوصلہ کم از کم برداشت کی طاقت تو اپنے اندر پیدا کیجیے۔

لیکن اگر آپ نے ٹھنڈے دل سے سوچ کر یہ پالیسی بنائی ہے کہ اس ملک کی اقلیتوں کو مار مار کر ختم کر دینا ہے اور اس ملک میں شمشان بھومی جیسا امن قائم کر دینا ہے تو پھر ہم کو آپ سے کچھ نہیں کہنا۔ اچھا ہے، یہ تجربہ بھی کر دیکھیے۔

قدر خود شناس

پھر اس ملک کی اقلیتوں کو سوچنا چاہیے کہ ان کا صحیح مقام کیا ہے اور ان کے کرنے کا صحیح کام کیا ہے؟ یہ بات تو صحیح ہے کہ زبان سے چاہے کچھ کہا جاتا رہے لیکن ملک کے نظام حکومت میں بحیثیت ایک تہذیبی گروہ کے ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ پھر کیا آپ کا کام بس اتنا ہے کہ اکثریت کی یلغار کو روکنے اور حکومت میں سے کچھ حصہ بٹا لینے کی کوشش میں اپنی طاقتیں صرف کرتے رہیں۔ چاہے ملک کہیں بھی جائے؟ آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کمزور صرف اس لیے ہیں کہ آپ تعداد میں کم ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ فیصلہ کن طاقت تعداد کی کمی بیشی نہیں بلکہ جوہر انسانیت ہے۔ کم تعداد ہونا کوئی قصور نہیں۔ قصور دراصل یہ ہے کہ ان اقلیتوں کے پاس دنیا کو دینے کے لیے کوئی تحفہ نہیں ہے۔ اگر آپ کے پاس زیادہ ترقی یافتہ اور صالح تہذیب کو وجود میں لانے والے اصول موجود ہیں اور ساتھ ہی وہ اخلاقی طاقت بھی آپ کے اندر ہے جو اصولوں کو منوانے اور عزت کا مقام حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے تو کوئی پروا نہیں اگر آپ تعداد میں کم ہیں کسی گروہ انسانی میں وزن پیدا کرنے والی چیز اس کی تعداد نہیں ہوتی بلکہ صحیح اصول حیات اور اعلیٰ اخلاقی صفات کا جوہر ہی وہ چیز ہے جو کسی گروہ میں وزن پیدا کرتی ہے۔ مگر افسوس کہ آپ کی نگاہ اس طرف نہیں جاتی۔ اول تو آپ نے اپنے فکر و عمل کو اپنے تہذیبی دائرے کے اندر ہی محصور کر لیا ہے اور اگر کبھی آگے بڑھتے بھی ہیں تو اس سے آگے نہیں جاتے کہ بہت سی اقلیتیں مل کر ایک متحدہ محاذ بنا لیں۔ یہ سب تدبیریں مدافعانہ ہیں۔ یہ اگر کامیاب بھی ہو جائیں تو اس سے زیادہ کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ آپ ذرا زیادہ قوت کے ساتھ کش مکش کر لیں گے اور کچھ سیاسی قسم کے وقتی فائدے حاصل کر لیں گے لیکن یہ ایک منفی پالیسی ہوئی۔ جو لوگ کسی خطرے سے بچنے کے لیے خوف کے جذبے سے جمع ہوں وہ زیادہ دنوں جمع نہیں رہ سکتے۔ جہاں وہ خطرہ دور ہوا کہ یہ منتشر ہوئے۔ اگر آپ کے پاس اجتماعیت کے اصول کوئی ایجابی نصب العین اور پرکشش اخلاقی طاقت نہیں ہے تو یہ سیاسی مفاد پر جمع ہونے والی اقلیتیں خود آپس میں دست و گریباں ہوں گی

اور ایک دوسری طرح کے فساد کا سبب بن جائیں گی۔ اگر کسی اقلیت کو عزت کا مقام حاصل کرنا ہے تو اس کی ایک ہی شکل ہے کہ وہ ایسے اصول ملک کے سامنے پیش کرے جو ملک کے موجود انتشار کا علاج ہوں اور اپنے اندر وہ اخلاقی اوصاف پیدا کرے جن کی قدر کرنے پر آج کا مادہ پرست انسان بھی مجبور ہے۔

مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ اب رہا مسلمانوں کا معاملہ تو واقعہ یہ ہے کہ مختلف تاریخی جغرافی حالات کی وجہ سے یہی گروہ سب سے زیادہ حالات کے دباؤ اور فسادات کی زد میں ہے۔ اس کے اسباب خارجی بھی ہیں اور داخلی بھی۔ یعنی دوسروں کی بے اعتدالیاں بھی اس کا سبب ہیں اور خود اپنی کوتاہیاں بھی۔ جہاں تک دوسروں کے غلط طرز عمل کا تعلق ہے تو اس میں شک نہیں کہ ان کا بیان و اظہار بہت لذیذ ہے اور ایسی باتوں سے نفس بہت خوش ہوتا ہے کہ قصور ہمارا نہیں دوسروں کا ہے۔ لیکن یہ طریقہ مفید نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طاقت یا کمزوری کا اعلیٰ سرچشمہ انسان کا اپنا باطن ہے نہ کہ خارجی حالات۔ اگر کسی گروہ کے اندر اپنے نصب العین کا عشق اور کردار کی صلابت ہو تو خارجی حالات، ہوا کے جھونکوں سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ سوکھے پتوں کی طرح اپنے درخت سے کٹے ہوئے ہیں تو یہی ہوا کے جھونکے انھیں اڑائے جاتے ہیں۔ مسلمان کی تو پوری تاریخ گواہ ہے کہ ان کو کوئی دوسرا کبھی نقصان نہیں پہنچا سکا ہے۔ ہمیشہ انھوں نے اپنی نبضیں کاٹنے میں خود ہی چستی دکھائی ہے آج اس ملک میں اپنی حالت پر غور کر لیجیے۔ مسلمان آج تک یہی بات طے نہیں کر سکے کہ ان کی اصل پوزیشن اس ملک میں کیا ہے۔ خود فریبی کے جال سے نکل کر دیکھا جائے تو یہ بات صاف نظر آجائے گی کہ مسلمانوں کی حیثیت یہاں ایک کارفرما طاقت کی نہیں ہے۔ غیر اسلامی نظریات کو قبول کر کے اور غیر اسلامی پارٹی ڈسپلن میں خود کو کس کر دو چار مسلمانوں کا اونچی کرسیوں پر بیٹھ جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ حکومت میں حصہ دار ہیں۔ اس خود فریبی نے دراصل مسلمانوں کی پوزیشن کا اور ان کے رویے کا معاملہ بہت پیچیدہ بنا دیا ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ نقصان مسلمانوں کو اس کہنے نے پہنچایا ہے جو انھوں نے خود ڈال رکھا ہے۔ مسلمان کی حیثیت اصل میں یہ ہے ہی نہیں کہ وہ دوسری اقلیتوں کی طرح ایک اقلیت یا دوسری اکثریتوں جیسی ایک اکثریت ہیں۔ اس کا پہلا منصب تو

ہونے کا منصب ہے۔ مسلمان فخر کے طور پر تو ضرور کہتے ہیں کہ ہم خیر امت ہیں اور ہم کو اس لیے برپا کیا گیا ہے کہ ہم نیکی و خیر کا حکم دیں اور بدی و منکر کو مٹائیں لیکن انھوں نے نہ تو خیر امت ہونے کے تقاضوں کو پوری طرح سمجھا ہے اور نہ عملاً اس خدمت کو انجام دینے کے لیے تیار ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جن کو اخلاق کا پتلا ہی نہیں اخلاق کا محافظ ہونا چاہیے تھا ان کا اخلاق و کردار کسی سے چھپا ہوا نہیں اور جن کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہونا چاہیے تھا وہی سب سے زیادہ منتشر ہیں۔ اگر خدا پرست مسلمانوں کی نظر اپنی غلطیوں پر جاتی بھی ہے تو بس عبادات میں اور کچھ معروف اخلاقیات میں اپنی کوتاہیوں سے آگے نہیں بڑھتی اور اس مقام تک کم ہی لوگوں کی نگاہ پہنچتی ہے کہ اولاً ہم چند اصولوں کے علمبردار اور ہدایتِ الٰہی کے امین ہیں۔ ہماری پہلی ڈیوٹی یہ ہے کہ دنیا والوں تک ان تعلیمات کو پہنچائیں۔ اس اعتبار سے ہمارے لیے اتنا کافی نہیں ہے کہ ہم بس عبادت گزار اور با اخلاق بن جائیں۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ہم کو اخلاق کا معلم و محافظ بننا پڑے گا۔ ہماری زندگی اس میں نہیں ہے کہ کچھ مادی فوائد اور چند عزت کے کھلونوں کی خاطر لڑنے مرنے میں اپنی طاقت صرف کریں بلکہ ہماری زندگی اس میں ہے کہ ان اصولوں کی خاطر جن پر ہم ایمان لائے ہیں، مرمٹنے کی طاقت اپنے اندر پیدا کریں۔ اور گروہی اغراض و مفادات سے بلند ہو کر اور عام انسانیت کی خدمت کو اپنا نصب العین بنا کر کام کریں اور اس طرح اپنے کو دکھی انسانیت کا نجات دہندہ ثابت کریں۔

مسلمان ملک کی ضرورت بن سکتے ہیں

ہندستان اس وقت نظریاتی و عملی اکھیڑ پچھاڑ کی اس حالت میں مبتلا ہے جو کسی ملک کے ایک رخ پر پڑ جانے سے پہلے طاری ہوتی ہے۔ ایک طرف یورپ کے مادہ پرستانہ افکار و نظریات ہیں جو اس ملک پر نازل کیے جا رہے ہیں اور انہی نظریات سے بنے ہوئے عملی سانچے ہیں جن میں اس ملک کو سیاسی طاقت کے زور سے ڈھالا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ملک کا قدیم مذہبی و اخلاقی مزاج ہے جس کا معدہ ابھی الحاد و مادہ پرستی کی مکھی کو ہضم کرنے پر پوری طرح تیار نہیں ہے۔ پھر یہاں کی مذہبی مزاج رکھنے والی قومیں بعض اسباب کی بنا پر ملک کے سامنے کوئی چیز پیش کرنے سے قاصر رہی ہیں جس کی ضرورت بھی ہے اور بڑی حد تک طلب بھی۔ وہ چیز جس کی بنیاد پر ایک ایسا سمویا ہوا نظام وجود میں آئے جو لوگوں کی مادی بھوک کا علاج بھی کر دے اور اخلاقی و روحانی پیاس کو

بھی تسکین دے ـــــ اس چیز کی کمی نے ملک کو بے شمار مسائل میں الجھا دیا ہے۔ اور پورا ملک ٹھٹکا ہوا کھڑا ہے۔

اس موقع پر مسلمان کا کام تھا کہ آگے بڑھ کر اس خلا کو پُر کرتا کیونکہ اس کے پاس وہ چیز ہے جس کی ملک کو اور اہل ملک کو سب سے زیادہ ضرورت ہے لیکن افسوس کہ ملک کے پیچیدہ مسائل کا حل بننے کے بجائے مسلمان خود ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ مسلمان نے اپنا فرض منصبی ادا کرنا چھوڑ دیا تو پورا ملک خاردار جنگلوں سے بھر گیا اور سب سے زیادہ خاردار حصہ ان کے نصیب میں لکھا گیا۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بڑے مفکر نے ان سے بالکل سچ کہا ہے کہ "آپ کا حال اور آپ کا مستقبل معلق ہے اس سوال پر کہ آپ اس ہدایت کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں جو آپ کو خدا کے رسول کی معرفت پہنچی ہے اور جس کی نسبت سے آپ کو مسلمان کہا جاتا ہے اگر آپ اس کی صحیح پیروی کریں اور آپ کے اجتماعی کردار میں پورے اسلام کا ٹھیک ٹھیک مظاہرہ ہونے لگے تو آپ دنیا میں سربلند اور آخرت میں سرخ رو ہوں گے۔ خوف و ذلت اور مغلوبی و محکومی کے یہ سیاہ بادل جو آپ پر چھائے ہوئے ہیں دیکھتے دیکھتے چھٹ جائیں گے۔ انصاف کی امیدیں آپ سے وابستہ کی جائیں گی۔ بھروسہ آپ کی امانت و دیانت پر کیا جائے گا۔ سند آپ کے قول کی لائی جائے گی اور یہ دور صرف تاریخ میں ایک داستان عبرت کی طرح باقی رہ جائے گا کہ اسلام جیسی عالمگیر طاقت کے علمبردار کبھی اتنے بے وقوف ہو گئے تھے کہ عصائے موسیٰ بغل میں تھا اور وہ لاٹھیوں اور رسیوں کو دیکھ دیکھ کر کانپ رہے تھے۔

شر میں سے خیر

یہ ہے مسلمانوں کے تمام مسائل کا اصلی و حقیقی حل۔ ان کے وقتی و ہنگامی مسائل کا بھی مستقل ملی مسئلے کا بھی۔ بلکہ درحقیقت ملک کے مسئلے کا بھی یہی حل ہے یہ جو ان پر مختلف مصائب نازل ہو رہے ہیں۔ یہ ایک طرف تو اس غفلت کی سزا ہے کہ انھوں نے اپنی اصلی ڈیوٹی کو بھلا دیا۔ دوسری طرف ان کو جھنجوڑ کر بیدار کیا جا رہا ہے کہ اب بھی سنبھل جاؤ اور اپنا فرض منصبی ادا کرو ورنہ تم کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ اگر قوموں کے اندر کچھ زندگی ہوتی ہے تو یہ جھٹکے ان کو بیدار کر دیتے ہیں اور حادثات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اگر ان میں ہوتی ہے تو وہ بیدار ہو کر انھی حادثوں کو ترقی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ بھڑکتے ہوئے الاؤ کی مخالف ہوا کے جھونکے اور بھڑکا دیتے

لمٹاتے ہوئے چراغ اسی ہوا سے بجھ جاتے ہیں۔ اب یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ بھڑک اٹھنے والے بنتے ہیں یا بجھنے والا دیا۔

اس شر میں سے خیر کی نمود اس طرح ہو رہی ہے اور اس پر خدا کا جتنا شکر کیا جائے کم ہے کہ مسلمان صورت حال کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں اور "وہ سوتے ہیں کچھ کلبلانے لگے ہیں"۔ پے در پے جھٹکوں نے ان کی آنکھیں کھول دی ہیں اور ان میں یہ احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ وہ اپنے موقف سے ہٹ گئے ہیں۔ ایک نظم اجتماعی کی ضرورت کا احساس بھی ان میں پیدا ہو رہا ہے اور وہ لوگ بھی جن کے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ آدمی کو اپنی روٹی کپڑے سے آگے بڑھ کر بھی کچھ کرنا چاہیے وہ بھی اس ضرورت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ ان میں بے شمار ایسے تڑپنے والے دل موجود ہیں جو ایک صدا پر لبیک کہنے کے لیے بے چین ہیں۔ لیکن وہ آواز انھیں سنائی نہیں دیتی جو ان کی فطرت چاہتی ہے۔ اب یہ کام ملت کے اکابر کا ہے کہ ایسے نازک موقع پر ملت کی صحیح رہنمائی کریں اور شر میں سے خیر کا جو یہ پہلو نکل رہا ہے کہ امت کے اندر ایک پیاس پیدا ہوئی ہے اس کی تسکین کا سامان کریں اور ملک گیر پیمانے پر امت کو ایک ایسا لائحۂ عمل دیں کہ وہ جھاڑ جھنکاڑ کی طرح اکھاڑ کر نہ پھینک دی جائے بلکہ اپنے مقصد وجود کو پورا کرتے ہوئے خود بھی زندگی و توانائی حاصل کرے اور ملک کے لیے بھی مفید ثابت ہو۔

کرنے کا اصل کام تو یہی ہے جو اوپر بیان ہوا لیکن وقتی و مقامی طور پر

ضروری تدابیر کچھ کام ایسے ہیں جن کی طرف تمام ذمہ دار اصحاب کو توجہ کرنا چاہیے۔

۱۔ فساد زدہ علاقے میں بالعموم خوف و ہراس کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اچھے اچھے لوگوں کے پیر اکھڑنے لگتے ہیں۔ اسی طرح بعض جوشیلے عناصر جذبات میں آکر کوئی غلط رخ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں خطرناک ہیں۔ اس کیفیت کو دور کرنے کی پوری کوشش ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں اصل چیز تو توکل علی اللہ ہی ہے۔ مگر ساتھ ہی بعض اور چیزیں بھی اس کوشش میں معاون ہوتی ہیں۔ مثلاً اڑی ہوئی ہر خبر پر بے سوچے سمجھے یقین نہ کر لینا۔ دوسرے فریق کی پوزیشن میں آکر معاملے پر غور کرنا۔ اپنی غلطیوں پر بھی نظر رکھنا۔ تصویر کے دونوں رخ دیکھنا اور یہ بات پیش نظر رکھنا کہ اصل چیز یہ حرکت کرنے والے ہاتھ نہیں بلکہ وہ دماغ ہے جو نظر نہیں آرہا ہے۔ اس طرح کی چیزیں نظر کے سامنے رکھنے سے

ذہنی توازن برقرار رہتا ہے اور معاملے کی تہ تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

۲۔ حریف مقابل کی طرف خود دوستی کا ہاتھ بڑھانا بڑا مشکل کام ہے یعنی یہ کہ جو شخص آپ کی طرف لاٹھی لے کر دوڑے اور آپ اس سے بغل گیر ہونے کے لیے بڑھیں بے شک یہ جوانمردی کا کام ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ کاٹ کرنے والی کوئی تلوار آج تک نہیں بن سکی ہے اگر اس چیز کی ہمت ہو تو شرارت میں مسابقت کے بجائے شرافت میں مسابقت شروع ہو سکتی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ بڑا فرق ہے دوستانہ مصافحہ میں اور مایوسانہ سپردگی میں اپنے وجود کو دوسرے کے حوالے کر دینا کوئی شرافت و رواداری نہیں ہے۔

۳۔ آپس میں ہمدردی و معاونت کا جذبہ ابھارنا۔ انفاق کا جذبہ اور کسی سہارے کے بغیر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا عزم پیدا کرنا، خود غرضی۔ خود رائی اور انتشار کی بیخ کنی کرنا جو اکثر خرابیوں کی جڑ ہے۔ نیز یہ بات ذہن نشین کرنا کہ جماعتی مرکز نہ ہونے کا محض احساس یا شکایت اور ایسے مرکز کی محض آرزو کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے کوشش شرط ہے۔ کوئی لیڈرشپ آسمان سے نازل نہیں ہوگی بلکہ ہم ہی لوگوں میں سے ابھرے گی اگر ہم آزادروی چھوڑ کر خود کو ایک جماعتی فریم میں کسنے پر تیار ہوں۔

۴۔ مندرجہ بالا مقاصد پورے کرنے کے لیے محلہ وار تنظیمیں بنانا مناسب ہوگا جن کا کام یہ بھی ہو کہ زکوٰۃ و صدقات کا ایک نظم بنا کر بیت المال قائم کریں اور اپنے حلقۂ کار میں ایسی رائے عام پیدا کریں جس سے امن و صلاح کی فضا بنے اور فتنہ و فساد دبے ـــــ ان نیک مقاصد کے لیے حریف مقابل کے خیر پسند اصحاب کو آمادہ کرنا اور ان کے ساتھ تعاون کرنا بھی ضروری ہے ـــــ البتہ اس سلسلے میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ہنگامی حالات میں جو امن کمیٹیاں بنتی ہیں ان میں بیشتر وہی لوگ آتے ہیں جو یا تو خود فساد کے سرپرست ہوتے ہیں یا ان کمیٹیوں کو کسی پارٹی کی انتخابی مہم کا ذریعہ بنا دیتے ہیں۔ اس لیے یہ امن کمیٹیاں عام طور پر امن کے لیے کچھ بھی مددگار ثابت نہیں ہوتیں ـــــ ان تنظیمات میں صرف انہی لوگوں کو آنا چاہیے جو چاہے معروف نہ ہوں لیکن ذاتی و گروہی مقاصد سے بلند ہونے کا حوصلہ اور خالص عبادت کی نیت سے خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں ـــــ لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ عام لوگوں میں اچھے برے کی تمیز پیدا ہو جائے۔

تعلیمیت کا کام باقاعدہ کیا جائے یا دردمند لوگ انفرادی طور پر یہ خدمت انجام دیں بہرحال اس خدمت کو ایسی تفریق سے ہرگز گندہ نہ کیا جائے کہ کون مظلوم ہمارا ہم قوم ہے اور کون نہیں۔ ظلم جس پر بھی ہوا ہو وہ ایک سچے اور مخلص آدمی کی ہمدردی کا مستحق ہے۔ اسی طرح بلا لحاظ مذہب و ملت ظالم کی بھی اس طرح مدد کی جائے کہ اس کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔

۶۔ بالعموم "فسادات" کا "تکملہ و تتمہ" مقدمات ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے بچنا تو ممکن نہیں لیکن اس سلسلے میں وہ تدبیریں ہرگز نہ اختیار کی جائیں جو عام طور پر مقدمات کے سلسلے میں کی جاتی ہیں۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹے گواہ پیش کرنے یا اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ آدمی سچ بول کر سزا بھگت لے۔ یہی اخلاقی جیت دراصل حقیقی فتح ہے۔ جو لوگ سچ پر جمے رہنے کی طاقت رکھتے ہیں وہی میدان مار سکتے ہیں۔ ایسی مثالیں تازہ موجود ہیں کہ کچھ جواں مردوں نے سچی اور بے لاگ بات کہہ کر عدالت کو بھی مبہوت کر دیا اور اپنے حریفوں کے بھی سر جھکا دیے۔

یہ چند مشورے ہیں جو ہماری رائے میں سب کے لیے قابل توجہ ہیں۔ عام حالات میں بھی قابل توجہ ہیں اور ہنگامی حالات میں تو ان پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اگر عام حالات میں ہی ان باتوں کا اہتمام کیا جائے تو ان شاء اللہ ہنگامی حالات کی نوبت ہی نہ آئے۔ مشورے ان کے علاوہ اور بھی ہو سکتے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ اصل چیز یہ مشورے اور ریزولیوشن اور کام کی شکلیں نہیں بلکہ اصلی چیز دل کی لگن، ایمان کی تڑپ، خدمت کا جذبہ اور راست بازی ہے۔ اور خدا کے فضل و کرم سے ہماری سوسائٹی میں ان اوصاف کی کمی نہیں ہے صرف ان کے منظم ہو کر کام میں لگ جانے کی کسر ہے۔

نوٹ:۔ یہ مقالہ بھوپال کے فسادات کے موقع پر لکھا گیا تھا، مگر آج بھی اسی طرح تازہ ہے جس طرح اُس وقت تھا۔ (ادارہ)

رسائل و مسائل

وزن صاع کی تحقیق

ال :-

صدقۂ فطر میں گیہوں نصف صاع دینا چاہیے لیکن نصف صاع کے وزن میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ فتاویٰ دیوبند میں پونے دو سیر ادا کرنے کا فتویٰ ہے ۔ علم الفقہ مولفہ مولانا عبدالشکور لکھنوی میں ایک سیر تین چھٹانک لکھا ہے اور کتاب العشر والزکوٰۃ مؤلفہ مولانا عبدالصمد رحمانی میں ایک سیر چھ چھٹانک تحریر کیا ہے ۔ یہ بتائیے کہ وزن میں اتنا اختلاف کیوں ہے اور آپ کے نزدیک کس کی تحقیق اقرب الی الصواب ہے ۔

اب :-

آپ نے سوال میں جس ترتیب سے تین تحقیقوں کا ذکر کیا ہے پہلے میں اسی ترتیب سے ان تینوں ل ذیل میں درج کرتا ہوں ۔

(۱) "فتاویٰ دیوبند مکمل مبوب" میں صاع کے تین اوزان بیان کیے گئے ہیں ۔ ایک جگہ لکھا ہے :۔

"وزن انگریزی سے وزن صاع کا قریب آدھ پاؤ اور ساڑھے تین سیر کے ہوتا ہے اور نصف صاع پونے دو سیر ایک چھٹانک ہوتا ہے سا اسی کے موافق یہاں صدقہ فطر ادا کیا جاتا ہے اور اسی میں احتیاط ہے ۔" (جلد سوم و چہارم صفحہ ۳۰۶)

اس جواب میں نصف صاع کا وزن ایک سیر تیرہ چھٹانک ہوا ، اس کے بعد ایک دوسرے جواب میں ایک سیر گیارہ چھٹانک لکھا ہے اور احتیاطاً پونے دو سیر صفحہ ۳۰۳ اور تیسری جگہ ایک اور کے جواب میں لکھا ہے :۔

"علامہ شامی نے جو وزن صاع کا لکھا ہے اس حساب سے وزن پورے صاع کا تقریباً ساڑھے تین سیر

ہوتا ہے۔ اور نصف صاع پونے دو سیر بوزن انگریزی یعنی ۸۰ تولہ کے سیر سے ہوتا ہے۔ یہی مفتیٰ بہ ہے۔" (صفحہ ۳۹)

ایک ہی کتاب میں جوابات کا یہ اضطراب پڑھنے والے کو الجھن میں مبتلا کرتا ہے۔ صفحہ ۳۶ اور صفحہ ۳۹ والے جواب سادہ ہیں لیکن صفحہ ۳۶-۳۷ پر جو جواب نقل ہوا ہے اس میں سند بھی دی گئی ہے اور باضابطہ حساب بھی پیش کیا گیا ہے۔ کسی سائل نے وزن مثقال، نصاب زکوٰۃ اور وزن صدقۂ فطر کے بارے میں سوال کیا تھا اور وزن مثقال کے متعلق اس نے لکھا تھا کہ غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار میں لکھا ہے کہ مثقال ساڑھے چار ماشے کا ہوتا ہے اور عمدۃ الرعایۃ حاشیہ شرح وقایہ میں مثقال کو تین ماشہ ایک رتی لکھا ہے۔ جواب میں دارالعلوم دیوبند کے محترم و مکرم مفتی نے وزن مثقال کے بارے میں لکھا ہے کہ مثقال کا وزن ساڑھے چار ماشے ہونا بھی صحیح ہے اور سند کے طور پر ترجمہ غیاث اللغات کی یہ عبارت پیش کی ہے:۔

"مثقال بالکسر نام ایک وزن کا کہ ساڑھے چار ماشے کا ہوتا ہے اور اگرچہ اس میں بہت اختلاف ہے مگر قوی یہی ہے۔ انتہیٰ۔

اسی کو بنیاد بنا کر انھوں نے عمدۃ الرعایۃ میں لکھے ہوئے وزن مثقال کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ درہم کا وزن ہے اور پھر اسی بنیاد پر انھوں نے نصف صاع کا وزن تقریباً پونے دو سیر بوزن انگریزی لکھا ہے۔ آگے شامی جلد ثانی باب صدقۃ الفطر کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

اعلم ان الصاع اربعۃ امداد والمد رطلان والرطل نصف من والمن بالدراھم مئتان وستون درھما وبالاستار اربعون والاستار بکسر الھمزۃ بالدراھم ستۃ ونصف وبالمثاقیل اربعۃ ونصف کذا فی شرح درر البحار فالمد والمن سواء الخ

یہ عبارت نقل کر کے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے' میں اس کو یہاں بلفظہٖ نقل کرتا ہوں:۔

"اس تحقیق کا حاصل یہی ہے جو بندے نے لکھا ہے۔ ایک من یعنی ایک مد کا وزن چالیس ستار ہی اور ایک استار ۴½ مثقال پس کل ایک سو اسی مثقال ہوئے۔ اس کے ماشے ۸۱۰ ہوئے اور وہ مساوی ۶۷½ تولے کے ہے۔ یہ ایک مد کا وزن ہے پس دو مد یعنی نصف صاع ۱۳۵ تولے کی برابر ہوئے

اور سیر دونوں بوزن انگریزی ۱۰۰ ور شمار ہوتا ہے یعنی چھٹانک کم پونے دو سیر۔ اور ایک دوسرے حساب سے جو شامی کی عبارت میں من کا وزن دراہم سے لکھا ہے یعنی ایک من ۲۶۰ درہم کا۔ اس حساب سے نصف صاع تین تولہ زیادہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر پونے دو سیر کا حکم کر دیا جاتا ہے"۔

(صفحہ ۳۷)

(۲) علم الفقہ جلد ۴ میں مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:۔

"مثقال، تین ماشے اور ایک رتی کا ہوتا ہے اس لیے کہ مثقال بیس قیراط کا ہوتا ہے اور ایک قیراط پانچ جو کا ہوتا ہے پس ایک مثقال میں سو جو ہوئے اور سو جو کی بحساب چار جو فی رتی پچیس رتیاں ہوئیں اور پچیس رتی کے بحساب آٹھ رتی فی ماشہ، تین ماشے ایک رتی ہوئی۔

درہم زکوٰۃ کے مسائل میں جب بولا جاتا ہے تو اس سے دو ماشے اور ڈیڑھ رتی مراد ہوتی ہے اور ایک ماشہ آٹھ رتی کا ہوتا ہے اور ایک رتی چار جو کی ہوتی ہے پس ایک درہم میں سُتّر جو ہوئے اور ساڑھے سترہ رتی۔

صاع انگریزی سیر کے حساب سے جو کلدار اسی روپے کا ہوتا ہے۔ سوا دو سیر نو تولہ سات ماشے کا ہوتا ہے یا یوں کہا جائے کہ پانچ ماشے کم دو سیر ڈیڑھ پاؤ ہوتا ہے غرض کہ پانچ ماشے کی کمی کوئی کمی نہیں ایک صاع کو دو سیر ڈیڑھ پاؤ سمجھنا چاہیے کیوں کہ حسب تصریح محققین ایک صاع ایک ہزار چالیس درہم کا ہوتا ہے اور ہر درہم دو ماشے ڈیڑھ رتی کا۔ پس صاع میں دو ہزار دو سو چھتر ماشے ہوئے اور ان ماشوں کے ایک سو نواسی تولے سات ماشے ہوئے اور تولوں کے بحساب اسی تولہ فی سیر۔ دو سیر ایک پاؤ نو تولے سات ماشے ہوئے"۔

(صفحہ ۱۵-۱۶)

اس حساب سے نصف صاع، ایک سیر تین چھٹانک ہوا۔

(۳) مولانا عبدالصمد رحمانی کے نزدیک بھی درہم شرعی کا وہی وزن ہے جس کا ذکر علم الفقہ کے لے سے اوپر گزرا یعنی دو ماشے ڈیڑھ رتی، وہ صاع کا وزن بھی علامہ شامی کی تصریح کی بنا پر ایک ہزار چالیس درہم تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی تحقیق میں جو نئی بات ملتی ہے وہ یہ ہے:۔

"ہم نے اسی روپے کو نمبری سیر کے مقابلے میں جو وزن کیا تو اس اسی روپے میں بعض روپے

گیارہ ماشے کا پایا اور بعض روپیہ ساڑھے دس ماشے کا پایا لیکن احتیاط چونکہ ساڑھے دس ماشے میں ہے اس لیے ہم ذیل میں اسی کو اختیار کرکے صدقۂ فطر کا شرعی حساب لکھتے ہیں۔

(کتاب العشر والزکوٰۃ، حاشیہ ص ۱۸۲، ۱۸۳)

مفصل حساب پیش کرکے آخر میں اس کا حاصل یہ لکھا ہے:۔

الحاصل یہ بات صاف ہوگئی کہ نصف صاع کے کل (۳۷ ۱۱ ماشے ۴ رتی) ہوئے اور ایک سیر کے کل ماشے (۸۴۰) ہوتے ہیں۔ اب کتنا اس پر اضافہ کیا جائے کہ دونوں برابر ہوجائیں۔ چھ چھٹانک کا۔ جو صدر کے حساب کی بنا پر ۳۱۵ ماشے ہوتے ہیں۔ اگر اضافہ کردیا جائے تو ایک سیر چھ چھٹانک کے (۱۱۵۵) ماشے ہوجائیں گے اور حساب کی رو سے ہم کو کل (۳۷ ۱۱ ماشے ۴ رتی) دینے ہیں یعنی اس میں ساڑھے سترہ ماشے زیادہ ہیں۔ بہرحال ایک سیر چھ چھٹانک گیہوں ادا کرنے میں صدقۂ فطر (۱۷ ماشے ۴ رتی) کی زیادتی کے ساتھ ادا ہوجائے گا۔ اور یہ بہتر ہے کما لایخفیٰ۔

بعض روپیہ گیارہ ماشے کا ہوتا ہے اس حساب سے اسی روپیے کے سیر سے صدقۂ فطر ادا ہوگا مگر ہم نے احتیاطاً کل روپے کو ساڑھے دس ماشے کا رکھا ہے۔ (حاشیہ ص ۱۸۵)

ان تینوں تحقیقات پر رائے ظاہر کرنے سے پہلے یہ عرض کردینا مناسب ہے کہ درہم شرعی اور مثقال کے وزن کے بارے میں مولانا عبدالشکور اور مولانا عبدالصمد کی تحقیق کی بنیاد فقہاء کے درج ذیل قول پر ہے۔

الدرھم اربعۃ عشر قیراطا والقیراط خمس شعیرات فیکون الدرھم الشرعی سبعین شعیرۃ والمثقال مائۃ شعیرۃ (رد المحتار ج ۲ باب زکوٰۃ المال)	درہم چودہ قیراط کا ہوتا ہے اور قیراط پانچ جو کا لہذا درہم شرعی ستر جو کا ہوا اور مثقال سو جو کا

علامہ شامی اور دیگر فقہاء بھی درہم شرعی کا یہی وزن تسلیم کرتے ہیں۔ اب یہ حقیر ان تینوں تحقیقات پر مختصر تبصرہ کرکے اپنی رائے ظاہر کرتا ہے۔

(۱) دارالعلوم دیوبند کے محترم مفتی رحمۃ اللہ اور مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ کی تحقیق میں اتنے بڑے تفاوت کی وجہ یہ ہے کہ اول الذکر نے صرف غیاث اللغات کے حوالے سے مثقال کا وزن

ساڑھے چار ماشے تسلیم کر لیا ہے اور اسی پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی ہے۔ صاحب غیاث اللغات نے کس بنیاد پر مثقال کا وزن ساڑھے چار ماشے لکھا ہے اس کا کوئی ذکر فتوے میں موجود نہیں ہے۔ حالانکہ وزن صاع کی شرعی تحقیق کے لیے اس بنیاد کا ذکر ضروری تھا۔

دوسری بات یہ کہ سائل نے عمدۃ الرعایۃ (مصنفہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ) کے حوالے سے مثقال کا وزن تین ماشے ایک رتی لکھا تھا اس کے بارے میں حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ وہ درہم کا وزن ہے۔ دوسرے لفظوں میں بات یہ ہوئی کہ عمدۃ الرعایہ میں مثقال کا جو وزن لکھا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا عبدالحی نے مثقال کا وزن غیاث اللغات کی طرح بلا دلیل نہیں لکھا ہے بلکہ دلیل اور حساب کے ساتھ لکھا ہے۔ پھر کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ بے دلیل قول کو قبول کر کے مدلل قول کو رد کیا جائے —— تیسری بات یہ کہ علامہ شامی اور حضرت مفتی صاحب کی تحقیق اس وقت یکساں ہو سکتی ہے جب مثقال کو ساڑھے چار ماشے کا تسلیم کر لیا جائے اور صورت حال یہ ہے کہ علامہ شامی اور دیگر فقہائے احناف کے مسلمات کی بنا پر اس کا وزن تین ماشے ایک رتی ثابت ہوتا ہے نہ کہ ساڑھے چار ماشے —— حقیقت یہ ہے کہ مولانا عبدالشکور لکھنوی کی تحقیق علامہ شامی اور دیگر فقہاء کے مسلمات کے مطابق ہے —— محترم مفتی دارالعلوم دیوبند کی تحقیق اس وقت تک قابل تسلیم نہیں ہے جب تک دلیل اور حساب سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ مثقال کا وزن ساڑھے چار ماشے ہوتا ہے۔

(۲) مولانا عبدالشکور اور مولانا عبدالصمد رحمانی کی تحقیق میں تھوڑے سے تفاوت کی وجہ یہ ہے کہ اول الذکر نے ایک روپیہ کا وزن پورا ایک تولہ مان لیا ہے اور مولانا عبدالصمد رحمانی نے اپنی فنی تحقیق کی بنا پر اس کا وزن ساڑھے دس ماشے تسلیم کر کے حساب کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر تفصیل گزر چکی۔ یہ حقیر مولانا عبدالصمد ہی کی تحقیق کو صحت سے قریب تر سمجھتا ہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ گفتگو مقدار واجب پر ہو رہی ہے۔ نفلاً و تبرعاً تو جس قدر بھی دیا جائے ثواب میں اضافہ ہی ہوگا۔

(سید احمد قادری)

تنقید و تبصرہ

مخدوم جہانیاں جہاں گشت رح — محمد ایوب قادری ایم اے۔ صفحات ۳۰۴۔ کتابت و طباعت و کاغذ اوسط، مجلد مع گرد پوش۔ قیمت سات روپیے۔ غیر مجلد قیمت چھ روپیے۔ ناشر ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی وحید آباد۔ کراچی۔

جناب محمد ایوب قادری ایم اے متعدد کتابوں کے مصنف اور اہل علم کے درمیان معروف شخصیت ہیں۔ ادارۂ تحقیق و تصنیف کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم ہوا ہے۔ ایوب صاحب اس کے معتمد ہیں اور ادارے نے یہ پہلی کتاب شائع کی ہے۔ ادھر ایک عرصے سے پاک و ہند ہر جگہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب علم کی توجہ صوفیۂ کرام کی تاریخ مرتب کرنے کی طرف مبذول ہوگئی ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے اور اس کی بہت ضرورت تھی۔ صوفیۂ حق نے تعمیر سیرت و کردار اور اشاعت اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ فراموش کرنے کے لائق نہیں ہیں بلکہ ضرورت ہے کہ تحقیق و تنقید کے ساتھ ان کے سوانح حیات اور ان کی تعلیمات شائع کی جائیں۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور و معروف صاحب سلسلہ بزرگ ہیں۔ فاضل مؤلف نے تحقیق و تنقید کے ساتھ ان پر یہ کتاب مرتب کرکے مفید خدمت انجام دی ہے، اس کی قدر کرنی چاہیے۔ کتاب آٹھ ابواب پر منقسم ہے اور جدید انداز میں مرتب کی گئی ہے۔ آخر میں اشخاص، مقامات اور کتابوں کے مفصل اشاریے بھی دیے گئے ہیں۔ پہلے باب میں ہند پاکستان میں اسلام کے داخلے سے لے کر حضرت مخدوم کے عہد تک ایک اجمالی تاریخی تبصرے کی وجہ سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں فاضل مؤلف نے جو محنت برداشت کی ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ انھوں نے اس کے لیے تقریباً پونے دو سو کتابیں اور رسالے پڑھے ہیں اور کتابوں کے مطالعہ کے لیے لمبے سفر بھی اختیار کیے ہیں۔ حضرت مخدوم کے نام سے جو سفرنامہ منسوب ہے

اسے جعلی قرار دیا ہے اور قدم شریف کے نام سے جو پتھر رام پور۔ یوپی اور دیگر مقامات پر پائے جاتے ہیں انہیں بھی وضعی قرار دیا ہے۔ غالی اور نادان عقیدت مندوں کو یہ بات بری لگے گی، لیکن کسی کی ناگواری کی وجہ سے سچی بات کو چھپانا صحیح نہیں ہے۔ فاضل مؤلف نے جرأت کے ساتھ سچی بات لکھ دی ہے۔

صوفیۂ کرام کی تعلیمات، ملفوظات وافعال اور ان کے معمولات میں جو چیزیں کتاب وسنت سے متصادم نہیں ہیں وہ بہت ہی مؤثر اور پرسوز ہیں اور انہیں پڑھ کر دل متاثر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں بھی ایسی بہت سی چیزیں موجود ہیں ـــــ لیکن کتاب میں ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جن سے طبیعت میں کھٹک پیدا ہوتی ہے ان کی طرف اگر اشارۃً کیا جائے تو یہ بات دیانت تنقید وتبصرہ کے خلاف ہوگی۔ حضرت مخدوم کے ملفوظات میں سب سے زیادہ جو چیز کھٹکتی ہے وہ احادیث رسول کا حصہ ہے۔ ایک طرف حدیث میں ان کی وسعت نظر اور مہارت کا حال ہم پڑھتے ہیں اور دوسری طرف ان کے ملفوظات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب اقوال پڑھتے ہیں تو دونوں میں تطبیق مشکل ہو جاتی ہے۔ میں یہاں چند کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔

صفحہ ۸۵ میں لکھا ہے: "اسی لیے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اور ابوبکر دو گھوڑوں کے مشابہ ہیں کہ وہ دوڑیں۔ اگر وہ آگے بڑھ جاتے تو میں ان پر ایمان لاتا لیکن میں آگے بڑھ گیا پس وہ مجھ پر ایمان لائے۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب یہ قول پڑھ کر میں لرز اٹھا۔ اس قول سے جو بات نکلتی ہے، مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ میں اس کا ذکر کروں لیکن یہ یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ یہ قول ہرگز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نہیں ہو سکتا۔ ص۹۵ پر من لیس لہ شیخ فشیخہ الشیطان کے بارے میں حضرت مخدوم کا یہ فرمانا کہ یہ حدیث صحاح کی ہے۔ ان کے علم حدیث کے بارے میں بڑا خراب تاثر پیدا کرتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید حضرت مخدوم نے یہ بات نہیں کہی ہوگی۔

ص۱۶۸ "کما قال النبی من خالف سنتی فھو کافر" معلوم نہیں یہ حدیث کس کتاب حدیث میں ہے۔

ص۱۷۰ "جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شریعت میرے اقوال ہیں، طریقت میرے افعال ہیں اور حقیقت میرے احوال ہیں" نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس قول کا انتساب قطعاً غلط ہے۔ ص۹۵ پر تحصیل صرف ونحو کے بارے میں جس حدیث کو صحاح کی حدیث کہا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

مثلاً یہ تو قرآن کی ایک آیت کا حوالہ بھی غلط ہے۔ واو یلعن بعضکم علی بعض قرآن کا کوئی ٹکڑا نہیں ہے۔

بعض فقہی مسائل سے بھی کھٹک پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر "نماز عید کے بعد مصلی میں حضرت مخدوم کا چار رکعت مزید ادا کرنا۔ (ص۱۵۹) سنت کے خلاف ہے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز عیدین کے بعد عیدگاہ میں نفل ادا نہیں فرماتے تھے۔ حضرت مخدوم کے ملفوظات میں ایک ملفوظ یہ ہے۔ "اولیائے کامل کے ہر ذرہ میں خوشبو آتی ہے اور اگر کامل نہیں ہے تو بھی بدبو نہیں آتی ہے۔ فاضل مؤلف اگر یہ ملفوظ نقل نہ کرتے تو بہت اچھا ہوتا۔ اسی طرح کی چیزیں لوگوں کو غلوئے عقیدت میں مبتلا کرتی ہیں۔ اس ارشاد کے انتخاب پر حیرت ہوئی۔ بزرگوں کے کلام میں اخلاص عبادت کے لیے آخرت اور جنت سے صرف نظر کرنے کی جو تعلیم ملتی ہے وہ کتاب وسنت سے بالکل ہٹی ہوئی ہے افسوس ہے کہ حضرت مخدوم کے یہاں بھی یہ تعلیم ملتی ہے۔ ص۱۷۱ پر ہے "جب تک سالک کا دل دنیاو عقبیٰ کی آلودگی بلکہ ماسوی اللہ سے پاک نہ ہوگا اس وقت تک اللہ کی قربت حاصل نہ ہوگی" عقبیٰ کے لیے آلودگی کا لفظ کس قدر کھٹکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر تصوف کی تعلیمات، کتاب وسنت سے الگ نہیں ہیں تو پھر یہ تعلیم کس آیت یا کس حدیث سے ثابت ہے؟

بعض جملے فاضل مؤلف سے بھی نامناسب نکل گئے ہیں۔ ص۲۶ پر لکھتے ہیں: "جب شیخ الاسلام نجم الدین صغری نے بد باطنی کا مظاہرہ کیا" بد باطنی کا لفظ یہاں بہت ہی نامناسب استعمال ہوا ہے۔ بہرحال جہاں تک فاضل مؤلف کی تحقیق اور محنت کا سوال ہے۔ کتاب بہت کامیاب ہے اور امید ہے کہ آئندہ اڈیشن اور کامیاب ہوگا۔ (ع۔ق)

اسلامی قانون کی تدوین مولانا امین احسن اصلاحی، صفحات ۱۶۸، قیمت قسم اول مجلد مع گرد پوش تین روپے۔ قسم دوم دو روپے۔ ناشر: مکتبۃ المنبر۔ لائل پور مغربی پاکستان

جاذب نظر کتابت وطباعت سے آراستہ۔ یہ کتاب جناب مولانا امین احسن اصلاحی کے چند لکچروں کا مجموعہ ہے جو موصوف نے پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں اور کالجوں میں دیے تھے۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے ایک ذکاوت و وقاد ذہن علوم وفنون کی تہہ میں اتر جانے والی نظر، کتاب وسنت کا گہرا علم اور موثر اسلوب نگارش

عطا فرمایا ہے۔ آپ کی زبان و قلم میں موجودہ علوم و فنون سے مسلح نوجوانوں اور اہل علم کو اسلام پر مطمئن کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ آپ نے اسلامی قانون پر جو خطبے دیے ہیں ان کے اہل مخاطب کالجوں کے اساتذہ اور طلبہ ہیں اس لیے ان کے ذہن و صلاحیت کو سامنے رکھ کر علمی اصطلاحات سے بچتے ہوئے صاف سادہ اور واضح انداز میں اسلامی قانون کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، شبہات دور کیے ہیں اور اعتراضات کا ازالہ کیا ہے اور اطمینان کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ قانون کا فہم اور اس سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لیے یہ مجموعہ بہت مفید ہے۔ حدیث کی حجیت پر جو اعتراض کیا جاتا ہے اور اسلامی قانون کو فرسودہ کہہ کر اس کو نظر انداز کرنے کی جو روش اختیار کی جاتی ہے مولانا نے اس کے بارے میں بھی تشفی بخش گفتگو کی ہے۔

اس مجموعے کی دو باتوں سے تبصرہ نگار کا ذہن مطمئن نہیں ہو سکا۔ ایک یہ کہ مولانا نے اجماع کو اجتہاد کی اعلیٰ قسم قرار دیا ہے۔ یہ بات علمی طور پر سمجھ میں نہیں آتی اس لیے کہ اجماع، کسی شرعی حکم پر وقت کے تمام علماء اور اہل حل و عقد کے اتفاق کو کہتے ہیں اور خود اس اتفاق کے لیے کسی دلیل شرعی کی موجودگی ضروری ہے اور کبھی یہ دلیل کوئی ایسی واضح نص ہوتی ہے جس کا اجتہاد سے تعلق نہیں ہوتا۔ علماء اصول میں یہ اختلاف بھی موجود ہے کہ اجماع کسی قیاسی اور اجتہادی دلیل پر ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اجماع اجتہاد کی قسم ہوتا تو پھر یہ اختلاف پیدا نہ ہوتا۔ کتاب و سنت کے بعد اجتہاد کو تیسرا ماخذ قرار دینے کے لیے مولانا نے حدیث معاذؓ سے جو استدلال کیا ہے وہ بھی اس لیے صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اجماع کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا وہ حجتِ شرعی حضور کے بعد قرار پایا ہے نہ کہ حضورؐ کے وقت میں۔ حدیث معاذؓ سے استدلال کرکے اجماع کے تیسرے ماخذ ہونے کی نفی صحیح نہیں ہے۔

دوسری بات جس نے کھٹک پیدا کی وہ حدیث اور سنت کا وہ فرق ہے جو ص۶۲ پر بیان کیا گیا ہے۔ اس فرق کو خود مولانا نے آگے چل کر نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ علمائے اصول دوسرے ماخذ کے لیے سنت کا لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن اس سے ان کی مراد احادیثِ رسول ہی ہوتی ہیں اس لیے دوسرا ماخذ ہونے کی جہت سے سنت اور احادیث میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مکتبۃ المنبر نے یہ کتاب شائع کرکے ایک دینی خدمت انجام دی ہے اور وہ اس کے لیے ہمارے شکریے کا مستحق ہے۔ (ع۔ ق)

پاندان والی خالہ (حصہ دوم) | تخلص بھوپالی۔ صفحات ۲۰۰، کاغذ کتابت طباعت عمدہ۔ مجلد مع گرد پوش قیمت دو روپے بارہ آنے۔ ناشر:- پنج بھوپال پبلیکیشنز جہانگیر آباد۔ بھوپال۔

اس کتاب کے حصہ اول پر زندگی میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ حصۂ دوم میں بھی وہ تمام خوبیاں ہیں جو حصہ اول میں ہیں۔ "افسانہ لکھ رہا ہوں" کے عنوان سے ابتدا میں جو صفحات لکھے ہیں وہ بھی قابل مطالعہ ہیں۔ ذیل کی سطروں میں انھوں نے جو بات لکھی ہے وہ تجربہ و مشاہدے کے عین مطابق ہے۔

"پرانی بات ہے کہ جس ملک کے حکمراں یا جس ریاست کے رئیس کا جو مزاج اور کردار رہا عوام نے اس کے اثرات کو گلے گلے تک قبول کیا ہے۔ انگریزوں کو ہندو، مسلمانوں کے درمیان منافرت پھیلانے کا شوق ہوا تو پورا ملک اسی شوق میں مبتلا ہو گیا۔ کسی ریاست کا والی موسیقی نواز ہوا تو گھر گھر طبلے سارنگی کھڑکنے لگے۔ کوئی حکمراں عیاشی کی طرف مائل ہو کر اپنی عاقبت خراب کرنے پر بضد ہوا تو پوری آبادی جہنم کے رستوں پر خیمہ زن ہو گئی۔ اگر راجہ کو بہلوانی کا شوق ہوا تو جس کو دیکھو ڈنڈ پیلنے لگا۔ اگر رئیس وقت کو کتے پالنے کا شوق چرّایا تو اس ریاست میں انسان کم، کتے زیادہ نظر آنے لگے۔ دور نہ جائیے۔ ابھی ہم آپ زندہ ہیں اشخاصی حکمرانوں کے ذوق و شوق کو ملاحظہ کیجیے اور پھر اس کے ملک گیر ردِ عمل پر نظر ڈالیے۔" (صفحہ ۵)

رشید احمد صدیقی کے سوا اب تک میں نے کسی مزاح نگار کے ادب کو سوقیت سے بالکلیہ پاک نہیں دیکھا۔ اس کتاب میں بعض ایسی چیزیں ملتی ہیں۔ (ع۔ ق)

اردو املا کا آسان طریقہ | عبد الغفار مدہولی صفحات ۴۶ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ قیمت ۲۵ پیسے ملنے کا پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

جناب عبد الغفار مدہولی، معلم استادوں کا مدرسہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے یہ کتاب اردو سکھانے کے لیے لکھی ہے وہ خود لکھتے ہیں:-

"دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں ان طلبار کے لیے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے، اردو سکھانے کی مشکلات پر قابو پانے کا طریقہ بتاؤں۔ مندرجہ بالا دونوں مضامین (اردو کا آسان طریقہ اور اردو رسم خط میں علامتیں) میں نے اسی مقصد سے لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ مزید امور کا اضافہ کر کے "آسان اردو سکھانے کا طریقہ" کے نام سے یہ کتاب شائع کی جا رہی ہے۔"

اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لیے کتاب لکھی گئی ہے اس کے لیے مفید ہے۔

اشارات کا بقیہ | حق پرستوں کے لیے یہ "خدمت" پہلے کفار و مشرکین انجام دیتے تھے اور اب یہ "خدمت" وہ لوگ زیادہ جرأت و بے خوفی کے ساتھ انجام دیتے ہیں جو انبیاء و اولیاء کے ہم نام ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد سے تاریخ کا رخ بدل دیا گیا ہے اور یہ تبدیلی قیامت تک کے لیے ہے۔

جماعت اسلامی کے رہنماؤں کی گرفتاری کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ مولانا مودودی کو تو سزائے موت بھی سنائی جا چکی ہے لیکن جماعت کو غیر قانونی قرار دینے کا "شرف" موجودہ حکومت کی قسمت میں تھا۔ حکومتیں جب کسی جماعت پر اس جرم میں ہاتھ ڈالنا چاہتی ہیں کہ وہ ان کی ہاں میں ہاں کیوں نہیں ملاتی تو ہاتھ ڈالنے کے لیے کچھ ایسے الزامات لگاتی اور کچھ ایسے جرائم کی فہرست مرتب کرتی ہیں جن پر الزامات و جرائم کا اطلاق ہو سکے۔ ان الزامات کا جھوٹا یا سچا ہونا بعد کی چیز ہے، لیکن حکومت پاکستان نے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی مدظلہ پر جو الزامات لگائے ہیں ان میں متعدد ایسے ہیں کہ ان پر شیر اور بکری کے بچے کی حکایت یاد آ جاتی ہے۔ الزامات کی سرکاری فہرست پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ یہ فہرست "لاٹھی اور بھینس" کے اصول کا بڑا مضحکہ خیز نمونہ ہے۔

جماعت پر پابندی عائد کر کے حکومت نے ریاست پاکستان کا جو نقصان کیا ہے اس کا احساس اس کو اس لیے نہیں ہوگا کہ وہ اقتدار کے نشے میں بدمست ہے اور اسی کو بچانے کے لیے اس نے یہ جابرانہ اقدام کیا ہے۔ پاکستان کے عوام و خواص نے اس اقدام کے خلاف جو ملک گیر احتجاج کیا ہے اس نے حکومت کی بے انصافی اور دھاندلی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اس نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جماعت اسلامی کا جرم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ حکومت کی آمریت کے لیے ایک ایسا چیلنج بن گئی تھی جس کا مقابلہ کرنے سے وہ عاجز آ چکی تھی۔ جماعت اسلامی کے بعض بدترین مخالفین تک نے وہاں کی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ جماعت پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ حکومت مقدمہ چلائے گی یا نہیں، یہ تو معلوم نہیں لیکن مولانا مودودی کی طرف سے رٹ دائر ہو چکا ہے۔

ہم آخر میں دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حکومت پاکستان کو ہدایت دے اور داعیان حق کو صبر و استقامت کی نعمت سے نوازے۔

۵ر فروری ۱۹۶۴ء

اعلان ملکیت ماہ نامہ "زندگی" رام پور

و دیگر تفصیلات فارم IV رول نمبر ۸

(۱) مقام اشاعت	دفتر زندگی رام پور۔ یوپی
(۲) مدت اشاعت	ماہانہ
(۳ و ۴) طابع و ناشر	احمد حسن وطنیت ہندستان پتہ بازار کلاں رام پور یوپی
(۵) ایڈیٹر	سید احمد عروج قادری وطنیت: ہندستان پتہ گھیر سیف الدین خاں۔ رام پور۔ یوپی
(۶) مالک کا نام و پتہ	جماعت اسلامی ہند رام پور۔ یوپی

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے بہترین علم و یقین کی حد تک صحیح ہیں۔

احمد حسن

ماہنامہ

زندگی
رامپور

جلد:۔ ۳۲
شمارہ:۔ ۴

ذیقعدہ ۸۳ھ
اپریل ۶۴ء

مدیر:۔ سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسالِ زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رام پور۔ یوپی

● زرِ سالانہ:۔ ۵ر ششماہی:۔ تین روپیہ۔ فی پرچہ:۔ پچاس نئے پیسے

● ممالکِ غیر سے:۔ دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں

منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱۱/c شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک:۔ جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر:۔ سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر:۔ احمد حسن۔ مطبع:۔ دہلی پرنٹنگ پریس [illegible]

مقام اشاعت:۔ دفتر زندگی رام پور (یوپی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

شری مرارجی ڈیسائی نے پٹیل میموریل لکچر کے سلسلے کی پہلی ریڈیائی تقریر میں فرمایا۔

ہندستان کے اتحاد کے نقطہ نظر سے دوسرا اہم عہد حکومت اکبر کا ہے جس کی سلطنت میں سارا شمالی ہند اور جنوب کا کچھ حصہ تھا اس نے ملک کے طول و عرض میں نظم و نسق، انصاف اور مالیات کا یکساں نظام رائج کیا اور اس وقت کی بیرونی زبانوں اور مقامی زبان کے ملاپ سے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ اکبر کے دور حکومت کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ پہلی مرتبہ ایک ایسے خاندان نے جسے ہندستانی اجنبی سرزمین میں برسر حکومت آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا غیر مانوس ماحول میں مستقل گھر اور مسکن بنانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں نہ صرف نئے حالات سے تطابق پیدا کیا بلکہ مقامی فن، مقامی ثقافت، مقامی مذاہب اور مقامی حکمرانوں کو بھی فروغ بخشا —

اگر اکبر نے دو طرفہ ازدواجی تعلقات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا تو شاید ہندستان کے اتحاد کا عمل زیادہ سرعت سے پورا ہوتا۔

اکبر کے جانشینوں نے، خاص طور پر اورنگ زیب نے بدنصیبی سے نہ صرف اس تاریخی ارتقا کو مہر بند کر دیا بلکہ ثقافت، نفاست، اقتصادی فلاح اور مذہبی رواداری کی ان روایتوں کو بھی ملیامیٹ کر دیا جو ہندستانی زندگی کا انداز بن گئی تھیں اور بعد میں قومی اقدار کی صورت میں نشو و نما پا سکتی تھیں۔

ضمیمہ ہفتہ وار قومی آواز، لکھنؤ ۲۲ر دسمبر ۶۳ء

مرارجی ڈیسائی نے اپنی تقریر میں اکبر اور اورنگ زیب کے بارے میں اس بحث کو پھر تازہ کر دیا جو گزشتہ کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ اگرچہ عالمگیر پر مذہبی تعصب اور عدم رواداری کے الزام کی تردید خود برادران وطن

کے محقق اور انصاف پسند اہل علم کر چکے ہیں، لیکن اکثریت آج بھی اسے ظالم، ہند کش اور انتہائی متعصب دشمن بادشاہ کے روپ میں پیش کرتی ہے۔ ملکی اتحاد اور قومی یک جہتی کے لیے بھارت کے نیتاؤں نے ہمیشہ اکبر کو پیش کیا ہے۔ مرارجی ڈیسائی اس میں منفرد نہیں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اب ہندستان آزاد ہو چکا ہے اور طاقت اکثریت کے ہاتھوں میں منتقل ہو چکی ہے اس لیے انھوں نے کھل کر اپنی اس تمنا کا اظہار کر دیا ہے کہ :۔

اگر اکبر نے دو طرفہ ازدواجی تعلقات کا سلسلہ شروع کر دیا ہوتا تو شاید ہندستان کے اتحاد کا عمل زیادہ سرعت سے پورا ہوتا۔

میں یہاں کسی لمبی تاریخی بحث میں الجھنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ میں اکبر اور عالمگیر کی دو قلمی تصویریں قارئین زندگی کے سامنے رکھ دوں۔ یہ تصویریں خود بول اٹھیں گی کہ مرارجی ڈیسائی اور بھارت کے دوسرے نیتا اکبر کو کیوں پسند کرتے اور اورنگ زیب کو کیوں ناپسند کرتے ہیں۔

ایک سیدھے سادے مذہبی بادشاہ اکبر کو بگاڑنے میں کن عوامل نے حصہ لیا، یہ اس وقت میرے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔ اکبر جب اچھی طرح بگڑ گیا تو اس کی حالت یہ ہو گئی۔

(۱) دربار اکبری میں ملت اسلامی کا سارا سرمایہ حادث اور بد عقلی کا مجموعہ ٹھیرایا گیا اور اس کے بنانے والے (العیاذ باللہ) عرب کے وہ چند مفلس بدو قرار پائے جن میں سب کے سب محض مفسد اور رہزن تھے (!)

ارکان دین کے ہر رکن اور اسلامی عقائد کے ہر عقیدے کے متعلق خواہ ان کا تعلق اصول سے ہو یا فروع سے (مثلاً نبوت، مسئلہ علم کلام، دیدار الٰہی، انسان کا مکلف ہونا، عالم کی تکوین، حشر و نشر وغیرہ) کے متعلق تمسخر اور ٹھٹھے کے ساتھ، طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کیے جانے لگے۔

خود اکبر کا حال یہ تھا کہ عام مخلوق کو خلق قرآن کے مسئلے کی تبلیغ کرتا اور وحی کے محال ہونے پر پھر اوظلے سے کام لیتا اور نبوت و امامت کے مسئلے میں لوگوں کا امتحان لیتا، جن، فرشتے، اس طرح تمام غیبی

لہ ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی منتخب التواریخ میں تفصیل سے اکبر اور دربار اکبری کے حالات لکھے ہیں اور ان حالات کے بہت سارے اقتباسات مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم و مغفور نے اپنے ایک طویل مقالے میں جمع کیے تھے۔ [illegible] کے مقالے سے اخذ کیے ہیں۔ (مقالہ نگار)

ہستیوں یا نیز مجبورستا ہے... کا کھلے لفظوں میں انکار کرتا، قرآن کے تواتر، خدا کے متکلم ہونے اور بدن کے فنا ہونے کے بعد ثواب و عذاب کے لیے روح کے باقی رہنے کو محال سمجھتا تھا۔ البتہ تناسخ کے طور پر ثواب و عذاب کا قائل تھا۔

اوائل ہجرت میں قافلۂ قریش کو لوٹنے، چودہ عورتوں سے نکاح کرنے اور بیویوں کی رضامندی کے لیے شہد کو حرام کر لینے کے واقعات سے نبوت پر اعتراض کرتا تھا۔

اکبر کی بدبختی آخر اس حد پر جا کر ختم ہوئی کہ احمد و محمد و مصطفیٰ وغیرہ نام بیرونی کافروں کی خاطر سے اور اندرونی عورتوں کی وجہ سے اس پر گراں گزرنے لگے آخر کچھ دنوں کے بعد اپنے چند خاص لوگوں کے نام اس نے بدل بھی ڈالے۔ مثلاً یار محمد اور محمد خاں کو وہ رحمت ہی کے نام سے پکارتا بھی تھا اور لکھنے کے وقت بھی ان کو اسی نام سے موسوم کرتا۔

عوام و خواص پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ یہ تھے۔

علماء سوء اپنی تصنیفوں میں خطبہ لکھنے سے بچنے لگے، صرف توحید اور بادشاہی القاب کے ذکر پر قناعت کرتے تھے، ان کی مجال نہ تھی کہ بے ایمان جھٹلانے والوں کے علی الرغم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک، زبان و قلم پر لاتے۔

چند ہندو اور چند "ہندو مزاج" مسلمان آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر صراحۃً اعتراضات کرتے تھے۔ اور ان کو کوئی روکنے والا، ٹوکنے والا نہ تھا اور جب اکبر کے دربار میں عیسائی مشنری کا وفد پہنچا تو ان ملعونوں نے دجال کے صفات بیان کر کے (استغفر اللہ) ان کو خیر النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈھالا۔ اللہ اکبر! اتنی بدبختانہ بے ہودگی کو سن کر بھی اکبر کی پیشانی پر بل تو کیا پڑتا وہ نہایت خندہ جبینی سے ان کا استقبال کرتا ہے اور اپنے شہزادہ مراد کو حکم دیتا ہے کہ "چند اسباق ان پادریوں سے پڑھ لو۔"

یہ تو تخریب و نفی تھی اب تعمیر و اثبات کا حال سنیے :۔

بادشاہ نے یہ خیال پکا یا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدت عمر کل ایک ہزار سال تھی جو پوری ہو گئی۔ بادشاہ کے دل میں اس کے بعد ان منصوبوں کے اظہار و اعلان میں اب کوئی رکاوٹ باقی رہی جو اپنے دل میں انھوں نے گانٹھا تھا۔ اور ایسے علماء جن کا کچھ رعب تھا ان سے بھی

بساط الٹی ہو چکی تھی۔ پھر کیا تھا اس کے بعد تو بادشاہ خوب کھیل کھیلے اور اسلامی ارکان واحکام کی بربادی اور سنت نے اپنے ساختہ پرداختہ قوانین کی ترویج میں مشغول ہوئے جس کے بعد عقائد کی بربادی کا بازار گرم ہوا۔

ملک کی اکثریت پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے ان میں کا ایک اثر یہ ہے

ہندوستان کے قدیم دانشمندوں کے نام سے (اس زمانے میں) برہمن ہندی اشعار نقل کر کرکے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے تھے جن کا مضمون یہ ہوتا تھا کہ جہان کو فتح کرنے والا ایک بادشاہ ہندوستان میں پیدا ہوگا جو برہمنوں کی بڑی عزت کرے گا اور گائے کی حفاظت کرے گا اور عالم کی نگرانی انصاف کے ساتھ کرے گا (ملا صاحب لکھتے ہیں) پرانے کاغذات پر ان خرافات کو لکھ کر بادشاہ کو دکھایا کرتے تھے اور بادشاہ ان کو صحیح سمجھتا تھا

چنانچہ برہمنوں کی عزت افزائی کا ایک نمونہ یہ تھا۔

ایک زمانہ تک دیوی برہمن جو مہا بھارت کی کتھا کہنے والا تھا اس کو چارپائی پر اوپر کھینچ لیا جاتا جو اکبر کے قصر کے پاس تھا جس کو اس نے خواب گاہ میں بنایا تھا۔ اور اس سے ہندوستانی قصے اور اس کے اسرار، نیز بتوں کے، آفتاب کے اور آگ کے پوجنے کے طریقے، ستاروں کی تعظیم کے آداب کافروں کے جو بڑے لوگ گزرے ہیں۔ مثلاً برہما، مہادیو، بشن، کشن، مہامائی وغیرہ کے احترام کی صورتیں سنتا اور پھر ان کی جانب مائل ہوتا، ان کو قبول کرتا۔"

عقاید کے بعد اب اکبری اعمال کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے۔

شیخ ابوالفضل کی نگرانی میں حکم دیا گیا کہ ہمیشہ رات دن شاہی محل میں آگ، روشن رکھنے کا انتظام کیا جائے۔ بادشاہ ہی نہیں اس کے مقربین بھی شمع اور چراغ کے روشن ہونے کے وقت قیام کرنا اپنے لیے فرض قرار دیے ہوئے تھے۔ آفتاب کی عبادت دن میں چار وقت یعنی صبح و شام، دوپہر آدھی رات میں لازمی طور پر کرتے تھے اور ایک ہزار ایک آفتاب کے ہندی کے ناموں کو اپنا وظیفہ بنایا تھا، وہ قشقہ بھی لگاتے تھے۔ سود اور جوا حلال کر دیا گیا تھا اسی پر دوسری حرام چیزوں کو قیاس کر لینا چاہیے ایک جوا گھر خاص دربار میں بنایا گیا تھا اور جواریوں کو شاہی خزانے سے سودی قرض دیا جاتا تھا۔ اعلان دیا گیا کہ شراب بدن کی اصلاح کے لیے طبی طور پر استعمال کی جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کے

ہے کوئی فتنہ وفساد نہ پیدا ہو..... ایک دکان شراب فروشی کی بھی دربار ہی کے پاس ایک دربان عورت کے اہتمام میں قائم تھی جو شراب فروشوں کی نسل سے تھی اور اس کے نرخ بھی خود ہی مقرر کیے تھے۔

"دین الٰہی" میں داڑھی مونڈنے پر بھی بہت زور دیا جاتا تھا۔ غسل جنابت کا مسئلہ منسوخ کر دیا گیا اس لیے کہ منی نیک لوگوں کی پیدائش کا تخم ہے بلکہ مناسب یہ ہے کہ پہلے غسل کرے۔ اس کے بعد ہم بستر ہو۔ پردے کے بارے میں حکم ہوا کہ جوان عورتیں جو کوچہ و بازار میں نکلتی ہیں ان کو چاہیے کہ چہرے کو کھلا رکھیں یا برقع ہو تو چہرے کو کھول دیا کریں۔ نکاح کے بارے میں ایک قانون یہ تھا کہ "بیشتر از یک زن نکاح نہ کنند" زنا کی باضابطہ تنظیم کی گئی اور شہر سے باہر اس کے لیے ایک بستی بسائی گئی۔

اعمال اکبری کے بارے میں اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ "نمونہ از خروارے" کا مصداق ہے۔

اکبر کی جس بے تعصبی اور مذہبی رواداری کا ڈھول تیس چالیس سال سے بجایا جا رہا ہے اس کا پول دیکھتے چلیے۔

نماز و روزہ اور وہ ساری چیزیں جن کا نبوت سے تعلق ہے ان کا نام "تقلیدات" رکھا گیا یعنی سب بدعقلی کی باتیں ٹھہرائی گئیں اور مذہب کی بنیاد "عقل" پر رکھی گئی نہ نقل پر —— اسی پر بس نہیں بلکہ دیوان خانہ میں کسی کی مجال نہ تھی کہ نماز ادا کر سکے۔ نماز روزہ اور حج ساقط کر دیے گئے —— دینی شعائر کی ہجو میں اشعار بنائے گئے اور کوچہ و بازار میں وہی گائے جاتے تھے۔

دربار اکبری میں "شرف قبول" حاصل کرنے کا ذریعہ یہ تھا۔

ملا مبارک کے ایک بیٹے نے جو ابوالفضل کا شاگرد تھا "اسلامی عبادات کے متعلق اعتراض اور مسخرگی کے پیرایے میں چند رسالے تصنیف کیے (شاہی جناب میں) اس کے ان رسالوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور اس کی سرپرستی کا ذریعہ یہی رسالے بن گئے۔

اور جو لوگ شاہی اعتقاد و عمل کے موافق نہ ہوتے ان کا حال یہ ہوتا۔

بادشاہ جس کسی کو اپنے اعتقاد کے موافق نہ پاتے تھے وہ ان کے نزدیک گردن زدنی اور ...

ہوا شمار ہوتا تھا اور اس کا نام تقیہ رکھ دیا جاتا تھا (اور اب ایسے لوگوں کو اس زمانے میں ملا کہا جاتا ہے)

اس سے آگے بڑھ کر بات یہاں تک پہنچی کہ:-

عربی پڑھنا، عربی جاننا، عیب قرار دیا گیا اور فقہ و تفسیر و حدیث کے پڑھنے والے مردود و مطعون ٹھیرائے گئے۔

حاصل یہ نکلا کہ

اسلام کی ضد اور اس کے توڑ پر ہر وہ حکم جو کسی دوسرے مذہب کا ہوتا اس کو بادشاہ نص قاطع اور قطعی دلیل خیال کرتے تھے بخلاف اسلامی ملت کے، اس کی ساری باتیں مہمل، نامعقول، نوپیدا اور عرب کے مفلسوں کی گھڑی ہوئی خیال کی جاتیں۔

آخری طریقہ کار اور معیار یہ قرار پایا کہ:-

مسلمانوں کے سوا جس شخص کی جو بات پسند آجاتی تھی اس کا انتخاب کر لیا جاتا تھا اور جو باتیں ناپسندیدہ اور بادشاہ کی خواہش کے خلاف ہوتی تھیں ان سے احتراز اور پرہیز کو ضروری خیال کرتے

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکبر کی زندگی میں:-

پانچ چھ سال کے بعد اسلام کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا اور بات بالکل الٹ گئی

اورنگ زیب عالمگیر کی زندگی کا ہلکا سا خاکہ یہ ہے:-

وہ ایک متقی و پرہیزگار، عالم دین بادشاہ تھا، رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل کرتا، جہاں کہیں بھی ہوتا پانچوں وقت کی نمازیں، اول وقت میں، جماعت کے ساتھ ادا کرتا اور سنن و نوافل بھی پابندی سے ادا کرتا نماز جمعہ، جامع مسجد میں ادا کرتا، اگر کسی کام سے شہر سے باہر ہوتا تو جمعرات کو شہر واپس آجاتا اور جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا کر کے پھر جہاں چاہتا جاتا۔ سخت گرمیوں کے موسم میں بھی رمضان کے روزے رکھتا، تراویح پڑھتا اور آخری عشرے میں مسجد کے اندر اعتکاف کرتا۔ ہر ہفتے میں پیر، جمعرات اور جمعہ کو روزہ رکھتا، ان کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جن روزوں کی فضیلت مروی ہے ان ایام کے روزے بھی رکھتا۔ ایام شہزادگی میں بھی دین پر استقامت، نماز کی پابندی، خدا پر بھروسا و عبادت سے

بعد اس منصب پر فائز تھا جس پر گنے چنے لوگ فائز ہوا کرتے ہیں۔ مولانا شبلیؒ نے مآثر الامرا کے حوالے سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ "جب وہ شہزادگی کے زمانے میں بلخ کی مہم پر گیا تھا اور عبدالعزیز خاں سے معرکہ ہو رہا تھا تو عین حالت جنگ میں نماز ظہر کا وقت آگیا، دشمن کی فوجیں چاروں طرف سے تیر برسا رہی تھیں، یہ استقلال کا دیوتا گھوڑے سے بکمال متانت اترا، نماز کی صف قائم کی، سکون اور اطمینان کے ساتھ فرائض و نوافل ادا کیے۔ عبدالعزیز خاں یہ حیرت انگیز سماں دیکھ کر لڑائی سے ہٹ گیا کہ ایسے شخص سے لڑنا تقدیر سے لڑنا ہے۔"

ایام شہزادگی سے آخر عمر تک وہ اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا کرتا رہا۔ بادشاہت سے پہلے حج کا ارادہ کیا تو شاہجہاں نے اجازت نہ دی اور بادشاہت کے بعد اس کو موقع نہ مل سکا لیکن وہ دوسرے لوگوں کو حج و زیارت کے لیے بھیجا کرتا اور ان پر کثیر رقم صرف کرتا، سال دو سال کے بعد حرمین شریفین کے اہل حاجت کے لیے بھی بڑی بڑی رقمیں بھیجتا تھا۔ ہمیشہ باوضو رہتا تھا۔ دن اور رات کے تمام اوقات کی وہ دعائیں جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منقول ہیں پڑھا کرتا تھا، سال کی متبرک راتوں کو زندہ رکھتا تھا، نمازیں پڑھتا، صدقہ کرتا اور مسجد میں علماء و مشائخ کی صحبت میں رات گزارتا۔ ہر برائی سے احتراز کرتا، نہ کبھی اس نے شراب پی اور نہ کسی ایسی عورت کے پاس گیا جو اس کے لیے حلال نہ ہو۔ نہ غیر شرعی لباس پہنتا اور نہ چاندی سونے کے ظروف استعمال کرتا۔ اس نے اپنے حکام و امراء کو بھی غیر شرعی لباس پہننے کی ممانعت کر دی تھی۔ اس کا حکم تھا کہ کوئی حاکم اس کے سامنے جھوٹ نہ بولے اور نہ کسی کی غیبت کرے اس کے تمام اوقات تقسیم شدہ تھے۔ عبادت، مذاکرۂ علمی۔ مصالح فوج۔ مظلومین کی داد رسی۔ مطالعۂ کتب، حکومتی اخبار اور رپورٹوں کا مطالعہ۔ ان اوقات کی وہ سختی سے پابندی کرتا تھا اور ایک کو دوسرے کے ساتھ خلط ملط نہیں کرتا تھا۔ اس کے دینی جذبے کا حال یہ تھا کہ اس نے تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد قرآن مجید حفظ کیا۔ اسے حدیث کی اچھی معرفت حاصل تھی۔ بادشاہ بننے کے بعد اس نے حدیث میں "الاربعین" مرتب کی۔ اس کا فارسی میں ترجمہ کیا اور نفیس حاشیے لکھے۔ فقہ میں مہارت تامہ حاصل تھی اور جزئیات فقہ کے استحضار میں ضرب المثل تھا۔ اسی طرح خطاطی اور شجاعت و بہادری میں بھی اس کی مثالیں کم تھیں۔ اس کی بہادری نے مغل حکومت کو اتنی وسعت دے دی تھی جو اکبر کو بھی نصیب نہ ہو سکی اس کے باوجود وہ اپنی ضروریات کے لیے بیت المال سے کچھ نہ لیتا تھا بلکہ قرآن لکھ کر اور ٹوپیاں بُن کر اپنی روزی خود کماتا تھا

خاصانِ خدا کی نماز

مولانا مجیب اللہ ندوی

دنیا کا کوئی مذہب اور مسلک ایسا نہیں ہے جس میں خدا کا تصور موجود نہ ہو اور اس میں کسی نہ کسی صورت میں عبادت و نماز اور دعا و مناجات کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ اس کی صورت و ہیئت اور طریقہ و وقت میں اختلاف رہا ہے مگر اس ہیئت و صورت اور طریقہ و وقت کے اختلاف کے باوجود انسان نے ہمیشہ اپنی پیشانی خالق کائنات کے سامنے جھکائی ہے اور ہر پریشانی و مصیبت میں حاجت براری کے لیے اسی کی طرف دستِ احتیاج پھیلایا ہے یہ اور بات ہے کہ اپنی نادانی کی وجہ سے اس نے اپنی دعا و عبادت میں شرک کی آمیزش بھی کرلی ہے مگر اس کا ذہن کبھی بھی ایک بالاتر ہستی کے تصور اور اس کی عبادت سے خالی نہیں رہا ہے چنانچہ قرآن پاک میں تخلیق انسانی اور خلافت ارضی کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اس تصور دعا و عبادت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے جنت میں جو چوک ہوگئی تھی اس پر ان کو شدید احساس ندامت ہوا اور ان کے دل میں توبہ و انابت کا ایک مضطربانہ داعیہ پیدا ہوا خدائے قدوس کو ان کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ خود دربار قدس کی طرف سے ان کو توبہ و انابت کے الفاظ سکھائے گئے۔ فتلقیٰ ادم من ربہ کلمات وہ الفاظ یہ تھے۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو ساڑھے نو برس تک یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ کی دعوت دیتے رہے لیکن جب قوم نے ان کی دعوت پر کوئی توجہ نہیں کی اور ان کو مسلسل ٹھکراتی رہی بلکہ اس نے ان کو ہلاک کر ڈالنے کی کوشش بھی کی تو عاجز آکر انھوں نے اپنے پروردگار کو پکارا۔ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ (اے پروردگار اب زمین پر کسی کافر کے گھر کو بھی نہ چھوڑ

اسی طرح قرآن نے مجمل طور پر تمام انبیاء کے بارے میں یہ کہا۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا اس کی طرف یہ وحی کی کہ میری ہی عبادت کرو۔)

خاص طور پر سلسلہ ابراہیمی کے تمام ہی پیغمبروں کے ذکر میں قرآن نے ان کی دوسری تعلیمات کے ساتھ نہ صرف ان کے طریقۂ عبادت و نماز اور دعا و سوال کا ذکر کیا ہے بلکہ ان کی دعوت نماز کا ذکر بھی کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پروردگار سے اپنے اور اپنی ذریت کے لیے ہمیشہ یہ دعا فرماتے تھے۔ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ (اے پروردگار! مجھے اور میری نسل کو نماز قائم کرنے والا بنا اور اے ہمارے پروردگار ہماری دعا قبول فرما!)

جس وقت وہ وادی غیر ذی زرع میں خانۂ خدا کی تجدید کرتے ہیں اور لخت جگر کو اس ویرانے میں چھوڑ کر پھر شام روانہ ہوتے ہیں تو آپ کی زبان سعادت پر یہ دعا ہوتی ہے۔ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (اے پروردگار یہ یہاں رہ کر نماز قائم کریں) پھر آگے فرماتے ہیں اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ (بے شک میرا رب میری دعا سننے والا ہے۔

حضرت اسمٰعیل جو تسلیم و رضا کے پیکر تھے باپ کی اس دعا کا واقعی مظہر بن گئے۔ وہ نہ صرف حضرت ابراہیم کی دعا رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کا مصداق تھے بلکہ ان کے بارے میں قرآن میں یہ ہے کہ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ (وہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیتے تھے)

اسی طرح حضرت شعیبؑ حضرت لوطؑ اور حضرت یعقوبؑ اور اُن کی نسل کا ذکر کر کے یہ فرمایا گیا ہے۔ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ (ہم نے ان کی طرف بھلے کام کرنے اور نماز قائم کرنے کی وحی کی۔)

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو جو قیمتی نصیحتیں کیں ان میں ایک نصیحت یہ بھی تھی۔ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ (اے پیارے بیٹے نماز قائم کرنا)

حضرت زکریا کے بارے میں ہے وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ (وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے)

غرض یہ کہ ایمان و یقین کے بعد نماز و دعا ہی وہ سب سے مضبوط سر رشتہ ہے جس کے ذریعے ایک بندے کا اپنے آقا سے اپنی بندگی کا تعلق باقی و قائم رکھتا ہے اس لیے اس پر توحید کے بعد سب سے

زیادہ زور دیا گیا ہے جب تک اگلی امتوں نے اس رشتے کو حقیقی طور پر قائم رکھا ان کا تعلق بھی اپنے پروردگار سے قائم رہا اور وہ اس کی نوازشوں اور رحمتوں کے سزاوار ٹھہرے لیکن جب انھوں نے اس رشتے کو توڑ ڈالا یا کمزور کر دیا تو اللہ تعالےٰ کی نعمتوں اور رحمتوں سے دور ہوتے گئے۔ چنانچہ قرآن نے متعدد جگہ اس صورت حال کا ذکر کیا ہے، ایک جگہ ہے :۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ ۔

ان کے بعد ان کے ناخلف وارثوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور شہوات کے پیچھے پڑ گئے۔

"اضاعت صلوٰۃ" کے ساتھ "اتباع شہوات" کے ذکر میں بڑی معنویت ہے یعنی نماز کے ذریعے بندہ خدا سے قریب ہو جاتا ہے لیکن جب یہ رشتہ آدمی کاٹ لیتا ہے تو اتنا ہی نہیں کہ وہ خدا سے دور ہو جاتا ہے بلکہ وہ اپنی باگ ڈور شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جو اسے خواہشات کی خوشنما وادیوں میں لیے پھرتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا تعلق خدا سے بالکل منقطع ہو جاتا ہے لیکن ان میں جو لوگ اب بھی خدا کے سامنے سجدہ ریز ہونے والے رہ جاتے ہیں خدا تعالےٰ ان کو فلاح و صلاح کی خوش خبری دیتا ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے :۔

لَيْسُوا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَتْلُوْنَ اٰيَاتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ٥ .... اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ٥ (آل عمران)

اہل کتاب میں سب لوگ برابر نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک گروہ حق پر قائم ہے وہ رات میں خدا کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور نمازیں پڑھتا رہتا ہے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں بھلائی میں آگے رہتے ہیں۔ یہی لوگ صالح ہیں۔

اگر ان آیات کو جمع کر لیا جائے تو اس سے یہ بھی پتہ چلے کہ ان کی نمازوں میں وہ تمام ارکان موجود تھے جو ہماری نمازوں میں ہیں یعنی قیام، قرأت، رکوع، سجود وغیرہ۔ اسی کے ساتھ ان میں ان باطنی کیفیات کا ذکر بھی آپ کو ملے گا جو نماز کی روح اور غذا ہیں۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جس طرح انبیائے کرام کی دوسری تعلیمات کی تکمیل ہوئی اسی طرح اس فضائے روحانی اور قربت ربانی کی تکمیل بھی ہوئی پھر یہ امتیاز بھی آپ ہی کو حاصل ہے کہ

خدا نے جس نماز کا حکم دیا ہے اور آپ نے امت کو جس نماز کی تلقین کی ہے اس کے نہ صرف اوقات، ظاہری ارکان و شرائط و آداب محفوظ ہیں بلکہ اس نماز کی معنویت و کیفیات تک کو امت نے محفوظ کر لیا ہے۔

نماز کیا ہے

نماز بندے کو اپنے آقا سے قریب کر دینے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ یہ دعا و مناجات اور اپنے آقا سے سرگوشی کا محور اور وسیلہ ہے۔

یہ پروردگار عالم کے سامنے اپنے جذبۂ امتنان کا اظہار و اعلان ہے یہ اپنی عبودیت و تذلل کا اعتراف اور اپنے آقا کی کبریائی و یکتائی کا اقرار ہے۔ نماز روح کی غذا، قلبِ مضطر کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ خود مقصد بھی ہے اور مقصد کا ذریعہ بھی۔ غور کیجیے کہ جو نماز بندے کو خدا سے قریب کر دیتی ہو جو اس کی مرضی و خوشنودی پانے کا ذریعہ ہو، جس کے سبب آدمی خدا سے سرگوشی کے قابل ہو جاتا ہو جو انسان کی روح کو سکون اور قلبِ مضطر کو تسکین دیتی ہو جس کے ترک و قیام پر اللہ تعالیٰ عزت و ذلت کا فیصلہ صادر فرماتا ہو اس نماز کے لیے کتنے اہتمام، ذوق و شوق اور شغف و انہماک کی ضرورت ہے! افسوس ہے کہ امت کا ایک بہت بڑا طبقہ اس فرض سے متساہل، بلکہ بالکل غافل ہے اور جو لوگ اس فرض کو ادا کرتے ہیں ان کی نمازیں ان اوصاف سے خالی ہوتی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، نہ ہماری نمازوں میں خشوع و خضوع کی کیفیت ہوتی ہے اور نہ ان میں حضورِ قلب کا سماں ہوتا ہے نہ اس سے قلب و روح کو لذت و حلاوت ملتی ہے اور نہ ان میں انبساط کی کیفیت محسوس ہوتی ہے بلکہ ہم عام طور پر نماز کو اسی طرح ادا کرتے ہیں جس طرح فوج اور پولیس کے سپاہی قواعد پریڈ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نمازیں اور دعائیں بے اثر ہو گئی ہیں۔

اب ہم خاصانِ خدا کی نماز کی ظاہری و معنوی کیفیات کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں جن کی نمازیں اور دعائیں قلب و دماغ کی دُنیا اور میدانِ جہاد کا نقشہ بدل دیتی تھیں۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز

قرآن نے مومنین صادقین کی نمازوں کا جو نقشہ کھینچا ہے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اس کا سب سے اعلیٰ نمونہ تھی۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سراپا عصمت و پاکیزگی تھے۔ آپ کو مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ کی بشارت مل چکی تھی کہ نماز کا مقام مغفرت خواہی سے اونچا اور طلب حاجت سے بھی بلند

لیے ان بشارتوں کے باوجود آپ نے کبھی کسی راہ بندہ نوازی میں رخصت کی سہولتیں اختیار نہیں
نیں بلکہ آپ کا قدم مبارک ہمیشہ میدانِ عزیمت کی مشقتوں ہی کی طرف بڑھتا رہا۔ مشہور روایت ہے
طویل قیام کی وجہ سے آپ کے پائے مبارک میں ورم آجاتا تھا اس مجاہدے اور ریاضت پر صحابہ کرام
تعجب ہوتا تھا چنانچہ ایک دن ایک صحابی نے مجلس ہی میں یہ سوال کر دیا — فِدَاکَ اَبِیْ وَاُمِّیْ آپ پر
ے ماں باپ فدا ہوں، آپ تو سراپا عصمت و پاکیزگی ہیں پھر اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے
پا عبدیت بن کر ارشاد فرمایا۔ اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

قرآن نے مومنین صادقین کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا (فرقان)	وہ لوگ جو سجدہ و قیام میں رات گزارتے ہیں

دوسری جگہ ہے۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ	ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں

ایک اور جگہ ہے۔

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا	وہ اپنے رب کو خوف و رجا کے ساتھ پکارتے ہیں

ایک جگہ ہے:۔

يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا	روتے ہیں اور یہ کیفیت ان کے خشوع کو
قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ○ وَ	بڑھا دیتی ہے۔ رات کو کم ہی سوتے ہیں اور سحر
بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ○ (ذاریات)	کے وقت خدا سے استغفار کرتے ہیں۔

اگر آپ ان کیفیات کو مجسم صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جلوت و خلوت
نمازوں میں تلاش کیجیے آپ کے قلب مبارک کی کیفیات و احساسات کی ترجمانی آسان نہیں ہے مگر صحابہ
م نے ان کیفیتوں کی جتنی بھی تصویر کشی الفاظ کے ذریعہ کی ہے اگر ان کا ادنیٰ حصہ بھی ہمارے قلب و
میں جگہ پا سکے تو یہ ہماری فلاح و سعادت کا ضامن ہوگا۔ چند واقعات ملاحظہ فرمائیں۔

محرم اسرار نبوی حضرت عائشہ آپ کی نمازوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتی ہیں:۔
کبھی ایسا ہوتا کہ آپ نماز میں کھڑے رہ جاتے۔ سورہ بقرہ سورہ آل عمران سورہ

جیسی طویل سورتیں پڑھ ڈالتے اور جب درمیان میں کوئی خوف و خشیت کی آیت آجاتی تو خدا سے دعا مانگتے اور پناہ طلب کرتے۔ کوئی رحمت اور بشارت کی آیت آجاتی تو جبدِ شکور بن کر اس کے حصول کی دعا مانگتے۔ کبھی کبھی کوئی ایسی آیت بھی آجاتی کہ آپ اس کے ذوق و شوق میں محو ہو جاتے۔ ایک صحابی نے آپ کی نماز تہجد کے بارے میں حضرت عائشہؓ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا فلاتسئل عن حسنھن وطولھن ان کی طوالت اور خوبصورتی کے بارے میں کچھ نہ پوچھو وہ بیان سے باہر ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں "ایک بار نفل نماز میں آپ کے ساتھ شریک ہوا آپ نے اتنی طویل نماز پڑھی کہ میں ایک بری بات سوچنے لگا۔ لوگوں نے اس بری بات کے بارے میں پوچھا تو بولے حضورؐ کو کھڑا چھوڑ کر بیٹھ جانے کا خیال ہونے لگا۔" (شمائل ترمذی)

حضرت خبابؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو صبح تک اسی میں مصروف رہے حال اسرار نبوی حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ

"ایک رات مجھے آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ آپ نے سورہ بقرہ شروع کی۔ میں سمجھا سو آیتیں پڑھیں گے لیکن آپ ان کو پڑھ کر اور آگے بڑھے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ شاید پوری سورۃ آپ ایک ہی رکعت میں ختم کرنا چاہتے ہیں جب وہ سورت ختم ہوئی تو میں نے خیال کیا کہ آپ رکوع کریں گے، لیکن آپ نے فوراً ہی سورۂ آل عمران شروع کر دی۔ یہ بھی ختم ہو چکی تو سورۂ نساء شروع کر دی۔ (یہ تینوں سورتیں مل کر سوا پانچ پارے ہیں) آپ بہت ٹھہر ٹھہر کر قرأت کر رہے تھے۔ اور ہر آیت کے مضمون کے مطابق بیچ بیچ میں تسبیح اور دعا کرتے جاتے تھے اس کے بعد آپ نے رکوع کیا اور پھر سجدہ کیا اور ان میں بھی اتنا ہی توقف فرمایا۔ (مسلم صلوٰۃ اللیل)

ان طویل نمازوں میں آپ کے قلب و روح کی کیا کیفیت ہوتی تھی اس کا نقشہ ایک صحابی عبداللہ ابن شخیر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

"میں ایک بار خدمت نبوی میں حاضر ہوا دیکھا تو آپ نماز میں مشغول ہیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور بے قراری میں رونے کی وجہ سے آپ کے سینے سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے معلوم ہوتا تھا کہ ہانڈی ابال کھا رہی ہے۔ ولجوفہ ازیز کازیز المرجل من البکاء"

(شمائل ترمذی)

ایک دوسری روایت میں ہے۔ جیسے چکی کی آواز نکل رہی ہے۔ خشیت الٰہی کی یہ کیفیت کبھی امت کی فلاح خواہی اور مغفرت طلبی کے ساتھ جمع ہو جاتی تھی تو پھر آپ کی اور عجب کیفیت ہو جاتی تھی۔ حضرت ابوذ غفاری بیان کرتے ہیں کہ ایک بار آپ نماز میں سورۂ مائدہ تلاوت فرمارہے تھے جب اس آیت پر پہنچے
اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ تو یہ اثر ہو کہ پوری رات یہی آیت دہراتے رہ گئے۔ (ابن ماجہ صلوٰۃ اللیل)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک بار میں اپنی خالہ میمونہ کے یہاں رات کو سویا تو دیکھا کہ آپ پچھلے پہر بیدار ہوئے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے آپ نے آسمان پر ایک نظر ڈالی پھر سورۂ آل عمران کی آخری رکوع کی تلاوت کی (یعنی اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے حسن الثواب تک) اور دل کی گہرائیوں سے یہ دعائیہ الفاظ زبان مبارک پر جاری ہو گئے۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ
قَيَّامُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَكَ الْحَمْدُ
اَنْتَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ
مَنْ فِيْهِنَّ اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ
الْحَقُّ وَقَوْلُكَ الْحَقُّ وَلِقَاءُكَ
الْحَقُّ والبعثۃ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ۔
اَلسَّاعَةُ حَقٌّ اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَ
بِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَ
اِلَيْكَ اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَاِلَيْكَ
حَاكَمْتُ فَاغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَ
اَخَّرْتُ وَاَسْرَرْتُ وَاَعْلَنْتُ اَنْتَ
اِلٰهِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ (مشکوٰۃ)

خداوندا حمد تیرے ہی لیے ہے تو آسمانوں
زمین کا نور ہے اور حمد تیرے ہی لیے ہے تو
آسمان و زمین کو تھامے ہوئے ہے۔ اور حمد تیرے
ہی لیے ہے، تو آسمان و زمین کا اور جو کچھ ان میں
ہے سب کا پروردگار ہے۔ تو حق ہے اور تیرا
وعدہ حق ہے تیری بات حق ہے، تجھ سے ملنا حق
ہے۔ بعثت حق ہے، دوزخ حق ہے، قیامت حق
ہے۔ خداوندا! میں نے تیرے ہی آستانے پر سر
جھکایا اور تجھی پر ایمان لایا ہوں تجھی پر میں نے بھروسہ
کیا ہے اور تجھی سے رجوع کرتا ہوں، تیرے ہی
زور سے جھگڑتا ہوں تجھی سے فیصلہ چاہتا ہوں تو
میرا اگلا پچھلا کھلا اور چھپا ہر ایک گناہ معاف فرما۔
تو ہی میرا الٰہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک بار آپ حجرے میں آرام فرما تھے۔ رات میں جب میری

آنکھ کھلی تو آپ کو بستر پر نہیں پایا میں سمجھی کہ شاید کسی دوسری بیوی کے حجرے میں تشریف لے گئے ہیں اندھیرے میں ہاتھ سے اِدھر اُدھر ٹٹولا تو دیکھا کہ جبین مبارک خاک پر ہے اور آپ سربسجود دعا میں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھ کو اس پر بڑی ندامت ہوئی کہ آپ کس عالم میں ہیں اور میں کس خیال میں ہوں۔ (نسائی باب الغیرۃ)

ایک بار ایک صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے موئے مبارک سفید ہو رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ شیبتنی ھود واخواتھا (مجھے سورۂ ہود اور ان کی جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔)

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰی نے آپ سے یہی سوال کیا تو فرمایا۔ ہود، واقعہ، مرسلات، عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ (شمائل ترمذی)

ان سورتوں کے بوڑھا کر دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں قیامت کی ہولناکی اور صعوبتوں کا دل ہلا دینے والے انداز میں ذکر ہے جس سے ہر انسان کو گزرنا ہوگا۔ آپ اکثر نمازوں میں ان سورتوں کی تلاوت فرماتے۔

حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ "جب دو ثلث رات گزر جاتی تو آپ گھبرائے ہوئے اٹھتے، اور آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوتے۔

یاایھا الناس اذکروا اللہ	لوگو! خدا کو یاد کرو، خدا کو یاد کرو۔
اذکروا اللہ جاءت الراجفۃ	ایک زلزلہ آ رہا ہے اور اس کے پیچھے ایک
تتبعھا الرادفۃ جاءت الموت	جھنجھوڑنے والی چیز قیامت آ رہی ہے۔ موت اپنی
بمافیہ جاء الموت بمافیہ	تمام تلخیوں کے ساتھ آ پہنچی، موت اپنی ہلاکت سامانیوں
(مشکوٰۃ، باب البکاء)	کے ساتھ آ پہنچی۔

جب آپ بادل کا کوئی ٹکڑا دیکھتے تو گھبرا جاتے اور فوراً قبلہ رو ہو کر دعا فرماتے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ نے گھبراہٹ کا سبب پوچھا تو فرمایا۔ "عائشہ! کیا معلوم کہ ہمارے ساتھ قوم ہود کا سا معاملہ پیش آ جائے جنہوں نے بدلی دیکھ کر کہا تھا کہ یہ ہمارے کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے آ رہی ہے، حالانکہ وہ عذاب تھا۔ سورج گرہن اور چاند گرہن میں بھی آپ کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ سورج گرہن کے وقت کی کیفیت اور آپ کی نماز کا حال حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں، فرماتے ہیں۔

"ایک مرتبہ سورج گرہن لگا، آپ فوراً نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور اتنا طویل قیام فرمایا کہ گویا رکوع میں جانے کا ارادہ ہی نہیں۔ پھر رکوع فرمایا تو معلوم ہوتا تھا کہ اب آپ سر ہی نہ اٹھائیں گے۔ پھر سر اٹھایا تو

معلوم ہوا کہ سجدے میں نہیں جائیں گے۔ پھر اس طویل رکوع اور سجود کے ساتھ یہ کیفیت تھی کہ عذاب قیامت کے شدت احساس سے تیز تیز سانس لے رہے تھے اور بارگاہ قدس میں یہ عرض کر رہے تھے

رَبِّ اَلَمْ تَعِدْنِیْ اَنْ لَّا تُعَذِّبَهُمْ وَاَنَا فِیْهِمْ اَلَمْ تَعِدْنِیْ اَنْ لَّا تُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۝	اے پروردگار! کیا تونے یہ وعدہ نہیں کیا ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تو لوگوں کو عذاب نہ دے گا۔ اے پروردگار تو نے وعدہ کیا ہے کہ جب تک لوگ استغفار کرتے رہیں گے تو اُن کو عذاب نہ دے گا۔

(ابوداؤد، صلوٰۃ الکسوف)

یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نیاز کی کیفیت اور آپ کے قلب مبارک کے احساسات اور جذبات محبت و خوف کا ایک ہلکا سا خاکہ ہے جو یہاں پیش کیا گیا ہے۔ نماز کی اصل روح خدا کا ذکر ہے اور اس سے دعا ہے۔ یہ بندۂ مومن کی ایسی صفت ہے جس سے وہ کسی آن خالی نہیں رہتا۔ نماز کے لیے کچھ شرائط و قیود ہیں مگر دعا کے لیے کوئی شرط و قید نہیں ہے۔ اس کی تعمیل ہر آن ہو سکتی ہے۔ قرآن پاک میں اہل ایمان کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ	جو لوگ خدا کو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے یاد کرتے ہیں۔

صاحب خلق قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اس دوام ذکر کی تصویر تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر آن و ہر لحظہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔

ربیعہ بن کعب اسلمی رات کو آپ کے آستانے پر پہرہ دیتے تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ کی تسبیح و تہلیل کی آواز سنتے سنتے میں تھک جاتا تھا اور مجھے نیند آجاتی تھی (مسند ج ۴ ص ۵۹)

امہات المؤمنین کا بیان ہے کہ خاص طور پر سورۂ نصر کے نزول کے بعد ہر وقت و ہر آن زبان مبارک پر تسبیح و تہلیل جاری رہتی تھی۔ (ابن سعد)

سراپا عبدیت ہونے کے باوجود آپ فرمایا کرتے تھے "خدا کی قسم میں نہیں جانتا حالانکہ میں خدا کا رسول ہوں ما یفعل بی ولا بکم۔ مرنے کے بعد میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔" اس حدیث پر کچھ کلام کیا گیا ہے مگر اس سے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ پر بالکل درست ہے۔

صحابہ کرام کی نمازیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جس طرح ہر چیز میں اسوۂ نبوی کا نمونہ اور اس کی زندہ تصویر تھے۔ اسی طرح نماز سے شغف میں بھی وہ آپ کی زندہ یادگار تھے۔ جماعت کا اہتمام، تطوعات کا ذوق وشوق اور تہجد کی پابندی عہد صحابہ میں عام تھی۔ نماز کے ساتھ ان کے شغف وانہماک اور ذوق وشوق کی کچھ تفصیل یہاں کی جارہی ہے۔ قرآن کریم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نماز کے ذوق وشوق اور شب بیداری کا ذکر متعدد جگہ کیا ہے مثلاً:۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ	ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے
يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا	ہیں وہ سجدہ اور قیام میں پوری رات گزار دیتے
يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ	ہیں وہ خوف و لالچ کی کیفیت کے ساتھ خدا کو
طَمَعًا	پکارتے ہیں

سورۂ مزمل میں ہے کہ آپ جب رات کو نماز تہجد کے لیے کھڑے ہوتے تو آپ کے ساتھ صحابہ کی جماعت بھی ہوتی۔

قرآن کریم میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نمازوں اور خاص طور پر رات کی نمازوں کا جائزہ لیا کرتے تھے۔ "نماز اور خشوع" والے مضمون میں اس کی تفصیل آچکی ہے اور یہ ذکر آچکا ہے کہ تہجد کے وقت اٹھ کر آپ صحابہ کرام کو بھی اس کی ترغیب فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار آپ نے بڑے محبت کے انداز میں فرمایا:۔

رحم الله رجلا قام من	اللہ اس شخص پر رحم کرے جو رات کو اٹھا
الليل فصلى وايقظ امراته فصلت	اور نماز پڑھی اور اپنی بیوی کو بھی جگایا اور اس
فان ابت نضح فى وجهها الماء	نے نماز پڑھی اگر اس نے اٹھنے سے انکار کیا تو
رحم الله امراة قامت من الليل	اس نے اس کے چہرے پر پانی چھڑک دیا۔ اللہ
فصلت وايقظت زوجها فصلى فان	تعالیٰ اس عورت پر بھی رحم کرے جو رات کو اٹھی
ابى نضحت فى وجهه	اور نماز پڑھی پھر اپنے شوہر کو بھی جگایا اور اگر

---

[1] یہ مضمون "زندگی" ماہ فروری ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔

الماء ۔	اداس نے بھی نماز پڑھی اگر اس نے اٹھنے سے انکار کیا تو اس کے چہرے پر پانی کا چھینٹا دیا
(مشکوٰۃ تحریض قیام اللیل)	

آپ بار بار صحابہ کو اس کی تاکید فرماتے۔ ایک بار آپ نے فرمایا:- "علیکم بقیام اللیل فانہ داب الصالحین قبلکم وھو قربۃ لکم الی ربکم ومکفرۃ للسیات ومنھاۃ عن الاثم (مشکوٰۃ تحریض قیام اللیل)

اس میں آپ نے نماز تہجد کی چار خصوصیتیں بیان فرمائی ہیں۔ (۱) یہ تمام انبیاء و صالحین کی سنت ہے (۲) قرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔ (۳) کفارۂ سیئات ہے۔ (۴) برائی سے روکتی ہے۔ قرآن کے ان مختصر مگر جامع دو فقروں میں بھی اس کی بہت سی خصوصیات کی طرف اشارہ موجود ہے۔ ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطأ واقوم قیلا۔

آپ نے ایک بار ایک خطبہ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جن لوگوں کو خوش ہو کر اپنے حضور میں طلب کرے گا ان میں قیام لیل کرنے والوں کا گروہ بھی ہوگا۔ این الذین کانت تتجافی جنوبھم عن المضاجع۔ (اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہے گا کہ ان لوگوں کو لاؤ وہ کہاں ہیں جن کے پہلو رات کو بستر سے جدا رہتے تھے۔)

حضرت ابن عمر کا ذوق شب بیداری دیکھ کر آپ نے ایک بار فرمایا کہ تم اس شخص جیسے نہ ہونا جس نے قیام لیل کے بعد پھر اسے ترک کر دیا۔ قرآن کی ہدایات اور ان ترغیبات نبوی نے ان میں فرائض کی ادائگی کے ساتھ تطوعات اور خاص طور پر نماز تہجد کے اہتمام کا ایک عام جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

ان حضرات کی نمازوں کے ذوق و شوق کے چند واقعات ملاحظہ فرمائیں۔

نماز باجماعت کا اہتمام

نماز باجماعت کا اہتمام اور اس سے شغف و انہماک صحابہ کرام کی ایک مشترک اور عام خصوصیت تھی۔ جو لوگ ان میں معذور سمجھے جاتے تھے وہ بھی نماز باجماعت کا اہتمام کرتے تھے۔ حضرت سفیان ثوریؒ صحابہ کرام کی اس خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کانوا یتبایعون ولایدعون الصلوٰۃ المکتوبۃ فی	صحابہ کاروبار خرید و فروخت بھی کرتے رہتے تھے مگر نماز باجماعت کبھی ترک نہیں

کرتے تھے۔

کاروباری مشغولیت کے ساتھ ان کی اس پابندیٔ نماز کی گواہی خود قرآن نے دی ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا ... ان میں وہ لوگ ہیں جن کو تجارت ذکر الٰہی

بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ ... اور اقامت صلوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔

مسجد نبوی کی چھت کھجور کی پتیوں سے بنائی گئی تھی اور وہ اتنی وسیع و عریض نہ تھی کہ تمام صحابہ رض سر چھپا سکیں۔ عرب کی گرمی ضرب المثل ہے۔ اسی تپتی ہوئی دوپہر میں ظہر کی نماز ہوتی تھی۔ گرمی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ پیشانی زمین پر رکھنی مشکل ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت جابر اس کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں "جب میں ظہر کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھنے جاتا تھا تو مٹھی بھر کنکری ہاتھ میں لیکر اسے ٹھنڈا کر لیتا تھا جسے اپنی پیشانی کے سامنے رکھ لیتا تھا اور تپش کی وجہ سے اس پر سجدہ کرتا تھا" (ابو داؤد باب وقت الظہر) شدت گرمی کی وجہ سے صحابہ پر ظہر کی نماز باجماعت شاق ضرور گزرتی تھی۔ مگر کیا مجال کہ وہ اسے ترک کر دیں۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔

لم یکن یصلی صلوٰۃ اشد علی ... آپ کی کوئی نماز صحابہ کرام پر ظہر کی نماز

اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منہا (ابو داؤد) ... سے زیادہ شاق نہیں ہوتی تھی۔

ایک صحابی کا مکان بہت دور تھا مگر وہ پنج وقتہ جماعت میں شریک ہوتے تھے کسی نے کہا کہ آپ ایک گدھا خرید لیتے جس پر دھوپ اور اندھیری رات میں سوار ہو کر شریک جماعت ہوتے' بولے۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میرا گھر مسجد کے بغل میں ہو اور جماعت کے لیے آنا جانا نہ پڑے۔ اُن کی یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے ان سے اس کی وجہ پوچھی بولے۔

اردت ان یکتب لی اقبالی الی ... میری خواہش ہے کہ میری یہ طویل آمد و رفت

المسجد ورجوعی الی اھلی اذا رجعت ... داخل حسنات ہو۔

یہ سنکر آپ نے فرمایا کہ یہ سب کچھ اللہ تعالےٰ نے تمہیں دے دیا' انتہائی مجبوری اور شدید بیماری میں بھی ان سے جماعت ترک نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود عہد صحابہ کی عام کیفیت بیان کرتے ہیں

ولقد رأیتنا وما یتخلف عنہا ... عہد صحابہ میں وہی شخص جماعت میں شریک

الا منافق بین النفاق ولقد رأیتنا وان الرجل یهادی بین الرجلین حتی یقام فی الصف (ابوداود)

نہیں ہوتا تھا جس کا نفاق بالکل ظاہر ہوتی کہ بعض معذور اور بیمار دو آدمیوں کے سہارے لائے جاتے اور صف میں کھڑے کر دیتے جاتے تھے

ازوں کا ذوق و شوق اور قیام لیل کا اہتمام

نفل نمازوں اور خاص طور پر قیام لیل کا اہتمام صحابہ کرام کی عام خصوصیت تھی۔

ر حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: "ھم رھبان فی اللیل" وہ رات میں راہبوں کی دت کرتے تھے۔

صحابہ کرامؓ کی نمازوں کے ذوق و شوق کے چند واقعات ملاحظہ فرمائیں۔

ضرت ابو بکر صدیق کے بارے میں مذکور ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک ڑی گئی ہے جس میں کوئی حس و حرکت نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ نے ان کی نماز کی کیفیت بڑے زمیں بیان فرمائی ہے۔ وہ بیان کرتی ہیں میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے والدین کو ایمان کی ں پایا اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر میں صبح و شام تشریف ہوں۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے دل میں مسجد کا خیال آیا۔ گھر کے صحن میں ایک مسجد بنالی

فکان یصلی فیہ ویقرء القرآن فیتقصف علیہ نساء المشرکین وابناؤھم وھم یعجبون منہ وینظرون الیہ وکان ابو بکر رجلا بکاء لا یملک عینہ اذا قرء القرآن فافزع ذالک اشراف قریش من المشرکین (بخاری باب المسجد)

اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے اور نماز میں قرآن پڑھنا شروع کرتے تو مشرکین کی عورتیں اور بچے ٹھہر ٹھہر کر سننے لگتے ان کی اس کیفیت پر تعجب کرتے اور ان کی طرف دیکھتے رہتے۔ ابو بکرؓ جب قرآن کی تلاوت فرماتے تو آنکھوں کو بالکل قابو نہیں رہ جاتا تھا تو اشراف قریش اس سے گھبرائے کہ کہیں ان کی نماز اور قرأت سے ہمارے بچے اور عورتیں متاثر نہ ہو جائیں۔

مرض وفات کے وقت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو امامت نماز کا حکم فرمایا تو ان کی ں کا اندازہ کر کے حضرت عائشہ نے کہا کہ وہ رقیق القلب آدمی ہیں آپ کی جگہ کھڑے ہو کر رو پڑیں گے

مور قیق القلب لا یقوم مقامك

حضرت عمرؓ کے بارے میں ہے کہ نماز میں اس شدت سے روتے تھے کہ پچھلی صف والے آواز سن لیتے تھے۔ عبداللہ بن شداد کا بیان ہے کہ

سمعت نشیج عمر وانا فی اخر	میں آخری صف میں تھا مگر حضرت عمرؓ کے
الصفوف یقرء إِنَّمَا أَشْكُوا بَثِّيْ	رونے کی آواز سن رہا تھا اور وہ آیت انما
وَحُزْنِيْ إِلَى اللهِ (بخاری باب اذا بکی الامام)	اشکوا بثی وحزنی الی اللہ پڑھ رہے تھے

تہجد پڑھنے کا معمول تھا کہ جب صبح ہونے لگتی تو گھر والوں کو جگاتے اور یہ آیت پڑھتے جاتے۔

وامر اهلك بالصلوٰة	اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو۔

کبھی وہ نماز میں سورۂ یوسف اور سورۂ حج اور کبھی یونس، ہود اور کہف پڑھ ڈالتے تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ خلافت کے زمانے میں جب دن کو عبادت کا موقع کم ملتا۔ تو رات کو اس کمی کو پورا کرتے تھے عموماً رات کا اکثر عبادت میں بسر ہوتا تھا اور کبھی رات بھر نہ سوتے۔ (ابن سعد)

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس معاملے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مثل تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:۔

کان ما علمت صوّاماً	جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ بڑے
قوّاماً	عبادت گزار اور روزے دار تھے۔

زبیر بن سعد قریشی کا بیان ہے۔

لم ار هاشمیا قط أعبد لله	میں نے ہاشمیوں میں ان سے زیادہ
منه۔	عبادت گزار نہیں دیکھا۔

(صفحہ ۶۴ کا بقیہ) کی جاتی ہے اس کا نام عمرہ ہے۔ عمرے میں سات بار خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں اور سات بار صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتے ہیں۔

عمرہ میں صفا مروہ کی سعی

فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا (البقرہ)	پس جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرے کو کرے تو کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کا طواف کرے

خُسرانِ مُبین

(قسط ۲)

(مولانا سلیمان، فرخ آبادی)

اللہ کے حضور پیشی کا انکار کرنیوالے خسران میں مبتلا رہیں گے

دو دنیائیں ہیں جن کی کامیابی و کامرانی پر انسان کی فلاح و بہبود موقوف ہے ایک فکر کی دنیا دوسری عمل کی دنیا اور ان دونوں کی فلاح و خسران اس بات پر منحصر ہے کہ آدمی اپنی زندگی کا مقصود، اپنے جیون کا محور، اپنی سعی وجہد کا مرکز، اپنی انفرادیت اور اجتماعیت کا ہدف اور اپنے سفر زیست کی منزل کیا قرار دیتا ہے۔ اس موجودہ دنیا کو، جو فکر و عمل کی دونوں دنیاؤں کے مجموعے کا نام ہے یا اس آخرت کی دنیا میں کامیابی اور نجات کو اپنی زندگی کا مقصود اور اپنی سعی وجہد کی غایت قرار دیتا ہے جو فکر و عمل کے انجام کی دنیا ہے۔ موت سے پہلے کی دنیا کو جس نے اپنا مقصود ٹھیرایا۔ درحقیقت اس نے ہمالیہ سے بھی زیادہ بلند اور آسمان سے بھی زیادہ اونچے مقام سے تحت الثریٰ تک کھڈ میں چھلانگ لگا دی اور اپنے فکر و عمل کی دنیا کو برباد کر کے ہمیشہ کی تباہی و بربادی مول لی کیونکہ اس نے اپنے فکر و عمل سے آخرت کی حقیقت کا انکار کیا۔ اس حقیقت کا انکار کرنے والے آج تک کبھی کامیاب ہوئے اور نہ کبھی فلاح پاسکیں گے۔ ان کے مقدر میں ابدی خسران اور ہمیشہ کا خسارہ لکھ دیا گیا جو اپنی جگہ اٹل ہے۔ چنانچہ سورۃ انعام آیت ۳۱ ع ۴ میں فرمایا گیا۔ "یقیناً خسران میں مبتلا ہوگئے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے اپنی ملاقات (دربار خداوندی میں حاضری) کو جھٹلایا۔ جب اچانک وہ گھڑی آجائے گی تو کہیں گے ہائے حسرت و افسوس! ہم سے کیسی تقصیر ہوئی اور وہ اپنی پیٹھوں پر اپنے (فکر و عمل کے) گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے۔ آگاہ! کیسا برا ہے وہ بوجھ جو یہ اٹھائیں گے۔ نیز ملاحظہ ہو

(الکہف آیات ۱۰۳ تا ۱۰۵ ع ۱۲)

اللہ اور اس کی شریعت سے بے نیاز ہو کر قانون سازی کرنے والے خسران میں مبتلا رہیں گے۔

تاریخ کا ہر ورق بلکہ اس کی ہر سطر شاہد ہے کہ انسان نے جب بھی کبھی اپنی زندگی یا اس کے کسی شعبے کے واسطے اپنی عقل، اپنے حواس، اپنے علم، اور اپنے تجربے اور مشاہدے کے بل بوتے پر خود ہی قانون وضع کیا، رسوم و رواج ایجاد کیے۔ قواعد و ضوابط منضبط کیے تو وہ ہمیشہ ایسے بندھنوں میں جکڑ گیا کہ اس کی انسانیت کراہنے لگی، اس کے قدموں کو ایسی بیڑیوں نے اس کے ہاتھوں کو ایسی ہتھکڑیوں نے جکڑ دیا کہ اس کی روح اور اس کا ضمیر چیخ اٹھے، وہ ایسے طوق و سلاسل میں پھنس گیا اس کی انفرادیت پس کر رہ گئی، اس کی اجتماعیت ظلم و ستم اور اونچ نیچ سے بھر گئی۔ غرض کہ اس کے آتش فشاں پہاڑ سے آگ کا ایک لاوا پھوٹا جس سے دنیائے انسانیت جھلس کر رہ گئی اور اس کی چھاتی پر بڑے بڑے آبلے پڑ گئے گہرے گھاؤ بن گئے، ناسور ہو گئے جو رستے ہیں اور چین نہیں لینے دیتے۔ ہمارا آج کا دور بھی اس کا ایک نمونہ ہے ایک طرف سرمایہ داری اور اس کی انفرادیت ہے تو دوسری طرف کمیونزم اور اس کی اجتماعیت ہے دونوں اعتدال اور عدل و قسط سے محروم ہیں۔ چنانچہ دنیا ظلم و ستم سے بھر چکی ہے اور امن و عافیت کو ترس رہی ہے۔ آج کا انسان، ایک طرف فیملی پلاننگ اور برتھ کنٹرول کی تحریکیں چلاتا ہے اور دوسری طرف جانوروں پر رحم کے خوش نما نام سے جنگل کے درندوں، ہاتھیوں، شیروں اور گینڈوں کی حفاظت اور رکھشا کی کوششوں میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسولوں کی رہنمائی سے منہ موڑنے کا انجام یہی ہوا ہے کہ انسان عدل و میانہ روی سے محروم ہو گیا، بے اعتدالی کا شکار ہو گیا، مصیبتوں میں گھر گیا ہے۔ آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ چنانچہ سورۂ انعام آیت ۱۴۰، ع ۱۷ میں فرمایا۔ "یقیناً خسارے میں رہے اور ٹوٹے میں مبتلا ہو گئے۔ وہ لوگ جنھوں نے نادانی اور جہالت سے اپنی اولاد کو قتل کیا اور جو رزق اللہ نے ان کو دیا تھا اسے اللہ پر افترا کر کے اپنے اوپر حرام ٹھیرا لیا۔ وہ یقیناً بھٹک گئے اور وہ ہدایت پانے والے تھے ہی نہیں ——— واضح رہے کہ عرب کے بعض قبائل جن اسباب سے اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے ان میں سے ایک فقر و احتیاج اور بھوک کا اندیشہ بھی تھا اور ساتھ ہی انھوں نے بعض حلال اور طیب جانوروں کو از خود حرام ٹھیرا لیا تھا اور یہ نتیجہ تھا اللہ کی شریعت سے روگردانی کا۔ ٹھیک یہی روش آج کی تہذیب نے اختیار کر رکھی

ہے چنانچہ یہ بھی خسران بداماں ہے آج نہیں تو کل ڈوب کر رہے گی' اس کی بے اعتدالی خود منہ سے بول رہی ہے کہ وہ تباہ ہوگی اور انسانیت کو بھی خسران سے دوچار کرے گی' لہذا ہر ہی خواہ انسانیت کا فریضہ ہے کہ وہ دنیا کو خسران سے بچانے کے لیے معاشرے کی تعمیر ان بنیادوں پر کرے جو انبیاء علیہم السلام نے فراہم کی ہیں۔

آیاتِ الٰہی پر ظلم' ابدی خسران کا باعث ہے

انسانی زندگی کا ریکارڈ محفوظ رہے گا' اس کا روزنامچہ تیار ہو رہا ہے۔ کارنامے اور کرتوت دونوں نوٹ کیے جا رہے ہیں' انسان کو اپنی زندگی کا حساب دینا ہوگا' ذرہ ذرہ کا حساب' لمحہ لمحہ کا حساب' لیکن یوم الحساب میں وزن صرف نیکیوں میں ہوگا اور اس کی میزان عمل کے پلڑے بالکل ہلکے ہوں گے جس کے پاس نیکیاں کم اور بدیاں زیادہ ہوں گی ـــــ اور بدیاں اس کی زیادہ ہوں گی جس نے اللہ کی آیات پر ظلم کیا ہوگا۔ زمین و آسمان کی ہر چیز میں خدا کی نشانیاں پوشیدہ ہیں خود نفس و جسم انسانی بھی خدا کی نشانیوں سے بھرپور ہے اور کتاب الٰہی کی آیات بھی اللہ کی نشانیاں ہیں' خدا کی آیات میں غور و فکر نہ کرنا' یا غور و فکر کی بنیاد خدا کے ذکر کو قرار نہ دینا' یا نتائج غلط اخذ کرنا' یہ سب آیات الٰہی پر ظلم ہے اور جن ظالموں نے ظلم کے ذریعے بدیاں کما کر اپنی میزان عمل کو ہلکا رکھا ایسے ظالموں نے اپنے آپ کو خسران میں مبتلا کیا۔ چنانچہ اعراف آیت ۹ ع ۱ میں فرمایا جس کی تولیں ہلکی رہیں پس یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے کو خسارے میں مبتلا کیا بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات پر ظلم کرتے تھے۔ نیز سورۂ یونس آیت ۹۵ ع ۱۰ میں فرمایا۔ اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے ہرگز نہ ہو۔ پس خسران میں شامل رہنے والے ہو جاؤ گے نیز ملاحظہ ہو سورۂ کہف آیت ۱۰۳ تا ۱۰۵ ع ۱۲ اور سورۂ زمر آیت ۶۳ ع ۷۔

اگر رب نے درگذر نہ فرمایا تو ہم خسران میں مبتلا ہو جائیں گے۔

مومن کے نزدیک سب سے بڑی کامیابی اور کامرانی یہ ہوتی ہے کہ اس کا رب اسے اپنی رحمتوں سے نواز دے' اپنی بخششوں سے اس کا دامن بھر دے' اس کے گناہوں کو معاف کر دے اور اس کی لغزشوں سے درگزر فرما دے اس کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت اور اس کے عفو و مغفرت سے محرومی کو ہمیشہ کی تباہی کے مترادف سمجھتا ہے ـــــ مومن گناہوں خطاؤں اور لغزشوں سے پاک اور محفوظ ہو۔ اس سے کوتاہیاں سرزد ہی نہ ہوں' ایسا نہیں ہوتا' البتہ قصور کا احساس ہے...

وہ اعترافِ قصور کرتا ہے وہ غرورِ عبادت میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ احساسِ گناہ اس کی عادت ہوتی ہے۔ اور یہی اعتراف و انفعال اس کو اللہ کی رحمتوں کا طلب گار، اس کی بخششوں اور عفو و درگذر کا تمنائی بنا دیتا ہے اور وہ اس کی نوازشوں سے محرومی کو سب سے بڑا خسران شمار کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف آیت ۲۳ میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام کی دعا نقل فرمائی :" اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں بخشے گا نہیں، اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو ہم خسران میں مبتلا رہنے والے ہو جائیں گے نیز آگے آیت ۱۴۹ ع ۱۸ میں فرمایا۔ انھوں نے (بنی اسرائیل نے) کہا اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ فرمائے اور ہم سے درگزر نہ کرے تو یقیناً ہم خسران میں رہنے والے ہوں گے۔" نیز سورۂ ہود آیت ۴۷ میں حضرت نوح علیہ السلام کا قول نقل فرمایا۔ اگر تو میری مغفرت نہ فرمائے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں خسران زدہ لوگوں میں ہو جاؤں گا۔

غیر اللہ کو اپنی نیازمندیوں کا محور قرار دینے والے خسران میں رہیں گے

آدمی خدا کو نہ پوجے، معبودِ حقیقی کی عبادت نہ کرے، مطاعِ برحق کی اطاعت نہ کرے، حاکمِ مطلق کی رعایا بن کر نہ رہے، یہ بالکل ممکن ہے اور ممکن کیا عملاً ایسا ہوتا رہا ہے اور آج بھی دھڑلے سے ایسا ہو رہا ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ آدمی کسی کو بھی اپنی نیازمندیوں کا محور اور مرکز نہ بنائے اور کسی کا بھی پرستار نہ بنے ـــــ اللہ تعالیٰ کو نہیں تو کسی نہ کسی بت کو بنا کر ضرور پوجے گا۔ اپنے نفس کو، اپنے باپ دادا کے رسم و رواج کو، دنیا والوں کے طور طریق کو، زر، زمین کو غرض کہ کسی نہ کسی کو پوجے گا ضرور، کیونکہ پرستش کا جذبہ اس کی فطرت کا مطالبہ ہے لیکن یہ غیر اللہ کی پوجا اور یہ معبودانِ باطل کوئی بھی اس کے کام نہ آئیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ غیر اللہ کے پجاریوں نے اپنے کو خسارے میں مبتلا کر لیا ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف آیت ۵۳ ع ۶ میں فرمایا۔" یقیناً انھوں نے اپنے کو خسارے میں مبتلا کر لیا اور ان سے کھو گیا وہ سب کچھ جسے انھوں نے گڑھ لیا تھا۔ نیز سورۂ ہود آیت ۲۲ ع ۲ میں فرمایا۔" یقیناً وہ (من گھڑت خداؤں کے پجاری) آخرت میں خسران میں رہیں گے۔" اور سورۂ زمر آیت ۶۵ ع ۷ میں فرمایا۔ اگر تو نے شریک مانا تو اکارت جائیں گے تیرے اعمال اور تو یقیناً خسران پانے والوں میں سے ہو جائے گا۔"

نبی کی اطاعت سے منہ موڑنے والے خسران میں مبتلا ہوں گے۔

انسان نے جب بھی کسی حقیقت کو جھٹلایا ہے تو اس نے خسارہ مول لیا ہے، لیکن نبی کی نبوت کا

پیغام اور تعلیمات اتنی عظیم حقیقت ہوتی ہے کہ اس کا انکار اور اس کو جھٹلانا ہمیشہ ہمیش کی تباہی و بربادی کے مترادف ہوتا ہے نبی کو جھٹلانے والے صرف دنیا میں نہیں اور نہ صرف آخرت میں بلکہ دونوں جہان میں خسران سے دوچار ہوتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ اعراف آیت ۹۲ ع ۱۱ میں فرمایا جنھوں نے شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا وہی خسران میں رہنے والے ہیں۔

اللہ سے نڈر ہوکر زندگی گزارنا خسران کا باعث ہے

جو لوگ اللہ کے وجود کا انکار کرتے ہیں یا اس کی صفات کا استحضار نہیں رکھتے وہ اللہ سے نڈر اور بے خوف ہوکر زندگی گزارتے ہیں اور جو فرد یا قوم اللہ سے بے نیاز اور بے خوف ہوکر زندگی گزارے وہ یقیناً ہمیشہ ہمیش کا خسارہ مول لیتی ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف آیت ۹۹ ع ۱۲ میں فرمایا۔ "پس اللہ کی خفیہ تدبیر سے وہی لوگ بے خوف رہتے ہیں جو خسران میں مبتلا ہونے والے ہیں"

اللہ جسے راہِ راست نہ دکھائے وہ خسران میں مبتلا ہوگا

انسان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ ذی شعور، ذی ارادہ اور با اختیار ہے اس کا یہی وہ وصف ہے جس کے باعث اسے خلافت ارضی کا منصب عطا کیا گیا، احسن تقویم میں پیدا کیا گیا۔ فرشتوں کا مسجود بنایا گیا علمی مقابلہ میں اسی وصف کے بل بوتے پر وہ فرشتوں سے بازی لے گیا، اسی وصف کے غلط استعمال سے اسے اسفل السافلین میں جھونک دیا جاتا ہے اور وہ حیوانات سے بھی زیادہ گر ہو جاتا ہے اس کی ہدایت و ضلالت کا تمام تر انحصار اس کے اپنے شعور و اختیار کے صحیح و غلط استعمال پر ہے اپنے اس وصف خاص سے اگر وہ صحیح کام لیتا ہے تو اللہ اسے ہدایت سے نوازدیتا ہے اور نتیجۃً وہ فلاح سے ہمکنار ہوتا ہے اور اگر وہ اسے غلط استعمال کرتا ہے تو اللہ اسے ضلالت و گمراہی سے دوچار کر دیتا ہے اور انجام کار وہ خسران میں مبتلا ہو جاتا ہے چنانچہ سورۂ اعراف آیت ۱۷۸ ع ۲۲ میں فرمایا اور اللہ جسے گمراہ کرے پس ایسے ہی لوگ خسران میں مبتلا رہنے والے ہیں۔

زندگی کا طرزِ عمل اور نیت اگر درست نہیں ہے تو آدمی خسران سے دوچار ہوگا۔

یہ دنیا عمل کی دنیا ہے، دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کی کارگاہ ہے اور یہ عمل اور سعی و جہد ہی وہ بھٹی ہے جس میں تپاکر انسانوں کو چھانٹا جاتا ہے۔ کندن جنت کے لیے اور کھوٹ جہنم کے لیے الگ کر لیا جاتا ہے انسان کوشش تو بہرحال کرتا ہے لیکن دو سوال ہیں جن کے جواب پر جنت یا دوزخ دونوں میں سے

کوئی ایک بہرحال انسان کے سامنے آئے گی۔ ایک سوال ہے جدوجہد کس لیے؟ اور دوسرا سوال ہے جدوجہد کس طرح؟ ان دونوں سوالوں کے صحیح یا غلط جواب پر فلاح وخسران کا انحصار ہے۔

غرض کہ نیت' طرزِ عمل (زندگی کے تمام میدانوں میں) اور وفاداری کا محور ہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے انسان جنت سے ہمکنار ہوکر فلاح پائے گا یا دوزخ سے دوچار ہوکر خسران میں مبتلا ہوگا چنانچہ سورۂ انفال آیات ۳۶' ۳۷ میں فرمایا:۔ "منکرینِ حق اپنا مال و دولت' اللہ کے راستے سے باز رکھنے کے لیے صرف کرتے ہیں پس وہ اسے خرچ کریں گے اور یہ (طرزِ عمل) ان کے لیے حسرت کا باعث ہوگا۔ پھر وہ مغلوب ہو جائیں گے۔ اور کفر کی روش پر چلنے والے جہنم میں اکٹھا کیے جائیں گے تاکہ اللہ تعالیٰ خبیث کو طیب سے الگ کردے اور خبیثوں کو بعض کو بعض پر لاد دے اور سب کو جہنم میں جھونک دے۔ یہی لوگ خسران میں مبتلا رہنے والے ہیں۔

اہلِ کفرونفاق خسران میں مبتلا رہیں گے۔

دنیا کا اقتدار' طاقت اور قوت مال اور اولاد' دیگر دنیاوی اسباب اور ذرائع' وسائل' اللہ کی نعمت بھی ہیں' امانت بھی ہیں اور امتحان بھی' جو فرد یا قوم نعمتوں کی گرویدہ اور فریفتہ ہوکر منعمِ حقیقی کو بھول جائے امانت میں خیانت کرنے لگے امتحان میں پورا اترنے اور کامیاب ہونے کی کوشش نہ کرے' نعمتوں سے خوب خوب لطف اندوز ہو' لیکن ان کا حق ادا نہ کرے۔ دنیا اور کاروبارِ حیات میں خوب خوب انہماک کا ثبوت دے اور غیر مقصدی غیر یقینی اور غیر حقیقی بحثوں میں الجھا رہے اور دماغ لڑاتا رہے ایسے لوگوں کی سعی وعمل رائگاں جائے گا اور وہ سوائے خسران کے اور کچھ نہ پائیں گے چنانچہ سورہ توبہ آیات ۶۷ تا ۶۹ میں فرمایا۔ اہلِ نفاق اور اہلِ کفر سے اللہ نے جہنم کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے جو ان کے لیے کافی ہے اللہ کی ان پر لعنت ہوا اور ان کے واسطے قائم رہنے والا عذاب ہے مثل ان لوگوں کے جو تم سے پہلے تھے' قوت میں تم سے زیادہ شدید تھے۔ مال و اولاد میں تم سے زیادہ تھے پھر انھوں نے اپنے حصے کا لطف اٹھالیا اور تم نے بھی اپنے حصے کے مزے لوٹ لیے جس طرح انھوں نے لوٹے اور تم بھی انہیں بحثوں میں پڑے جن میں وہ پڑے تھے یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں رائگاں گئے اور یہی لوگ خسران میں رہنے والے ہیں۔

انجام اور حشر کو نگاہوں سے اوجھل رکھنے والے خسران میں رہیں گے۔

دنیا کا کون سا کاروبار یا معاملہ ایسا ہے جس کے انجام پر نگاہ نہ رکھی جائے اور آدمی کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے، انجام سے غفلت اور ناکامی لازم و ملزوم ہیں۔ ایک ایک کام اور ہر ہر معاملے کا الگ الگ بھی یہی حال ہے اور مجموعی طور پر پوری زندگی کا بھی یہی حال ہے زندگی کے انجام پر نگاہ نہ رکھنے سے یقیناً زندگی کا سرمایہ رائگاں جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت کے انکار یا اس سے غفلت کا شکار ہو کر ہمیشہ کے خسران میں مبتلا ہو جاتا ہے چنانچہ سورہ یونس آیت ۵۴ ع ۵ میں فرمایا۔ "یقیناً خسران میں مبتلا ہوئے وہ لوگ جنھوں نے اللہ سے ملاقات (بعث بعد الموت) کو جھٹلایا اور وہ راہ یاب نہیں ہوئے۔ نیز سورہ حٰم السجدہ آیت ۲۲، ۲۳، ع ۳ میں فرمایا۔ اور تم پردہ کرتے تھے اس سے کہ تم کو بتا دیں گے تمہارے کان تمہاری آنکھیں اور تمہارے چمڑے بلکہ تمہارا یہ خیال تھا کہ اللہ کو علم نہیں ہوتا بہت سے ان کاموں کا جو تم کرتے ہو اور یہی تمہاری "بدگمانی اور خام خیالی ہے جو تم نے اپنے رب کے متعلق قائم کر رکھی تھی اسی نے تم کو ہلاک کر دیا ہے پس تم خسران میں مبتلا رہنے والے ہو گئے ہو۔

مخالفینِ حق اپنی ہمالیہ جیسی چالوں کے باوجود خسران میں رہتے ہیں۔

انسانی عقل آج تک جس قدر چالیں سوچ سکی ہے وہ تمام کی تمام مخالفین حق نے علمبرداران حق کو نیچا دکھانے کی غرض سے استعمال کی ہیں، کوئی اوچھا ہتھیار ایسا نہیں جو حق کو پامال کرنے کے لیے باطل پرستوں نے استعمال نہ کیا ہو، جھوٹ، تہمت اور افترا سے لے کر طعنوں پھبتیوں اور تالیاں پیٹنے تک ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے سے لیکر معاشی ناکہ بندی اور معاشرتی بائیکاٹ تک پھانسی کے تختوں اور دار و رسن کی منزلوں سے لے کر پبلک میں رسوا اور ذلیل و خوار کرنے کی کوششوں تک غرض کہ زک پہنچانے عذاب دینے اور کیچڑ اچھالنے کا کوئی طریقہ ایسا نہیں ہے جسے وہ کام میں نہ لائے ہوں۔ لیکن جسے اللہ عزیز رکھے اسے کون مٹا سکتا ہے۔ اللہ جس کی بگڑی بنائے اس کی "بنی" کون بگاڑ سکتا ہے۔ ان کی تمام چالیں دھری کی دھری رہ گئیں ان کے تمام داؤں اکارت ہو کر رہ گئے۔ "علمبرداران حق" کی خود "حق" والے نے یاوری کی۔ سرفروشان حق کی امداد و اعانت خود اس نے کی جس کی خاطر انھوں نے اپنا جان و مال کھپایا۔ اللہ نے ان کی مدد کی اور اس طرح کی کہ باطل پرستوں کی تمام چالیں انہیں پر الٹ گئیں اور وہ خسران میں مبتلا ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ سورۂ انبیاء آیت ۷۰ ع ۵ میں فرمایا۔ اور انھوں نے چاہا کہ وہ

ابراہیم کے) ساتھ چالیں چلیں پس ہم نے اُن کو خسران زدہ کر دیا ۔

لام کی راہ میں ٹھنڈی سڑک پر چلنے والے خسران میں مبتلا ہوں گے ۔

دنیا کا کوئی دعویٰ ثبوت اور شہادت کے بغیر تسلیم نہیں کیا جاتا ۔ چنانچہ اسلام کا دعوٰے بھی قولی وعملی
بوت کے بغیر محض ایک دعوٰے ہی رہتا ہے ۔ دنیا کی کوئی مہم بغیر جدوجہد اور قربانی کے سر نہیں ہوتی ۔
لام کی مہم بھی جدوجہد اور قربانیوں کے بغیر کامیابی کی منزلوں کو نہیں پہنچ سکتی ۔

انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک حق اور دنیا کی گزشتہ اور دورِ حاضر
تمام تحریکیں، اس کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں کہ اس دنیا میں کامیابی و کامرانی کے لیے بہرحال جدوجہد
بانیاں اور سرفروشیاں درکار ہیں ۔ حق اور باطل دونوں کی کامیابی انسانی جدوجہد پر منحصر ہے ۔ لیس للانسان
الا ما سعیٰ ۔ جنت اور دوزخ انسان کی اپنی سعی وکوشش پر موقوف ہیں ۔

مخلص مومن، سچے مسلم، حقیقی پیروان دین اور صحیح معنی میں علمبردارانِ دین وہی لوگ ہیں جو [illegible] جان
لے کر کفن بردوش ہو کر اسلام کی راہ میں سرفروشی کا ثبوت دیں، حق و باطل کی کش مکش میں پہلوتہی اختیار نہ
کریں، اقامت دین اور مدافعت دین کی کٹھنائیوں سے جی نہ چرائیں، چور دروازوں سے نکل بھاگنے اور
ٹھنڈی سڑک سے گزر جانے کی کوشش نہ کریں ۔ ان کے عقائد راسخ ہوں، ان کے اخلاق پختہ ہوں، ان کا
کردار اسلامی ہو، اُن کا نصب العین رضائے رب ہو، اُن کا طریق کار سنت نبوی ہو، وہ نہ صرف یہ کہ دین کی
مدافعت میں اپنا تن من دھن لگاتے ہوں، بلکہ مجاہدانہ سرفروشیوں کے واسطے اقدامی کوششیں بھی کرتے ہوں
کامیابی کا سہرا ایسے ہی جی کڑے کے لوگوں کے سر بندھے گا اور جو لوگ حق و باطل کی کش مکش سے کترائیں
و حق کے پلڑے میں اپنے فکر و عمل کا وزن نہ ڈالیں وہ خسران میں مبتلا ہوں گے ۔ چنانچہ سورۂ حج آیت ۱۱
ع ۲ میں فرمایا ۔ " اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ کی بندگی کنارے پر کرتے ہیں ۔ پس اگر ان کو
فائدہ پہنچ جاتا ہے تو مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی آزمائش آ گئی تو اُلٹے پھر جاتے ہیں ۔ اُسے (انہیں)
دنیا اور آخرت دونوں میں خسارہ رہا اور یہ کھلا ہوا خسران ہے ۔

آخرت کی میزان میں بے وزن لوگ خسران میں رہیں گے ۔

گراموفون کا ریکارڈ انسانی دماغ کی ایجاد ہے جس میں انسانی آواز محفوظ ہو جاتی ہے اور مشین میں
چابی بھر کر مسالے کی گھومتی ہوئی پلیٹ پر سوئی رکھنے سے آواز عود کر آتی ہے مگر انسانی دماغ کے موجد نے

دنیا کی ہر شے میں ایک ایسی قوت جاذبہ بھردی ہے جو انسان کے کارناموں اور کرتوت کو اچھے اور برے اعمال کو جذب کرلیتی ہے اور اللہ کے حکم کی سوئی جب بھی ان پر رکھی جائے گی، دنیا کی ساری چیزیں انسان کے جسم کا رونگٹا رونگٹا، انسان کا لباس، فرنیچر، دیوار و در غرض کہ ہر چیز بول اٹھے گی کہ اس نے یہ کام، یہ حرکت اور یہ سکون فلاں وقت، فلاں جگہ "اچھا" یا "برا" کیا تھا۔ زندگی کے اس ریکارڈ پر جو انسان سے متعلق دنیا کی ہر چیز پر ثبت ہو رہا ہے اور فرشتے جو رپورٹ تیار کر رہے ہیں اور انسان اپنے فکر و عمل کے قلم سے جو اپنی ڈائری مرتب کر رہا ہے۔ اسی ریکارڈ، رپورٹ اور ڈائری کے ذریعے آخرت کی میزان عمل کے پلڑے بھاری یا ہلکے ہوں گے جن کے پلڑے وزنی ہوں گے وہ کامراں، شاداں اور فرحاں ہوں گے اور جن کے ہلکے ہوں گے وہ خسران میں مبتلا ہوں گے۔ چنانچہ سورۂ المومنون آیت ۱۰۳ ع ۶ میں فرمایا۔ اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے پس یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے کو خسارے میں مبتلا کرلیا جو جہنم میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔

مخلصانہ بندگی اور مسلمانہ زندگی سے گریز خسران کا باعث ہے۔

چند شرطیں ہیں جن کے وجود سے کامرانی اور فلاح و بہبود سے وابستہ ہے اور جن کے عدم سے خسران کا روگ لگا ہوا ہے۔

۱۔ اللہ اور صرف اللہ کی پوجا اور پرستش کرنا۔

۲۔ اللہ اور صرف اللہ کی بندگی و غلامی کرنا۔

۳۔ اللہ اور صرف اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کرنا الا یہ کہ کسی کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے تحت ہی ہو۔

۴۔ اس پوجا و پرستش، اس بندگی و غلامی اور اس اطاعت و فرماں برداری میں مخلص ہونا۔

۵۔ مسلمانہ روش اختیار کرنا۔ یعنی زندگی کے ہر فکر و خیال میں اور ہر عملی حرکت و سکون میں خواہ وہ پرائیوٹ زندگی سے متعلق ہو یا پبلک لائف سے انفرادی اور نجی زندگی سے تعلق رکھتا ہو، یا بین الاقوامی مسائل اور معاملات سے معاشرت اور معیشت سے متعلق ہو یا سیاست و جہاں بانی سے، بہرحال زندگی کے ہر پہلو، ہر شعبہ اور ہر میدان میں بندگی اور اطاعت و فرماں برداری کی روش اختیار کرنا۔

۶۔ اللہ کی نافرمانی سے (زندگی کے ہر شعبے میں) اس طرح ڈرنا اور بچنا جیسے آگ سے خوف کھانا۔

۷۔ اللہ کی عبادت (زندگی کے ہر شعبے میں) اور دین کو اس کے لیے خالص کرنے میں آدمی اس قدر پختہ ہو، اس کا ایمان اس قدر راسخ ہو، اسے قرآنی نظریہ کائنات اور رویہ زندگی پر اس قدر اطمینانِ قلب ہو کہ وہ اس سلسلے میں کسی کو خطرے میں لاتا ہی نہ ہو۔ دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے لیکن وہ اپنی جگہ ثابت قدم رہے۔

ان شرطوں کے وجود سے جنت اور ان کے عدم اور فقدان سے دوزخ اور خسران وابستہ ہے۔ چنانچہ سورۂ زمر آیت ۱۵ ع ۲ میں فرمایا۔ "یقیناً خسران میں رہنے والے ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو قیامت کے دن خسارے میں مبتلا کر لیا۔ آگاہ یہی کھلا خسران ہے۔

شیطان کی پارٹی خسران سے دوچار ہوگی۔

جن افراد اور اقوام پر شیطان حاوی ہو جائے جو اسے اپنا رہبر اور پیشوا بنالیں، ایسے لوگ حزب الشیطان (شیطان کی پارٹی) میں شامل ہو گئے لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کس طرح معلوم کیا جائے کہ فلاں شخص اور قوم پر شیطان حاوی ہو گیا ہے اور اس نے اسے اپنا رہبر اور پیشوا بنا لیا ہے۔

انسان کی زبان، اس کا دل، دماغ اور عمل یہ چار معیار ہیں جن پر کسی قوم اور فرد کو پرکھا جا سکتا ہے کہ اس پر شیطان مسلط ہے یا کائنات اور انسان کے خالق، مالک اور حاکم کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات کے اقرار کا اس کی عظمت و محبت کا غلبہ اور تسلط ہے۔ یہ معیارات اربعہ جس طرح کسی فرد کے لیے معیار ہیں اسی طرح کسی قوم اور جماعت کے لیے بھی معیار ہیں۔ فرد کی طرح قوم کی بھی زبان ہوتی ہے جس سے وہ بولتی ہے دماغ ہوتا ہے جس سے وہ سوچتی ہے، دل ہوتا ہے جس میں رد و قبول کی صلاحیت ہوتی اور جذبات موجزن ہوتے ہیں، ہاتھ اور پیر ہوتے ہیں جن سے وہ معاملات زندگی میں حصہ لیتی ہے۔

۱۔ کسی فرد اور قوم کی زبان اگر اللہ کی یاد میں ڈوبی رہتی ہے وہ فرد یا قوم ذکر الٰہی میں رطب اللسان ہے، رات دن اور صبح و شام اللہ اور اس کی صفات کا چرچا اس کا مشغلہ ہے تو سمجھو کہ شیطان اس پر مسلط نہیں ہے ۲۔ کسی فرد اور قوم کے دل میں اگر خدا کا خوف اور اس کی خشیت طاری ہے وہ آخرت کا زندہ تصور رکھتی ہے۔ ہر وقت اور ہر کام میں خدا کی گرفت کا خیال اسے ستاتا رہتا ہے۔ غرض کہ وہ خدا سے ترساں اور لرزاں رہتی ہے تو سمجھو کہ شیطان اس پر مسلط نہیں ہے۔

۴۔ کسی فرد اور قوم کی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد نجی معاملات، قومی و ملکی مسائل اور بین الاقوا...
سیاست و تجارت اگر ان حدود کی پابند ہے جو اللہ اور اس کے رسول ؐ نے قائم کر دی ہیں تو سمجھو کہ شیطا...
اس پر مسلط نہیں ہے۔

اور اگر کوئی فرد اور قوم اپنی زبان اپنے دل، اپنے دماغ اور اپنے عمل کے میدان میں اللہ اور...
کے رسول ؐ کی قائم کردہ حدود کی پابند نہیں ہے۔ تو سمجھو کہ شیطان اس پر مسلط ہے۔ اور جن لوگوں پر شیطا...
مسلط ہو وہ ہمیشہ ہمیش کے خسران میں مبتلا ہو کر رہیں گے چنانچہ سورہ مجادلہ آیت ۱۹ ع ۳ میں فرمایا
" قابو یافتہ ہو گیا ہے ان پر شیطان، پس غافل کر دیا ہے ان کو اللہ کی یاد سے۔ (ذکر لسانی، ذکر قلبی...
ذکر فکری اور ذکر عملی سے) یہی لوگ شیطان کی پارٹی ہیں۔ آگاہ! یقیناً شیطان کی پارٹی کے لوگ خ...
میں مبتلا رہنے والے ہیں۔

اللہ سے غفلت کی زندگی گزارنے والے خسران سے دوچار ہوں گے۔

برائیوں کی جڑ اور بدیوں کی ماں اگر کوئی شے ہے، بس کی گانٹھ اور زہر کی پڑیا اگر کوئی چیز ہے
وہ حبِ دنیا ہے۔ یہ کبھی افکار و خیال کی گمراہیوں کی شکل میں کبھی اخلاق و کردار کی بداطواریوں کی...
کبھی معاشرت و معیشت کی بے راہ رویوں کی ہیئت میں اور کبھی سیاست و اجتماعیت کی بے انصافیو...
بے اعتدالیوں اور ستمرانیوں کے روپ میں نمایاں ہوتی ہے۔ انسان کی فطری صلاحیتوں اور طبعی قوتو...
کو جب آپ کجراہیوں کا شکار پائیں تو اس کے پس منظر میں حب دنیا کو ضرور پائیں گے ——— اس زہر...
کا اگر کوئی تریاق اور ساری عمر سے بچانے والا اگر کوئی آب حیات ہے تو وہ صرف اللہ کی یاد ہے۔ زب...
دل اور دماغ و عمل کے ذریعہ یاد سمع و بصر اور فؤاد کی قوتوں کے ذریعہ یاد ظاہری اور باطنی حواس کے ذ...
یاد ــ غرض کہ اللہ کی جامع اور کامل یاد ہی اس حب دنیا کا کاٹ کر سکتی اور اس کا زور توڑ سکتی ہے۔
جو فرد یا قوم حبِ دنیا میں مبتلا اور ذکر الٰہی سے غافل ہو ایسے لوگ یقیناً خسران میں مبتلا ہوں گے۔ چنانچ...
سورۃ المنافقون آیت ۹ ع ۲ میں فرمایا :۔ " اے ایمان والو! غفلت میں مبتلا نہ کر دیں، تمہیں تمہارے...
اور اولاد، اللہ کی یاد سے، اور جو (فرد یا قوم) ایسا کر بیٹھے پس وہی لوگ خسران میں رہنے والے ہیں۔
اور اگلی آیت میں اس کا علاج یہ تجویز کیا گیا کہ جو کچھ اللہ نے تمہیں بخشا ہے اسے زیادہ سے زیادہ اللہ کی را...
میں خرچ کیا کرو۔ یادِ الٰہی سے غفلت اور حبِ دنیا دونوں کا علاج انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

قومیں خدا اور رسول سے منہ موڑ کر دنیا میں بھی خسران سے دوچار ہوتی ہیں

ابتدائے آفرینش سے آج تک کی قوموں پر نگاہ دوڑا جائیے اور اجتماعیت کو فلاح و بہبود سے ہم کنار کرنے والے انبیاء علیہم کے پیش کردہ اصولوں کو بھی اپنی نگاہ میں رکھیے۔ اس تقابلی مطالعہ سے واضح طور پر یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ دنیا کی قوموں نے جب بھی انبیائی اصول پر اپنی اجتماعیت کی تعمیر کی تو وہ ہمیشہ فلاح و بہبود سے ہم کنار ہوئیں اور جب انھوں نے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے برخلاف قلم و تلوار سے یا تو کام لینا چھوڑ دیا یا غلط کام لینا شروع کر دیا۔ قوائے ذہنیہ اور قوائے عملیہ کو زنگ آلود کر لیا یا غلط رخ پر ڈال دیا۔ بناؤ کے بجائے بگاڑ کی راہ پر چلنا شروع کر دیا۔ شمشیر و سناں کے بجائے طاؤس و رباب میں مشغول ہو گئیں تو وہ ہمیشہ خسران سے دوچار ہوئیں، تباہ و برباد ہو گئیں ایسی مٹیں کہ ان کا نام و نشان تک نہ رہا۔

افراد تو خدا کی نافرمانی کا شکار ہو کر بھی اس دنیا میں بظاہر کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن قومیں خدا سے بے نیاز ہو کر اس دنیا میں بھی انجام کار تباہی و بربادی سے دوچار ہوتی ہیں چنانچہ سورہ الطلاق آیت ۸ تا ۹ میں فرمایا۔ "اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی روش اختیار کی پس ہم نے ان کا سخت حساب لیا (سخت پکڑا) اور ہم نے اُن کو ان دیکھا عذاب دیا پس انھوں نے اپنی (غلط روی) کا وبال چکھا اور وہ انجام کار خسران سے دوچار ہوئیں۔

دنیا اور آخرت کے خسران سے کس طرح نجات مل سکتی ہے

ایک اور صرف ایک نسخہ شفاء ہے جس کو استعمال کر کے انسانی افراد اور قومیں دنیا اور آخرت کے خسران سے نجات پا سکتی ہیں۔ اس نسخے کے چار اجزاء ہیں۔

۱۔ ان تمام بنیادی حقیقتوں کو تسلیم کرنا جو کائنات اور انسان کے آغاز، انجام اور حیات کے متعلق تمام انبیاء علیہم السلام تمام آسمانی کتابوں اور اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آخری کتاب نے پیش کی ہیں یعنی ایمان لانا۔

۲۔ صرف زبانی اقرار، قلبی اذعان اور دماغی اطمینان کافی نہیں بلکہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تفصیل میں ایمان کے مطابق روش اختیار کرنا بھی ضروری ہے یعنی عمل صالح پر کاربند ہونا۔

۳۔ صرف اپنی اپنی زندگی کو احکام الٰہی اور سنت نبوی کے مطابق ڈھال لینا بھی کافی نہیں اور نہ

اس میں کامیابی ممکن ہے جب تک انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اصلاح کرنے اور سیاسیہ کے سدھارنے اور ایمان وعمل صالح کی بنیاد پر اجتماعیت کو استوار کرنے کی جد وجہد نہ کی جائے اقامتِ دین کے لیے سعی پیہم اور دعوت وتبلیغ کے بغیر انفرادی اصلاح کافی نہیں ہے، بلکہ تواصی بالحق بھی ضروری ہے۔

۴۔ ایمان وعمل صالح کی بنیاد پر چلنے اور دعوت وتبلیغ کرنے اور اقامت دین کی جد وجہد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس راہ کی تمام دشواریوں، تمام رکاوٹوں اور جان ومال کی تمام بربادیوں کو انگیز کرنے اور صبر واستقامت کے ساتھ راہ حق پر گامزن رہنے کا ثبوت نہ دیا جائے۔

غرض کہ ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر یہ وہ نسخہ ہے جس پر کاربند ہو کر ہر قوم اور ہر فرد بلکہ پوری انسانیت دنیا اور آخرت کے خسران سے نجات پا سکتی ہے۔ چنانچہ سورۂ عصر اس کی شاہد ہے۔

(ختم)

شرائطِ ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم پانچ رسائل پر دی جائے گی۔

۲۔ رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں۔ اگر فروخت نہ ہوئے تو واپس نہیں لیے جائیں گے۔

۳۔ کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔ البتہ پچاس یا زائد رسالوں کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی

۴۔ رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری یا وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔

۵۔ رقم ہر حال میں پیشگی آنی چاہیے۔ یا پھر وی پی بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی کے مصارف زیادہ ہوں گے۔

منیجر رسالہ زندگی رام پور

حج

(قسط ۲)

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

حج کی اہمیت

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آل عمران ۹۷)

اور جس کسی نے کفر کی روش اختیار کی تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ خدا تمام جہان والوں سے بے نیاز ہے۔

یعنی جو لوگ استطاعت کے باوجود اس حکم کی پیروی نہ کریں، اور کفر و انکار کی روش اختیار کریں ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ بے نیازی اور بے زاری کا اظہار فرماتا ہے، اور جس سے اللہ تعالیٰ خود بے زاری اور بے نیازی کا اظہار فرمائے اس سے زیادہ تباہ حال اور محروم اور کون ہوگا۔ حج کی اسی اہمیت کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

"جس شخص کو کسی بیماری نے، یا کسی واقعی ضرورت نے، یا کسی ظالم و جابر حکمراں نے نہ روک رکھا ہو، اور پھر بھی وہ حج نہ کرے تو چاہے وہ یہودی مر کر چاہے نصرانی۔"

حج کی برکتیں

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (الحج ۲۷-۲۸)

اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دو کہ وہ آپ کے پاس دور دراز مقامات سے پا پیادہ اور دبلے اونٹوں پر سوار آئیں تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں

"تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو ان کے لیے رکھے گئے ہیں"۔ یہ بڑا ہی جامع انداز بیان ہے۔ بلاشبہ حج کے حقیقی فائدے تو دینی اور اخروی فائدے ہی ہیں ——— اور یہی حج کی جان ہیں لیکن اس فقرے میں دینی فائدوں کے ساتھ ساتھ دنیوی فائدوں کی طرف بھی اشارہ ہے۔ مکے کی بے آب و گیاہ وادی میں

اپنی اولاد کو بساتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے جناب باری میں دعا فرمائی تھی۔

"خدایا! تو لوگوں کے دلوں کو (اشتیاق وعقیدت سے) ان کی طرف مائل کردے اور ان کو ہر طرح کے پھل عنایت فرما تاکہ یہ تیرے شکر گزار بن کر رہیں۔"

اسلام سے پہلے بھی بنی اسمٰعیل اس دعا کی بدولت بیت اللہ کی برکتوں سے مالامال تھے اور اسلام کے بعد تو ان میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ حج کے مہینے پورے عرب کے لیے خیر و برکت کے مہینے ہوتے تھے ان مہینوں میں پورا عرب امن کا گہوارہ بن جاتا تھا۔ تجارتی قافلے پورے اطمینان کے ساتھ تجارتی سفر کرتے ——— حج کے لیے دور دراز سے آنے والے مختلف قبیلے یہاں سے اتحاد و یگانگت اور الفت و محبت کے جذبات لے کر لوٹتے۔ غرض کہ عرب قومیت کے جذبات ابھارنے اور وحدت قائم رکھنے کا بہت بڑا ذریعہ تھا، اسی کی بدولت نہیں اپنے خیالات معلومات اور تمدن کے طور طریقوں کی اشاعت کے مواقع ملتے ——— اور یہ زائرین ہر طرف اپنے لیے دنیا کی نعمتیں اور عقیدت و محبت کے جذبات پاتے۔

اسلام چونکہ ایک عالمی مذہب ہے، اور پوری دنیا کو خدا پرستی کے مرکز پر جمع کرنا چاہتا ہے اس لیے حج کے یہ فوائد اور برکتیں بھی انتہائی وسیع ہوگئیں اور اب حج سارے جہاں کے خدا پرستوں میں دینی روح اور توحید کا ولولہ پیدا کرنے اور ان میں وحدت و الفت کے جذبات ابھارنے کا ایک بے مثال ذریعہ ہے۔ دنیا کے چپے چپے سے لاکھوں توحید کے پروانے ہر سال یہاں آکر جمع ہوتے ہیں اور کم از کم حج کے ایام میں تو پوری دنیا توحید کی صداؤں سے گونج اٹھتی ہے۔ اس "عالمی نشر گاہ" سے ہر سال پوری قوت کے ساتھ توحید کا پیغام نشر ہوتا اور پورے عالم انسانی میں پہنچتا ہے۔ بیت اللہ کی زیارت کرنے والے نہ صرف اپنی دنیا اور عاقبت سنوارتے ہیں، بلکہ وہ دنیا میں دین حق کا چرچا کرنے اور توحید کی آواز بلند کرنے کا بھی ذریعہ بنتے ہیں ——— اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا مہمان کہا ہے اور وہ سب کچھ دینے کا وعدہ فرمایا ہے جو یہ مانگیں بلکہ وہ عظیم نعمت دینے کا وعدہ فرمایا ہے جس سے زیادہ کی تمنا نہیں کی جاسکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"حج اور عمرے کے لیے جانے والے اللہ تعالیٰ کے خصوصی مہمان ہیں۔ وہ اللہ سے دعا کریں تو وہ قبول فرماتا ہے۔ اور مغفرت چاہیں تو بخش دیتا ہے۔"

ایک اور موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا۔

حج مبرور کا صلہ تو جنت سے کم ہے ہی نہیں۔[1]

مساوات کا بے مثال مظاہرہ

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَاءَنِ الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ

اور مسجد حرام جس کو ہم نے پورے عالم انسانی کے لیے (مرکز) بنایا ہے جس میں مقامی لوگ اور باہر کے لوگ سب برابر ہیں۔

بیت اللہ کے گرد ہر سال یہ لاکھوں انسانوں کا عظیم الشان اجتماع عالمی مساوات کا ایک بے مثال مظاہرہ ہے کہ روئے زمین پر کہیں اور اس کی نظیر نہیں مل سکتی ـــــ زمین کے دور دراز گوشوں اور مختلف سرد و گرم ملکوں سے جمع ہونے والے یہ انسان مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں، کوئی کالا ہے کوئی گورا، کوئی کمزور ہے کوئی طاقتور، کوئی امیر ہے کوئی غریب ان کی صورتیں مختلف ان کی سیرتیں جدا، لیکن توحید کی وحدت نے ان کے سارے اختلاف مٹا دیے ہیں، سارے امتیازات کھو دیے ہیں۔ کلمہ توحید نے سب کو ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔ ہزار امتیازات کے باوجود سب ایک ہی در کے گدا ہیں، ایک ہی شمع کے پروانے ہیں، سب ایک ہی لباس میں ملبوس اور سب کی زبان پر ایک ہی صدا ہے۔ خدایا ہم تیری رضا کے لیے تیری جناب میں حاضر ہیں۔ ہم سب تیری حمد کرنے والے اور تیرے شکر گزار ہیں۔ ہر نماز کے بعد، ہر قافلے سے ملتے وقت، ہر بلندی پر چڑھتے وقت بس یہی ایک صدا سب کی زبان پر ہے اور سب اپنے گھروں سے دور بیت اللہ کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔

حج کے آداب

آداب حج سے مراد وہ اہم باتیں ہیں جن کے بغیر کوئی حج درحقیقت حج ہی نہیں۔ جس حج میں ان باتوں کا اہتمام نہ کیا گیا ہو، قرآن کی نظر میں اس کی حیثیت ایک سفر سے زیادہ کچھ نہیں، اس لیے وہ تاکید کرتا ہے کہ خدا کے گھر کا حج کرنے والا ان آداب کا پورا پورا لحاظ رکھے اور اس طرح وہ اپنے حج کو حقیقی تزکیہ قلب اور مکمل روحانی انقلاب کا ذریعہ بنائے۔

۱۔ نیت کا اخلاص

وَلَا آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا (المائدہ ۲)

اور نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم کی طرف جا رہے ہوں۔

یوں تو ہر عمل کے عمل صالح ہونے کا انحصار اس حقیقت پر ہے کہ وہ محض خدا کی خوشنودی کے

---

[1] حج مبرور وہ ہے جو پاک نیت اور پورے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کیا گیا ہو۔ [2] مسلم، کتاب الحج

لیے ہو اور اس کے سوا اس میں کسی دوسری خواہش کا ہلکا سا آمیزہ بھی نہ ہو کیونکہ نفسانیت کی ایک ہلکی سی لاگ بھی بڑی سے بڑی نیکی کو تلپٹ کرکے رکھ دیتی ہے لیکن خاص طور پر حج میں اس کا اور بھی زیادہ دھیان رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ یہ روحانی انقلاب اور تزکیہ قلب کی ایک آخری تدبیر ہے اور جو روحانی مریض اس علاج سے بھی شفایاب نہ ہوں پھر کسی دوسرے علاج سے ان کی شفایابی کی امید بہت ہی کم رہ جاتی ہے۔

۲۔ فلاحِ دارین کی تمنا

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

(البقرہ ۲۰۰ — ۲۰۲)

پھر بعض لوگ تو ایسے ہیں جو کہتے ہیں۔ خدایا! ہمیں جو کچھ دینا ہے اسی دنیا میں دے دے۔ ایسے (دنیا کے پجاری) لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اور بعض لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ ایسے لوگ اپنی کمائی (اور تمنا) کے مطابق (دونوں جگہ) حصہ پائیں گے اور اللہ کو حساب چکانے کچھ دیر نہیں لگتی۔

درحقیقت حج اسی کا ہے، جو آخرت میں خدا سے اجر و انعام کا طالب ہو، اور وہ شخص جس کے دل میں آخرت کے اجر و انعام کی کوئی تمنا ہی نہ ہو، جو صرف دنیا ہی بنانا چاہتا ہو، تو ایسے دنیا پرست کا حج خدا کی نظر میں کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ مومن تو فلاح دارین کی تمنا لیے ہوئے "خدا کے گھر" پہنچتا ہے، اور یہ آرزو لیے ہوئے پہنچتا ہے کہ آگ کے عذاب سے نجات پا جائے۔

۳۔ خدا کی یاد

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (البقرہ ۲۰۳)

اور اللہ کی یاد میں مشغول رہو گنتی کے ان چند دنوں میں۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاۗءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۝ (البقرہ ۲۰۰)

پھر جب تم حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو جس طرح پہلے اپنے آباء و اجداد کا ذکر کرتے تھے اسی طرح اب اللہ کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر

حج کے تمام ارکان کا حقیقی مقصود یہی ہے کہ خدا کا بندہ خدا کی یاد میں ڈوبا رہے اور اس کی یاد میں ان چند دنوں میں اس طرح اس کے دل میں رچ بس جائے کہ پھر زندگی کی ہماہمی میں کوئی چیز اسے خدا سے غافل نہ کر سکے۔ جاہلیت کے دور میں لوگ ارکان حج ادا کرنے کے بعد اپنے باپ دادا کی بڑائیاں بیان کرتے اور ڈینگیں مارتے۔ ہدایت دی گئی کہ اب ان دنوں خدا کی یاد میں بسر کرو۔ بڑائی اسی کے لیے سزاوار ہے جو واقعی بڑا ہے اور یہ تمام عبادتیں اسی لیے ہیں کہ اس کی بڑائی تمہارے دل و دماغ میں بس جائے پس اسی کے ذکر میں ڈوبے رہو۔

۴۔ بہترین زادِ راہ لو

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (البقرۃ: ۱۹۷)

اور سفرِ حج کے لیے زادِ راہ ساتھ لو۔ اور سب سے بہتر زادِ راہ خدا کا تقویٰ ہے۔ اور اے ہوش مندو! میرا تقویٰ اختیار کرو۔

اسلام سے پہلے لوگ حج کے لیے سرو سامان کے ساتھ نکلنے کو معیوب سمجھتے تھے اور حج کے لیے فقیرانہ شان کے ساتھ نکلنا ضروری خیال کرتے تھے۔ قرآن نے اس خیال کی تردید کے ساتھ ساتھ یہ صحیح نقطۂ نظر دیا کہ اصل چیز جو حج کو خدا کی نظر میں مقبول بناتی ہے وہ خدا کا تقویٰ ہے۔ اگر یہ زادِ راہ ساتھ ہے تو آدمی ہر حال میں خدا کی نافرمانی سے بچے گا اور وہ سب کچھ حاصل کرے گا جس کے لیے خدا نے اس گھر کی زیارت کو فرض قرار دیا ہے۔ پس ہوشمندی کی بات یہ ہے کہ خدا کا خوف دل میں بسا ہوا ہو۔

۵۔ شعائر اللہ کا احترام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا (المائدۃ - ۲)

اور اے مومنو! خدا پرستی کی ان نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو۔ نہ حرمت کے مہینوں کی بے حرمتی کرو۔ نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو۔ نہ ان جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذرِ خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں اور نہ ان لوگوں کی راہ میں کاوٹیں ڈالو جو اپنے پروردگار کے فضل کی تلاش اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکانِ محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہوں۔

کسی روحانی اور معنوی حقیقت کو محسوس کرانے اور یاد دلانے کے لیے جو چیز مقرر کی گئی ہو اسے شعیرہ کہتے ہیں شعائر اسی کی جمع ہے ـــــ حج کے سلسلے کی تمام ہی چیزیں خدا پرستی کی کسی نہ کسی حقیقت کو یاد دلانے اور محسوس کرانے کے لیے مقرر کی گئی ہیں اور خدا پرستوں کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ ان کا احترام کریں' حج کی ایک ایک چیز محترم ہے' حج کا مہینہ محترم' حج کے مقامات محترم' قربانی کے جانور محترم' حالتِ احرام کی پابندیاں محترم ـــــ یوں تو مومن سے پوری زندگی میں یہ مطالبہ ہے کہ وہ خدائی شریعت کی پابندیوں کا احترام کرے' لیکن اس احساس کو حج کے ان ایام میں اور زیادہ تیز اور نازک بنا دیا جاتا ہے' کیونکہ یہ زبردست تربیت کا زمانہ ہوتا ہے۔ حد یہ کہ اس زمانے میں یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی حالت احرام میں بال بنوائے یا ناخن ترشوائے۔

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج ۳۲)

اور جو خدا پرستی کی ان نشانیوں کا احترام کرے جو خدا نے مقرر کی ہیں تو یہ دلوں کے تقوے کی بات ہے۔

یعنی خدا پرستی کی ان نشانیوں کا احترام اس بات کا ثبوت ہے کہ دل میں خدا کا تقویٰ موجود ہے جو تمام اعمال خیر کی بنیاد ہے۔

وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (الحج ۳۰)

اور جو کوئی اللہ کی قائم کی ہوئی حرمتوں کا پاس و لحاظ رکھے تو یہ اس کے رب کے ہاں بڑی بہتری ہے۔

۶۔ ارکانِ حج کی حقیقت کا علم

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ○ (البقرۃ ۱۹۸)

اور خدا کو یاد کرو جس طرح یاد کرنے کی اس نے تمہیں ہدایت فرمائی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ اس سے پہلے ان حقیقتوں سے بھٹکے ہوئے تھے۔

حج کے سلسلے کی تمام ہی چیزیں خدا پرستی کی کسی نہ کسی اہم حقیقت کو محسوس کرانے اور یاد دلانے کے لیے ہیں۔ اس لیے محض سرسری طور پر حج کے ارکان کا ادا کر لینا یا حج کے مقامات پر پہنچ جانا ہی کافی نہیں ہے' بلکہ خدا کے یہ مقرر کردہ شعائر جن حقیقتوں کی یاد تازہ کرتی ہیں ان سے واقف ہونا اور

...کو جذب کرنے کا جذبہ ہونا بھی ناگزیر ہے ورنہ ایسے بے جان حج سے کسی عظیم روحانی انقلاب کی توقع بے سود ہے۔

شہوانی باتوں سے اجتناب اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ (البقرۃ ۱۹۷) حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں۔ جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں شہوانی باتیں نہ ہوں

حج کا قصد کرتے ہی جن باتوں سے سختی کے ساتھ اجتناب کرنا چاہیے ان میں رفث یعنی شہوانی باتوں کا سب سے پہلے ذکر کیا گیا۔ اول تو سفر کے دوران اس کے محرکات بھی بہت سے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور پھر یہ قوت سب سے بھی انتہائی پُرزور۔ اگر آدمی ذرا بھی خود کو ڈھیلا چھوڑ دے تو دل و نگاہ کی آلودگی میں تو ملوث ہو ہی سکتا ہے۔ اسی فقرے کی رو سے نہ صرف یہ کہ میاں بیوی کا خصوصی تعلق ممنوع ہے بلکہ ان کے درمیان کوئی ایسی بات چیت بھی نہ ہونی چاہیے جو شہوانی رغبت پر مبنی ہو اور آزادروی کا تو سوال ہی کیا!

نافرمانی سے بچنا وَلَا فُسُوْقَ اور نہ خدا کی نافرمانی کی باتیں ہوں۔

خدا کی نافرمانی سے تو بہر حال مومن کو بچنا ہی چاہیے لیکن حج کے ایام میں یہ احساس اور زیادہ تیز ہو جانا چاہیے۔ گناہ تو بہر حال برا ہے لیکن حج کے پاکیزہ سفر اور پاک فضا میں اس کی برائی اور بڑھ جاتی ہے۔

لڑائی جھگڑے سے پرہیز وَلَا جِدَالَ اور نہ لڑائی جھگڑے کی باتیں ہوں۔

حج کے سفر میں چونکہ بڑا ازدحام ہوتا ہے۔ اور قدم قدم پر ایک دوسرے کا مفاد ٹکراتا ہے اس لیے اس کا خصوصی اہتمام ہونا چاہیے حتیٰ کہ خادم کو ڈانٹنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

حج کے احکام حج کا طریقہ اور تفصیلی احکام تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے معلوم ہوں گے۔ البتہ قرآن حکیم نے اصولی رہنمائی کے لیے کچھ اصولی احکام بیان فرمائے ہیں

حج کے مہینے اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (البقرۃ ۱۹۷) حج کے چند مہینے ہیں جو سب کو معلوم ہیں۔

یعنی جن مہینوں میں حج کی تیاری کی جاتی ہے اور حج کا احرام باندھا جا سکتا ہے وہ وہی چند مہینے ہیں جو پہلے سے سب کو معلوم ہیں[1]

---

[1] یعنی شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس ابتدائی دن

حج سے رکنا پڑے تو قربانی دو

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (البقرۃ ۱۹۶)

اور جب حج اور عمرے کی نیت کرلی جائے تو خدا کی خوشنودی کے لیے اسے پورا کرنا چاہیے ہاں اگر کسی وجہ سے تم راستے میں گھر جاؤ تو پھر جو قربانی میسر آئے خدا کی جناب میں پیش کرو

یعنی اگر کسی کو راستے میں رکنا پڑ جائے اور حج کے لیے آگے بڑھنا ناممکن ہو تو اسے اپنی نیت بہرحال احرام کرنا چاہیے اور اپنی طرف سے قربانی کا جانور یا اس کی قیمت بھیج دینی چاہیے تاکہ اس طرف سے قربانی کردی جائے۔ قربانی کے لیے وقت پر اونٹ گائے، بکری جو بھی بسہولت میسر آسکے یا کی قیمت بھی بھیج سکے بھیج دے۔

قربانی سے پہلے حجامت نہ بنواؤ

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ (البقرہ ۱۹۶)

اور سر کے بال اس وقت تک نہ منڈواؤ جب تک کہ قربانی کا جانور اپنے ٹھکانے پر نہ پہنچ جائے۔

یعنی جو شخص واقعی خدا کی خوشنودی کے لیے اپنے گھر سے بیت اللہ کی زیارت کے لیے نکل کھڑا ہوا اور پھر کسی واقعی عذر کی بنا پر اسے مجبوراً رک جانا پڑا ہے۔ تو اس کو چاہیے کہ وہ اس وقت تک احرام اور حج کی کیفیت طاری رکھے جب تک کہ اس کا بھیجا ہوا جانور قربان گاہ تک نہ پہنچ جائے اور جب اسے یقین ہو جائے کہ اس کا جانور قربان ہوگیا ہوگا اور خدا کے گھر کے زائرین اب احرام کھول کر حجامت بنوا رہے ہوں گے، اسی وقت وہ بھی حجامت بنوالے۔

معذور فدیہ دے

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (البقرۃ ۱۹۶)

ہاں جو شخص بیمار ہو، یا اسے سر کی کسی تکلیف کی وجہ سے معذوری ہو، تو اسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے، یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

یعنی اگر کسی واقعی معذوری کی بنا پر کوئی شخص پہلے ہی بال اُتروا دے اور اس کا انتظار نہ کرے کہ جانور قربان گاہ تک پہنچے تو اسے فدیہ دینا چاہیے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو یا تو تین دن کے روزے رکھنے چاہییں یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دینا چاہیے اور [illegible]

کرنا چاہیے۔

سفرِ حج میں عمرہ کرنا

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذٰلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرۃ ۱۹۶)

پس جو شخص حج کے وقت تک عمرے کا فائدہ اٹھانا چاہے تو وہ اپنے مقدور کے مطابق قربانی کرے اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے ایامِ حج میں اور سات روزے گھر پہنچ کر اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یہ رعایت ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر بار مسجدِ حرام کے قریب نہ ہوں۔

حج کے سفر ہی میں عمرہ کرنے کی اجازت دراصل ایک رعایت ہے جو مکے سے باہر رہنے والوں کو دی گئی ہے۔ جاہلیت کے دور میں لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں ادا کرنا سخت گناہ ہے۔ قرآن نے اس باطل خیال کی تردید فرمائی اور حج کے سفر میں عمرہ کرنے کی اجازت کی وضاحت فرمائی۔

سفرِ حج کے دوران تجارت

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ (البقرۃ ۱۹۸)

اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم حج کے ساتھ ساتھ اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو۔

فضل تلاش کرنے سے مراد کسبِ معاش کے لیے دوڑ دھوپ کرنا ہے۔ جاہلیت کے دور میں لوگ سفرِ حج کے دوران روزی حاصل کرنے کے لیے کچھ کرنے کو گناہ خیال کرتے تھے۔ قرآن نے اس خیال باطل کی بھی تردید کی اور سفرِ حج کے دوران روزی کے لیے دوڑ دھوپ کو "فضل رب کی تلاش" قرار دیا۔

خانہ کعبہ کا طواف

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (الحج ۲۹)

اور چاہیے کہ پرانے گھر (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔

خانہ کعبہ کا طواف ارکانِ حج میں سے ہے اور یہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو کیا جاتا ہے۔ اس طواف سے ہی حج کی تکمیل ہوتی ہے اور اس کو طوافِ زیارت کہتے ہیں۔

مزدلفہ میں قیام

فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ

پھر جب عرفات سے لوٹو تو مشعرِ حرام

عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝

(مزدلفہ) کے پاس ٹھیر کر اللہ کو یاد کرو۔ اور اسی طرح یاد کرو جس کی ہدایت خدا نے تمہیں بخشی ہے ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے

عرفات جانا

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (البقرہ ۱۹۹)

پھر تم (اہلِ مکہ) بھی وہیں سے پلٹو جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں۔ اور اللہ سے معافی چاہو۔ بلاشبہ خدا معاف فرمانے والا اور بہت زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔

اسلام سے پہلے قریش اور ان کے قبیلے اس غرور میں مبتلا ہو گئے تھے کہ عام اہلِ عرب کی طرح مزدلفہ سے عرفات جانا ہماری شان سے گری ہوئی بات ہے۔ ہمارا امتیاز یہ ہے کہ ہم حدودِ حرم سے باہر عام لوگوں کی طرح نہ نکلیں۔ قرآن نے ان کے غرور کو توڑا اور قیامت تک کے لیے مساوات کا یہ اصول قائم فرمایا کہ خدا کی بندگی میں کسی کو کوئی امتیاز نہیں سب اس کے بندے ہیں اور بندگی کے آداب سب کے لیے یکساں ہیں۔

منیٰ میں قیام

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (البقرہ ۲۰۳)

اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے ان چند دنوں میں، پھر جو کوئی (منیٰ سے) واپسی میں جلدی کرے اور دو ہی دن میں پلٹ آئے۔ تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں۔ اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھیر کر پلٹے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ یہ دن اس نے تقوے کے ساتھ بسر کیے ہوں ــــ اور بچو اللہ کی نافرمانی سے۔ اور یقین رکھو کہ ایک دن اس کے حضور تم سب کو پیش ہونا ہے

گنتی کے ان چند دنوں سے ذوالحجہ کی گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں تاریخ مراد ہے ان دنوں میں حج سے فراغت کے بعد منیٰ میں قیام کیا جاتا ہے۔ منیٰ میں قیام چاہے دو دن کیا جائے یا تین دن مطلب مقصود یہ ہے کہ یہ دن اللہ کی یاد میں بسر ہوں۔

صفا اور مروہ کے درمیان سعی

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا

بلاشبہ صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں پس جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے، کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے۔

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا بھی مناسکِ حج میں سے ہے —— زمانۂ جاہلیت میں لوگوں نے ان دونوں پہاڑیوں پر دو بت نصب کر دیے اور بعد میں یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ سعی دراصل ان دونوں بتوں کا طواف ہے —— اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ شاید صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا تو ایام جاہلیت کا اضافہ ہے ان مناسکِ حج سے اس کا تعلق نہیں جو حضرت ابراہیم کو سکھائے گئے تھے۔ قرآن نے اس غلط فہمی کو دور کیا اور بتایا کہ ہمیشہ کی طرح اب بھی صفا اور مروہ کی سعی خدا پرستی کے اعمال ہیں۔ تم بلا کھٹکے طواف کرو۔

حالتِ احرام میں شکار

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ۔

اور جب حالت احرام میں ہو تو شکار کرنا حلال نہ سمجھو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (المائدہ ۹۵)

اے ایمان والو! حالت احرام میں شکار نہ مارو۔

بیت اللہ کی زیارت کے لیے جو فقیرانہ لباس پہنا جاتا ہے اس کو احرام کہتے ہیں۔ کعبہ کے گرد کئی کئی منزل کے فاصلے پر کچھ حدیں مقرر کر دی گئی ہیں انہیں میقات کہتے ہیں۔ ان حدوں سے آگے بڑھنا اسی وقت جائز ہے جب آدمی اپنے سارے کپڑے اتار کر صرف دو چادریں باندھ اور اوڑھ لے۔ اس کو احرام کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لباس پہننے کے بعد آدمی پر بہت سی باتیں حرام ہو جاتی ہیں۔ زینت و آرائش کرنا، خوشبو لگانا، حجامت بنوانا، شہوانی ضرورت پوری کرنا اور اسی طرح شکار مارنا حتیٰ کہ شکار کا پتہ بتانا بھی ممنوع ہو جاتا ہے۔

خدا کی خوشنودی کے لیے عمرہ کرو

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (البقرہ ۱۹۶)

اور جب خدا کی خوشنودی کے لیے حج یا عمرے کی نیت کر تو اسے پورا کرو۔

حج کے مقررہ دنوں کے علاوہ دوسرے دنوں میں بیت اللہ کی جو زیارت (باقی صفحہ ۲۲ پر)

تصنیف آرنلڈ ٹائن
ترجمہ:- عبدالمغنی ایم۔اے

اتحادِ عالم اور زاویۂ تاریخ میں تبدیلی

آرنلڈ جے ٹائن بی عصر حاضر کا سب سے بڑا مورخ ہے۔ تاریخ کی دنیا میں اس کا وہی مقام ہے جو سائنس کی دنیا میں آئن سٹائن کا ہے۔ ٹائن بی نے تاریخ عالم کے مطالعے کا ایک نیا انداز پیش کیا ہے جو انقلابی ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت حکیمانہ اور صالح ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تاریخ کو انسان کے ذہن و روح کی تمام حرکات کا آئینہ سمجھتا ہے اور اس لیے اس کے مطالعے کے لیے اب تک میسر ہونے والے تمام علوم انسانی کے استعمال کو ضروری خیال کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے تاریخی مطالعات میں جغرافیہ، عمرانیات، معاشیات اور سائنس کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور مذہبیات، فلسفہ اور ادبیات وغیرہ کا بھرپور استعمال ملتا ہے۔ اس طرح ٹائن بی انسانی زندگی کا مطالعہ ایک ناقابل تقسیم کل کی طرح کرتا ہے اور اس کا مطمح نظر محض واقعات کی تفتیش سے زیادہ اقدار کی جستجو ہے۔ اس کے علاوہ عیسائی ہونے کے باوجود ٹائن بی ایک وسیع النظر اور غیر جانب دار مورخ ہے۔ یہ جامعیت حقیقت پسندی اور دیانت داری ٹائن بی کو دوسرے مغربی مورخوں سے قطعی ممتاز کر دیتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مغرب کا عظیم ترین مورخ ہے۔ ٹائن بی کی انشا بھی بڑی زوردار اور دلکش ہے۔ اس کا انداز بیان، بلکہ مطالعے اور پیش کش کا پورا انداز اکثر اوقات نری مورخانہ واقعات نگاری سے اوپر اٹھ کر مصلحانہ بصیرت و حلاوت کا حامل ہو جاتا ہے۔ شاید وہ آج کی بے بصر انسانیت کے سامنے تاریخ کے سیکھے ہوئے سبق رکھ کر اسے جھنجھوڑنا چاہتا ہے۔ ٹائن بی کا عرفان حق جو تاریخی وجدان کی شکل میں رونما ہوا ہے اسے حاضر تمدن کی جانب سے بہت اندیشہ ناک بنا دیتا ہے اور وہ جوش اور زور کے ساتھ لوگوں کو ماضی کے تجربوں کی روشنی میں موجودہ و آیندہ خطرات سے متنبہ کر دینا چاہتا ہے۔ وہ لوگوں کے سامنے فلاح کے کچھ مثبت اصول بھی رکھتا ہے، کم از کم تعمیر کے بنیادی نکتوں کی طرف اشارہ کر دیتا ہے — پیغام

ٹائن بی کے مجموعۂ مقالات "تہذیب دور آزمائش میں" (سیویلائزیشن آن ٹرائل) سے لیا گیا ہے۔ (مترجم)

مانوسیت تخیل کے لیے افیون ہے' اور چونکہ ہر مغربی لڑکا جانتا ہے کہ قریب چار صدیوں قبل مغربی ملاحوں کے کیے ہوئے سمندری سفر عہد آفریں تاریخی واقعات تھے' لہٰذا بالغ مغربی اذہان بھی ان کے نتائج کو بس مان کر چھوڑ دینے کی طرف مائل ہیں۔ چنانچہ مغربی سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے اگر میں بتاؤں کہ ہمارے سمندر گرد اجداد کی مہمات کے اثرات کتنے ڈرامائی اور انقلابی ہوئے ہیں تو اس کے لیے مجھے کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے اس سے کم کوئی بات نہیں کی کہ دنیا کے نقشے کو پورے طور پر بدل دیا ۔ بے شک طبعی نقشہ نہیں بلکہ انسانی خاکہ ہمارے سیارے کے اس حصۂ سطح کا جس پر انسانیت بستی اور چلتی ہے ۔

آدمی کے گرد و پیش میں مغرب کی لائی ہوئی یہ تبدیلی میرا پہلا موضوع ہوگا۔ پھر یہی موضوع دوسرے دو موضوعات کی طرف رہنمائی کرے گا۔ اتنی بڑی خارجی تبدیلیاں بالعموم لوگوں کے رویے میں مطابق تغیرات برپا کرتی ہیں اور واقعی جب ہم اپنے گرد و پیش نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کے ان اکتشافی سفروں کے اثرات نے ـــــــ حالانکہ تاریخ کی میزان وقت میں یہ سفر بالکل حال کے ہیں ـــــــ نوع انسانی کی بہت بڑی اکثریت کے درمیان زاویۂ تاریخ میں پہلے ہی زبردست تبدیلی پیدا کردی ہے ۔ یہ میرا دوسرا موضوع ہوگا' بلکہ یہی ایک قول محال کی تشریح کرنے سے ایک تیسرے موضوع کو بھی سامنے آئے گا۔ نوع انسان کی جو اکثریت اس وقت میرے ذہن میں ہے وہ بلاشبہ غیر مغربی ہے' اور قول محال یہ ہے کہ آج کی دنیا میں ہم صرف مغربی ہی وہ لوگ ہیں جن کا تاریخی زاویۂ نظر ہنوز واسکوڈی گاما کے عہد سے قبل کے دور میں ٹکا ہوا ہے ۔ ذاتی طور پر مجھے یقین نہیں کہ مغربیوں کا طوفان نوح سے قبل والا یہ روایتی زاویۂ تاریخ زیادہ دنوں برقرار رہے گا۔ مجھے ذرا شک نہیں کہ مستقبل قریب میں اب ہماری باری ہے ایک نیا ذہنی رخ اختیار کرنے کی' اور یہ رخ' جیسا میں خیال کرتا ہوں' مشرق کی جانب ہوگا۔ لیکن ہم تاریخ کا انتظار کیوں کریں کہ وہ اٹھارویں صدی کے کسی جرمن ڈرل سارجنٹ کی طرح ہماری گردن پکڑ کر ہمارے سروں کو سیدھا کردے ؟ اگرچہ ہمارے پڑوسی حال ہی میں اس ناگوار اور تحقیر آمیز طریق پر تعلیم دیے گئے ہیں۔ ہمیں ان سے بہتر کرنا چاہیے' اس لیے کہ ہم یہ عذر نہیں کرسکتے کہ یہ بات اچانک ہمارے سامنے آگئی' جو واقعی پڑوسیوں کے ساتھ ہوا حقائق ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

دیکھ رہے ہیں، اور اپنے تاریخی تصور کو کام میں لاکر شاید ہم اس لازمی تعلیم کو پہلے ہی اختیار کر سکے ہیں جو بہرحال ہماری سمت چلی آرہی ہے۔ یونان کا قلندر فلسفی کلینتھیس زیوس اور فیٹ سے دعا کرتا ہے کہ وہ اس کے ارادے کے اقدام پر اپنی رحمت نازل کریں تاکہ اس میں کمی نہ آئے (کیوں کہ اگر میں پیچھے ہٹتا اور روگردانی بھی کرتا ہوں تو بھی مجھے وہی کچھ کرنا پڑے گا۔

اب ذرا طبعی نقشے میں مذکورہ انقلابی تغیر کو حافظے میں لاکر ہمیں اپنے موضوع پر محو گفتگو ہوجانا چاہیے سبھی جانتے ہیں کہ نوع انسانی کو، انسانی وجوہ سے ہمیشہ یہ خطرہ لاحق ہے کہ وہ معاصر واقعات کی تاریخی اہمیت میں مبالغہ کرے، اس لیے کہ جس خاص نسل کو ان واقعات سے سابقہ ہوتا ہے اس کے لیے ان کی اہمیت بالکل شخصی ہوجاتی ہے۔ پھر بھی میں اس قیاس کا خطرہ مول لوں گا کہ جب ہمارے عہد کو بہت پیچھے چھوڑ کر مستقبل کے مورخ کی چشم تصور سے دیکھا جائے گا تو جس واقعہ عظیم پر ہم اس وقت گفتگو کر رہے ہیں وہ ایک قلۂ کوہ کی طرح ماضی کے افق پر ابھرا نظر آئے گا۔ ہمارے عہد سے میری مراد گزشتہ پانچ چھ ہزار برس ہیں جن کے اندر انسانیت کم از کم پچھلے چھ سو ہزار برس سے زندگی گزارتے رہنے کے بعد سماجی و اخلاقی کمال کی اس حقیر سطح تک پہنچی جس کو ہم 'تمدن' کہتے ہیں۔ میں نقشے میں موجودہ تبدیلی کو 'معاصر' کہتا ہوں۔ کیونکہ وہ چار پانچ صدیاں جن کے دوران یہ تغیر ہوتا رہا ہے۔ ماہرین ارضیات و فلکیات کی دریافت کی ہوئی میزان وقت میں چشم زدن سے زیادہ نہیں۔ اور جب میں اپنے سامنے اس زاویے کی تصویر کشی کر رہا ہوں جس میں گزشتہ چند ہزار برس کے واقعات مستقبل کے مورخوں کو نظر آئیں گے تو میں آج سے ۲۰۰۰۰ یا ۱۰۰۰۰۰ برس بعد آنے والے مورخوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں — یہ تعیین کرکے کہ ہمارے جدید مغربی سائنس دانوں کے مطابق اس سیارے پر زندگی قریب آٹھ سو ملین برسوں سے رہی ہے اور یہ کم از کم اتنے ہی برسوں تک اور رہے گی (ہاں مگر یہ کہ مغربی انسان کی نابالغانہ مکمل معلومات قصہ ہی مختصر کردے) اگر وہ دعوی جو اپنے موضوع کی تاریخی اہمیت کے متعلق میں کر رہا ہوں مبالغہ آمیز معلوم ہو تو آئیے ذرا ہم یاد کرلیں کہ دنیا کے نقشے میں یہ تبدیلی کتنا غیر معمولی واقعہ ہوگیا ہے۔ میرے خیال میں اس کے دو پہلو ہیں جن میں دوسرا زیادہ سنسنی خیز ہے۔ سب سے پہلے قریب ۱۵۰۰ء سے (اپنے محدود مغربی عہد کے الفاظ میں بات کرتے ہوئے) انسانیت ایک واحد عالمی معاشرے میں سمٹ آئی ہے۔ آغاز تاریخ سے اس وقت تک انسان کا زمینی گھر بہت سے الگ الگ قطعوں میں بٹا ہوا تھا۔ تقریباً ۱۵۰۰ء سے نسل انسانی ایک

…کے پیچھے چلی آتی ہے۔ یہ واقعہ ہدایتِ الٰہی کے تحت انسانی عمل سے انجام پذیر ہوا ہے، اور یہاں
…یک حقیقی سنسنی خیز نقطے پر پہنچ جاتے ہیں۔ انسان کے معاملات میں اس انقلابی تغیر کا حامل اُن مقامی معاشروں
…سے کوئی بھی ہو سکتا تھا جو اس انقلاب کی ابتدا کے وقت نقشۂ عالم پر موجود تھے لیکن وہ خاص مقامی
…شرہ جس نے واقعی اس کام کو کر ڈالا اس کے لیے ناممکن ترین امیدوار تھا۔

اپنے وطنی مغربی موقف سے بلند ہو جائے اور اس سوال پر ایک مرکزی نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالنے کے
…یں نے اپنے آپ سے سوال کیا، اس وقت جب مغرب کی چند جہاز راں کمپنیوں نے اتحادِ عالم کی مہم
…وع کی، معروف غیر مغربیوں کے درمیان سب سے مرکزی مقام میں اور سب سے ذہین مشاہد کون
…سکتا ہے؟ مجھے جواب دو۔ یہ شخص شہنشاہ بابر ہے۔ بابر پانچویں نسل میں اس تیمور لنگ کی اولاد تھا۔
…ن نے ایک مرکزی مقام سے اپنی بری مہمات کے ذریعہ اتحادِ عالم کی آخری کوشش کی تھی۔ بابر کے حینِ حیات
— ۱۴۸۳ء۔ ۱۵۳۰ء — اسپین سے کولمبس بذریعہ سمندر امریکہ اور پرتگال سے واسکوڈی گاما ہندستان
…نچا۔ بابر نے اپنی عملی زندگی کا آغاز جکسارتیس کی اوپری وادی میں حاکمِ فرغنہ کی حیثیت سے کیا۔ یہ ایک
…ہوٹا سا خطہ ہے جو دوسری صدی قبل مسیح سے ایک قسم کا مرکز رہا ہے۔ بابر نے ہندستان پر خشکی کے راستے
…سے حملہ کیا۔ جبکہ اکیس سال پیشتر واسکوڈی گاما وہاں بحری راستے سے پہنچ چکا تھا۔ سب سے آخری اور بڑی
…ت یہ کہ بابر ایک اہلِ قلم تھا مادری زبان ترکی میں لکھی ہوئی اس کی شان دار خود نوشت سوانح عمری نمایاں
…ہانت اور فہم کا انکشاف کرتی ہے۔

بابر کا افق کیا تھا؟ فرغنہ کے مشرق میں ہندستان اور چین مغرب میں خود بابر کے بعید رشتے دار
…مالی ترک تک۔ بابر نے فوجی معاملات میں عثمانیوں سے سبق لیا اور اسلامی حدود کی توسیع میں اُن
…ی مدافعتی اور بہادری کی تحسین کی۔ وہ ان کو 'غازیانِ روم' کا خطاب دیتا ہے۔ یعنی وہ خوش نصیب
…باہد جنھوں نے مشرقی عیسائیت کے گھر کو فتح کرنے میں کامیابی حاصل کی جب کہ اگلے عرب مسلمان اس میں
…کام ہو چکے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ بابر نے اپنی یادداشتوں میں کہیں مغربی عیسائیت کا ذکر کیا ہے، نہ اس کا
…لیے مجھے مسز بیوریج کے کیے ہوئے عمدہ انگریزی ترجمے کے اشارات میں کہیں ملا۔ بلاشبہ بابر فرانکوں کی
…ستی سے باخبر تھا۔ اس لیے کہ وہ ایک تربیت یافتہ شخص اور اسلامی تاریخ سے واقف تھا۔ اگر اسے
…ن کے ذکر کا موقع ملتا تو غالباً وہ انھیں تند خو اور شوریدہ سر کافر بتاتا جو برِ اعظم ایشیا کے بہت سارے

جزیرہ نما ؤں میں ایک کے انتہائی مغربی سرے پہ رہتے ہیں۔ وہ یہ بھی بیان کرتا کہ اس کے زمانے سے تقریباً
چار سو برس قبل ان وحشیوں نے اپنے تنگ اور ناگوار گوشے سے نکل کر روم اور دار الاسلام کے زرخیز اور
مال دار تر علاقوں میں در آنے کی شیطانی کوشش کی۔ تہذیب کے مقدر کے لیے یہ ایک نازک لمحہ تھا
لیکن صلاح الدین نے ان وحشیوں کو مار بھگایا' پھر ان کی فوجی شکستوں پر مستزاد ان کی زبردست اخلاقی
ہزیمت ہوئی' جب اپنے مستقبل کے مالکوں کے انتخاب میں روم کے عیسائیوں نے پوپ کی ٹوپی کو
چھوڑ کر پیغمبرِ اسلام کی دستار کو اختیار کر لیا اور اس طرح قلمروِ عثمانی کے سایۂ عاطفت میں آ گئے۔

بابر کے حملہ ہند (۱۵۱۹ء) کے کئی برس قبل ۱۴۹۸ء میں ہندوستان میں فرنگی جہازوں کی آمد
طرف بابر کوئی توجہ دیتا نظر نہیں آتا۔ بجز اس کے کہ اس کے سکوت کی توجیہ ناقص سے ناواقفیت کی
بجائے اس بات سے کی جائے کہ ان سمندری خانہ بدوشوں کی سرگشتیاں ایک مورخ کے التفات کے
قابل نہیں معلوم ہوئیں۔ اس طرح یہ ذہین صاحب قلم اور صاحب سیف افریقہ میں پرتگالی جہاز رانیوں کے
مفہوم سے نابلد تھا؟ وہ اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکا کہ ان سمندر گرد فرانکوں نے گھوم کر اسلام کو عقب سے
گرفت میں لے لیا تھا؟ ہاں مجھے یقین ہے کہ اگر بابر کو کہا جاتا کہ جس سلطنت کی وہ ہندستان میں بنیاد ڈال
رہا ہے وہ جلد ہی اس کے ورثا کے ہاتھوں سے نکل کر فرانکوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی تو اسے انتہائی
حیرت ہوتی۔ اُسے اس تبدیلی کا خدشہ بھی نہیں تھا جو اس کی اور ہماری نسل کے درمیان روئے زمین پر
رونما ہونے والی تھی۔ لیکن میں مانتا ہوں کہ یہ بے خبری بابر کی ذہانت کے متعلق کوئی بدگمانی نہیں پیدا کرتی
بلکہ ہمارے عہد کی تاریخ عالم میں مذکورہ واقعۂ عظیم کی طرفگی کا ایک اور ثبوت ہے۔

فی الواقع ۱۵۰۰ء سے دنیا کا نقشہ اتنا بدل گیا ہے کہ پہچان میں نہیں آتا۔ اس تاریخ تک نقشۂ
تمدنوں سے مرکب تھا جو قدیم دنیا پر شمال مشرق میں جاپانی جزیروں سے شمال مغرب میں برطانوی
جزیروں تک محیط تھے یعنی جاپان' چین' ہند چینی' انڈونیشیا' ہندستان' دار الاسلام' روم کی کرسچینیٹی اور
مغربی مسیحیت۔ گرچہ یہ دائرہ بیچ میں معتدل منطقہ شمالی سے خطِ استوا تک جگہ جگہ ٹوٹ سا جاتا ہے
ان میں آب و ہوا اور طبعی ماحول کے وسیع سلسلے ہیں مگر مذکور معاشروں کی سماجی ساخت اور ثقافتی
کردار نمایاں طور پر یکساں ہیں۔ ان میں ہر معاشرے کے اندر کسانوں کی اکثریت تھی جو بالکل اسی
حال میں زندگی بسر اور کام کر رہے تھے جو قریب چھ آٹھ ہزار برس قبل ان کے آبا و اجداد کے تھے

[illegible] جب کہ زراعت کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ حاکموں کی ایک چھوٹی سی اقلیت تھی جو طاقت کی اجارہ دار تھی اور دولت، فراغت علم اور ہنر کی فراوانی سے لطف اندوز تھی اور یہ خصوصیات اس کی طاقت کو اور بڑھا رہی تھیں۔ قدیم دنیا میں اس قماش کی ایک دو تمدنی نسلیں پہلے بھی رہ چکی تھیں ۱۵۰۰ء میں ان کی کچھ باقی تھی جبکہ دوسری سب بھلائی جا چکی تھیں (اس کے بعد جدید مغربی ماہرین آثار قدیمہ انہیں روشنی میں لائے) جدید دنیا میں بھی اس وقت اسی قماش کی دو تمدنی نسلیں زندہ تھیں جو قدیم دنیا کے لیے تو نامعلوم تھیں ہی، ایک دوسری کو بھی شاید ہی جانتی ہوں۔ قدیم دنیا کے زندہ تمدن ایک دوسرے سے ربط رکھتے تھے۔ اگرچہ اتنا قریبی نہیں کہ ایک معاشرے کے رکن ہو جائیں، یا رکن ہونے کی طرح محسوس کریں۔

ان کا ربط جیسا کچھ بھی تھا ۱۵۰۰ء تک حمل ونقل کے دو مختلف راستوں سے قائم و جاری رہا۔ ایک راستہ بحری تھا جسے بعد کے مغربی طلبہ کوب تک جزیرہ نمائی و مشرقی دخانی کمپنی کے راستے کے نام سے جانیں گے۔ [illegible]ء میں بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ہمارے ایک چچیرے دادا کے زمانے میں (جو میرے بچپن کی ایک زندہ یاد ہے) جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک مسافر بردار جہاز کے کماں دار تھے اور اپنے بحری فرائض سے نہر سوئز کی کھدائی سے ذرا قبل سبک دوش ہوئے، اس بحری راستے کو میڈیٹرینین اور بحر احمر پھر میڈیٹرینین اور خلیج فارس کے درمیان پیدا ہونے والے ایک راستے نے توڑ دیا۔ میڈیٹرینین اور اس بحری راستے کے جاپانی حصوں میں حمل ونقل کا بازار اکثر گرم رہا، اور قریب سنہ ۱۲[illegible] ق م سے بحری مہم کی ایک لہر جو اسکندریہ کے ان یونانی ملاحوں نے چلائی تھی جو لنکا تک پہنچ گئے تھے۔ انڈونیشیا ہوتی ہوئی مشرقی سمت میں بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ اس نے پولینیزی کشتیوں کو اسیٹرلینڈ تک پہنچا دیا۔ اگرچہ یہ ماقبل مغرب ملاح مہم جو اور رواں پسند تھے، لیکن ان کا کھولا ہوا آبی راستہ تمدنوں کے درمیان ارتباط کے ایک ثانوی راستے سے زیادہ اہمیت کبھی نہیں حاصل کر سکا۔ خاص راستہ میدانوں اور ریگستانوں کے اسی سلسلے کا رہا جو صحارا سے منگولیا تک تمدنوں کو اپنے لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔

انسانی مقاصد کے لیے یہ میدان اندرون زمین سمندر کی طرح تھے جو خشک ہونے کی بدولت انسانی روابط کے لیے پندرھویں صدی مسیحی کے خاتمے سے قبل کے سمندروں سے زیادہ کارآمد تھے۔ یہ بے آب سمندر اپنے خشک پوش جہاز اور بے گودی کے بندرگاہ بھی رکھتے تھے۔ میدانی سفینے اونٹ تھے اور میدانی کشتیاں گھوڑے اور میدانی بندرگاہ کارواں سرائے — چھوٹی بندرگاہیں ریگستان میں بکھرے ہوئے

ب جزیروں کی اور بڑی بندرگاہیں ان ساحلوں پر جہاں ریگ کی لہریں ختم ہو جاتیں۔ جیسے پٹرا، پامیرا
اور سائز تیمور لنگ کا سمرقند اور دیوار عظیم کے دروازوں پر چین کے نخاس۔ میدان طے کرنے والے
بے، نہ کہ سمندر پار کرنے والے جہاز، نقل و حرکت کے وہ خاص ذرائع تھے جن کے ذریعے پندرھویں
، سے قبل کی دنیا کے علیحدہ تمدن کبھی کبھی ایک دوسرے سے ربط پیدا کر لیتے تھے۔

اس وقت کی دنیا میں، جیسا آپ دیکھتے ہیں، بابر کا فرغنہ مرکزی مقام اور بابر کے زمانے کے تُرک مرکزی
ے۔ ہمارے زمانۂ حیات میں بھی ترکوں کو مرکزی مقام دے کر ایک تاریخ عالم شائع کی گئی ہے جس کی
دار مغرب نواز عثمانی ترکوں کے عظیم سلسلے کی وہ آخری کڑی ہے جس کو دنیا مصطفیٰ کمال کے نام سے
ہے۔ اپنے ہم وطنوں کی اخلاقی حالت کی درستگی کے لیے یہ ایک شان دار منصوبہ بلکہ صحیح تاریخی وجدان کا
م بالشان معرکہ تھا اس لیے کہ مسیحی دَور کی چوتھی صدی سے، جب کہ انھوں نے اپنے آخری ہندیورپی
کو میدانوں سے پرے دھکیل دیا، سترھویں صدی تک جب روم، ایران اور ہندوستان میں عثمانی، صفوی
ری ترکی خاندانوں کا زوال ہوا ــــــ ترکی بولنے والی قومیں ہی فی الواقع اس محراب ایشیا کا بنیادی پتھر
، سے ما قبل تا سکوڈی گاما کے تمدن آویزاں تھے۔ ان بارہ سو برسوں کے دوران، جدا جدا تمدنوں کے
، ربط کا بڑی راستہ ترکوں کے قبضے میں تھا، اور ما قبل گاما دنیا میں اپنے اس مرکزی مقام سے یہ ترک
، و مغرب اور جنوب و شمال کی سرزمینوں مثلاً منچوریا، الجیریا، یوکرین اور دکن کی جانب فتح کا جھنڈا
نکل کھڑے ہوئے۔

لیکن اب ہم انقلاب عظیم کا ذکر کرتے ہیں، یعنی حرفتی انقلاب جس کے باعث مغرب کی قسمت چمک گئی
زندہ تمدنوں پر حاوی ہو گیا اور زبردستی انہیں عالم گیر سلسلے کی ایک واحد سوسائٹی میں متحد کر دیا۔ مغرب
نقلابی ایجاد یہ تھی کہ اس نے عالمی نقل و حمل کا اعلیٰ ترین ذریعہ میدان کی بجائے سمندر کو بنا دیا۔ پہلے
پھر دخانی سفینوں کے ذریعے سمندر کے اس استعمال نے مغرب کو اس قابل بنا دیا کہ وہ تمام آباد اد
دی دنیا کو بشمول امریکہ متحد کر دے۔ بابر کا فرغنہ ایک ایسی دنیا کا مرکزی نقطہ تھا جو خشک میدانوں میں
ی تگ و تاز سے متحد ہوئی تھی، لیکن بابر کی زندگی میں مرکز عالم نے اچانک ایک بڑی چھلانگ لگائی
ے قلب سے اُچھل کر یہ مرکز اپنے انتہائی مغربی سرے پر چلا گیا اور سیول اور لسبن کے گرد چکر لگانے

مرکزِ عالم کو لندن سے نیو یارک کی جانب کھسکتے ہوئے دیکھا ہے لیکن تالاب کے دو رو والے کنارے مرکز سے اور بھی بعید مقام پر یہ منتقلی ایک محض مقامی حرکت ہے جس کے حجم کا مقابلہ اس چھلانگ سے نہیں کیا جا سکتا۔ جو بابر کے زمانے میں مرکزی ایشیا کی میدانی بندر گاہوں سے اطلانتک کی سمندری بندر گاہوں تک لگائی گئی۔ وہ بڑی چھلانگ خود حرکتی کے ذرائع میں اچانک انقلاب کے باعث سرزد ہوئی۔ میدانی بندر گاہیں بے کار ہو گئیں جب سمندر میں چلنے والے سفینوں نے اونٹوں اور گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اور اب کہ ہماری نگاہوں کے سامنے سمندر میں تیرنے والی دخانی کشتیاں ہوائی جہازوں کے مقابل پس ماندہ ہوتی جا رہی ہیں۔ ہم اپنے آپ سے سوال کر سکتے ہیں: ایک بار پھر تو نہیں مرکزِ عالم چھلانگ لگانے جا رہا ہے —— اور اتنے ہی سنسنی خیز طور پر جیسے سولھویں صدی میں —— ایک ایسے حرفتی انقلاب کے زیرِ تحریک جو کم از کم اتنا ہی بنیادی ہے جتنا سولھویں صدی میں واسکوڈی گاما کی کشتی کا بابر کے گھوڑے (تیموچن) کی جگہ لینا ہو گفتگو ختم کرنے سے قبل میں اس امکان پر پھر بحث کروں گا۔ اس بیچ میں قبل اس کے کہ ہم بابر کے بری نقشہ عالم کو لپیٹ کر اس بحری نقشے کو پھیلادیں جو بابر کے زمانے سے اب تک میدان میں قائم رہا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ان علاحدہ تمدنوں کی حاضری لے لیں جن کے درمیان بابر کے عہد تک نسل انسانی بٹی ہوئی تھی، اور پھر مختصراً ان سے ان کے تاریخی زاویہ نظر کے بارے میں سوال کریں۔

وہ یکسانی جو یہ علیحدہ تمدن اپنے ثقافتی کردار اور سماجی ساخت میں بروئے اظہار لاتے ہیں ان کے تاریخی زاویہ نگاہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ ان میں ہر ایک کو یقین تھا کہ وہ دنیا میں ایک ہی متمدن معاشرہ تھا اور یہ کہ باقی بنی نوع انسان وحشی اچھوت اور بد دین تھے۔ اس خیال پر رہنے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ما قبل گاما چھ تمدنوں میں کم از کم پانچ غلطی پر تھے، اور منطقی نتیجہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان میں کوئی بھی صحیح نہ تھا بلاشبہ مغالطے کی تمام مختلف صورتیں مغالطہ ہی ہوتی ہیں لیکن یہ ممکن ہے کہ سب کی سب یکساں ہولناک ہوں۔ "قوم منتخب" کے احمقانہ تخیل کی ان نصف درجن باہم حریف و متخالف تعبیرات کا مطالعہ عبرت انگیز

چینیوں کے لیے روئے زمین پران کا علاقہ ہی "زیرِ فلک سب کچھ" اور ان کے بادشاہ کے زیرِ نگیں خطہ "سلطنت وسطی" تھا۔ اسی نقطہ نظر کی بہ یقین ترجمانی اس مشہور جواب میں پائی جاتی ہے جو شہنشاہ اعظم چی این لنگ (ش ۱۷۹۵-۱۷۳۵ء) نے برطانیہ عظمیٰ کے شاہ جارج سوم کے اس خط کا دیا تھا جس میں تجویز کیا گیا کہ دونوں فرماں روا ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی و تجارتی تعلقات قائم کریں۔

"جہاں تک تمہاری اس التجا کا تعلق ہے کہ تمہاری قوم کا ایک فرد میرے فردوسی دربار میں حاضر ہو کر چین کے ساتھ تمہارے ملک کی تجارت کا نظم کرے، تو یہ درخواست میرے خاندان کی رسوم کے بالکل خلاف پڑتی ہے۔ ہماری رسوم اور ضابطہ، قوانین تمہاری رسوم اور ضابطے سے اتنے مکمل طور پر مختلف ہیں کہ اگر تمہارا سفیر کسی طرح ہمارے تمدن کے مبادیات سیکھ بھی لے سکے، تو یہ ممکن نہیں کہ تم ہمارے آداب و طرائق کو اپنی اجنبی سرزمین میں رواج دے سکو...... ایک وسیع دنیا پر فرماں روائی کرتے ہوئے میرے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد ہے،

وہ یہ کہ کامل فرماں روائی کو برقرار رکھوں

اور ریاست کے فرائض انجام دوں...... میں اجنبی یا حرفتی اشیا کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا، اور تمہارے ملک کی مصنوعات کی کوئی ضرورت نہیں رکھتا۔

(چاینا اینڈ فارن پاورز: سرِاِن وہائٹ ۱۹۲۷ء)

اگر وحشی سفیر لارڈ میکارٹنی نے اس بے ڈھب بات کا بھی اظہار کیا ہوتا کہ ان کا بادشاہ کبھی کبھی ہوش و حواس کھو دیتا ہے تو شہنشاہ چین کو ذرا حیرت نہ ہوتی۔ اس لیے کہ کوئی صحیح الدماغ وحشی شہزادہ فرزندِ آسمانی کو اس طرح خطاب کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا گویا وہ اس کے مساوی ہو۔ اور وہ لہجہ جو برطانوی مراسلے کو مرتب کرنے والوں نے انتہائی معصومیت میں اختیار کیا تھا۔ وہ تو ضرور ہی اس تاریخ کی روشنی میں نہایت بیہودہ نظر آتا جو چی این لنگ اور اس کے مصاحبوں کو معلوم تھی۔

چین لنگ نے خود ہی تاریخ بنائی تھی جب اس نے یوریشیائی میدان کے وحشی خانہ بدوشوں کو تابع فرمان کیا اور اس طرح "ریگستان" اور "بوئے" کے درمیان اس مناقشے کو ختم کر دیا جو گزشتہ تیرہ ہزار سال سے انسانی تاریخ کی جالی کا ایک خاص دھاگا تھا۔ "فرزندِ آسمانی" نے یہ تاریخی مہم عملاً تن تنہا انجام دی۔ اس اعزاز میں دوسرا فریق جو کسی حصے کا دعوے دار ہو سکتا تھا وہ سینز ر ماسکو تھا۔ جنوبی سمندر کے وحشی (جیسا کہ چینی مغرب کے ان بحری خانہ بدوشوں کو کہتے تھے جو مغرب کی طرف سے چین کے جنوبی ساحل پر آپہنچے تھے) چین کے جامد تمدن کے لیے اس فتح عظیم میں کوئی حصہ نہیں رکھتے تھے۔ لیکن جنگ آزما اور مدبر چی این لنگ کے یہ ذاتی کمالات اس تابانی میں شاید ہی اضافہ کر سکے جو "فرزندِ آسمانی" کے منصب کی بدولت اسے حاصل تھی۔ اس کے زیر فرمان سلطنت موجود سیاسی اداروں میں سب سے قدیم، سب سے کامیاب اور

سب سے کریمانہ تھی تیسری صدی قبل مسیح میں اس سلطنت کی تشکیل نے ایک متمدن دنیا کو ایک متمدن حکومت عطا کی جس کی نوکر شاہی کے کارندے مقابلے کی بنیاد پر بحال کیے جاتے اور بہت ہی تربیت یافتہ ہوتے تھے اور اس بین الاقوامی طوائف الملوکی کو ختم کر دیا جس میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے موروثی جاگیرداروں کی پیہم باہمی جنگوں نے انسانیت کو تباہ کر دیا تھا۔ درمیان کی بیس صدیوں کے دوران بڑی احتیاط سے مرتب کیا ہوا یہ عالمی امن کبھی کبھی برہم بھی ہوا' لیکن یہ برہمی ہمیشہ عارضی رہی اور عہد چی این لنگ کے خاتمے پر 'سلطنت وسطیٰ' کا تازہ ترین احیا اپنے شباب پر تھا۔ اس سیاسی صندوق نے ایک ذہنی خزانے کو محفوظ کر رکھا تھا۔ یعنی ان مکاتب فلسفہ کی دریافتیں جنہوں نے مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات کے بنیادی سوالات کے تمام ممکن جوابوں کی جستجو کر ڈالی تھی۔ اور سلطنت وسطیٰ کے فرزندوں نے ثابت کر دیا تھا کہ پیدائشی ذہانت اور تدبر کے ساتھ ہی ساتھ وہ وسعت نظر کے بھی حامل ہیں۔ جب انھوں نے ایک عظیم غیر ملکی مذہب ہندستانی بدھ مت (مہایانا) کو اختیار کر لیا تاکہ ان روحانی ضروریات کا سامان کریں جن کی تکمیل ان کا لادینی تمدن اپنے وسائل سے نہ کر سکے۔

تاریخ کی وہ سحر انگیز صدا جس نے پیکنگ میں فرزند آسمانی کو اس زعم میں مبتلا کیا تھا کہ اصل تمدن کا نمائندہ وہ ہے' وہی ۱۷۹۳ء میں اس کے مثیل سیزر ماسکو کو بھی فریب دے رہی تھی وہ بھی ایک ایسی عالمی سلطنت کی جدید ترین ہیئت مقدسہ کا حاکم تھا جو کبھی گری تو تھی لیکن پھر ہمیشہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ آفاقی امن جس کا آغاز ٹائیبر کے کناروں پر روم اول سے آگسٹس نے کیا تھا اس کی تجدید قسطنطین نے باسفورس کے کناروں پر روم ثانی کے گرد وپیش کیا اور جب قسطنطنیائی سلطنت ساتویں' گیارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں تین بار گرنے اور اٹھنے کے بعد بالآخر ۱۴۵۳ء میں 'بے دین' ترکوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تو اقتدار ایک تیسرے روم ماسکو کو منتقل ہو گیا جس کے دائرۂ اختیار کی کوئی حد نہ تھی۔ (جیسا کہ تمام دین دار اہالیان ماسکو کا ایمان تھا!) روسی سلطنت عالم کے ماسکوئی وارث نے روم کے یونانی اسلاف کے ثقافتی کمالات بھی ورثے میں پائے۔ اتنا ہی نہیں' وہ خدا کی جانب سے منتخب کیا ہوا اس عظیم غیر ملکی عقیدے عیسائیت کا حامی بھی تھا جسے یونان وروم کے بت پرستوں نے اپنے روحانی نقائص کی تلافی کے لیے اختیار کر لیا تھا۔ اس طرح سیزر روس بیک وقت یونان وروم اور مسیح اور مسیح کے واسطے خدا کی منتخب کردہ قوم اسرائیل کا وارث تھا۔ ماسکوئیت کا لقب اہل ماسکو کی نگاہ میں اتنا ہی فیصلہ کن تھا جتنا منفرد۔

اگر زار کا دعویٰ فرزند آسمانی کی اطلاع میں آتا تو شاید وہ اس کے ساتھ قدرے نرمی کا برتا
کرتا۔ نقشۂ عالم پر یگانہ انقلاب کے تقریباً پندرہ صدیوں پیشتر چین کی اولین سلطنت نے میدا
کے بے آب سمندر میں ایک پرخطر سفر تفتیش انجام دیا تھا اور روم کی سلطنتِ اولیٰ کی سرحدوں پر پہ
گئی تھی تو چین کے ریگستانی ملاحوں نے اس تحیر خیز دریافت کو بڑی فیاضی سے "تا زین" کا نام دیا
یعنی مغرب بعید میں "عظیم چین" لیکن چین اور "عظیم چین" کو ہمیشہ ان پڑوسیوں نے ایک دوسرے سے
رکھا جو دونوں ہی کے دعووں کو چیلنج کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ہندوؤں کی نگاہ میں وہ بدھ مت جو
چین نے اتنے احترام کے ساتھ ہندوستان سے لیا تھا۔ کٹر ہندو مت سے ایک افسوسناک روگردا
سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ صحیح مذہبی رسوم، مقدس کلام الٰہی اور درست الٰہیات کا اجارہ صرف بر
کو حاصل تھا۔ ہندوستان ہی کی بہت بڑی آبادی اور مقدس آریائی سرزمین کی حدوں کے باہر دنیا کا
مرد، عورت اور بچہ اچھوت اور ملکم فات تھا۔ (ہندوؤں کے نزدیک) ہندوستان کے مسلم فاتح ناقابل د
مادی طاقت کے حامل ہو سکتے تھے، مگر وہ خود کو اپنے مذہبی جذام سے پاک نہیں کر سکتے تھے۔

اسی طرح مسلمان بھی ہندوؤں اور عیسائیوں کے خلاف اتنے ہی سخت تھے جتنے ہندو مسلمانوں
چینیوں کے خلاف۔ مسلمانوں کی نظر میں بنی اسرائیل کے تمام پیغمبر صحیح و درست تھے اور حضرت عیسیٰؑ آخر
رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل عظیم ترین پیغمبر تھے۔ مسلمانوں کی نزاع حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ نہیں تھی
مسیحی چرچ کے ساتھ، جس نے روم پر تصرف بے دین یونانی شرک و بت پرستی کے آگے سپر ڈال کر حاصل کیا
تھا۔ خدائے واحد کے ساتھ اس شرمناک بے وفائی سے ابراہیمؑ کے دینِ حنیف کو اسلام نے رستگاری دی تھی
ایک طرف عیسائی شرک اور دوسری جانب ہندو شرک کے درمیان توحید کا نور ایک بار پھر چمک اٹھا تھا۔
اسلام ہی کی بقا سے دنیا بھر کی امید وابستہ ہو گئی۔

تصحیح گزشتہ ماہ انگریزی مہینہ "مارچ" کے بجائے "فروری" غلط درج ہو گیا ہے۔ اس لیے
خریداران زندگی فروری کو قلم زد کر کے مارچ لکھ لیں۔ شمارہ نمبر اور عربی مہینہ صحیح
ہے۔
(ادارہ)

تنقید و تبصرہ

مکتوبات سلیمانی حصہ اول مرتبہ:- مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ صفحات ۳۰۰ سائز ۲۲x۱۸/۸ قیمت مجلد گرد پوش کے ساتھ پانچ روپیہ۔ ناشر:- صدق جدید بک ایجنسی۔ کچہری روڈ۔ لکھنؤ۔

مکتوبات سلیمانی کا اشتیاق تو اسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب مولانا عبدالماجد دریا بادی مدظلہ نے اس کی اشاعت کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ اشاعت کے بعد جب ہمارے یہاں اس کے پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوئی تو اس اشتیاق کی وجہ سے میں نے مکرمی حکیم عبدالقوی صاحب کو خط لکھ کر کتاب منگوائی اور جب تک اسے ختم نہ کر لیا کوئی دوسری کتاب مطالعے میں نہ آئی۔ بلاشبہ اس اشتیاق کا ایک بڑا سبب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت ہے ان مکتوبات کے مطالعے سے راقم الحروف کو فائدہ پہنچا۔ سید صاحب کے مزاج اور ان کے احوال و کوائف کے بعض ایسے پہلو سامنے آئے جن سے واقفیت نہ تھی اور محترم مکتوب الیہ سے متعلق معلومات میں تو بہت اضافہ ہوا۔ فاضل مرتب کے حاشیے "قل و دل" کے بڑے اچھے نمونے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب پر جو دیباچہ لکھا ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ معلومات افزا ہونے کے علاوہ اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔

ان مکتوبات کو شائع کرنے اور نہ کرنے کی جو بحث اٹھ کھڑی ہوئی تھی اب ان مکتوبات کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ انہیں شائع کرنے سے تو کوئی نقصان نہ پہنچا البتہ اگر یہ شائع نہ کیے جاتے تو ایک بڑا ادبی و تاریخی نقصان پہنچ جاتا۔ زیادہ سے زیادہ صرف وہ حصے قابل بحث ہو سکتے ہیں جن میں سید صاحب نے مولانا ابوالکلام کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے اسی طرح مولانا مرحوم و مغفور کے اس خط کی اشاعت و عدم اشاعت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں جو انھوں نے سید صاحب کے اعتراضات و شبہات کے جواب میں لکھا تھا۔ اس خط کی اشاعت سے مولانا ابوالکلام کی شخصیت کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن خود سید صاحب کی شخصیت پر اس کا کوئی برا اثر پڑا یا نہیں یہ ضرور قابل غور

ہے۔ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ خط کس کی اجازت سے شائع کیا گیا ہے۔ جہاں تک تبصرہ نگار کے تاثر کا تعلق ہے تو اس مکتوب کو پڑھ کر مولانا مرحوم کی قدر کچھ زیادہ ہو گئی ہے، کم نہیں ہوئی، اسی طرح مکتوبات سلیمانی کے ان حصوں سے بھی مولانا کی قدر کم نہ ہوئی جن میں سید صاحب نے ان پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راقم الحروف ان کو علم و ادب کے لحاظ سے عبقری تسلیم کرتا رہا ہے لیکن تقدس و تقوی کے لحاظ سے ان کی بڑائی کا کبھی خیال پیدا نہیں ہوا۔ ہاں، جو لوگ ان کو مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح مقدس و متقی سمجھتے رہے ہیں، ممکن ہے کہ ان کی عقیدت پر ان مکتوبات کی اشاعت سے چوٹ لگے حالانکہ چوٹ لگنے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ انھوں نے مکتوب میں اپنی توبہ کا جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ بہت ہی مؤثر اور اُن کی قدر بڑھانے والا ہے اور اگر کوئی شخص ان کو پیدائشی ولی سمجھتا تھا تو ایسا شخص خارج از بحث ہے اس کو اپنے غلوئے عقیدت کا جائزہ لینا چاہیے۔ راقم الحروف، سید صاحب کے تقدس اور تقوے کا بھی معترف ہے لیکن اس کے باوجود ان مکتوبات کے مطالعے سے ان کی عقیدت پر نہ کوئی چوٹ پڑی اور نہ کوئی دھچکا لگا۔

۲۷۴ خطوط کے مجموعے سے حصۂ اول میں ۳۰۲ خطوط آئے ہیں، باقی دوسرے حصے میں آئیں گے اور اب اسی کا انتظار ہے۔ (ع ق)

تین کتابیں صفحات ۷۰، کاغذ، کتابت، طباعت اوسط، قیمت:- دو روپیہ پچاس پیسے۔ ناشر- مکتبۂ آسی، جوہر آباد- فیڈرل بی ایریا اسکیم ۱۶ کراچی ۱۹ پاکستان۔

اس نام سے تین شعراء — محبوب خزاں — محب عارفی — قمر جلیس کے کلام کا انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ اکیلی بستیاں — گل آگہی — خواب نما بالترتیب تینوں شعرا کے انتخابِ کلام کے عنوانات ہیں۔

تبصرہ نگار 'اکیلی بستیاں' صفحے کے صفحے پڑھتا چلا جا رہا تھا اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر یہ ہے کیا؟ اتنے میں نگاہ ایک شعر پر رُک گئی۔ خزاں صاحب نے فرمایا ہے:-

معشوق ہیں کیسا مدیر و نقاد شاعر کو غلام جانتے ہیں۔

اس شعر نے پرابلم حل کیا کہ اُفوہ یہ تو آزاد شاعری ہے جو ہم پڑھ رہے ہیں۔ ٹیڈی لباس کا شہرہ کچھ دنوں سے سُن رہے تھے لیکن معلوم ہوا کہ شاعری کی بھی ایک نئی قسم "ٹیڈی شاعری" ایجاد ہو چکی ہے۔ شاعری

بھی ایک قسم بحر اور قافیہ و ردیف سے تو خیر ایک عرصہ ہوا آزاد ہو چکی ہے لیکن اب یہ ٹیڈی شاعری ہر قید سے آزاد ہو چکی ہے کسی مدیر و ناقد کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ اس قسم کے شعراء کو غلام سمجھے اور طرح طرح کی پابندی کا مطالبہ کرے۔ ہاں شاعر کو یہ پیدائشی حق حاصل ہے کہ وہ جو کچھ چاہے اور جس طرح چاہے کہے۔ باب تشبیہ و استعارے کے لیے کسی قاعدے کی پابندی تو بڑی چیز ہے، لفظ کو اس کے حقیقی یا مجازی معنوں میں استعمال کرنے کی قید بھی ناقابل برداشت ہے۔ شاعر جس لفظ کو جس معنی میں چاہے، استعمال کر سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جس طرح پرانے خیال کے لوگوں کو ٹیڈی لباس مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے اسی طرح انہیں یہ ٹیڈی شاعری بھی مضحکہ خیز معلوم ہو۔ ہر چیز نے ترقی کر لی ہے تو پھر یہ ادب و شعر ہی پیچھے کیوں رہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔ خزاں صاحب اپنی پہلی نظم "اکیلی بستیاں" میں فرماتے ہیں:۔

بستی میں گندی گلیوں کے نیچے لڑکے دھما چوکڑی ۔۔ برسے تو چھاگل ٹھہرے تو پل چل اہوں میں اک کھیلی

سبحان اللہ! کتنا حسین اور پر معنیٰ شعر ارشاد ہوا ہے لیکن شاعر کی فن کاری نے سپر نہیں رکھی ہے۔ اس سے بھی نرالا اور انوکھا شعر یہ فرما دیا گیا ہے۔

بڈی پہ چہرے، چہروں میں آنکھیں، آئی جوانی چلی

ٹیلوں پہ جوبن، ریوڑ کے ریوڑ، کھیتوں پہ چھا کر چڑھی

ہنسنے ہنسانے کے لیے شاعر نے کیا خوب شعر تصنیف کر ڈالا ہے۔۔ غزل کے اشعار کا بھی ایک شعر حاضر ہے

کترا تے ہیں، بل کھاتے ہیں، گھبراتے ہیں کیوں لوگ

سردی ہے تو پانی میں اتر کیوں نہیں جاتے

معلوم نہیں یہ پانی گرم ہے یا ٹھنڈا۔ اگر ٹھنڈا ہو تو علاج بالمثل ہے اور اس کی داد کوئی ہومیو پیتھ ڈاکٹر بہتر طور پر دے سکتا ہے اور عجب نہیں کہ شاعر کو انعام بھی دے۔

تبصرہ نگار کی یہ کم ہمتی ہے کہ وہ تینوں کتابوں کو بالاستیعاب پڑھ نہ سکا لیکن سرسری نظر سے اندازہ ہوا کہ بے مقصد اور بے معنی شاعری میں کتاب اول کو اولیت حاصل ہے۔ محب عارفی اور قمر جمیل صاحبان کے کلام کو وہ بات حاصل نہیں ہے ان دونوں کے کلام میں پابندیاں بھی ہیں اور کچھ معانی بھی۔

زیر تبصرہ کتابوں سے پرانے زمانے کے لوگ تو استفادہ نہیں کر سکیں گے۔ البتہ وہ نوجوان جو کسی محنت کے بغیر شاعر بننا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ نمونے کا کام دے سکتی ہے۔

س۔ ا

(اشکالات کا بقیہ)

مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں :-

عالمگیر کو اگرچہ خلافت کا دعوےٰ نہ تھا تاہم وہ مسلمان بادشاہ تھا اور اس کا فرض تھا کہ وہ حکومت میں اس قدر اسلامی شان باقی رکھے جس قدر ایک اسلامی حکومت کے لیے اصل عنصر کے لحاظ سے ضروری ہو (اکبر کے عہد میں) اسلامی شعائر بالکل مٹ چکے تھے۔ عام دربار کا لباس گھیردار پاجامہ اور ہندوانی پگڑی تھی راجاؤں کی طرح، سلاطین زیور پہنتے تھے۔ دربار میں سلام کے بجائے سجدہ یا پاگی رائج تھی۔ یہ بے غیرتی اس قدر بڑھی کہ بے غیرت مسلمانوں نے ہندوؤں کو لڑکیاں دینی شروع کیں۔ عالمگیر نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی تو اس کا فرض تھا کہ اسلامی شعائر دوبارہ قائم کرے۔ اس نے سب سے پہلے سنہ جو ابتدائی تاریخ جلوس کے ایک ہی برس کے بعد سنِ شمسی کو جو پارسیوں کی تقلید سے قائم کیا گیا تھا، قمری سے بدل دیا۔ یہ اگرچہ بظاہر معمولی بات ہے لیکن اس قسم کی معمولی باتوں سے دنیا میں سیکڑوں قومیں نیست اور فنا ہو گئیں۔

درشن کا طریقہ بالکل اسلام کے مخالف تھا۔ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس نے انسان کو ہمیشہ انسان کے درجے پر رکھا کبھی کسی انسان کی پرستش اور عبادت کی اجازت نہیں دی لیکن درشن کا طریقہ صریح ایک قسم کی عبادت تھی چنانچہ عالمگیر نے ۱۰۸۰ھ میں اس کو سرے سے بند کر دیا۔ ۱۰۸۰ھ میں سلام مسنون کا طریقہ جاری کیا اور حکم دیا کہ عام طور پر مسلمان آپس میں ملنے جلنے کے وقت یہی طریقہ برتیں۔ — گانا بجانا بھی دربار کا ایک لازمہ قرار پا گیا تھا اور ہر روز ایک وقت معین تک دربار شاہی رقص و سرود کا تماشاگاہ بن جاتا تھا مزامیر کے ساتھ گانا چونکہ شرعاً ممنوع ہے اور دربارِ شاہی کی شان کے بالکل خلاف ہے۔ عالمگیر نے اس صیغے کو بھی بند کر دیا۔ گویّوں نے اس پر ایک مصنوعی جنازہ نکالا۔ عالمگیر نے دیکھ کر کہا، ہاں مگر ایسا دفن کرنا کہ پھر نہ اٹھے۔

احتساب کا مستقل محکمہ قائم کیا۔ — تمام ممالک میں جس قدر مسجدیں تھیں سب میں امام مؤذن خطیب مقرر کیے جن کی تنخواہیں سرکاری خزانے سے ملتی تھیں — فقہ اور حدیث کی تعلیم کو نہایت ترقی تھا ایک ایک قصبے میں مذہبی علما علوم مذہبی کی درس و تدریس میں مشغول تھے اور ان کو سرکار کی طرف سے وظیفے ملتے تھے۔ کپتان ہملٹن نے سندھ کے صرف ایک شہر ٹھٹہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ شہر علوم فقہ

و فلسفہ سیاسیات کے لیے مشہور ہے ان علوم میں لڑکوں کو تعلیم دینے کے لیے تقریباً چار سکول ہے یہاں میں

جس شخص کے ظلم اور مذہبی تعصب و عدم رواداری کے خلاف شور مچایا جا رہا ہے اس کی حقیقت بھی دیکھ لیجیے ۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں :۔

سب سے بڑا کام جس سے شاید تاریخ خالی ہے یہ ہے کہ بادشاہ وقت کے مقابلے میں اگر کوئی شخص داد رسی چاہے تو نہ اس کی مجال تھی نہ اس کا کوئی قاعدہ مقرر تھا۔ عالمگیر نے ۱۰۸۲ھ میں یہ فرمان نافذ کیا کہ تمام اضلاع میں سرکاری وکیل مقرر کیے جائیں اور عام منادی کرا دی جائے کہ جس کسی کو بادشاہ پر کوئی دعویٰ ہو پیش کرے اور سرکاری وکیل اس کی جواب دہی کرے اور اس کا حق ثابت ہو تو سرکاری وکیل سے اپنا مطالبہ وصول کرے۔ (بحوالہ خافی خاں)

عالمگیر کے عہدِ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ اس کا عدل و انصاف ہے۔ عزیز، بیگانہ، غریب، امیر، دوست، دشمن کی کچھ تمیز نہ تھی۔ ایک رقعہ میں خود لکھتا ہے کہ معاملات انصاف میں شہزادوں کو میں عام آدمیوں کے برابر سمجھتا ہوں۔ یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ غیروں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے ۔
کپتان ہیملٹن جس نے عہدِ عالمگیر میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے :۔

ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے ۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پورے طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانے میں کرتے تھے جبکہ بادشاہت خود ہندوؤں کی تھی۔ وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن ان کی بیویوں کو اجازت نہیں ہے کہ شوہروں کے مردے کے ساتھ ستی ہوں

ایک دوسرے مقام پر شہر ٹھٹھہ کے حالات میں لکھتے ہیں : ـــ

صرف ملیوں میں ۸۰ فرقے ہیں اور گو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے لیکن آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ برہمن ہمیشہ لوگوں کو اس کی ترغیب دیا کرتے ہیں کہ دیوتاؤں کے واسطے بڑی بڑی جائدادیں وقف کی جائیں

پارسی بھی ہیں اور وہ اپنے رسوم مذہب زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو پوری

اجازت ہے کہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں ان کے اخلاق اس شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے عموماً بدترین ہوتے ہیں
شہر سورت کے بارے میں وہ لکھتا ہے :۔

اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان میں کبھی کوئی سخت جھگڑے ان کے اعتقادات و طریقۂ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقے سے اپنے معبود کی پرستش کرے ۔ صرف اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے ۔ (حکومت اورنگ زیب کی اصلی تاریخ)

عالمگیر کی زندگی اور اس کے عہدِ حکومت کا یہ بہت ہی مختصر اور ہلکا خاکہ ہے جو کھینچا گیا ہے :۔

اگر شری مرارجی ڈیسائی یا ان جیسے دوسرے نیتا اکبر کو پسند اور عالمگیر کو ناپسند کرتے ہیں تو ذرہ برابر حیرت نہیں ہوتی لیکن جب بعض مسلمان حلقوں سے یہ نعرہ بلند ہوتا ہے کہ نئے ہندوستان کو اکبر کی ضرورت ہے ۔ عالمگیر کی نہیں تو تھوڑا سا تعجب ضرور ہوتا ہے لیکن ابوالفضل اور فیضی سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں تو یہ تعجب بالکل ختم ہو جاتا ہے ۔

اور اب جماعت اسلامی ہند کی فردِ جرم میں ایک شق کا مزید اضافہ ہوا ہے وہ یہ کہ جماعت اسلامی ہندستان میں عالمگیر کی حکومت واپس لانا چاہتی ہے ۔ ہمارے مخالفین یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی شخصی و خاندانی حکومت اور شاہیت و بادشاہت کے خلاف ہے ۔ وہ بادشاہت کی نہیں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی قائل ہے اس کے نزدیک نہ اکبر کی حکومت نمونہ ہے نہ اورنگ زیب کی ۔ وہ تو صرف صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کی حکومت کو مثالی اور نمونے کی حکومت سمجھتی ہے اور یقین رکھتی ہے کہ جب تک دنیا میں یہ حکومت لوٹ نہ آئے وہ آگ کے سمندر میں غوطے کھاتی رہے گی ۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ آج دنیا میں عالمگیر جیسا کوئی حکمراں اور حکومت عالمگیر جیسی کوئی حکومت بھی موجود نہیں ہے ۔ عالمگیر جیسی عادلانہ حکومت بھی بھارت کو آج کے مقابلے میں ایک لاکھ درجہ بلند کر سکتی ہے ۔

قارئین المنبر سے

اگرچہ ملک بھر کے تمام اہم اخبارات میں یہ خبر شائع ہو چکی ہے کہ ہفت روزہ "المنبر" لائل پور گورنر مغربی پاکستان کے حکم سے چھ ماہ کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ بایں ہمہ قارئین المنبر کی جانب سے مسلسل خطوط موصول ہو رہے ہیں کہ انہیں المنبر نہیں مل رہا ہے۔

ہم اس پابندی کو اٹھوانے کے لیے آئینی حدود کے اندر کوشاں ہیں جونہی یہ پابندی رفع ہوئی "المنبر" حسب سابق اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے مصروف کار ہو جائے گا، انشاء اللہ العزیز

منیجر ہفت روزہ "المنبر" لائل پور

زندگی

رامپور

ذی الحجہ ۸۳ھ
مئی ۱۹۶۴ء

جلد :- ۳۲
شمارہ :- ۵

(مدیر :- سید احمد قادری)

• خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ :- منیجر زندگی رامپور۔ یوپی
• زر سالانہ :- پانچ روپیہ ششماہی :- تین روپے - فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے
• ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقم بھیجیں اور رسیدیں ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ شہاب C/۱۰ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک جماعت اسلامی ہند، اڈیٹر، سید احمد عروج قادری پرنٹر پبلشر، احمد حسن مطبع دلی پرنٹنگ ورکس دہلی
دفتر اشاعت :- دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

فسادات کے اسباب اور عوامل و محرکات پر مختلف مکاتب فکر نے اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ اب شاید ہی کوئی گوشہ باقی رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہاں اسباب فساد پر کچھ لکھنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ اسباب جو کچھ بھی ہوں اس بات پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ بھارت کے مسلمان ایک بہت سخت آزمائشی دور سے گزر رہے ہیں۔

ان سخت حالات میں بہت سارے مسلمان یہ سوچ سکتے ہیں کہ فسادات کے ازالے اور انسداد میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا، فسادات کو روکنے کی تدابیر حکومت اور ملک کی اکثریت کو اختیار کرنی چاہییں۔ مسلمان بے بس اور مظلوم ہیں ان کی کوئی تدبیر کارگر اور کارآمد نہیں ہو سکتی۔ بلا شبہہ یہ بات صحیح ہے کہ یہاں مسلمان مظلوم ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ فساد میں حصہ نہیں لیتے بلکہ مختلف بہانے تراش کر ان پر یک طرفہ حملے کیے جاتے ہیں۔ اس لیے انسدادِ فسادات کی مؤثر تدابیر حکومت اور اکثریت کے انسانیت دوست اور شریف عوام و خواص ہی اختیار کر سکتے اور فسادات کے سلسلے کو بند کر سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بات صحیح نہیں ہے کہ مسلمان اتنے بے بس ہو چکے ہیں کہ وہ کوئی تدبیر اختیار نہیں کر سکتے اور اگر اختیار کریں تو وہ کارآمد اور مفید نہیں ہو سکتی۔ سوچنے کے اس انداز کو بدلنے کی ضرورت ہے

حکومت اور تمام باشندگانِ ملک کے ہمہ گیر تعاون کے بغیر فسادات آسانی سے رُک نہیں سکتے۔ اس لیے مسلمانوں کو اپنے حصے کا تعاون پیش کرنا چاہیے اور ملک کی جو جماعتیں اس سلسلے میں مخلصانہ کام کر رہی ہیں ان کی مدد کر کے ان کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہییں ـــ ایک سرسری نظر بھی یہ بتانے کے لیے

کافی ہے کہ انسداد فسادات میں جن لوگوں کی کوششیں مؤثر اور مفید ہو سکتی ہیں وہ یہ ہیں :۔
مسلمان ۔ اکثریت کے خیر پسند افراد ۔ اخبار نویس اور ملک کا پریس ۔ غیر مسلم اقلیتیں ۔ حکومت ۔ فرقہ پرست جماعتیں ۔

مسلمان کیا کریں

بھارت کے مسلمان، دینی و مذہبی نقطۂ نظر سے بھی، انسانیت کے پہلو سے بھی، وطنی و قومی جہت سے بھی اور موجودہ نازک حالات کو سامنے رکھتے ہوئے بھی، فسادات میں حصہ نہیں لیتے اور یہ بات تو ان کے خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ وہ کوئی مجمع اکٹھا کرکے غیر مسلم بھائیوں پر حملہ آور ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کی شرپسند جماعتیں، غیر مسلم عوام کو مشتعل کرکے فسادات کی آگ بھڑکاتی ہیں جس میں صرف مسلمان نقصان اٹھاتے ہیں اور ستر ہ سال سے برابر اٹھاتے چلے آرہے ہیں اس لیے مسلمانوں سے اجتماعی طور پر یہ کہنا ستم ظریفی ہوگی کہ وہ فساد برپا نہ کریں ۔ ان کے سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ وہ کیا تدابیر ہیں جنھیں اختیار کرکے وہ یک طرفہ حملوں کی زد سے بچ سکتے اور فسادات کی بھڑکائی ہوئی آگ پر پانی انڈیل سکتے ہیں ۔

ہم ذیل میں چند اہم اور بنیادی تدابیر درج کرتے ہیں :۔

(۱) تمام تدبیروں کی اصل اور سب سے زیادہ بنیادی اور اہم تدبیر یہ ہے کہ ہم مسلمان، اللہ رب العٰلمین کو خوش کرنے کی فکر کریں اور اسلام کے سکھائے ہوئے عقائد و افکار کو اس طرح تازہ کرلیں کہ وہ ہماری رگ و پے میں سرایت کرجائیں اور ہمارے اعمال و افعال ان کی روشنی سے چمک اٹھیں ۔ مسلمانوں کے تمام سہارے ٹوٹ چکے ہیں صرف ایک سہارا باقی ہے اور وہ اللہ کا سہارا ہے ۔ اللہ نے اپنے مومن بندوں سے جو وعدے کیے ہیں ان میں کا ایک یہ ہے

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ (المومن)	بلاشبہ ہم اپنے رسولوں اور مومنوں کی مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور مدد کریں گے جب دن گواہ کھڑے ہوں گے ۔ (یعنی قیامت کے دن)

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۔ ہم پر حق ہے کہ مسلمانوں کی مدد کریں

إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ ۔ اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کروگے تو اللہ

وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (محمد) ۔ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جمادے گا

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ ۔ دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تمہیں سربلند

الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران) ۔ رہوگے اگر تم مومن ہو

سوال یہ ہے کہ اللہ نے مدد کرنے اور سربلند کرنے کا جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ اس سوال کا صرف ایک ہی مومنانہ جواب ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی امداد کے لیے جو لازمی شرط لگائی ہے وہ ہم پوری نہیں کررہے ہیں۔ جب تک یہ شرط پوری نہ کردی جائے امداد کا حصول متوقع نہیں ہے۔ ہمیں مخلص مومن بننا پڑے گا اور مخلصانہ ایمان کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔ ان فسادات کی شکل میں دراصل خدا کی طرف سے بار بار یہ تنبیہ کی جارہی ہے کہ مسلمان چونکیں، خدا کی طرف پلٹیں، ایمان کے تقاضے اور دین کی امداد کی شرط پوری کریں۔

اس تدبیر کے بغیر بحیثیت مسلمان، ہم عزت کی زندگی کسی دیگر تدبیر سے حاصل نہیں کرسکتے۔ اللہ کی قدرت عظیم ہے اور تمام کائنات کی زمام اختیار صرف اس کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ اگر خوش ہوجائے اور مدد کرنی چاہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اور اس کے صرف ایک اشارے سے حالات اس طرح بدل سکتے ہیں کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں، اس کے صرف ایک اشارے سے دلوں کی دنیا بدل جاتی ہے وہ اگر چاہے تو جو لوگ آج مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہورہے ہیں وہ کل ان کے ہمدرد و غمگسار بن جائیں اور جو لوگ آج ان کو مٹادینے کے خواہشمند ہیں وہ کل ان کے معین و مددگار ہوجائیں۔

(۲) بغیر کسی تاخیر کے آپ بامقصد زندگی بسر کرنا شروع کریں اور آپ نے اپنے مقصد زندگی سے غفلت برتی ہے اسے ترک دیں۔ مقصد زندگی کی تعیین آپ کے ذمے نہیں ہے بلکہ جب اللہ پر آپ ایمان لائے ہیں اس نے خود آپ کی زندگی کا مقصد متعین کردیا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ صرف اسی کی بندگی کریں [illegible] میں اللہ کے بھیجے ہوئے دین اسلام کی پیروی، اس کی اشاعت و اقامت اور قول و عمل سے اس کی گواہی، آپ کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ مسلمان، دنیا کو اللہ کی طرف بلانے والی ایک امت ہیں [illegible] انھوں نے اپنی یہ داعیانہ حیثیت بھلادی تھی۔ اب سزا نہیں اس حیثیت کی عظیم ذمے داری سے عہدہ برآ

ی کرنی ہے ـــ جس دین پر وہ ایمان لائے ہیں اس کے ساتھ ان کا رویہ کیا ہو؟ یہ ہے
ں پر دنیا میں ان کی باعزت و باوقار زندگی اور آخرت میں ان کی کامیابی کا انحصار ہے آج
لے ایک بندۂ خدا نے مسلمانوں سے یہ کھٹکنے کی بات کہی تھی کہ:۔

آپ کا حال اور آپ کا مستقبل متعلق ہے اس سوال پر کہ آپ اس ہدایت کے ساتھ کیا معاملہ کرتے
ہیں جو آپ کو خدا کے رسول کی معرفت پہنچی ہے اور جس کی نسبت سے آپ کو مسلمان کہا جاتا ہے۔
اگر آپ اس کی صحیح پیروی کریں اور آپ کے اجتماعی کردار میں پورے اسلام کا ٹھیک ٹھیک مظاہرہ ہونے
لگے تو آپ دنیا میں سربلند اور آخرت میں سرخ رو ہوں گے۔ خوف و ذلت اور مغلوبی و محکومی کے یہ سیاہ
بادل جو آپ پر چھائے ہوئے ہیں، دیکھتے دیکھتے چھٹ جائیں گے۔ انصاف کی امیدیں آپ سے وابستہ
ہو جائیں گی۔ بھروسہ آپ کی امانت و دیانت پر کیا جائے گا۔ سند آپ کے قول کی لائی جائے گی اور
یہ دور صرف تاریخ میں ایک داستان عبرت کی طرح باقی رہ جائے گا کہ اسلام جیسی عالمگیر طاقت کے
علمبردار کبھی اتنے بے وقوف ہو گئے تھے کہ عصائے موسیٰ بغل میں تھا اور وہ لاٹھیوں اور رسیوں کو
دیکھ دیکھ کر کانپ رہے تھے۔

عقل و نقل، تجربہ، جس لحاظ سے بھی دیکھیے مسلمان کا بحیثیت مسلمان کوئی دوسرا مقصد زندگی ہو ہی نہیں سکتا۔
وجہ یہ ہے کہ دنیا کا جو گروہ بھی موت کے بعد دوسری زندگی اور آخرت کے حساب کتاب پر ایمان
ں کے لیے لازمی ہے کہ اپنی زندگی کا رویہ آخرت کی کامیابی و سرخ روئی کی بنیاد پر متعین کرے
پر عقل کبھی مطمئن نہیں ہو سکتی کہ وہ دعویٰ تو کرے خدا پر ایمان اور آخرت پر یقین کا، لیکن اپنے
و مصائب کے دور کرنے اور اپنے مسائل کو حل کرنے کی تدابیر سوچتے وقت، خدا کی ہدایت اور
ی بازپرس کو نظر انداز کر دے۔ ایسا طرز عمل اللہ اور آخرت پر ایمان کے ساتھ مذاق تو ہو سکتا ہے
ایمان سے اس کا دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔

پ کا موجودہ تذبذب، بے یقینی اور انتشار سخت نقصان پہنچا رہا ہے اس لیے آخری طور پر طے کیجیے
یمان و اسلام جس چیز کا مطالبہ و تقاضا کر رہا ہے آپ اسے پورا کریں گے۔ اگر آپ نے
ہر یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مدد کا وعدہ پورا نہ کرے اور آپ کے لیے باعزت زندگی کی راہ نہ کھولے
۳ موت سے ڈرنا چھوڑ دیجیے اس لیے کہ وہ اپنے وقت سے پہلے کبھی نہیں آتی حضرت علیؓ نے

فرمایا تھا اور کس قدر سچ فرمایا تھا:۔

"لوگ موت سے ڈرتے ہیں، حالانکہ خود یہی تو زندگی کی محافظ ہے۔"

اس جملے کا مطلب بھی یہی ہے کہ موت وقت سے پہلے نہیں آسکتی وہ ٹھیک اسی وقت آتی ہے جو اس کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ نہ پہلے نہ پیچھے ۔۔۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر میدان عمل سے بھاگ کھڑا ہونا، یا مشکلات کے مقابلے سے منہ موڑنا صحیح نہیں ہے۔ اگر کوئی قوم دنیا کی محبت میں گرفتار اور موت سے خائف ہو تو پھر وہ دوسری قوموں کا لقمۂ تر بن جاتی ہے اور معمولی معمولی قومیں اسے اپنا شکار بنالیتی ہیں اور اگر کوئی قوم باوقار زندگی حاصل کرنے کے لیے مرنے پر تُل جاتی ہے تو اپنا مقصد حاصل کر کے رہتی ہے اور بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی راہ روک نہیں سکتی۔ الجزائر کی تازہ ترین مثال سامنے ہے کہ وہاں جب مسلمان مرنے پر تل گئے تو فرانس جیسی جبار طاقت کو گھٹنے ٹیک کر وہاں سے نکل جانا پڑا۔

سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ دنیا کی وہ جگہ کون سی ہے جہاں موت سے پناہ مل جاتی ہو۔ اگر وقت آگیا ہو تو مضبوط و مستحکم اور فلک بوس قلعہ بھی اس سے بچا نہیں سکتا پھر موت کی گرم بازاری کا حال یہ ہے کہ ٹرینوں کے الٹنے سے، ہوائی جہازوں کے گرنے سے، زلزلوں کے جھٹکوں سے، سیلابوں اور طوفانوں کے زور سے اور بیماریوں اور وباؤں کی آفت سے دنیا کے ہر گوشے میں ہزاروں افراد ہر سال مرتے رہتے ہیں۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ مشرقی پاکستان کے ہزار در ہزار مسلمان طوفان کی نذر ہو گئے اور ان کی کروڑوں روپے کی جائداد برباد ہو گئی۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک، شہادت کی موت بہترین موت ہے، تو پھر اس سے بھاگنے، ڈرنے اور گھبرانے کے کیا معنی؟ جان و مال یا عزت و آبرو کی حفاظت میں مارا جانا یا ظالم کے ہاتھوں مظلومانہ قتل، شہادت ہے اور شہادت کی اعلیٰ ترین قسم وہ قتل ہے جو خدا کے دین کی اقامت و حفاظت کی راہ میں نصیب ہو۔ اگر مسلمان بامقصد زندگی بسر کرنے لگیں تو نہ صرف یہ کہ اس راہ کے مصائب و مشکلات کو جھیل لینا آسان ہو جائے گا بلکہ جان و مال کی قربانی میں بہتوں کو لذت بھی ملنے لگے گی۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کے ایک بڑے مفکر نے لکھا تھا:۔

انسان جب کسی مقصد کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے تو دو طرح کی حالتیں پیش آتی ہیں۔ کچھ لوگ جواں مرد و باہمت ہوتے ہیں وہ بلا تامل ہر طرح کی مصیبتیں جھیل لیتے

ہیں لیکن ان کا جھیلنا جھیل لینا ہی ہوتا ہے یہ بات نہیں کہ مصیبتیں نہ رہی ہوں۔ عیش و راحت بن گئی
ہوں کیونکہ مصیبت پھر مصیبت ہے، باہمت آدمی کڑوا گھونٹ بغیر کسی جھجک کے پی لے گا لیکن اس
کی کڑواہٹ کی بدمزگی محسوس ضرور کرے گا لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں صرف باہمت ہی
نہیں کہنا چاہیے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ سمجھنا چاہیے ان میں صرف ہمت و جواں مردی ہی نہیں ہوتی
بلکہ عشق و شیفتگی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے وہ مصیبتوں کو مصیبتوں کی طرح نہیں جھیلتے بلکہ عیش و
راحت کی طرح اُن سے لذت و سرور حاصل کرتے ہیں۔

کہنے والے نے جو بات کہی ہے اس پر تاریخ اسلامی کے بے شمار واقعات گواہ ہیں اور فی الواقع
لوگ ہیں جن کے ہاتھوں میں کسی قوم کی سربلندی کا علَم ہوتا ہے

(۴) جب فسادات کا طوفان اٹھتا ہے تو اب بھی کچھ مسلمانوں کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں اور وہ د
ملک کی طرف منتقل ہونے کی فکر کرنے لگتے ہیں اور کچھ ایسا کر گزرتے ہیں اور ان کی یہ گھبراہٹ اور ر
وطن سے فرار آئندہ فساد کے لیے ایک محرک بنتا ہے۔ بھارت کے مسلمان یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں
چند غیر مسلم جماعتیں علی الاعلان انہیں پاکستان کی طرف دھکیلنا چاہتی ہیں اور بھارت میں ان کے قیام
پسند نہیں کرتیں۔ فساد سے ان کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے قدم یہاں سے اکھڑ جائیں
اگر اس سے متاثر ہو کر دو چار ہزار مسلمان بھی پاکستان چلے جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ شرپسندوں ک
تدبیر کامیاب ہو گئی وہ اپنی تدبیر کو کامیاب ہوتا دیکھ کر کسی نہ کسی جگہ پھر فساد کراتے ہیں اور فسادات ک
ایک چکر چلتا رہتا ہے۔ ان کی اس تدبیر کو ناکام اور فساد کے ایک سبب کو ختم کرنے کے لیے مسلمانوں
کو اجتماعی حیثیت سے، بڑی مضبوطی کے ساتھ یہ عزم کر لینا چاہیے کہ مسلمان بن کر انہیں اپنے اسی وطن
زندہ رہنا اور مرنا ہے۔

(۵) خوف و ہراس کو دل میں جگہ نہ دیجیے۔ حوصلہ برقرار رکھیے، شرپسند لوگ آپ کو لوٹ، پیٹ کر
کرنا چاہتے ہیں اور اخلاقی و انسانی حیثیت سے پستی کے غار میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ آپ حوصلہ برق
رکھ کر ان کی اس تدبیر کو ناکام کر دیجیے۔ اگر ان کی یہ تدبیر ناکام ہو گئی تو پھر وہ خود مرعوب اور سہمے ہو
ہو جائیں گے۔ اپنے دلوں میں خدا کا خوف پیدا کیجیے، اس کا خوف دوسری ہر طاقت سے نڈر بنا دیتا
(۶) آپ کا سب سے بڑا دشمن خود آپ کا انتشار جماعتی کمزوری، دنیوی اور ذاتی مفاد کو ت

دینے کی عادت اور خود غرضی ہے۔ ان کمزوریوں کے ساتھ کوئی گروہ اور کوئی جماعت مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے آپ اپنے ملی شعور اور اجتماعی احساس کو بیدار کریں، اجتماعی زندگی بسر کریں اور ملی و اجتماعی نفع و نقصان کے مقابلے میں اپنے ذاتی و خاندانی نفع و نقصان کو ہیچ سمجھیں۔ اجتماعی فائدے کے لیے انفرادی نقصان برداشت کر لینے کی عادت ڈالیں۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا تو پھر ایک باشعور، بامقصد اور جماعتی حیثیت سے مستحکم ملت پر حملے کرنا آسان نہیں رہے گا۔

(۷) آپ میں سے ہر شخص کو انفرادی و شخصی حیثیت میں بھی ایسی تمام زیادتیوں سے الگ رہنا چاہیے جن سے غیر مسلموں میں اشتعال پیدا ہوتا ہو، لین دین میں، رہن سہن میں، بات چیت میں، میلے ٹھیلے میں، سفر و حضر میں، ہر جگہ اور ہر موقع پر اس کی پوری احتیاط رکھیے اور اگر کوئی ناشائستہ اور شرپسند مسلمان ایسی کوئی حرکت کر گزرے تو دوسرے مسلمان حق و انصاف اور سچائی کا ساتھ دیں اس شخص کا محض اس لیے ساتھ نہ دیں کہ وہ مسلمان ہے اس طرح کے جاہلانہ تعصب سے اپنے ذہن کو پاک کر لینا چاہیے۔ یہ تعصب تو ہر جگہ اور ہر حال میں حق پرستی کے خلاف ہے لیکن موجودہ حالات میں تو سخت مہلک بھی ہے۔ زیادتی کرنے والے کی کھلے دل سے مذمت کیجیے اور اس زیادتی کے اثر کو دور کرنے کی فوری کوشش کیجیے اور اگر زیادتی غیر مسلم کی طرف سے ہو تو صبر و تحمل سے کام لیجیے اور معاملے کو دفع کرنے کی سعی کیجیے۔

(۸) اپنی عددی کمزوری کو اخلاق و کردار کی بلندی سے قوی بنائیے اور غیر مسلموں کے سامنے اپنے قول و عمل سے اسلام کا نمونہ پیش کیجیے۔ تعداد کی قلت و کثرت اپنی جگہ ایک اہمیت ضرور رکھتی ہے لیکن یہ چیز عزت، وقار، سربلندی، کمزوری اور قوت کا اصل معیار نہیں ہے۔ تعداد کی کمی، اخلاق و کردار کے استحکام سے پوری ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بااخلاق و باکردار گروہ ملک کی ضرورت بن جاتا ہے اور باشندگان ملک کے دلوں میں اس کے لیے جگہ پیدا ہو جاتی ہے۔

بلا لحاظ مذہب و ملت ہر مجبور، محتاج، بیمار اور مظلوم کے ہمدرد و غمگسار بن جائیے۔ آپ کی عملی ہمدردی، خدمت اور انسانیت و شرافت رائگاں نہیں ہو سکتی۔ آخرت میں بھی ان شاء اللہ اس کا اجر ملے گا اور دنیا میں بھی اس کے اچھے اثرات مترتب ہوں گے اس لیے کہ آپ کے یہ کام خوشامد اور چاپلوسی کی بنا پر نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق پوری خودداری کے ساتھ انجام پائیں گے۔

(۹) اگر کہیں فساد پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو تو مجرد افواہ پر یقین کر کے گھبراہٹ کا ثبوت نہ دیجیے

کیا خدا کو ماننے والے تنگ نظر ہوتے ہیں

(مولانا سید جلال الدین عمری)

موجودہ دور میں مذہب کی تنگ نظری کا صور اتنے زور سے پھونکا گیا ہے کہ دنیا اس کے نا
تک سے گھبرانے لگی ہے اور کسی شخص کے متعصب ہونے کی یہ زبردست دلیل سمجھی جاتی ہے کہ و
مذہب کا قائل ہے اور خدا اور رسول کو مانتا ہے۔ لیکن کیا فی الواقع خدا اور مذہب کے ماننے
انسان تعصب کا شکار ہو جاتا ہے اور اس میں تنگ نظری پیدا ہو جاتی ہے؟ اگر یہ بات صحیح ہے
اس میں شک نہیں کہ ہر شریف آدمی کو مذہب سے دور رہنا چاہیے۔ کیونکہ تعصب اور تنگ نظر
بہت بری بلا ہے۔ اس سے بستیاں اجڑتی ہیں، تہذیب و تمدن کو نقصان پہنچتا ہے، اجتماعیت بر
ہوتی ہے اور سیاست میں فساد رونما ہوتا ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ کسی انسانی آبادی
لیے ایک متعصب اور تنگ نظر انسان کا وجود جنگل کے درندے سے زیادہ ضرر رساں ہے۔ اس
اگر کوئی شخص تعصب کی مخالفت کرتا ہے تو اس کی مخالفت بجا ہے۔ ہم کھلے دل سے اس کی تا
کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ یقین بھی ہے کہ مذہب سے تنگ نظری نہیں پیدا ہوتی ا
مذہب کے ماننے والے جتنے روادار اور وسیع الظرف ہوتے ہیں کوئی دوسرا گروہ اتنا روادا
وسیع الظرف نہ ہوتا ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔

ہم یہاں ان تاریخی اسباب سے بحث کرنا نہیں چاہتے جن کی بنا پر مذہب پر تنگ نظری کا الز
لگایا جاتا ہے۔ لیکن اتنی بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس الزام کے لگانے والے خدا
اس کے دین کے سخت ترین دشمن ہیں۔ ان کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے کہ مذہب کی اساس پر کا
گروہ وجود میں آئے۔ وہ کسی ایسی تنظیم کو برداشت کرنا نہیں چاہتے جو خدا پر ایمان رکھے اور اپنی

تمدن کو اس کی غلامی میں لگا دے۔ ان کا بہترین مفاد اس میں ہے کہ خدا کو ماننے والے اپنی انفرادیت ختم کردیں اور پوری طرح ان میں ضم ہو جائیں۔ خدا اور اس کے دین سے ان کی یہ دشمنی کوئی زیادہ پوشیدہ نہیں ہے جسے کھولنے کی ضرورت ہو۔ بلکہ ان میں سے بیشتر اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہو چکے ہیں، البتہ بعض ابھی تک 'خلوص اور خیر خواہی' کی نقاب اوڑھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے شاید مذہب کے ماننے والے بھی انہیں اپنا ناصح مشفق سمجھتے ہیں، اور جب وہ 'بے غرضی' کے ساتھ مذہب کی 'خامیوں' کی نشان دہی کرتے ہیں تو یہ اس کی اصلاح کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں، حالانکہ خدا اور اس کے دین کے یہ چھپے دشمن اس کے کھلے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔

مذہب کو تعصب کا سرچشمہ اور مذہب کے ماننے والوں کو تنگ نظر انسانوں کا گروہ ثابت کرنے کے لیے اس کے مخالفین نے جو الزامات لگائے ہیں ان میں سے پہلا الزام یہ ہے کہ مذہب کی اساس پر عالمی برادری وجود میں نہیں آسکتی۔ کیونکہ مذہب سے فرقہ پرستی اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے اور اس کے ماننے والوں کا نقطۂ نظر محدود ہوتا ہے، اس لیے وہ پوری نوع انسانی کو ایک سطح پر رکھ کر سوچ نہیں سکتے۔

لیکن مذہب پر اتنا بڑا الزام لگانے سے پہلے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ تعصب اور گروہ بندی کیسے پیدا ہوتی ہے اور انسان کے فکر و نظر میں وسعت کہاں سے آتی ہے؟

اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ کسی نظریے کے اندر جتنی وسعت ہوگی اس کے ماننے والے کے فکر و عمل میں بھی اتنی ہی وسعت ہوگی۔ انسان کے فکر و عمل کی دنیا محدود ہو جاتی ہے جب وہ کسی محدود نظریے کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دیتا ہے۔ ایک شخص فردِ واحد کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ دوسرے شخص کی نگاہ میں پوری قوم اس کی خدمت کی مستحق ہوتی ہے اور تیسرا شخص اپنی خدمت کے دائرے کو ساری انسانیت تک پھیلا دیتا ہے۔ نظریات کے اس اختلاف سے سعی و عمل کے حدود بھی وسیع یا تنگ ہو جاتے ہیں پہلے شخص کے سامنے ایک فرد کی آسائش و راحت ہوگی۔ دوسرا شخص افراد کے ایک گروہ کی فکر کرے گا اور تیسرا شخص نوعِ انسانی کے کسی بھی فرد کی تکلیف پر بے چین ہو جائے گا۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے بطور مثال نظریۂ قومیت کو لیجیے۔ یہ نظریہ انسانوں کو طبقوں اور جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک نوعِ انسانی کے ایک حصہ کو دوسرے حصے سے الگ کرنے کے لیے

اتنی بات کافی ہے کہ ان کے درمیان جغرافیائی حدود کا اختلاف ہے یا ان کی زبانیں اور رنگ و نسل جدا جدا ہیں۔ اس نظریے سے تمدن میں دو بڑی خرابیاں رونما ہوتی ہیں۔ پہلی خرابی یہ ہے کہ یہ نظریہ اپنے مزاج کے لحاظ سے انسان میں تعصب پیدا کرتا ہے۔ جو شخص صحیح معنوں میں قوم پرست ہوگا، وہ لامحالہ صرف اپنی قوم ہی کا بھلا چاہے گا۔ اسے کسی دوسری قوم کی فلاح و بہبود سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہوگی اور اگر ہوگی بھی تو اسی وقت جب کہ وہ اس کی اپنی قوم کے لیے مفید ہو۔ ہر معاملے میں قومی مفاد اس کے پیش نظر ہوگا، جس کام میں وہ قوم کا فائدہ دیکھے گا وہ اس کے لیے جائز بلکہ ضروری قرار پائے گا خواہ وہ دوسری قوم کے لیے کتنا ہی نقصان دہ کیوں نہ ہو، اور جس کام میں قومی نقصان ہوگا وہ اس سے دور رہے گا خواہ اس سے کسی دوسری قوم کے لیے بڑے سے بڑے نفع کی توقع ہی کیوں نہ کی جائے۔ اسے آپ قوم کا ایسا وفادار کہہ سکتے ہیں جس کی نظر کبھی حق و ناحق پر نہیں ہوتی بلکہ قوم کے نفع و نقصان پر ہوتی ہے۔

نظریۂ قومیت کی دوسری خرابی یہ ہے کہ وہ انسانوں کو ایک نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ ان کے درمیان بلندی و پستی کے غلط معیارات قائم کر دیتا ہے۔ کبھی کسی قوم کو اس لیے برتر قرار دیتا ہے کہ اقتدار اور حکومت اس کے ہاتھ میں ہے اور کبھی اس کے نزدیک کوئی قوم اس لیے اونچی ہو جاتی ہے کہ وہ ایک خاص زبان بولتی ہے یا اس کا کسی خاص نسل سے تعلق ہے۔ ظاہر ہے اس خرابی کے ہوتے ہوئے آپ مساواتِ انسانی کا تصور نہیں کر سکتے۔

موجودہ دور قوم پرستی کا دور ہے۔ اس دور میں قومیت کی یہ دونوں خرابیاں پوری طرح نمایاں ہو چکی ہیں۔ ایک طرف تو قومی تعصب پوری شدت کے ساتھ ابھر آیا ہے اور قوم کے لیے فنا ہونا فرد کی معراج سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف آج کا انسان مساوات کا تصور چھوڑ چکا ہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی بھی با اقتدار قوم اپنے زیر سایہ کسی محکوم قوم کو جینے کا حق تک دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ ان کی ترقی و خوش حالی کی دشمن ہے اور ہر قدم پر ان کی راہ میں کانٹے بچھاتی ہے۔ ان نتائج کے کھل کر سامنے آنے کے بعد بھی اعتراض مذہب پر ہے کہ اس سے تحزب اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے اور وہ عالمی برادری کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

انسانوں کے بارے میں خدا کو ماننے والے شخص کا نقطۂ نظر خدائی نقطۂ نظر کا عکس ہوتا ہے

خدا کے نزدیک تمام انسان خواہ وہ کسی بھی قوم اور وطن سے تعلق رکھتے ہوں، ایک ہیں۔ وہ انسانوں کے ساتھ اس بنیاد پر معاملہ نہیں کرتا کہ ان میں کون شریف النسل ہے اور کون ادنیٰ ذات کا۔ کس کی زبان عربی ہے اور کون انگریزی بولتا ہے؟ کس کا رنگ سرخ و سفید ہے اور کون سیاہ فام اور کالا ہے۔ اسے نہ تو کسی سے ذاتی محبت ہے اور نہ کسی سے ذاتی دشمنی، بلکہ سب کے سب اس کے بندے اور غلام ہیں۔ اس لیے اس سے برابر کا تعلق رکھتے ہیں۔

خدا پر ایمان ایک وسیع ترین نقطۂ نظر ہمیں عطا کرتا ہے۔ جو شخص اس نقطۂ نظر کو اختیار کریگا وہ فطری طور پر تمام انسانوں کو ایک وحدت سمجھے گا اور ان سے سچی محبت کرے گا۔ طبقاتی کش مکش، گروہی عصبیتیں اور جماعتی نزاعات ایمان باللہ کے ساتھ ہرگز جمع نہیں ہو سکتے۔ آج دنیا نے بلندی و پستی کے جو جھوٹے معیارات قائم کر رکھے ہیں، خدا کو ماننے والا انسان ان سب کو مٹائے گا اور بغیر کسی تفریق کے تمام انسانوں کو ایک نظر سے دیکھے گا۔ وہ اپنے مزاج کے لحاظ سے وسیع الذہن ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ تصور کرنا بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ تنگ نظر ہوگا اور محدود دائرے میں رہ کر سوچے گا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا کو ماننے سے تنگ نظری پیدا ہوتی ہے وہ ایمان کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔

۲۔ مذہب کے ماننے والوں پر دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ انسان کو بحیثیت انسان کے نہیں دیکھتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مومن ہے یا کافر؟ خدا کو مانتا ہے یا اس کا انکار کرتا ہے؟ اور پھر اس کے بعد ان کی ساری ہمدردیاں اور جذباتِ محبت ان لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جو خدا کو مانتے ہیں۔ خدا کا انکار کرنے والوں کے لیے ان کی محبت اور ہمدردی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ان کے نزدیک باطل پرست ہیں، بے دین اور ملحد ہیں۔ وہ ان کے ساتھ قطعاً اس سلوک کے روادار نہیں ہوتے جو سلوک کہ وہ کسی کے ساتھ اس کے ایمان کے بعد کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کو ماننے والوں کے درمیان تعاون اور ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے، وہ ایک دوسرے کے صحیح معنی میں مخلص اور بہی خواہ ہوتے ہیں لیکن ستم یہ ہے کہ بعض لوگ ان کی اس خصوصیت کو فرقہ واریت سمجھتے ہیں اور اس کے بعد وہ تمام صفات ان پر چسپاں کر دیتے ہیں جو کسی فرقے کے اندر پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ ہم پورے یقین اور اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جو اجتماعیت ایمان باللہ کی اساس پر وجود میں آتی ہے وہ فرقہ پرستی اور تعصب کی لعنت سے پوری طرح محفوظ ہوتی ہے۔ خدا

کرتا ہے۔ انسان کے اندر اعلیٰ اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں اور اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے جو اسے ہر بداخلاقی سے باز رکھتا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے انسانوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا ہے وہی رویہ خدا کو ماننے والے شخص کا ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے' اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے' وہ ہر ایک سے محبت کرتا ہے اور اس کے احسانات سب کے لیے عام ہیں' وہ مومن کو بھی دیتا ہے اور کافر کو بھی دیتا ہے' وہ یہاں ان لوگوں کو بھی اپنی رحمت سے محروم نہیں کرتا جو اس کی بڑی سے بڑی نافرمانی کرتے ہیں' وہ باغیوں اور سرکشوں کو بھی' جب تک کہ ان کی مہلت حیات ختم نہ ہو جائے' راہ راست پانے اور اپنی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے مواقع دیتا ہے۔ وہ تمام اچھی صفات سے متصف ہے اور اس نے ان ہی صفات کی اپنے بندوں کو تعلیم دی ہے۔ خدا کو ماننے اور اس کی تعلیم کو قبول کرنے سے انسان کے اندر یہی صفات جلوہ گر ہوتی ہیں اور وہ بہت اونچے کردار کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ خدائے تعالیٰ ہر معاملے میں فضل و احسان کی روش پر قائم ہے' اس کی یہ روش کبھی نہیں بدلتی۔ خدا کے ماننے والے بھی ہمیشہ یہی روش اختیار کرتے ہیں۔ خدا اپنے ایک ایک بندے پر اس کے عقیدہ و مذہب سے قطع نظر بے حد مہربان ہے۔ خدا کے ماننے والے بھی اس کے تمام بندوں پر بغیر کسی تفریق کے مہربان ہوتے ہیں۔ خدا غفار و ستار ہے اور بڑے بڑے ظالموں اور جابروں کو معاف کر دیتا ہے' اس کے ماننے والوں کا رویہ بھی عفو و درگزر کا رویہ ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ فیاض ہے اور اپنے بندوں کے ساتھ فیاضی کا سلوک کرتا ہے' اس کے ماننے والے بھی فیاض ہوتے ہیں اور کبھی تنگ نظری و تنگ ظرفی کا معاملہ نہیں کرتے۔

خدا کو ماننے والے انسان کا وجود دوست اور دشمن ہر ایک کے لیے رحمت ہے' وہ اپنے مخالفین کو نہ صرف برداشت کرتا ہے بلکہ ان کے ساتھ انتہائی شریفانہ برتاؤ کرتا ہے۔ کسی سے اس کا فکری اختلاف نہ دشمنی میں تبدیل ہوتا ہے اور نہ اس سے الفت و محبت کا رشتہ قائم کرنے میں مانع ہوتا ہے۔ وہ تکلیف و راحت' خوشی اور غم' اختلاف و عدم اختلاف ہر حال میں اخلاقی قدروں کا محافظ ہوتا ہے۔ اگر کسی کے ساتھ وہ بدسلوکی کرنا بھی چاہے تو اس کی اخلاقی روح اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ انسانی حقوق کا اس روئے زمین پر اس سے بڑا پاسبان کوئی نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ اور اس کی زبان سے موافق اور مخالف ہر ایک کی جان و مال اور عزت و آبرو پوری طرح محفوظ ہوتی ہے' ان پر کبھی آنچ نہیں آ سکتی

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننے سے انسان کے اخلاق میں بے پناہ عظمت اور بلندی پیدا ہو جاتی ہے، اس سے دشمنوں کی دشمنی ختم ہوتی اور دوستوں کی دوستی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے انسان اپنے حقوق سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن دوسرے کے حق پر خواہ وہ اس کا حریف ہی کیوں نہ ہو، قبضہ کرنا نہیں چاہتا۔ جب اس قسم کے افراد سے کوئی معاشرہ وجود میں آتا ہے تو وہ ایک مثالی معاشرہ ہوتا ہے اور ہر طرف رواداری اور وسیع النظرفی کی فضا چھا جاتی ہے۔ اس طرح کے معاشرے میں استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے بجائے ایثار اور سخاوت کے جذبات پرورش پاتے ہیں اور ایک شخص کا انداز فکر جو بھی ہو اور وہ جس نظریۂ حیات پر بھی ایمان رکھتا ہو، پورا معاشرہ اس کا سرپرست بن جاتا ہے۔ وہ کسی بھی حال میں اپنے آپ کو بے بس اور کمزور محسوس نہیں کرتا بلکہ ایک ایسی با اخلاق اور انسانیت نواز سوسائٹی میں پاتا ہے جو اس کے لیے مضبوط سہارا ہے اور اس کی ہر شکل میں کام آرہی ہے۔ خدا کو ماننے والا گروہ نوع انسانی کا بہترین گروہ ہے۔ اس سے زیادہ روادار اور وسیع الظرف گروہ کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ اس کے نزدیک انسان ایک قیمتی متاع ہے جس کا ضیاع بہت بڑا نقصان ہے۔ وہ اس کے بچانے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہے۔

مذہب کے ماننے والوں پر تیسرا الزام یہ ہے کہ وہ فکری اختلاف کو برداشت نہیں کرتے بلکہ اپنا فکر دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ کوئی بھی صالح اجتماعیت اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جبکہ افراد ایک دوسرے کے عقیدے و خیال کا احترام کریں۔ اختلاف کرنے والوں کو اختلاف کا حق دیں اور اسے بخوشی برداشت کریں۔

میں یقین کے ساتھ کہوں گا کہ یہ ایک بے بنیاد الزام ہے۔ خدا نے دین میں جبر نہیں رکھا ہے۔ اس نے انسان کو آزادی دی ہے کہ وہ اپنے لیے جو دین چاہے پسند کرے اور زندگی کے جس طریقے کو صحیح سمجھے اسے اختیار کرے۔ خدا نے انسان کی آزادی کا دائرہ یہاں تک وسیع کر دیا ہے کہ وہ بغیر کسی روک ٹوک کے اس کے وجود تک کا انکار کر سکتا ہے اور اس کی مرضی کے خلاف زندگی بھر عمل کر سکتا ہے۔ خدا کو ماننے والے بھی آزادی کی اسی راہ پر چلتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں حریت فکر کے سب سے بڑے علم بردار ہیں۔ وہ اس بات کے حق میں ہوتے ہیں کہ انسان کو فکر و خیال کی آزادی ملنی چاہیے، وہ کسی پر اپنا عقیدہ مسلط نہیں کرتے، کسی کو اپنا نظریہ ماننے پر مجبور نہیں کرتے اور کسی سے ان کی دشمنی محض اس لیے نہیں ہوتی

کہ وہ ان سے اختلاف رکھتا ہے اور اس کا فکر ان کے فکر سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ جو شخص ان کے نظریے کو صحیح نہیں سمجھتا ہے اسے اس بات کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اسے قبول نہ کرے۔ اگر وہ عقیدے کے معاملے میں زبردستی کریں تو ان کا طریقہ اس طریقے کے صریح خلاف ہوگا جو خدا نے اپنے بندوں کے ساتھ اختیار کیا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان کے نزدیک ارتداد ایک سنگین جرم ہے، جس کی وہ کبھی اجازت نہیں دیتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کو اس بات کا حق ہے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے خدا پر ایمان نہ لائے لیکن جب اس نے ایک مرتبہ سوچ سمجھ کر خدا کو مان لیا تو اب اسے اس کی اجازت نہیں ہے کہ خدا کا انکار کر دے۔ کیونکہ یہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ کھلم کھلا مذاق ہے، جو کسی بھی حال میں قابل برداشت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جس ریاست کی بنیاد خدا کے دین پر رکھی گئی ہو، خدا کے انکار سے اس کی بنیاد ہی کمزور پڑ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کوئی بھی ریاست اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔ اسلامی ریاست میں خدا کو ماننے سے پہلے آدمی ملحد و بے دین رہ سکتا ہے لیکن خدا کو ماننے کے بعد پھر کبھی وہ الحاد کی طرف نہیں جا سکتا۔

مذہب کے ماننے والوں پر چوتھا الزام یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو زندہ رہنے کا حق نہیں دیتے بلکہ مذہب کے نام پر ان سے جنگ کرتے ہیں۔ مذہب کا قصر ہمیشہ اس کے دشمنوں کی لاشوں پر تعمیر ہوا ہے۔

اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ ہم کبھی یہ نہیں کہتے کہ خدا کو ماننے والے ناتوانی اور بے کسی کی تصویر ہوتے ہیں اور کبھی سختی کو روا نہیں رکھتے۔ اگر کوئی شخص ان کے بارے میں یہ خیال کرتا ہے کہ وہ کسی کو سزا نہیں دیتے اور کسی سے باز پرس نہیں کرتے تو اس کا خیال غلط ہے۔ وہ طاقت کے استعمال کو بعض اوقات جائز ہی نہیں بلکہ ناگزیر سمجھتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے صرف تحمل و برداشت اور عفو و درگزر ہی کا حکم نہیں دیا بلکہ جنگ کا بھی حکم دیا ہے۔ خدا کو ماننے والے اس کے حکم سے کبھی اپنا دفاع کرتے ہیں اور کبھی حملہ آور ہو کر دشمن کو دفاع پر مجبور کرتے ہیں۔ البتہ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی جنگ لوٹ مار اور استحصال کے لیے نہیں ہوتی۔ وہ دوسروں کے حقوق پر قبضہ کرنے کے لیے میدان میں نہیں آتے، ان کو کسی قوم اور کسی گروہ سے ذاتی پرخاش نہیں ہوتی اور نہ وہ کسی کی آزادی چھیننا چاہتے ہیں، بلکہ وہ عدل و انصاف کے محافظ ہوتے ہیں اور اسی کی حفاظت کے لیے تلوار اٹھاتے ہیں۔ ان کا یہ خاص امتیاز ہے۔

کہ وہ طاقت کو بے جا استعمال نہیں لاتے بلکہ حق و انصاف کے ساتھ کام میں لاتے ہیں، وہ مجرم کو سزا دیتے ہیں بے گناہ کو سزا نہیں دیتے، وہ ظالم کے ساتھ سختی کرتے ہیں، مظلوم کے ساتھ نہیں کرتے، ان سے ہمدردی کی توقع کسی مفسد فرد یا گروہ کو نہیں ہو سکتی، کیونکہ ان کی ہمدردیوں کے مستحق عدل کے طالب اور انصاف کے چاہنے والے ہوتے ہیں۔ یہی وہ حق ہے جس کا امن پسند انسان محتاج ہے۔ اگر ظالم کے خلاف تلوار نہ اٹھائی جائے تو ظلم کی حمایت ہوگی، باغیوں اور سرکشوں کے ساتھ رواداری برتی جائے تو اس سے بغاوت اور سرکشی کو فروغ ہوگا۔ فتنہ و فساد کو انگیز کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا سے امن و امان کو ختم کر دیا جائے، اگر بدکاروں اور مجرموں کی گرفت نہ کی جائے اور انہیں کھلی چھوٹ دے دی جائے تو یہ دنیا نیکوں اور اچھوں کے رہنے کے قطعاً قابل نہ ہوگی۔ اس لیے ضروری ہے کہ عدل و انصاف کی خاطر تلوار اٹھائی جائے لیکن اس کے لیے پہلے ہمیں عدل کی حقیقت جان لینی چاہیے۔ اس کے بغیر اس کام کی نوعیت سمجھ میں نہیں آ سکتی، جسے خدا کے ماننے والے انجام دیتے ہیں۔

عدل کی بنیاد ایسے قانون پر ہوتی ہے جس کی نظر میں عورت اور مرد، جوان اور بوڑھا، عالم اور جاہل، حاکم اور محکوم، امیر اور غریب، مزدور اور سرمایہ دار ایک ہوں۔ ایسا قانون صرف خدا کا دیا ہوا قانون ہے۔ وہ تمام انسانوں کو ان کے دنیوی مراتب کے فرق کے بغیر ایک نظر سے دیکھتا ہے اور بغیر کسی جانبداری کے ان کے ساتھ عدل کی روش اختیار کرتا ہے۔ دنیا میں ظلم کی ابتدا خدا کے قانون سے بغاوت کے ذریعہ ہوئی اور اب عدل اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان خدا کے قانون کے تابع نہ ہو جائے۔ خدا کے قانون سے بغاوت کے بعد انسان کے سامنے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ خود قانون بنائے اور دوسروں پر حکومت کرے۔ دوسری یہ کہ محکوم بن جائے اور اپنے ہی جیسے کسی دوسرے انسان کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت قبول کرے۔ یہ دونوں ہی صورتیں سراسر ظلم کی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت میں انسان صریح طور پر ایک ظالم کی پوزیشن اختیار کر لیتا ہے اور دوسری صورت میں اپنے آپ کو جان بوجھ کر ظلم کی آماجگاہ بناتا ہے اور یہ اپنی ذات کے ساتھ کھلا ہوا ظلم ہے۔ آج تک کی تاریخ کا یہی تجربہ ہے کہ جب بھی انسان نے انسان پر حکومت کی ہے اس نے ظلم کی راہ اختیار کی ہے جہاں کسی شخص یا گروہ کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ حاکم ہے اور دوسروں کو اس کی غلامی کرنی چاہیے، وہیں سے ظلم کا آغاز ہو جاتا ہے اور دھیرے دھیرے سوسائٹی میں ظالم اور مظلوم دو طبقے وجود میں آ جاتے ہیں۔ ایک پوری قوت کے

ظلم کرتا ہے اور دوسرا بے کسی کے ساتھ ظلم سہتا ہے۔ انسان کی انسان پر حکومت خواہ مذہب کے
م پر ہو یا سیاست کے نام پر، چھوٹے پیمانے پر ہو یا بڑے پیمانے پر، اس سے ظلم کی مقدار اور وسعت
تو فرق آ سکتا ہے لیکن ظلم ختم نہیں ہوتا۔ خداوندان مذہب نے بھی انسان پر ظلم کیا ہے اور خداوندان
یاست نے بھی۔ جب تک انسان پر انسان کی حکومت ہوگی یہ دنیا ظلم و زیادتی سے خالی نہ ہوگی۔ خدا
کو ماننے والے اسی ظلم کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ وہ انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلانے
کے لیے اٹھتے ہیں اور دنیا میں صرف خدا کی حکومت چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کی جنگ سراسر نوع انسانی
کی بھلائی کے لیے ہوتی ہے۔ اگر وہ اس مقصد کے لیے نہ اٹھیں تو مجرم ہوں گے اور ان کا جرم کبھی
معاف نہ کیا جائے۔

مذہب کے ماننے والوں پر پانچواں الزام یہ ہے کہ ان کی حکومت فرقہ وارانہ حکومت ہوتی ہے
اور اس میں دوسرے فرقوں کے حقوق محفوظ نہیں ہوتے۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ہم جس مذہبی حکومت کا یہاں ذکر کر رہے ہیں وہ کسی خاص فرد
یا کسی خاص طبقے کی حکومت نہیں ہے بلکہ خدا کے قانون کی حکومت ہے۔ اس میں اقتدار اعلیٰ صرف خدا
کی ذات کو حاصل ہوتا ہے۔ ہر کام میں اس کی مرضی مقدم ہوتی ہے اور ہر معاملے میں پورے خلوص کے ساتھ
اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ خدائے تعالے اپنے اس قانون کو خود نہیں چلاتا۔ بلکہ اسے وہ انسان چلاتے
ہیں جو خدا کو حکمرانی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو مانتے ہیں۔

بعض لوگ اسے عدل و انصاف کے خلاف سمجھتے ہیں کہ قانون کے نفاذ کا حق کسی ایک فرقے کو سونپ
دیا جائے اور دوسرے اس سے بالکل محروم رہیں۔

لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ کسی قانون کے چلانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اس کا سچا
وفادار ہو اور اس کی صداقت پر پورا یقین رکھتا ہو۔ اس کے بغیر وہ خلوص کے ساتھ اسے نافذ نہیں کر سکتا۔
جو لوگ خدا کے اقتدار اعلیٰ ہی کو تسلیم نہ کرتے ہوں اگر اس کے قانون کے نفاذ کی ذمہ داری ان کے ہاتھ
میں دے دی جائے تو کبھی اس کی تاثیر اور قوت باقی نہیں رہ سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ اس قانون کے الفاظ
باقی رہ جائیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کی حقیقت اور معنویت برباد ہو جائے گی۔ خدا کے [illegible]
کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی کہ اس کے نفاذ کا حق ان افراد کو سونپ دیا جائے جو سرے سے اس پر

ایمان ہی نہ رکھتے ہوں بلکہ اس کے منکر اور مخالف ہوں۔ اسے وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس سے کلی اتفاق رکھتے ہیں اور اس کے نفاذ اور قیام کے دل سے آرزومند ہیں۔

مذہبی حکومت ایک اصولی حکومت ہے جو خدا کے اقتدار اعلیٰ کو مان کر وجود میں آتی ہے۔ اس میں قطعاً یہ بحث نہیں پیدا ہوتی کہ اس کے ماننے والے کس گروہ اور کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ سب کے سب اس میں یکساں حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسی حکومت میں اس بات کا کھلا ہوا امکان اور پوری گنجائش موجود ہے کہ ایک شخص جو کل تک خدا کے اقتدار اعلیٰ کو مان نہیں رہا تھا آج اسے مان کر ان لوگوں میں شامل ہو جائے جو اسے چلانے کے اصولاً ذمہ دار ہیں۔ بلکہ اگر اس میں صلاحیت ہے تو وہ ان کا قائد اور راہنما بن سکتا ہے۔ کسی کو اس سے یہ پوچھنے کی اجازت نہ ہوگی کہ تیری ذات کیا ہے اور تو کس نسل اور خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟

ہمیں ان لوگوں کے خیال سے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ مذہبی حکومت میں مخالف مذہب فرقوں کے حقوق محفوظ نہیں ہوتے۔ کیونکہ خدا کے قانون میں آج بھی ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس نے اپنے مخالفین اور منکرین کو اتنے حقوق دیے ہیں کہ کسی شخص کو اس معاملے میں اس سے شکایت نہیں ہو سکتی۔ ہمارے نزدیک خدا کے قانون میں ان حقوق کا موجود ہونا اس بات کی زبردست ضمانت ہے کہ وہ عملاً محفوظ ہیں۔ کیونکہ اس قانون کے چلانے والے نہ تو اس میں ادنیٰ تغیر کر سکتے ہیں اور نہ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ خدا کی حکومت کے اندر ایک ایک فرد کی جان و مال کو اپنی جان و مال سمجھیں اور ان کی عزت و آبرو کی اپنی عزت و آبرو کی طرح حفاظت کریں۔ اگر ان کے ہاتھ سے کسی کا کوئی ادنیٰ حق بھی ضائع ہوتا ہے تو وہ اس قانون کے وفادار نہ ہوں گے، اور یہاں خدا کے قانون کے وفاداروں کی بحث ہو رہی ہے نہ کہ اس کے بے وفاؤں کی۔

شرائط ایجنسی (۱) ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی۔ (۲) رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں اگر فروخت نہ ہوئے تو واپس نہیں لیے جائیں گے۔ (۳) کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا، البتہ پچاس یا زائد رسالوں کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی ہوگا۔ (۴) رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری یا وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔ (۵) رقم ہر حال میں پیشگی آنی چاہیے یا پھر وی پی کی اجازت دی جائے۔

منیجر زندگی رامپور یوپی

خاصانِ خدا کی نماز

(۲)

(مولانا مجیب اللہ ندوی)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اکابر صحابہ میں ہیں وہ قلیلا من اللیل یھجعون وبالاسحار ھم یستغفرون کے پیکر تھے نہ صرف خود بلکہ پورا گھرانہ اس میں ان کا شریک رہتا تھا۔ ابو وائل راوی ہیں کہ ایک بار ہم لوگ صبح کی نماز پڑھ کر عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس گئے۔ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کیا انھوں نے اندر آنے کی اجازت دی لیکن ہم لوگ تھوڑی دیر دروازے ہی پر کھڑے رہے کہ اتنے میں لونڈی نے آ کر کہا کہ آتے کیوں نہیں؟ ہم لوگ گھر میں گئے تو وہ بیٹھے ہوئے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ فرمایا کہ اجازت ملنے کے بعد پھر کیوں رک گئے تھے ہم لوگوں نے کہا کہ یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے اہل وعیال سو رہے ہوں۔ فرمایا کہ ہمارے گھر والوں کے بارے میں تم نے غفلت کا گمان کیا۔ اس کے بعد پھر تسبیح میں مشغول ہو گئے جب سمجھے کہ آفتاب طلوع ہو گیا تو لونڈی سے کہا کہ دیکھو آفتاب طلوع ہو گیا اس نے نفی میں جواب دیا۔ پھر آپ تسبیح میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر پوچھا تو اس نے کہا کہ ہاں نکل آیا' تو زبان سے یہ دعائیہ کلمے نکلے۔ "خدا نے آج کے دن ہمیں معاف کر دیا اور مہدی کہتے ہیں کہ یہ کہا کہ خدا نے ہمارے گناہوں کے بدلے ہمیں ہلاک نہیں کیا"[1]

حضرت ابن مسعودؓ نفل روزے کم رکھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں نماز کو روزے پر ترجیح دیتا ہوں اگر روزے رکھوں گا تو ضعف کی وجہ سے نماز نہ ہو سکے گی۔ ایک بار حضورؐ کے ساتھ تہجد میں شریک ہوئے آپ نے اتنی طویل نماز پڑھی کہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں ایک بری بات پیدا ہوئی۔ لوگوں نے

---

[1] مسلم کتاب الصلوٰۃ' باب ترتیل القراءۃ

پوچھا وہ بڑی بات کیا تھی۔ فرمایا: بیٹھ جانے کا خیال ہوا" نماز میں تھک کر بیٹھ جانا کوئی بری بات نہ تھی مگر زہد و عزیمت انھوں نے اسے برائی سے تعبیر فرمایا ہے۔

حضرت عمار بن یاسرؓ سابقین مہاجرین میں سے ہیں، نماز سے ان کو عشق تھا، رات رات بھر نماز و دعا میں مشغول رہتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کی اس آیت کا شان نزول عمارؓ ہی ہیں۔

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ	کیا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں خدا
الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا	کی فرماں برداری کرتا ہے سجدہ کرکے اور قیام
يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْ	کرکے اور آخرت سے ڈرتا رہتا ہے اور اپنے
رَحْمَةَ رَبِّهٖ	رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے (کہیں نافرمان
(سورہ زمر)	بندوں کے برابر ہو سکتا ہے۔)

اس قدر خشوع و خضوع سے نماز پڑھتے تھے کہ اگر کسی نماز میں وہ جلدی کرتے تو لوگوں کو سخت تعجب ہوتا چناں چہ ایک بار ایسا ہی ہوا تو بولے کہ آج شیطان نے مسابقت کی ہے۔ (مسند ج ۴ ص ۲۶۴)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نماز و عبادت کے لیے تمام صحابہؓ میں ممتاز تھے۔ رات کا بیشتر حصہ عبادت و تلاوت قرآن میں بسر ہوتا تھا۔ اکثر تیسرے دن قرآن ختم کرتے تھے۔ یہی حال حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا تھا۔ نافع کہتے ہیں کہ ابن عمرؓ رات بھر نماز پڑھتے تھے۔ صبح کے وقت مجھ سے پوچھتے کہ صبح صادق ہوئی یا نہیں اگر میں کہتا 'ہاں' تو نماز میں مشغول رہتے ورنہ دعا و استغفار کرنے لگتے۔ ان کے تلمیذ خاص ابن سیرین کہتے ہیں کہ رات میں جتنی بار نیند سے آنکھ کھلتی اٹھ کر نماز پڑھتے۔ قرآن کی تلاوت سے اتنا شغف تھا کہ اکثر رات بھر میں قرآن ختم کر دیتے تھے۔ عنفوان شباب ہی سے عبادت و تلاوت قرآن پاک کا یہ حال تھا کہ رات کو گھر کے بجائے مسجد نبوی میں سوتے تھے۔ ایک بار اسی حالت میں دوزخ کے فرشتوں کو خواب میں دیکھا اس کا تذکرہ انھوں نے اپنی بہن ام المومنین حضرت حفصہؓ سے کیا۔ انھوں نے اس کا ذکر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپ نے فرمایا کہ عبداللہ بن عمر جوان صالح ہے۔ اس کے بعد سے نماز سے ان کا شغف اور زیادہ بڑھ گیا۔ ان کا زہد و اتقا صرف نماز تک محدود نہیں تھا بلکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کو دنیا کی دلفریبیوں نے اپنی طرف مائل نہ کیا ہو مگر ابن عمر کا دامن اس سے کبھی آلودہ نہیں ہوا۔

حضرت ابوہریرہؓ بھی ان صحابہ کرام میں سے تھے جو ہمیشہ قائم اللیل رہتے تھے۔

ابو عثمان نہدی کا بیان ہے کہ مجھے سات بار ان کا مہمان بننے کا اتفاق ہوا ہر بار میں نے ان کو دیکھا کہ رات کے ایک حصے میں وہ خود عبادت کرتے تھے اور پھر اپنی بیوی کو اٹھا دیتے تھے وہ جب سو جاتیں تو خادم کو اٹھا دیتیں اس طرح گھر میں رات بھر ذکر و عبادت کی آواز گونجتی رہتی تھی۔ (مسند ج ۲ ص ۳۵۳) آپ ہمہ وقت تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے تھے۔ عکرمہ کا بیان ہے کہ وہ بارہ ہزار تسبیحیں روزانہ پڑھتے تھے۔ ایک دوسرے راوی کا بیان ہے کہ ان کے پاس ایک تھیلی تھی جس میں کنکریاں یا کھجور کی گٹھلیاں بھری رہتی تھیں ان پر وہ تسبیح پڑھا کرتے تھے جب تھیلی خالی ہو جاتی تھی تو لونڈی پھر بھر دیتی تھی۔ (ابوداؤد، کتاب النکاح، باب مایکرہ من ذکر الرجل)

یہ دو چار صحابہ کی حالت نہیں تھی بلکہ عام صحابہ کی یہی کیفیت تھی چنانچہ تتجافی عن المضاجع اور قلیلا من اللیل مایھجعون کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ ان کی کوئی رات ایسی نہیں گزرتی تھی جس میں وہ کچھ نیند نہ خراب کرتے ہوں۔ قتادہ مطرف بن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں۔

قل لیلۃ لا تاتی علیھم الا یصلون فیھا للہ عز وجل اما من اولھا واما من اوسطھا ۔	کم ہی رات ایسی گزرتی تھی جس کے پہلے حصہ میں یا بیچ کے حصے میں نماز نہ پڑھتے ہوں۔

مجاہد کا قول ہے:۔

قل مایرقدون لیلۃ حتی الصباح لا یتھجدون	کم ہی ایسی رات گزرتی تھی کہ وہ تہجد پڑھے بغیر صبح صادق تک سوتے رہتے ہوں

حضرت عبد اللہ بن زبیر کا یہ حال تھا کہ لوگ پوری سورہ بقرہ ختم کر دیتے اور ان کا رکوع ختم نہ ہوتا جب سجدہ کرتے تو ایسے بے حس و حرکت ہو جاتے کہ چڑیاں اڑ اڑ کر پیٹھ پر بیٹھ جاتی تھیں۔ حجاج کے محاصرے کے وقت جب کہ چاروں طرف سے تیروں اور پتھروں کی بارش ہو رہی تھی، وہ حطیم میں نماز ادا کیا کرتے رہتے ان کی نماز کی یہ کیفیت دیکھ کر حضرت ابن عباس کہا کرتے تھے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نماز پڑھنا چاہتے ہو تو ابن زبیرؓ کی نقل کرو۔

جب یہ شہید ہو گئے اور حضرت ابن عمرؓ کا گزر ہوا تو بڑی حسرت سے کہا کہ ابو خبیب خدا تمہارے

کرتے تم بڑے روزہ دار بڑے نمازی اور بڑے صلہ رحمی کرنے والے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے تو بے اختیار رو پڑتے تھے اور دیر تک روتے رہتے تھے۔

الم یان للذین امنوا ان	کیا اہل ایمان کے لیے ابھی یہ وقت نہیں
تخشع قلوبھم لذکر اللہ	آیا کہ ان کے دل خدا کے ذکر کے لیے جھک جائیں

ایک بار اپنے بھائی عبیدؒ کو یہ آیت فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَہِیْدًا پڑھتے سنا تو اس قدر روئے کہ داڑھی اور گریبان تر ہو گئے۔ حضرت تمیم داریؓ ایک بار تہجد کے لیے کھڑے ہوئے تو پوری رات یہ آیت اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَہُمْ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (کیا ہم گنہگاروں کو یہ گمان ہے کہ ہم ان کو مومنین کے برابر کر دیں گے) پڑھتے رہے اور روتے رہے۔ صحابہ کرام کو نماز میں ایسی لذت ملتی تھی کہ تیروں کی پے در پے بارش بھی اس لذت کو منقطع نہ کر سکتی تھی۔ غزوہ ذات الرقاع کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہاڑ کی ایک گھاٹی میں منزل کی اور حراست کے لیے صحابہ سے استمزاج کیا۔ اس کے لیے دو جاں نثار صحابی ایک عمار بن یاسر اور دوسرے عباد بن بشیر یا عمارہ بن حزم نے اپنے کو پیش کیا چنانچہ یہ دونوں حضرات گھاٹی کے درے پر پہنچ گئے اور جاگنے کی باری باندھی چنانچہ عمار بن یاسر سوئے اور عبادہ بن بشیر نے نماز کی نیت باندھ لی ایک دشمن جو بہت دیر سے گھات میں لگا ہوا تھا اس نے سمجھا کہ یہ پہرہ دار کھڑا ہے چنانچہ اس نے ایک تیر لگایا جو بالکل نشانے پر بیٹھا انھوں نے انتہائی بے نیازی سے جسم سے تیر کو الگ کر دیا اور پھر نماز میں مشغول رہے اسی طرح اس نے دوسرا اور تیسرا تیر لگایا مگر وہ برابر جسم سے تیر نکالتے رہے اور نماز میں مشغول رہے۔ پھر اطمینان سے نماز پوری کی اور اس کے بعد ساتھی کو جگایا۔ جب تیرانداز نے محسوس کیا کہ یہ لوگ ہوشیار ہو گئے ہیں تو خوف کھا کر بھاگ گیا۔ حضرت عمار نے جب اپنے ساتھی کو دیکھا کہ وہ خون سے نہائے ہوئے ہیں تو بولے۔ سبحان اللہ پہلے ہی تیر لگنے پر کیوں نہ جگا دیا (کہ میں بدلہ لے لیتا) وہ انصاری بڑے معصومانہ انداز میں بولے، کنت فی سورۃ اقرؤھا فلم احب ان اقطعھا میں نے ایک سورہ (کہف) شروع کر دی تو مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا کہ اس کی لذت کو منقطع کر دوں۔ (ابو داؤد الصلوٰۃ من الدم)

اگر محبوب سے محبوب بھی صحابہ کے خشوع وخضوع میں خلل انداز ہو جاتی تھی تو ان کے نزدیک وہ بے قیمت ہو جاتی تھی۔ ایک بار ابو طلحہ انصاری اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے ایک خوبصورت چڑیا آ کر

قریب ہی درخت پر بیٹھ گئی۔ اتفاق سے اس پر ان کی نگاہ پڑ گئی اور دیر تک اسے دیکھتے رہے جس کی وجہ سے یہ یاد نہیں رہا کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں اس کا اتنا اثر ہوا کہ فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے کہ یا رسول اللہ! اس باغ کو میں صدقہ کرتا ہوں اس نے مجھے اس فتنے میں ڈال دیا۔ ایک اور صحابی اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے فصل کا زمانہ تھا دیکھا تو کھجوریں پھل سے لدی ہوئی ہیں۔ اس پر اس قدر فریفتہ ہوئے کہ نماز کی رکعتیں یاد نہیں رہیں۔ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ میں اس باغ کی وجہ سے اس فتنے میں مبتلا ہو گیا ہوں اس کو اموال صدقہ میں داخل کر دیجیے چنانچہ انھوں نے اسے پچاس ہزار میں فروخت کیا اس مناسبت سے اس کا نام "خمسین" پڑ گیا۔ (موطا)

حضرت انسؓ قیام و سجدہ میں اس قدر دیر لگاتے تھے کہ لوگ سمجھتے تھے کہ بھول گئے۔ (بخاری باب المکث بین السجدتین)

موت جس وقت سامنے کھڑی ہوتی تھی اس وقت بھی صحابہ کرام نماز ہی سے اپنی روح کو تسکین دیتے تھے۔ حضرت خبیبؓ کو کفار نے جب شہید کرنا چاہا تو آپ نے ان سے دو رکعت نماز پڑھ لینے کی خواہش کی۔ انھوں نے اجازت دی آپ فوراً نیت باندھ کر خدا کے سامنے سجدے میں ہو گئے جب نماز ختم کر چکے تو فرمایا کہ اگر تم کو یہ خیال نہ ہوتا کہ موت کے ڈر سے اتنی لمبی نماز پڑھ رہا ہوں تو میں نماز کو اور لمبا کرتا۔

صحابہ کرام کے بارے میں (الادب المفرد) میں ہے کہ یہ حضرات خشک مزاج نہ تھے بلکہ وہ اپنی صحبتوں میں اشعار بھی پڑھ لیا کرتے تھے، جاہلیت کے تذکرے بھی کرتے تھے مگر جب دین کا کوئی کام آ جاتا تو ان کو گویا جنون ہو جاتا تھا۔

فاذا ارید منھم من شئ	لیکن جب خدا کے دین کا کوئی کام پیش
من امر اللہ دارت حمالیق عینہ	ہو جاتا تھا تو ان کی آنکھیں اس طرح پھر جاتی
کانہ مجنون (باب الکبر)	تھیں کہ گویا اب وہ پاگل ہو گئے

حضرات تابعینؒ

صحابہ کرام رضی اللہ تعالے عنہم اسوۂ نبوی کے پہلے حامل تھے ان کے فیض صحبت سے جو لوگ اس امانت کے حامل ہوئے ان کو ہم تابعین اور ان سے جن لوگوں نے یہ امانت پائی تھی انھیں تبع تابعین کہتے ہیں۔ یہ حضرات اپنے ایمان و یقین، زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، اخلاق و عادات اور دعوت و جہاد ہر چیز میں صحابہ کرام کے جانشین اور خلیفہ تھے اور پھر اسی طرح یہ تابعین

... ایک جیتا جاگتا ... طبقے تک منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔

ہمارا موضوع صرف ان کی عبادت و ریاضت اور ذکر و دعا ہے اس لیے ان کی زندگی کے چند واقعات نقل کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ وہ اس پہلو سے صحابہ کرام کا مکمل نمونہ تھے

معروف تابعی ابراہیم بن یزید کے بارے میں تذکروں میں ہے کہ وہ جب نماز پڑھتے تھے تو اس قدر استغراق ہوتا تھا کہ سجدے کی حالت میں چڑیاں پیٹھ پر اڑ کر بیٹھتیں اور چہچہاتی تھیں اور ان کو خبر نہ ہوتی تھی جماعت کا اس قدر اہتمام تھا کہ کبھی تکبیر اولی فوت نہ ہوتی تھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کو تکبیر اولی میں تساہل کرتے دیکھو تو اس سے ہاتھ دھو ڈالو اس زہد و تقوی کے باوجود فرمایا کرتے کہ جب بھی اپنے قول و عمل میں موازنہ کرتا ہوں تو جھوٹے ہونے کا خوف معلوم ہوتا ہے۔

امام اعمش ممتاز تابعین میں ہیں وہ نماز کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ نماز باجماعت کا اتنا اہتمام تھا کہ ستر سال تک ان کی تکبیر اولی قضا نہیں ہوئی۔

ثابت ابن اسلم بنانی معروف تابعین میں ہیں ان کا دل ہر آن آتش سوزاں رہتا تھا، آنکھیں ہر وقت اشک بار رہتی تھیں ان کا یہ حال تھا کہ جس مسجد سے بھی گزرتے تھے اس میں دو رکعت نماز ضرور پڑھ لیتے تھے ایک بار تہجد کی نماز میں یہ پُر موعظت آیت

اَكَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ مِنْ	اے انسان تو اس سے کفر کرتا ہے
تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ	جس نے تم کو مٹی سے پھر نطفہ سے پیدا کیا۔

پڑھی اور اس کو بار بار دہراتے اور روتے رہے۔ حضرت جعفر صادق اس خانوادۂ سعادت سے تعلق رکھتے تھے جس کے ہر ہر فرد کے زہد و تقا کی قسم کھائی جا سکتی تھی یہ اپنے زمانے میں علم و فضل کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک جیسے ائمہ وقت ان کے تلامذہ میں تھے مگر اس جلالت شان کے باوجود عبادت اور تلاوت قرآن سے ان کو عشق تھا۔ امام مالکؒ فرماتے تھے کہ میں جب بھی ان کے پاس گیا تو ان کو نماز پڑھتے، تلاوت کرتے یا روزہ رکھے ہوئے پایا۔

حضرت حسن بصریؒ چمنستان تابعین کے گل سر سبد تھے ان کے فضل و کمال اور امامت و جلالت پر ساری دنیا کا اتفاق ہے لیکن اس عظمت و علو مرتبت کے باوجود خوف اور خشیت الہی اور عبادت و ریاضت کا پیکر تھے ان کے ایک شاگرد یونس بن عبید بیان کرتے ہیں کہ حسن بصریؒ جب مجلس میں آتے تھے تو معلوم

ہوتا تھا کہ کسی عزیز قریب کو دفن کر کے آئے ہیں جب دوزخ کا ذکر کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوزخ انھیں کے لیے بنائی گئی ہے۔ اعمش کا بیان ہے کہ ہم ان کی مجلس میں ہوتے تو نہ دنیا وی بات پوچھی جاتی اور نہ کوئی خبر دی جاتی بس صرف آخرت کا ذکر رہتا ایک بار امام شعبی ملنے گئے تو دیکھا کہ وہ قبلہ رو ہوکر ایک عجیب عالم میں کہہ رہے تھے۔ ابن آدم تو نیست تھا ہست کیا گیا تو نے مانگا تجھ کو دیا گیا لیکن جب تیری باری آئی اور تجھ سے مانگا گیا تو تو نے انکار کر دیا یہ کیفیت دیکھ کر امام شعبیؒ نے اپنے ساتھی سے کہا چلو اس وقت شیخ کسی اور عالم میں ہیں کمزوری کے زمانے میں گدھے پر سوار ہوکر مسجد جایا کرتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ جو وسوسے ایسے ہیں جو پیدا ہوتے اور نکل جاتے ہیں وہ شیطان کی طرف سے ہیں ان کے ازالے کے لیے تلاوت قرآن سے مدد لینی چاہیے اور جو پیدا ہوکر قائم ہو جائیں وہ نفس کی جانب سے ہیں ان کے دور کرنے میں نماز اور مجاہدے سے مدد لینی چاہیے۔

ربیع بن خثیم ممتاز تابعین میں ہیں ان پر بھی خوف و خشیت کی کیفیت ہمہ وقت طاری رہتی تھی۔ ایک بار لوہار کی بھٹی کی طرف سے گزر ہوا تو اس کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔ نماز با جماعت کے اہتمام کا یہ عالم تھا کہ آخر عمر میں فالج کے اثر کی وجہ سے معذور ہو گئے تھے لیکن دو آدمیوں کے سہارے سے مسجد میں پہنچتے تھے۔ کسی نے کہا کہ آپ معذور ہیں گھر ہی پر نماز پڑھ لیا کریں۔ فرمایا کہ حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کی آواز جہاں تک پہنچے جواب دینا چاہیے خواہ گھٹنے کے بل چلنا پڑے۔ تہجد کی نماز کا بھی پورا اہتمام کرتے تھے اس میں ان پر خشیت کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ ایک بار آیت اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۝ (جاثیہ) کو پڑھا اور اس کو رات بھر دہراتے رہے۔

حضرت سعید بن جبیر اکابر تابعین میں تھے۔ وہ ہمہ رقت و خشیت کا پیکر بنے رہتے اسی رقت و خشیت کا اثر تھا کہ ان کی نماز خشوع، خضوع اور حضور قلب کی تصویر ہوتی تھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔ سعید بن عبید بیان کرتے ہیں کہ امامت کی حالت میں میں نے ان کو اس آیت کو بار بار دہراتے سنا ہے۔

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِىْٓ اَعْنَاقِهِمْ	جب ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور
وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ فِى	زنجیریں ہوں گی وہ کھولتے پانی میں گھسیٹے جائیں
الْحَمِيْمِ۝ (مومن)	گے۔

ایک بار اس آیت کو پڑھ کر بار بار دہراتے رہے۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللهِ ۔ اس دن سے ڈرو جب دن تم لوگ اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے

تلاوت قرآن پاک سے بھی خاص شغف تھا عموماً دو راتوں میں قرآن ختم کر لیا کرتے تھے۔ سفر و حضر دونوں میں یہ معمول رہتا تھا۔

سعید بن مسیب طبقۂ تابعین کے لیے سرمایۂ افتخار تھے ان کا یہ عالم تھا کہ نماز با جماعت کا اتنا اہتمام کرتے تھے کہ چالیس اور ایک روایت کے مطابق پچاس برس تک ان کی نماز با جماعت قضا نہیں ہوئی واقعہ حرہ کے زمانے میں گھر سے باہر نکلنا دشوار تھا مگر اس حالت میں بھی وہ مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے ان کو بنی امیہ کے نوجوان دیکھتے تو کہتے کہ اس پاگل بڈھے کو دیکھو (اس وقت بھی مسجد نہیں چھوڑتا) جماعت کے چھوٹنے کے خوف سے مدینہ منورہ سے باہر نہیں جاتے تھے ان کی آنکھوں میں کچھ شکایت ہو گئی تھی لوگوں نے مشورہ دیا کہ مدینے سے باہر عقیق چلے جائیے تو علاج ہو جائے۔ بولے۔ "صبح کی نماز میں حاضری کیسے ہوگی؟" رات کو نماز پڑھتے پڑھتے پیروں پر ورم آجاتا۔ صبح کو نفس سے مخاطب کر کے کہتے تجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور تو اسی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

شیخ صفوان امام احمد کے اساتذہ میں ہیں ان کے بارے میں امام احمد فرمایا کرتے تھے وہ خدا کے ان بندوں میں تھے جن کے وسیلے سے پانی کی دعا کی جاتی تھی ان کا یہ حال تھا کہ نماز پڑھتے پڑھتے پیر سوج جاتے تھے۔ سجدے کی وجہ سے پیشانی زخمی ہو جاتی تھی۔ ابو حمزہ کا بیانؒ ہے کہ میں نے صفوان کو عبادت کے اس مرتبے پر دیکھا تھا کہ اگر یہ کہا جائے کہ کل قیامت ہے تو اس یقین میں وہ جس حد تک پہنچ چکے تھے اس میں اضافہ نہ ہوتا۔

حضرت عامر بن عبداللہ ان تابعین میں تھے جو ایک طرف میدان جہاد میں اپنی شمشیر کے جوہر دکھاتے تھے اور دوسری طرف وہ "فی اللیل رہبان" کی تصویر تھے۔ خدا کے خوف کا یہ عالم تھا کہ جب سفر جہاد میں کہیں جھاڑیاں ملتیں اور ان سے کہا جاتا کہ ان میں شیر کا ڈر ہے ان میں نہ جائیے تو فرماتے مجھے خدا سے شرم معلوم ہوتی ہے کہ اس کے سوا کسی اور سے خوف کروں۔ ایک بار اسی طرح آپ سفر میں تھے جھاڑیوں کے پاس منزل ہوئی۔ گھوڑا باندھ کر اس کے سامنے چارہ ڈال دیا اور پھر ایک جھاڑی میں گھس گئے۔ ان کے ایک شاگرد نے طے کیا کہ آج ان کو دیکھوں گا کہ وہ رات میں کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک ٹیلے پر پہنچ کر

نماز میں مشغول ہو گئے اور صبح تک نماز پڑھتے رہے طلوع صبح کے وقت یہ دعا کی۔ "خدایا! تجھ سے میں نے تین چیزیں مانگی تھیں، دو تو نے عطا کر دیں اور ایک نہیں دی"۔ شاگرد نے پوچھا کہ آپ نے کن تین چیزوں کی دعا کی تھی۔ بولے۔ "عورت کی محبت دل سے نکل جائے اور خدا کے علاوہ کسی کا ڈر دل میں نہ رہے اور میری نیند اڑ جائے۔ پہلی دونوں چیزیں قبول ہو گئیں، البتہ تیسری دعا قبول نہیں ہوئی۔

عطاء بن ابی رباح امام العلم تھے مگر انھوں نے علم سے کوئی دنیاوی فائدہ نہیں اٹھایا۔ عبادت و ریاضت کا حال یہ تھا کہ ۲۰ سال تک مسجد کا فرش ان کا بستر رہا، تہجد میں روزانہ دو سو آیتیں پڑھنے کا معمول تھا، کثرت سجدہ سے پیشانی پر گھٹا پڑ گیا تھا، ہمہ وقت زبان ذکر الٰہی سے تر رہتی تھی۔ انھیں کے ہمعصر عمرو بن دینار تھے، ان کا یہ عالم تھا کہ رات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک تہائی شب میں سوتے تھے، دوسری تہائی میں حدیث کا مطالعہ کرتے تھے اور تیسری تہائی میں خدا کے حضور میں سجدہ ریز رہتے تھے جماعت کی پابندی کا یہ حال تھا کہ جب قویٰ مضمحل ہو گئے تو چونکہ مسجد فاصلے پر تھی اس لیے سواری سے مسجد پہنچتے تھے۔ امام زین العابدین حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تنہا صاحب زادے تھے جو میدان کربلا میں شہید نہیں ہوئے تھے وہ اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جو زہد و تقویٰ کا منبع ہے مگر ان اضافی فضائل نے ان کو مغرور نہیں بنایا تھا وہ تسلیم و رضا کا پیکر تھے، خشیت الٰہی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار احرام باندھ کر سواری پر بیٹھے تو رنگ زرد پڑ گیا اور زبان سے لبیک نہ کہہ سکے۔ کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ خوف لگتا ہے کہ میں لبیک کہوں اور ادھر سے لا لبیک کی آواز آ جائے۔ لوگوں نے کہا کہ لبیک کہنا تو ضروری ہے اصرار کے بعد جوں ہی زبان نے لبیک کہا آپ بے ہوش ہو گئے۔ پرنانا (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی سنت کے مطابق جب تیز ہوا چلتی تو ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ دن رات کا مشغلہ عبادت الٰہی تھا۔ عمر کے آخری لمحات تک عبادت کی کثرت میں فرق نہیں آیا اسی کثرت کی وجہ سے ان کا لقب زین العابدین (عابدوں کی زینت) پڑ گیا تھا ورنہ ان کا نام علی بن الحسین تھا۔ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو سارے بدن میں لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا تو فرمایا تم کو کیا معلوم کہ میں کس کے حضور کھڑا ہوتا ہوں اور کس سے سرگوشی کرتا ہوں۔ ایک بار سجدے میں محویت کا یہ عالم تھا کہ ان کے پاس ہی آگ لگ گئی اور بجھ گئی مگر خبر نہ ہوئی۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو آواز دی گئی مگر آپ نے کوئی توجہ نہیں کی فرمایا کہ اس وقت میں دوسری آگ (دوزخ) کی طرف متوجہ تھا۔

زمرۂ تابعین کے سر خیل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ دوسری حیثیات وخصوصیات کے ساتھ اس حیثیت سے بھی ان کی شخصیت اسوۂ نبوی اور سیرت صحابہ کا نمونہ تھی حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفۂ وقت تھے اس وقت کے خلفاء کی مجلسوں میں موت وقیامت کے ذکر وخوف کا گزر کم ہی ہوتا تھا مگر عمر بن عبدالعزیز کی مجلس بزم عزا ہوتی تھی رات کو علماء جمع ہوتے اور موت وقیامت کا ذکر ہوتا وہ اس طرح روتے جیسے ان کے سامنے جنازہ[1] رکھا ہے۔ بسا اوقات رات کو عشاء کے بعد تنہا مسجد میں بیٹھ کر روتے اور دعائیں کرتے، اس حالت میں آنکھ لگ جاتی، پھر گھبرا کر اٹھتے اور یہ مشغلہ جاری ہوجاتا یہاں تک کہ رات گزر جاتی ایک بار اپنے ہم جلیس سے فرمایا کہ آج رات بھر غور وفکر میں جاگتا رہا۔ انھوں نے پوچھا کہ کس چیز کی فکر میں؟ فرمایا کہ قبر اور اہل قبر کے بارے میں کہ جب اس کا کفن بوسیدہ ہوچکا ہوگا' بدبو پھیل رہی ہوگی بدن پر کیڑے رینگ رہے ہوں گے۔ یہ کہہ کر ہچکی بندھ گئی اور بے ہوش ہوگئے۔ بیوی پانی چھڑک کر ہوش میں لائیں۔ یزید بن حوشب کہا کرتے تھے کہ حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ قیامت سے ڈرنے والا میں نے نہیں دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوزخ انھیں کے لیے بنائی گئی ہے۔ ایک روز یہ آیت یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ پڑھی تو چیخ اٹھے کہ واسوء صباحاہ وہ بری صبح ہوگئی۔ ایک دن نماز میں یہ آیت پڑھی وقفوھم انھم مسئولون اور انہیں ٹھہراؤ کہ ان سے باز پرس ہوگی۔ تو اسی کو بار بار دہراتے رہے اور اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔

امام ابوحنیفہؒ کا شمار صغار تابعین میں ہوتا ہے مگر وہ اپنے علم وفضل' تفقہ واجتہاد' زہد وا تقاء اور عبادت وریاضت میں کبار تابعین کی یادگار بلکہ ان کے ہم عنان تھے۔ ذکر وعبادت میں ان کو مزا آتا تھا اور بڑے ذوق وخلوص سے ادا کرتے تھے۔ اس باب میں ان کی شہرت ضرب المثل ہوگئی تھی۔ علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کی پرہیزگاری اور عبادت کے واقعات تواتر کی حد کو پہنچ گئے ہیں۔ اکثر نماز میں یا قرآن پڑھنے کے وقت رقت طاری ہوتی اور گھنٹوں رویا کرتے۔ ابراہیم بصری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ نماز فجر میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ شریک تھا۔ امام نے یہ آیت پڑھی وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی خدا کو ظالموں کے کردار سے بے خبر نہ سمجھنا۔

امام ابوحنیفہ پر ایسی حالت طاری ہوتی کہ سارا بدن کانپنے لگا۔ زائدہ کہتے ہیں کہ مجھکو ایک ضروری مسئلہ

[1] ہماری غفلت کا یہ عالم ہے کہ جنازہ دیکھ کر بھی موت کی یاد تازہ نہیں ہوتی۔

یافت کرتا تھا امام ابوحنیفہ کے ساتھ عشاء میں شریک ہوا اور منتظر رہا کہ نوافل سے فارغ ہوں تو دریافت کروں وہ قرآن پڑھتے پڑھتے اس آیت پر پہنچے۔ ووقانا عذاب السموم۔ بار بار اس آیت کو پڑھتے تھے یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور وہی آیت دہراتے رہے۔ ایک بار نماز میں یہ آیت پڑھی بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰی وَاَمَرُّ ۝ یعنی قیامت گنہگاروں کا وعدہ گاہ ہے اور قیامت سخت مصیبت کی چیز اور ناگوار چیز ہے۔ اس آیت میں رات ختم ہوگئی، بار بار پڑھتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ یزید بن کمیت ایک مشہور عابد اور امام صاحب کے ہم عصر تھے ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نمازِ عشاء میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ شریک تھا امامِ نماز نے اِذَا زُلْزِلَتْ پڑھی۔ لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے، میں ٹھہر رہا۔ امام ابوحنیفہ کو دیکھا کہ بیٹھے ٹھنڈی سانسیں بھر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں اٹھ آیا کہ ان کے اوقات میں خلل نہ ہو۔ صبح کو مسجد میں گیا تو دیکھا کہ غمزدہ بیٹھے ہیں، داڑھی ہاتھ میں ہے اور بڑی رقت سے کہہ رہے ہیں "اے وہ ذات جو ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر بدی دونوں کا بدلہ دے گی، نعمان (اپنے غلام) کو آگ سے بچانا۔

ایک دن بازار میں جا رہے تھے ایک لڑکے کے پاؤں پر پاؤں پڑ گیا وہ چیخ اٹھا اور کہا تم خدا سے ڈرتے نہیں۔ امام کو غش آگیا۔ مسعر بن کدام ساتھ تھے، انھوں نے سنبھالا، ہوش میں آئے تو پوچھا، ایک لڑکے کی بات پر اس قدر بے قرار ہوجانا کیا تھا؟ فرمایا کیا عجب کہ اس کی آواز غیبی ہدایت ہو۔

ایک دفعہ حسب معمول دوکان پر گئے، نوکر نے کپڑے کے تھان نکال کر رکھے اور تفاؤل کے طور پر کہا خدا ہم کو جنت دے۔ امام صاحب پر رقت طاری ہوئی اور اس قدر روئے کہ شانے تر ہوگئے۔ نوکر سے کہا دوکان بند کردو۔ آپ چہرے پر رومال ڈال کر کسی طرف نکل گئے۔ دوسرے دن دوکان پر گئے تو نوکر سے کہا۔ بھائی ہم اس قابل کہاں ہیں کہ جنت کی آرزو کریں۔ یہی بہت ہے کہ عذاب الٰہی میں گرفتار نہ ہوں۔

ایک دفعہ کسی کو مسئلہ بتا رہے تھے۔ ایک شخص نے کہا۔ ابوحنیفہ! خدا سے ڈر کر فتویٰ دیا کرو۔ امام صاحب پر اس کلام کا اس قدر اثر ہوا کہ چہرہ کا رنگ زرد پڑگیا۔ اس شخص کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا اے بھائی خدا تم کو جزائے خیر دے۔ اگر مجھ کو یہ یقین نہ ہوتا کہ خدا مجھ سے مواخذہ کرے گا کہ تو نے جان کر کیوں علم کو چھپایا تو میں ہرگز فتویٰ نہ دیتا۔ کوئی مسئلہ مشکل آجاتا اور جواب نہ معلوم ہوتا تو متردد ہوتے کہ شاید میرے کسی گناہ کا نتیجہ

[illegible] یا سی کی شامت ہے پھر وضو کرکے نماز پڑھتے اور استغفار کرتے۔ فضیل ابن عیاض جو خود تزکیہ واحسان کے امام ہیں ان سے کسی نے یہ حکایت بیان کی تو بہت روئے اور کہا کہ ابوحنیفہ کے گناہ کم تھے اس لیے ان کو یہ خیال ہوتا تھا۔ جو لوگ گناہوں میں غرق ہیں ان پر ہزار آفتیں آتی ہیں اور مطلق خبر نہیں ہوتی کہ یہ [illegible] تنبیہ ہے۔

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد مسجد میں درس دیتے اور دور دور سے آئے ہوئے فتووں کے جواب لکھتے پھر تدوین فقہ کی مجلس منعقد ہوتی بڑے بڑے نامور شاگردوں کا مجمع ہوتا۔ جو مسائل اتفاق رائے سے طے ہوتے قلمبند کر لیے جاتے نماز ظہر پڑھ کر گھر آتے' گرمیوں میں ہمیشہ ظہر کے بعد سو رہتے۔ نماز عصر کے بعد کچھ دیر تک درس و تعلیم کا مشغلہ رہتا' باقی وقت دوستوں سے ملنے ملانے' بیماروں کی عیادت' اور غریبوں کی خبر گیری میں صرف ہوتا۔ مغرب کے بعد پھر درس کا سلسلہ شروع ہوتا اور عشاء تک رہتا۔ نماز عشاء پڑھ کر عبادت میں مشغول ہوتے اور اکثر رات رات بھر نہ سوتے۔ جاڑوں میں مغرب کے بعد مسجد ہی میں سو رہتے اور تقریباً دس بجے اٹھ کر نماز عشاء پڑھتے۔ پھر تمام رات اوراد و وظائف میں گزرتی کبھی کبھی دوکان پر بیٹھتے اور وہیں یہ تمام مشاغل انجام پاتے۔

تبع تابعین رحمہم اللہ

حضرات تابعین رحمہم اللہ کے تربیت یافتہ تبع تابعین تھے ان کی عبادت و ریاضت اور تعلق باللہ کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

امام ابو یوسف' امام ابوحنیفہ کے مشہور شاگرد' فقہ حنفی کے رکن اعظم' حکومت کے قاضی القضاۃ اور علم و فضل کے اعتبار سے اتباع تابعین کے سرخیل تھے' مگر اس فضل و کمال کے باوجود عبادت و ریاضت میں صحابہ کرام اور تابعین عظام کے یادگار تھے۔ ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ عہدۂ قضا قبول کر لینے کے بعد بھی روزانہ سو رکعت نفلیں پڑھا کرتے تھے۔ دعا کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ جب دعا کرتے تضرع کی وجہ سے ہاتھ چادر سے باہر نکال کر پھیلا دیتے۔ اکثر ان کی دعا یہ ہوتی۔

"بار الہا! میں نے کبھی بھی حرام پیسہ نہیں کھایا' کسی فیصلے میں جانب داری نہیں کی۔ میری خواہش یہ کبھی نہیں ہوئی کہ فلاں کے حق میں فیصلہ ہو' خواہ وہ خلیفہ وقت ہی کیوں نہ ہو' مجھے اس کے بدلے معاف کر دے۔" ایک بار کسی نے آپس کے جھگڑے میں قرآن بے موقع پڑھ دیا جس سے سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ تو اللہ سے ڈرتا نہیں۔ کلام اللہ کو تو نے معمولی چیز سمجھ لیا ہے۔ قرآن کے پڑھنے والے

کو چاہیے کہ وہ اس کو نہایت خشوع و خضوع اور خوف و دہشت کے ساتھ پڑھے کتاب الخراج کے شروع میں ہارون کو مخاطب کرکے انھوں نے جو نصیحت کی ہے اس سے ان کی خدا شناسی اور خوف آخرت کا پورا پتہ چلتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے دوسرے ممتاز شاگرد امام محمد بن الحسن تھے۔ یہ بھی اسلاف اور خود استاذ کی عبادت و ریاضت کے کامل متبع تھے۔ امام محمد نے رات کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ ایک حصہ میں آرام کرتے، دوسرے حصے میں مطالعہ کرتے اور تیسرے حصے میں اللہ کے حضور قیام و قعود میں گزارتے تھے ان کے ایک شاگرد عبداللہ کہتے تھے کہ میرے والد مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں نے بہت چاہا کہ امام محمد جس خشوع و خضوع کے ساتھ معمولاً نماز پڑھتے ہیں ایسی نماز میں ایک دن پڑھ لوں مگر میں عاجز رہا۔ محمد بن سماعہ اور عیسیٰ ابن ابان وقت کے محدث تھے، ان کا بیان ہے کہ نماز پڑھنی ہم نے محمد سے سیکھی۔ اس عبادت و ریاضت نے ان میں اتنا خوف آخرت اور احساس ذمہ داری پیدا کر دیا تھا کہ رات کو طشت میں پانی رکھ لیتے تھے جب نیند آتی تھی تو اپنے اوپر پانی ڈال لیتے تھے۔ کسی نے اس زحمت کشی کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں کیسے سو سکتا ہوں جب عام مسلمان ہم پر اعتماد کرکے اور یہ خیال کرکے سو رہے ہیں کہ جب ہمارے سامنے کوئی معاملہ پیش آئے گا تو اس کو (امام محمد) کے پاس لے جائیں گے وہ اسے واضح کر دیں گے ــــ تو اگر میں سو جاؤں تو دین ضائع ہو جائے گا۔ آپ ہر روز ایک ثلث قرآن کی تلاوت فرماتے تھے۔

امام اوزاعیؒ کا شمار ان تبع تابعین میں ہوتا ہے جو ایک نئے مسلک فقہ کے بانی تھے۔ امام ابن تیمیہ کہا کرتے تھے کہ امام اوزاعیؒ سے بڑا کوئی فقیہ شام میں نہیں پیدا ہوا۔ امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ اگر ایسے علماء پیدا ہوتے رہتے تو امت میں زوال نہ آتا۔ ان کے بارے میں تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ان میں خلیفہ بننے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ مگر اس عظمت و جلالت شان کے باوجود عبدیت کے اعلیٰ درجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے تھے انھوں نے منصور کو جو نصیحتیں کی تھیں اس سے ان کی سوزش قلب کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے[1] خشیت الٰہی سے آنکھیں ہر وقت اشکبار رہتی تھیں۔ رات کا بیشتر حصہ ذکر و نوافل میں گزرتا تھا۔ رات کی نماز میں طویل قیام کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے، رات کی نماز میں جو لوگ جتنا طویل قیام کریں گے اللہ تعالےٰ اسی نسبت سے ان کے قیام کو ہلکا کر دے گا۔ اپنے قول کے استدلال میں سورۂ دہر کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:۔ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا

---

[1] تبع تابعین حصہ اول میں تفصیل ملے گی۔

کَانُوْا قَلِيْلًا ... يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا۝

رات کی نماز میں اس قدر روتے تھے کہ مصلیٰ تر ہو جاتا تھا۔ ایک بار گھر میں ایک عورت آئی دیکھا کہ مصلے کا ایک حصہ تر ہے۔ پوچھا کہ مصلے پر کسی بچے نے پیشاب کر دیا ہے؟ نیک بیوی بولیں یہ شیخ کے آنسوؤں سے تر ہو گیا ہے۔ یہ روزانہ سجدے میں اسی طرح رویا کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یحی اللیل قرانا وبکاء۔ یہ رو کر اور قرآن کی تلاوت کر کے رات ختم کر دیا کرتے تھے۔ ان پر صرف نماز ہی نہیں بلکہ ہر وقت خشوع وخضوع اور خوف وخشیت کی کیفیت طاری رہتی تھی بشیر بن منذر بیان کرتے ہیں کہ خشوع کی شدت کی وجہ سے اندھے معلوم ہوتے تھے مگر جب مجلس میں ہوتے تو بڑے ضبط سے کام لیتے تھے۔ البدایہ میں ہے کہ ان کو مجلس میں روتے تو نہیں دیکھا گیا مگر جب تنہائی میں ہوتے تھے تو اس قدر روتے تھے کہ ان کے حال پر رحم آتا تھا۔

عبداللہ بن مبارک اس دور بہار کے گل سر سبد تھے۔ ان کے بارے میں سفیان ثوری جیسے جلیل القدر محدث اور صاحب زہد واتقا فرمایا کرتے تھے کہ میں نے صحابہ کے حالات پر غور کیا تو صحبت نبوی کے علاوہ اور کسی چیز میں ابن مبارک کو کم نہیں پایا۔ یہ عبادت وتقوے میں ضرب المثل تھے۔ سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کوشش کی ابن مبارک جیسی محتاط زندگی گزاروں مگر چند دن بھی نہ گزار سکا وہ زہد وورع اور قیام لیل میں آپ اپنی مثال تھے۔ اس زہد وورع کے ساتھ ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ اپنی کتاب "الزہد" جب طلبہ کے سامنے پڑھتے تھے تو قلبی رقت کی وجہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ میں برابر غور کرتا تھا کہ ان کو کس بنا پر اتنا شرف وفضل اور قبول عام حاصل ہے۔ جس طرح وہ نماز پڑھتے ہیں ہم بھی پڑھتے ہیں اور جس طرح وہ روزہ رکھتے ہیں ہم بھی رکھتے ہیں، وہ حج کرتے ہیں اور جہاد میں شریک ہوتے ہیں ہم بھی یہی کرتے ہیں۔ اتفاق سے ایک سفر میں ساتھ تھا، رات کے وقت یکایک چراغ گل ہو گیا۔ ایک آدمی چراغ جلانے کے لیے اٹھا۔ وہ واپس ہوا تو ابن مبارک کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اسی خشیت الٰہی کی وجہ سے ان کی عظمت وجلالت باقی ہے۔ امام شعبہ کی جلالت وامامت پر بھی سب کا اتفاق ہے۔ ان کی خلوت کی زندگی کے واقعات بہت کم معلوم ہیں مگر ہم عصر علماء کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس لحاظ سے بڑے اونچے مقام پر تھے۔ ابن معین جیسے امام روزگار ان کو "شعبہ امام المتقین" کے لقب سے

یاد کرتے تھے۔ حضرت مسعر بن کدام مختار اتباع تابعین میں ہیں۔ ان کی عبادت و ریاضت بھی ضرب المثل
تھی ان کی والدہ بھی بڑی عابدہ تھیں، ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کے دو ٹھکانے ہیں، ایک گھر دو
مسجد۔ کثرت سجدہ کی وجہ سے پیشانی داغ دار ہوگئی تھی۔ روزانہ رات میں نصف قرآن ختم کر ڈالتے تھے
اُن کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ نصف قرآن ختم کیے بغیر نہ سوتے تھے۔ ختم تلاوت کے بعد سو جاتے
ایک ہلکی سی جھپکی لینے کے بعد اس طرح چونک کر اٹھتے تھے جیسے کوئی چیز کھو گئی ہو اور پریشان ہو کر تلاش
کر رہے ہوں۔ اٹھ کر وضو و مسواک سے فارغ ہو کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے اور طلوع فجر تک مشغول
رہتے۔ اس زہد و اتقاء کے باوجود ہر وقت آخرت سے خائف رہتے تھے۔ ایک دن اُن پر گریہ طاری
ہوا، ماں پاس بیٹھی ہوئی تھیں، وہ بھی رونے لگیں۔ پوچھا کہ اماں آپ کیوں رو رہی ہیں؟ بولیں بیٹے تم
روتے دیکھا میں بھی رونے لگی۔ انھوں نے کہا کہ اماں کل جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کے تصور سے رو رہا
ہوں، ان کی ان کیفیات کی بنا پر لوگ ان کے جنتی ہونے کا یقین کرنے لگے تھے۔ عبداللہ بن وہب امام
مالکؒ کے مشہور شاگرد ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ زہد و عبادت میں بھی ممتاز تھے۔ ایک دن کسی شخص نے
یہ آیت تلاوت کی وَإِذْ يَتَحَاجُّونَ فِي النَّارِ۔ سنکر اُن پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی اور بہت دیر
تک یہ کیفیت رہی۔ تذکرہ نگاران کو كَانَ مِنَ الْعُبَّادِ کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

یحییٰ بن سعید القطان امام جرح و تعدیل ہیں ان کے بارے میں ان کے ایک شاگرد بیان کرتے
ہیں کہ میں بیس برس تک ان کی خدمت میں رہا۔ میرا گمان ہے کہ اس مدت میں ان سے کوئی ایسا کام نہیں
ہوا جس سے خدا کی نافرمانی ہوتی ہو۔ ابن معینؒ کا بیان ہے کہ ان کی جماعت کبھی ترک نہیں ہوتی تھی
نماز باجماعت کے ساتھ نوافل کا حد درجہ اہتمام تھا جس نفل عبادت کو شروع کر دیتے اسے زندگی بھر نباہتے
قرآن پاک سے شغف کا حال یہ تھا کہ رات بھر میں پورا قرآن ختم کر ڈالتے تھے اور صرف قرآن خواں نہیں
بلکہ قلب و دماغ پر وہی اثر ہوتا تھا جو قلب مومن پر ہونا چاہیے۔ ایک دن کسی سے آپ نے قرآن
کی فرمائش کی جب قاری نے یہ آیت پڑھی إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ تو ان پر گریہ
طاری ہو گیا اور بے ہوش ہو گئے۔ یہ کیفیت دیکھ کر پورا گھر رونے لگا اور گھر ماتم کدہ بن گیا۔

عبدالرحمٰن بن مہدی سعید القطان کے ہم فن بھی تھے اور ہم رتبہ بھی۔ زہد و عبادت میں یہ دونوں
بزرگ گویا توأم تھے۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ وہ اکثر پوری رات نوافل اور تلاوت میں گزارتے

میں گزار دیتے تھے۔ یوں روزانہ نصف قرآن کی تلاوت کا معمول تھا۔ ایک بار رات بھر جاگتے رہے۔ صبح کے وقت آنکھ لگ گئی اور نماز فجر قضا ہو گئی۔ ان کو نماز کے قضا ہونے کا اس قدر رنج ہوا کہ ایک مدت تک زمین سے پیٹھ نہیں لگائی۔ ان کے خوف و خشیت الٰہی کے اور بھی واقعات ہیں

حضرت فضیل بن عیاضؒ سرخیلِ زاہدین و عابدین ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی بڑی رندانہ تھی، مگر جب توبہ کی تو توبۃ النصوح کی اور اس کے بعد ایک مدت تک حرم کعبہ کی مجاورت کرتے رہے۔ ان پر خوف و خشیت کی کیفیت ہر آن طاری رہتی تھی۔ ابن اشعثؒ کہا کرتے تھے کہ ان کے دل میں خدا کی جتنی عظمت تھی کسی دوسرے میں نہیں دیکھی۔ بسا اوقات خوف و خشیت کی کوئی آیت سنتے تو ان پر خوف و غم کی عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اس طرح رہتے تھے کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا تھا۔ آپ قرآن نہایت غمگین اور موثر انداز میں پڑھتے تھے اور اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی انسان کو مخاطب کر رہے ہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم رات کو اٹھ کر نفل پڑھنے اور دن کو روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو تو سمجھ لو کہ محروم ہو اور تم کو گناہوں نے گھیر لیا ہے۔ یہ ارشاد اُن کی خلوت کا آئینہ دار ہے۔ فرماتے تھے کہ جو شخص قرآن پڑھتا ہے اس سے اس طرح سوال ہوگا جس طرح انبیاء علیہم السلام سے تبلیغ رسالت کے بارے میں سوال ہوگا اس لیے کہ قرآن پڑھنے والے انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں۔

حضرت سفیان ثوریؒ امام العلم ہونے کے ساتھ اس دور کے رئیس الاتقیاء تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اگر سفیان نہ ہوں گے تو ورع کا خاتمہ ہو جائے گا مگر خوف آخرت کا یہ عالم تھا کہ فرماتے تھے کہ میں رات کو سوتا ہوں اور کوئی آواز آ جاتی ہے تو چونک کر اٹھ جاتا ہوں کہ کہیں عذاب الٰہی نہ ہو ایک بار دن میں نفل نماز پڑھ رہے تھے جب قرآن کی آیت فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ پر پہنچے تو چیختے ہوئے باہر دھوپ میں نکل پڑے۔ ایک بار عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے ایک شاگرد سے طہارت کا برتن مانگا اسے لیکر رات بھر سوچتے رہ گئے۔ شاگرد نے جب پوچھا تو فرمایا کہ آخرت پر غور کرتا رہ گیا۔ عبدالرحمٰن بن مہدی جن کے زہد و ورع کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ ان کی سیرت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے تھے کہ ان سے زیادہ رقیق القلب میں نے نہیں دیکھا۔ میں کئی رات مسلسل ان کو دیکھتا رہا معمول یہ تھا کہ رات کے پہلے حصے میں سو جاتے۔ پھر یکایک گھبرا کر "دوزخ دوزخ" کہتے ہوئے اٹھتے" پھر وضو کرتے۔ وضو کرنے کے بعد یہ دعا کرتے ____

"اے اللہ! تو بخوبی میری حاجتوں کو جانتا ہے۔ میں تجھ سے عذاب دوزخ سے نجات کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگتا۔ اے اللہ! فکر آخرت ہی نے مجھے رقیق القلب بنا دیا ہے اور یہ میرے اوپر تیرا بڑا انعام ہے۔ اے اللہ! اگر گوشہ گیری کے لیے کوئی عذر میرے پاس ہوتا تو میں ایک لمحہ بھی لوگوں میں نہ رہتا۔"

اس دعا کے بعد نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ نماز میں گریہ و بکا کی وجہ سے قرأت نہیں کر پاتے تھے۔ ابن مہدی کہتے ہیں کہ میں شرم و خوف کی وجہ سے ان کی طرف دیکھ تو نہیں پاتا تھا۔ مگر کوشش کے باوجود ان کی قرأت صاف سنائی نہیں دیتی تھی۔ ایک بار مجلس میں ایک شخص نے سوال کیا کہ تم رات کو کیا کرتے ہو۔ سب نے اپنے معمولات بتائے۔ اس کے بعد لوگوں نے آپ سے پوچھا تو فرمایا کہ پہلے حصے میں بھرپور نیند سوتا ہوں پھر اٹھتا ہوں تو دوبارہ ٹیک نہیں لگاتا۔

(ختم شد)

ایک آیت
ایک پُرجلال اعلان

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (القمر - ۴۵)

عنقریب ان کا جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

یہ آیت، سلطان کائنات کا ایک پُرجلال شاہی اعلان ہے جو مکے میں سنایا گیا تھا۔ اس اعلان نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، مکے کے مسلمان اور وہاں کے کفار و مشرکین سب پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ اُس کش مکش کا انجام کیا ہونے والا ہے جو حق و باطل کے درمیان برپا ہوئی ہے۔ یہ صرف شکستِ باطل کا مژدہ ہی نہیں ہے بلکہ قتال فی سبیل اللہ کے وجوب کی تمہید بھی ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:۔

یعنی عنقریب ان کو اپنے مجمع کی حقیقت کھل جائے گی جب مسلمانوں کے سامنے سے شکست کھا کر اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے چنانچہ بدر اور احزاب میں یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر یہ آیت جاری تھی سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

قربانی کا حکم تمام الٰہی شریعتوں میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے، اور ہر امت کے نظام عبادت میں سے ایک لازمی جزء کی حیثیت حاصل رہی ہے ـــ البتہ قربانی کے طریقے مختلف قوموں، ملکوں ور زمانوں میں حالات کے لحاظ سے جدا جدا رہے ہیں ـــ انسان نے مختلف ادوار میں بندگی، قیدت، جاں نثاری، عجز و نیاز اور پرستش کے جو جو طریقے اختیار کیے الٰہی شریعتوں نے انسانی نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے وہ تمام ہی طریقے اپنی اصلاحات کے ساتھ خدا کے لیے مخصوص کر دیے انسانوں نے اپنے باطل معبودوں کے سامنے جانوروں کی قربانیاں بھی پیش کیں۔ خدا نے اس کو بھی اپنے لیے مخصوص کر دیا اور اپنے سوا ہر ایک لیے اس کو حرام قرار دیا۔

قربانی دراصل اس عزم و یقین کا اظہار ہے کہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے سب کا حقیقی مالک خدا ہے اور اسی کی راہ میں یہ سب کچھ قربان ہونا چاہیے ـــ حتیٰ کہ اس کا اشارہ پا کر اپنا خون بہانے سے بھی آدمی کو دریغ نہ کرنا چاہیے ـــ اسلام اسی حقیقت کا دوسرا نام ہے۔ حضرت ابراہیم ور اسمٰعیل علیہما السلام کے اسی جذبۂ و عمل کو قرآن نے اسلام سے تعبیر کیا ہے۔

قربانی کی اصل جگہ تو وہی ہے جہاں ہر سال لاکھوں حاجی اپنی قربانیاں پیش کرتے ہیں، لیکن خدائے رحیم و کریم نے اس عظیم شرف سے ان لوگوں کو بھی محروم نہیں رکھا ہے جو مکہ سے دور ہیں اور حج یں شریک نہیں ہیں ـــ قربانی کا یہ حکم صرف ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بیت اللہ کا حج ر رہے ہوں بلکہ یہ ایک عام حکم ہے، اور تمام ہی مسلمانوں کے لیے ہے۔ یہ حقیقت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ قربانی تمام ہی مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر کی شہادت ہے[1]

---

[1] ترمذی

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دس سال تک مدینہ میں رہے اور برابر ہر سال قربانی کرتے رہے
ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص وسعت رکھنے کے باوجود قربانی نہ کرے وہ ہما
عیدگاہ کے قریب نہ آئے ۔"

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بقرعید کے دن فرمایا "جس نے عید کی
سے پہلے ذبح کر لیا اس کو دوبارہ اپنی قربانی کرنی چاہیے اور جس نے نماز کے بعد قربانی کی اس
قربانی پوری ہوگئی اور اس نے ٹھیک مسلمانوں کے طریقے کو پالیا" ـــــ ظاہر ہے بقرعید کے دن
یں کوئی ایسی نماز نہیں ہوتی جس سے پہلے قربانی کرنا سنت مسلمین کے خلاف ہو۔ لامحالہ یہ واقعہ
ینے کا ہے اور اسی کی شہادت حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی پیش فرماتے ہیں۔

ربانی ایک عظیم یادگار

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰۗؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ

پس جب اسمٰعیلؑ ان کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچے تو ابراہیم نے (ایک روز) ان سے کہا۔ پیارے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ غور کرو اب کیا ہونا چاہیے؟ بیٹے نے (بلا تامل) کہا۔ ابو جان! آپ کو جو کچھ حکم دیا جا رہا ہے، اسے کر ڈالیے۔ خدا نے چاہا تو آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ آخر کو جب باپ بیٹے دونوں نے خدا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو منہ کے بل زمین پر ڈال دیا۔ تو ہم نے ندا دی ابراہیم! (بس!) تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا ہم نیکوکاروں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ دراصل یہ ایک زبردست قربانی تھی (جس کے لیے تم تیار ہو گئے) اور ہم نے ایک عظیم قربانی کو فدیہ بنا کر اس کو چھڑا لیا۔ اور ہم نے یہ سنت

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِيْنَ ۝ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيْمَ ۝ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (صفت ۱۱۰-۱۱۱)

آنے والی امت میں (یادگار) چھوڑ دی سلام ہے ابراہیم پر ہم اپنے وفاداروں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ بلاشبہ وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھے جو سچے دل سے ہم پر ایمان رکھتے ہیں

یعنی رہتی زندگی تک امت مسلمہ میں قربانی کی یہ عظیم الشان یادگار حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا فدیہ ہے۔ خدا نے اس فدیے کے عوض ان کی جان چھڑائی کہ اب قیامت تک آنے والے وہ لوگ جو خدا کے اشارے پر اسی طرح قربان ہونے کے لیے تیار ہوں۔ اسی دن دنیا بھر میں جانوروں کو ذبح کر کے اس یادگار کو قائم رکھیں گے۔ قربانی کی یہ بے بدل مثال قائم کرنے والے حضرت اسمٰعیل تھے اور اس کو ہمیشہ قائم رکھنے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لوگ ہیں۔

قربانی شکر نعمت

كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (الحج ۳۶)

اس طرح ان جانوروں کو ہم نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔

لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ (الحج)

ان جانوروں میں تمہارے لیے فائدے ہی فائدے ہیں۔

خدا نے انسان کے لیے جانوروں کو مسخر فرما کر اس پر عظیم احسان فرمایا ہے۔ انسان طرح طرح سے ان جانوروں سے فائدہ اٹھاتا ہے ان کا دودھ پیتا ہے، ان کے گوشت کو غذا بناتا ہے، ان کی ہڈی، کھال اور اون سے ضرورت کی چیزیں تیار کرتا ہے، ان سے کھیتی باڑی میں مدد لیتا ہے۔ قرآن ان فائدوں کی طرف اشارہ کر کے اور ان کی تسخیر کا ذکر فرما کر یہ فکر بنانا چاہتا ہے کہ جس خدائے بزرگ و برتر نے یہ عظیم الشان نعمت عطا کی ہے۔ اسی کے نام پر تمہیں ان کی قربانی کرنی چاہیے۔ قربانی خدا کی عظیم نعمت کا عملی شکریہ ہے۔

قربانی ۔ خدا کی بڑائی کا اظہار

كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ (الحج ۳۷)

خدا نے اس طرح ان چوپایوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم اس کی بخشی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائی کا اظہار کرو۔

خدا کے نام پر ان جانوروں کا ذبح کرنا دراصل اس بات کا اعلان و اظہار ہے کہ جس خدا نے

ت عطا کی ہے اور جس نے ان کو ہمارے لیے مسخر کر رکھا ہے' وہی ان کا حقیقی مالک ہے۔ قربانی
قیقی مالک کا شکریہ بھی ہے اور اس بات کا عملی اظہار بھی کہ مومن دل سے جس خدا کی بڑائی اور
ی پر یقین رکھتا ہے۔ اس کے نام پر جانوروں کا خون بہا کر وہ اس کا عملاً اظہار و اعلان بھی کرتا
۔ اور اسی جذبے کا اظہار ذبح کرتے وقت وہ ان الفاظ سے کرتا ہے۔ اللّٰھُمَّ لَکَ وَمِنْکَ
یا یہ تیرا ہی مال ہے اور تیرے ہی حضور پیش ہے۔

بانی کی روح

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ (الحج ۳۷)

اللہ تعالیٰ کو تو نہ ان جانوروں کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون بلکہ اس کو تمہارا صرف تقویٰ پہنچتا ہے

اسلام سے پہلے لوگ قربانی کر کے اس کا گوشت بیت اللہ کے سامنے لا کر رکھتے اور اس کا
بیت اللہ کی دیواروں پر لتھیڑتے تھے۔ قرآن نے بتایا کہ خدا کو تمہارے اس گوشت اور خون کی
رت نہیں' اس کے یہاں تو قربانی کے وہ جذبات پہنچتے ہیں جو ذبح کرتے وقت تمہارے دلوں میں موجزن
تے ہیں۔ قربانی گوشت اور خون کا نام نہیں ہے' بلکہ اس حقیقت کا نام ہے کہ ہمارا سب کچھ خدا کے
ہے' اور اسی کی راہ میں قربان ہونے کے لیے ہے۔ قربانی کی اسی روح کا اظہار قربانی کرنے
دعا کے ان الفاظ سے بھی کرتا ہے' جو جانور کو قربان کرتے وقت پڑھتا ہے

"بلاشبہ میری نماز اور قربانی' میرا مرنا اور جینا سب اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی
یک نہیں' اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے' اور میں سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں' خدایا! یہ
ی مال ہے' اور تیری ہی جناب میں حاضر ہے۔"

بانی صرف اللہ کے لیے

فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْھَا (الحج ۳۶)

پس ان جانوروں پر صرف اللہ کا نام لو۔

جانوروں پر اللہ کا نام لینا بڑا اہم انداز بیان ہے۔ یعنی ان کو ذبح کرتے وقت اللہ ہی کے نام
ان کو ذبح کرو۔ اور اسی کے نام پر ذبح کرو۔ وہی ہے جس نے ان کو تمہارے قبضہ میں دے رکھا
ے اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ان میں فائدے ہی فائدے رکھے ہیں۔

بانی تمام الٰہی شریعتوں میں

وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ

اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کا

جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ۔ (الحج ۳۴)

ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے، تاکہ (اس امت کے لیے) لوگ ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو خدا نے ان کو عطا فرمائے ہیں۔

یعنی قربانی کا طریقہ ہر امت میں موجود رہا ہے اور ہر امت کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ان چوپایوں کو صرف اسی خدا کے نام پر ذبح کریں جس نے بخشے ہیں اور اسی کا نام لیکر ذبح کریں، تاکہ اس کا شکر بھی ادا ہو اور اس کی بڑائی اور بزرگی کا عمل سے اعتراف بھی ہو۔

قربانی کے جانور خدا پرستی کی نشانی

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللهِ (الحج ۳۶)

اور (قربانی کے) اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ قرار دیا ہے۔

شعیرہ اس محسوس علامت کو کہتے ہیں جو کسی معنوی حقیقت کی طرف متوجہ کرے، قربانی کے یہ جانور اس روحانی حقیقت کی محسوس علامتیں ہیں کہ قربانی کرنے والا دراصل ان جذبات کا اظہار کر رہا ہے کہ میری جان بھی خدا کی راہ میں اسی طرح قربان ہے، جس طرح میں اس جانور کو قربان کر رہا ہوں۔

قربانی کا گوشت خود کھاؤ

فَكُلُوْا مِنْهَا

پس تم خود بھی اس میں سے کھاؤ۔

یہ خدا کا بے پایاں کرم ہے کہ قربانی کا آخرت میں بھی اجر عطا فرماتا ہے اور دنیا میں بھی یہ قربان کیا ہوا جانور ہماری ہی غذا بنتا ہے، قربانی کے دن پسندیدہ بات یہی ہے کہ آدمی قربانی کے گوشت ہی سے کھانا شروع کرے۔ یہ گویا خدا کی طرف سے بندے کی ایک دعوت بھی ہے

نادار محتاجوں کو کھلاؤ

وَاَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيْرَ

اور نادار محتاج کو کھلاؤ۔

قربانی ایک فعل حسن تو ہے ہی ساتھ ہی اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی برکت سے اس دن ہزاروں فقیروں اور محتاجوں کو فراخی کے ساتھ گوشت مل جاتا ہے اور مسلمانوں کا پورا معاشرہ سیر ہو کر خدا کی نعمت سے مستفیض ہوتا اور اس کا شکر ادا کرتا ہے۔

نہ مانگنے والوں کو کھلاؤ

وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ

اور نہ مانگنے والے کو کھلاؤ۔

یعنی ایسے نادار اور غریب جو سوال نہیں کرتے۔

مانگنے والوں کو کھلاؤ

وَالْمُعْتَرَّ (الحج) اور مانگنے والے کو کھلاؤ۔

غرض ہر قسم کے ناداروں، مفلسوں اور ضرورتمندوں کو کھلاؤ۔ تاکہ پورا معاشرہ خدا کی اس دعوت سے لطف اندوز ہو، اور اس کی تکبیر میں سرگرم ہو۔

اونٹ کی قربانی کا روحانی منظر

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ (الحج ۳۶)

اور (قربانی کے) اونٹوں[1] کو ہم نے تمہارے لیے خدا پرستی کی نشانی بنا دیا ہے، اس میں تمہارے لیے خیر ہی خیر ہے۔ پس ان کو قطار در قطار کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو اور جب ان کے پہلو زمین پر ٹک جائیں تو خود کھاؤ اور ان کو کھلاؤ جو مانگنے سے بچتے ہیں اور ان کو بھی جو مانگتے ہیں

اونٹوں کی قربانی کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو ایک قطار میں کھڑا کر کے زور سے ان کے حلقوم میں نیزہ مارا جاتا ہے، جس سے خون کا ایک فوارہ چھوٹتا ہے اور جب خون نکل چکتا ہے تو وہ زمین پر گر پڑتے ہیں۔
قربانی کے اس منظر کو ذرا تصور میں جمائیے اور پھر غور کیجیے — جانوروں کی یہ قربانی کیا ہے۔ یہی تو کہ اسی طرح ہماری جانیں بھی خدا کی جناب میں قربان ہونے کے لیے حاضر ہیں۔ دراصل یہ قربانی اپنی جان کی قربانی کے قائم مقام ہے۔ اس معنویت کے ساتھ اونٹوں کی قربانی پر غور کیجیے۔ ان کے زخمی ہونے، خون بہانے، گرنے اور راہِ خدا میں جان دینے کے منظر پر غور کیجیے ——— ایسا محسوس ہوگا کہ گویا میدانِ جہاد میں خدا پرستوں کی صفیں بندھی ہوئی ہوں، ان کے حلقوم اور سینوں میں تیر پیوست ہو رہے ہوں۔ خون کے فوارے چھوٹ رہے ہوں۔ لالہ زار زمین ان کی جاں نثاری کا ثبوت دے رہی ہو، اور وہ ایک ایک کر کے خدا کے قدموں میں گر گر کر اپنی جانیں پیش کر رہے ہوں۔

---

[1] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مینڈھے اور گائے کی قربانی کو بھی اسی میں شامل فرما دیا ہے۔ (تفصیل آگے آ رہی ہے)

استشراق اور اسلام

(پروفیسر محمود بریلوی (سابق ڈائرکٹر اسلامک کانگریس، قاہرہ مصر)

صلیبی جنگوں میں اپنی شکست فاش کے بعد جب یورپ اور دنیائے عیسائیت پر یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام اور مسلمان، طاقت کے بل پر مٹائے نہیں جا سکتے۔ تو نصرانی مغرب نے (جن میں اسلام دشمن یہودیوں کی کمی نہیں) اپنے مقصد کے حصول کے لیے محاذ و ترکیب جنگ دونوں بدل دیے۔ اور اٹھارویں صدی عیسوی سے نصرانی مغرب نے (جن میں ریاستہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ، جرمنی، فرانس، اسپین، اطالیہ، ہالینڈ، بلجیم اور کنیڈا پیش پیش ہیں) اسلام کے خلاف ایک نیا "کروسیڈ" علمی و ذہنی سطح پر قائم کیا، جس کا نام انھوں نے استشراق یا استشرقیت (Orientalism) رکھا۔ چنانچہ پچھلی دو صدیوں سے مغربی مستشرقین نے بیشتر انگریزی اور کمتر دیگر یورپی زبانوں میں ایسی کتابوں کا انبار لگا دیا جن کی نوعیت دو طرح کی ہے۔ یعنی (۱) یا تو وہ کھلم کھلا اسلام، شارعِ اسلام اور عقائد و اعمالِ اسلام کے خلاف ہیں اور (۲) یا ایسی خطرناک تر کتابیں ہیں جو بظاہر تو اسلام و شارعِ اسلام کے ساتھ رواداری کا مظاہرہ کرتی ہیں لیکن دراصل مسلمان ناظرین کے دلوں میں (جن کی اکثریت عربی زبان و دینی علوم سے بیگانہ ہوتی ہے) عقائد و اعمال اسلام کے خلاف ایسے تشکیک پیدا کر دیتی ہیں جو ان کی گمراہی کا اصلی سبب ہیں۔ اس طرح آج دنیائے اسلام میں (بالخصوص حکمراں و مغربی تعلیم یافتہ طبقات میں) ہر جگہ مسلمانوں میں ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جو اسلام کا ایک جدید اڈیشن مرتب کرنا چاہتا ہے جس کا شارعِ اسلام کے بتائے ہوئے دین سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغرب میں مراکش سے لے کر مشرق میں انڈونیشیا تک تمام دنیائے اسلام میں مغربی تعلیم یافتہ فرقہ (جو بالعموم عنانِ حکومت سنبھالے ہوئے ہے) عقائد و اعمال دین سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ ہر جگہ جمہور و عوام ہی شعائر اسلامی کے پیرو نظر آتے ہیں۔ متمول و صاحب ثروت

بے حس وغیر متاثر ہیں اور علماء اسلام یا تو حیران وششدر ہو کر خانہ نشین ہیں یا پھر اپنی دنیا کمانے کے لیے تمول جاہ کے کاسہ لیس ہیں۔ دنیائے اسلام میں (سوائے معدودے چند افراد کے) ایسا طبقہ ہنوز پیدا نہیں ہوا جو مغربی علوم وفنون سے واقف ہوتے ہوئے تعلیمات و روایات اسلامی کا علمبردار ہو۔

اسلام کے نشاۃ ثانیہ کا اعلان دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے گاہے ماہے ہوتا رہتا ہے مگر یا تو اس کے معلن نااہل، غیر مخلص وخود پرست ہیں، اور یا اس کا تخیل ہنوز تنظیم وتعاون کا محتاج ہے۔ بدنصیبی سے مسلمان ممالک کے حکمراں قوم پرستی کی لعنت میں اس شدت وانہماک سے گرفتار ہیں کہ اسلام کی بین الاقوامی وعالمگیر اخوت کا جذبہ مردہ ہو کے رہ گیا ہے۔ انڈونیشیا اور ملیشیا، عیسائی فلپین کے ساتھ مل کر ملائی قوم کی ایک عظیم الشان "کامن ویلتھ" بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ متحدہ عرب جمہوریہ عربوں کو (جن میں مسلمان، عیسائی، اور غیر صیہونی یہودی سب شامل ہیں) متحد کرکے ایک زبردست "عربستان" بنانے کی تگ ودو کر رہا ہے۔ ترک اپنی قبل از اسلام کی حطاطی تہذیب کے رطب اللساں ہیں اور ایرانی ساسانی ثقافت کے ثناخواں۔ اس ہنگامے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کردہ اسلام جو دنیا میں قومیت کے امتیاز کو مٹا کر صرف مسلمان پیدا کرنے آیا تھا، ان ملائی، عرب، ترک وایرانی وغیرہ عناصر کے درمیان "مسلمان" کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔

اسلام دشمن مغربی دنیا نے مسلمانوں کے اس انتشار وافتراق سے فائدہ اٹھایا۔ اسلام کی جانب سے بے اعتنائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ نسلاً بعد نسل مسلمان ممالک کے مستغنی باشندے محض نام کے مسلمان رہ گئے اور اسلام کی مدافعت وترویج کا کام بعض ایسے ہاتھوں میں محدود ہو کے رہ گیا جنھوں نے مسلمان کہلاتے ہوئے اسلام کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ دنیائے اسلام کے علماء وارباب بست وکشاد یہ سب کچھ دیکھتے رہے لیکن کسی نے میراث رسول کو سنبھالنے کی جسارت نہ کی۔

راقم الحروف نے سالہا سال کی کاوش کے بعد جب اپنی انگریزی کتاب "اسلام ان افریقہ" مکمل کی (جو امریکی مصنف جان گنتھر کی اسلام دشمن کتاب "ان سائڈ افریقہ" کے جواب میں لکھی گئی ہے) تو اس کے دل میں "مستشرقیت" پر انگریزی میں ایک سیر حاصل کتاب کی تالیف وتدوین کی کرید پیدا ہوئی لیکن راقم الحروف کی یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ عنوان ایک عالمگیر سازش کا شکار ہے۔ مسلمانوں کی اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ مغربی زبانوں میں اسلام پر جتنی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب کی

انھوں اور یہودیوں کے علم و فضل کی مرہون منت ہیں اور مسلمان انھیں آمنا و صدقنا کہہ کر گھر لئے پڑھتے ہیں، مثلاً ـــــ "انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور" ڈکشنری آف اسلام" وغیرہ وغیرہ۔

عیسائیوں میں خصوصیت کے ساتھ رومن کیتھولک فرقے نے اسلام کی مخالفت کی ہے۔ یہ اسلام نی بیشتر اس امر پر مبنی ہے کہ عیسائیت اور یہودیت کے برعکس اسلام کا سادہ پیغام دنیائے انسانیت و بآسانی مرغوب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "اوریئنٹلزم" کا عنوان ہی سرے سے اہم قاموسوں مثلاً نسائیکلو پیڈیا برٹانیکا" وغیرہ سے غائب ہے۔ تاکہ اس پر کوئی مواد مہیا نہ ہو سکے اور اسلام دشمنی ، یہ عقلی و ذہنی جنگ اس خاموش محاذ پر مؤثر طور پر لڑی جا سکے۔ بہر نوع راقم الحروف ریسرچ میں پچھلے ئی سال سے مصروف ہے اور اپنی کاوشوں کا نتیجہ انشاء اللہ مستقبل قریب میں دنیائے اسلام ے روبرو پیش کر دے گا۔

راقم الحروف کو یہ دیکھ کر بھی بڑی حیرت ہے کہ نام نہاد و خود ساختہ "اسلام دوست" مستشرقین نا پوری پوری زندگیاں عربی زبان، قرآن حکیم و علوم اسلامی کی تحصیل میں صرف کر دیتے ہیں اور ن میں سے بعض نے The legacy of Islam اور The history of the Arab (وغیرہ قسم کی محققانہ کتابیں بھی مرتب کی ہیں، لیکن اسلام کی ستائش کے باوجود وہ سلام قبول نہیں کرتے۔ جب راقم الحروف نے یہی بات قاہرہ (مصر) میں بوقت ملاقات پیرس رانس) کے مشہور مستشرق پروفیسر کوئی سینیو آنجہانی سے کہی (جو مذہباً رومن کیتھولک تھے) تو وہ ہنس یے اور راقم الحروف اپنی سادہ لوحی پر خفیف ہو کے رہ گیا۔

مسلمان اہلِ قلم کے لیے ایک سخت دشواری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر صرانی و یہودی مصنفین کی کتابوں میں غلاظت اچھلتی ہوئی دیکھتے ہیں لیکن تعلیمات اسلامی کے بلند خلاق کی متابعت میں اس کا منہ توڑ جواب نہیں دے سکتے اور مسلمان مصنفین کی اس خموشی کو اغیار و عداء اسلام اور مسلمانوں کی کمزوری پر محمول کرتے ہیں۔

راقم الحروف نے اپنی سیاحت کے دوران معلوم کیا ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں مغرب جرمنی اور مشرق میں جاپان جہاں دنیاوی حیثیت سے نہایت خوش حال ہیں وہاں روحانی و مذہبی حیثیت سے سخت بدحال ہیں۔ بایں ہمہ اسلام کا پیغام ان ہر دو ممالک میں یقینی کامیابی کا حامل

ہے۔ راقم الحروف نے بذاتِ خود جاپان میں متعدد افراد کو اسلام کا پیرو بنایا اور مغربی جرمنی میں کچھ لوگوں کو اس کے پیغام سے متاثر کیا۔ راقم الحروف کی رائے ناقص میں اگر اسلام کا پیام کامیابی کے ساتھ ان ہر دو ترقی یافتہ ممالک میں پہنچا دیا جائے تو ایک طرف تو خود ان ممالک کو گوناگوں فائدہ پہنچے اور دوسری طرف اسلام کی سربلندی کے مغرب و مشرق میں جھنڈے گڑ جائیں اور یہ کام چنداں دشوار نہیں ہے۔ بشرطیکہ ہم جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق ترقی یافتہ طریق کار کو سامنے رکھ کر ایسے مسلمان مبلغ وہاں بھیجیں، جو خود مضحکہ بننے کے بجائے وہاں کے باشندوں کو متاثر کریں اور اپنے ذاتی کردار کو نمونہ بنا کر اور اسلام مجسم بن کر سامنے آئیں۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی بیش قیمت و نایاب تصنیف جس کا انگریزی ترجمہ جناب محمد آصف قدوائی نے "اسلام اینڈ دی ورلڈ" کے نام سے کیا ہے قابل ذکر ہے۔

راقم الحروف کا گمان ہے کہ آج بھی اللہ کے نیک بندوں سے دنیا خالی نہیں ہے اور ہمارے ہی درمیان اسی دنیا اور اس کی آلائشوں میں ملوث ایسی ہستیاں متحرک ہیں جن کے قلوب اسلام کے تیر سے برمائے ہوئے ہیں اور جن کے دماغوں میں اللہ اور صرف اللہ بسا ہوا ہے۔ کیا عجب ہے کہ وہی اللہ اپنے کسی باہمت و با استطاعت بندے کو مغربی جرمنی اور جاپان میں اسلام کا پرچم لہرانے اور اللہ کا نام بلند کرنے کی توفیق عطا فرما کر مغرب سے لے کر مشرق تک اسلام کے نشاۃ ثانیہ کا آغاز کر دے۔ آمین!

(ماخوذ)

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح حسنِ سیرت کے لحاظ سے تمام انسانوں کے درمیان بے مثال تھے اسی طرح حسنِ صورت کے اعتبار سے بھی بے نظیر اور ظاہری وجاہت و مردانہ حسن و جمال کے کامل ترین نمونہ تھے۔ صحابۂ کرام آپ کے سراپا کا ذکر بھی بڑے وجد انگیز انداز میں کیا کرتے تھے۔ حدیث و سیرت کے ذخیرے اس ذکر سے بھرے ہوئے ہیں۔ سید احمد قادری مدیر زندگی نے مستند کتابوں سے آپؐ کا سراپا ادبی زبان میں حلیۃ النبیؐ کے نام سے مرتب کیا ہے۔ کتاب پر پیش لفظ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے

دعوت و تبلیغ کے شرائط و آداب

(حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رح کے مواعظ حسنہ کی روشنی میں)

(محمد یوسف اصلاحی)

دعوت و تبلیغ دین وہ عظیم الشان فریضہ ہے جسے ہمیشہ انبیاء جیسے اولوالعزم انسان انجام دیتے رہے ہیں، اس لیے اس میدان میں آنے کی وہی لوگ ہمت کریں، جو دعوت و تبلیغ کے ضروری جوہروں سے آراستہ ہوں، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضروری آداب و شرائط سے نہ صرف واقف بلکہ اپنی داعیانہ زندگی کو ہر وقت ان سے آراستہ رکھنے کا حوصلہ رکھیں۔ دعوت و تبلیغ کے یہ شرائط و آداب پانچ ہیں۔ ۱۔ دعوت سے گہری واقفیت۔ ۲۔ اخلاص نیت۔ ۳۔ نرمی اور دل سوزی ۴۔ صبر و تحمل اور تواضع۔ ۵۔ عملی نمونہ۔

۱۔ دعوت سے گہری واقفیت اس راہ کی اولین شرط ہے۔ داعی دوسروں کو جس حق کی طرف بلا رہا ہے، وہ خود اس کے دل کی گہرائی میں اتر چکا ہو، اس کے دل و دماغ پر چھا چکا ہو، اور اس کی روح نے دعوت کی روح کو جذب کر لیا ہو۔

۲۔ دوسری اہم ترین شرط یہ ہے کہ داعی کی نیت خالص ہو، اس کی سرگرمیوں کا محرک محض خدا کی خوشنودی ہو اس کا نصب العین صرف خدا کے دین کا غلبہ اور اس کے کلمے کی سربلندی ہو۔ ریا، شہرت طلبی کی طلب جیسے رکیک مقاصد سے اس کا دل پاک ہو۔

اگر وہ واقعی اپنے مقصد میں سچا ہے، اپنے نصب العین میں مخلص ہے، تو وہ ضرور خدا کی نصرت و توفیق سے نوازا جائے گا۔ اور یقیناً اس کی مخلصانہ تگ و دو فواحش و منکرات، خدا فراموشی اور نافرمانی کے قلعوں کو مسمار کر دے گی۔

خدائے برتر کا ارشاد ہے:۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ	اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے قدموں میں ثبات پیدا فرمائے گا۔

ایک اور ارشاد ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ○	یہ حقیقت ہے کہ خدا ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کریں اور اس کے وفادار بن کر رہیں۔

پس اگر داعی شرک وکفر کی گندگیوں سے اپنا دامن بچائے رہے، خدا کے دین کو پھیلانے میں لوگوں کے خوف اور لالچ سے بے نیاز رہے۔ اور خلوص کے ساتھ محض اپنے رب کو خوش کرنے کی خاطر نیک کاموں میں لگا رہے، تو خدائے بلند و بالا ضرور اس کو فتح وظفر سے ہمکنار فرمائے گا۔ اور وہ یقیناً اپنے مقصد میں شادکام ہوگا۔

لیکن اگر اس کی نیت میں کھوٹ ہے، اس کی کوششوں کا محرک اعلاء کلمۃ اللہ کے سوا کچھ اور ہے تو ایک طرف تو خدا اس پر ذلت، خسران، رسوائی اور بے عزتی مسلط کر دے گا۔ دوسری طرف اس کو اس توفیق سے بھی محروم رکھے گا کہ اس کے ہاتھوں برائیوں کا بازار اجڑے اور نیکیوں کی کھیتی لہلہائے بلکہ اس دنیا پرست کی نام نہاد دینی کوششوں سے برائیاں اور برگ وبار لائیں گی۔ منکرات کا بازار اور گرم ہوگا۔ نافرمانوں اور معصیت کاروں کی جراتیں اور بڑھیں گی اور جن وانس کے شیطان اور ڈھیٹ ہوجائیں گے اور متحد ہو کر خدا اور رسول کے خلاف علم بغاوت بلند کریں گے۔ خدا کی اطاعت کا دن ڈوبنے لگے گا اور گناہوں کی رات چھانے لگے گی۔

تیسری اہم شرط یہ ہے کہ داعی سوز ومحبت، نرمی اور شفقت کا پتلا ہو، انسانیت کے درد سے بے قرار ہو، اور پوری انسانیت کے لیے اس کے دل میں وہ سوز گداز وہ رحمت وشفقت ہو، جو کسی دل میں سگے بھائی کے لیے ہوتی ہے۔

بدگوئی، سخت کلامی، بدمزاجی اور سخت گیری جیسے شیطانی جذبات سے اس کا سینہ محفوظ ہو، اور وہ شیطان کی مکاریوں سے ہر وقت چوکنا رہے، داعی حق آخر اس شیطان لعین سے کیسے مطمئن

ہو کر بیٹھ سکتا ہے اور اس کی مکاریوں کو گوارا کر سکتا ہے۔ جو ہر وقت مومن کی عقل پر غلبہ پانے کی فکر میں ہے کہ اسے خدا سے دور کر سکے، اس کو معصیت پر آمادہ کر سکے اور جنت کی طرف بڑھنے والے کو اپنے پھندوں میں پھانس کر تباہ و برباد کر کے دہکتے جہنم میں دھکیل دے۔

خداوند عالم کا ارشاد ہے:۔

اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ — وہ تو اپنے پیروؤں کو اس راہ پر بلاتا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں۔

اور خدائے رحیم نے اپنے رسول کو خطاب فرماتے ہوئے کہا ہے:۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ — یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تندخو، سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔

اور موسٰیؑ اور ہارونؑ کو فرعون کی طرف بھیجتے ہوئے خدا تعالٰی نے تاکید فرمائی۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى — پس تم دونوں اس سے نرمی کی بات کہنا، ممکن ہے کہ وہ غور کرے اور خشیت اختیار کرے۔

اور خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے "حدیث اسامہ" میں ارشاد فرمایا ہے۔" کسی کے لیے یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے جب تک اس میں تین خوبیاں نہ ہوں۔ ایک یہ کہ وہ ان حقیقتوں کا گہرا علم رکھتا ہو جن کا لوگوں میں پرچار کر رہا ہے، اور ان منکرات کی حقیقت سے بھی آشنا ہو جن سے لوگوں کو روک رہا ہے۔ پھر وہ لوگوں کو دعوت دینے میں انتہائی نرم خو اور روکنے میں انتہائی رحم دل ہو۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ داعی، صبر، بردباری، تحمل اور تواضع کے اخلاقی جوہروں سے آراستہ ہو، خواہشات پر قابو رکھنے کی قوت و صلاحیت رکھتا ہو، مضبوط قوت ارادی کا مالک ہو، صاحب مروت ہو، درد مند طبیب کی طرح مریض سے پیش آتا ہوا و رہوشمندوں کی طرح نادانوں کا علاج کرتا ہو، اور لوگوں کو اپنی رہنمائی اور قیادت میں بڑھائے جانے کی قوت اور عزم رکھتا ہو۔

خدائے کائنات کا ارشاد ہے:۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً	اور ان میں سے ہم نے پیشوا بنائے جو
يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا	ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے، جب انھوں
صَبَرُوا	نے صبر کا ثبوت دیا۔

یعنی یہ مقام بلند ان کو اس وقت ملا۔ جب انھوں نے دین کی نصرت، سربلندی اور اقامت کی را
میں قوم کی جانب سے پہنچنے والے ہر ظلم و ستم کو خوشی خوشی برداشت کیا اور پورے استقلال اور
دل سوزی کے ساتھ قوم کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔

حضرت لقمانؑ کے تذکرے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ	اور نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو،
عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا	اور جو مصیبت بھی پڑے اسے صبر کے ساتھ
أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ	برداشت کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بڑے
الْأُمُورِ ○	حوصلے کا کام ہے۔

پانچویں آخری شرط یہ ہے۔ داعی اپنی دعوت کا کامل نمونہ ہو، اس کی عملی زندگی دعوت کی
شہادت ہو۔ وہ جن حقائق کی طرف لوگوں کو پکار رہا ہے، خود ان کا محسوس پیکر ہو اور جن منکرات سے وہ
کو بچنے کی تلقین کر رہا ہے، ان کے سایے سے اس کی زندگی پاک ہو، اسی وقت اس کی آوا
میں اثر ہو سکتا ہے اور اس کی دعوت بارآور ہو سکتی ہے، ورنہ، نہ صرف یہ کہ بے عملی کی دعو
قبول نہ کی جائے گی بلکہ لٹے نافرمان لوگ اس پر چھا جائیں گے۔ اور اس کی دعوت دب دب
مٹ جائے گی اور خدا کی نظر میں بھی وہ مجرم اور قابل ملامت قرار پائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ	کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور
تَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ	خود کو بھول جاتے ہو۔ درآنحالیکہ تم خدا کی
الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○	کتاب پڑھتے ہو۔ کیا تم اتنا نہیں سمجھ پاتے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "حدیث انس" میں ارشاد فرمایا ہے:۔
"جس رات مجھے معراج کرائی گئی میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ اپنے ہونٹ قینچیوں سے کا

ہیں، میں نے پوچھا۔ جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل نے کہا۔ "اے خدا کے رسول! (آپ پر سلام ہو) یہ آپ کی امت کے وہ خطیب اور واعظین ہیں جو لوگوں کو تو نیکیوں کا حکم دیتے تھے، اور اپنے آپ کو بھولے ہوئے تھے، حالانکہ وہ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے تھے

اللہ کیا خوب کہا ہے شاعر نے!

لا تنہ عن خلق وتاتی مثلہ   عار علیک اذا فعلت عظیم

(لوگوں کو برائی سے نہ روکو جب تم خود اسی طرح کی برائیوں میں مبتلا ہو۔ تمہارے لیے بڑے ہی شرم کی بات ہے۔ جب تم خود وہی برائی کرو (جس سے لوگوں کو روک رہے ہو۔)

اور حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں۔ ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ تورات میں خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "ابن آدم دوسروں کو میرا ذکر سناتا ہے اور خود مجھے بھولا ہوا ہے، دوسروں کو میری طرف بلاتا ہے اور خود مجھ سے دور بھاگتا ہے۔ ایسے لوگوں کی دعوت بالکل رائیگاں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود کو مستثنیٰ کر کے زور شور سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ خدائے برتر و عالی ان کی دعوت و تبلیغ کی ضرورت سے بہت بلند و برتر اور قطعاً بے نیاز ہے۔

نیند کے باب میں سائنس کیا کہتی ہے

ایڈورڈ ایشپول   ترجمہ ش ن۔ عثمانی

شاعر کے نزدیک نیند فطرت کی راحت بخش اتنا ہے جو ہماری بیداری کی پریشانیوں اور تھکن کا بوجھ ہلکا کر دیتی ہے۔ اس کو ایک ایسا راز تسلیم کیا گیا ہے کہ جس کے متعلق محویت کے ساتھ سوچا جائے۔

چھوٹی سی موت

البتہ سائنس والوں کی نظر میں نیند کا درجہ راز سے کم ہے۔ —— ایک مانا ہوا راز تو یقیناً ہے ہی نہیں۔ ابھی چند برسوں سے سائنس داں یہ بات سمجھنے لگے ہیں کہ ہم کس طرح اور کیوں سوتے ہیں۔ لیکن گزشتہ دو سال کے عرصے میں دماغی برقی لہروں کا ریکارڈ کرنے والے آلے کی مدد سے جو تحقیقات ہوئی ہیں انھوں نے اس چیز کے متعلق ہمیں بہت کچھ بتایا ہے جس کو شاعرانہ اصطلاح میں آدمی کی چھوٹی سی موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

برطانیہ کے سائنسی جریدے "ڈسکوری" کی نومبر کی اشاعت میں اس پر لکھتے ہوئے ایڈنبرگ یونیورسٹی کے ڈاکٹر آئن اوسولڈ نے جو نیند کے متعلق اعلیٰ درجے کی سند ہیں خود اپنی اور دوسرے کارکنوں کی تحقیقات کا تازہ ترین حال بیان کیا ہے۔

اس کے بعد جبکہ ہم کو غنودگی آچکی ہو ہماری پہلی قسم کی نیند جس کو سائنس داں "بنیادی ابتدائی نیند" کے نام سے یاد کرتے ہیں دماغ کی برقی لہروں کو ناپنے والے کے ذریعے دماغ کی سست رو، گہری لہروں کی شکل میں ریکارڈ کی جاتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ معمول گہری نیند سو رہا ہے کوئی بھی نیند ہو اس کی مدت کا آغاز اسی مرحلے سے ہوتا ہے۔

تقریباً گھنٹہ بھر بعد نیند کا دوسرا مرحلہ "عقبی دماغی نیند کا مرحلہ" آپہنچتا ہے۔ جن دماغی لہروں کا ریکارڈ کیا گیا تھا وہ تبدیل ہوتی ہیں اور آنکھوں کی کلبلاتی ہوئی حرکت شروع ہوتی ہے۔

رہ رہ کر آنکھوں کی اس حرکت سے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ سونے والا معمول اب کم گہری نیند میں ہے۔ مگر بات یہ نہیں۔ کیونکہ جب دماغ کے عقبی گوشے کی نیند شروع ہوتی ہے تو ہمارے اعصاب زیادہ ڈھیلے پڑجاتے ہیں۔

آنکھوں کی اس حرکت نے بہت دلچسپ انکشاف تک سائنس دانوں کی رہنمائی کی ہے جب دماغ کے عقبی حصے کی نیند کے دوران میں ان حرکتوں پر پہلی بار نظر پڑی تو سائنس دانوں نے یہ خیال کیا کہ اپنے خوابوں کی دنیا کی چیزیں دیکھتے ہوئے یہ سونے والے ہی کی حرکت و عمل ہے۔

اس مفروضے کو پرکھنے اور جانچنے کے لیے ان زیر تجربہ معمولوں کو دماغ کے عقبی حصے کی نیند کے دوران میں جگایا گیا تاکہ پتہ چل سکے کہ وہ خواب دیکھ رہے تھے کہ نہیں؟ عام طور پر وہ دیکھ رہے ہوتے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جن کا کہنا تھا کہ ہم کبھی خواب دیکھتے ہی نہیں ان کو جب دماغ کے عقبی حصے کی اس نیند کے دوران میں بیدار کیا گیا تو انھوں نے اقرار کیا کہ فی الواقع وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ اس کے برخلاف جب سونے والوں کو "ابتدائی نیند" کے وقت اٹھایا گیا تو وہ شاذونادر ہی خواب دیکھتے ہوئے پائے گئے۔

یہ تجربات جن کو پہلے پہل شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر نیتھانیل کلیٹ مین نے کیا تھا۔ بعد میں دنیا کے مختلف حصوں کی تحقیقاتی ٹیموں کے ذریعہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گئے۔

اندھوں کے خواب اس پر اضافہ یہ ہوا کہ اندھوں کے خوابوں پر تجربات کے ذریعہ اس عمل کی تصدیق

ی گئی۔ پیدائش کے وقت سے یا ابتدائی بچپن سے جو لوگ اندھے ہوتے ہیں ہر کسی شخص کی طرح
قبی داخلی حصہ کی نیند سوتے ہیں۔ دماغ کی برقی لہروں کو ریکارڈ کرنے والا اس کی تصدیق کرتا
ہے۔ البتہ "اندھے معمولوں" میں آنکھوں کی حرکت و جنبش نہیں ملتی۔ اس عقبی نیند کے دوران میں اندھے
عمول بھی یقیناً خواب تو دیکھتے ہیں لیکن جیسا کہ توقع ہو سکتی ہے ان کو خواب میں کچھ دکھائی نہیں دیتا
یں ایسے لوگ جو بہت طویل عرصے سے نابینا نہ رہے ہوں اور جن کو خوابوں میں ابھی تک دکھائی دیتا
ہو ان کی آنکھوں میں عقبی نیند کے دوران جنبش بھی ہوا کرتی ہے۔

اس طرح ہم دو مختلف قسم کی نیندوں کے درمیان راتیں بسر کرتے ہیں۔ ہم ابتدائی بنیادی
نیند سے چلتے ہیں اور تقریباً گھنٹہ بھر بعد دماغ کے عقبی حصے والی نیند کے مرحلے میں داخل ہو جاتے ہیں۔
ہر ایک یا ڈیڑھ گھنٹے میں یا اس کے لگ بھگ ہم نیند کے اس مرحلے میں داخل ہوتے ہیں جس کی
مدت ایک عام رات بھر کی نیند میں مجموعی طور پر تقریباً دو گھنٹے ہوتی ہے — یہ ایک موٹا سا اندازہ ہے
اس وقت کا کہ جتنی دیر ہم ہر ایک شب خواب دیکھا کرتے ہیں۔ ہم کو اس قدر زیادہ خواب دیکھنے کا پتہ
نہیں چلتا کیونکہ جب اس عقبی نیند سے بنیادی' ابتدائی نیند میں پلٹتے ہیں — جیسا کہ ہم دوران شب
میں بار بار کیا کرتے ہیں — تو تیزی کے ساتھ ہم ان خوابوں کو بھول جاتے ہیں۔

یقیناً ہم بہت دیر تک سوئے بغیر کام نہیں چلا سکتے اور ہمیں دونوں قسموں کی نیند درکار ہے
۔۴ گھنٹے تک جاگنے کے بعد ہمارے زیر تجربہ معمولی خفقان اور دماغی آشوب میں مبتلا ہونے لگتے ہیں
اور بے خوابی کے تقریباً ۴۰۰ گھنٹوں کے بعد تو مکمل شکست و ریخت ہی ہو جاتی ہے۔

ریڈرز ڈائجسٹ ویکلی، ۸ دسمبر ۶۳ء

سکونِ موت

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات کو تمہارے لیے لباس
اور نیند کو سکونِ موت
اور دن کو جی اٹھنے کا وقت بنایا۔ (قرآن مجید)

رسائل و مسائل

عشری زمین اور سونے کا نصاب

گزارش یہ ہے کہ عشر کے بارے میں جو اشارات قرآن میں ہیں مثلاً وَاٰتُوا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ ــــ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمین کی پیداوار پر عشر ہے۔ حدیث سے بھی کوئی تخصیص مفہوم نہیں ہوتی لیکن مذہب حنفی کے ترجمان عشر کی جو تشریح کرتے ہیں اس کی رو سے شاید ہی کوئی زمین عشر کی زد میں آئے گی۔ پاکستان اور ہندوستان کی تمام اراضی عشر کے فریضے سے بے نیاز ہو جائیں گی۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہشتی زیور اور دیگر رسائل میں لکھا ہے اور جناب کی نظر سے گزرا ہوگا کہ جو زمین مسلمان فاتحین نے فتح کر کے مسلمانوں میں تقسیم کر دی ہے وہ عشری ہے۔ اس کے علاوہ تمام اراضی میں عشر نہیں ہے۔ ایسے ہی وہ اراضی جو کفار سے مسلمانوں نے خریدلی ہیں ان میں بھی عشر نہیں ہے۔ اب پاکستان میں جن زمین پر مہاجر آباد ہوئے ہیں جو کہ کافروں کی متروکہ اراضی ہیں، لازمی طور پر عشر سے خالی رہیں گی۔ جناب سے گزارش ہے کہ اس مسئلے پر تبصرہ فرمائیں۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ چاندی اور سونے کے نصاب میں کوئی تقارب نہیں ہے بلکہ بے پناہ تفاوت ہے۔ ساڑھے سات تولے سونے کی مالیت سے باون تولے چاندی کو کوئی نسبت نہیں ہے اس تفاوت اور عدم تقارب کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک انسان کے پاس فقط سات تولے سونا ہے تو اس کے ذمے زکوٰۃ نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پاس ایک تولہ سونا ہے اور چار تولہ چاندی ہے، تو اس پر زکوٰۃ ہے۔ کیونکہ دونوں ناقص نصاب، ایک نصاب کی تکمیل کرتے ہیں

ایک تولہ سونا کی چاندی باون تولے سے زیادہ آتی ہے۔ اب دیکھیے کہ ساڑھے سات تولے والا بچارہا ایک تولہ والا پکڑا گیا۔ یہ کرشمہ ہے عدم تقارب اور تفاوت کا۔ امید ہے کہ جناب ضرور توجہ فرمائیں گے۔

جواب

عُشر کے بارے میں آپ نے فقہ حنفی کی جو ترجمانی کی ہے وہ بہت ہی ناقص ہے اور بہشتی زیور کا آپ نے جو حوالہ دیا ہے وہ بھی نامکمل ہے۔ میں ذیل میں بہشتی زیور کی پوری عبارت نقل کرتا ہوں

مسئلہ ۱۔ کوئی شہر کافروں کے قبضے میں تھا وہی لوگ وہاں رہتے تھے، پھر مسلمان اُن پر چڑھ آئے اور لڑ کر اُن سے وہ شہر چھین لیا اور وہاں دین اسلام پھیلایا اور مسلمان بادشاہ نے کافروں سے لے کر شہر کی ساری زمین انہیں مسلمانوں کو بانٹ دی (یعنی وہ مسلمان جنھوں نے وہ ملک فتح کیا تھا اور یہی حکم ہے اگر ان کے سوا دوسرے مسلمانوں میں تقسیم کر دے، حاشیہ مولانا تھانوی) تو ایسی زمین کو شرع میں عشری کہتے ہیں، اور اگر اس شہر کے رہنے والے لوگ، سب کے سب اپنی خوشی سے مسلمان ہو گئے لڑنے کی ضرورت نہیں پڑی تب بھی اس شہر کی سب زمین عُشری کہلاوے گی اور عرب کے ملک کی ساری زمین عُشری ہے۔

مسئلہ ۲۔ اگر عشری زمین کوئی کافر خریدے تو وہ عشری نہیں رہتی۔ پھر اگر اس سے مسلمان بھی خریدے یا کسی اور طور پر اس کو مل جائے تب بھی وہ عشری نہیں ہوگی۔

(بہشتی زیور مکمل و مدلل حصۂ سوم)

مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ تین قسم کی زمینیں عشری ہیں۔
(۱) کسی مفتوحہ ملک کی وہ زمینیں جو مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئی ہوں (۲) وہ زمینیں جن کے مالک بغیر جنگ و قتال برضا و رغبت خود مسلمان ہو گئے ہوں۔ (۳) ملک عرب کی تمام زمینیں۔
اس تقسیم کی رو سے بھی ہندوستان و پاکستان میں مسلمانوں کی معتدبہ زمینیں عشری قرار پاتی ہیں کیونکہ بہت ساری زمینیں مسلمان بادشاہوں کی عطا کردہ ہیں اور بہت ساری وہ ہیں جن کے مالک برضا و رغبت مسلمان ہو گئے تھے۔ اس لیے آپ کا یہ کہنا کہ "مذہب حنفی کے ترجمان، عُشر کی جو تشریح کرتے ہیں اس کی رو سے شاید ہی کوئی زمین عُشر کی زد میں آئے گی" صحیح نہیں ہے۔ مولانا تھانوی رحمۃ

مئلہ میں جو بات کہی ہے وہ کسی زمین کے عشری نہ رہنے اور خراجی بن جانے کی ایک صورت ہے
ن کی عبارت کی اتنی توضیح کافی ہے۔ اب اس سے الگ ہو کر غرض ہے کہ فقہ حنفی میں جس طرح عشری
مینوں کی تعیین کی گئی ہے اسی طرح خراجی زمینوں کی تعیین بھی کی گئی ہے۔ فقہائے احناف کے نزدیک
سی زمین کے خراجی ہونے کی چار صورتیں ہیں۔

(۱) عجمی ملکوں میں سے کسی ملک پر امام المسلمین کا غلبہ ہو جائے اور وہ وہاں کی زمینوں کو غیر مسلم
شندگان ملک ہی کے ہاتھوں میں چھوڑ دے۔

(۲) کسی غیر مسلم ملک کے باشندے بطور خود امام المسلمین سے صلح کر کے ذمی بننا قبول کر لیں تو
ن کی مقبوضہ زمینیں بھی خراجی ہوں گی۔

(۳) کسی مسلمان نے کسی غیر مسلم سے خراجی زمین خریدلی تو اس صورت میں بھی وہ زمین خراجی ہی
ہے گی عشری نہ ہوگی۔

(۴) کسی غیر مسلم نے کسی مسلمان سے عشری زمین خریدلی تو اب وہ زمین خراجی بن جائے گی عشری
ی نہ رہے گی۔

اس تفصیل کو سامنے رکھ کر ہندوستان کی زمینوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں اب
وئی زمین خراجی باقی نہیں ہے۔ حکومت مال گزاری کی شکل میں جو کچھ لے رہی ہے وہ شرعی خراج
یں ہے اور اسی سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اب مسلمانوں کے قبضہ وملکیت میں جتنی زمینیں ہیں وہ سب
ری ہیں اور ان پر عشر واجب ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کی زمینوں کے بارے میں یہ سوال پیدا
تھا۔ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور دارالعلوم دیوبند کے مفتی صاحب نے فتویٰ
تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے پاس جو زمینیں ہیں وہ عشری ہیں۔ یہ دونوں فتوے مولانا عبدالشکور
ننوی مرحوم ومغفور نے "علم الفقہ" میں درج کیے ہیں۔ ابھی حال میں دارالعلوم دیوبند کی طرف سے
ل مبتوب فتاوی شائع ہوئے ہیں اس میں دو جگہ یہ مسئلہ موجود ہے ایک جگہ لکھا ہے :-

"ہندوستان کی تمام زمینوں کا ایک حکم نہیں ہے، البتہ جو زمین مملوک مسلمین ہے اس میں عشر
واجب ہے، مسلمانوں کو عشر نکالنا چاہیے۔" (جلد سوم وچہارم صفحہ)

اسی جلد کے صفحہ ۱۷ پر ہے :-

"ہندستان میں اراضی مملوکہ مسلمین کو عشری سمجھنا چاہیے۔

پاکستان میں جن زمینوں پر مہاجر آباد ہوئے ہیں ان کا حکم وہیں کے علماء سے دریافت کیجیے اس لیے کہ صورت حال سے وہ براہ راست واقف ہوں گے ویسے اس حقیر کی رائے میں ان زمینوں پر بھی عشر واجب ہوگا۔

آپ نے دوسری جو بات پوچھی ہے اس کا جواب مجھ جیسا طالب العلم کیا دے سکتا ہے۔ اس مسئلے کا فیصلہ تمام مذاہب فقہ کی نمائندہ مجلس علماء ہی کر سکتی ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے عہد میں بلکہ اس عہد سے بہت بعد تک قیمت کے اعتبار سے چاندی اور سونے کے نصاب میں فرق نہ تھا۔ سونے کا مشہور نصاب بیس دینار ہے اور اس زمانے میں ہر دینار دس درہم کا مانا جاتا تھا۔ اس طرح سونے کا نصاب بھی دراصل دو سو درہم کے برابر ہی تھا۔ یہ بات بھی اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ احادیث سے جس صحت کے ساتھ چاندی کا نصاب ثابت ہے اتنی صحت کے ساتھ سونے کا نصاب ثابت نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ائمۂ فقہ کے درمیان سونے کے نصاب میں اختلاف رہا ہے۔

اب اس دور میں چاندی اور سونے کے درمیان عظیم تفاوت کو دیکھتے ہوئے علماء کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ سونے کا نصاب کیا ہو۔

نکاح کی ایک صورت

"ایک شخص کا نکاح اس طرح ہوا کہ وہ خود اکولہ میں تھا اور دلہن بمبئی میں تھی۔ اکولہ سے صرف ایک وکیل اور دو گواہ بمبئی گئے اور وہاں وکیل نے دولہا کی طرف سے نکاح قبول کیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ عقد نکاح صحیح ہوا یا نہیں؟"

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ نکاح صحیح ہوا جس طرح عورت حق دار ہے کہ اپنے نکاح کے لیے کسی کو وکیل بنائے اسی طرح مرد کو بھی یہ حق حاصل ہے۔

حبشہ کے بادشاہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وکیل بن کر ام حبیبہ کا نکاح حضرت حضور سے کیا تھا۔

(سید احمد قادری)

رُوداد اجلاس مجلس نمائندگان

منعقدہ ۱۲ تا ۱۴ مارچ ۶۴ء

الحمدللہ کہ مجلس نمائندگان کا اجلاس ۱۲ مارچ ۶۴ء بروز پنجشنبہ ۹ بجے صبح سے مرکز جماعت اسلامی ہند واقع دہلی میں زیر صدارت مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی شروع ہوکر بتاریخ ۱۴ مارچ ۶۴ء بروز شنبہ ۴ بجے شام بحسن وخوبی اختتام پذیر ہوا۔ اس مجلس کا اصل کام نئی میقات شوال ۸۳ھ تا رمضان ۸۷ھ کے لیے امیر جماعت اور مجلس شوریٰ کا انتخاب کرنا تھا۔

شرکاءِ اجلاس اجلاس میں درج ذیل ۵۱ ارکان مجلس نے شرکت فرمائی۔

(۱) جناب محمد حنین صاحب آسام۔ (۲) جناب عبدالفتاح صاحب، بنگال و اڑیسہ۔ (۳) مولانا سلمان ندوی صاحب، شمالی بہار۔ (۴) مولانا طیب خاں صاحب، شمالی بہار۔ (۵) جناب انیس الدین احمد صاحب۔ (۶) جناب سید ضیاء الہدیٰ صاحب، جنوبی بہار۔ (۷) مولانا حبیب اللہ صاحب (۸) مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی۔ (۹) ماسٹر التفات احمد صاحب۔ (۱۰) مولوی محمد صدیق صاحب۔ (۱۱) حکیم وجیہ اللہ صاحب (۱۲) مولوی شبیر احمد صاحب۔ (۱۳) مولوی محمد خلیل رحمانی صاحب مشرقی یوپی (۱۴) ماسٹر سید جعفر علی صاحب۔ (۱۵) جناب سعید اختر صاحب (الہ آباد) (۱۶) مولانا عبدالغفار صاحب، لکھنؤ (۱۷) مولانا سلیمان قاسمی صاحب۔ (۱۸) مولانا محمد یوسف صاحب اصلاحی۔ (۱۹) مولانا منظور الحسن صاحب ہاشمی۔ (۲۰) جناب عبدالحی صاحب، رامپور۔ (۲۱) مولانا محمد عزیر صاحب (۲۲) جناب نجات اللہ صدیقی صاحب۔ (۲۳) جناب راؤ شمشاد علی خاں صاحب۔ (۲۴) جناب مولانا سید حامد علی صاحب (۲۵) جناب محمد شفیع صاحب مونس، دہلی (۲۶) مولانا انتظام الدین صاحب بھوپال۔ (۲۷) مولانا مظہر الحق صاحب، راجستھان۔ (۲۸) جناب عبدالرشید عثمانی صاحب (۲۹) جناب سلطان احمد خاں صاحب۔ (۳۰) جناب سید اصغر علی صاحب عابدی (۳۱) مولانا شمس پیرزادہ صاحب، بمبئی۔ (۳۲) جناب محمد نعیم اللہ صاحب (۳۳) جناب عبدالقیوم صاحب اورنگ آباد

(۳۴) جناب عبدالرزاق صاحب لطیفی۔ (۳۵) جناب عنایت المغیث صاحب۔ (۳۶) جناب ابوسعید محمد بن عبداللہ صاحب۔ (۳۷) مولانا صغیر احمد صاحب انور حیدرآباد۔ (۳۸) جناب عبدالعزیز صاحب آندھرا (۳۹) جناب سراج الحسن صاحب میسور۔ (۴۰) جناب مولانا شیخ عبداللہ صاحب مدراس۔ (۴۱) جناب کے سی عبداللہ صاحب (۴۲) جناب ٹی کے عبداللہ صاحب (۴۳) جناب کے مؤید صاحب (۴۴) جناب اے کے عبدالقادر صاحب (کیرلہ) (۴۵) مولانا سید احمد صاحب عروج قادری۔ (۴۶) مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی (۴۷) مولانا سید جلال الدین انصر صاحب (۴۸) جناب افضل حسین صاحب (۴۹) جناب محمد مسلم صاحب (۵۰) جناب سید حامد حسین صاحب (مرکز) (۵۱) محمد یوسف قیم جماعت (معتمد مجلس)

غیر حاضر ارکان مجلس ۔ حسب ذیل ارکان بعض معذوریوں کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہو سکے

(۱) جناب محمد نسیم صاحب لکھنؤ۔ (۲) جناب اکرام الدین احمد صاحب الہ آباد (۳) جناب ارشاد حسین صاحب جعفری رامپور (۴) جناب پی محمد ابوالجلال صاحب (۵) جناب ٹی پی عبداللہ صاحب (۶) جناب ٹی محمد صاحب کیرلہ۔ (۷) جناب محمود احمد خاں صاحب اورنگ آباد۔

کارروائی ۔ اجلاس کی کارروائی مولانا محمد یوسف صاحب اصلاحی کی تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد ارکانِ مجلس کا ایک دوسرے سے تعارف ہوا۔ تعارف کے بعد ایجنڈے کے مطابق مجلس کی کارروائی شروع ہوئی اور سب سے پہلے گزشتہ مجلس نمائندگان منعقدہ اپریل ۱۹۶۰ء کی روداد کی قیم جماعت نے خواندگی کی جس کے بعد شرکائے مجلس نے روداد پر دستخط ثبت کیے۔

اس کے بعد قیم جماعت نے گزشتہ میقات شوال ۷۹ھ تا رمضان ۸۳ھ سے متعلق جماعت کی چہار سالہ کارگزاری کی رپورٹ پیش کی اور آمد و رفت کا گوشوارہ پڑھکر سنایا۔ ارکان مجلس میں سے بعض نے کچھ وضاحتی سوالات کیے جن کا جواب امیر جماعت نے دیا۔

انتخاب امیر ۔ اس کارروائی کے بعد امارت کے انتخاب کے لیے حسب ذیل دو نام پیش کیے گیے۔

(۱) مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی (۲) مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی۔

مذکورہ دونوں ناموں پر دونوں اصحاب کی عدم موجودگی میں مجلس نے ایک غیر رسمی نشست میں تبادلہ خیال کیا جس کے بعد مجلس کی باقاعدہ نشست میں ارکان مجلس نے اپنی رائیں تحریری طور پر پیش کیں۔ رائے شماری کے نتیجے میں مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی کو ۴۳ اور مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی کو ۱۷ رائیں حاصل ہوئیں۔

چنانچہ مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی امیر جماعت منتخب کر لیے گئے۔

انتخاب کا نتیجہ سامنے آجانے کے بعد مولانا ابواللیث صاحب نے گوناگوں وجوہ سے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے معذرت کا اظہار فرمایا۔ لیکن رفقاء کے اصرار کے پیش نظر مولانا نے امارت کی ذمہ داری کو قبول فرمایا اور موصوف نیز سارے ارکانِ مجلس نے اجتماعی طور پر بارگاہِ ایزدی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اللہ سے مدد طلب فرمائی۔

مجلس شوریٰ کا انتخاب ۔ اس کے بعد ارکان مجلس نمائندگان نے اپنے میں سے ۱۴ ارکان مجلس شوریٰ کے انتخاب کے لیے تحریری رائیں پیش کیں۔ رائے شماری کے نتیجے میں حسب ذیل ارکان مجلس شوریٰ کے ارکان منتخب ہوئے۔

(۱) مولانا صدرالدین صاحب (۲) جناب محمد مسلم صاحب (۳) مولانا سید حامد علی صاحب (۴) مولانا شمس پیرزادہ صاحب (۵) جناب سید حامد حسین صاحب (۶) جناب محمد عبدالحی صاحب (۷) جناب سید انیس الدین احمد صاحب (۸) جناب کے سی عبداللہ صاحب (۹) جناب افضل حسین صاحب (۱۰) جناب محمد نجات اللہ صاحب صدیقی۔ (۱۱) جناب مولانا سید احمد صاحب قادری۔ (۱۲) جناب عبدالرزاق صاحب لطیفی (۱۳) مولانا نظام الدین صاحب (۱۴) جناب محمد شفیع صاحب مونس۔

دستور جماعت کی تصحیح ارکان مجلس شوریٰ کے انتخاب کے بعد گزشتہ مجلس نمائندگان منعقدہ نومبر ۶۰ء کی روداد جو ترمیم دستور سے متعلق تھی پڑھ کر سنائی گئی۔ روداد کی خواندگی کے پیش نظر مندرجہ ذیل تین مقامات پر شائع شدہ دستور جماعت میں حسب ذیل تصحیح کی گئی۔

(۱) دستور کی دفعہ ۲۸ شق ۲ میں "امیر جماعت" کے لفظ کے بعد اور لفظ "شوریٰ" سے پہلے "مجلس" کے لفظ کا اضافہ کر دیا گیا۔

(۲) دستور کی دفعہ ۷۳ شق ۵ میں لفظ "پالیسی" کے بعد "پروگرام" کے لفظ کا اضافہ کر دیا گیا۔

(۳) دستور کی دفعہ ۶۹ تشریح ۱ میں لفظ جواب کے بعد "کے" کا اضافہ کر دیا گیا۔

نئی میقات کی مدت ۔ یہ طے ہوا کہ موجودہ میقات کا اختتام ۳۱ مارچ ۶۸ء کو ہوگا۔ اس کے بعد دعا پر اجتماع برخاست ہوا۔

محمد یوسف، قیم جماعت اسلامی ہند

روداد اجتماع امرائے حلقہ جات

منعقدہ ۱۶ مارچ ۶۴ء

مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی میں مجلس نمائندگان کے اختتام کے بعد بتاریخ ۱۶ مارچ ۶۴ء جماعت کے تنظیمی حلقوں کے امراء کا ایک اجتماع زیر صدارت مولانا ابو اللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند منعقد ہوا حسب ذیل امرائے حلقہ جات نے اس اجتماع میں شرکت کی۔

جناب محمد حسین صاحب، آسام۔ (۲) مولانا سلمان ندوی صاحب، شمالی بہار۔ (۳) مولانا حبیب اللہ صاحب، مشرقی یوپی۔ (۴) مولانا عبد الغفار صاحب، لکھنؤ۔ (۵) جناب محمد شفیع صاحب مونس، دہلی۔ (۶) مولانا نظام الدین صاحب، بھوپال (۷) جناب عبد الفتاح صاحب، بنگال واڑیسہ (۸) جناب انیس الدین احمد صاحب، جنوبی بہار۔ (۹) ماسٹر سید جعفر علی صاحب، الٰہ آباد (۱۰) مولانا سلیمان قاسمی صاحب، رامپور (۱۱) مولانا مظہر الحق صاحب، راجستھان۔ (۱۲) مولانا شمس پیرزادہ صاحب، بمبئی۔ (۱۳) جناب عبد الرزاق صاحب لطیفی (حیدرآباد) (۱۴) جناب عبد العزیز صاحب، آندھرا۔ (۱۵) جناب سراج الحسن صاحب، میسور (۱۶) مولانا شیخ عبد اللہ صاحب، مدراس۔ (۱۷) جناب کے سی عبد اللہ صاحب (کیرلہ) جناب محمود احمد خاں صاحب امیر حلقہ اورنگ آباد جو نظر بند ہیں ان کے قائم مقام جناب محمد نعیم اللہ صاحب بھی شریک تھے۔

امرائے حلقہ جات کے علاوہ مولانا سید احمد صاحب عروج قادری امیر جماعت حلقہ مرکز رامپور اور جناب سید حامد حسین صاحب معاون قیم جماعت اور محمد یوسف قیم جماعت بھی شریک اجتماع تھے۔

چونکہ مجلس نمائندگان کے ارکان کی حیثیت سے مذکورہ حضرات دہلی تشریف لائے ہوئے تھے اس لیے امیر جماعت نے ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اجتماع امرائے حلقہ جات منعقد کیا۔ جس کا پہلے سے تو کوئی باقاعدہ ایجنڈا مرتب نہیں کیا گیا تھا، البتہ وقتی طور پر کچھ امور کے سلسلے میں بعض باتیں طے کی گئیں۔ ملک کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر فسادات کی روک تھام کا مسئلہ بھی زیر غور آیا اور امیر جماعت نے امرائے حلقہ جات کو ہدایت کی کہ اس ضمن میں گزشتہ فسادات کے موقع پر ذیل کی جو ہدایات

باچکی ہیں وہ ان کی طرف خصوصی توجہ دیں۔

(۱) مسلمانوں اور غیر مسلموں کے خیر پسند، سنجیدہ اور بااثر افراد سے ربط پیدا کر کے فساد کے محرکات دور کرنے میں ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔

(۲) ملک کی سیاسی اور سماجی پارٹیوں کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیا جائے۔

اور ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جائے۔ نیز فسادات کے اسباب دور کرنے کے سلسلے میں تعاون کی راہیں تلاش کی جائیں۔

(۳) حکومت کے ذمہ داروں اور ایڈمنسٹریشن کو بروقت متوجہ کیا جائے۔

(۴) عوام الناس کے اخلاقی سدھار کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

(۵) خدمت خلق کے ذریعہ مختلف طبقات اور فرقوں میں خیر سگالی کے جذبات پیدا کیے جائیں۔

(۶) ملک کی تہذیبی اقلیتوں کے درمیان یگانگت اور یک جہتی پیدا کرنے کے لیے سمپوزیم منعقد کیے جائیں اور یک جہتی کی حقیقی بنیادیں لوگوں کے سامنے لائی جائیں۔

(۷) حتی الامکان ملک بھر کے پریس سے رابطہ قائم کر کے فسادات کے محرکات کو دور کرنے اور فسادات کے واقعات کی بیان کی روک تھام کے لیے ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔

اس کے بعد امیر جماعت نے امرائے حلقہ جات کو حسب ذیل ہدایات دیں۔

۱۔ چونکہ مجلس شوریٰ کا انعقاد اوائل مئی ۷۴ء میں پیش نظر ہے اس لیے ذیل کی معلومات ۲۰ اپریل ۷۴ء تک مرکز کو فراہم کر دی جائیں۔

(ا) موجودہ پالیسی مع توضیحات اور پروگرام (شائع شدہ زندگی اگست ۱۹۷۲ء) میں اگر کسی ترمیم اور اضافے کی ضرورت ہو تو اس سے نیز اس کے اسباب سے بالاختصار مطلع کریں اس ضمن میں جن حلقہ اور مجلس مشاورت سے مشورہ کرنا ممکن ہو ان سے مشورہ بھی کر لیں۔

(ب) جب تک کہ موجودہ پالیسی اور پروگرام میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے اس وقت تک اسی کو نافذ العمل سمجھا جائے اور اپنے حلقے کے گزشتہ منصوبے میں جو کمی رہ گئی ہے اس کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔

(۲) اپنے حلقے کے دارالاشاعت کے سلسلے میں دوسالہ منصوبہ (تا اختتام مارچ ۱۹۷۶ء) بنا کر بھیجیں اور مطلع کریں کہ کون کون سی کتابوں کی اشاعت ان کے پیش نظر ہے اور اس غرض کے لیے

کس قدر رقم کی ضرورت ہے۔ نیز حلقے سے کتنی رقم فراہم ہوسکتی ہے اور مرکز سے کتنی مطلوب ہے۔
(۳) مقامی امراء کے تقرر کے سلسلے میں دستور جماعت کی دفعہ ۵۳ کے پیش نظر ۲۰ راپریل ۱۹۶۴ء تک ضروری کارروائی عمل میں لائیں۔
(۴) ناظمات ضلع کے تقرر کے وقت مرکزی سرکلر مورخہ جنوری ۵۸ء میں مندرج ہدایات کو خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھیں۔
مذکورہ ہدایات کے علاوہ بعض دیگر جماعتی امور جن کا تعلق تنظیمی حلقوں سے تھا، زیر غور آئے۔

(محمد یوسف قیم جماعت اسلامی ہند)

بقیہ اشارات

اور نہ بلا تحقیق ایک جگہ سے دوسری جگہ کسی خبر کو پھیلائیے، بلکہ صبر و تحمل کے ساتھ تحقیق کا انتظار کیجیے۔
(۱۰) فساد روکنے کی ہر کوشش ناکام ہوجائے اور شرپسند گروہ حملہ کرہی دے تو پھر مدافعت کے لیے ڈٹ جائیے۔ دنیا کا ہر قانون مدافعت کا حق دیتا ہے اور اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے تو ایسے وقت میں مدافعت کرنا واجب ہے۔

مسلمان نمائندوں اور وزراء سے

آپ مقامی انتظامی اداروں کے ممبر ہوں یا مجالس قانون ساز کے یا حکومت کے کسی عہدے پر فائز ہوں، آپ جہاں کہیں بھی ہوں، یہ نہ بھولیے کہ آپ مسلمان ہیں دین اسلام کو مانتے اور آخرت کی جواب دہی پر ایمان رکھتے ہیں، آپ کا عقیدہ آپ کی ذمہ داری کو بڑھا دیتا ہے۔ آپ پر بلا تفریق مذہب و ملت تمام باشندگان ملک کے حقوق کی نگرانی اور ملک میں امن و امان کی فضا پیدا کرنے اور قائم رکھنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آپ جو کچھ کرسکتے ہیں ان میں کے چند کام نمونے کے طور پر یہاں لکھے جاتے ہیں۔
(۱) آپ کو مسلمان عوام کے مقابلے میں ملک کی مختلف پارٹیوں اور حکومت کے ذمہ داروں سے ملنے اور ان پر اثرانداز ہونے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں اس لیے آپ ذاتی مفادات سے بلند ہوکر ان سے ملتے رہیے اور ان کو خصوصی طور پر ظلم و فساد کے خلاف متحرک ہونے کی ترغیب دیتے

یے مسلمانوں کے بارے میں اگر کوئی ذاتی غلط فہمی پائی جاتی ہو تو اسے دور کیجیے۔ آپ کا کردار اتنا بلند ہو کہ وہ آپ کو سچا سمجھیں اور آپ کی باتوں سے متاثر ہوں۔

(۲) اگر کہیں فساد کا اندیشہ ہو تو الگ تھلگ ہو کر بیٹھ نہ رہیے بلکہ دوڑ بھاگ کر کے اس کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کیجیے

(۳) اگر کوشش کے باوجود فساد نہ رکے اور معصوم و بے گناہ لوگ اس کی زد میں آئیں تو مجالس قانون ساز میں، پبلک میں اور اخبارات میں پوری جرأت کے ساتھ اظہار حق کیجیے، ظالموں کو ظالم کہیے، حکومت سے مظلوم کے نقصانات کی تلافی کا، فساد کی عدالتی تحقیقات کا اور ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کیجیے۔

(۴) کوشش کے باوجود اگر آپ کی بات نہ سنی جائے تو غیظ و غضب کا اظہار کیے بغیر سلامت روی کے ساتھ احتجاجاً وزارتوں کی کرسیاں چھوڑ دیجیے اور مجالس قانون ساز سے باہر آ جائیے۔ اجتماعی طور پر آپ ایسا کر گزریں تو یہ تدبیر فسادات کو روکنے اور آپ کی باتوں کے سنے جانے کے لیے مؤثر تدبیر ہوگی، آپ اپنے دلوں کا جائزہ لے کر اور ذاتی مفادات سے بلند ہو کر غور کریں گے تو آپ کا ضمیر خود پکار اٹھے گا کہ اس قدر بے وزنی کے باوجود وزارتی کرسیوں اور اسمبلی اور پارلیمنٹ کی ممبری سے چمٹے رہنا صحیح نہیں ہے

علمائے کرام کی خدمت میں

متعدد جہتوں اور مختلف وجوہ سے دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت، امت مسلمہ کی دینی رہنمائی اور اس کے بقاء و تحفظ کے لیے جد و جہد کی سب سے بڑی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ آپ کھلے دل سے سوچیں گے تو آپ کو خود اپنی عظیم ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگا۔ یہاں چند چیزیں آپ کی توجہ مبذول کرانے کے لیے لکھی جا رہی ہیں۔

(۱) ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے جو فضا پیدا ہو چکی ہے وہ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ آپ کو سب سے پہلے اپنے درمیان کے جزوی و گروہی اختلافات کو ختم کر کے اپنی توجہ اسلام کی اشاعت و بقا کی طرف لگا دینی چاہیے

(۲) اسلام کے عالمگیر پیغام کو بھارت کے غیر مسلموں تک پہنچانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری آپ پر ہے اس لیے تمام بہتر ذرائع اختیار کر کے بلا تاخیر ان تک اس کے پیغام کو پہنچانے کی جد و جہد شروع کر دیجیے

اس کی شکل یہ ہے کہ آپ غیر مسلم عوام اور خواص سے ربط قائم کریں، ان کے دکھ درد میں شریک ہوں اور ان پر اپنے عمل سے یہ تاثر ڈالیں کہ آپ جو کچھ ان سے کہہ رہے ہیں اس میں کوئی ذاتی و سیاسی غرض پوشیدہ نہیں ہے بلکہ اسلامی تعلیمات پورے ملک کے لیے دنیوی و اخروی فلاح کی ضامن ہیں اور اصل مقصد آخرت میں اللہ کے عذاب سے نجات پانا ہے۔

(۳) عام مسلمانوں کے سلسلے میں اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے لیے ان کو تیار کرنے کا کام بھی آپ کو کرنا ہے، آپ کی مدد اور رہنمائی کے بغیر بطور خود بہتر طریقے سے وہ اسے اختیار نہیں کر سکیں گے اس کی عملی صورت یہ ہے کہ آپ خود اسلامی تعلیمات کا پیکر بن کر ان کے سامنے جائیں اور جزوی و گروہی اختلافات کو نظر انداز کر کے وہ سب کچھ بتائیں جو انہیں انسداد فساد کے لیے کرنا چاہیے۔

(۴) ہندستان میں جو شر پسند لوگ، اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں وہ آپ کے اختلافات کو اچھال کر مسلمانوں کے درمیان انتشار پیدا کرنے کی سعی بھی کرتے رہتے ہیں۔ آپ ہی صرف ان کی اس تدبیر کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ خدا کے لیے اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔ اگر آپ خلوص کے ساتھ اسلام کے داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوں تو بہت جلد ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے فضا بدل سکتی ہے۔

(باقی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(۲)

سید احمد قادری

برادرانِ وطن کے لیے

بھارت میں جن جماعتوں کی بنیاد مسلم دشمنی پر رکھی گئی ہے اور جو کھلم کھلا مسلمانوں سے نفرت و بیزاری کا اظہار کرتی ہیں، ان سے مخاطبت بعد کو ہوگی، پہلے اکثریت کے ان امن پسند، انسانیت دوست اور شریف افراد سے کچھ عرض کرنا ہے جو بے جرم مسلمانوں کے قتل و خون اور ان کی تباہی و بربادی کو پسند نہیں کرتے۔ ہمیں یقین ہے کہ اب بھی یہاں ایسے افراد کی تعداد مسلم دشمن اور شر پسند افراد سے زیادہ ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایسے افراد کی تعداد زیادہ ہے تو پھر ستر سال سے ہولناک فسادات کا چکر کیوں چل رہا ہے، اور یہ سلسلہ بند کیوں نہیں ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فسادات کو ناپسند کرنے کے باوجود یہ افراد انہیں روکنے کی عملی جد و جہد نہیں کرتے اور عملی جد و جہد کے بغیر کوئی برائی نہ آج تک مٹی ہے اور نہ مٹ سکتی ہے — اگر کسی گاؤں کے ایک یا چند گھروں کو نشانہ بنا کر ڈاکو حملہ آور ہوں تو دو ہی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے گھروں کے افراد چپ سادھے اپنے گھروں میں پڑے رہیں اور دوسری یہ کہ وہ مظلوم گھروں کو بچانے کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئیں اور ڈاکوؤں کا مقابلہ کریں۔ پہلی صورت میں چند مسلح ڈاکو بھی مظلوم گھروں کے بیشتر افراد کو قتل کر کے، زخمی کر کے یا [illegible] لوٹ کر [illegible] سمجھ کر گزر جائیں گے جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے گھروں میں چپ سادھے ہوئے افراد [illegible] کو ناپسند کرتے ہوں تو ان کی ناپسندیدگی کا ڈاکوؤں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور دوسری صورت میں [illegible] گروہ گاؤں کی اجتماعی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکے گا اور بھاگ کھڑا ہوگا۔

[illegible] کے نزدیک گمراہ اور بے دین ہے [illegible]
[illegible] جنگ ہے لیکن اگر خدا کو ماننے والوں کے ہاتھوں میں اقتدار و حکومت آ جائے تو وہ
ایک دوسرے کے خلاف میدان جہاد میں کود پڑیں گے، اور یہ سرد جنگ دفعتاً فساد عظیم میں تبدیل
ہو جائے گی۔ اس لیے جو لوگ مذہب کو زندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ انسانیت کے بدترین دشمن
ہیں۔ یہ محض قیاس آرائی نہیں بلکہ حقیقت ہے اور مذہب کی پوری تاریخ اس کی تائید میں پیش کی جا سکتی
ہے۔ دنیا کو مذہبی جنگوں کے انتہائی سخت تجربات ہو چکے ہیں۔ ان تجربات سے سبق نہ حاصل کرنا سخت
نادانی ہوگی۔

اس کے جواب میں یہاں چند باتیں میں کہوں گا۔

۱۔ پہلی بات یہ کہ اگر تاریخ مذہب کا حاصل مطالعہ یہی ہے کہ وہ مذہبی جھگڑوں کی تاریخ ہے
تو یہ اس کا بہت ہی غلط اور ناقص مطالعہ ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے عرب کی زمین میں اور
اس کی قوت اور تاثیر سے دنیا کے دوسرے حصوں میں ایک ایسا دَور گزر چکا ہے، جب کہ ہر طرف خدا
اور آخرت کا تصور چھایا ہوا تھا۔ اسی تصور کے تحت فرد کے شعور کی تربیت ہوتی تھی اور عملی زندگی
پر بھی اسی کی گرفت قائم تھی۔ خدا پر یقین انسان کے فکر کی اساس بھی تھا اور عمل کی اساس بھی۔ وہ ہر معاملے
میں خدا ہی کو آخری اقتدار کا مالک سمجھتا تھا اور خدا کے فیصلے کے مقابلے میں اس کے ذاتی فیصلے کی حیثیت کالعدم
ہوتی تھی۔ جس طرح آج اجتماعی زندگی کی ہر ادا بول رہی ہے کہ نہ خدا ہے اور نہ ہم اس کے بندے ہیں،
ٹھیک اسی طرح اس وقت زندگی اس حقیقت کی ترجمان تھی کہ خدا ہے اور وہی اقتدار و حکومت کا جائز
مالک ہے۔ کوئی شخص نہ تو اپنے انفرادی دائرے میں اس کے حکم سے سرتابی کو جائز سمجھتا تھا اور نہ
اجتماعیت کا کوئی گوشہ اس کے اقتدار سے آزاد تھا۔ عدالت کے فیصلے خدا کے قانون کے تحت ہوتے تھے
اور تہذیب و معاشرت میں خدا کی خدائی اور انسان کی بندگی کی روح نمایاں تھی۔ ایک فرد خدا ہی کے حکم
کے تحت اپنے تمام معاملات طے کرتا تھا کہ آخرت میں اسے خدا کے حضور جواب دہی کرنی ہے اور ہر
طرف پورا معاشرہ بندگی کے جذبات سے سرشار تھا۔

تاریخ ہم سے کہتی ہے کہ اس دَور میں لوگ نہ ایک دوسرے کی گردن کاٹتے تھے [illegible]
زندگی میں کسی قسم کا فساد اور بگاڑ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس جن خاندانوں اور قبیلوں کے [illegible]

[illegible] ہے لیکن اس کے باوجود جمہوریت کی [illegible]
[illegible] جمہوریت کے نام سے جو بے عنوانیاں ہوتی ہیں ان کے باعث [illegible]
کہ یا افراد کی کوتاہیاں ہیں جنہیں نہ ہونا چاہیے۔

اسی طرح دنیا میں ظلم کے خلاف نظریات وجود میں آتے ہیں جو تشدد کے خلاف آواز [illegible] ہیں یہ ظلم اور نا انصافی ختم کرنے کے دعوے کیے جاتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود دعوے کرنے والوں کی زندگیاں ان جرائم سے پاک نہیں ہیں۔ اس کے باوجود ہم ان نظریات کو باطل نہیں سمجھتے۔ پھر یہ ہماری کیسی تنگ نظری ہے کہ استدلال کا یہی طریقہ خدا کے بارے میں سوچتے وقت اختیار کرنے کے لیے ہم آمادہ نہیں ہیں۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ہمارا فیصلہ غلط ہے اور ہم نے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ دنیا میں کوئی بھی نظریہ ایسا ہی افراد کو اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے جو اسے حق سمجھ کر کھلے دل سے قبول کرتے ہیں۔ ایسے افراد کی زندگیاں اس نظریے کے نتیجے میں وجود میں آتی اور اس کی حقیقی ترجمان بن جاتی ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس طرح کے افراد کسی نظریے کو بالعموم اس کے دورِ حکومت میں نہیں ملتے۔ بلکہ دعوتی مرحلہ انسانوں میں سے انہیں چنتا اور اپنے ڈھنگ پر ان کی تربیت کرتا ہے۔ جو نظریہ حکمرانی کے دور سے گزر رہا ہو اس کے ساتھ انسان کے بہت سے مفادات وابستہ ہو جاتے ہیں اس لیے یہ وقت محض مخلصین کے وجود کا نہیں ہوتا بلکہ مخلصین کی صف میں غیر مخلصین بھی شامل ہو جاتے ہیں اور دشمن بھی دوستی کا سوانگ بھرنے لگتے ہیں۔ ایسا ہی ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ سوسائٹی میں محض اپنا ایک مقام پیدا کرنے کے لیے اس نظریے پر ایمان کا دعویٰ کرنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے دل اس کے قبول کرنے کے لیے قطعاً آمادہ نہیں ہوتے۔ جو نظریات با اقتدار ہوتے ہیں ان پر زمانے کے گزرنے کے ساتھ ایک وہ وقت بھی آتا ہے کہ اس پر ایمان رکھنے اور اس کی صحیح ترجمانی کرنے والوں کی تعداد گویا آٹے میں نمک کے برابر رہ جاتی ہے اور ان افراد کا غلبہ ہو جاتا ہے جو اس کے نام کو محض اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن تاریخ کی یہ کوتاہی ہمیشہ دیکھی گئی ہے کہ وہ کسی نظریے کو اس کے دورِ دعوت میں قابلِ التفات نہیں سمجھتی اور یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ یہ نظریہ کس قسم کی سیرت و کردار پیدا کر رہا ہے۔ بلکہ تاریخ کی توجہ اس کی طرف اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ اقتدار [illegible]

[illegible] ہے تو یہ ان کے کردار کی خامی ہے نہ کہ اس کے [illegible]

[illegible] کرتے ہیں، اگر وہ اعلیٰ سیرت کے مالک ہیں اعلیٰ اخلاق [illegible]

[illegible] خدا کے دین کے ترجمان ہیں، لیکن جن افراد کی زندگیوں میں یہ [illegible]

[illegible] بھی خدا کے دین کا ترجمان نہیں کہہ سکتے خواہ وہ طلق کی پوری قوت سے

[illegible] ایمان کا اعلان کیوں نہ کر رہے ہوں۔

تاریخ ہمارے سامنے دو طرح کی مثالیں پیش کرتی ہے کچھ مثالیں تو وہ ہیں جن سے ایمان

[illegible] کے بارے میں ہماری عقل جس نتیجے پر پہنچتی ہے، اس کی تائید ہوتی ہے۔ اور بعض مثالیں ایسی ہیں

[illegible] نتیجے کی تردید کرتی ہیں۔ اگر تاریخ صرف دوسری ہی قسم کی مثالوں سے روشناس ہوتی تو یہ

[illegible] کہا جا سکتا تھا کہ شاید ہماری عقل کا اخذ کردہ نتیجہ صحیح نہیں ہے لیکن جب یہ پہلی تائیدی

[illegible] دو نہیں بے شمار مثالیں پیش کرتا ہے تو کس قدر عجیب بات ہے کہ اس نتیجے کو رد کر دیا جائے

[illegible] ان ادوار اور شخصیتوں کو دلیل کے طور پر استعمال کیا جائے جن میں خدا پر ایمان ایک زندہ حقیقت کے

[illegible] پر موجود نہیں تھا بلکہ مر چکا تھا۔

خدا پر ایمان نے انسانوں کی ایک بڑی تعداد میں تعصب و تنگ نظری کے بجائے وسعت خیال اور

[illegible] اداری پیدا کی ہے، غصہ اور انتقام کی جگہ عفو و درگزر کے جذبات ابھارے ہیں۔ انھوں نے ہر ایک

[illegible] ساتھ اخوت و ہمدردی کا سلوک کیا ہے، دشمنوں تک سے ان کا رویہ پیار اور محبت کا رہا ہے

[illegible] انیت کا یہ طبقہ خدا اور اس کے دین کے بارے میں ہر غلط استدلال کی کھلی ہوئی تردید ہے۔

تصحیح

مئی کے شمارے کی فہرست مضامین میں ایک مضمون "استشراق اور اسلام" [illegible] نہیں

[illegible] سکا ہے۔ یہ مضمون [illegible] پر ہے۔ خریداران زندگی فہرست میں اس کا اضافہ کر لیں۔

[illegible]

[illegible] ہے کہ حضرت [illegible]

تاریخ معلوم کر کے واقعات سیرت کو بھی سنہ عیسوی میں لکھتے ہیں۔ اس ضرورت کے پیش نظر سنہ ہجری کو سنہ عیسوی میں اور عیسوی سنہ کو ہجری سنہ میں تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے اصول مشکل نہیں۔ اندازے حساب تقویمی یکم محرم سنہ ۱ھ ۱۶ جولائی ۶۲۲ء کے مطابق تھا۔ اس حساب سے ہجری سنہ 227016 (دو لاکھ ستائیس ہزار سولہ دن) سنہ عیسوی سے پیچھے رہا۔ اگر کسی سال کے ہجری ایام میں یہ دن جوڑ دیے جائیں تو ظاہر ہے کہ عیسوی سنہ نکل آئے گا۔ مثلاً یہ معلوم کرنا ہے کہ یکم محرم ۱۳۸۱ ہجری کو عیسوی تاریخ کیا تھی تو اول ۱۳۸۰ سال کے دن بنانا پڑیں گے جو 489026 ہوں گے۔ بعد ازاں ان میں 227016 کو جمع کرنا پڑے گا اور ایک کا اضافہ کر کے عیسوی سال بنانا پڑیں گے جس کا جواب ۱۰ جون ۱۹۶۱ء آئے گا۔ اسی طرح اگر یہ دریافت کرنا ہو کہ یکم جنوری ۱۹۶۱ء کو ہجری تاریخ کیا تھی تو ۱۹۶۰ سال کے عیسوی دنوں میں سے 227016 کو گھٹانا پڑے گا اس حساب سے جو باقی بچے گا اس سے ہجری تاریخ نکل آئے گی۔

اس پورے عمل میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ گریگوری کے زمانے تک عیسوی سنہ بالکل صحیح حسابات پر مشتمل نہیں تھا۔ شمسی سال حقیقتاً ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۴۹ سیکنڈ کا ہوتا ہے گویا پورے ۳۶۵ دن سے ۱۱ منٹ ۴ سیکنڈ کم۔ اس طرح گریگوری کے زمانے تک ۱۱ دن کا فرق پڑ چکا تھا۔ اس فرق کو نکالنے کے لیے پاپائے اعظم گریگوری نے یہ حکم جاری کیا کہ ۴ر اکتوبر ۱۵۸۲ء کے بعد جو دن ہو اسے ۱۵ر اکتوبر قرار دیا جائے۔ چنانچہ ۱۵۸۲ء سے پہلے کی تاریخوں کی مطابقت پچھلے حسابات سے ہوتی ہے اور گریگوری کی اصلاح کے بعد کی تاریخوں کی مطابقت جدید حسابات سے کی جاتی ہے۔

یہاں ہم ایک اور آسان طریقہ پیش کرتے ہیں جس سے یہ بات بسہولت دریافت ہو سکتی ہے کہ ہجری سال عیسوی سال کا [illegible] ہوتا ہے [illegible] 3 . 97023 [illegible] [illegible]

[illegible] شروع ہوا تھا۔

```
   970224
     1362      1362 سے ضرب دیا
---------
  1940448
 5821344
2910672
970224
-----------
1321'445088      چھ عدد گننے کے بعد نشان اعشاریہ لگایا
   621'5774      اس میں جوڑئیے
-----------
1943'0225        13 - سنہ 1943 عیسوی
      365        تاریخ معلوم کرنے کے لیے 365 سے ضرب دیجیے
-----------
     1125
    1950
    675
-----------
    82125        یعنی ۸ جنوری
```

قارئین کرام کی سہولت کے لیے یہاں بعض جدولیں دی جاتی ہیں جن سے استخراج تاریخ جلد اور آسانی کے ساتھ ممکن ہے۔

حصۂ دوم

جدولیں

جدول اوّل :۔ سنہ ہجری کے استخراج مدخل کا قاعدہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے جو تھوڑا طویل ہے لیکن اس جدول کے ذریعے ہر ہجری سال کا مدخل آسانی سے دریافت ہو سکتا ہے۔ سال کو 210 پر تقسیم کر کے باقی (REMAINDER) کو جدول میں دیکھیے۔ مثلاً اگر 1381 کا مدخل معلوم کرنا ہے تو باقی 121 = 210 ÷ 1381 - جدول میں 120 کے محاذی میں اور ایک کے نیچے پانچ کا [illegible]

```
210 ) 1381 ( 6        ۵
      1260
باقی   121
```

یعنی پنجشنبہ کو یا غرہ محرم ۱۳۸۲ھ پنجشنبہ کو ہوا تھا۔

جدول دوم:۔ کسی سال کا غرہ محرم معلوم ہو جانے کے بعد جدول دوم پورے سال کی تقویم کا کام دے گی مثلاً ۱۳۸۱ کا غرہ محرم پنجشنبہ ہے تو جدول دوم کی پانچویں سطر میں پنجشنبہ ہوگا اور صرف یہی سطر اس سال کی پوری تقویم کا کام دے گی۔ یکم محرم پنجشنبہ، یکم صفر ہفتہ، یکم جمادی چہارشنبہ، ۹ جمادی الاولیٰ یکشنبہ، ۲۷ رمضان ہفتہ وعلیٰ ہذا القیاس

جدول سوم:۔ یہ جدول سنہ ہجری کو سنہ عیسوی میں اور سنہ عیسوی کو سنہ ہجری میں تبدیل کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ اس جدول میں ہر سال کے عیسوی اور ہجری ایام ساتھ ساتھ دیے گئے ہیں عیسوی ایام 1582ء تک جولین تاریخ کے مطابق ہیں اور 1582ء کے بعد گریگوری کی تاریخ کے مطابق پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سنہ عیسوی 227016 یوم ہجری سنہ سے بڑا ہے۔ اس بنا پر اگر یہ دن ہجری ایام میں جوڑ دیے جائیں تو عیسوی تاریخ نکل آتی ہے اور اگر ان کو عیسوی ایام میں سے گھٹا دیا جائے تو ہجری تاریخ نکل آئے گی۔ جدول سے استخراج تاریخ کا طریقہ یہ ہے۔ مثلاً اگر یہ دیکھنا ہے کہ ۲۳ر فروری ۱۹۶۲ء کو ہجری تاریخ کیا تھی تو جدول میں سے اول 1920 سال کے ایام لیجیے

1920 سال کے ایام	701267
41 سال کے ایام	14975
1961	716242
جنوری کے ایام	31
فروری کے ایام	23
	716296
گھٹائے گئے	227016
باقی	489280
جدول میں سے 1380 سال ہجری کے دن	489026
	254
ایام شہور کی جدول میں 237 دن گزشتہ	237
یعنی ۱۷ رمضان ۱۳۸۱ھ	17

اسی طرح اگر یہ دیکھنا ہو کہ ۱۱ر شوال ۱۳۸۱ھ کو عیسوی تاریخ کیا تھی تو

[illegible] سے ۱۳۸۰ ہجری سال کے دن 489026

محرم تا ۱۱ر شوال 266

11

489303

اس میں جمع کیے 227016

716319

جدول میں سے ۱۹۲۰ سال کے دن 701267

15052

جدول میں سے ۴۱ سال کے دن 14975 ‏ 1961

77

عیسوی ایام و شہور کی جدول سے 59

---

18 یعنی ۱۸ر مارچ ۱۹۶۲ء

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۱۸ر مارچ ۱۹۶۲ء کو دن کیا تھا۔ یہ چوتھی جدول سے معلوم ہو سکتا ہے۔

جدول چہارم:۔ کتب تاریخ میں اکثر واقعات کی صرف عیسوی تاریخیں اور سنہ مذکور ہوتے ہیں، دن نہیں ہوتے۔ یہ جدول سنہ عیسوی کی دائمی تقویم ہے۔ اس سے ہر تاریخ کا دن بہ سہولت نکل آتا ہے۔ کبیسہ سالوں اور صدیوں کو دائرے میں لکھا گیا ہے۔ اس بنا پر سال کبیسہ میں جنوری اور فروری کی تاریخیں دائروں کے مطابق دیکھنا چاہیے اور باقی عام طریقے سے

جس تاریخ کا دن دیکھنا مقصود ہو تو اس تاریخ میں مہینے، سال اور صدی کے نیچے جو عدد لکھے ہوئے ہیں سب جمع کرکے ایک کم کر دیجیے اور پھر سات سے تقسیم کیجیے۔ اگر کچھ نہ بچے تو شنبہ، ایک بچے تو یکشنبہ، دو بچیں تو دوشنبہ، تین بچیں تو سہ شنبہ، ۴ بچیں تو چہار شنبہ، پانچ بچیں تو پنجشنبہ، ۶ بچیں تو جمعہ ہوگا۔ مثلاً ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۱ء کا دن معلوم کرنا ہے تو۔

31+4+4=39-1=38 (7) 5

35

---

3 سہ شنبہ

جدول (1)

30	29	28	27	26	25	24	23	22	21	20	19	18	17	16	15	14	13	12	11	10	9	8	7	6	5	4	3	2	1	[illegible]
[illegible]	2	5	1	3	6	1	4	7	2	5	1	3	6	2	4	7	2	5	1	3	6	2	4	7	2	5	1	3	6	0
[illegible]	7	8	6	1	4	6	2	5	7	3	6	1	4	7	2	5	7	3	6	1	4	7	2	5	7	3	6	1	4	30
1	5	1	4	6	2	4	7	3	5	1	4	6	2	5	7	3	5	1	4	6	2	5	7	3	5	1	4	6	2	60
	3	6	2	4	7	2	5	1	3	6	2	4	7	3	5	1	3	6	2	4	7	3	5	1	3	6	2	4	7	90
	1	4	7	2	5	7	3	6	1	4	7	2	5	1	3	6	1	4	7	2	5	1	3	6	1	4	7	2	5	120
1	6	2	5	7	3	5	1	4	6	2	5	7	3	6	1	4	6	2	5	7	3	6	1	4	6	2	5	7	3	[illegible]
2	4	7	3	5	1	3	6	2	4	7	3	5	1	4	6	2	4	7	3	5	1	4	6	2	4	7	2	[illegible]	[illegible]	[illegible]

	9	10	11	12	13	14	15	16	17	18	19	20	21	22	20
جمادی الاخریٰ	23	24	25	26	27	28	29	30	(1)	2	3	4	5	6	22
	7	8	9	10	11	12	13	14	15	16	17	18	19	20	24
رجب	21	22	23	24	25	26	27	28	29	(1)	2	3	4	5	26
	6	7	8	9	10	11	12	13	14	15	16	17	18	19	28
شعبان	20	21	22	23	24	25	26	27	28	29	30	(1)	2	3	30
	4	5	6	7	8	9	10	11	12	13	14	15	16	17	32
رمضان	18	19	20	21	22	23	24	25	26	27	28	29	(1)	2	34
	3	4	5	6	7	8	9	10	11	12	13	14	15	16	36
	17	18	19	20	21	22	23	24	25	26	27	28	29	30	38
شوال	(1)	2	3	4	5	6	7	8	9	10	11	12	13	14	40
	15	16	17	18	19	20	21	22	23	24	25	26	27	28	42
ذیقعدہ	29	(1)	2	3	4	5	6	7	8	9	10	11	12	13	44
	14	15	16	17	18	19	20	21	22	23	24	25	26	27	46
ذوالحج	28	29	30	(1)	2	3	4	5	6	7	8	9	10	11	48
	12	13	14	15	16	17	18	19	20	21	22	23	24	25	50
	26	27	28	29	30										

جدول (۳)

سال	ایام ہجری	ایام عیسوی	سال	ایام ہجری	ایام عیسوی
1	354	365	21	7442	7670
2	709	730	22	7796	8035
3	1063	1095	23	8150	8400
4	1417	1461	24	8505	8766
5	1772	1826	25	8859	9131
6	2126	2191	26	9214	9496
7	2481	2556	27	9568	9861
8	2835	2922	28	9922	10227
9	3189	3281	29	10277	10592
10	3544	3651	30	10631	10957
11	3898	4017	31	10985	11322
12	4252	4383	32	11340	11658
13	4607	4748	33	11694	12053
14	4961	5113	34	12048	12418
15	5316	5478	35	12403	12783
16	5670	5844	36	12757	13149
17	6024	6209	37	13112	13514
18	6379	6574	38	13466	13879
19	6733	6939	39	13820	14244
20	7087	7005	40	14157	14610

[illegible]	[illegible]	[illegible]
14975	14529	41
[illegible]	[illegible]	[illegible]
15705	15238	43
16071	15592	44
16436	15947	45
16801	16300	46
17166	16655	47
17532	17010	48
17897	17364	49
18262	17718	50
18627	18073	51
18993	18427	52
19358	18781	53
19723	19136	54
20088	19490	55
20454	19845	56
20819	20199	57
21184	20552	58
21549	20908	59
21915	21262	60

[illegible]	ایام ہجری	سال
21915	21262	60
43830	42524	120
65745	63786	180
87660	85048	240
109575	106310	300
131490	127572	360
153405	148834	420
175320	170096	480
197235	191358	540
219150	212620	600
241065	233882	660
262980	255144	720
284895	276406	780
306810	297668	840
328725	318930	900
350640	340192	960
372555	361454	1020
394470	382716	1080
416385	403978	1140
438300	425240	1200

ایام عیسوی	[illegible]	سنہ	ایام ہجری	[illegible]	[illegible]
635544	616598	1740	460215	[illegible]	[illegible]
657438	637860	1800	482130	467764	[illegible]
674333	659122	1860	504045	[illegible]	[illegible]
693962	673297	1900	525900	510288	[illegible]
701267	680384	1920	548875	531550	[illegible]
723182	761646	1980	569790	552812	[illegible]
745097	722908	2040	577815	560608	[illegible]
767011	744170	2100	591695	574074	1620
788926	765432	2160	613610	595336	1680
803535	779706	2200	620914	602423	1700

جدولوں کے ذریعے سنہ عیسوی اور سنہ ہجری کی تاریخوں
کے استخراج میں اکثر بڑے بڑے عدد باقی بچتے ہیں جو مہینوں کے
ایام ہوتے ہیں اور پھر حساب لگانا پڑتا ہے کہ اس باقی سے کیا مراد ہے
یہاں عیسوی اور ہجری مہینوں کے ایام کی دو جدولیں اور دی جاتی
ہیں یہ اس لیے ہیں کہ باقی ایام میں سے ان کا بڑے سے بڑا عدد گھٹا کر
مہینہ اور تاریخ دریافت کر لیا جائے۔ مثلاً مثال نمبر ۲۲ فروری سنہ ۱۹۹۳ء
کو ہجری تاریخ دریافت کرنے کے ذیل میں آخری باقی ۲۵۴ تھی۔
جس میں رمضان کے عدد 237 گھٹائے جا سکتے تھے چنانچہ ۲۵۴
میں سے 237 گھٹانے کے بعد ۱۷ باقی بچے یہ رمضان کی ۱۷ تاریخ
اسی طرح مثال نمبر ۷۷ باقی بچے تھے ۷۷ میں سے مارچ
کے ۵۹ دن گھٹائے جا سکتے تھے جن کو گھٹا کر ۱۸ جواب آیا۔
گویا ۱۸ مارچ سنہ ۱۹۹۳ء

ہجری مہینے

مہینہ	ایام
محرم	0
صفر	30
ربیع الاول	59
ربیع الآخر	89
جمادی الاولیٰ	118
جمادی الآخری	148
رجب	177
شعبان	207
رمضان	237
شوال	266
ذوالقعدہ	296
ذوالحجہ	325
	354

عیسوی مہینے

مہینہ	ایام
جنوری	0
فروری	31
مارچ	59
اپریل	90
مئی	120
جون	151
جولائی	181
اگست	212
ستمبر	243
اکتوبر	273
نومبر	304
دسمبر	334
	365

جدول (۴)

(الف)

سال

5	(4)		3	2	1	
11	10	9	(8)		7	6
(16)		15	14	13	(12)	
22	21	(20)		19	18	17
	27	26	25	(24)		23
33	(32)		31	30	29	(28)
39	38	37	(36)		35	34
(44)		43	42	41	(40)	
50	49	(48)		47	46	45
	55	54	53	(52)		51
61	(60)		59	58	57	(56)
67	66	65	(64)		63	62
(72)		71	70	69	(68)	
78	77	(76)		75	74	73
	83	82	81	(80)		79
89	(88)		87	86	85	(84)
95	94	93	(92)		91	90
		99	98	97	(96)	
7	6	5	4	3	2	1

مہینے

[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
0	5	2	0	4	1	6	9	[illegible]	5	[illegible]

(ب)

صدیاں

(6)	(5)	(4)	(3)	2	(1)	(0)
(13)	(12)	(11)	(10)	(9)	(8)	(7)
x	x	x	(17)	(16)	(15)	(14)
x	(20)	19	x	18	x	17
x	(24)	23	x	22	x	21
x	(28)	27	x	26	x	25
4	5	6	7	1	2	3

بیوی کے فرائض

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

(اسلسلے کے لیے دیکھیے زندگی ۱۰ جنوری [illegible])

ازدواجی زندگی کو پرسکون اور خوش گوار بنانے کیلئے جس طرح شوہر کے کچھ فرائض ہیں اسیطرح بیوی کے بھی — اور یہ مبارک رشتہ اسی وقت باعث رحمت و برکت بن سکتا ہے جب دونوں باہمی معاونت تعاون، اشتراک عمل اور ہم آہنگی سے اس کو کامیاب بنانے کی مخلصانہ کوشش کریں۔ شوہر کے فرائض کے بعد اب بیوی کے فرائض بیان کیے جاتے ہیں۔

اپنا رویہ درست رکھے فَالصّٰلِحٰتُ پس جو نیک روش رکھنے والی عورتیں ہیں

خاندان کا استحکام، بچوں کی اچھی تربیت اور گھریلو زندگی کی برکتوں کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ ازدواجی زندگی میں عورت کا رویہ درست رہے۔ لیکن عورت کے نیک رویے کا تمام تر حاصل محض یہ دنیوی فوائد ہی نہیں ہیں اگر وہ خدا کا حکم سمجھ کر اپنے رویے کو درست رکھتی ہے تو اس کا ہر عمل خدا کی نظر میں عبادت ہے گا۔ اور وہ آخرت میں بھی بے پایاں اجر و انعام کی مستحق قرار پائے گی۔ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَۃِ اَکْبَرُ ؕ

اطاعت گزار رہے قٰنِتٰتٌ وہ مرد کی اطاعت شعار ہوتی ہیں۔

گھر کے نظم کو درست رکھنے کے لیے شوہر کی فطری قوامیت کو سامنے رکھنا اور خوش دلی سے اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے لیکن اگر عورت اس بات کو بھی پیش نظر رکھے کہ یہ خدا اور رسول کا حکم ہے اور اس کی تعمیل کرنے والیوں کو خدا کی خوشنودی اور جنت کی بشارت دی گئی ہے تو اس کی اطاعت گزاری محض گھر کے نظم کو درست رکھنے ہی کا ذریعہ نہ رہے گی بلکہ گھر کی چہار دیواری میں رہتے ہوئے ان کا جو قدم بھی اٹھے گا وہ ان کو جنت سے قریب کرے گا اور [illegible]

[illegible] عورتیں جو شوہر کی اطاعت گزار ہوں گی۔

امانتوں کی حفاظت کرے حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (النساء-۳۴)

اور وہ مردوں کے پیچھے اللہ کی توفیق میں ان کے حقوق اور امانتوں کی حفاظت کرتی ہیں

حقوق اور امانتوں کی حفاظت میں وہ ساری ہی چیزیں شامل ہیں جو عورت کے پاس بطور امانت ہوتی ہیں اور جن کی حفاظت کی شوہر عورت سے بجا طور پر توقع رکھتا ہے۔ مال و اسباب کی حفاظت عصمت و آبرو کی حفاظت، شوہر کے رازوں کی حفاظت، قول و قرار کی حفاظت، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حقائق کی تفصیل کے ساتھ وضاحت فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے۔ جب تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمہاری اطاعت کرے اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمہارے پیچھے تمہارے مال کی اور اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرے اور آپ نے فرمایا کہ عورت جب پانچوں وقت کی نماز پڑھے، اپنی عصمت کی حفاظت کرے، اور شوہر کی اطاعت کرے تو جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔ اور نافرمان عورتوں کو آپ نے یہ وعید بھی سنائی ہے، کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا جو شوہر کی ناشکر گزار رہی ہو گی حالانکہ وہ کسی وقت بھی اپنے شوہر سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

ازدواجی تعلق کو صبر کے ساتھ نباہیے

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء-۱۲۸)

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے زیادتی یا بے سلوکی کا اندیشہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، اگر میاں بیوی آپس میں کسی قرارداد پر مصالحت کر لیں اور مصالحت بہرحال بہتر ہے۔

عمر بھر کی ازدواجی رفاقت میں بارہا عورت کو شوہر کی جانب سے بدسلوکی اور بے رخی کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں [illegible] تو یہ ہو سکتا ہے کہ عورت شوہر کی علیحدگی اور جدائی کا ارادہ کرے [illegible] اسلام کی نظر میں یہ ایک ناپسندیدہ بات ہے۔ بہترین روش یہ ہے کہ میاں اور بیوی [illegible] [illegible] حقوق کی کمی بیشی پر آپس میں مصالحت کر لیں [illegible] [illegible] جس طرح بھی ہو سکے [illegible] شوہر کے ساتھ نباہ کرنے کی [illegible]

...ہے۔

اصلاحِ حال میں معاشرے کی ذمّہ داری

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا

(النساء - ۳۵)

اور اگر تم کو میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکم مرد کے خاندان میں سے اور ایک حَکم عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو۔ وہ دونوں (یعنی زوجین اور ثالث) اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت کی صورت پیدا فرما دیگا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے اور (ہر چیز سے) باخبر ہے۔

ازدواجی تعلق دراصل انسانی تمدن کی جڑ ہے، زوجین کے تعلقات کی درستی پر پورے انسانی تمدن کی درستی کا مدار ہے۔ اسلام کے نزدیک اس تعلق کی درستی اور مضبوطی سب سے بڑی نیکی ہے اور اس تعلق کو توڑنے کی کوشش سب سے بڑی برائی اور فساد ہے۔ حدیث میں ہے کہ "ابلیس لعین روزانہ اپنے شیطانی مرکز سے زمین کے مختلف گوشوں میں اپنے کارکن روانہ کرتا ہے۔ پھر وہ کارکن واپس آ کر اپنی اپنی کارگزاریوں کی رپورٹ سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ میں نے فلاں فساد برپا کیا۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں فتنہ کھڑا کیا۔ مگر ابلیس ہر ایک سے یہ کہتا جاتا ہے کہ تم نے کچھ نہیں کیا۔ پھر ایک کارکن آ کر اطلاع دیتا ہے کہ میں فلاں مرد اور عورت میں جدائی ڈال آیا ہوں، تو ابلیس خوش ہو کر اسے گلے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں تو نے واقعی کام کیا ہے"

درحقیقت وہ شخص انتہائی مفسد اور بدترین مجرم ہے جو اس پاکیزہ تعلق کو توڑتا ہے کیونکہ اس تعلق کی استواری پر پوری انسانی سوسائٹی کی سلامتی اور قیام کا انحصار ہے۔

قرآنِ حکیم نے زوجین کو اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دینے کی تاکید کرتے ہوئے پورے معاشرے کو بھی ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ وہ بھی زوجین کے تعلقات کو استوار رکھنے اور ان میں باہم مصالحت و موافقت قائم رکھنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ اور اپنے دباؤ اور اثر سے فریقین کو مصالحت اور نباہ پر آمادہ کرنے میں پورا زور لگائے۔

طلاق

طلاق انسانی سوسائٹی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ بعض اوقات تمام اخلاقی تعلیمات اور
بیرونی اور کوششوں کے باوجود بھی زوجین میں نباہ، موافقت، یک جہتی اور مواصلت نہیں ہو پاتی
اور اگر ازدواجی تعلق کو برقرار رکھا جائے تو مختلف قسم کے اخلاقی اور معاشرتی مفاسد پیدا ہونے کے
یقینی اندیشے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں قرآن نے طلاق کی اجازت دی ہے ۔

طلاق دینے کی اجازت ہے

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (البقرہ ۲۳۶)

تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اگر تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو۔

اسلام نے نکاح کو ہر قیمت پر برقرار رکھنے کی تاکید ضرور کی ہے لیکن اگر اس کا قیام زوجین
کے حق میں ہر پہلو سے سراسر نقصان ہی کا موجب ہو تو پھر جدائی کی بھی اجازت دی ہے۔ اسلامی
شریعت نے خواہ مخواہ انسان کو تنگی میں مبتلا نہیں کیا ہے۔ البتہ طلاق کی اجازت سے فائدہ اسی
وقت اٹھایا جائے جب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک حلال چیزوں
میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہی ہے۔

طلاق آخری چارۂ کار ہے

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○ (النساء-۱۹)

اور ان کے ساتھ اچھے سلوک کی زندگی گزارو۔ اگر وہ تمہیں (کسی وجہ سے) ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ نے اس میں (تمہارے لیے) بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔

اگر شوہر کو کسی وجہ سے بیوی پسند نہ آئے۔ خوبصورت نہ ہو یا اس میں کوئی اور نقص ہو تو اسے
چاہیے کہ صبر و تحمل سے کام لے۔ فوراً دل برداشتہ ہو کر اس کو چھوڑنے کی نہ سوچے۔ ازدواجی تعلق
نہایت اہم [illegible] انسانی تمدن کا دار ہے۔ اس تعلق کو توڑنے میں جلدی
[illegible]

اسلام نے [illegible] ضروری ہے لیکن یہ بالکل آخری چارۂ کار ہے [illegible]

...ات میں استعمال کرنا چاہیے۔ جب واقعی زوجین میں نباہ اور مصالحت کے تمام امکانات ختم ہو چکے ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نکاح کرو اور طلاق نہ دو۔ اللہ تعالیٰ ایسے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو طرح طرح کے مزے چکھتے پھریں۔

زوجین میں مصالحت کے لیے ثالثی کا طریقہ

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا ۝ (النساء ۳۵)

اور اگر تمہیں زوجین کے تعلقات بگڑ جانے کا ڈر ہو تو ایک حکم مرد کے خاندان میں سے اور ایک حکم عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کر دو۔ اگر یہ دونوں (یعنی زوجین اور حکم) اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت کی کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔ اللہ کو سب کچھ معلوم ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

اگر زوجین کے تعلقات بگڑ جائیں تو اس سے پہلے کہ معاملہ کوئی سنگین صورت اختیار کرے اور جدائی تک نوبت پہنچے یا معاملہ عدالت میں جائے معاشرے کے بزرگوں کو چاہیے کہ وہ گھر کے گھر ہی میں اصلاح کی کوشش کریں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک نیک سیرت اور منصف مزاج شخص مرد کے خاندان سے منتخب کیا جائے اور ایک عورت کے خاندان سے اور ان دونوں کے سپرد یہ معاملہ کر دیا جائے۔ پھر یہ دونوں سر جوڑ کر بیٹھیں اور اسباب اختلاف کی منصفانہ تحقیقات کر کے باہمی مصالحت کی کوئی صورت نکالیں۔ اگر یہ لوگ اپنی کوششوں میں مخلص ہوں گے اور زوجین بھی خدا ترسی کے ساتھ اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ مدد فرمائے گا اور ان کے درمیان موافقت کی کوئی شکل پیدا فرما دے گا۔

علیحدگی ہو جائے تو دونوں اللہ پر بھروسہ کریں

وَإِن يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا

اور اگر زوجین میں نباہ نہ ہو سکے اور دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو خدا اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی ضرورت اور محتاجی سے بے نیاز کر دے گا

حَكِیْمًا ٥ (النساء ۱۳۰) اللہ کا دامن رحمت بہت وسیع ہے اور وہ دانا و بینا ہے

مطلب یہ ہے کہ اگر زوجین میں کسی طرح مفاہمت ممکن ہی نہ ہو اور یہ نوبت آ جائے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ ہی ہونا پڑے۔ تو دونوں خدا سے مایوس نہ ہوں۔ اس پر بھروسہ رکھیں وہ مرد کے لیے بھی اپنی وسیع رحمت سے انتظام فرما دے گا اور عورت کو بھی سہارا بخشے گا وہ بڑا دانا و بینا ہے ہر ایک کی ضرورتوں سے خوب واقف ہے، اور کوئی بات اس کی وسعت سے باہر نہیں۔

طلاق کیسے دی جائے اسلام کے نزدیک طلاق روئے زمین کی تمام جائز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز ہے اس لیے زوجین کی انتہائی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ اس کی نوبت نہ آئے لیکن اگر تمام نیک ارادوں اور کوششوں کے باوجود حالات طلاق ہی کا تقاضا کریں تو پھر طلاق دینے میں ان حدود کا پورا پورا لحاظ ہونا چاہیے جو اس ضمن میں قرآن و سنت سے ثابت ہیں۔

طلاق طُہر میں دی جائے

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ ط	اے نبیؐ! (مسلمانوں سے کہہ دیجیے) کہ جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو تو ایسے وقت طلاق دو کہ وہ پوری مدت عدت شمار کر سکیں (یعنی پاکی کی حالت میں طلاق دو)

(الطلاق: ۲۸)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ سخت برہم ہوئے۔ اور حضرت عبداللہؓ کو رجعت کا حکم دیا اور فرمایا اگر طلاق دینا ہی ہے تو حیض ختم ہونے کے بعد طُہر کی حالت میں دو۔ ایسے ہی موقع کی ہدایت کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

طُہر کا زمانہ عورت کی صحت کا زمانہ ہے۔ اس حالت میں عورت اپنی روش اور مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ سکتی ہے، اور صحیح صحیح رائے قائم کرنے کے لیے اسے پورا پورا موقع حاصل رہے گا پھر اس دوران مرد و عورت کا وہ تعلق بھی قائم رہتا ہے جو باہمی اُنس اور قربت کا اہم ترین ذریعہ ہے

طلاق کی حد

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ (البقرہ ۲۲۹)

"طلاق (کا حق) دو مرتبہ ہے۔ پھر یا تو بھلے طریقے سے (عورت کو) روک لیا جائے یا شریفانہ طور پر اسے رخصت کر دیا جائے۔

معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں قانون طلاق کی یہ دفعات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے مرد کو طلاق کا اختیار ضرور دیا ہے لیکن اس کی حد متعین ہے، عرب جاہلیت میں طلاق کی کوئی حد نہ تھی، شوہر اگر بیوی سے بگڑ جاتا تو اس کو بار بار طلاق پر طلاق دیتا رہتا اور رجوع کرتا رہتا بے چاری عورت عمر بھر مصیبت میں گرفتار رہتی، نہ تو اس شوہر کے ساتھ سکون کی زندگی بسر کر پاتی اور نہ ہی اس سے آزاد ہو کر کسی دوسرے سے نکاح کر سکتی۔ قرآن نے طلاق کی حد متعین کر کے عورت پر اس ظلم کا دروازہ بند کر دیا۔

قرآن کی رو سے ایک مرد اپنی بیوی کو صرف دو بار طلاق رجعی دینے کا حق رکھتا ہے۔ دو بار طلاق دینے کے بعد جب کبھی بھی تیسری بار طلاق دے گا۔ عورت مستقل طور پر اس سے اس طرح جدا ہو جائے گی کہ نہ پھر اس سے رجوع ہی ممکن ہوگا اور نہ حلالے[1] کے بغیر نکاح ہی ممکن ہوگا۔

شریعت اسلامی کی رو سے طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ طہر کی حالت میں صرف ایک طلاق رجعی دی جائے۔ پھر اگر دوسری طلاق دینے کا ارادہ ہو تو اس کے لیے دوسرے طہر کا انتظار کیا جائے۔ ورنہ بہتر تو یہی ہے کہ ایک ہی طلاق پر اکتفا کیا جائے اور عدت گزارنے دی جائے۔ اس دوران مرد جب بھی چاہے عورت سے رجوع کر سکتا ہے۔

دو طلاقیں دینے کی صورت میں جب عدت گزر جائے تو پھر یا تو مرد اس سے دوبارہ نکاح کرے یا پھر انتہائی شریفانہ طریقے پر اس کو رخصت کر دے۔

طلاق رجعی میں رجوع

فَاِمۡسَاکٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِیۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ (البقرہ ۲۲۹)

(طلاق رجعی کے بعد) یا تو اچھے طریقے پر روک رکھو یا بھلے طور پر رخصت کر دو۔

طلاق رجعی سے مراد وہ طلاق ہے جو صریح لفظ طلاق سے دی گئی ہو، اس کی حد دو ہے۔

---

[1] حلالے کی شکل آگے بیان کی گئی ہے۔

اور اس میں عدت کے دوران مرد جب بھی چاہے رجوع کر سکتا ہے۔

شوہر کو رجعت کا حق ہے

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا (البقرہ ۲۲۸)

اور ان کے شوہر اگر تعلقات درست کرنے پر آمادہ ہوں تو وہ اس عدت کے دوران میں (مطلقہ) عورتوں کو پھر اپنی زوجیت میں واپس لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔

رجعت کو ایذا رسانی کا ذریعہ بنایا جائے

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (البقرہ ۲۳۱)

اور جب تم عورتوں کو (دوبارہ) طلاق دے چکو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو یا تو انہیں اچھے طریقے سے اپنے نکاح میں روک لو یا شائستہ طریقے سے ا نہیں رخصت کر دو محض ستانے کی غرض سے انہیں نہ روکے رکھو کہ یہ زیادتی ہے اور جو ایسا کرے گا وہ درحقیقت اپنے ہی اوپر ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔

طلاق کے بعد رجعت اسی نیت سے ہونی چاہیے کہ اب بیوی کو حسن سلوک کے ساتھ رکھنا ہے اور اس کے ساتھ موافقت اور محبت کی زندگی گزارنا ہے۔ طلاق کے بعد محض اس نیت سے رجوع کرنا کہ بیوی کو ستانے اور زدوکوب کرنے کا موقع ہاتھ آجائے ایک مسلمان کے لیے کسی طرح مناسب نہیں۔ یہ اللہ کے احکام کے ساتھ کھیل ہے اور الٰہی قانون کے منشا کا خون کرنا ہے۔

علیحدگی کی صورت میں شریفانہ رویہ اختیار کرو

اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (البقرہ ۲۳۱)

اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا (البقرہ ۲۲۹)

یا شریفانہ طریقے پر انہیں رخصت کر دو۔ یا اچھے سلوک کے ساتھ انہیں رخصت کر دو۔ اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا تمہارے لیے ہرگز جائز نہیں کہ دیے ہوئے مال میں سے ان سے کچھ واپس لو۔

یعنی دو طلاق کے بعد اگر بیوی کو بالکل علیحدہ کرنے ہی کا ارادہ کر لیا ہو تب بھی غم و غصہ میں غیر شریفانہ

طریقے اور حسن سلوک کو بھول نہ جاؤ۔ اگر وہ اب تمہاری بیوی نہیں ہے تو کیا ہوا انسان تو ہے، اور پھر عرصے تک تمہارے ساتھ زندگی گزار چکی ہے، جو کچھ تم اسے دے چکے ہو اس کا واپس لینا تو تمہارے لیے جائز ہی نہیں ہے تمہارا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ کچھ اور دے دلا کر عزت و سلوک کے ساتھ اسے رخصت کرو

تین طلاق کے بعد علیحدگی

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (البقرہ ۲۳۰)

پس اگر (دو بار طلاق دینے کے بعد) عورت کو (تیسری بار) طلاق دے دی تو وہ عورت پھر اس کے لیے حلال نہ ہوگی الا یہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے مرد سے ہو

دو طلاق تک تو مرد کو اختیار ہے کہ وہ عدت کے دوران رجوع کرے اور عدت کے بعد نکاح کرلے لیکن عدت گزرنے کے بعد قطعی انقطاع ہو جاتا ہے نہ اب رجوع ہو سکتا ہے اور نہ نکاح ——— نکاح کی صرف ایک ہی شکل ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس سے نکاح کرے اور پھر اپنی خوشی سے طلاق دے دے[1]۔ اب عدت گزرنے کے بعد پہلا شوہر نکاح کر سکتا ہے۔ اس صورت کو شریعت میں حلالہ کہتے ہیں۔

حلالہ کے بعد نکاح میں کوئی حرج نہیں

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَّتَرَاجَعَا اِنْ ظَنَّا اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (البقرہ ۲۳۰)

پس اگر (یہ دوسرا شوہر) اسے طلاق دے دے اور پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدود الٰہی پر قائم رہیں گے تو ان کے لیے باہم رجوع کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

نکاح اسی وقت صحیح ہوگا جب دوسرا شخص خود اپنی خوشی سے طلاق دے دے لیکن اگر کوئی شخص اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے لیے حلال کرنے کی غرض سے سازش کے طور پر کسی سے اس کا نکاح کرائے اور پہلے سے یہ طے کرے کہ وہ نکاح کے بعد اسے طلاق دے دے گا۔ تو یہ سراسر ایک ناجائز فعل ہوگا۔ ایسا نکاح شریعت کی نظر میں نکاح نہیں ہے۔ اور ایسے سازشی نکاح و طلاق سے ہرگز اپنے پہلے شوہر

[1] حدیث کی رو سے یہ بات بھی ضروری ہے کہ دوسرا شوہر ہم بستری کے بعد طلاق دے اگر ہم بستری کیے بغیر طلاق دیدی تب بھی پہلے شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی۔

کے لیے حلال نہ ہوگی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے سے حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔

مدتِ ایلاء گزرنے پر طلاق ہو جائیگی

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (البقرۃ:۔۲۲۶)

جو لوگ اپنی بیویوں سے مخصوص تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر وہ (اس مدت میں) رجوع کرلیں تو اللہ تعالےٰ معاف کرنے والا مہربان ہے اور اگر انھوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو اللہ تعالےٰ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

اگر مرد عورت سے تعلق زن وشو نہ رکھنے کی قسم کھالے تو اس کو شرعی اصطلاح میں ایلاء کہتے ہیں اور اس کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔

اس مدت میں اگر شوہر نے رجوع نہ کیا تو مدت پوری ہونے پر طلاق واقع ہو جائے گی[۲] اور اگر رجوع کرلیا تو قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔

خلع

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۝ (البقرۃ ۲۲۹)

پس اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ (نکاح کو باقی رکھتے ہوئے) زوجین اللہ کے حدود قائم نہ رہیں گے تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کرے۔

---

[۱] کسی شخص کو تیار کرکے نکاح کرانا اور پھر ہم بستری کے بعد اس سے طلاق دلوانا ایک معصیت اور شرمناک بات ضرور ہے لیکن فقہ حنفی میں اس طرح کے حلالہ سے بھی مطلقہ عورت پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جاتی ہے اور وہ اس سے دوبارہ نکاح کرسکتا ہے۔

[۲] طلاق مدت گزرنے پر خود بخود واقع ہو جائے گی یا عدالت شوہر سے مطالبہ کرے گی کہ وہ طلاق دے، پھر یہ طلاق رجعی ہوگی یا بائن۔ یہ تمام تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔

عورت اگر کچھ دے دلا کر اپنے شوہر سے آزادی حاصل کرے تو شریعت کی اصطلاح میں اس کو خلع کہتے ہیں۔

اسلام نے جس طرح مرد کو یہ اختیار دیا ہے کہ اگر کسی عورت سے واقعی نباہ کی کوئی شکل ممکن نہ ہو تو وہ اسے طلاق دے دے۔ اسی طرح عورت کو بھی یہ اختیار دیا ہے کہ اگر وہ فی الواقع شوہر سے مایوس ہو چکی ہو اور نباہ کا اب کوئی امکان نہ ہو تو وہ کچھ معاوضہ دے کر طلاق لے سکتی ہے۔ اس صورت میں جو طلاق ہوگی وہ رجعی نہیں بلکہ بائن ہے، چونکہ عورت نے معاوضہ دے کر اس طلاق کو خریدا ہے اس لیے اب شوہر کو دوران عدت اس طلاق سے رجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔ البتہ اگر یہی مرد و عورت پھر ایک دوسرے سے راضی ہو جائیں اور دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو ایسا کرنا اُن کے لیے بالکل جائز ہوگا۔

خلع کے معاملے میں اگر عورت اور مرد کے درمیان گھر ہی گھر میں کوئی بات طے ہو جائے تو جو کچھ طے ہوا ہو وہی نافذ ہوگا۔ لیکن اگر معاملہ عدالت تک پہنچ جائے تو عدالت صرف اس بات کی تحقیق کرے گی کہ آیا فی الواقع یہ عورت اپنے مرد سے اس حد تک متنفر ہو چکی ہے کہ اب اس سے نباہ ممکن ہی نہیں اس بارے میں اطمینان ہو جانے کے بعد حالات کے لحاظ سے عدالت جو فدیہ تجویز کرے گی، اس فدیہ کو قبول کر کے شوہر کو طلاق دینا ہوگی۔

خلع کے معاوضے کے سلسلے میں علمائے دین نے بالعموم اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ شوہر جو مال بیوی کو دے چکا ہے اس سے زیادہ عورت سے مرد کو کچھ دلوایا جائے۔

ظہار

ظہار ایک اصطلاحی لفظ ہے۔ قدیم زمانے میں اہل عرب بیوی سے لڑائی کے دوران کبھی یہ کہہ بیٹھتے تھے: اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ "تو میرے لیے میری ماں کی پیٹھ جیسی ہے" اور یہ بات جب کسی کے منہ سے نکل جاتی تھی۔ تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اب یہ عورت اس پر حرام ہو گئی ہے کیونکہ وہ اس کو اپنی ماں جیسا کہہ چکا ہے۔ اصلاح معاشرت کے ذیل میں قرآن نے ان غلط خیالات کی بھی اصلاح فرمائی اور بتایا کہ بیوی کو ماں کہنے یا ماں کے ساتھ تشبیہ دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی۔ ماں تو بس وہی ہے جس سے آدمی پیدا ہوا ہے۔ محض زبان سے کسی کو ماں کہہ دینے سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی کہ جو بیوی تھی اب وہ محض تمہاری تشبیہ کے اثر سے ماں بن جائے۔

ظہار سے بیوی ماں نہیں بن جاتی

وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَکُمُ الّٰٓئِیْ تُظٰھِرُوْنَ مِنْھُنَّ اُمَّھٰتِکُمْ (احزاب ۴)

اور خدا نے تم لوگوں کی ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری ماں نہیں بنا دیا ہے

ظہار سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا

اَلَّذِیْنَ یُظٰھِرُوْنَ مِنْکُمْ مِّنْ نِّسَآئِھِمْ مَّا ھُنَّ اُمَّھٰتِھِمْ اِنْ اُمَّھٰتُھُمْ اِلَّا الّٰٓئِیْ وَلَدْنَھُمْ (مجادلہ ۲)

جو لوگ تم میں سے اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں۔ (ظہار سے) وہ ان کی مائیں نہیں بن جاتیں ان کی مائیں تو بس وہی ہیں جن کے پیٹ سے انھوں نے جنم لیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بیوی کو ماں کہنے یا ماں کی پیٹھ سے تشبیہ دینے سے بیوی کی حقیقت نہیں بدل جاتی بیوی تو بہر حال بیوی ہی ہے۔ ظہار سے اس کے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ یہ ایک نامعقول اور ناپسندیدہ بات ہے اس لیے اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا اور کفارہ ادا کرنے سے پہلے بیوی سے مخصوص تعلقات رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

ظہار ایک نامعقول بات ہے

وَاِنَّھُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْکَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا (مجادلہ ۲)

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ (ظہار کرنے والے) لوگ بڑی نامعقول اور جھوٹی بات منہ سے نکالتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ظہار سے بیوی کے نکاح پر اثر تو نہیں پڑتا۔ لیکن تمہیں ایسی نامعقول اور جھوٹی بات کہنے کی ضرورت کیا ہے؟

لعان

قرآن حکیم انسداد فواحش کے ذیل میں اس بات سے بھی انتہائی سختی کے ساتھ روکتا ہے کہ کوئی فحش باتوں کو پھیلائے اور بے حیائی کے چرچے کرتا پھرے۔ کیونکہ یہ تذکرے اور چرچے فواحش کے پھیلنے کا موجب بنتے ہیں، انسانی ذہن کو پراگندہ کرتے ہیں اور شہوانی جذبات کو بھڑکانے کا سبب بنتے ہیں۔ اسلامی سوسائٹی میں پاک دامن لوگوں پر تہمت لگانے کو سخت ترین جرم قرار دیا گیا ہے۔ اگر کوئی مرد یا عورت کسی پاک دامن پر بدکاری کی تہمت لگا دے تو اس کو چار گواہ ثبوت میں پیش کرنا ہوں گے جب کہ دوسرے تمام معاملات میں صرف دو گواہ کافی قرار دیے گئے ہیں ۔۔۔ اور اگر وہ چار گواہ ثبوت میں پیش نہ کر سکے تو اس پر حد قذف جاری کی جائے گی یعنی اس کو اسی کوڑوں کی عبرتناک سزا دی

جائے گی اور پھر کبھی اس کی گواہی قبول نہ کی جائے گی۔

انسانی اخلاق کی حفاظت اور انسداد فواحش کے ان سخت احکام کے بعد کون جرأت کر سکتا تھا کہ کسی پر تہمت لگائے یا کسی کے بارے میں کسی بدگمانی کا اظہار کرے لیکن ان احکام سے لوگوں میں ایک اور سوال پیدا ہو گیا کہ غیر مرد اور غیر عورت کی بدچلنی اور بدکاری دیکھ کر تو خیر آدمی صبر کر سکتا ہے۔ گواہ موجود نہ ہوں تو خاموش رہ کر معاملہ کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی بیوی کو کسی کے ساتھ ملوث دیکھ لے تو کیا کرے؟ کیا یونہی عمر بھر خون کے گھونٹ پیتا رہے؟ اگر قتل کرتا ہے تو الٹا مستوجب سزا ہوتا ہے۔ گواہ ڈھونڈنے نکلے تو ان کے آنے تک مجرم کب ٹھیرا رہے گا۔ اور صبر کرے تو آخر کیسے کرے۔ بیوی کو طلاق دیکر علیحدہ تو کر سکتا ہے مگر نہ عورت کو کسی قسم کی مادی اور اخلاقی سزا ملی نہ اس کے آشنا کو، اور اگر عورت کو ناجائز حمل ٹھہر گیا تو غیر کا بچہ الگ گلے پڑا۔ ابتدا میں تو یہ سوال فرضی طور پر اٹھایا گیا لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد عملاً ایسے کئی مقدمات رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوئے جس میں شوہروں نے اپنی بیویوں کو بچشم خود ملوث دیکھا تھا۔

اس موقع پر خدا نے مسلمانوں کی مشکل آسان کرنے اور ایسی بدکار بیویوں سے علیحدہ ہونے کے لیے جو طریقہ تجویز فرمایا۔ اسلامی قانون کی اصطلاح میں اس کا نام "لعان" ہے

طلاق، خلع، ایلاء وغیرہ کے ذریعہ زوجین میں جو تفریق ہوتی ہے اس کے بعد دوبارہ دونوں کا نکاح جائز ہے حتیٰ کہ اگر طلاق مغلظہ دی ہو تب بھی حلالہ کے بعد نکاح ممکن ہے لیکن لعان کے ذریعہ جدا ہونے والے مرد و عورت پھر زندگی بھر کبھی بھی باہم نکاح نہیں کر سکتے [1]

لعان کا طریقہ

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ	اور جو لوگ اپنی بیویوں پر تہمت لگائیں
اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ	اور ان کے پاس خود ان کے اپنے سوا دوسرے
لَّهُمْ شُهَدَاءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ	کوئی گواہ نہ ہوں، تو ان میں سے ایک شخص
فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ	کی شہادت (یہ ہے کہ) وہ چار مرتبہ خدا
شَهَادٰتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ	کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ (تہمت لگانے
الصّٰدِقِيْنَ ۝	میں) واقعی سچا ہے اور پانچویں مرتبہ کہے کہ

---

[1] اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ فقہ حنفی بعض صورتوں میں دوبارہ نکاح کی اجازت دیتی ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ (مدیر)

کلامِ اقبال پر کچھ خیالات

(جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب)

ایک صاحبِ علم بزرگ نے بالِ جبریل کی شرح دعوتی نقطۂ نظر سے کی اور شارح کا مسودہ جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب بھوپال کے پاس مشورے کے لیے بھیجا۔ موصوف نے اس شرح پر اظہارِ خیال سے پہلے ان کو ایک مبسوط خط لکھا۔ یہ خط اپنی ساخت اور مضامین کے لحاظ سے مقالہ بن گیا۔ اس میں کلامِ اقبال پر جس گہرائی سے نظر ڈالی گئی ہے اور جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں وہ اس لائق ہیں کہ قارئینِ زندگی بھی انھیں پڑھیں۔

ہم ابتدائی پیراگراف حذف کر کے وہ مقالہ نما مکتوب شائع کر رہے ہیں۔ فاضل مکتوب نگار نے نفسِ شاعری اور کلامِ اقبال کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ضروری نہیں کہ ادارۂ زندگی ان تمام خیالات سے متفق ہو۔ (ادارہ)

اگر شاعر محض قوال نہیں بلکہ "دیدۂ بینائے قوم" ہے اور اس کی شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ اس کے دلی جذبات کا کرشمہ ہے تو ماننا پڑے گا کہ اکثر کامیاب اشعار شرح و تفصیل کے متحمل نہیں ہوتے بلکہ ان کا سارا حسن اجمال ہی میں ہوتا ہے۔ مولانا شبلی کے بقول گویا حباب ہوتے ہیں جو چھونے سے ٹوٹ جاتے ہیں۔

شاعری دراصل ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ شاعر کا کوئی احساس جب شدت اختیار کر لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے جس طرح درد کی حالت میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے اسی طرح جب شاعر کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں تو وہ بے اختیار ان جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔ البتہ ایک عام آدمی کی آہ اور شاعر کی آہ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ شاعر کی قوتِ تخیل اس کے احساس کو [illegible]

تو شب آفریدی چراغ آفریدم ۔ سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی ۔ خیابان و گلزار و باغ آفریدم

تو نے شب (یعنی رات) پیدا کی میں نے چراغ پیدا کیا۔ تو نے سفال (یعنی خزف ریزے) پیدا کیے میں نے اس سے پیالہ بنایا۔

تو نے بیابان و کہسار و راغ (یعنی جنگل) پیدا کیا۔ میں نے خیابان و گلزار و باغ اگائے۔

یا مثلاً وہ کہتا ہے

نوائے عشق را ساز است آدم ۔ کشاید راز و خود راز است آدم

جہاں او آفرید این خوب تر ساخت ۔ مگر با ایزد انباز است آدم

آدمی نوائے عشق کا ساز ہے۔ راز کی پردہ کشائی کرتا ہے لیکن خود ایک راز ہے۔ جہاں کو اس نے یعنی خدا نے پیدا کیا اور اس نے یعنی آدمی نے اسے سنوارا۔ تو کیا آدمی اللہ کا شریک ہے؟
ظاہر ہے کہ ان اشعار میں شاعرانہ حسن تعلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ چند اشعار معانی کی ایک دنیا اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اور خودی و خود شناسی کی جو تعلیم یہ اشعار دے رہے ہیں وہ بڑی بڑی تقریریں اور مقالے نہیں دے سکتے۔ مگر یہ تمام اثر بلکہ ان کا حسن تک ختم ہو جائے اگر ان کا تجزیہ کر دیا جائے بلکہ تجزیہ کے بعد تو عجب نہیں کہ کسی مولوی صاحب کو کفر کا فتویٰ مرتب کرنا پڑے۔

ان مثالوں سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ شاعر خطیب و واعظ نہیں ہوتا لیکن اپنی قوت تخییل اور حسن استدلال سے وہ اثر پیدا کر دیتا ہے جو واعظ اور خطیب نہیں پیدا کر سکتا۔ اور وہ جن نزاکتوں سے پیام بناتا ہے اگر ان کا تجزیہ کر دیا جائے بلکہ بعض اوقات تو اگر ان کو سمجھ بھی لیا جائے تو اس کا سارا حسن و اثر خاک میں مل جائے۔ شاید یہی بات ہے جو انوری نے اپنے کسی شعر پر تبصرہ سن کر کہی تھی کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" (میرے شعر کو مدرسے میں کون لے گیا؟)

اس بات کو زیادہ محتاط طریقے سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شعرا کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک شاعر دوسرا متشاعر۔ دوسرے الفاظ میں ایک فطری شاعر دوسرا فنی شاعر۔ فطری شاعر جو کچھ کہتا ہے جذبات میں ڈوب کر کہتا ہے۔ اس کے یہاں جذبات و احساسات پہلے آتے ہیں [illegible] سے وہ خود مست ہو جاتا ہے اور سننے والوں کو مست بنا دیتا ہے۔ لیکن فنی شاعر کے یہاں چاہے مہارت فن ہو لیکن [illegible]

[illegible] بیان کیا جا سکتا ہے کہ شاعر [illegible] ہے [illegible] کے لیے وقت نہیں دیتا بلکہ خود تڑپتا ہے اور اپنی تڑپ [illegible] کو [illegible] جاتا ہے۔ تشریح و تفسیر کا بوجھ صرف [illegible] شاعری اٹھا سکتی ہے۔ نظری شعر کی اگر تشریح کر دی جائے تو وہ شعر رہے گا اور نہ خطبہ کا کام دے سکے گا۔

میں جو پہلے سے بالعموم شاعری کے متعلق اور بالخصوص اقبال کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہوں اس لیے کبھی اس کی شرح و بسط کا قائل نہیں ہوا۔ اقبال کے بہترین شارح ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے بھی یہی بات کہی ہے:۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ شعر جیسی لطیف چیز جس کی پرورش آغوش وجدان میں ہوتی ہے منطقی تنقید و تجزیہ کی گرانباری کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

اقبال کی شاعری میں چونکہ ایک پیغام بھی ہے اس لیے اس کو سمجھنے میں اگر لوگوں کی مدد کرنا ہی ہے تو اتنا کافی ہوگا کہ بعض الفاظ و اصطلاحات کی تشریح کر دی جائے۔ مثلاً وہ قطعہ جو اوپر نقل ہوا "خداوندا خدائی درد سر ہے" اس میں "خدائی" اور "بندگی" مصطلحہ غلامی یعنی محکومی کے معنی میں استعمال ہوا ہے رہ گئی یہ بات کہ اقبال نے اپنے کلام میں فلسفہ و اجتماعیات کے اور دین و اخلاق کے جو مسائل بیان کیے ہیں ان کو سمجھنے کا کیا طریقہ ہے؟ تو میں عرض کروں گا کہ شاعری فلسفہ و علوم سیکھنے کا ذریعہ نہیں ہے جو شخص ان علوم سے واقف نہیں ہے وہ شعر کی تشریح میں ان مسائل کو بیان کر دینے کے بعد بھی ناواقف ہی رہے گا۔ میں پھر کہوں گا کہ شعر کا کام تعلیم دینا ہے ہی نہیں اس کا کام صرف متاثر کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا شاعر مفکر نہیں بنا سکا۔ اقبال ہی کو لے لیجیے۔ اس نے لوگوں کو متاثر کتنا ہی کیا ہو لیکن وہ ایک منظم و مرتب فکر پیش نہیں کر سکا۔ اور یہ شاعر کا نقص نہیں ہے بلکہ یہ کام اس کے دائرے سے خارج ہے۔

یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اقبال نے ساز زندگی کے خاموش تاروں کو مضراب [illegible] اس کی شاعری [illegible] ہے اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ وہ [illegible] ایک تعلیم کا [illegible] ہے [illegible] کے نام سے کلام کی ایک مستقل صنف بن گئی ہے حتیٰ کہ [illegible] میں بنا لیا جاتا ہے اور [illegible] اپنی [illegible] وہ اقبال کے نام سے [illegible] کر وہ فکری مقدمات فراہم نہیں کرتا فکر کا نچوڑ دیتا ہے۔ گویا وہ [illegible] نہیں دیتا [illegible]

پہچان کر اس پیغام کے امین بنے تھے وہ بھی خود کو بھول گئے اور دنیا نے بھی ان کو اس حیثیت سے بھلا دیا
ان کی خود فراموشی نے مختلف شکلیں اختیار کیں۔ ان کے افکار و عقائد میں بھی کسی ایک جانب جھکاؤ
پیدا ہوا اور اعمال میں بھی۔ ایک طرف ظل اللہ بن کر انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو اولیاء الشیطان کے
کرنے کا تھا چست و چالاک گھوڑے کی طرح زیر بار چلنے کے بجائے جنازے کی طرح لوگوں کے کاندھوں
پر سوار ہو کر چلے۔ دوسری طرف زبان سے لا رھبانیۃ فی الاسلام کہتے ہوئے عملاً ترک لذات
اور ترک دنیا کی لذت میں کھو گئے ایک طرف نظری طور پر خدا کو مانتے ہوئے اسے تو آئینی تخت پر
بٹھا دیا اور خود عقول عشرہ ایجاد کر کے آسمانوں کی گردش میں پھنس گئے۔ دوسری طرف خدا کو مانا تو اس
طرح کہ ایک ایک ذرہ انھیں خدا نظر آنے لگا۔ لا الٰہ الا اللہ پڑھتے ہوئے لا موجود الا اللہ پر
ایمان لے آئے اور اپنے وجود ہی سے انکار کر بیٹھے۔ بڑا بننے پر آئے تو زبان حال سے انا ربکم الاعلیٰ
بولنے لگے۔ اور انکسار و فروتنی کی طرف جھکے تو خود کو ساری دنیا سے زیادہ ذلیل سمجھ بیٹھے حتیٰ کہ پستی و
ذلت کی عادت ڈالنے کے لیے باقاعدہ مشقیں کی جانے لگیں (مثلاً فرقہ ملامتیہ) نتیجہ یہ نکلا کہ ہر جابر و
سرکش کے لیے لقمۂ تر بن گئے۔ مختصر یہ کہ ۔ حقیقت خرافات میں کھو گئی ۔ یہ امت روایات میں کھو گئی۔

ان حالات میں اور ایسے گوناگوں راگوں کے درمیان ایک گرج سنائی دی اس نے کڑک کر کہا
کہ یہ کیا واہیات ہے کہ "میں کچھ نہیں" نادان! تو ہی سب کچھ ہے" خدا کی مخلوق میں سب سے بڑا
تو ہے .... دانہ تو دہقاں بھی تو حاصل بھی تو .... ناخدا تو بحر تو ساحل بھی تو ....
اس نے تن بہ تقدیر انسان سے کہا کہ شکوۂ تقدیر یزداں فضول ہے ۔ تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟
اس نے خود فراموش انسان کو جھنجھوڑ کر کہا۔ اپنے میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی" ۔ اس نے بتایا
کہ نادان! اپنی خودی پہچان ۔ جو چیز تجھے حاصل ہے ۔ وہ پہاڑوں اور دریاؤں کو میسر نہیں ۔ جو
مقام تیرا ہے وہ چاند اور سورج کو حاصل نہیں تو ملاءِ اعلیٰ کا مکین ہے ۔ تو امانت الٰہی کا امین ہے
تو اس زمین کا آسمان ہے ۔ تو آفاق میں گم ہو جانے کے لیے نہیں۔ آفاق کو تجھ میں گم ہونا چاہیے ۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر ۔ تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اقبال نے جس خودی کو بیدار کیا وہ سروں کے جھکنے اور اکڑنے میں ایک خاص کیفیت پیدا کر کے
نہیں ایک مخصوص شکل کا پابند بناتی ہے ۔ جو سر خدا کی جناب میں جھکے بغیر دوسروں کے مقابلے میں بلند ہونا

چاہتا ہے وہ خودشناس نہیں۔ اور جو سر دوسری طرف سے اکڑے بغیر خدا کے سامنے جھکے اس کا جھکنا درحقیقت جھکنا ہی نہیں۔ جب آدمی خود کو پہچان کر خدا کا غلام بن جاتا ہے تو ساری کائنات اپنے کو اس کی سرپرستی میں دے دیتی ہے۔ اس کا سر خدا کے سامنے جھکتا ہے اور ساری خدائی کا دل اس کے سامنے۔ یہ وہ چیز ہے جو خودآگاہ بندہ مومن کے لیے مخصوص ہے۔ دنیا کی کوئی ہستی اس نعمت میں اس کی شریک نہیں۔ گویا لاشریک خدا کا پرستار اس پہلو سے خود لاشریک ہے۔ ایک انسان تب ہی مسلمان بنتا ہے جب کہ اس میں جباری بھی ہو اور قہاری بھی۔ قدوسی بھی ہو اور جبروت بھی۔ ان چار عناصر سے ترکیب پاکر جو چیز تیار ہوتی ہے اس سے لالہ کے جلتے ہوئے جگر میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ اور باطل کے اٹھائے ہوئے طوفان دہل جاتے ہیں۔ ایسا خودآگاہ وجود جب تیار ہوتا ہے تو اس کی اذان سے وہ سحر طلوع ہوتی ہے جس سے نور کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور شبستان وجود لرز جاتا ہے۔ وہ چاہے قاری نظر آتا ہو لیکن حقیقت میں خود چلتا پھرتا قرآن ہوتا ہے۔ وہ بخارا یا بدخشاں نام کے کسی نشیمن میں قید نہیں رہتا بلکہ یہ بندۂ خاکی جبریل امین کا ہمسایہ بن جاتا ہے۔ اس کا معیار قدر وقیمت بدل جاتا ہے۔ اس کے یہاں شورش طوفان حلال ہوتی ہے اور لذت ساحل حرام۔ اس کا تعلق بجلی سے جڑ جاتا ہے اور حاصل اس کے لیے ہیچ ہوتا۔ وہ "نہایت اندیشہ" ہوتا ہے اور "کمال جنون"۔ وہ "ابن الکتاب" نہیں رہتا "ام الکتاب" بن جاتا ہے۔ وہ خیر پر عامل نہیں ہوتا بلکہ خیر کا سرپرست ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ شر سے محض بچ لینے ہی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ آگے بڑھ کر شر کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ تقدیر کے ہاتھ میں بے بس "جمادات ونباتات" نہیں بنا رہتا بلکہ "احکام الٰہی کا پابند" ہوکر "خود تقدیر یزداں" بن جاتا ہے۔ وہ "خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات" ہی پر بس نہیں کرتا بلکہ اس کی فطرت "وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل" پکارتی ہے۔ وہ "مستی گفتار" میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ اس کے رگ وپے میں "مستی کردار" ہوتی ہے۔ اس کو ان چیزوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی کہ "ابن مریم مرگیا یا زندہ ہے" اور یہ کہ "ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم" اس کی پیاس ان "الٰہیات کے ترشے ہوئے لات ومنات" سے نہیں بجھتی، بلکہ اس کا حوصلہ "مصاف زندگی" میں کود کر "احتساب کائنات" چاہتا ہے۔ وہ "سیل تندرو" بن کر کوہ وبیاباں سے گزرتا ہے اور "گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں" بن جاتا ہے۔

خودشناس آدمی متکبر ومغرور نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنے بنی نوع کا سچا خیرخواہ اور انتہائی منکسر المزاج

ہوتا ہے۔ اگر کسی نے خود بینی کو خود شناسی سمجھ لیا۔ کیونکہ دونوں کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں ــــ تو سمجھنا چاہیے کہ ابھی اس کی خودی جاگی نہیں ہے۔ جو شخص صرف اکڑتا ہے وہ خود شناس نہیں اور جو شخص صرف جھکنا جانتا ہے وہ بھی خود شناس نہیں۔ قیام کی جگہ قیام اور سجود کی جگہ سجود اسی وقت ممکن ہے جبکہ آدمی خود کو اچھی طرح پہچان لے۔ اس کے بغیر آدمی قیام کے موقع پر سجدہ میں گر پڑے گا اور سجدہ کی جگہ کھڑا رہے گا۔ مختصر یہ کہ خود کو پہچانے بغیر آدمی خدا کو نہیں پہچان سکتا۔ اور خدا کو پہچانے بغیر خود کو پہچاننا ممکن نہیں۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ

منکرِ حق نزدِ ملّا کافر است　　منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

اقبال کے نزدیک جب کوئی فرد اپنی خودی کو جگا لیتا ہے تو اس کی نگاہ سے "بدل جاتی ہیں تقدیریں" لیکن جب کسی جماعت یا سوسائٹی کی خودی بیدار ہو جاتی ہے تو پھر اس کی جاذبیت کا، اس کی طاقت کا اور اس کی برکات کا اندازہ کرنا آج کے ترقی زدہ انسان کے لیے تو بہت ہی مشکل ہے۔ ایسی جماعت کے قدموں سے دنیا میں سچ مچ بہار آ جاتی ہے۔ یہ دنیا دار المحن ہوتے ہوئے دار السلام ــــ امن و سلامتی کی جگہ ــــ بن جاتی ہے۔

وہ سحر جس سے لرز جائے شبستانِ وجود　　ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اسی خودی یا خود شناسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آدمی اپنی کمزوریوں اور طاقتوں کو خوب جان لے تاکہ کمزوریوں کا علاج کر کے اپنی طاقتوں کو نشو و نما دے سکے اور ان کو صحیح مصرف میں صحیح طریقے سے صرف بھی کر سکے۔ یہ چیز بہت بڑی نعمت بھی ہے ساتھ ہی مشکل بھی ہے۔ اکثر لوگ اپنی صلاحیتوں کے بارے میں کم اندازہ لگاتے ہیں یا زیادہ۔ اخلاقی اعتبار سے کم اندازہ لگانا اتنا معیوب نہیں ہے جتنا برا زیادہ اندازہ لگانا ہے۔ لیکن صلاحیتوں کے ضائع ہونے کے اعتبار سے دونوں شکلیں یکساں مضر ہیں۔ پہلی اگر خود فراموشی ہے تو دوسری خود فریبی۔ قلم تراش کو لے کر میدان میں پہنچ جانا جس قدر غلط ہے اتنا ہی غلط تلوار سے پنسل بنانے لگنا ہے۔ اقبال کے نزدیک جب آدمی اپنے مقام کو صحیح طور پر پہچان لیتا ہے تو اس کے اندر جماؤ اور استحکام پیدا ہو جاتا ہے ــــ یعنی صبر اور ظرف ــــ نہ وہ موافق حالات میں بہکتا ہے نہ مخالف حالات میں دل چھوڑ دیتا ہے۔ نہ وہ بے جا پندار میں مبتلا ہوتا نہ بے جا انکسار میں۔ نہ وہ کسی کو حقیر جانتا ہے۔ نہ کسی سے مرعوب ہوتا۔ پھر وہ نہ تو اپنی صلاحیتوں کے

اکڑتا ہے نہ ان کے فقدان پر شرماتا اور رنجیدہ ہوتا کیونکہ اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ حقیقت پیوست ہوتی ہے کہ "تعریف کا مستحق خالق کمال ہے نہ کہ صاحب کمال" خودشناس آدمی کے اندر ایسی صفات اور طاقتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ خدا کی صفات پر ایمان لانے والا بندہ متخلق با خلاق اللہ بن جاتا ہے اس کے بعد نہ تو وہ روحانیت کے گوشہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کر لینے پر قناعت کرتا اور نہ مادیت کی دنیا میں ہائے ہائے کرتا پھرتا۔ پھر تو مالک کائنات کی طاقت اس کی پشت پر ہوتی ہے۔ اللہ اس کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ کام کرتا ہے اللہ اس کا پیر بن جاتا ہے جس سے وہ چلتا ہے۔ اس کے ارادے قدرت کے مقاصد کا معیار بن جاتے ہیں اور وہ دنیا میں بھی میزان بن جاتا ہے اور قیامت میں بھی میزان۔

یہ ہے میرے خیال میں فلسفیانہ موشگافیوں سے ہٹ کر اقبال کے تصور خودی کا ایک نا تمام سا خلاصہ۔ یہ بات کہ انسان کی خودی فطرتاً زندہ و بیدار ہوتی ہے اور خارجی چیزیں اسے مارتی اور سلاتی ہیں۔ یا یہ کہ اپنی فطرت کی رو سے وہ مردہ و خفتہ ہوتی ہے اور بیرونی عوامل اسے ابھارتے ہیں۔ پھر یہ کہ انسان کی خودی کے سو جانے سے کسی طرح انسانیت پر نیند طاری ہو جاتی ہے کہ بس کبھی کبھی وہ خواب دیکھ کر چونک پڑتی ہے اور پھر خراٹے لینے لگتی ہے اور خودی کے جاگ پڑنے سے کس طرح انسانیت بیدار ہو کر اپنی منزل مقصود کی جانب دوڑنے لگتی ہے۔ نیز یہ کہ انسان کی خودی کو جگانے والی چیزیں کیا کیا ہیں اور سلانے والی کیا کیا؟ یہ اور ایسے دوسرے نکتے اقبال کے یہاں کہیں اشاروں میں ملتے ہیں اور کہیں تفصیل سے۔ لیکن یہ خود ایسا موضوع ہے جو بجائے خود تفصیل اور دیدہ وری کا طالب ہے مختصر یہ کہ کہیں تو انہوں نے صاف طور پر اسلام کا نام لے کر اور کہیں نام بدل کر جو کچھ پیش کیا ہے وہ اسلام ہی ہے جس کو وہ خودی کہتا ہے وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ وہی روح ایمان، روح بندگی اور روح جہاد ہے۔ وہ خود کہتا ہے۔

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر دوسرا نام اسی دین کا ہے فقر غیور

یہ "فقر غیور" اس کے نزدیک انسان کی ایک ہی قیمتی متاع ہے۔ اس کی یہی پونجی اگر لٹ گئی تو پھر وہ حیوانات سے بھی ارذل ہے۔

البتہ اگر میں عرض کروں تو آپ اس کو چھوٹا منہ بڑی بات نہ خیال فرمائیں کہ اقبال کی تعلیم میں تقریر زبانی ہے۔ پر ملاحظہ ہو

جس کی سلطنت اُسی کا قانون

مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ

" توحید، رسالت اور قیامت پر ایک عارفانہ بحث " کے عنوان سے مولانا پھولپوری رح کے دلائل ماہنامہ نظام کانپور میں شائع ہو رہے ہیں، یہ حصہ مئی ۱۹۶۲ء کے شمارے سے لیا گیا ہے اور عنوان ہم نے قائم کیا ہے ۔ (ادارہ)

ہم جس کے مملوک اور بندے ہیں اسی کا قانون بھی ہونا چاہیے ۔ دنیا میں کہیں اس کی نظیر موجود نہیں ہے کہ سلطنت تو کسی اور کی ہو اور قانون کسی اور کا چل رہا ہو، جس کی رعایا اسی کا قانون، پس اب اس کو عقل سے سوچنا ہے کہ درحقیقت ہم کس کے مملوک ہیں ۔ یہ آسمان اور زمین کس کے ہیں ۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ۔۔۔ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے باد سازگار ۔۔۔ خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نور آفتاب
کس نے بھر دی خوشۂ گندم سے گندم کی یہ جیب ۔۔۔ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

جن کی ملکیت زمینوں اور آسمانوں میں ہے انہیں کا قانون اصلی قانون ہوگا ۔ زمین اور آسمان کا مالک کون ہے ۔ ہے کوئی مدعی جو دعویٰ کرے کہ ہم زمین اور آسمان کے مالک ہیں؟ جو ان کا مالک حقیقی ہے انہیں کو دعویٰ ملکیت زیبا ہے ۔

بادشاہی زیبد آں خلّاق را ۔۔۔ بادشاہاں جملگی عاجز او را

بادشاہی صرف اس خلاق عالم کو زیبا ہے جملہ شاہان دنیا اس کے سامنے عاجز ہیں اس کو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمینوں کا ملک ہے ۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ آسمان اور زمین کے اندر جو مخلوق ہے وہ کس کی ملک ہیں تو فرماتے ہیں وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور جو کچھ آسمانوں اور زمین کے اندر موجودات ہیں سب اللہ تعالیٰ

ہی کی ملک ہیں۔ جب یہ مقدمات تسلیم ہیں تو جس کا ملک اسی کا قانون سے فرماتے ہیں کہ الملک لله و
اسی کا ملک ہے اور اسی کا قانون اصلی قانون ہے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کسی کا قانون، قا
بن سکتا ہے۔ وہ ٹھکرا سکے نقل سو تمہے جس کے ہم غلام ہیں اسی ذات پاک کا قانون ہما
اصلی قانون ہے۔

جب انہیں کی سلطنت ہے، انہیں کی حکومت ہے، انہیں کی مملکت ہے تو انہیں کا قا
اصلی قانون ہے۔ باقی شاہان دنیا کے قوانین جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف ر
وہ سب اختراعی اور ذہنی اور نفسانی ہیں اور قرآن کا فیصلہ ہے کہ ومن لم یحکم بما انزل ا
هم الکافرون ومن لم یحکم بما انزل الله فا ولئك هم الظالمون ومن لم یحکم
انزل الله فا ولئك هم الفاسقون

جو اللہ کے نازل شدہ احکام کے علاوہ کسی اور قانون سے فیصلہ کریں وہ لوگ کافر،
ہیں، فاسق ہیں۔ یہ جواب تعبدی جواب ہے یعنی جب ہم ان کے بندے ہیں تو قانون بھی
کا ہونا چاہیے۔ خواہ ان کا قانون ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ دنیا میں ہم سب دیکھتے ہیں ک
ہو جانے پر ہر شخص اس کی پابندی کو ضروری سمجھتا ہے خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس کی وجہ
سزائے نقد ہے۔ جانتے ہیں کہ اگر عمل نہ کریں گے تو مارتے مارتے شل کر دیے جائیں گے۔ یاد رکھ
کی سزا دردناک بھی نقد ہے ـــــ دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ ہمارے ایام زندگی چپکے چپکے خیر
پر کم ہوتے جا رہے ہیں۔

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم ‏ ‏ رفتہ رفتہ چپکے چپکے دم بدم

قانون الٰہی کی عظمت و شوکت اور قانون مخلوق کا بودہ پن

اگر انسان قانون خالق اور قانون مخلوق کا مقابلہ ک
فکر سے کام لے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ہمارے
بنے قانون میں اور اللہ کے قانون میں کیا فرق ہے۔ ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ ج
کا تقابل حق کے ساتھ ہوتا ہے اس وقت باطل کا بطلان اور لچر پن ظاہر ہو جائے گا۔

حد سرقہ

مثال کے طور پر چوری کی سزا کو لے لیجیے۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص چور
اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حکمران دنیا جیل خانے میں ایک مدت، ڈال د

بجتے ہیں لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ جیل خانے میں متعدد چور آپس میں تبادلۂ خیالات کرکے اور بھی استاد ہو جاتے
ہیں۔ چوری کے فن میں کچھ خامی اور کچھ کمی ہوتی ہو تو اس کی تکمیل جیل خانے میں ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھا
جاتا ہے کہ ہر چور جیل خانے سے نکلتے ہی پھر چوری شروع کر دیتا ہے پس قانون کا جو مقصد انسدادِ جرائم
تھا وہ اس سزا سے حاصل نہ ہوا' باطل قانون سے باطل نتیجہ مرتب ہوتا ہے اب حق تعالیٰ کے قانون
کا ثمرہ مشاہدہ کیجیے۔

(۱) جس وقت کہ چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اس وقت خود اس مجرم کے قلب پر آئندہ اس فعل سے
توبہ کرنے کا ایک قوی تقاضا تو مرتب ہوتا ہی ہے' دوسرے دیکھنے والوں کا دل بھی دہل جاتا ہے اگر
کسی کے دل میں کبھی چوری کا وسوسہ و خیال بھی گزرتا ہوگا تو اس سزائے دردناک کو دیکھ کر اس کے دل
سے یہ شیطانی خناس ہمیشہ کے لیے نکل جاتا ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ جب مقطوع الیدین کٹے ہوئے ہاتھ والا انسان کسی محفل میں داخل ہوتا
ہے یا کسی راہ سے گزرتا ہے تو لوگ ہوشیار ہو جاتے ہیں کہ اس نے ایک بار چوری کی ہے اس سے بچنا
چاہیے۔ برعکس جیل خانے کا سزا یافتہ عام انسانوں میں گھل مل جاتا ہے اس سبب سے اس کے ضرر سے
بچنا مشکل ہے ـــــ ہر ملک کا انسان سعودیہ عربیہ میں اس قانون پر عمل کرنے کا اثر اپنی آنکھوں سے دیکھ
رہا ہے کہ کس درجہ وہاں انسدادِ جرائم کے سبب سے امن قائم ہے۔ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی
ارشاد فرماتے تھے کہ پان کا جو حصہ سڑ جاتا ہے اس کو کاٹ دیتے ہیں ورنہ وہ سڑا ہوا حصہ دوسرے
درست حصوں کو بھی سڑا دے۔ پس چوری کی یہ سزا خود اس ملزم کے لیے بھی رحمت ہے اور دوسروں
کے لیے بھی رحمت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم
ہو یا مظلوم۔ حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ظالم کی مدد کس طرح کریں۔ ارشاد فرمایا کہ ظالم کی مدد کا مطلب
یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روک دیا جائے۔

تنقید و تبصرہ

شیطان جاگ اٹھا | عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی۔ صفحات ۱۹۲ کاغذ، کتابت طباعت عمدہ۔
قیمت دو روپیہ بارہ آنے۔ ناشر:۔ پنج بھون پبلیکیشنز حیدرآباد۔ بھو

طنزیہ، مزاحیہ ادب میں دیکھتے دیکھتے جناب تخلص بھوپالی نے جو ترقی مقبولیت عام اور شہرت حاصل
ہے وہ ان کی کامیاب طنز نگاری کی دلیل ہے۔ زیر تبصرہ کتاب سے پہلے ان کی دو کتابیں اور شائع ہو
ہیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور پاندان والی خالہ (حصۂ اول) "پوسٹ مارٹم رپورٹ" تو تبصرہ نگار نہیں پڑ
ہے۔ پاندان والی خالہ کو پڑھا ہے اور زندگی میں اس پر تبصرہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب چھ
چھوٹے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مجموعہ پڑھنے والے کو ایک ایسی تفر
فضا میں پہنچاتا ہے جو صحت مند اور مسرت بخش ہے —— مرغی کے پر۔ صحت مند تنقید۔ سخاوت
دان پن تک —— نئے شوہروں کو ٹیکنیکل مشورے۔ درخواست اور انٹرویو۔ بلاشبہ قانون اندھا
ہے۔ تبصرہ نگار کو خاص طور پر پسند آئے۔ "اپنی یادیں" کے عنوان سے تخلص صاحب نے جو کچھ لکھا
اس میں قبر کی منظر کشی تبصرہ نگار کو پسند نہ آئی۔ قبر اور آخرت کو مزاح کا موضوع بنانا تخلص صاحب جیسے صحیح
مسلمان کے لیے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس سے قبر اور قیامت کی ہولناکی پر ضرب پڑتی ہے۔ ان دو
کے وہی مناظر پیش کرنے چاہئیں جو قرآن و حدیث میں دکھائے گئے ہیں۔ کتاب بحیثیت مجموعی دلچسپ
قابل مطالعہ ہے۔ (ع۔ ق)

مسلمانوں کی ایجادیں | از محمد حنیف اللہ پھلواری۔ صفحات ۸۰۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ
دفتر یونٹی و انصاف ۱۷/۸ لیاقت بازار کراچی۔

جناب محمد حنیف اللہ پھلواروی کی دو ایک کتابوں پر پہلے بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ اب ان کے لڑکے محمد سمیع اللہ
[کر]اچی میں مسلم اکاڈمی قائم کی ہے اور اپنے والد کی تصنیفات وہاں سے شائع کر رہے ہیں۔ یہ پمفلٹ
اللہ صاحب کی ایک مبسوط کتاب "اسلامی کارنامے" کا ایک جزو ہے۔ اس پمفلٹ میں مستند حوالوں سے ان
[ایجا]دات کا تعارف کیا گیا ہے جن کا سہرا مسلمان موجدوں کے سر ہے۔

آج جس طرح ایشیا کے باشندے یورپ کی ایجادات پر مبہوت ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ خود ان
[ا]یجادات پر یورپ کے باشندے مبہوت ہوتے تھے اور اس کا اعتراف یورپ کے بعض منصف
[مزاج] مصنفین نے کیا ہے۔ اس پمفلٹ میں جرمن مستشرق جان کرامر کا یہ اعتراف درج ہے۔

"اس وقت یورپ ایشیا کی ایجادوں اور صنعتوں کو مبہوت ہو کر دیکھتا تھا۔"

اور خاص طور پر مسلمانوں کی نسبت سے فرانس کے مشہور مورخ موسیو سیدیو نے لکھا ہے۔

"عربوں کے بے شمار نتائج افکار اور ان کی نفیس نئی نئی ایجادیں اس بات کی شاہد
ہیں کہ وہ سب باتوں میں اہل یورپ کے استاد ہیں۔"

یہ مختصر پمفلٹ قابل مطالعہ اور اس لائق ہے کہ اپنے پاس محفوظ رکھا جائے۔ (ر ع ق)

[تعلی]مات غزالی | مرتبہ مولانا محمد حنیف صاحب ندوی۔ صفحات ۵۶۰۔ مجلد گرد پوش کے ساتھ۔
قیمت :- دس روپیہ۔ ناشر:- ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

ادارہ ثقافت اسلامیہ نے یہ ایک اچھی اور مفید کتاب شائع کی ہے۔ امام غزالی کی احیاء علوم الدین
[کی] ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے اور علماء و صوفیہ دونوں ہی حلقوں میں بہت مقبول ہے ـــ
[زیر ت]بصرہ کتاب اسی کے چند ابواب کی اردو میں تلخیص ہے۔ جس میں امام غزالی کی اس خصوصیت کو
[نمای]اں کیا گیا ہے کہ کس طرح انھوں نے فقہی مسائل اور ان کی تفصیلات کو تصوف کے رنگ میں بیان کیا ہے
ذیل ابواب کی تلخیص کی گئی ہے۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، ذکر و دعا۔ تہذیب و آداب۔
[آداب] و معاشرت۔ محبت و اخوت۔ معاملات۔ فہم قرآن۔

ان بڑے عنوانات کے تحت سات صفحات میں مضامین کی مفصل فہرست لکھی گئی ہے۔ فاضل
[مرتب] نے ایک سو تین صفحات میں ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ اس میں مشاہیر صوفیہ کے مختصر حالات

کوائف ہیں۔ صوفیہ کی مشہور اصطلاحات کی تشریح و تفصیل ہے اور اسلام میں تصوف کے صحیح مقام و موقف کی تعیین کی گئی ہے۔

علم تصوف یا فن تصوف کا جو ذخیرہ آج موجود ہے اس کے کچھ اجزاء تو وہ ہیں جو قرآن مجید اور صحیح احادیث میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ذکر و فکر، انابت و خشوع، خشیت و تقویٰ، تعلق باللہ اور تزکیۂ نفس یہ ایسی چیزیں ہیں جو سب کے نزدیک مسلم ہیں۔ کوئی مسلمان نہ ان کا منکر ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ بحث دراصل ان نظریات اور ان اعمال میں ہوتی ہے جو نہ قرآن و حدیث میں ملتے ہیں اور نہ عہد رسالت و عہد صحابہ کی تاریخ میں۔ تصوف کا یہی حصہ صدیوں سے مختلف فیہ ہے۔ مثال کے طور پر وحدۃ الوجود کا نظریہ یا یہ بات کہ مومن کو اپنی تگ و دو اور توجہات کا مرکزی نقطہ اللہ کی ذات کو قرار دینا چاہیے اور مثال کے طور پر ذکر و مراقبہ کی وہ ہیئتیں اور مخصوص اعمال جو خانقاہوں میں مروج ہیں۔ فاضل مرتب نے مقدمے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی ذہانت اور مطالعے کا غماز تو ضرور ہے لیکن تسکین بخش نہیں ہے۔ انھوں نے سب کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ کوئی خوش نہ ہو۔ ان کی کہی ہوئی باتوں پر اظہار خیال مقصود نہیں۔ صرف ایک بات کی طرف یہاں اشارہ کرنا ہے۔ انھوں نے درجات کمال کے حصول کے لیے توازن و اعتدال کے خیال کو رد کر کے تخصیص کا نظریہ پیش کیا ہے لیکن یہ بات چونکہ اسلامی تعلیم کے خلاف تھی اس لیے بحث کے اخیر میں انھوں نے خود ایک سوال قائم کر کے اس کا جواب دیا ہے لکھتے ہیں :-

> کیا توازن و اعتدال کے ساتھ غایات اخلاق یعنی درجات کمال کو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اس سلسلے کی آخری کڑی اور اہم سوال ہے۔ جواب یہ ہے کہ کیا جاسکتا ہے لیکن یہ صرف انبیاء کا حصہ ہے، عام انسانوں کا نہیں۔ ص۴۱

اس جواب کے بعد ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کی زندگی کو درجات کمال حاصل کرنے کے لیے بطور اسوہ کیوں پیش کیا ہے؟ وَلَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ آپ کی زندگی کو بطور اسوہ پیش کرنے کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہے کہ وہ توازن و اعتدال کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ اس مسئلے پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن تبصرے میں اس کی گنجائش نہیں۔

مرتب نے جو تلخیص کی ہے اسے بالاستیعاب پڑھنے کا موقع نہ مل سکا اور نہ اصل کتاب سے

ملاکر دیکھنے کی نوبت آئی، جیسا کہ لکھا گیا۔ کتاب بحیثیت مجموعی مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ صفحات ۴۲۴۔ مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت چھ روپیہ۔ ناشر:۔ مکتبۂ اسلام، ۲۷ گوئن روڈ لکھنؤ

یہ قابل قدر اور لائق مطالعہ کتاب پندرہ ابواب میں منقسم ہے اور حضرت رائے پوری کے سوانح حیات پر ایک مفصل اور سیر حاصل کتاب ہے۔ تبصرہ نگار نے بزرگوں کے خاندان میں آنکھ کھولی ہے اور بدو شعور سے بزرگوں کے سیر و سوانح پڑھنے کا مشتاق ہے۔ اس کتاب کو بھی اس نے بڑے شوق سے پڑھا ہے اور اس سے مستفید و متاثر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت رائے پوری کو جزائے خیر دے کہ ان کی زندگی نے بہت سی زندگیوں کو سنوارا ہے۔ مولانا رائے پوری کے بہت سے ملفوظات اس کتاب میں نقل کیے گئے ہیں۔ یہاں صرف دو ملفوظ نقل کیے جاتے ہیں۔ "مقصود کار" کے عنوان کے تحت مرتب کتاب نے لکھا ہے۔ فرماتے تھے کہ:۔

> اصل کیفیت یقین کا پیدا ہو جانا ہے۔ جب کبھی کوئی سالک اپنی کیفیات کا ذکر کرتا تو یہی فرماتے کہ اصل کیفیت یقین ہے۔ ایک دفعہ فرمایا۔ کمرے میں اندھیرے میں شیر ہے نظر نہیں آتا۔ ایک آدمی وہاں ہے وہ بے خبری میں بے فکر بیٹھا ہے، اچانک روشنی ہوئی، شیر اس کو نظر آگیا۔ اس پر خوف طاری ہو جائے گا۔ اسی طرح یقین نصیب ہونے کے بعد خوف خدا آجاتا ہے اور یہ خوف خدا بنیاد ہے تمام اعمال حسنہ کے کرنے کی اور تمام اعمال بد سے بچنے کی حضرت رحمۃ اللہ علیہ اجرائے لطائف، سلطان الاذکار، انوار حتیٰ کہ فنائیت کی کیفیت کو بھی کچھ اتنا بڑا مرتبہ نہیں دیتے تھے۔ حضرت کے نزدیک استدلالی یقین کا وجدانی اور ذوقی یقین میں تبدیل ہو جانا اصل چیز تھی اس کا نتیجہ پھر یہ ہو جاتا ہے کہ ساری دنیا بھی خدا کی ہستی کا انکار کرے تو یہ وجدانی یقین والا شخص کبھی بھی انکار نہیں کرتا۔
>
> حضرت راستے کی کیفیات مثلاً وجد، انوار، اجرائے لطائف، سلطان الاذکار حتیٰ کہ فنائیت کو بھی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے حضرت کے یہاں کیفیت قابل حصول صرف ایک

تھی یقین، کامل یقین اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی کیفیات مثلاً خوف خشیت، محبت الہی، تعلق مع اللہ کا دوام، کامل اخلاص، اتباعِ شریعت، اخلاق عالیہ مثلاً توکل، رضاو تسلیم، صبر وشکر وغیرہ ۔ لوگ بڑے بڑے اونچے حالات حضرت کو سناتے تھے لیکن حضرت یہی فرماتے تھے کہ اصل مقصود یقین کا پیدا ہوجانا ہے ۔ حضرت کے یہاں تصوف کا مقصود صرف یہی تھا کہ استدلالی یقین وجدانی، ذوقی اور کشفی یقین میں تبدیل ہوجائے ۔ اللہ تعالے کی محبت نصیب ہو، تعلق مع اللہ کو دوام واستقلال حاصل ہو۔ کسی نے کسی لطیفہ کے جاری نہ ہونے کی شکایت کی ۔ آپ نے اس سے یقین کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا کہ وہ تو ہے ۔ فرمایا کہ پھر لطیفے کے پیچھے نہ پڑو، مقصود حاصل ہے " ص ۲۹۶

اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، سب سے اتفاق ضروری نہیں ہے ۔ اصل بات تو صرف اتنی ہے کہ جس چیز پر دل مطمئن ہو اس سے استفادہ کیا جائے ۔ (ع ۔ ق)

شرک عظیم ترین گناہ

مرتبہ مولانا سید حامد علی صاحب ۔ صفحات ۴۰ ۔ کاغذ کتابت طباعت بہتر ۔ قیمت مع محصول ڈاک ۳۵ نئے پیسے ۔ ناشر:- ادارۂ شہادت حق (وقف) خیر نگر گیٹ ۔ میرٹھ یوپی ۔

یہ پمفلٹ ادارۂ شہادت حق کی آٹھویں پیش کش ہے ۔ مولانا حامد علی صاحب نے ردالحاد کے سلسلے میں جو چند مختصر کتابیں مرتب فرمائی ہیں ان پر تبصرہ زندگی میں شائع ہوچکا ہے ۔ اب ردشرک کے سلسلے کا یہ پہلا پمفلٹ شائع ہوا ہے ۔ مولانا پیش لفظ میں خود لکھتے ہیں:۔

ردّ الحاد کا سلسلہ خاصا مقبول ہوا، اب ردشرک کے سلسلے کا آغاز کیا جارہا ہے ۔ اردو میں اس موضوع پر بہت کچھ لٹریچر موجود ہے، مگر پیش نظر سلسلہ جداگانہ نوعیت کا حامل اور وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا ۔ زیر نظر کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور امید ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لیے مفید ثابت ہوگی انشاءاللہ

مولانا نے اس کتاب کو ۱۴ ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے اور ایک منطقی ترتیب کے ساتھ یہ بات ثابت کی ہے کہ شرک خدا پرستی کی ضد ہے ۔ کتاب مندرجہ ذیل جملوں پر ختم ہوئی ہے

"حقیقت یہ ہے کہ شرک خدا پرستی کی عین ضد ہے وہ مذہب کے پردے میں خدا سے بغاوت ہے۔ شرک الحاد ہے بلکہ الحاد سے بھی بدتر۔"

اگر نفاق، کفر سے بدتر ہے تو یہ ماننے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ شرک الحاد سے بھی بدتر ہے۔ ملحد کا باغی ہے اور مشرک بھی۔ ملحد کی بغاوت کھُلی ہوئی ہے اور مشرک نے اپنے جسم پر خدا کے اقرار کا لبا اوڑھ رکھا ہے۔ ع۔ق

صفحہ ۵۵ کا بقیہ

وہی تناسب و اعتدال ہونے کے باوجود جو اسلام پیش کرتا ہے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ تمام تر اسلام ہے اس میں شک نہیں کہ اقبال نے اپنے دور میں اسلام کی اتنی ہی صحیح اور مکمل ترجمانی کی جتنی کسی غیر نبی انسان سے ممکن ہے لیکن اس کی کہی ہوئی ہر بات کو عین اسلام قرار دینا خود اس پر بھی ظلم ہے اور اسلام پر بھی۔ اب انسانی فکر آگے بڑھ کر اسلام کے اصلی سرچشمہ تک پہنچ رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب اقبال کا دیا ہوا فکر پیچھے نظر آنے لگے گا۔ اس کے یہاں بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جنھیں اسلام کا ترجمان ثابت کرنے کے لیے کافی کھینچ تان کرنا پڑتی ہے۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اقبال کے کلام کی تشریح اور اس کے پیغام کی وضاحت میں تنقیدی پہلو بھی آئے اور اصل کسوٹی کو ہاتھ میں لے کر صحیح اور غلط میں تمیز کرایا جائے۔ اصل کسوٹی سے میری مراد مولویانہ و فقہی نقطہ نظر یا مکتبی طرز فکر نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کمندیں اقبال تک نہیں پہنچتیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس کی ہر چیز کو قرآن کی —— تفسیر قرآن کی نہیں قرآن کی —— عینک سے دیکھا جائے اور اس کو اسی مقام پر رکھا جائے جس کا وہ واقعی مستحق ہے "جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے"۔ البتہ قرآن کی عینک سے دیکھنے میں بھی شاعری کی رعایت ضرور دینی ہوگی۔ ہر شعر قرآن کی کسی آیت کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ روح قرآنی کا مظہر ہو سکتا ہے۔

بقیہ اشارات:۔ پہنچانے میں بھی اسے تامل نہ ہو۔

بھارت میں ایسی جماعتیں جن کا سارا کاروبار مسلمانوں کی مخالفت پر چل رہا ہے نہ صرف یہ کہ موجود ہیں بلکہ خاصی طاقت ور ہیں۔ آخر میں ہم ان سے بھی چند باتیں کہنی چاہتے ہیں۔

(۱) آپ لوگ جس مذہب کو ماننے بلکہ اس کو ترقی دینے اور پھیلانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس

...لیے بے قصوروں کو قتل کرنا، بے آبرو کرنا اور ان کو لوٹنا پاپ ہی ہوگا پُن نہ ہوگا اور شاید یہ بات آپ کے مذہب میں جائز نہ ہوگی کہ قصور کوئی کرے اور بدلہ کسی اور سے لیا جائے جب یہ دونوں ...یں آپ کے مذہب میں بھی ناجائز ہیں تو پھر بھارت کے بے قصور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کا یقیناً ظلم ہی ہے اور یہ بات آپ کے مذہب میں بھی موجود ہے کہ ظالموں کے لیے ظلم کا پھل اچھا ...ہوتا، مظلوموں کی چیخ پکار قہر الٰہی بن کر ظالموں پر ٹوٹ پڑتی ہے۔

(۲) مسلمانوں کے وجود اور ان کی ترقی کو آپ اپنی قوم کے لیے شاید نقصان دہ سمجھتے ہیں، حالانکہ ...ت یہ نہیں ہے۔ مسلمانوں نے پہلے بھی اس ملک کو بہت کچھ دیا ہے اور آج بھی دے سکتے ہیں، ان ...مکون کے ساتھ کام کرنے کا موقع دے کر دیکھیے کہ یہ ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں یا مفید

(۳) یہ مسلمان جس دین کو ماننے والے ہیں وہ ایک عالمگیر دین ہے اور اس کے اصول، اس کی ...ات اور اس کی ہدایتیں، ہوا اور روشنی کی طرح عام ہیں۔ ان سے ہر قوم اور ہر ملک فائدہ حاصل ...سکتا ہے۔ اس دین کے ساتھ آپ کا موجودہ رویہ صحیح علم اور سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ غصے اور انتقام کی آگ سے اپنے ذہن کو ٹھنڈا کر کے غور کیجیے۔

(۴) یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ جب تک خدا فیصلہ نہ کر دے بھارت سے مسلمانوں کے ...کو ختم کرنا کسی طاقت کے بس میں نہیں ہے۔ اسپین اور سسلی کی تاریخ سے دھوکا نہ کھائیے۔ نیز اس ...پر بھی نگاہ رکھیے کہ باشندگان اسپین نے مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکال کر اس کو فائدہ پہنچایا یا نقصان؟ مسلمان وہاں تھے تو دنیا میں اسپین کا مقام کیا تھا اور آج کیا ہے؟

(۵) مسلمانوں کو شودر بنانے کی کوشش یا ان کو اپنے اندر ضم کرنے کی سعی لاحاصل بھی ہے اور ...ہی۔ آپ کی یہ کوشش بھارت کو آگے نہیں بڑھائے گی، پیچھے دھکیل دے گی۔ اس کوشش میں اپنا ...ت اور انرجی ضائع نہ کیجیے۔

(۶) آپ اگر فرقہ پرستی کے تنگ دائرے سے نکل آئیں اور اپنی روش بدل دیں تو بہت جلد ملک میں ...و امان کی پائیدار فضا تیار ہو سکتی ہے اور ملک تیزی کے ساتھ ترقی کر سکتا ہے۔

(۷) آپ کی تمام مخالفتوں اور زیادتیوں کے باوجود مسلمان آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں ...غصے میں جھٹک نہ دیجیے، کیونکہ آپ کے اس طرز عمل سے ملک کی تعمیر و ترقی کو نقصان پہنچے گا۔

فہرست مندرجات ماہنامہ زندگی
از جنوری ۱۹۶۴ء تا جون ۱۹۶۴ء

اشارات

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	سید احمد قادری	"منشور حقوق انسانی" پر اظہار خیال	۳۲	۱	جنوری ۶۴ء
		رمضان المبارک	"	۲	فروری ۶۴ء
		مغربی بنگال اور مشرقی پاکستان کے فسادات پر اظہار خیال	"	۳	مارچ ۶۴ء
		اکبر اور عالمگیر کے مذہب و اخلاق کی مجمل تاریخ	"	۴	اپریل ۶۴ء
		انسداد فسادات کی تدبیریں (۱)	"	۵	مئی ۶۴ء
		(۲) ختم	"	۶	جون ۶۴ء

ارشادات رسول

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	سید احمد قادری	اسلامی تعلیمات کے سات نکات	۳۲	۲	فروری ۶۴ء

مقالات

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	جناب انعام الرحمٰن صاحب شاہجہانپوری	اسباب فساد کا تجزیہ اور ازالے کی تدابیر	۳۲	۳	مارچ ۶۴ء
		اقبال کی شاعری پر کچھ خیالات	"	۶	جون ۶۴ء
۲	جناب اسحاق النبی صاحب علوی	سن عیسوی و ہجری کی تطبیق کے اصول	"	۶	جون ۶۴ء
۳	مولانا سید جلال الدین عمری	ختم نبوت	۳۲	۱	جنوری ۶۴ء
	"	پیغمبروں کی دعوت	"	۲	فروری ۶۴ء
	"	انکار خدا کی حقیقت	"	۳	مارچ ۶۴ء
	"	کیا خدا کو ماننے والے تنگ نظر ہوتے ہیں؟	"	۵	مئی ۶۴ء
	"	مذہب کی تاریخ کا غلط مطالعہ	"	۶	جون ۶۴ء
۴	مولانا سلیمان فرخ آبادی	خسران مبین (۱)	۳۲	۳	مارچ ۶۴ء
	"	" (۲) ختم	"	۴	اپریل ۶۴ء

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۵	جناب عبد الحق انصاری ایم اے	اسلامی اخلاق کی دینی بنیادیں (۲)	۳۲	۱	جنوری ۶۴ء
		" (۳) ختم	"	۲	فروری ۶۴ء
۶	مولانا عبد العلیم اصلاحی	اقامت دین	۳۲	۱	جنوری ۶۴ء
۷	مولانا حبیب اللہ ندوی	خاصان خدا کی نماز (۱)	۳۲	۴	اپریل ۶۴ء
		(۲) ختم	"	۵	مئی ۶۴ء
۸	پروفیسر محمود بریلوی	استشراق اور اسلام	۳۲	۵	مئی ۶۴ء
۹	مولانا محمد یوسف اصلاحی	قرآنی تعلیمات (۵	۳۲	۱	جنوری ۶۴ء
	"	روزہ	"	۲	فروری ۶۴ء
	"	حج (۱)	"	۳	مارچ ۶۴ء
	"	" (۲) ختم	"	۴	اپریل ۶۴ء
	"	قربانی	"	۵	مئی ۶۴ء
	"	بیوی کے فرائض	"	۶	جون ۶۴ء

تراجم و اقتباسات

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	ش، ن عثمانی	کیا مذہب گئے گزرے زمانے کی بات ہے؟ (محمد اسد کے انگریزی مقالے کا ترجمہ)	۳۲	۲	فروری ۶۴ء
		نیند کے باب میں سائنس کیا کہتی ہے (ایڈورڈ ایلشپول کے مقالے کا ترجمہ)	۳۱	۵	مئی ۱۹۶۴ء
۲	پروفیسر عبد المغنی ایم اے	اتحاد عالم اور زاویۂ تاریخ میں تبدیلی (آرنلڈ ٹائن کے مقالے کا ترجمہ)	۳۲	۵	مئی ۶۴ء
۳	مولانا محمد یوسف اصلاحی	دعوت و تبلیغ کے شرائط و آداب (حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے مواعظ حسنہ کی روشنی میں)	۳۲	۵	مئی ۶۴ء

رسائل و مسائل

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	سید احمد قادری	عقیقہ اور اس سے متعلق چند مسائل	۳۲	۱	جنوری ۶۴ء
	"	وزن صاع کی تحقیق	"	۳	مارچ ۶۴ء
	"	عشری زمین اور سونے کا نصاب	"	۵	مئی ۶۴ء

رودادیں

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	قیم جماعت اسلامی	روداد اجلاس مجلس نمائندگان	۳۲	۵	مئی ۶۴ء
		روداد اجتماع امرائے حلقہ جات	"	"	

زندگی

جلد :- ۳۳
شمارہ :- ۱

صفر ۸۴ھ
جولائی ۶۴ء

مدیر :- سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسالِ زر کا پتہ :- منیجر زندگی، رام پور۔ یوپی
● زر سالانہ :- پانچ روپیہ۔ شش ماہی :- تین روپیہ — فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے۔
● ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱۰/۱۱ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

مالک :- جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر :- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر :- احمد حسن۔ مطبع :- دہلی پرنٹنگ ورکس محلہ بنگلہ آنا دہلی
مقام اشاعت :- دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ "اقامت دین" کے نصب العین پر ایک کتابچہ تیار کیا جائے اس لیے کہ بہت سے افراد ضخیم کتابوں اور پھیلے ہوئے لٹریچر کے مطالعہ کے لیے وقت دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ تھوڑے سے وقت میں مختصر پمفلٹ پڑھ سکتے ہیں۔

اگرچہ اس موضوع پر مختصر پمفلٹ کافی نہیں ہے لیکن قلت وقت کی شکایت کرنے والے افراد کی ضرورت اور ان کے عذر کو نظر انداز کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔ ایک مختصر پمفلٹ اگر ان میں اس نصب العین سے دلچسپی پیدا کر دے تو وہ آپ سے آپ اس موضوع کی تفصیلات جاننے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز سے دلچسپی لینے لگتا ہے تو پھر وقت کی کمی کا علاج خود کر لیتا ہے۔

اس ضرورت کے پیش نظر جب راقم الحروف نے اس موضوع پر لکھنا چاہا تو یہ بات شدت سے محسوس ہوئی کہ فریضۂ اقامت دین پر جو دلائل کتاب وسنت اور جماعت کے لٹریچر میں پھیلے ہوئے ہیں، انہیں یکجا سمیٹ لینے والی ایک کتاب ہمارے پاس ہونی چاہیے۔ اس احساس کے نتیجے میں فی الحال میں نے مختصر پمفلٹ کی ضرورت کو نظر انداز کر دیا ہے اور تھوڑی تفصیل سے دلائل پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب یہ کام مکمل ہو جائے گا تو اسے سامنے رکھ کر کوئی مختصر پمفلٹ تیار کرنے میں دیر نہ لگے گی۔

دنیا میں زندگی بسر کرنے کے بہت سے طریقے اور بہت سے نظام رائج ہیں۔ آپ ان طریقوں اور نظاموں کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ان میں کے ہر طریقۂ حیات اور ہر نظام زندگی کا سلسلہ آگے بڑھ کر کسی

کسی ایک فرد پر ختم ہوتا ہے۔ کسی معاشرے کے صرف ایک فرد نے اس کی ابتدائی، اور اسے پھیلا
میں اپنی پوری زندگی لگا دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک فرد کے نظریۂ زندگی کے سانچے میں ہزاروں لاکھوں
کی زندگیاں ڈھل گئیں اور پورا ایک نظام اٹھ کھڑا ہوا۔ تاریخ کے مطالعے سے دو باتیں اول نظر
ہو جاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایک فرد ہزاروں افراد کو متاثر کر سکتا ہے اور اس کی تنہا ذات میں ایک پورا
حیات پوشیدہ ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ غور و فکر کے بعد
نظریۂ حیات کو وہ انسانیت کے لیے مفید سمجھتا ہے اس کو پھیلانا چاہتا ہے۔ اپنی راہ کی ہر رکاوٹ
کرنے کے لیے جان لڑا دیتا ہے اور اپنے نظریۂ زندگی کو کامیاب کرنے کے لیے کسی قربانی سے
ہچکچاتا۔ اس کی یہ خواہش و کوشش تقاضائے عقل کے عین مطابق ہے۔ یہ بحث بالکل الگ ہے کہ
نے جس نقطۂ نظر کو انسانیت کے لیے مفید سمجھا وہ فی الواقع مفید تھا یا مضر، کامل تھا یا ناقص۔

زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو درست کرنے کا ایک نظام
ہے جس کو ہم اسلام کہتے ہیں۔ اب اگر کوئی فرد یا کوئی جماعت اس نظام کے مفید انسانیت ہونے پر
دعویٰ کرتی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اسے پھیلانے اور کامیاب کرنے کے لیے جد و جہد نہ کرے
اس نظام کو دوسرے نظاموں پر پانچ واضح امتیازات حاصل ہیں۔

(۱) اس نظام کا خالق انسان نہیں بلکہ اللہ ہے، اسی نے اس کو انسانیت کی فلاح کے لیے نازل

(۲) یہ دنیا و آخرت دونوں ہی کی فلاح و کامیابی کا ضامن ہے۔

(۳) تاریخ کا طویل تجربہ اور عقل کا مدلل فیصلہ بتاتا ہے کہ یہ نظام انسانیت کے لیے ہمیشہ مفید
ہوا ہے اور اس میں نقصان کا کوئی شائبہ نہیں۔

(۴) یہ انسان کے تمام داعیات، جذبات اور ضروریات کا تسلی بخش جواب ہے۔

(۵) یہ نظام اللہ نے جن افراد پر نازل کیا انھوں نے اسے پھیلانے اور برپا کرنے کی کوشش محض
جذباتی تقاضے کی بنا پر نہیں بلکہ اس کام پر اللہ کی طرف سے مامور ہو کر کی ہے۔ تاریخ کے
افراد انبیائے کرام تھے جن کا سلسلہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے۔

[ا]قامت دین کا مفہوم

"اقامت دین" میں "دین" سے مراد وہ دینِ حق ہے جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء کے ذریعہ [مخت]لف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت [کے ل]یے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل فرمایا اور جو اب دنیا میں ایک ہی [مست]ند، محفوظ اور عنداللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام اسلام ہے۔

یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اس کی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ [عق]ائد عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور ریاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ [بھ]ی ایسا نہیں ہے جو اس کے دائرے سے خارج ہو۔

یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا ضامن ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل [کے ل]یے بہترین نظامِ زندگی بھی ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی صالح اور ترقی پذیر تعمیر صرف اسی کے [نظ]ام سے ممکن ہے۔

اس دین کی "اقامت" کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی [کی] جائے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر کی جائے اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اسے [ا]س طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقا، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے [م]طابق ہو۔

لفظ اقامت کے چند استعمالات

اقامت کے لغوی معنی کھڑا کرنے اور سیدھا کرنے کے ہیں اسی معنی کی مناسبت سے اس لفظ کے متعدد [اص]طلاحی و شرعی معنی بھی کلام عرب اور قرآن و حدیث میں مستعمل ہیں۔ مثال کے طور پر کسی بیٹھے ہوئے انسان کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جائے گا تو اس کے معنی وہی ہوں گے جو اصل لغت میں اس کے معنی ہیں یعنی کھڑا کرنا [ج]یسے کہا جائے کہ کَانَ زَیْدٌ قَاعِدًا فَاَقَامَہٗ خَالِدٌ (زید بیٹھا ہوا تھا تو خالد نے اس کو کھڑا کر دیا) کسی [ٹیڑ]ھی لکڑی کے لیے استعمال ہوگا تو اس کے معنی سیدھا کرنے کے ہوں گے۔ مثلاً اَقَامَ الْعُوْدَ (اس نے لکڑی سیدھی کی)

معنوی چیزوں کے لیے جب یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے متعدد اصطلاحی و شرعی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز کے لیے یہ لفظ بولا جائے گا تو اقامتِ صلوٰۃ کے معنی اس کو پورے حدود و شروط کے ساتھ

ادا کرنے کے ہوں گے۔ اقیموا الصلوٰۃ۔ نماز قائم کرو یعنی اس کو ان حدود و شروط کے ساتھ ادا کرو جن کی تعلیم شریعت نے دی ہے۔

یہ لفظ کسی حد شرعی کے لیے مستعمل ہوگا تو اس کے معنی نافذ کرنے کے ہوں گے۔ مثلاً اقام حدّ السرقۃ (اس نے چوری کی حد نافذ کی) کسی آئین و قانون کے لیے استعمال ہوگا۔ تو اس کے معنی اس کو نافذ و رائج کرنے کے ہوں گے۔ مثلاً اقام القوانین الاسلامیۃ (اس نے اسلامی قوانین نافذ و رائج کیے) ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے :-

حَدٌّ يُقَامُ فِي الْأَرْضِ خَيْرٌ	کوئی ایک حد بھی جو زمین میں نافذ کی جاتی
لِأَهْلِهَا مِنْ أَنْ يُمْطَرُوا أَرْبَعِينَ	ہے وہ اہلِ زمین کے لیے چالیس دن کی بارش
صَبَاحًا۔	سے زیادہ بہتر ہے۔

اس حدیث میں اقامت کے معنی نافذ کرنے کے ہیں۔ کسی حد شرعی کو نافذ کرنے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ اس پر ٹھیک اس طرح عمل کیا جائے جس کی تعلیم دی گئی ہے۔ مثلاً چوری کی حد نافذ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ قاضی کے فیصلے کے بعد حکومت اسلامی کا کوئی کارندہ تعلیم نبوی کے مطابق چور کا ہاتھ کاٹ دے۔

دین اسلام چونکہ انفرادی و اجتماعی احکام کا مجموعہ ہے اس لیے کسی حکم مثلاً نماز کے لحاظ سے اس کے معنی اس کو اچھی طرح ادا کرنے کے ہوں گے اور کسی دوسرے حکم مثلاً حد زنا کے اعتبار سے اس کے معنی نافذ کرنے کے ہوں گے۔ یہ بات بھی ناقابلِ انکار ہے کہ دین اسلام ایک مکمل قانون حیات اور آئین زندگی ہے اس لیے اقامت دین کے مفہوم میں دین کو نافذ اور رائج کرنا بھی داخل ہے۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ اقامت دین کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کے قانونِ حیات اور آئین زندگی کو دنیا میں رائج اور نافذ کیا جائے تو اس کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔

مختلف تعبیرات کا مسئلہ

یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان میں کسی ایک حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے متعدد اور مختلف تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ فی الواقع کسی زبان کی بلاغت کا مسئلہ ہے۔ وہ زبان بلیغ اور ترقی یافتہ نہیں سمجھی جا سکتی جس میں کسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے بس ایک ہی طرز تعبیر اور یکساں قسم کے بندھے الفاظ کے سوا کچھ نہ ہو۔ یہ بات بھی اہل علم و اہل زبان کے درمیان معروف ہے کہ متعدد اشیاء کے

کسی مجموعے کو ظاہر کرنے یا اس کی نشان دہی کے لیے کبھی صرف اس کے کسی نمایاں اور اہم جزو کا نام لیا جاتا ہے لیکن اس سے مقصود پورا مجموعہ ہوتا ہے۔ عربی زبان، دنیا کی بلیغ ترین زبان ہے اور اس کے بہترین نمونے ہمیں قرآن و حدیث میں ملتے ہیں۔ جو لوگ زبان کی بلاغت اور اہلِ علم کے درمیان اس معروف حقیقت سے ناواقف ہیں وہ سخت دھوکا کھاتے ہیں۔ دیکھیے، لوگوں کے درمیان یہ حدیث مشہور ہے۔ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ (جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا۔) اب اگر اس سے کوئی شخص یہ نتیجہ اخذ کرے کہ صرف زبان سے یہ کلمہ کہہ لینا کافی ہے دل میں یقین ہو یا نہ ہو تو ایسا شخص قرآن و حدیث سے نرا جاہل سمجھا جائے گا یا اس حدیث سے کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے کہ رسالت کا اقرار ضروری نہیں ہے صرف توحید کا اقرار کافی ہے تو اسے بھی حدیث کی زبان سے ناواقف سمجھا جائے گا۔

"دین" احکام و قوانین کا مجموعہ اور ایک جامع اصطلاح ہے اس کو ظاہر کرنے کے لیے متعدد و مختلف تعبیریں اور اسلوب بیان اختیار کیے گئے ہیں کہیں شہادت، شاہد اور شہداء علی الناس کے الفاظ سے اس کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ کہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے الفاظ بول کر اس مجموعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہیں بندگیٔ رب اور اطاعت رسول کا حکم دے کر پورے دین کی پیروی کا مطالبہ کیا گیا ہے کہیں اقامت صلوٰۃ و ایتاء زکوٰۃ سے اس کی تعبیر کی گئی ہے اور متعدد مقامات پر تو صرف اقرار ربوبیت کو پورے دین کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ قرآن و حدیث کی ان تعبیرات اور استعمالات سے ناواقفیت کی بنا پر لوگ نہ صرف قرآن فہمی کی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ ان کا تصور دین ہی ناقص ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر صرف آخری طرز تعبیر کو واضح کرنے کے لیے ایک آیت پیش کرتا ہوں:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ	جن لوگوں نے کہا، ہمارا رب اللہ ہے
ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ	پھر وہ اس پر جمے رہے تو ان پر فرشتے یہ پیغام
اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا	لے کر نازل ہوں گے کہ خوف نہ کرو، غمگین نہ ہو
بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ	اور اس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ
(حٰمٓ السجدۃ ۴)	کیا گیا تھا۔

اس آیت میں اقرار ربوبیت اور استقامت، پورے دین کو قبول کرنے اور زندگی کے آخری لمحے تک اس کے احکام پر عمل پیرا رہنے کی ایک تعبیر ہے۔

ایمان باللہ (جو دین کا اولین واہم ترین جزء ہے) کا ذکر پورے مجموعے کی طرف نشان دہی کے لیے کیا گیا ہے۔ اگر اس تعبیر سے کوئی شخص واقف نہ ہو تو وہ سخت دھوکا کھا سکتا ہے۔ ٹھیک یہی اسلوب ایک حدیث میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: آپ مجھے ایک ایسی جامع بات بتا دیجیے کہ آپ کے بعد پھر کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ نے فرمایا:

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ — تم کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر جم جاؤ

اس حدیث میں بھی ایمان باللہ پورے دین کو ظاہر کرنے کی ایک تعبیر ہے۔ تعلیم یہ دی گئی ہے کہ دین کی مکمل پیروی اور اس پر استقامت کو اپنا مقصدِ حیات بنالو۔ یہی وہ چیز ہے جس کے بعد اپنی فلاح و نجات کے لیے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

قرآن و حدیث میں جس طرح دینِ حق کو مختلف انداز اور متعدد تعبیروں سے ظاہر کیا گیا ہے اسی طرح غلبۂ حق کی حقیقت واضح کرنے کے لیے بھی متعدد تعبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ دین کا اظہار، کلمۃ اللہ کا اعلاء، باطل پرستوں کی ہزیمت، حق پرستوں کی فتح، کافروں کی ہلاکت، مومنوں کی نجات۔ یہ تمام تعبیرات یہ حقیقت واضح کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو دینِ حق دے کر اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ صرف اس کا پیغام پہنچا دیا جائے بلکہ اس لیے بھیجا تھا کہ وہ دین باطل پر غالب آئے۔

مثالی نمونہ

"اس دین کی اقامت کا مثالی اور بہترین نمونہ وہ ہے جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے قائم فرمایا۔"

اس مثالی نمونے کے لیے خلافتِ راشدہ، خلافت علیٰ منہاج النبوۃ، حکومتِ الٰہیہ اور اسلامی حکومت کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں ــــ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے جو حکومت قائم کی تھی اس میں بغیر کسی تفریق و تقسیم کے پورے دینِ اسلام کی مخلصانہ پیروی کی جاتی تھی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کر دیا گیا تھا کہ فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل ٹھیک ٹھیک اسی دین کے مطابق تھی۔ اس مملکت میں جا کر ہر شخص اپنی کھلی آنکھوں سے یہ دیکھ سکتا تھا کہ اسلامی حکومت اور قرآنی معاشرہ کیسا ہوتا ہے اور "اقامتِ دین" کا مفہوم کیا ہے۔ جس طرح ایک

کھڑے ہوئے شخص کے قد و قامت جسمانی ساخت رنگ روپ اور چہرے مہرے کو پہچاننے کے لیے دیکھنے
والی آنکھیں کافی ہیں اسی طرح اقامت دین کا صحیح مفہوم جاننے کے لیے صدیق و فاروق کی خلافت کا مثالی
کافی ہے جس کی بلند قامتی اور اس کے تمام رنگ روپ تاریخ کے صفحات نے محفوظ کر دیے ہیں۔ یہ مثا
نمونہ صرف نمونہ ہی نہیں ہے بلکہ فریضہ اقامتِ دین کی ایک روشن دلیل بھی ہے۔

انحطاط کا اثر

صدیوں کے انحطاط و زوال کا اثر یہ ہے کہ آج پڑھے لکھے مسلمان بھی عام طور سے امت مسلمہ کے مقصد
وجود، مقصدِ حیات، نصب العین اور جد و جہد کے مرکز و محور سے ناواقف ہو گئے ہیں وہ نہیں جانتے
اس کا مقصدِ وجود اور نصب العین کیا ہے اور کس چیز کو اس کی جد و جہد کا مرکز و محور رہنا چاہیے اس ناواقف
کی وجہ یہ ہے کہ ان کے داعیوں میں دین کا ایک بہت ہی محدود مفہوم اور انبیاء کرام علیہم السلام کے مقصد
بعثت کا ایک مختصر جزو، کل دین بنا کر اتار دیا گیا ہے وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، مجالسِ وعظ و نصیحت او
خوش اخلاقی و نیک چلنی کی ٹھنڈی تبلیغ ہی کو پورا دین سمجھتے ہیں اور اس سے آگے کچھ سوچنے کو تیار نہیں ہو
بلکہ اب ان میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو رہے ہیں جن کو اس بات کی کوئی شرعی دلیل ہی نہیں ملتی کہ انبیاء ک
کی بعثت کا مقصد اقامت دین تھا اور نہ انہیں اس بات کی کوئی دلیل ملتی ہے کہ اقامت دین کا مفہ
وہ ہے جس کی تشریح اوپر کی گئی ہے

یہ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنی آخری کتاب، آخری نبی کی سیرت اور ان کے ساتھ
کی تاریخ محفوظ کر دی ہے اور اس کا بھی انتظام فرما دیا ہے کہ قیامت تک ایک جماعت دین حق پر قائم رہ
اس کی تقویت و اشاعت اور تجدید و اقامت کا فریضہ انجام دیتی رہے گی اس لیے اگر کوئی شخص یا گر
گروہ تعصبات سے ہٹ کر کھلے ذہن کے ساتھ کتاب و سنت اور تاریخ و سیرت کا مطالعہ کرے تو حق ا
پر واضح ہو جائے گا۔

بنیادی سوال

اس سلسلے میں سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس دنیا میں اپنے رسول کس مقصد
بھیجے تھے آیا غرض صرف اتنی تھی کہ گمراہ انسانوں تک دین حق کا پیغام پہنچا دیا جائے، وہ اسے قبول کر لیں
بہت اچھا اور نہ قبول کریں تو بس انہیں عذاب آخرت کی وعید سنا دی جائے۔ باقی رہی یہ دنیا تو یہاں آ

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

امام ابو یوسف کا معاشی فکر

جناب نجات اللہ صدیقی صاحب، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ایک مرتب اور منضبط علم کی حیثیت سے معاشیات کی عمر دو ڈھائی سو برس سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس سے قبل بھی اجتماعی مسائل اور انتظامی امور پر لکھنے والوں میں اس بات کا شعور پایا جاتا تھا کہ زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور دوسرے معاشی امور کی تہ میں کچھ اصول کارفرما ہیں۔ اشیاء کے مبادلے اور زر کے استعمال سے پیدا ہونے والے مسائل پر بھی ایسی گفتگوئیں ملتی ہیں جن سے متعلقہ اصولوں سے آگاہی کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ ان معاشی مظاہر کے باقاعدہ تجزیے و تحلیل اور ان اصولوں کے تفصیلی مطالعہ کا رواج نسبتہً دیر میں ہوا۔ چنانچہ معاشی تجزیہ (Economic Analysis) کی ایسی تاریخیں مرتب کی جا چکی ہیں جو زمانہ قدیم اور قرون وسطیٰ کی تحریروں میں معاشی تجربے کے عمل کا سراغ لگاتی ہیں۔ اور ان معاشی اصولوں کی نشان دہی کرتی ہیں جن سے ان زمانوں کے مفکرین باخبر تھے[1]۔ یہ اصول زیادہ تر فلسفیوں اور ان عملی افراد کی تحریروں میں ملتے ہیں جنھوں نے سیاسی اور انتظامی امور پر بحث کی ہے اور اس بحث کے دوران معاشی حقائق پیش کیے ہیں یا معاشی تصورات (Concepts) استعمال کیے ہیں

لیکن مغرب میں علوم کا ارتقا جس مخصوص فضا میں ہوا ہے اس کے زیر اثر اور بڑی حد تک بے خبری کی وجہ سے بھی معاشی تجزیہ اور معاشی فکر کی تاریخوں میں مسلمان مفکرین کا کوئی ذکر نہیں ملتا[2]۔

---

[1] اس موضوع پر سب سے جامع تصنیف جوزف۔ اے شمپیٹر کی "معاشی تجزیہ کی تاریخ" ہے

Joseph. A. Schumpeter: History of Economic Analysis

[2] واحد استثناء ابن خلدون کی ذات ہے جس کا ذکر ایک عالم عمرانیات اور مورخ کی حیثیت سے شمپیٹر نے ضمناً کیا ہے (مذکورہ بالا کتاب طبع آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۹ء صفحات ۱۳۶ اور ۷۸۸) لیکن (باقی اگلے صفحہ پر)

دونوں حالیکہ یہ بات ایک عام قاری کو بھی حیرت میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی ہے کہ مغربی تہذیب کے غلبے سے پہلے جو طرز زندگی صدیوں تک مہذب دنیا میں رائج رہا، اس کے زیر اثر ان قوموں میں معاشی فکر و تجزیے کے باب میں کوئی قابل ذکر کام نہ ہو سکا ہو گا جو صنعت و حرفت، تجارت اور تنظیم مملکت کے باب میں بھی اس وقت دنیا میں سب سے آگے تھیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی کچھ کم قابل افسوس نہیں ہے کہ خود معاصر مسلمان مصنفین نے بھی مسلمانوں کے معاشی فکر اور مسلمان علماء و مفکرین کے یہاں معاشی تجزیے کی تاریخ مرتب کرنے کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی ہے۔

معاشی تجزیے سے ہماری مراد یہ ہے کہ ان قوتوں اور ان انسانی اعمال و رجحانات کا پتہ چلایا جائے جن کے تعامل کے نتیجے میں سطح زندگی پر نمایاں معاشی مظاہر وجود میں آتے ہیں یا ان اثرات و نتائج کی نشان دہی کی جائے جو کسی معاشی عمل یا اقدام سے متعلقہ افراد یا اداروں پر مرتب ہوتے ہوں۔ تجزیہ کا اطلاق اسباب و عوامل کی دریافت پر بھی ہوتا ہے اور اثرات و نتائج کی تحقیق پر بھی۔ معاشی تجزیہ پیچیدہ اور مرکب معاشی امور کے پیچھے کام کرنے والی سادہ اور مفرد قوتوں کو دریافت کرتا ہے یا معاشی اعمال کے پیچیدہ اثرات کے مختلف اجزاء کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دکھلاتا ہے۔ قیمتوں کے تعین کو طلب و رسد کے تعامل کا نتیجہ قرار دینا، پھر طلب کی تعین کرنے والے عوامل ـــ افراد کے ذوق اور ان کی ترجیحات، ان کی آمدنی وغیرہ ـــ کی نشان دہی کرنا معاشی تجزیے کی ایک مثال ہے۔ اس طرح کسی محصول کا تجزیہ یہ متعین کرے گا کہ اس کے اثرات محصول ادا کرنے والوں پر کیا پڑتے ہیں اور اس سے وصول کرنے والوں کو کیا حاصل ہوتا ہے، ان اثرات اور اس حاصل کا محصول کی نوعیت اس کی شرح یا طریق تحصیل سے کیا تعلق ہے اور ان میں کوئی ترمیم ان اثرات و نتائج کو کس طرح متاثر کر سکتی ہے۔

معاشی فکر کا دائرہ زیادہ وسیع ہے، اس سے مراد وہ تمام افکار و خیالات ہیں جو معاشی امور سے متعلق ہوں۔ معاشی مسائل کے حل کے لیے کیے جانے والے اقدامات، اور معاشی بہبود کے لیے پیش کی جانے والی تجاویز اس کے دائرے میں شامل ہیں اور وہ تمام امور و مباحث جن کا مطالعہ

(حاشیہ کا بقیہ) اس کے معاشی فکر و تجزیے سے شمپیٹر بھی آگاہ نہیں ہے۔ دوسرے معروف مورخین معاشیات کسی مسلمان مفکر کا ذکر نہیں کرتے۔

موجودہ علماء معاشیات معاشی پالیسی (Economic policy) کے عنوان کے تحت کرتے ہیں۔ کسی معاشی مظہر کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے یا کسی معاشی نتیجے کے مطلوب یا غیر مطلوب ہونے کی بابت ظاہر کیے جانے والے خیالات بھی معاشی فکر کے ترجمان ہوتے ہیں۔ مثلاً تجارت کے فوائد، سود کے جواز مروجہ محاصل کی خوبیوں یا خرابیوں، زرعی تعلقات اور زمین کے بندوبست اور بے روزگاری کے انسداد کی تدابیر پر بحث و گفتگو بحث کرنے والوں کے معاشی فکر کی ترجمانی کرے گی۔

معاشی افکار کے مطالعہ سے ان کے پیچھے کام کرنے والی تجزیاتی بصیرت کا بآسانی پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایک مفکر جب دو مختلف محاصل کا موازنہ کرتے ہوئے ایک کو دوسرے سے بہتر قرار دیتا ہے تو اس رائے کی بنیاد اس کے نزدیک وہ اثرات و نتائج ہوتے ہیں جو ادا کرنے والوں اور وصول کرنے والوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی محصول کے اثرات و نتائج پر غور اس کے تجزیے میں شامل ہے، اور یہ بات کہ وہ مفکر کن اثرات کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور کون سے نتائج اسے زیادہ مطلوب ہیں، نیز یہ کہ اس کی نظر اثرات پر زیادہ ہے یا نتائج پر...... اس کے معاشی فکر اور ان معاشی و سماجی قدروں کی نشان دہی کرتی ہے جنہیں ان کے نزدیک وزن حاصل ہے۔

معاشی فکر کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسانی معاشرے کی لیکن معاشی تجزیہ و تحلیل کا، اس علم کے مستند مورخین کی رائے ہیں، فلاسفۂ قدیم سے قبل کوئی پتہ نہیں ملتا[1] اگرچہ علماء یونان کے معاشی تجزیے کا معیار بہت اونچا نہیں ہے۔ پھر بھی انھیں اس باب میں شرف اولیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں کارنامہ ارسطو (۳۸۴ قبل مسیح تا ۳۲۲ قبل مسیح) کا ہے۔ ارسطو کے تجزیاتی کام کی اہمیت اس سے زیادہ اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کے بعد دس بارہ صدیوں تک تجزیاتی کام نے کوئی قابل ذکر ترقی نہیں کی۔ سلطنت روما اور قرون وسطی کے یورپ میں اس باب میں ایک غیر معمولی خلا ملتا ہے۔ ارسطو کے سات سو برس کے بعد سینٹ آگسٹائن (۳۵۴ - ۴۳۰ء) کی تصانیف میں بھی معاشی امور کے تجزیہ کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی ہے اور علم معاشیات کے مورخین کو ٹامس اکوئیناس (۱۲۲۵ - ۱۲۷۴ء) سے پہلے اس میدان میں کوئی قابل ذکر کام نہیں ملتا[2]۔

---

[1] شمپیٹر: بحوالہ بالا صفحہ ۵۳

[2] شمپیٹر: بحوالہ بالا صفحہ ۶۰

جیساکہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ایک مرتب اور منضبط علم کی شکل اختیار کرنے سے پہلے کے
ر میں معاشی تجزیہ اور معاشی اصولوں کا پتہ اس دور کے معاشی مطالعہ اور معاشی امور پر کی جانے
ی بحثوں کی تحلیل کے ذریعہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ابتدائی اسلامی دور کے معاشی فکر کا اس انداز سے
مالعہ کافی نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ یہ مطالعہ ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ اس دور میں معاشی مظاہر کو سمجھنے کی کس
تک کوشش کی گئی تھی۔ معاشی مسائل کو حل کرنے اور معاشی امور سے متعلق قوانین بنانے میں کیا رہنما
مول سامنے رکھے گئے تھے اور جو حل اختیار کیے گئے یا جو قوانین بنائے گئے وہ متعلقہ امور و مسائل سے
س حد تک آگاہی ظاہر کرتے ہیں۔

اس مطالعہ میں ہمارا نقطۂ آغاز قدرتی طور پر رسالت مآب کا دور ہوگا۔ آپ کے ارشادات،
عملوں اور اجتماعی امور و مسائل میں آپ کی پالیسی کا گہرا مطالعہ آپ کے معاشی فکر اور معاشی مظاہر کے
م پر کافی روشنی ڈال سکتا ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام کے دور کے آثار کی تحلیل بالخصوص حضرت عمر
ی اللہ عنہ کی معاشی پالیسی کے جائزے سے بھی مفید نکات سامنے آئیں گے۔ اسلامی فقہ کی تدوین کا
ور اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ متعدد معاشی امور و مسائل پر اسلامی قوانین و ضوابط کے استنباط سے
ملق بحثیں یقیناً بحث میں حصہ لینے والوں کے معاشی فکر اور ان کی تجزیاتی رسائی کا پتہ چلانے کا اچھا
ریعہ ثابت ہوں گی۔ اس دور کے بعد جو اکابر مفکرین اور علماء گزرے ہیں ان کی بہت سی تصانیف محفوظ
ہ جو ان کے معاشی فکر کے مطالعہ کی بنیاد بن سکتی ہیں۔ دوسری صدی ہجری سے نویں صدی ہجری تک متعدد
یسے علماء و مفکرین گزرے ہیں جن کی تصانیف میں معاشی بحثیں بھی ملتی ہیں۔ اس ضمن میں قاضی ابو یوسف
سکویہ، ماوردی، ابن حزم، غزالی، رازی، ابن تیمیہ اور ابن خلدون کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہم
دعویٰ نہیں کرتے کہ ان علماء کے معاشی افکار کا جائزہ ایسے تجزیاتی نکات سامنے لائے گا جو ان کے
مدیوں بعد مرتب ہونے والے علم معاشیات کے معیاروں کے مطابق بلند پایہ قرار پائیں لیکن ہمارا یہ
ل ضرور ہے کہ یہ مطالعہ علمی اعتبار سے مفید نتائج سامنے لائے گا۔ نہ صرف یہ کہ اس سے اسلامی تہذیب
ن کے ایک ایسے پہلو پر روشنی پڑے گی جس کی طرف اب تک بہت کم توجہ کی گئی ہے بلکہ یہ مطالعہ
اشی فکر و تجزیے کی تاریخوں کے اندر اس خلا کو پُر کرنے کے لیے بھی ضروری ہے جو ہمیں متداول کتابوں میں
لتا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی سے تیرھویں صدی عیسوی تک کا زمانہ

شمپیٹر نے معاشی تجزیے کی تاریخ کے نقطۂ نظر سے ایک عظیم خلا قرار دیا ہے۔[1] بعینہٖ وہ دور ہے جس میں مسلمان علماء و مفکرین نے اس میدان میں قابلِ ذکر کارنامے انجام دیے ہیں۔

اس مختصر مقالے میں ہم نہ اس مطالعہ کا حق ادا کر سکتے ہیں نہ ہم نے اس کو اس کے قدرتی نقطۂ آغاز سے شروع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں چند باتیں صرف اس لیے کہی گئی ہیں کہ معاشیات اسلام کے طالب علم اس موضوع کی طرف توجہ کریں۔ ہم نے اس مقالے کے لیے مذکورہ بالا علماء و مفکرین سے ایک نمایاں شخصیت کا انتخاب کیا ہے۔ جب بھی اسلام میں معاشی فکر و تجزیے کی کوئی تاریخ مرتب کی جائے گی۔ امام ابو حنیفہ کے شاگردِ خاص اور خلیفۂ ہارون الرشید کے قاضی القضاۃ ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم (۱۱۳ھ - ۱۸۲ھ / ۷۳۱ء - ۷۹۸ء) کو اس میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوگا۔ ان کی مشہور تصنیف "کتاب الخراج" ان کے معاشی فکر کا آئینہ ہے اور اسی کو ہم نے اس مطالعہ کی بنیاد بنایا ہے۔[2] چونکہ ہمارے سامنے اسلام میں معاشی فکر و تجزیے کی تاریخ کو اس کے قدرتی نقطۂ آغاز سے شروع کرنے اور اس پر مفصل بحث کرنے کا کام نہیں ہے اس لیے بہت سے ایسے نکات جن کا تمہیدی طور پر مفید ہوتا ہم نے پیش نہیں کیے ہیں۔

قاضی ابو یوسف سلطنت بنو امیہ کے آخری زمانہ میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے زمانۂ شباب میں حکومت بنو عباس کے ہاتھوں میں آگئی اور جب پختہ عمر کو پہنچے تو عباسی حکومت کو پورا استحکام حاصل ہو چکا تھا۔ عمر کے آخری سترہ سال عباسی سلطنت کے دار الخلافہ بغداد میں گزرے۔ یہ زمانہ عباسی سلطنت کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اس کے حدود مشرق میں سرحدِ چین اور وادی سندھ تک، مغرب میں لیبیا کے صحراؤں تک، شمال میں دریائے سیحون اور کوہ قفقاز تک اور جنوب میں یمن اور وسط افریقہ تک پھیلے ہوئے

[1] شمپیٹر۔ بحوالہ بالا صفحہ ۷۴ - ۷۳۔ زیرِ عنوان The great gap

[2] قاضی صاحب کی دوسری مطبوعہ تصانیف، کتاب الآثار، کتاب اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ، اور کتاب الرد علی سیر الاوزاعی بھی ہمارے سامنے ہیں لیکن ان میں اس نوعیت کی بحثیں نہیں ملتیں جن کا جائزہ ہمارے لیے مفید ہو۔ قانونی مسائل پر قاضی صاحب کی بہت سی رائیں حنفی فقہ کی کتابوں میں نقل کی گئی ہیں جن کا جائزہ ان کے معاشی فکر اور تجزیاتی رجحانات پر مزید روشنی ڈال سکتا ہے لیکن اس مقالہ کی تیاری میں ان رایوں کو سامنے نہیں رکھا جا سکا۔

تھے۔ اس زمانے میں یہ دنیا کی سب سے طاقتور سلطنت تھی۔ اس کے خارجہ تعلقات یورپ اور ہندوستان سے بھی تھے۔ ہارون الرشید (دور حکومت ۱۷۰ھ - ۱۹۳ھ/ ۷۸۶ء - ۸۰۹ء) کے دربار میں ان ممالک کے حکمرانوں نے گراں بہا تحائف بھیجے تھے۔ اس حکومت میں اسلامی فقہ کو جو اس زمانے میں قرآن و سنت کی روشنی میں مصالح اور عرف کو سامنے رکھتے ہوئے مرتب کی جا رہی تھی، قانون ملکی کی حیثیت حاصل تھی۔

معاشی اعتبار سے یہ دور فراخی اور خوش حالی کا دور تھا۔ وادی نیل، دوآبہ دجلہ و فرات اور شام جیسے زرخیز علاقوں کی وافر پیداوار کے سبب غلے اور پھل ارزاں اور فراواں تھے۔ بغداد جسے خلیفہ منصور نے ۱۴۶ - ۱۴۵ھ (۷۶۲ - ۶۳ء) میں از سر نو آباد کیا تھا عالمی تجارت کا مرکز بنا ہوا تھا اور دریائے دجلہ میں، جس کے دونوں کناروں پر یہ شہر آباد تھا، ہر ملک کے جہاز نظر آتے تھے۔ بغداد کے بازاروں میں چین سے ریشم، مشک اور برتن، ہندستان اور ملایا سے مسالے، رنگ اور معدنی اشیاء، وسط ایشیا سے کپڑے، غلام ہیرے اور جواہرات، روس اور اسکینڈی نیویا سے شہد، موم، سمور اور غلام، اور مشرقی افریقہ سے سونا، ہاتھی دانت اور سیاہ فام غلام لائے جاتے تھے۔ خود سلطنت کے مختلف صوبوں سے وہاں کی مقامی پیداوار بغداد کے بازاروں میں آتی تھی۔ بغداد سے متعدد خام اشیاء اور مصنوعات اور دوسرے ممالک سے درآمد کردہ مال یورپ اور افریقہ کو برآمد بھی کیے جاتے تھے۔

ہارون الرشید کے زمانے میں بغداد کی آبادی سات لاکھ اور سلطنت کی سالانہ آمدنی جو خراج، جزیئے اور محاصل چنگی سے ہوتی تھی پچاس کروڑ درہم سے زیادہ تھی۔ عشر و زکوٰۃ کی آمدنی جس کے مصارف متعین تھے، اس کے علاوہ تھی۔ بغداد میں اشیاء ضرورت کے نرخ ارزاں تھے، عوام کی معاشی حالت اچھی تھی اور انھیں ایک معقول معیار زندگی میسر تھا۔

بغداد اس زمانے میں اسلامی علوم کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور عربی ادب، نحو اور لغت کے بڑے بڑے ائمہ جو آگے چل کر ان علوم میں مستقل مکاتب فکر کے بانی قرار پائے، اپنی سرگرمیوں اور درس و تدریس سے بغداد کی علمی فضا کو معمور کیے ہوئے تھے۔

قاضی ابو یوسف ایک غریب خاندان کے فرد تھے۔ کم عمری ہی میں کسب معاش پر مجبور ہوئے لیکن پھر ان کو علم حاصل کرنے کا شوق مشہور فقیہ قاضی ابن ابی لیلیٰ کے حلقہ درس میں لایا۔ کچھ عرصہ اس میں شریک رہنے کے بعد امام ابو حنیفہ کی شاگردی اختیار کی اور امام صاحب کی وفات تک ان سے

استفادہ کرتے رہے۔ آپ کا علم اور قانونی نقطۂ نظر زیادہ تر امام ابو حنیفہ کی تربیت کا فیض یافتہ ...
اگرچہ آپ نے اپنے دور کے دوسرے اساتذہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جلد ہی آپ کی علمی شخصیت
بالخصوص فقہ کے میدان میں، اپنے دوسرے معاصرین سے ممتاز ہو کر ابھری اور آپ اسلامی قانون کے ایک
صاحب اجتہاد ماہر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ آپ کو امام ابو حنیفہ کے بعد حنفی مکتب فقہ کا سب سے
بڑا معمار قرار دیا گیا ہے۔ فقہ میں آپ نے چند کتابیں تصنیف کی تھیں جن میں سے چند اب بھی محفوظ ہیں۔

تیسرے عباسی خلیفہ مہدی نے ابو یوسف کو مشرقی بغداد کا قاضی مقرر کیا۔ چوتھے خلیفہ ہادی
نے آپ کو پورے بغداد کا قاضی بنا دیا اور اس کے بعد جب ہارون الرشید خلیفہ ہوا تو اس نے
آپ کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کا عہدہ دیا جس پر اپنی وفات تک فائز رہے۔ پوری عباسی سلطنت
میں ججوں کا تقرر آپ کے مشورے سے عمل میں آتا تھا۔ آپ کے علم و بصیرت کے پیش نظر خلیفہ اہم سیاسی
انتظامی اور مالی امور میں بھی آپ سے مشورہ کر لیا کرتا تھا۔

کتاب الخراج

ہارون الرشید نے رعایا کی فلاح کے لیے کام کرنے اور شریعت کے مطابق عدل کے ساتھ حکومت
کرنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلے میں قاضی ابو یوسف سے رہنمائی چاہی۔ اس نے مختلف انتظامی
اور مالی امور سے متعلق سوالات کیے۔ بالخصوص محاصل کے باب میں شریعت کے ضوابط دریافت کیے۔ قاضی
صاحب نے کافی محنت اور توجہ سے ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے ایک جامع اور مفصل یادداشت
مرتب کر دی تھی۔ یہی تحریر بعد میں کتاب الخراج کے نام سے مشہور ہوئی۔

خراج کے موضوع پر دوسری اور تیسری صدی ہجری میں متعدد کتابیں مرتب کی گئی تھیں جن میں سے
چند اب بھی محفوظ ہیں[1]۔ خراج کے لفظی معنی ٹیکس کے ہیں۔ اگرچہ اس کا اطلاق زیادہ تر زمین کے محصول پر ہوتا
ہے[2] فقہائے اسلام نے اسے نسبتاً وسیع تر مفہوم میں استعمال کیا ہے جس کے دائرے میں فئے اور خلیفہ
کی آمدنی، جزیہ، محاصل جنگی اور زمین کے محاصل بھی آجاتے ہیں۔ خراج پر اکثر تصانیف میں ان محاصل

---

[1] یحیی ابن آدم القرشی: کتاب الخراج۔ قدامہ بن جعفر بن قدامہ الخراج وصنعۃ الکتابۃ۔ ابو عبید القاسم بن سلام:
کتاب الاموال اور قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج۔

[2] ملاحظہ ہو کشاف اصطلاحات الفنون اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ لفظ "خراج"۔

کے علاوہ دوسرے مالی امور اور متعلقہ انتظامی امور سے بھی بحث کی گئی ہے۔ قاضی ابو یوسف کی "کتاب الخراج" میں مذکورہ بالا امور کے علاوہ قوانین جنگ و صلح، فوجداری قوانین، حکمراں اور افسران حکومت کی ذمہ داریاں، رعایا کے فرائض، فلاح عامہ سے متعلق امور ذمی، معاہد، مستامن، حربی، مرتد اور باغی افراد سے متعلق احکام، محکمۂ ڈاک اور خبر رسانی وغیرہ بھی زیر بحث آئے ہیں۔ زمینوں، چراگاہوں، چشموں اور نہروں سے متعلق مسائل پر بھی گفتگو کی گئی ہے اور ضمناً بیع سے متعلق بعض مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔ ان مباحث کے ضمن میں بہت سی تاریخی معلومات بھی فراہم کردی گئی ہیں[1]۔

اس مقالہ میں ہم اس کتاب کی روشنی میں ابو یوسف کے معاشی فکر بالخصوص ان تجزیاتی نکات کا جائزہ لیں گے جو ان کے معاشی فکر میں ملتے ہیں۔ ان مباحث کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی تھی معاشیات کا علم وجود میں نہیں آیا تھا اس کی تصنیف کا زمانہ آدم اسمتھ کی دولت اقوام (Wealth of nations) سے ایک ہزار سال پہلے ہے، اور قرون وسطیٰ کے معاشی فکر کے سب سے بڑے نمائندہ ٹامس اکوئیناس ابو یوسف کے پانچ سو برس بعد پیدا ہوئے تھے۔ ارسطو اور دوسرے یونانی علماء کی کتابیں اس وقت تک عربی میں منتقل نہیں ہوئی تھیں اور عرب علماء ان کے تجزیاتی کام سے ناواقف تھے۔

چونکہ ابو یوسف کے تجزیاتی نکات یا کسی خاص موضوع پر ان کے فکر کا جائزہ لینے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی کتاب کی متعلقہ عبارتیں نقل کی جائیں لہذا اس مختصر مقالہ میں ان کی معاشی فکر کا مکمل جائزہ لینے کی گنجائش نہیں۔ ہم اپنے مطالعہ کو صرف دو تین موضوعات تک محدود رکھیں گے۔ اور ان کے ضمن میں بھی صرف ضروری اقتباسات پر اکتفا کریں گے۔

۱۔ خراج کی شرحیں۔

جزیرۃ العرب کے باہر کے جو علاقے جنگ کے بعد فتح ہوئے، یا جو صلح و معاہدے کے ذریعے اسلامی مملکت میں شامل ہوئے، ان کی زمینیں اسلامی قانون کی اصطلاح میں خراجی

---

[1] اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی، روسی اور ترکی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اطالوی میں اس کی تلخیص شائع ہو چکی ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ جلد ہی شائع ہونے والا ہے۔

[2] ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔

کہلاتی ہیں[1] مفتوحہ علاقوں کے باشندوں سے اگر محاصل زمین کے بارے میں کوئی معاہدہ ہوا ہو تو ریاست اس معاہدے کی پابندی کرے گی۔ اور محاصل کی طے شدہ شرحوں میں ان باشندوں کی مرضی کے بغیر کسی ترمیم کی مجاز نہ ہوگی۔ بصورت دیگر وہ ان باشندوں سے ان کی زمینوں پر ایک معقول شرح کے مطابق سالانہ کرایہ وصول کرنے کی مجاز ہوگی جس کا اصطلاحی نام خراج ہے۔ ان زمینوں کی قانونی نوعیت یہ ہے کہ ان کی اصل مالک اسلامی ریاست ہے، لیکن انہیں بدستور ان کے سابق مالکوں کے پاس رہنے دیا جائے ان کی حیثیت موروثی کاشتکاروں کی ہوگی جنہیں بے دخل نہیں کیا جائے گا۔[2]

عراق، مصر اور شام کے اکثر علاقے یا تو جنگ کے بعد فتح ہوئے تھے یا صلح کے ذریعہ اسلامی حکومت کے تحت آئے تھے اور ریاست ان زمینوں کا خراج وصول کرتی تھی۔ زیر بحث محاصل کا تعلق انہیں میں سے ہے۔

ایرانی سلطنت کے دور میں کسریٰ انوشروان کے زمانہ سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ زمین کا محصول رقبہ کے اعتبار سے ایک متعین شرح کے مطابق وصول کیا جائے۔ مثلاً اتنے درہم فی جریب۔ یا اتنا غلہ فی جریب حضرت عمر کے زمانہ میں جب عراق و شام کے یہ علاقے اسلامی مملکت میں شامل ہوگئے تو بھی یہی طریقہ باقی رکھا گیا۔ اصطلاحی الفاظ میں یہ طریقہ "نظام المساحہ"[3] کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر نے خراج کی یہ شرحیں ہلکی رکھی تھیں اور اس بات کی تحقیق کرلی تھی کہ کاشتکار متعینہ محاصل ادا کرنے پر بآسانی قادر ہوں گے یہی نظام محاصل خلافت راشدہ، اموی دور اور پھر عباسی دور میں منصور کی وفات (۷۷۵/۱۵۸ء) تک نافذ رہا۔ زرعی زمینوں کا محصول رقبہ کے اعتبار سے نقد رقم اور متعین مقدار غلہ کی شکل میں وصول کیا جاتا رہا۔

جب عباسی سلطنت قائم ہوئی تھی تو غلہ گراں تھا لیکن منصور کے عہد میں غلہ بہت سستا ہوگیا تھا۔ ان تبدیلیوں کے نتائج دیکھ کر یہ محسوس کیا گیا کہ خراج وصول کرنے کے طریقے میں کسی بنیادی ترمیم کی ضرورت ہے۔ چنانچہ تیسرے عباسی خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ-۱۶۸ھ/ ۷۷۵-۷۸۵ء) کے وزیر ابو عبید اللہ

---

[1] ابو یوسف: کتاب الخراج قاہرہ ۱۳۴۶ھ صفحہ ۸۲

[2] ابو عبید القاسم بن سلام: کتاب الاموال۔ قاہرہ ۱۳۵۳ھ صفحہ ۶۹، ۷۳-۷۴، صفحہ ۹۱ اور صفحہ ۲۷۹

[3] [illegible]

نے یہ تجویز پیش کی کہ حکومت کاشتکاروں سے ان کی زمین کی پیداوار کی ایک متعین نسبت وصول کرنے کا طریقہ اختیار کرے۔ مہدی نے یہ اصلاح نافذ کردی۔ یہ طریقہ "نظام المقاسمہ[1]" کہا جاتا ہے اس نظام میں یہ کہا جاتا ہے کہ نرخ کے اتار چڑھاؤ اور پیداوار میں کمی بیشی کا اثر کاشتکاروں اور سرکاری خزانہ دونوں پر یکساں اثر پڑتا ہے۔ ان تبدیلیوں سے دونوں کے مفاد میں کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ نہ آئے دن خراج کی متعین مقداروں میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ ۱۶۰ھ (۷۷۷ء) سے مختلف قسم کی خراجی زمینوں کی پیداوار میں سے ریاست مندرجہ ذیل نسبتوں کے مطابق خراج وصول کرنے لگی۔

دریاؤں چشموں اور بارش کے پانی سے سیراب ہونے والی زمینوں کی پیداوار کا آدھا حصہ
ڈول اور رہٹ سے سینچی جانے والی زمینوں کی پیداوار کا تہائی حصہ
زیادہ محنت طلب "دوالیب" کی مدد سے سینچی جانے والی زمینوں کی پیداوار کا چوتھائی حصہ

کھجور، دوسرے درختوں اور انگور کی بیلوں پر حسب سابق متعین مقداروں میں خراج وصول کیا جاتا رہا[2]۔

مہدی اپنے دور حکومت کے آخر میں فضول خرچیاں کرنے لگا۔ حکومت کو جب مزید مال کی ضرورت ہوئی تو مصر اور دوآبہ دجلہ و فرات میں خراج کی شرحیں بڑھا دی گئیں اور بارانی زمینوں کی پیداوار کا $\frac{1}{2}$ کی جگہ $\frac{3}{5}$ حصہ وصول کیا جانے لگا۔ اس کے بعد ہادی کے مختصر دور حکومت میں بھی یہی شرح نافذ رہی ربیع الاول ۱۷۰ھ (ستمبر ۷۸۶ء) میں ہارون الرشید حکمراں ہوا اور اس نے ایک لائق اور مدبر فرد یحییٰ ابن خالد بن برمک کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ اس کی تجویز پر ۱۷۲ھ (۷۸۸ء) میں بارانی زمینوں کے خراج کی شرح $\frac{3}{5}$ سے گھٹا کر پھر $\frac{1}{2}$ کردی گئی[3]۔

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کرچکے ہیں یہی وہ زمانہ تھا جس میں ہارون الرشید کی ایما پر ابو یوسف نے

---

[1] یعنی پیداوار میں شرکت کے اصول پر مبنی نظام محاصل

[2] مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو

محمد ضیاء الدین الریس: الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ - پانچواں باب قاہرہ ۱۹۵۷ء

[3] محمد ضیاء الدین الریس: بحوالہ بالا صفحہ ۴۰۷

"کتاب الخراج" مرتب کی تھی۔ انھوں نے خراجی زمینوں کے محاصل پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ان زمینوں کے اسلامی مملکت میں شامل ہونے اور ان کے نظام محاصل کی پوری تاریخ بیان کرنے کے بعد انھوں نے نظام المساحہ اور نظام المقاسمہ کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور خراج کے لیے منصفانہ شرحیں تجویز کی ہیں۔ انھوں نے نظام المقاسمہ کو نظام المساحہ سے بہتر قرار دیتے ہوئے پھل دار درختوں کھجور اور انگور کے سلسلے میں بھی اسی طریقے کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں :-

"میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ محصول کے طور پر غلہ کی کوئی متعین مقدار یا درہموں کی کوئی متعین تعداد مختلف شرحوں کے ساتھ ان پر عائد کر دینا سلطان اور بیت المال کے لیے نقصان کا باعث ہوگا۔ یہ شکل خراج ادا کرنے والوں کے باہمی معاملات میں بھی خرابیاں پیدا کرے گی۔

"جہاں تک متعین مقدار غلہ کی شکل میں محصول عائد کرنے کا سوال ہے، تو اگر غلہ بہت سستا ہوا تو سلطان اس مقدار کو کافی نہیں سمجھے گا جو ان پر عائد کی گئی ہے اور اس طرح ان کو جو چھوٹ مل رہی ہوگی اس پر وہ دل سے راضی نہ ہوگا۔ ان (تھوڑے محاصل) کے ذریعے فوجوں کو ضروری قوت نہ بہم پہنچائی جا سکے گی اور سرحدوں کے استحکام اور ان پر سپاہی مقرر کرنے کا کام بھی ٹھیک طور سے انجام نہ پا سکے گا۔

"اگر غلہ بہت زیادہ گراں ہو تو خراج ادا کرنے والوں کو مقررہ مقدار زیادہ معلوم ہوگی۔ لیکن سلطان کو اس میں تخفیف گوارا نہ ہوگی۔

"اور ارزانی اور گرانی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ان کا حال یکساں نہیں رہتا۔"

"درہموں کی متعین تعداد کی شکل میں محصول عائد کرنے کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے دوسرے عوامل کو بھی دخل حاصل ہے لیکن ان کی تشریح طوالت کا باعث ہوگی۔"[1]

پھر وہ غلے کے نرخ کے چڑھنے اور گرنے کے اسباب پر کچھ تبصرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

"میرے خیال میں پیداوار کے اندر ایک ایسی منصفانہ ملکی نسبت سے حصہ دار بن جانا جس سے حکومت بھی راضی ہو، اہل خراج باہمی تعلقات میں ظلم و زیادتی اور ایک دوسرے کی دست درازی سے

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج صفحہ ۵۰

بچے رہیں اور ان کے لیے کچھ بچ بھی رہے۔ بیت المال کی آمدنی بڑھانے، خراج ادا کرنے والوں کو ایک دوسرے کی دست درازیوں سے اور ایک دوسرے پر بے جا بار ڈالنے سے بچانے نیز ان کو والیوں اور دوسرے افسران حکومت کے ظلم سے محفوظ رکھنے کا بہترین طریقہ ہے[1]

"امیرالمومنین کو اللہ باقی رکھے، میری رائے یہ ہے کہ وہ سارے باشندگان سواد[2] سے گیہوں اور جو کی کاشت پر بہتے ہوئے پانی سے سیراب ہونے والی زمینوں کی پیداوار کے پر معاملہ کریں۔ محنت سے سینچی جانے والی زمینوں (کی پیداوار میں) سے پانچویں حصہ اور نصف[3] کھجور کے درخت، انگور، پختہ کھجوروں اور باغات میں تہائی پر اور موسم گرما کی فصل میں سے چوتھائی[4] پر ـ ان میں سے کسی چیز پر بھی خراج کی تحصیل اندازے سے نہ کی جائے، نہ کوئی چیز تخمینہ کی بنا پر طے کی جائے۔ (بلکہ پیداوار) تاجروں کے ہاتھوں فروخت کردی جائے پھر اس کی مجموعی قیمت میں سے حصے الگ کرلیے جائیں۔ یا اس کی ایک منصفانہ قیمت لگائی جائے جس میں نہ تو خراج ادا کرنے والوں کے ساتھ کوئی زیادتی ہو نہ حکومت کا نقصان ہو۔ پھر اس کے حساب سے ان کے ذمے جو کچھ نکلتا ہو وہ لے لیا جائے۔ ان دونوں شکلوں میں سے جو شکل بھی خراج ادا کرنے والوں کے لیے سہل تر ہو وہی اختیار کی جائے[4]"

جیسا کہ اس اقتباس سے واضح ہے ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ زرعی زمینوں پر متعین مقداروں میں محصول عائد کرنا عدل کے تقاضوں کو نہیں پورا کرتا۔ اس طریقے کے نتائج کبھی تو رعایا کے مفاد کے خلاف پڑتے ہیں اور کبھی ان سے ریاست کا مفاد مجروح ہوتا ہے۔

فرض کیجیے کہ محصول غلہ کی ایک متعین مقدار کی شکل میں عائد کیا گیا ہے۔ جب غلہ سستا ہوگا تو اس سے ریاست کو نقصان ہوگا۔ کیونکہ ریاست کو اس محصول کے ذریعہ جتنا غلہ ملے گا اس کی فروخت سے اس کو اس سے کم آمدنی ہوگی جو غلہ کے سستا ہونے سے پہلے ہوتی تھی۔ چونکہ ریاست کے اخراجات مثلاً فوجیوں کی تنخواہیں، سرحدی چھاؤنیوں کی تعمیر وغیرہ نقد رقوم کے ذریعے پورے کیے جاتے ہیں لہذا آمدنی

[1] ایضاً صفحہ ۵۰ ۔ ۵۹
[2] دو آبہ دجلہ و فرات
[3] یعنی ۱۰/۳
[4] ابو یوسف بحوالہ بالا صفحہ ۵۹

میں یہ کمی اس کی ذمہ داریوں کی تکمیل میں حارج ہوگی۔

اگرچہ ابو یوسف نے نقد والے نکتہ کو صراحۃً نہیں بیان کیا ہے لیکن فوجیوں اور سرحدوں کا حوالہ اور اس اندیشے کا اظہار کہ حکومت اپنی یہ ذمہ داریاں پوری طرح نہیں ادا کر سکے گی، اس بات کا ضامن ہے کہ ان کے پیش نظر یہی نکتہ ہے۔

ابو یوسف نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ جب غلہ گراں ہوگا تو کاشتکاروں کو ایک متعین رقبہ زمین کے محصول کے طور پر غلہ کی ایک متعین مقدار دینا گراں گزرے گا۔ لیکن انھوں نے اجمال سے کام لیا ہے اور یہ واضح نہیں کیا ہے کہ ایسا کیوں ہوگا۔ اس کا سبب خراج ادا کرنے والوں کا یہ احساس ہے کہ وہ باعتبار قیمت پہلے سے زیادہ محصول ادا کر رہے ہیں یا اور کچھ؟

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ متعین مقدار غلہ کی شکل میں محصول عائد کرنے کی مضرت واضح کرتے وقت ابو یوسف نے یہ نہیں کہا ہے کہ چونکہ پیداوار میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس لیے محصول کے طور پر دیے جانے والے غلہ کی مقدار کا متعین ہونا انصاف کے خلاف ہے۔ اگر غلہ کی گرانی کا سبب اس کی پیداوار کا معمول سے کم ہونا ہو تو کاشتکار کو کم پیداوار میں سے بھی اتنا ہی غلہ بطور محصول دینا ہوگا جتنا وہ زیادہ پیداوار میں سے ادا کرتا تھا۔ یہ بات اس پر گراں گزرے گی۔ یہ طرز استدلال اختیار کرنے کی بجائے انھوں نے اپنی توجہ صرف غلہ کے نرخ بازار پر مرکوز کی ہے۔ ایسا نہیں کہ انہیں اس بات کا شعور نہ ہو کیونکہ انھوں نے خود محصول کا جو نظام تجویز کیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ انھیں اس کا پورا پورا شعور ہو۔ اس نکتہ کی صراحت نہ کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ یہ موقف نہیں اختیار کرنا چاہتے کہ غلہ سستا ہونے کا سبب ہمیشہ پیداوار کی فراوانی اور اس کے گراں ہونے کا سبب ہمیشہ پیداوار کی قلت ہوتی ہے۔ اس کی بجائے وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ غلہ کا نرخ کم اور زیادہ ہوتا رہتا ہے، ایک سطح پر نہیں قائم رہتا۔ اور اسی بات کو متعین مقدار غلہ کی شکل میں محصول وصول کرنے کی مضرت کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

ان کے اس موقف پر مزید روشنی ہم آئندہ ڈالیں گے، لیکن یہاں اس مسئلے کا ایک اور پہلو قابل غور ہے۔ غلہ کے نرخ کی گرانی اور ارزانی کا تعلق پورے بازار میں اس کی رسد کے گھٹنے اور بڑھنے سے ہوتا ہے نہ کہ ہر منفرد کاشتکار کی پیداوار میں کمی بیشی سے۔ ابو یوسف یہاں جس موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں

اس کا تعلق محصول ادا کرنے والے ہر فرد، بلکہ اس کے زیر کاشت کھیت سے ہے۔ لہٰذا وہ یہ فرض کر کے نہیں چلتے کہ غلہ کی ارزانی اس بات کی علامت ہو کہ ہر کھیت میں پیداوار زیادہ ہوئی ہے اور اس کی گرانی اس بات کی علامت ہے کہ ہر کھیت میں پیداوار کم ہوئی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے متعین غلہ کی شکل میں محصول عائد کرنے کی خرابی واضح کرتے وقت وہ طرز استدلال نہیں اختیار کیا ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یہ حقیقت پسندی ان میں اس لیے آئی ہے کہ وہ ایک واقعی صورت حال کا مشاہدہ کر کے ایک عملی مشورہ دے رہے ہیں نظری معاشیات پر کوئی مقالہ نہیں مرتب کر رہے ہیں۔

متعین رقم کی شکل میں خراج وصول کرنے کی مضرت کو وہ متعین مقدار غلہ کی شکل میں خراج وصول کرنے کی مضرت کے مثل قرار دیتے ہوئے اس بات کی بھی صراحت کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں چند دوسرے عوامل کو بھی دخل حاصل ہے۔ دونوں میں یہ مماثلت تو واضح ہے کہ غلہ سستا ہوگا تو متعین نقد محصول ادا کرنا کاشتکاروں کے لیے زیادہ مشکل ہوگا، گراں ہوگا تو نسبتاً آسان ہوگا۔ لیکن یہ دوسرے عوامل کیا ہیں جن پر قاضی صاحب نے طوالت کے اندیشے سے گفتگو نہیں کی ہے۔ کیا ان کے ذہن میں درہم[1] کی قوت خرید سے متعلق کچھ نکات تھے، یا وہ اشیاء کے بدلتے ہوئے نرخ کے ساتھ متعین نقد آمدنی کو بیت المال کے نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں سمجھتے تھے؟ اس معاملہ میں ہم قیاس آرائی کو دخل نہیں دے سکتے۔ اگر ابو یوسف نے طوالت کا لحاظ نہ کرتے ہوئے ان عوامل پر تفصیلی روشنی ڈالی ہوتی تو ہمیں ان کی تجزیاتی بصیرت کو سمجھنے کا زیادہ موقع ملتا۔

غلہ یا نقد کی متعین مقداروں کی شکل میں محصول وصول کرنے کی بجائے قاضی صاحب نے پیداوار میں شرکت کا طریقہ اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس طریقے کو وہ حکومت اور کاشتکار دونوں کے لیے زیادہ مفید اور منصفانہ سمجھتے ہیں۔ متعین محاصل کے نظام پر ان کی تنقید کی روشنی میں اس کا مطلب یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک پیداوار میں شرکت کا طریقہ اختیار کر لینے کے بعد غلہ کے نرخ میں کمی بیشی کا کاشتکاروں پر محصول کے بار یا حکومت کی آمدنی پر کوئی امتیازی اثر نہ پڑے گا، اور ان کی اضافی پوزیشن قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے متاثر نہ ہوگی۔

اوپر نقل کی ہوئی عبارت سے پہلے قاضی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے[2] اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے

---

[1] اس وقت کا مروجہ چاندی کا ایک سکہ جس کا وزن تقریباً ۳ گرام ہوتا تھا۔
[2] صفحہ ۵۰، بحوالہ بالا۔

دیک ان کے مجوزہ طریقے سے بعض اور فائدے بھی وابستہ ہیں۔ جب متعین محاصل عائد کیے جاتے تھے تو
ن زمینوں پر بھی محصول وصول کیا جاتا تھا جو قابل کاشت ہوں لیکن کسی وجہ سے کاشتکار نے ان پر
اشت نہ کی ہو۔ نیا طریقہ اختیار کرنے سے کاشتکاروں پر سے یہ بار ہلکا ہو جائے گا اور خراج صرف
ن زمینوں پر عائد ہوگا جو عملاً زیر کاشت ہوں۔ دوسری مصلحت یہ بھی ہے کہ کاشتکار آمادہ، ناکارہ
زیر آب زمینوں کی بازیافت اور ان کو زیر کاشت لانے میں اس لیے جھجکتے تھے کہ ایسا کرتے ہی ان کو
بھی متعین محاصل ادا کرنے پڑتے جب کہ ابتداءً کئی برس تک ان زمینوں کی بازیافت اور تیاری پر آنے والی
لت کے مقابلے میں ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کم ہوتی تھی۔ نیا طریقہ اختیار کرنے سے کاشتکاروں
ی راہ سے یہ رکاوٹ دور ہو جائے گی اور زرعی توسیع کی ہمت افزائی ہوگی۔

نئے نظام محاصل کے حق میں ابو یوسف نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کو اختیار کرنے سے حکومت کی آمدنی
ں اضافہ ہوگا۔ نظام مقاسمہ میں خراج کی آمدنی میں اضافہ اسی شکل میں ہو سکتا ہے جب ملک کی زرعی
یداوار میں اضافہ ہو۔ ابو یوسف کو توقع ہے کہ نیا نظام زرعی سرگرمیوں میں توسیع کا باعث ہوگا اور
س طرح پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ نظام المساحہ میں یہ خوبی نہیں پائی جاتی کیونکہ اس میں حکومت کی آمدنی
انحصار خراجی زمینوں کے رقبے پر ہوتا ہے نہ ان کی پیداوار پر۔

جدید اصطلاح میں نظام المساحہ اور نظام المقاسمہ کے درمیان وہی فرق ہے جو محصول زمین
(Land tax) اور زرعی آمدنی کے محصول (Agricultural income tax) کے
بیان ہے۔ مؤخرالذکر ایک متناسب محصول (Proportional tax) ہے جس سے ہونے
ی آمدنی پیداوار کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے۔ ابو یوسف کی بحث سے واضح ہے کہ وہ ان دونوں محاصل
ے فرق اور مؤخرالذکر محصول کے بہتر ہونے کے اسباب پر نظر رکھتے تھے۔

ابو یوسف نے یہ بھی کہا ہے کہ ان کا مجوزہ نظام خراج ادا کرنے والوں کے باہمی تعلقات کو ظلم و
یادتی سے پاک کرنے اور ان کو افسران حکومت کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنے کا باعث بنے گا۔ کتاب الخراج
ے دوسرے مقامات پر انھوں نے قدرے تفصیل سے واضح کیا ہے کہ ایسا کیوں کر ہوگا۔[۱] ان کا خیال ہے کہ
مینوں کی پیمائش میں عام کاشتکاروں کے ساتھ بے انصافی کر کے ان پر کھیت کے واقعی رقبہ کی نسبت سے

زائد محصول عائد کر دیا جاتا ہے۔ اگر محصول زمین کے رقبہ کی پیدائش کی بجائے اس کی پیداوار پر منحصر ہوگا تو پیمائش کی ضرورت نہ پڑے گی اور ظلم کا یہ دروازہ بند ہو جائے گا۔ ساتھ ہی انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ پیداوار کی مقدار تخمینہ سے نہ طے کی جائے بلکہ اسے ٹھیک ٹھیک پیمانوں سے ناپا جائے[1] یا غیر جانبدار افراد سے اس کی قیمت کا اندازہ لگوا کر اسی حساب سے سرکاری حصہ وصول کیا جائے۔ اگر کاشتکار چاہے تو پیداوار کی فروخت کر کے مجموعی قیمت میں حکومت کا مقررہ حصہ وصول کر لیا جائے۔

ابو یوسف نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ محصول کی شرح ہلکی ہونی چاہیے۔ انھوں نے خود جو شرحیں تجویز کی ہیں وہ سابق شرحوں سے ہلکی ہیں جیسا کہ ذیل کی جدول سے ظاہر ہے۔

زمین کی قسم	سابق شرح	مہدی کی اضافہ شدہ شرح	ابو یوسف کی مجوزہ شرح
بارانی زمین۔ پیداوار کا محنت	۲/۱	۳/۵	۲/۵
محنت سے سینچی جانے والی زمین۔ پیداوار کا	۱/۳	۱/۳	۱/۱۰
کھجور، انگور، باغات وغیرہ	متعین مقداریں	متعین مقداریں	۱/۳ پیداوار
دوالیہ[2] سے سینچی جانے والی زمین۔ پیداوار کا	۱/۴	۱/۴	-
موسم گرما کی فصل[2]۔ پیداوار کا	-	-	۱/۴

پہلی اور دوسری قسم کی زمینوں پر ابو یوسف کی تجویز کردہ شرحیں سابق شرحوں سے کم ہیں۔ آخری قسم کے محصول کی شرح میں کوئی تبدیلی تجویز نہیں کی گئی ہے۔ اور تیسری قسم کے سلسلے میں ایک بنیادی اصلاح تجویز کی گئی ہے۔ اس اصلاح کے مصالح اوپر واضح کیے جا چکے ہیں، نیز نظام محاصل میں یکسانی پیدا کرنے کے لیے بھی یہ اصلاح ضروری تھی۔

ابو یوسف نے اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر اس بات کی صراحت کی ہے کہ ان کے زمانے کے حالات کے پیش نظر سابق شرحوں کے مطابق متعین مقداروں میں خراج وصول کرنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ اب وہ شرحیں کاشتکاروں کے لیے قابل برداشت نہیں رہ گئی ہیں[3]۔ (باقی صفحہ ۶۲ پر)

---

[1] صفحہ ۱۳۰

[2] غالباً یہ دونوں قسمیں ایک ہی ہیں یعنی موسم گرما میں ہونے والی فصل دوالیہ کے ذریعہ سینچی جاتی تھی۔ ملاحظہ ہو محمد ضیاء الدین الریس الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ۔ صفحہ ۴۴۱

[3] کتاب الخراج صفحہ ۱۰۱

حکمت نبوی اور حسن اخلاق

بجناب محمد فاروق خاں صاحب

انسان ہمیشہ حقیقت کا متلاشی رہا ہے۔ تاریخ انسانی میں ایسا کوئی دور نہیں جب یہ دنیا ایسے لوگوں سے جو حق کے جویا ہوتے ہیں بالکل خالی رہی ہو۔ اس دنیا میں ہمیں جو کچھ ظاہری آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے اسی کو انسان نے سب کچھ سمجھ لیا ہو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ تاریک سے تاریک دور میں بھی انسان کسی نہ کسی مافوق الطبعی طاقت یا ہستی پر یقین رکھتا ہوا نظر آتا ہے۔ انسان نے ہمیشہ اس سچائی کے جاننے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو اس مادی دنیا کی پشت پر ہے۔ حقیقت کی تلاش میں انسان نے غور و فکر اور کاوشوں سے بھی کام لیا اور اس کے لیے اس نے بڑی سے بڑی ریاضتوں سے بھی گریز نہیں کیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی دنیا میں آج حق اور سچائی کی اگر کوئی آواز سنائی دیتی ہے تو وہ انسان کے اپنے ذاتی غور و فکر اور ریاضتوں کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ اُن برگزیدہ ہستیوں کا فیض ہے اور انھیں کی صدائے بازگشت ہے جنھیں دنیا نبی اور رسول کے نام سے یاد کرتی آئی ہے۔

ان بزرگوں نے جب اس بات کا اعلان کیا کہ انھیں حقیقت کا علم بخشا گیا ہے تو اس اعلان و اظہار سے اُن کے جس یقین کا پتہ چلتا ہے اس درجے کا یقین ہمیں دوسروں کے یہاں نہیں ملتا۔ یہ نمایاں وصف تمام ہی انبیاء علیہم السلام میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے جو کچھ فرمایا علم و یقین کی بنیاد پر فرمایا تخمین و گمان کو انھوں نے اپنا رہنما نہیں بنایا اور نہ انھیں اس کی کوئی ضرورت تھی کہ وہ قیاس و گمان کا سہارا لے کر اپنے خیالات کو ترتیب دیں۔ وحی الٰہی خود ان کی رہنما تھی سچائی خود اُن سے سرگوشی کرتی تھی۔ حقیقت خود انھیں اپنا مخاطب بنا رہی تھی۔ پھر وہ زندگی کی تعمیر کے لیے قیاسی فلسفوں کے محتاج کیسے ہو سکتے تھے۔ انھوں نے دنیا کو جو راستہ دکھایا وہی زندگی کی صحیح اور فطری راہ ہے۔ جس علم کے ساتھ وہ دنیا میں

مبعوث ہوئے وہی حقیقت کا علم ہے۔

اسلام جس کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں حقیقت کے جاننے اور انبیاء علیہم السلام کے دکھائے ہوئے راستے کی طرف رہنمائی حاصل کرنے کا وہی ایک مستند ذریعہ ہے اسلام وہ سرچشمۂ ہدایت ہے جس سے انسان اپنے ظرف کے مطابق علم و بصیرت کی روشنی حاصل کر سکتا ہے۔ علم و بصیرت کا متلاشی انسان اسلام سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

اسلام ہمارے احساسات اور لطیف تصورات کا ترجمان ہے۔ ہمارے فطری مطالبات کا صحیح ترین جواب اسلام ہے۔ اسلام نے فکر و عمل کا جو نظام پیش کیا ہے اس سے بہتر نظام ممکن نہیں ہے۔ اسلام انسان کو ہر قسم کی فکری و نظری اور اخلاقی گمراہیوں سے نجات دے کر اسے صحیح فکر و نظر اور صحیح اور پاکیزہ ترین ذوق و احساس سے آشنا کرتا ہے۔ وہ انسان کی فکری و عملی صلاحیتوں کو سلب نہیں کرتا۔ ذہن و فکر کے ارتقائی مراحل میں وہ انسان کی پوری رہنمائی کرتا ہے۔ اسلام انسان کو ایسے مقام پر دیکھنا چاہتا ہے جہاں پوری روشنی ہے جہاں تاریکی کا نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا۔ اسلام انسان کو اس حکمت سے نوازنا چاہتا ہے جو اس آسمان کے نیچے سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ یہی وہ دولت ہے جسے قرآن نے خیر کثیر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ حکمت کیا ہے اس کی تشریح مختلف انداز سے کی گئی ہے۔ اور ہر تشریح اپنی جگہ صحیح اور درست ہے۔ لسان العرب میں ہے :-

والحکمۃ عبارۃ عن معرفۃ افضل الاشیاء بافضل العلوم — حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ جاننے کو کہتے ہیں

کتب سابقہ میں بھی حکمت کی اہمیت پر پورا زور دیا گیا ہے

"حکمت کو ترک نہ کرنا وہ تیری حفاظت کرے گی۔ اس سے محبت رکھنا وہ تیری نگہبان ہوگی۔"

(امثال ۴:۶)

"جو حکمت حاصل کرتا ہے اپنی جان کو عزیز رکھتا ہے۔" ایضاً ۱۹:۸)

"چاندی کو نہیں بلکہ میری تربیت کو قبول کرو۔ اور کندن سے بڑھ کر علم کو کیونکہ حکمت مرجان سے افضل ہے اور سب مرغوب چیزوں میں بے نظیر۔" (ایضاً ۸:۱۰-۱۱)

جسے علم و حکمت کی دولت ملی اس نے نشاطِ حیات کو پا لیا۔ جو شخص علم و حکمت سے محروم رہا وہ حقیقی

زندگی سے محروم رہا۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے جہاں اور بہت سے مقاصد رہے ہیں وہیں ایک اہم مقصد ان کی بعثت کا یہ بھی رہا ہے کہ وہ اپنے پیروؤں کو اس علم و حکمت سے نوازیں جس سے خدا نے انھیں بہرہ مند فرمایا ہے۔ جسے حکمت ملی اس نے گویا ایک ایسی بصیرت حاصل کر لی جس کی روشنی میں وہ زندگی کے وسعت پذیر پہلوؤں میں رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ حکمت معانی اور قدروں کا مطالعہ اور حیات کی توجیہ و تعبیر ہے۔ حکمت کے بغیر انسان کو اپنی ذات سے بھی حقیقی واقفیت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے بغیر نہ تو شعور کو حقیقت تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور نہ ہم زندگی کے امکانات اور اس کی گہرائیوں سے واقف حاصل کر سکتے ہیں۔ حکمت انسان کو صرف زندگی کی حقیقی قدروں کا علم ہی نہیں بخشتی بلکہ وہ انسان کو صحیح معنوں میں تہذیب و اخلاق کے بلند مقام سے آشنا کرتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان محض جذبات اور ہیجان کی پیروی کرنے کے بجائے فہم و ادراک سے کام لینے لگتا ہے۔ اس کے احساسات میں ادراک کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ اس کی ہر کیفیت بصیرت میں تبدیل ہو جاتی ہے، اس کی زندگی اور عامیانہ زندگی میں مشرقین کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں انسان کے مختلف قسم کے احساسات اور جذبات میں باہم تضاد اور ناگوار بے آہنگی باقی نہیں رہتی، بلکہ وہاں انسان کے مختلف احساسات ایک احساس کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ زندگی کے اوراق وہاں بکھرے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ وہ باہم ملے ہوئے اور یکجا دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کو مکمل آسودگی اور حقیقی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

جب انسان زندگی کی عامیانہ سطح سے نجات پا لیتا ہے اور اسے زندگی کی حقیقی غرض و غایت کی پہچان ہو جاتی ہے تو پھر وہ دوسروں کو اپنی سطح پر لانے کی کوشش میں سرگرم نظر آنے لگتا ہے۔ علم و حکمت کے بغیر انسان تاریکی میں رہتا ہے۔ اس تاریکی سے نجات ممکن نہیں جب تک کہ انسان کو خود اس سے نجات حاصل کرنے کی فکر دامن گیر نہ ہو۔ دانائی (Wisdom) اور ہوش مندی کے علاوہ اخلاق کی پاکیزگی اور حسن ادب کا شمار بھی آثار حکمت میں ہوتا ہے۔ اہل عرب عقل و رائے کی پختگی اور شرافت اخلاق کی جامع قوت کو حکمت کا لقب دیتے تھے۔ اور ایسا شخص ان کے یہاں حکیم قرار پاتا تھا جو عاقل ہی نہیں بلکہ مہذب بھی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ——————

حکمت کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ علم و حکمت کا تقاضا ہے کہ خدا کے خوف کے ساتھ زندگی گزاری جائے۔ صحیح معنوں میں خدا سے ڈرنے والے وہی ہوتے ہیں جو خدا کی عظمت کو پہچانتے ہیں۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵ : ۲۸) اللہ سے اس کے بندوں میں وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

کتب سابقہ میں بھی اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

"خداوند کا خوف حکمت کی تربیت ہے" (امثال ۱۵ : ۱۲)

"دیکھ خداوند کا خوف ہی حکمت ہے اور بدی سے دور رہنا خرد ہے"

(ایوب ۲۸ : ۲۸)

"تکبر کے ساتھ رسوائی آتی ہے لیکن خاکساروں کے ساتھ حکمت ہے۔" (امثال ۱۱ : ۲)

علم وحکمت کا تقاضا ہی نہیں بلکہ عین حکمت یہ ہے کہ ہماری زندگی اپنے رب کی شکرگزاری میں بسر ہو۔ حضرت لقمن کے بارے میں قرآن میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکمت عطا فرمائی تھی وہ حکمت یہی تھی کہ انھیں اس بات کی تعلیم فرمائی گئی تھی کہ وہ اللہ کے شکرگزار بندے بنیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ (۳۱ : ۱۲) اور ہم نے لقمن کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر ادا کرو۔

خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارا یہ احساس بڑھ جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ علم وحکمت کا وافر حصہ عطا فرماتا ہے آدمی کے اندر جتنی زیادہ بصیرت ہوگی وہ اتنا ہی زیادہ آپ کے ارشادات کی روح سے آشنا ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے ارشادات ہی اس کے لیے آپ کے رسول برحق ہونے کی سب سے بڑی دلیل بن جائیں گے۔ آپ کا ہر ارشاد اور آپ کی زندگی کا ہر واقعہ معجزنما ہے۔ ادراک کے لیے فہم وبصیرت درکار ہے۔ آپ کے ارشادات ہمیں ان حقیقتوں کا علم بخشتے ہیں جو تغیرات سے ماورا ہیں۔ جب تک انسان کی زندگی ان حقیقتوں سے آشنا نہ ہوجائے انسان حقیقی زندگی کی لذت سے آشنا نہیں ہوسکتا۔ آزادی اس کا نام نہیں کہ آدمی اپنے کو خواہشات نفس کے حوالے کرکے انجام سے بے فکر ہوجائے۔ انسان کے لیے حقیقی آزادی یہ ہے کہ وہ ہر طرح کی گمراہیوں سے نجات پاکر زندگی کے فطری مطالبات پورے کرسکے۔ اسے گناہوں سے حذر محض عذاب کے خوف سے نہ ہو بلکہ سچائی کی محبت خود اُسے گناہوں سے بچنے پر مجبور کردے۔

ہم یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول نقل کرتے ہیں جو یہ اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو جو راستہ دکھایا ہے وہی زندگی کا سیدھا اور فطری راستہ ہے۔ علم و حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی خواہشات کو آپ کے لائے ہوئے احکام کے تابع کر دیں۔ آپ فرماتے ہیں :۔

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ (موطا امام مالک)

میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

حسنِ اخلاق کی تکمیل کو اپنی بعثت کا مقصد قرار دے کر آپ نے اس حقیقت کبریٰ کی جانب اشارہ فرمایا ہے کہ انسان کی زندگی ایک کُل ہے۔ یہ زندگی اپنا ایک بنیادی اور اصلی مفہوم رکھتی ہے۔ انسان کی کامیابی اسی بات میں مضمر ہے کہ اس کے سارے اعمال اور افعال اور اس کے جملہ حرکات و سکنات سے اسی بنیادی اور حقیقی مفہوم و معنی کا اظہار ہو۔ اس کے سارے ہی اعمال ایک حقیقی محرک کے تابع ہو جائیں۔ اخلاق کا تصور شعور اور ارادہ و اختیار کی آزادی کے بغیر ممکن نہیں حسنِ اخلاق سے مراد ارادہ و اختیار کا صحیح اور بہترین استعمال ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ انسان کو اپنی حقیقت اور اپنی زندگی کی اصل غرض و غایت کا علم حاصل ہو۔ اس کے لیے آدمی انبیاءؑ کی رہنمائی کا محتاج ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کو مختلف اکائیوں میں تقسیم کرنے کے بجائے ایک کُل قرار دیا ہے۔ رنگ و بو پھولوں کے لیے بار نہیں بنتے۔ حسن اخلاق بھی انسان کے لیے بار نہیں بلکہ اس کی زندگی کا حقیقی حسن و جمال ہے۔ زندگی میں دل کشی اور رعنائی اخلاق سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ پھولوں سے اگر رنگ و بو مطلوب ہے تو وجود انسانی سے جس بات کا مطالبہ ہے وہ حسن اخلاق کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث میں ہمدردی، غمخواری، دل سوزی وغیرہ جملہ اخلاقی محاسن کو عین ایمان اور اسلام قرار دیا گیا ہے۔ پھر اخلاق کا کامل اظہار اس حق کی ادائگی میں ہوتا ہے جسے ہم اللہ کا حق کہتے ہیں، جسے اس نے خود اپنے بندوں پر عائد فرمایا ہے۔ انسان مختلف قسم کے تعلقات میں جکڑا ہوا ہے۔ ان تعلقات کی بنا پر فطری طور سے اس پر مختلف قسم کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ ان حقوق کو ادا کرنا انسان کا اخلاقی فرض ہے۔ اخلاقی نقطہ نظر سے انسان پر سب سے پہلا اور سب سے بڑا حق اس کے خدا کا ہے۔ خدا کے حقوق کی ادائگی میں اس کی عبادت اور اطاعت وغیرہ ساری چیزیں داخل ہیں۔ خدا کے بعد بندگان خدا کے حقوق ہیں جن کا ادا کرنا انسان کے لیے ضروری ہے۔ بندگان خدا میں سب سے زیادہ حق والدین کا

اس لیے کہ ان کے احسانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر درجہ بدرجہ دوسرے لوگوں کے حقوق ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ تفصیل سورۂ النساء کی حسب ذیل آیت میں ملتی ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا	تم سب اللہ کی بندگی کرو اور اس کے
بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا	ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ والدین، قرابت
وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ	داروں، یتیموں، مسکینوں، پڑوسی رشتہ دار،
وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ	اجنبی ہمسایہ، پہلو کے ساتھی، مسافر اور جو تمہارے
وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ	قبضے میں (لونڈی، غلام) ہوں، سب کے ساتھ
وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا	نیک برتاؤ کرو۔ بلاشبہ اللہ کسی ایسے شخص کو
يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا (۴: ۳۶)	پسند نہیں کرتا جو مغرور اور ڈینگیں مارنے والا ہو۔

اس آیت میں اللہ کی بندگی کا حکم، والدین، اعزا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ نیک برتاؤ کا حکم دیتے ہوئے دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنا انسان کے لیے ایک اخلاقی اور فطری بات ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان سے اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت کا مطالبہ بھی ایک فطری مطالبہ ہے۔ از روئے قانون ہی نہیں بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی انسان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی بندگی میں لگا رہے۔ بلکہ سچے اور صحیح قوانین انسان کے اخلاقی رویے کی درستی کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ اگر انسان اپنے کو خدا کی بندگی سے آزاد رکھتا ہے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے تو حقیقت میں وہ خود اپنا مخالف اور اپنی فطرت کا دشمن ہے۔ انسان سے خدا نے اس سے زیادہ اہم کوئی مطالبہ نہیں کیا ہے کہ وہ اپنی فطرت کو پامال ہونے سے بچالے۔ اور اسے نشو ونما دے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا	بامراد ہوا وہ جس نے اسے (یعنی اپنے
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا	نفس کو) پاک کر کے اس کی نشو ونما کا موقع
(۹۱: ۹-۱۰)	فراہم کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

اپنے نفس اور اپنی فطرت کی محافظت کی ایک ہی شکل ہے وہ یہ کہ آدمی اپنی زندگی کو شرک اور کفر سے پاک رکھے۔ اگر کوئی کفر اور شرک میں اپنے کو ملوث کرتا ہے تو حقیقت میں وہ اپنی فطرت کو کچل رہا ہے اور اپنے اس نفس کو خاک میں ملا رہا ہے جو حقیقت میں خدا کی ایک امانت ہے۔

اخلاق کے جامع وسیع اور ہمہ گیر تصور کو قرآن میں مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نبی علیہ السلا
کے بارے میں ارشاد ہوا ہے :-

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ٥	بلا شبہ آپ اخلاق کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہیں

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ اخلاق کے اعتبار سے حد درجہ بلند ہیں۔ آپ کا ہر عمل اخلاق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ آپ اگر ایک طرف اپنے رب کے حد درجہ شکر گزار اور مطیع و فرماں بردار ہیں دوسری طرف بندگان خدا کے لیے آپؐ نہایت خلیق اور دردمند واقع ہوئے ہیں۔ آپؐ اخلاق کے جس بلند مرتبے پر فائز ہیں۔ اس کی بلندی اور عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اخلاق وکردا بھی ہمارے پیش نظر رہے جس کا مظاہرہ آپؐ کے مخالفین کی جانب سے ہو رہا تھا۔ زندگی میں اخلا محاسن کا پایا جانا رُشد و ہدایت کی دلیل اور انسان کا اخلاقی اوصاف سے عاری ہونا اس کی ضلالت گمراہی کا کھلا ہوا ثبوت ہوتا ہے۔ آپؐ کے مخالفین کا بدترین اخلاق اس بات کا پتہ دے رہا تھا کہ و ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں گرچہ وہ آپؐ ہی کو اُلٹے مفتوں قرار دے رہے تھے۔ فرمایا گ

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ	تمہارا رب اسے بھی بخوبی جانتا ہے جو اس
عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ	کی راہ سے بھٹک گیا اور وہ ہدایت یاب
بِالْمُهْتَدِينَ	لوگوں سے بھی بخوبی واقف ہے۔

اس کے بعد مخالفین کے بدترین اخلاق کی تصویر کشی خاص انداز سے کی گئی ہے :-

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ٥	تو تم تکذیب کرنے والوں کا کہنا نہ ماننا
وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ٥	یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم نرمی اختیار کرلو تو
وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ٥	یہ بھی نرم پڑجائیں۔ اور کسی ایسے شخص کا کہنا
هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ	ماننا جو بہت (جھوٹی) قسمیں کھانے والا بے وقعت
لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ٥ عُتُلٍّ	ہو۔ طعنے دینے والا ہو۔ چغلیاں کھاتا پھرتا ہو۔
بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ٥ أَن كَانَ	نیک کاموں سے روکنے والا، حد سے بڑھنے والا
ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ٥ إِذَا تُتْلَىٰ	گناہ کا ارتکاب کرنے والا ہو۔ سخت خو علاوہ
عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ	ازیں بدذات ہو۔ اس سبب سے کہ وہ مال

الْاَوَّلِیْنَ ٥ اور اولاد والا ہو۔ جب اسے ہماری آیتیں سنا

تو کہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کی بے سند باتیں ہیں

"خلق عظیم" کے مقابلے میں ان آیات میں حسن اخلاق کا ذکر کیا گیا ہے اس میں جہاں یہ بیان ہوا ہے کہ مخالفینِ رسول، شرافت اور انسانیت کے تقاضوں کو پس پشت ڈال رہے تھے وہیں ان کے اس بدترین سلوک کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے جو وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ ایک طرف اگر وہ بدمزاج، نیکیوں اور بھلائیوں کے دشمن اور کبر و نخوت میں مبتلا تھے تو دوسری طرف وہ اللہ کی آیتوں اور اس کے رسولؐ کی رسالت کی تکذیب بھی کر رہے تھے۔ اگر وہ اخلاق کے بلند مقام کو پا لیتے تو ان کی زندگی کامیاب اور بامراد ہو سکتی تھی۔ وہ خدا کے حقوق کا بھی پاس و لحاظ رکھتے اور بندگان خدا کے ساتھ بھی ان کا تعلق درست ہو جاتا۔

اوپر کی تشریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاق کو اگر انسان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے تو اسلام نے بھی اس کی بنیادی اہمیت کو باقی رکھا ہے بلکہ اسے اور زیادہ وسعت اور بلندی عطا کی۔ اسی طرح اسلام کی جملہ تعلیمات اور اس کے احکام میں بڑی وسعت اور بلندی پائی جاتی ہے۔ اب آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو کہ میری بعثت حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے پھر پڑھیے اور اس کی وسعت اور معنویت پر غور کیجیے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپؐ نے انسانوں کو جس علم و حکمت کی تعلیم دی ہے وہ ہر پہلو سے کامل ہے۔ اس میں کوئی بھی نقص نہیں پایا جاتا۔ آپ کی تعلیمات کا یہ وہ نمایاں وصف ہے جس کی بنا پر ہم آپؐ کو ایک عظیم رہنما ہی نہیں ایک حکیم و دانا بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اور یہ سارے اوصاف ایک وصف رسالت ہی کے لازمی اجزا ہیں۔ وہ حضرات جو علم و بصیرت کے متلاشی ہوں، ان سے میں گزارش کروں گا کہ وہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رہنما بنا کر زندگی اور اس کے مسائل پر غور فرمائیں۔ خواہ وہ مسائل فکر و نظر سے متعلق ہوں یا ان کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہو۔ عملی زندگی میں انسان کے انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کے اعمال و کردار شامل ہیں۔ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں انسان وہ سب کچھ حاصل کر سکتا ہے جس کا فی الواقع وہ ضرورت مند ہے اور جس کی طلب فطری طور پر انسان کو ودیعت فرمائی گئی ہے۔

قرآنی تعلیمات:-

عدت

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

شریعت نے عورت کو یہ حکم دیا ہے کہ اگر اس کو طلاق دیدی جائے یا اس کا شوہر مرجائے تو وہ کچھ دنوں تک اپنے آپ کو روکے رکھے۔ اس مدت انتظار کو اصطلاح میں "عدت" کہا جاتا ہے۔

عدت کے کئی اہم شرعی مقاصد ہیں۔ ایک اہم مقصد تو یہ ہے کہ اگر شوہر نے کسی وقتی غصے سے متاثر ہو کر یہ اقدام کیا ہے تو اس مدت میں اس کو سوچنے کا موقع مل جائے اور وہ اپنے فعل پر نادم ہو کر رجوع کرے کیونکہ شریعت اسلامی کا منشا یہ ہے کہ جن دو افراد میں ایک بار ازدواجی تعلق قائم ہو جائے وہ عمر بھر تک اپنی تمام خوش گواریوں کے ساتھ قائم رہے، یہی وجہ ہے کہ عدت کی پوری مدت میں شوہر کو یہ اختیار حاصل رہتا ہے کہ وہ جب بھی چاہے اپنی مطلقہ بیوی سے بغیر نکاح کیے پھر زوجیت کے تعلقات قائم کرلے۔ الا یہ کہ عورت کو تین طلاقیں دے کر مرد اپنا یہ حق خود ہی کھو بیٹھے۔

دوسرا اہم اخلاقی مقصد یہ ہے کہ عورت اپنے بچھڑے ہوئے رفیق حیات کی جدائی کا غم اور سوگ منائے۔ اور اگر اس کی طرف سے کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو وہ اپنی روش میں تبدیلی کر کے شوہر کو پھر رجعت پر آمادہ کرلے۔

تیسرا مقصد یہ ہے کہ اس مدت میں اس بات کا بھی اطمینان ہو جائے کہ عورت حاملہ ہے یا غیر حاملہ، تاکہ اولاد کا نسب مشتبہ نہ ہو۔ کیونکہ ثبوت نسب پر اولاد کے اخلاقی مرتبہ کا بھی انحصار ہے اور حق وراثت کا بھی۔

ایک چوتھا اہم مقصد یہ بتانا بھی ہے کہ نکاح و طلاق محض ایک معاشرتی معاملہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک دینی اور شرعی معاملہ بھی ہے، شوہر اور اولاد کے حقوق کی حفاظت ایک شرعی فریضہ ہے، اور عدت شریعت اسلامی کا عائد کردہ ایک حق ہے، اس لیے اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو یہ پروانہ بھی لکھ دے کہ

میرے مرنے کے بعد یا مجھ سے طلاق لینے کے بعد عورت پر میری طرف سے کوئی عدت نہیں ہے، تب بھی شریعت اسلامی اس حق کو کسی طرح ساقط نہ کرے گی۔

عورت کے حالات کے لحاظ سے عدت کی بھی مختلف مدتیں اور نوعیتیں ہیں بعض عدتوں میں تو یہ تمام مقاصد بیک وقت پائے جاتے ہیں اور بعض میں ان میں سے کچھ پائے جاتے ہیں۔

عدت کی مدت

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (البقرہ ۲۲۸)

اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ تین قروء تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قروء سے مراد حیض ہیں اور امام شافعیؒ اس سے ایام طہر مراد لیتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں عام طور پر تقریباً تین ماہ کی مدت ہوتی ہے[1]۔

غیر حائضہ کی مدت عدت

وَالّٰٓـئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓـئِیْ لَمْ یَحِضْنَ (الطلاق ۲۸)

اور وہ عورتیں جو (بڑھاپے کی وجہ سے) حیض آنے سے نا امید ہو چکی ہیں اگر تم کو (ان کی عدت کی تعیین میں) شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور (اسی طرح ان عورتوں کی مدت عدت بھی تین مہینہ ہے) جن کو (کم عمری کی وجہ سے) حیض نہیں آتا۔

حاملہ کی عدت

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق ۴)

اور حمل والی عورتوں کی مدت عدت یہ ہے کہ بچے کی ولادت ہو جائے۔

بیوہ کی عدت

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (البقرہ ۲۳۴)

اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں ان کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں، تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے، دس دن روکے رکھیں۔

یہ حکم اس بیوہ کا بھی ہے جس سے شوہر نے مباشرت کی ہو اور اس بیوہ کا بھی ہے جس کو شوہر نے

---

[1] باندی کی مدت عدت نصف ہے، حیض آنے کی صورت میں دو مرتبہ ایام ماہواری ہو اور حیض نہ آنے کی صورت میں صرف ڈیڑھ ماہ کی مدت ہے۔

ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور مر گیا ہو۔

حاملہ اپنے پیٹ کا راز نہ چھپائے

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

اور (طلاق یافتہ عورتوں کے لیے) یہ جائز نہیں کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو کچھ خلق فرمایا ہے اس کو چھپائیں، انہیں ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہیں۔

اگر کوئی عورت اپنے حمل کو اس لیے چھپائے کہ وضع حمل میں ابھی زیادہ مدت باقی ہے، اور وہ ایام ماہواری سے اپنی عدت شمار کرکے جلد فارغ ہونا چاہتی ہے تو یہ سخت گناہ بھی ہے اور اس طرح عدت بھی پوری نہ ہوگی۔ حاملہ کو چاہے طلاق دی گئی ہو یا اس کا شوہر مر گیا ہو بہر صورت اس کی عدت وضع حمل ہی ہے اور وضع حمل تک اسے رکنا ہی پڑے گا۔

خلوت سے محروم عورت کی عدت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ (الاحزاب ۴۹)

اے مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں جس کے پورا کرنے کا تم مطالبہ کرسکو لہٰذا انہیں کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کردو۔

ہاتھ لگانے سے مراد مباشرت ہے، مباشرت کیے بغیر ہی اگر طلاق دے دی گئی ہے، تو اب مرد کو رجوع کا حق نہیں ہے۔ طلاق کے فوراً بعد عورت جس سے چاہے نکاح کرسکتی ہے، مگر یہ صرف اس عورت کا حکم ہے جس کو مباشرت سے پہلے طلاق دی گئی ہو، اور اگر مباشرت سے پہلے عورت کے شوہر کا انتقال ہو جائے تو اس کو وہی چار مہینے اور دس دن کی عدت گزارنی ہوگی۔

عدت کے ایام گنتے رہو

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ (الطلاق ۱)

اے نبی! (مسلمانوں سے کہہ دیجیے) کہ جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو تو زمانۂ عدت سے پہلے طلاق دو اور عدت کے دن گنتے رہو۔

"عدت کے دن گنتے رہو" اس حکم میں اگرچہ مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے لیکن خطاب مرد و
ت دونوں سے ہے البتہ اس میں یہ اشارہ ضرور ہے کہ چونکہ عورت بھول اور غفلت میں زیادہ
ا ہوتی ہے اس لیے ایام عدت کے شمار کا مرد خصوصی اہتمام کریں۔

طلقہ کے ساتھ سلوک مطلقہ عورتوں سے اگرچہ ایک حد تک شوہر کا تعلق ختم ہو جاتا ہے لیکن اسلام نے ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ اور
لیم تر مصلحتوں کی بنا پر ان کے بھی کچھ حقوق رکھے ہیں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کیسا انسانیت
از، اخلاق پسند اور عادلانہ نظام حیات ہے۔ اور انسانی سوسائٹی کے لیے سایۂ رحمت ہے۔

عدت تک گھر میں رکھو

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ (الطلاق ۶)

تم (اپنی مطلقہ عورتوں کو عدت گزارنے کے لیے) اپنی وسعت کے مطابق مکان میں وہاں رکھو جہاں تم رہتے ہو۔

عدت میں ایذا نہ پہنچاؤ

وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ (الطلاق)

اور (عدت کے دوران) ان کو تنگ کرنے کے لیے ایذا نہ پہنچاؤ۔

دورانِ عدت ان کو گھر سے نہ نکالو

وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِن بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ (الطلاق ۱)

اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے، نہ تو تم ان مطلقہ عورتوں کو گھروں سے نکالو اور نہ وہ خود ہی اپنے گھروں سے نکلیں۔

بے حیائی کریں تو نکال دو

إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (الطلاق)

ہاں اگر وہ کھلی بے حیائی کرنے لگیں (تو دوسری بات ہے۔)

کھلی بے حیائی سے مراد زناکاری ہے "کھلی بے حیائی" میں چوری، زبان درازی اور
لڑنا جھگڑنا بھی داخل ہے۔

گھر سے رخصت کرتے وقت رخصتانہ دیا جائے

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى

اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو ان کو معروف دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ دیا

الْمُتَّقِيْنَ ○ (البقرۃ ۲۴۱) — جائے۔ یہ متقیوں پر لازم ہے۔

مطلقہ حاملہ کا خرچ برداشت کرو

وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق) — اور اگر (یہ مطلقہ) عورتیں حمل والی ہوں تو بچہ پیدا ہونے تک ان کا خرچ دیتے رہو۔

دودھ پلانے کا معاوضہ دو

فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (الطلاق) — پھر اگر وہ بچے کو تمہارے کہنے سے دودھ پلائیں تو ان کو اس کا معاوضہ دو۔

عدت کے بعد انہیں نکاح سے نہ روکو

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○ (البقرۃ ۲۳۴) — پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں پورا اختیار ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں جو چاہیں فیصلہ کریں تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں اللہ تعالیٰ ہر ایک کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے۔

یعنی عدت گزرنے کے بعد عورت کو پوری آزادی ہے جہاں چاہے اپنا نکاح کرے۔ کسی کو ان کی یہ آزادی سلب کرنے کا حق نہیں اور نہ ان کے فعل کی ذمہ داری کسی پر ہے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا — اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو پھر اس میں رکاوٹ نہ ڈالو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کرلیں، جب کہ وہ معروف دستور کے مطابق آپس میں نکاح کرنے پر رضامند ہو جائیں تمہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تمہارے لیے (ظاہر و باطن ہر لحاظ سے) شائستہ اور پاکیزہ

تَعۡلَمُوۡنَ ○ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو۔ اللہ (خوب) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

(البقرۃ ۲۳۲)

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی عورت کو اس کے شوہر نے طلاق دی اور عدت کے دوران رجوع نہ کیا پھر جب عدت گزر گئی تو یہ دونوں آپس میں دوبارہ نکاح کرنے کے خواہش مند ہیں تو عورت کے رشتہ داروں کو ہرگز اس نکاح میں رکاوٹ نہ ڈالنی چاہیے نیز اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اگر کسی عورت کو طلاق دی گئی اور اس کی عدت گزر گئی اب وہ عورت اپنے پہلے شوہر سے آزاد ہو کر کسی اور جگہ اپنا نکاح کرنا چاہتی ہے ــــــ تو اس کے سابق شوہر کو یہ گھٹیا حرکت ہرگز نہ کرنی چاہیے کہ اس کے نکاح میں رکاوٹ ڈالے اور یہ ناروا کوشش کرے کہ جس عورت کو اس نے چھوڑا ہے اس کو کوئی دوسرا بھی اپنے نکاح میں قبول نہ کرے۔

دیا ہوا مال ان سے واپس نہ لو

وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ أَنۡ تَأۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـًٔا

(اور مطلقہ عورتوں کو رخصت کرتے ہوئے) تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو۔

(البقرۃ ۲۲۹)

مطلقہ بیویوں کو جو مہر، زیور، کپڑے اور مال وغیرہ ان کے شوہر دے چکے ہیں ان میں کوئی چیز بھی ان کو واپس لینے کا حق نہیں ہے۔

اسلام نے جن اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی تعلیم دی ہے اس کی رو سے تو یہ بات ویسے بھی انتہائی مکروہ ہے کہ ایک شخص جو چیز کسی کو ہبہ کر چکا ہے یا تحفہ میں دے چکا ہے اس کو پھر واپس لے۔ حدیث میں اس ذلیل حرکت کو کتے کے اس فعل سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنی قے خود چاٹ لے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ ایک شوہر کے لیے تو یہ بات انتہائی شرمناک ہے کہ وہ مطلقہ بیوی کو رخصت کرتے وقت اس سے وہ سب کچھ رکھوا لینا چاہیے جو اس نے خود ہی کبھی اسے دیا تھا۔ اس کے برعکس اسلام کی ہدایت تو یہ ہے کہ مطلقہ عورتوں کو کچھ اور دے دلا کر شریفانہ رخصت کرو۔ یہ وہ عورتیں ہیں جو ایک عرصہ تک تمہارے ساتھ رفاقت کی زندگیاں گزار چکی ہیں۔

بیوہ کے ساتھ سلوک

جن عورتوں کے شوہر مر چکے ہوں اور وہ بے کسی کی زندگیاں گزار رہی ہوں انسانی معاشرے میں یہ سب سے زیادہ رحم و سلوک کی مستحق ہیں

مختلف ادوار میں ہمیشہ انسانی معاشروں نے ان کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا ہے اور انہیں نہایت ذلت کے ساتھ انسانی حقوق سے محروم کیا ہے۔ قرآن نے ان کے حقوق کی بھی حفاظت کیا ہے اور عادلانہ ہدایت کے ساتھ انہیں سوسائٹی میں عزت بخشی ہے۔

بیوہ کو اپنی میراث نہ سمجھو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا (النساء ۱۹)

اے مومنو! تمہارے لیے ہرگز جائز نہیں کہ تم زبردستی (بیوہ) عورتوں کو اپنی میراث بنا لو۔

مطلب یہ ہے جب کسی عورت کا شوہر مرجائے تو شوہر کے خاندان والے اس کے ولی وارث نہ بن بیٹھیں۔ جب اس کا شوہر مرگیا تو وہ پوری طرح آزاد ہے جہاں چاہے اور جس سے چاہے اپنا نکاح کرے۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ اس پر اپنا اختیار چلائے یا اس کے زیر تجویز نکاح میں رکاوٹ ڈالے

ان کا مال ہتھیانے کی کوشش نہ کرو

وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ (النساء ۱۹)

اور (نہ تمہارے لیے یہ بات جائز ہے) کہ انہیں تنگ کرکے ان کا وہ مال ہتھیانے کی کوشش کرو، جو تم انہیں دے چکے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد تو یہ بے کس اور زیادہ رحم وسلوک کی مستحق ہوگئی ہے نہ یہ کہ شوہر نے اپنی زندگی میں جو مہر اور مال اس کو دیا تھا تم الٹا اسی کو ہتھیانے کی ذلیل حرکت کرنے لگو

بیوہ کا نکاح کردو

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ (النور ۳۲)

اور تم میں جو عورتیں بیوہ ہوں ان کے نکاح کردو

ایک بے سہارا بیوہ کے ساتھ سب سے بڑا سلوک یہ ہے کہ اس کے لیے صالح جوڑا تلاش کرکے اس کو حصار نکاح میں محفوظ کردیا جائے۔ کیونکہ ایک عورت کا حقیقی نگراں، محافظ اور معاون ایک صالح شوہر ہی ہو سکتا ہے۔

رضاعت

رضاعت کا مطلب دودھ پلانا ہے۔ اگر سوء اتفاق سے زوجین ایک دوسرے سے علیحدہ

ہو جائیں خواہ طلاق کے ذریعہ سے یا خلع کے ذریعے سے اور عورت کی گود میں دودھ پیتا بچہ ہو تو اس کی رضاعت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے قرآن نے اس مسئلے کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔

دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ (البقرۃ ۲۳۳)	اور جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدت رضاعت دودھ پیے تو ماؤں کو چاہیے کہ کامل دو سال تک دودھ پلائیں۔

یہ حکم اس صورت میں بھی ہوگا جب شوہر نے طلاق دی ہو اور اس صورت میں بھی ہوگا جب شوہر مر چکا ہو۔

دو سال سے پہلے دودھ چھڑایا جا سکتا ہے

فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا (البقرۃ ۲۳۳)	اگر ماں باپ دونوں باہمی رضامندی اور مشورے سے دو سال سے پہلے) دودھ چھڑانا چاہیں تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

رضاعت کے معاملے میں فریقین کو باہم موافقت کی تاکید

فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوفٍ وَإِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ (الطلاق ۶)	پھر اگر وہ (مطلقہ) عورتیں تمہارے کہنے سے تمہارے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کو اس کا معاوضہ دو۔ اور (بچے کی رضاعت کے معاملے میں) پسندیدہ طریقے پر باہم موافقت رکھو۔ اور اگر تم باہم ضد اور (نااتفاقی) کرنے لگو (اور ماں انکار کر دے) تو باپ کے کہنے سے کوئی اور عورت دودھ پلائے گی۔

مطلب یہ ہے کہ آپس کی ضد اور کشاکش میں بچے کی زندگی خراب نہ کرو۔ بچہ تو دونوں کی اولاد ہے اور دونوں کی محبت کا مرکز، دونوں کو چاہیے کہ اس کے معاملے میں اچھا طریقہ اختیار کریں اور باہمی موافقت کے ساتھ اس کی پرورش کا اچھا انتظام کریں۔ ماں کو یہ سوچنا چاہیے کہ اگر میں عدد

پلانے سے انکار کروں گی تو اس کا اثر کس پر پڑے گا باپ تو کسی اور عورت کا انتظام بہر حال کرے گا لیکن میرے بچے کو میرا دودھ نہ مل سکے گا۔ باپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ مجھے بہر حال اس کے دودھ پلانے کا معاوضہ دینا ہی ہے تو پھر میں اس کو اس کی گود میں کیوں نہ ڈالوں جو ہر وقت اس پر شفقت و محبت کی نگاہ ڈالے۔

دایہ سے دودھ پلوایا جاسکتا ہے

وَإِنْ أَرَدْتُّمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ (البقرۃ ۲۳۳)

اور اگر تمہارا ارادہ اپنی اولاد کو کسی غیر عورت سے دودھ پلوانے کا ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس سے کچھ معاوضہ طے کر لو اور وہ معروف طریقے پر ادا کر دو۔

یعنی اگر ماں دودھ نہ پلانا چاہے تو معاوضہ دے کر کسی اور عورت سے بھی دودھ پلوایا جا سکتا ہے۔

دودھ پلانے والی کا روٹی کپڑا باپ کے ذمہ ہے

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ

اور دودھ پلانے والیوں کا روٹی کپڑا معروف طریقے کے مطابق بچے کے باپ کے ذمہ ہے۔

باپ نہ ہو تو بچے کا ولی ذمہ دار ہوگا

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ (البقرۃ ۲۳۳)

دودھ پلانے کا یہ حق جس طرح بچے کے باپ پر ہے اسی طرح اس کے وارث پر بھی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر باپ کا انتقال ہو جائے تو اس کی جگہ بچے کا جو ولی ہوگا اس کو یہ حق ادا کرنا ہوگا۔

فریقین ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے کی نہ ٹھانیں

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ (البقرۃ ۲۳۳)

کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے۔ نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔

بچہ ماں اور باپ دونوں کا ہے اس لیے بچہ کی وجہ سے فریقین کسی بے جا دباؤ نہ ڈالیں اور خواہ مخواہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی نہ ٹھانیں۔ اگر باپ نادار ہے تو ماں کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ بچے کے باپ سے اتنا معاوضہ لے جو اس کی وسعت اور مقدرت سے باہر ہو اور وہ خواہ مخواہ بچہ کی وجہ سے پریشانی میں پڑے اور اگر باپ مالدار ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی وسعت اور حیثیت کے مطابق دودھ پلانے کا معاوضہ دے اور کم سے کم معاوضہ دے کر بچے کی ماں کو پریشان نہ کرے۔ پھر فریقین کے خاندان والوں کو بھی اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ بچے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو نقصان اور تکلیف نہ پہنچائیں۔

منہ بولا بیٹا

منہ بولے بیٹے کو متبنّٰی کہتے ہیں۔ متبنّٰی کے بارے میں بھی عرب میں بہت سی غلط باتیں رائج تھیں جاہلی معاشرے میں منہ بولا بیٹا اس شخص کا حقیقی بیٹا سمجھا جاتا تو اس کو اپنا متبنّٰی بناتا۔ اسی کی طرف اس کی نسبت کی جاتی، معاشرتی زندگی میں اس کو وہی حیثیت حاصل ہوتی جو حقیقی بیٹے کی ہوتی ہے، اور اس کو حقیقی بیٹوں ہی جیسے حقوق دیے جاتے اور انہیں جیسا سلوک بھی کیا جاتا۔ قرآن حکیم نے معاشرتی اصلاح کے ذیل میں ان تمام غلط خیالات کی تردید فرمائی اور معاشرے میں منہ بولے بیٹے کی صحیح حیثیت اور واقعی مقام متعین فرمایا۔

منہ بولے بیٹے کی حیثیت

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ (الاحزاب)

اور خدا نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا ہے یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم اپنے منہ سے نکال دیتے ہو

مطلب یہ ہے کہ اگر تم کسی کو اپنا بیٹا کہہ دو تو محض تمہارے کہنے سے وہ تمہارا بیٹا نہیں بن جاتا اس لیے معاشرتی زندگی میں نہ ان کا وہ مقام ہے جو حقیقی بیٹوں کا ہوتا ہے اور نہ ان کے بیٹوں جیسے حقوق ہیں۔

ان کی نسبت حقیقی باپ کی طرف کی جائے

ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ

منہ بولے بیٹوں کو ان کے حقیقی باپوں کی نسبت سے پکارو۔ خدا کے نزدیک یہ

اللّٰہِ (الاحزاب ۵) بات زیادہ منصفانہ ہے

حضرت زیدؓ کو لوگ زید بن حارثہ کہنے کے بجائے زیدؓ بن محمدؐ کہتے تھے۔ اس حکم کے آ جانے کے بعد سب سے پہلے جو اصلاح نافذ کی گئی وہ یہ تھی کہ حضرت زید کو ۔ زید ابن محمد کہنے کے بجائے ان کے حقیقی باپ کی نسبت سے زید بن حارثہ کہنا شروع کر دیا گیا۔

اور اس آیت کے نزول کے بعد یہ بات حرام قرار دے دی گئی کہ کوئی شخص اپنے حقیقی باپ کے سوا کسی اور کی طرف اپنا نسب منسوب کرے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ "جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا کہا اور وہ جانتا ہو کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں ہے اس پر جنت حرام ہے"۔ اسی طرح کی اور احادیث بھی ہیں جن میں اس فعل کو سخت گناہ قرار دیا گیا ہے۔

متبنّٰی دینی بھائی ہے اگر اس کا باپ معلوم نہ ہو

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا	اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون
اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ	ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور
فِی الدِّيْنِ (الاحزاب ۵)	رفیق ہیں ۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تب بھی یہ جائز نہیں کہ ان کا نسب خواہ مخواہ کسی سے ملاؤ۔ اس صورت میں ان کو اپنا دینی بھائی اور رفیق سمجھو۔

پیار میں بیٹا کہنے کا حکم

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ	اور جو بات تم نادانستہ کہہ بیٹھو
جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ	اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے
بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ	ہاں اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا
قُلُوْبُكُمْ (الاحزاب ۵)	تم دل سے ارادہ کرو۔

یعنی کسی کو پیار سے بیٹا کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ اسی طرح اگر محض اخلاقاً کسی کے لیے ماں، بیٹی، بہن، بھائی وغیرہ الفاظ استعمال کر لیے جائیں تو کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن دلی ارادے کے ساتھ کسی کو بیٹا یا بیٹی وغیرہ کہنا اور پھر اس کو واقعی وہی حیثیت دے دینا ہے جو ان رشتوں کی ہے اور اس کے لیے وہی حقوق سمجھنا جو ان رشتوں کے ہیں اور ان کے ساتھ ویسے ہی تعلقات رکھنا جیسے ان رشتہ داروں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ یقیناً قابل اعتراض ہے اور اس پر گرفت ہوگی ۔

اخبار واف کار :۔

مذہب کی قوّت

ہندستان کے سب سے زیادہ مقبول عام لیڈر اور سب سے زیادہ معتمد وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی موت ہمارے ملک کا ایک بڑا حادثہ ہے۔ اس حادثے کا سب سے سنگین پہلو یہی ہے کہ اب ملک میں کوئی ایسی شخصیت باقی نہیں رہی جسے وہ قبول عام اور اعتماد حاصل ہو جو نہرو جی کو حاصل تھا۔ مرنے والے میں جو خوبیاں اور خامیاں تھیں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا لیکن ایک بات ایسی ہے جس سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہو، وہ یہ کہ پنڈت جی اپنے ملک کے پرستار تھے، ان کی زندگی کا نصب العین یہ تھا کہ بھارت خوش حالی، صحت و فراغت، بلند معیار زندگی اور ہر طرح کی مادی ترقی میں اس قدر آگے بڑھ جائے کہ دنیا کے کسی ملک سے پیچھے نہ رہے۔ یہی چیز ان کے تمام افکار و خیالات اور ان کی تمام سرگرمیوں کا مرکز و محور تھی، وہ بڑے مخلص وطن پرست تھے، یہی وجہ ہے کہ اپنے ملک کے "بے تاج بادشاہ" ہونے کے باوجود شاید سب سے زیادہ محنت اور سب سے زیادہ کام کرنے والے وزیر تھے، پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے کا احساس ان کے مزاج کا جزو بن گیا تھا، ڈیوٹی انجام دینے میں سستی اور کاہلی کا شاید وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، اخبارات میں ان کے جو آخری الفاظ شائع ہوئے ہیں وہ ان کے مزاج کا صحیح پتہ بتلاتے ہیں،

"نئی دہلی۔ ۲۹ مئی

آج پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں تمام جماعتوں کے تعزیتی جلسے کو بتایا گیا کہ مرحوم وزیر اعظم نہرو کے آخری الفاظ کیا تھے، انھوں نے کہا تھا۔ "میں نے تمام فائل اور کاغذ نپٹا دیے ہیں"۔

یہ انکشاف وزیر اعظم گلزاری لال نندا نے کیا۔ مرحوم وزیر اعظم معالجوں کی ہدایت کے خلاف اپنی بیماری کے تمام کاغذات دیکھتے تھے اور ان کو بر وقت نپٹا دینے پر اصرار کرتے تھے۔

ان کی اسی مخلصانہ کارکردگی اور وطن پرستی نے ان کو قبولیت عام عطا کی تھی۔ انہیں اپنی اس قبولیت عام کا احساس بھی تھا اور اس کو باقی رکھنے کی کوشش انھوں نے زندگی کے آخری لمحے تک کی۔ مرنے کے بعد ان کی

اُدھی یا بوران کی لاش کے ساتھ مذہبی لحاظ سے وہ سب کچھ کیا گیا جو گاندھی جی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ راقم الحروف نے یہ نوٹ دراصل اسی پہلو کی طرف توجہ دلانے کے لیے لکھا ہے۔ خدا اور مذہب کے بارے میں ان کے جو خیالات تھے وہ سب کو معلوم ہیں لیکن مذہب، مذہبی مراسم اور مذہبی روایات کی قوت کا حال یہ ہے کہ ان کے ماڈرن اور مہذب خاندان نے مذہبی روایات کے ایک ایک جزئیے پر عمل کرنا ضروری سمجھا اور اس کے التزام پر اپنے آپ کو مجبور پایا۔ اس سلسلے کی ایک خبر میں یہاں نقل کرتا ہوں:۔

"نئی دہلی:۔ ۳۰ مئی ـــــ وزیراعظم نہرو کے پھول بصد احترام آج صبح یہاں راج گھاٹ کے قریب اس مقام سے چن لیے گئے جہاں ان کے جسد خاکی کو نذر آتش کیا گیا تھا۔

مسز اندرا گاندھی، مسز وجے لکشمی پنڈت، مسز کرشنا ہتھی سنگھ اور نہرو خاندان کے دوسرے لوگ اس مقام کے قریب جہاں ان کا داہ سنسکار ہوا تھا پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ مسٹر نہرو کے دونوں نواسوں راجیو اور سنجے نے ہندو رسم کے مطابق پھول چننے سے پہلے ان پر گنگا جل اور دودھ چھڑکا۔

صدر رادھا کرشنن، وزیراعظم نندا، مسٹر لال بہادر شاستری اور مسٹر کامراج تعظیم کے ساتھ خاموش کھڑے ہوئے تھے اور مرحوم نہرو کے دونوں نواسے پھول چن چن کر مٹی کے آٹھ برتنوں میں جمع کر رہے تھے۔ کئی ہزار آدمی جو صبح سویرے ہی سے وہاں جمع ہو گئے تھے آواز ملا کر رام دھن اور بھجن گا رہے تھے ...... نہرو جی کے نواسے جس وقت ان کے پھول چن رہے تھے۔ مولوی اور پنڈت وغیرہ قرآن کی سورتیں پڑھ رہے تھے اور رامائن، گیتا اور گرنتھ صاحب کا پاٹھ کر رہے تھے۔" (قومی آواز ۳۱ مئی ۱۹۶۴ء)

معلوم نہیں، بائبل کا ذکر اخبار میں چھوٹ گیا ہے، یا کوئی پادری اس کے لیے تیار نہ ہوا۔ بہرحال ہندستان کے تین بڑے مذہبوں کی مذہبی کتابوں کے "فیوض و برکات" اس شخص کی روح کو پہنچائے جا رہے تھے جس نے اپنی زندگی میں کہا تھا کہ اسے اخروی نجات کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہے مذہب اور مذہبی روایات کی وہ قوت جس کا مظاہرہ نہرو جی کی موت کے بعد خود انہیں کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے کیا گیا۔

مذہب اور مذہبی روایات سے چمٹے رہنے والوں پر رجعت پرستی کے طعنے کس طرح خود ان لوگوں پر پلٹتے رہتے ہیں! عجب طعنے دیتے ہیں۔

ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن تو خیر ہے ہی ایک مکمل دستورِ حیات، گیتا اور گرنتھ صاحب میں بھی زندگی کو سنوارنے کی بہت سی دینی و اخلاقی ہدایات موجود ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ ہندستان کے سربراہ کار ان ہدایات کو اپنی زندگیوں کی تطہیر اور ملک کی تعمیر میں استعمال کرتے۔ ان کتابوں کو صرف مرنے کے بعد استعمال کرنے کے لیے مخصوص کر دینا نہ مفید ہے نہ معقول۔

مجلس شوریٰ کی روداد

منعقدہ ۱۵ مئی تا ۲۱ مئی ۱۹۶۴ء

الحمدللہ کہ مجلس شوریٰ کا سالانہ اجلاس مرکز جماعت واقع دہلی میں زیر صدارت مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی بتاریخ ۱۵ مئی ۶۴ء بعد نماز جمعہ ۳ بجے سہ پہر سے شروع ہو کر ۲۱ مئی ۶۴ء کو رات کے آخری حصے میں بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔ حسب ذیل ارکان شوریٰ نے اجلاس میں شرکت فرمائی۔

۱۔ جناب کے سی عبداللہ صاحب (کیرلا) ۲۔ مولانا شمس پیرزادہ صاحب (بمبئی) ۳۔ جناب عبدالرزاق صاحب لطیفی (حیدرآباد) ۴۔ مولانا نظام الدین صاحب (بھوپال) ۵۔ جناب انیس الدین احمد صاحب (بہار) ۶۔ جناب محمد عبدالحی صاحب (رامپور) ۷۔ جناب محمد نجات اللہ صاحب صدیقی (علیگڈھ) ۸۔ جناب محمد شفیع مونس صاحب (میرٹھ) ۹۔ مولانا سید حامد علی صاحب (میرٹھ) ۱۰۔ مولانا سید احمد عروج قادری صاحب (مرکز رامپور) ۱۱۔ جناب افضل حسین صاحب (مرکز رامپور) ۱۲۔ جناب محمد مسلم صاحب (مرکز دہلی) ۱۳۔ جناب سید حامد حسین صاحب (مرکز دہلی) ۱۴۔ محمد یوسف (قیم جماعت)

مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی (مرکز رامپور) اپنی خانگی مجبوریوں کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہو سکے۔

اجلاس کا افتتاح تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ اس کے بعد امیر جماعت نے اجلاس کا باقاعدہ افتتاح کرتے ہوئے فرمایا۔

مجلس شوریٰ کا یہ اجتماع ہماری نئی میقات کا پہلا باقاعدہ اجتماع ہے جو اس وقت معمول کے مطابق بطور سالانہ اجتماع کے منعقد ہو رہا ہے لیکن دو خاص باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر اس اجتماع کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

پہلی بات وہ حالات ہیں جن کے اندر یہ منعقد ہو رہا ہے۔ آپ سب حضرات اس سے واقف ہیں کہ

پچھلے دنوں ہندستان کے مختلف علاقوں میں نہایت سخت اور ہولناک فسادات ہوئے ہیں جن میں مسلمانوں کو عظیم جانی ومالی نقصانات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس صورت حال کا یہ اولیں تقاضا ہے کہ اس موقع پر ہم اپنے تباہ حال اور مظلوم بھائیوں کو مدد پہنچانے کے لیے آگے بڑھیں۔ چنانچہ بہت پہلے جماعت کی طرف سے ریلیف کا کام شروع کیا جا چکا ہے اور ہمارے بس میں جو کچھ ہے اس کے مطابق یہ خدمت انجام دی جا رہی ہے لیکن اس وقت مسئلہ صرف ریلیف پہنچانے ہی کا نہیں ہے بلکہ اس سے اہم اور مشکل مسئلہ یہ ہے کہ ان فسادات نے ہندستان کے عام مسلمانوں اور بالخصوص فساد زدہ علاقوں کے مسلمانوں کے دماغ پر جو اثرات ڈالے ہیں ان کا کس طرح ازالہ کیا جائے۔ مسلمان عام طور سے خوف وہراس میں مبتلا ہیں اور مستقبل کی طرف سے وہ کچھ مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر جلد ان کو ان کیفیات سے نجات نہ دلائی گئی تو اس کا نتیجہ ناگزیر طور سے چند شکلوں میں نمودار ہوگا' بہت سے لوگ ہندستان چھوڑ کر کہیں اور جانے کی فکر میں لگ جائیں گے۔ چنانچہ لوگ پاکستان جا بھی رہے ہیں' کچھ لوگ جو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے کہیں جا نہیں سکتے ہیں اور دین سے ان کا لگاؤ بھی برائے نام ہی ہے وہ حالات کی شدت سے گھبرا کر خدانخواستہ کفر وارتداد کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں یا ان پر یاس واضمحلال کی ایسی کیفیت طاری ہو سکتی ہے کہ آئندہ وہ کچھ سوچنے اور کرنے کے قابل ہی نہ رہ جائیں۔ یہ صورت حال حد درجہ تشویش انگیز ہے جس پر ہمیں خود بھی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی طرف ہمیں ملت کے دوسرے دردمندوں کو بھی متوجہ کرنا چاہیے۔ اور مل جل کر اس کا کوئی حل یا مداوا تلاش کرنا چاہیے۔ انسانیت' اخوت اسلامی' دینی اور دعوتی مصالح۔ غرض گوناگوں پہلوؤں سے یہ ایک نہایت ضروری کام ہے۔

اس صورت حال کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ فسادات بجائے خود کوئی مرض نہیں ہیں بلکہ ان امراض کی علامات ہیں جو پورے ملک کے جسم میں' جس کا ایک حصہ مسلمان بھی ہیں سرایت کیے ہوئے ہیں اس لیے جب تک وہ امراض دور نہ ہوں۔ ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ان فسادات کا ملک سے خاتمہ ہو سکتا ہے بنابریں ہمیں تباہ حال مسلمانوں کو صرف ریلیف پہنچانے یا ان کے موجودہ خوف وہراس اور مستقبل کی طرف سے ان کی مایوسی یا بے اعتمادی کو دور کرنے کے لیے کچھ وقتی تجویزیں طے کر لینے ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان امراض کے ازالے کے لیے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ان غیر مسلموں کے اشتراک وتعاون سے بھی جن کو اس مقصد سے دلچسپی ہو سکتی ہے ان کا کوئی مستقل حل اور مداوا سوچنا چاہیے اور اس ضمن میں اب تک ہم نے خود جو کچھ سوچا ہے اور طے کیا ہے اس کو زیادہ مستعدی

اور سرگرمی کے ساتھ روبہ عمل لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مولانا نے اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ یہ وقت ہندستان کی تاریخ میں ایک نہایت نازک وقت ہے۔ ملک کی سب سے بڑی اور با اقتدار پارٹی جو ایک عرصے سے زوال کا شکار ہو چکی ہے، اب رفتہ رفتہ اس مقام پر پہنچ گئی ہے کہ اس کے نتیجے میں یہاں کے حالات میں تغیرات کا رونما ہونا ناگزیر ہے۔ اس لیے غور و فکر کے وقت متوقع حالات و امکانات کو بھی ہمیں پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

مولانا نے اس اجتماع کی اہمیت کی دوسری وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں اس اجلاس میں اپنی نئی میقات کے لیے پالیسی اور پروگرام بھی طے کرنا ہے جو ایک نہایت نازک ذمہ داری ہے، کیونکہ درحقیقت ہم یہ طے کرنے جا رہے ہیں کہ ان چار سالوں میں ہم اپنے مقصد کے حصول کے لیے کیا کریں گے اور جو لوگ جماعت سے وابستہ ہو چکے ہیں ان کے وقت اور صلاحیتوں کو کس طرح کام میں لائیں گے۔

ظاہر ہے اس معاملے میں ہماری ذرا سی لغزش سے مقصد کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے اور ہم رفقاء کی توانائی اور صلاحیتوں کو غلط رخ پر ڈالنے کے بھی مرتکب ہوں گے۔

آپ نے مزید فرمایا کہ ہر چند ہمارے سامنے ایک طے شدہ پالیسی اور پروگرام موجود ہے جو اب تک رائج رہا ہے لیکن اس مدت میں حالات میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ پالیسی اور پروگرام طے کرتے وقت ان کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ساتھ ہی ہمیں اپنی چار سال کی کوششوں اور ان کے نتائج کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ اس لیے ان کا جائزہ بھی ضروری ہے۔ غرض یہ اجتماع ایک مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد اور رہنمائی فرمائے۔

آخر میں آپ نے ارکان شوریٰ کو توجہ دلائی کہ آئندہ پالیسی اور پروگرام کے بارے میں مختلف مجالس مشاورت اور ارکان جماعت کی طرف سے کچھ تجاویز بھی موصول ہوئی ہیں۔ کچھ طے کرنے سے پہلے ان کا مطالعہ کر لینا بھی ضروری ہے، ان سے ہمیں اپنے رفقاء کا ذہن سمجھنے میں مدد ملے گی اور کچھ نئی اور مفید باتیں بھی ہمارے سامنے آئیں گی۔

امیر جماعت کی افتتاحی تقریر کے بعد ایجنڈے کے مطابق گزشتہ شوریٰ کی روداد اور جماعت کی سالانہ رپورٹ قیم جماعت نے پڑھ کر سنائی۔ رپورٹ کے ضمن میں متعدد ارکان نے کچھ تاثرات اور مشورے پیش کیے

جو نوٹ کر لیے گئے۔

نئی میقات کے لیے پالیسی۔

ایجنڈے کی اہم تر دفعہ اس میقات کے لیے پالیسی اور پروگرام طے کرنا تھا چنانچہ اس پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے تھوڑی دیر جماعت کے اندرونی حالات پر گفتگو کی گئی جس کے نتیجے میں یہ عام احساس سامنے آیا کہ ہمارا داخلی نظام پوری توجہ کا مستحق ہے اور ہمیں اس پر پوری توجہ دینی چاہیے۔

اس کے بعد پچھلی پالیسی پر دفعہ وار غور کیا گیا اور تفصیلی بات چیت کے بعد اس میں ضروری ترمیمات اور اضافے کیے گئے۔ غور و بحث کے وقت ملکی اور جماعتی حالات کے ساتھ ان تجاویز اور مشوروں کو بھی سامنے رکھا گیا جو ارکان شوریٰ، امرائے حلقہ جات، حلقوں کی مجالس مشاورت اور ارکان جماعت کی طرف سے موصول ہوئی تھیں۔ اور اس طرح نئی میقات کے لیے حسب ذیل پالیسی طے کی گئی۔

جماعت اسلامی کی پالیسی

۱۔ ہماری دعوت کے مخاطب مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی ہوں گے۔ البتہ مسلم ملت، دین کے ساتھ اپنے مخصوص لگاؤ کی بنا پر ہماری دعوت کی اولین مستحق ہوگی اور اس بنا پر ہماری زیادہ توجہ کی بھی

۲۔ ہماری شرعی زندگی کا تقاضا ہے کہ دعوت کا کام کسی تخصیص و امتیاز کے بغیر ہر طبقے کے لوگوں میں کیا جائے۔ البتہ دعوتی کام انجام دیتے وقت ہر طبقے کے با اثر افراد کو خصوصیت سے پیش نظر رکھنا ہوگا اور چونکہ تحریک و دعوت کے لیے زیادہ مفید و کارآمد وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو شر بے زار اور خیر پسند ہوں، اس لیے اس مقصد کے لیے ایسے ہی لوگوں کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرنا ہوگی۔

۳۔ ہمیں اپنا دعوتی کام اس ڈھنگ پر انجام دینا ہوگا کہ دعوت اپنے حقیقی محرک کے ساتھ صحیح شکل میں مخاطب کے ذہن نشین ہو جائے یعنی نجات اخروی کو زندگی کے اصل مسئلے کی حیثیت سے پیش کیا جائے اور نظام باطل کی بنیادوں پر تنقید کرتے ہوئے دعوت کے بنیادی نکات توحید۔ آخرت اور رسالت کو دل و دماغ میں راسخ کیا جائے البتہ جس دین کی ہم دعوت دیتے ہیں چونکہ وہ جس طرح رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا ضامن ہے۔ اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہترین نظام زندگی بھی ہے اس لیے دعوت پیش کرتے وقت حسب ضرورت اس کی اس حیثیت کو بھی نمایاں کیا جائے، بلکہ اگر مخاطب ایسے ہی لوگ ہوں جن کو ابتداءً اس کے اس پہلو سے ہی دلچسپی ہو سکتی ہے تو دعوت کی ابتداء اس حیثیت سے بھی ہو سکتی ہے

۴۔ مسلمانوں میں دعوتی کام انجام دیتے وقت دعوت کے عملی تقاضوں کو بھی تفصیل و وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہوگی تاکہ ان میں غیر اسلامی افکار و نظریات اور تحریکات سے اجتناب اپنے ایک اصولی ملت ہونے کا احساس، غیر اسلامی نظام زندگی سے بیزاری اور اسلامی نظام زندگی کے قیام کا جذبہ ابھر سکے۔

۵۔ غیر مسلموں میں دعوتی کام انجام دیتے وقت غیر اسلامی افکار و عقائد اور مروجہ نظاموں اور تحریکوں کا باطل ہونا اس طرح واضح کیا جائے گا کہ ان میں ان سے بیزاری پیدا ہو اور اسلامی عقائد و تعلیمات اور اخروی اور دنیوی ثمرات و برکات کو اس طرح پیش کیا جائے گا کہ اسلام کی طرف سے ان کی بدگمانیاں دور ہوں اور اس کے حق میں پسندیدگی اور قبول حق کا داعیہ پیدا ہو جائے۔

۶۔ بیرون ملک کے وہ مسائل جن پر اظہار خیال کرنا دین و انسانیت کا تقاضا ہو۔ مثلاً عالمی امن و امان، بنیادی انسانی حقوق، انسانی ہمدردی اور اخوت اسلامی وغیرہ ان پر حسب ضرورت بے لاگ اور منصفانہ اظہار خیال کیا جائے گا اور کسی عمومی مصیبت کے وقت عملی ہمدردی بھی کی جائے گی۔

۷۔ اندرون ملک کے وہ مسائل جو اسلام اور ملت اسلامیہ کے مفادات پر قابل لحاظ اثرات ڈالتے ہوں، ان کے سلسلے میں بے لاگ اور منصفانہ اظہار خیال کیا جائے گا۔ اور بوقت ضرورت رائے عامہ بھی ہموار کی جائے گی اور جو افراد یا جماعتیں ہمارے نقطۂ نظر کی تائید و حمایت کر سکتی ہوں ان سے اپنے اصولوں کے تحت اشتراک و تعاون بھی حاصل کیا جائے گا۔

۸۔ ملک کے ایسے مسائل جو شخصی آزادی، آزادی خیال و ضمیر، انسانی حقوق، مختلف گروہوں اور طبقوں کے باہمی تعلقات پر اچھا یا برا اثر ڈالتے ہوں یا اخلاق و معاشرت کے بناؤ بگاڑ، ملک کے امن و امان اور باشندگان ملک کی حقیقی فلاح و بہبود سے گہرا تعلق رکھتے ہوں، ان کے سلسلے میں بے لاگ و منصفانہ اظہار خیال کیا جائے گا۔ اور اگر حالات متقاضی ہوں تو حسب استطاعت و ضرورت رائے عامہ بھی ہموار کی جائے گی اور دوسرے افراد اور جماعتوں سے اشتراک و تعاون بھی کیا جائے گا۔

۹۔ ازالہ منکرات اور قیام معروف کے سلسلے میں حتی الوسع جدوجہد کی جائے گی اور اس ضمن میں ملک میں ہونے والی کوششوں کے ساتھ اشتراک و تعاون بھی کیا جائے گا۔

۱۰۔ ہمارا یہ دینی فریضہ ہے کہ عام انسانوں سے مرحمت و مواساۃ کا رشتہ مضبوط تر کریں، اس لیے

اس سلسلے میں انفرادی کوششوں کے ساتھ حسب استطاعت وگنجائش اجتماعی کوششیں بھی عمل میں لائی جائیں گی

۱۱۔ مسلمانوں کے ضمن میں ان کی دینی تعلیم وتربیت اور ان کی اخلاقی ومعاشرتی اصلاح نیز ان کے اندر اسلامی نظم واتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ ہندوستان میں وہ اسلام کی صحیح قولی وعملی شہادت دے سکیں۔

۱۲۔ جس دین کے ہم داعی ہیں اس کا یہ اولین تقاضا ہے نیز اس کا قیام اس پر موقوف ہے کہ اس کے داعیوں کی عملی زندگی زیادہ سے زیادہ اس کا نمونہ ہو۔ اس لیے ہمیں اپنی اصلاح وتربیت کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرنی ہوگی۔

میقاتی پروگرام

پالیسی کی دفعات ۱تا۵ کی روشنی میں دعوتی کام

مسلمانوں میں دعوتی کام۔ (۱) اس میقات میں ایک لاکھ مسلمانوں کو جماعت کی دعوت سے متعارف کیا جائے گا۔ متعارف اس شخص کو سمجھا جائے گا جس کے بارے میں کارکن کو یہ اطمینان ہو جائے کہ اس نے جماعت کی دعوت کو ٹھیک طور سے سمجھ لیا ہے۔

(۲) پچیس ہزار متفقین بنائے جائیں گے۔ متفق سے مراد وہ مسلمان ہے جس کے بارے میں کارکن کو یہ اطمینان ہو جائے کہ اس نے جماعت کی دعوت کو سمجھ کر اس سے اتفاق کر لیا ہے۔ اور اس کے مطابق اس کی عملی زندگی میں تغیرات رونما ہونے لگے ہیں۔

(۳) چار ہزار ہمدرد بنائے جائیں گے ——— ہمدرد اس شخص کو سمجھا جائے گا جو جماعت کے عقیدے اور نصب العین کو صحیح تسلیم کرتا ہو۔ اور ان کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے پر بھی آمادہ ہو لیکن کسی وجہ سے وہ نظم جماعت میں شریک نہ ہو سکے۔

(۴) خواتین میں دعوتی کام کی طرف مناسب توجہ کی جائے گی اور حسب موقع حلقہ ہائے خواتین بھی قائم کیے جائیں گے۔

(۵) مسلمانوں میں دعوت کے تعارف کے لیے مناسب لٹریچر کا اضافہ کیا جائے گا۔

غیر مسلمین میں دعوت (۱) اس میقات میں تیس ہزار غیر مسلموں سے دعوتی روابط قائم کیے جائیں گے۔

(۲) اس میقات میں چھ ہزار افراد کو متعارف بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

وہ غیر مسلم متعارف سمجھا جائے گا جس کے بارے میں کارکن کو یہ اطمینان ہو جائے کہ اس نے اسلام کی بات ٹھیک طور سے سمجھ لی ہے۔

(۳) اسلام کے تعارف کے سلسلے میں غیر مسلمین کے لیے مناسب لٹریچر کی فراہمی کی طرف خصوصی توجہ کی جائے گی بالخصوص قرآن و سیرت اور منتخب احادیث کو علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

(نوٹ) اس میقات میں جو دعوتی لٹریچر تیار کرنا پیش نظر ہے۔ اس کی فہرست بعد میں شائع کیجا سکے گی۔

۴۔ غیر مسلموں میں دعوت کے پیش نظر رسالہ "کانتی" (ہندی) میں مناسب مضامین شائع کیے جائیں گے۔

۵۔ اس میقات میں سہ روزہ "دعوت" "زندگی" اور "کانتی" کی موجودہ تعداد اشاعت میں بالترتیب ۱ہزار، ایک ہزار اور چھ سو کا اضافہ کیا جائے گا۔

۶۔ غیر مسلموں میں دعوتی کام کرنے کے سلسلے میں کارکنوں کو حسب ذیل موضوعات پر علمی تیاری کرنی چاہیے

۱۔ شرک و بت پرستی اور اس کا فلسفہ۔ ۲۔ آواگون۔ ۳۔ عقیدۂ اوتار۔ ۴۔ ورن آشرم یعنی ذات پات کا سسٹم۔ ۵۔ وحدت ادیان۔ ۶۔ ویدانت اور سنیاس

۷۔ وہ اسلامی تعلیمات و مسائل جن کے سلسلے میں غیر مسلموں میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں مثلاً جہاد، جزیہ، ذمی، پردہ، تعدد ازدواج، گوشت خوری وغیرہ۔

نوٹ: اس تیاری کے لیے مرکز کی طرف سے موزوں کتابوں کی نشان دہی بھی کی جائے گی۔

پالیسی کی دفعہ ۶ میں درج مسائل کے ذیل میں حسب ضرورت مرکز کی طرف سے رہنمائی کی جاتی رہیگی اور جماعت اس کے تحت اور اس کی روشنی میں اظہار خیال کریں گے۔

• پالیسی کی دفعہ ۶ کے ذیل میں خاص طور سے حسب ذیل مسائل پیش نظر رکھے جائیں گے۔

ا۔ فرقہ وارانہ جارحیت۔ (ب) پرسنل لا۔ (ج) موجودہ نظام تعلیم کی مضرتیں جو ملک کے بچوں اور جوانوں پر بالعموم اور مسلمان بچوں اور نوجوانوں پر بالخصوص اثر انداز ہو رہی ہیں۔

ا۔ فرقہ وارانہ جارحیت۔ جماعت نے ملک سے فرقہ پرستی کو ختم کرنے کو ایک اہم مسئلہ کی حیثیت سے روز اول ہی سے سامنے رکھا ہے اور اس سلسلے میں جو تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں، ان کی نشان دہی اور ان کے مطابق عمل درآمد بھی وہ برابر کرتی رہی ہے، لیکن پچھلے دنوں ملک کے مختلف علاقوں میں جو فسادات رونما ہوئے ہیں ان سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ بدقسمتی سے فرقہ پرستی ختم ہونے کی بجائے جارحانہ

شکل اختیار کر گئی ہے جس سے ملت اسلامیہ کو عظیم جانی و مالی نقصانات اٹھانے پڑے ہیں۔ ساتھ ہی اس سے ملک کی سلامتی و استحکام اور لا اینڈ آرڈر کو بھی سخت ترین خطرہ پیش آگیا ہے اس لیے ضرورت محسوس کی گئی کہ اس مسئلے کو اور زیادہ اہمیت کے سامنے رکھا جائے، اس لیے جو تدبیریں اب تک اختیار کی جاتی رہی ہیں ان کے ساتھ حسب ذیل تدبیریں بھی اختیار کی جائیں گی۔

۱۔ فرقہ وارانہ صورت حال کے اعتبار سے ملک جس ہلاکت کی طرف جارہا ہے اس سے باشندگان ملک کی غفلت اور بے توجہی کا ایک بڑا سبب حالات و واقعات سے بے خبری ہے۔ اس لیے صحیح حالات و واقعات کو ملک کے سامنے لایا جائے۔

۲۔ اکثریت کے امن پسند افراد کو شر پسند اور ملک کے فسادی عناصر کے خلاف کھڑے ہونے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کیا جائے۔

۳۔ اس سلسلے میں ایڈمنسٹریشن پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور پھر ان کے سلسلے میں اس سے جو کوتاہیاں ہورہی ہیں ان کی طرف اسے مؤثر انداز میں توجہ دلائی جائے۔

۴۔ مسلمانوں میں صبر، استقامت اور اعتماد و توکل علی اللہ کے جذبات پیدا کرنے کے ساتھ ان کو یہ احساس دلایا جائے کہ حملوں کے وقت مایوسی اور گھبراہٹ کا شکار نہ ہوں بلکہ صورت حال کا جرأت اور پامردی کے ساتھ مقابلہ کریں اور اپنی محافظت اور مدافعت کے لیے وہ تمام تدبیریں بروئے کار لائیں جو نہ شرعاً اور اخلاقاً غلط ہوں اور نہ مروجہ قانون کے خلاف۔ اور اس سلسلے میں سماج کے دیگر امن پسند عناصر کا تعاون بھی حاصل کریں۔

ب۔ پرسنل لا۔ پرسنل لا کے تحفظ کے سلسلے میں مسلمانوں پر ان کی ذمہ داریاں واضح کی جائیں گی اور اگر کوئی ایسی قانون سازی کی جارہی ہو جو پرسنل لا پر اثر انداز ہوتی ہو تو بروقت احتجاج کیا جائے گا۔

ج۔ شمول دفعہ ۱۱ کے تحت یہ پروگرام ہوگا۔ ا۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے منظور یا شائع شدہ کتابوں کے مضامین کو جن کے ذریعہ ایک مخصوص دھرم اور عقائد و تصورات کی تبلیغ کی جارہی ہے یا جو اسلامی اصول اور عقائد کے خلاف ہیں یا ہوں، یا جو مسلمانوں کے مذہبی جذبات و احساسات کو مجروح کرتے ہیں یا کرتے ہوں ان کو نصاب اور درسیات سے خارج کرانے کی مؤثر جدوجہد کی جائے گی۔

۲۔ مسلمانوں کو آمادہ کیا جائے گا کہ وہ اپنے بچوں اور بچیوں کے لیے آزاد پرائمری مکاتب قائم کریں۔

۳۔ مسلمانوں کے آزاد پرائمری مکاتب میں تعلیم پانے والے طلبہ کو جبری تعلیم سے مستثنیٰ کرانے کی کوشش کی جائیگی
۴۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے صباحی و شبینہ مکاتب قائم کرنے کے لیے مسلمانوں کو آمادہ کیا جائے گا۔
۵۔ جو افراد ادارے یا جماعتیں اس سلسلے میں کام کر رہی ہیں ان سے اشتراک و تعاون کیا جائے گا۔

• پالیسی کی دفعہ ۸ میں شخصی اور اجتماعی آزادیٔ خیال کے ذیل میں ان کوششوں کی مذمت کرنا جن کے نتیجے میں کلیت پسندی اور آمریت کے رجحانات فروغ پاسکیں اور کلیت پسندی اور آمریت کے مقابلے میں ان کوششوں کی تائید کرنا بھی شامل ہے جن سے ملک میں جمہوریت کو فروغ حاصل ہو۔

موجودہ چھوت چھات اور معاشرتی عدم مساوات، فرقہ پرستی، نسل پرستی، لسانی تعصبات، طبقہ داری کش مکش، رقص و سرود، فحاشی و عریانی اور برتھ کنٹرول کی مہم کی مذمت بھی اسی دفعہ کے دائرے میں داخل ہے ملک میں جس معاشی نظام کے قیام کی کوششیں ہورہی ہیں وہ اگرچہ اس لحاظ سے یک رخا نظام ہے کہ اس میں انسان کی مادی ضرورتوں ہی کو بطور اصل کے سامنے رکھا گیا ہے درآں حالیکہ ملک کی حقیقی فلاح و بہبود ایک ایسے نظام کے قیام میں مضمر ہے جو معاشی ترقی کے ساتھ اخلاقی بہتری اور اخروی فلاح کا بھی ضامن ہو، لیکن حکومت کی ایسی ترقیاتی اسکیموں یا ان کے اجزاء کی جو شرعی اور اخلاقی قباحتوں سے پاک ہوں، تائید کی جائیگی

• پالیسی کی دفعہ ۹ میں شراب نوشی اور فحش لٹریچر کی اشاعت کی روک تھام کی کوششیں خاص طور سے مراد ہیں۔

پالیسی کی دفعہ ۱۱

۱۔ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کے ضمن میں خصوصیت کے ساتھ حسب ذیل خرابیوں کی طرف توجہ کی جائیگی

و۔ مسلمانوں میں معاشرتی اونچ نیچ
ب۔ بے پردگی اور غیر ساتر لباس
ج۔ شادی بیاہ اور دیگر مواقع سے متعلق غیر اسلامی اور مسرفانہ رسوم۔

۲۔ مسلمانوں کے اندر نظم و اتحاد پیدا کرنے کے لیے مذہبی جھگڑوں کی روک تھام کی جائے گی اور مختلف مکاتب فکر اور جماعتوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی جائے گی۔

پالیسی کی دفعہ ۱۲

مقاصد تربیت تربیت کے مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ ایمانیات کی پختگی، خصوصاً وجود باری تعالیٰ اور توحید کا پختہ یقین، صفات الٰہی اور ان کے تقاضوں کا استحضار صحیح توازن کے ساتھ، زندگی بعد موت پر پختہ یقین، آخرت کی جواب دہی اور دوزخ وجنت کے مناظر کا استحضار، اللہ کی رضا اور آخرت کی کامرانی واقعۃً زندگی کا حقیقی مقصود بن جائیں، ایمان بالرسول کی پختگی اور اس کے تقاضوں کا صحیح شعور، اسلام کے واحد دین حق ہونے پر کامل یقین، محبت خدا ورسول کا دلوں پر غلبہ۔

۲۔ انفرادی واجتماعی کردار کی تعمیر اور اس بات کی کوشش کہ تقویٰ واحسان کی کیفیتیں پیدا ہوں۔

۳۔ داخلی نظم کا استحکام

۴۔ دعوتی کام کرنے کے لیے صلاحیت واستعداد اور عملی جذبے کی نشوونما۔

۵۔ علم دین میں اضافہ اور اسلامی فکر میں پختگی۔

ذرائع تربیت مقاصد تربیت کے حصول کے لیے حسب ذیل اختیار کیے جائیں گے۔

۱۔ قرآن پاک، سیرت اور صالح لٹریچر کا گہرا مطالعہ جو فکر وعمل کو مقاصد تربیت کے لیے تیار کرسکے۔ صالح لٹریچر کے ذیل میں جماعت کا بنیادی لٹریچر اور ایسی کتابیں خاص طور سے داخل ہیں جن میں دین کی بنیادی باتوں توحید، آخرت اور رسالت، عبادات اور انفرادی واجتماعی اخلاق سے بحث کی گئی ہو۔

۲۔ اذکار ونوافل، احتساب واستغفار اور انفاق مال۔

۳۔ دعوت کے لیے عملی جدوجہد

۴۔ مرحمت ومواسات اور خدمتِ خلق۔

دیگر تدابیر

۱۔ امیر جماعت اس میقات میں کم از کم ہر حلقہ کا ایک دورہ کریں گے جس میں خاص طور سے تربیت کے پہلو کو سامنے رکھا جائے گا۔

۲۔ اس میقات میں امرائے حلقہ جات کا کم از کم ایک اجتماع ہوگا جس میں خاص طور سے تربیتی پہلو سامنے رکھا جائے گا۔

۳۔ امرائے حلقہ جات اپنے اپنے حلقے میں سال میں کم از کم ایک بار اجتماعی تربیت کا انتظام حلقہ یا ضلع کی سطح پر کریں گے۔

۴۔ امرائے حلقہ جات اپنے دوروں میں خاص طور سے تربیتی مقاصد کو سامنے رکھیں گے۔

۵۔ مقامی اجتماعات کو تربیتی لحاظ سے زیادہ مفید اور مؤثر بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

۶۔ تربیت کے لیے شخصی ربط و ملاقات کو خصوصی اہمیت کے ساتھ پیش نظر رکھا جائے گا۔

۷۔ حلقہ مرکز میں اجتماعی تربیت کا بھی مناسب انتظام کیا جائے گا۔

کل ہند اجتماع اس میقات میں ایک کل ہند اجتماع منعقد کیا جائے گا۔

نوٹ:۔ مندرجہ بالا پالیسی کے پیش نظر جو کام کیے جا سکتے ہیں وہ باعتبار اہمیت و ضرورت ایک ہی درجہ کے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اصل دعوت و تحریک سے اسی نسبت و تعلق کی بنیاد پر باہم مختلف ہو سکتے ہیں اور یہ ظاہر بات ہے کہ پالیسی کی دفعات ۱ تا ۵ اور دفعہ ۱۲ باعتبار اہمیت دیگر تمام دفعات سے زیادہ ضروری ہیں۔ اس لیے عام حالات میں ان کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

قراردادیں

مجلس شوریٰ نے بعض قراردادیں بھی منظور کیں جو فرقہ وارانہ جارحیت کی مذمت، سرحدی ریاستوں سے مسلمانوں کے اخراج، مشرقی پاکستان سے آنے والے پناہ گزینوں اور جماعت اسلامی کے کارکنوں کی ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتاریوں کے خلاف احتجاج پر مشتمل تھیں۔ ان قراردادوں کا متن اگلے صفحہ پر درج ہے۔

مجلس شوریٰ نے جماعت کے بعض داخلی معاملات و مسائل پر بھی غور و خوض کیا اور مناسب فیصلے کیے گئے۔

بجٹ

جون ۶۴ تا مارچ ۶۵ء کی مدت کے لیے مجلس شوریٰ نے جو بجٹ منظور کیا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

متوقع آمد	56,000/=
متوقع مصارف	76,800/=
خسارہ	20,800/=

جسے قرض سے کر پورا کیا جائے گا۔

اس کے بعد دعا پر اجتماع بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

محمد یوسف۔ قیم جماعت اسلامی ہند۔ ۲۳ ۲ ۶۴ء

قراردادیں

قرارداد نمبر ۱

جنوری اور مارچ ۱۹۶۴ء میں مغربی بنگال بہار اڑیسہ اور مدھیہ پردیش میں مسلمانوں پر جو جارحانہ حملے ہوئے ہیں اور ان کے نتیجے میں مسلمانوں کو جو عظیم جانی و مالی نقصانات اٹھانے پڑے ہیں ان پر مجلس شوریٰ انتہائی درد و کرب کا اظہار کرتی ہے اور کائنات کے حقیقی حاکم و فرماں روا خداوند ذی العزۃ والجبروت سے دعا کرتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور امت مسلمہ کو جو اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کے باوجود اسی کے حضور سر جھکاتی اور اسی کے محبوب رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و محبت کا تعلق رکھتی ہے، مزید آزمائشوں میں نہ مبتلا کرے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صورت حال کے مقابلے کے لیے صبر استقامت اور جرأت و پامردی عطا فرمائے اور وہ اخلاقی و روحانی طاقت بھی جس کے ذریعے اپنی روشن تاریخ میں انھوں نے بارہا انتہائی صبر آزما حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے اور اپنے گمراہ دشمنوں کے دلوں کو جیت کر ان کو اپنا مخلص و خیر خواہ دوست بنایا ہے۔

مجلس شوریٰ اس ضمن میں مسلمانوں کو یہ حقیقت یاد دلاتی ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ ہی اپنے کو اللہ تعالیٰ کے حفظ و امان اور اس کی رحمت و نصرت کا مستحق بنا سکتے ہیں جس کو اللہ محفوظ رکھنا چاہے اسے کوئی مٹا نہیں سکتا اور جسے اللہ مٹانا چاہے اس کی کوئی حفاظت نہیں کر سکتا۔ تحفظ ملت کا حقیقی تنہا اعتماد طریقہ یہی ہے کہ توبہ و استغفار کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کیا جائے اور اپنے خیر امت ہونے کے شعور اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ اپنے گم کردہ راہ بھائیوں کو راہ راست دکھانے کی کوشش کی جائے۔

قرارداد نمبر ۲

مجلس شوریٰ درندگی اور بربریت کے ان تمام واقعات پر انتہائی رنج و اندوہ اور تشویش کا اظہار کرتی ہے جو پچھلے چند ماہ میں ہمارے ملک کی چار ریاستوں (مغربی بنگال بہار اڑیسہ اور مدھیہ پردیش) میں رونما ہوئے ہیں۔ ان حادثات سے نہ صرف یہ کہ ایک بہت بڑی آبادی خوف و ہراس، اضطراب اور بے اعتمادی

کا شکار ہو رہی ہے اور ہمارے ملک اور یہاں کے باشندوں کو ساری دنیا میں رسوائی اور ندامت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے بلکہ باشندگانِ ملک میں محبت و خیر خواہی اور اعتماد کی جگہ نفرت و بدگمانی اور بے اعتمادی بڑھتی جا رہی ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی یقینی ہے کہ ایک بار اگر ایک گروہ کو قتل و غارت گری اور لوٹ مار کی چاٹ لگ گئی تو کل کو باہمی اختلاف، صوبائی اور لسانی مسائل، ذات پات کے جھگڑوں اور سیاسی گروہ بندی کے ضمن میں بھی اسی کا مظاہرہ ہوگا جس کو روکنا کسی کے بس کی بات نہ رہے گی۔ یہ صورتِ حال ملک کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔

مجلس شوریٰ کا خیال ہے کہ یہ حالات اس بات کی علامت ہیں کہ ہمارے ملک میں قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی پچھلی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں ہیں اس لیے مجلس شوریٰ ملک کے تمام خیر خواہ اور درد مند اصحاب سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اس مسئلے پر نئے سرے سے غور و فکر کریں اور اس بات کے لیے ہر ممکن کوشش کریں کہ شر پسندوں کو شر انگیزی کا آئندہ موقع نہ مل سکے۔

جہاں تک شہریوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا تعلق ہے اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت اور ایڈمنسٹریشن کے سر عاید ہوتی ہے اور حالیہ فرقہ وارانہ حملوں کے ضمن میں ایڈمنسٹریشن اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ان فسادات کا ایک نہایت تشویش انگیز پہلو یہ ہے کہ جیسا کہ ملک کے ذمہ دار لیڈروں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے ان ہنگاموں کے پیچھے کارخانوں کے منتظمین، سیاسی جماعتوں کے کارکنوں، حتیٰ کہ ایڈمنسٹریشن کے بعض افراد کا بھی ہاتھ رہا ہے اور ایک محدود مدت کے اندر ایک وسیع علاقے میں یکساں ٹیکنک کے ساتھ فسادات کا پھیل جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کے پیچھے ایک منظم سازش اور منصوبہ کارفرما رہا ہے اس لیے مجلس شوریٰ یہ ضروری سمجھتی ہے کہ حکومت ہند اعلیٰ سطح پر ان بلوؤں کی عدالتی تحقیقات کرائے اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دے۔ حکومت کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ ان فسادات میں جن لوگوں کے مکانات اور کاروبار وغیرہ تباہ ہوئے ہیں ان کو آباد کرنے اور ان کے کاروبار کو بحال کرنے کے لیے انھیں معقول امداد اور بلا سودی قرضے فراہم کرے۔ اس سلسلے میں ریاستی حکومتوں کی طرف سے جو کچھ ہوا ہے وہ ناکافی اور غیر اطمینان بخش ہے۔

قرارداد نمبر ۳

مسلمانان ہند نے حالیہ فرقہ وارانہ حملوں کے دوران جس کردار کا مظاہرہ کیا ہے وہ فی الجملہ ہمارے اس اعتماد میں اضافہ کرتا ہے کہ یہ ملت زندہ رہنے اور سخت ترین حالات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ البتہ اس پہلو سے ہمیں شدید بے اطمینانی ہے کہ ایسے نازک موقع پر بھی ملت میں اسلامی نظم و اتحاد نہ پیدا ہو سکا۔ ملک و ملت کی موجودہ صورت حال میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ملت اسلامیہ کے اصحاب فکر اور نمائندے نیز ان کی مختلف جماعتوں اور اداروں کے سربراہ جمع ہو کر موجودہ صورت حال کا جائزہ لیں اور ایسی تدابیر سوچیں جن کو زیر عمل لا کر ملت اپنے وجود اور تہذیب و ثقافت کا تحفظ کر سکے اور ساتھ ہی انتشار و انارکی کی طرف بڑھتے ہوئے اس ملک میں صالح رجحانات اور تعمیری یکجہتی پیدا کرنے کا فریضہ انجام دے سکے جو ایک خیر امت اور اصولی ملت ہونے کی وجہ سے اس کی اولیں ذمہ داری ہے۔ مجلس شوریٰ کے نزدیک یہ ایک تاریخی اہمیت رکھنے والا سانحہ ہے کہ مسلمانان ہند نا خود شناسی، مرعوبیت اور باہمی نااتفاقی کا شکار ہو کر اس فریضے سے غافل اور غیر مؤثر ہو رہے ہیں۔

قرارداد نمبر ۴

آسام، تری پورہ اور دوسری ریاستوں کی سرحدوں پر رہنے والے مسلمانوں کے سلسلے میں اس وقت ملک میں جو فضا پائی جا رہی ہے مجلس شوریٰ اس کو سخت تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ آسام سے جو اطلاعات موصول ہو رہی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں پر مسلمانوں کے خلاف عام طور پر شبہات اور بدگمانی کا ماحول پیدا ہوتا جا رہا ہے اور اس فضا کو پیدا کرنے میں اخبارات اور سیاست دانوں ہی کا نہیں بلکہ حکومت کے ذمہ داروں تک کا ہاتھ رہا ہے۔

یہ بات غلط اور قابل اعتراض نہیں ہو سکتی کہ ہندوستان کی حدود میں پاکستان کے جو شہری غیر قانونی طور پر آگئے ہوں انھیں پاکستان واپس کر دیا جائے لیکن یہ بات کسی طرح بھی صحیح قرار نہیں دی جا سکتی کہ ان کی آڑ میں ہندوستان کے شہریوں کو بھی ملک بدر کر دیا جائے۔

مجلس شوریٰ مسلمان اکابر اور ملک کے دوسرے انصاف پسند زعماء سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ان سرحدی ریاستوں کے حالات کا خود جائزہ لیں اور مسلمانوں کو وہاں جن پریشان کن حالات سے دوچار ہونا

پڑھ لے اُن کے ازالے کے لیے مرکزی اور ریاستی حکومت کو متوجہ کریں۔

قرارداد نمبر ۵

پچھلے دنوں مشرقی پاکستان میں اقلیتوں پر جو مظالم ہوئے ہیں مجلس شوریٰ اُن پر اپنے شدید غم و غصہ کا اظہار کرتی ہے۔ اقلیتوں پر ظلم و ستم جہاں بھی ہو قابلِ مذمت ہی ہے لیکن ہمیں اس کا خاص طور سے اس لیے رنج و افسوس ہے کہ پاکستان ایک مسلم مملکت ہے اور اسلام کی رو سے اقلیتوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہر حال میں مسلم مملکت کا ایک عام فریضہ ہے۔

مجلس شوریٰ پاکستان کے علماء و زعماء سے خاص طور پر اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنے ملک میں ایسے حالات پیدا کریں کہ اقلیتیں امن و عزت کے ساتھ رہ سکیں۔

مجلس شوریٰ اس صورت حال کو نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے کہ ان فسادات کے بعد اقلیتی فرقوں کے افراد کثیر تعداد میں اپنا وطن ترک کر کے ہندستان آ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ بہر حال دونوں ملکوں میں سے کسی کے لیے بھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ مجلس شوریٰ یہ رائے رکھتی ہے کہ ترکِ وطن کا یہ سلسلہ جلد از جلد مسدود ہونا چاہیے شوریٰ اس بات کو بہ نظرِ استحسان دیکھتی ہے کہ پچھلے دنوں دونوں ملکوں کے وزرائے داخلہ کی ملاقات میں اس مسئلے پر غور و خوض کیا گیا تھا اور توقع رکھتی ہے کہ گفتگو کا دوبارہ آغاز ہوگا اور اس مسئلے کو کسی بہتر شکل میں حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

قرارداد نمبر ۶

پچھلے دنوں مختلف ریاستی حکومتوں نے جماعت اسلامی کے متعدد کارکنوں کو ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتار کیا ہے۔

جماعت اسلامی کے سلسلے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ فرقہ وارانہ امن و امان، انسانیت دوستی اور سماجی تعمیر کے لیے خاص طور سے کوششیں کرتی رہی ہے اور حکومت نے بھی جماعت یا اس کے کارکنوں پر کبھی کوئی متعین الزام لگا کر اسے ثابت نہیں کیا ہے۔

اس حقیقت کے پیش نظر بعض ریاستی حکومتوں کا موجودہ رویہ نہ صرف جماعت بلکہ عام مسلمانوں کے لیے

بھی پریشانی اور تشویش کا باعث ہے۔ اس لیے مجلس شوریٰ حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ انہیں فوری طور پر رہا کیا جائے۔ پُرامن اور بے گناہ شہریوں کو ڈی' آئی' آر کے تحت گرفتار کرنا اس کا بے جا استعمال اور حق و انصاف کے منافی ہے۔

شرائط ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم پانچ رسائل پر دی جائے گی۔

۲۔ رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں' اگر فروخت نہ ہوئے تو واپس نہیں لیے جائیں گے۔

۳۔ کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا' البتہ پچاس یا زائد رسالوں کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی ہوگا۔

۴۔ رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری یا وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا۔

۵۔ رقم ہر حال میں پیشگی آنی چاہیے یا پھر وی پی بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی کے مصارف زیادہ ہوں گے۔

منیجر رسالہ "زندگی" رامپور۔ یوپی

بقیہ صفحہ | انھوں نے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل سے اس بات کے نظائر پیش کیے ہیں کہ بعض علاقوں میں کاشتکاروں کے ساتھ پیداوار میں شرکت کے اصول پر معاملہ کیا گیا تھا۔[1]

ابو یوسف نے تحصیل محاصل کے انتظامی پہلو پر بھی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے درمیانی آدمیوں کو خراج کی تحصیل کا ٹھیکہ دینے کے طریقے کی شدت سے مخالفت کی ہے۔ اس طریقے کو اختیار کرنے سے خراج ادا کرنے والوں پر ظلم و زیادتی کا دروازہ کھلتا ہے، زرعی سرگرمیوں میں کمی آتی ہے اور پیداوار کم ہو جاتی ہے، حکومت کی آمدنی بھی محدود ہو جاتی ہے اور رعایا بھی تباہ ہو جاتی ہے۔[2] طوالت کے خوف سے ہم نے اس موضوع پر اُن کے فکر کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا ہے۔ (باقی آئندہ)

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۱۰۱، ۱۰۲ [2] ایضاً صفحہ ۱۲۵، ۱۲۶

بقیہ اشارات | نہ کش مکش کی ضرورت، نہ جنگ کی حاجت، نہ باطل کی شکست مقصود، نہ باطل پرستوں کی ہلاکت منظور۔

یا

رسولوں کو بھیجنے کی غایت یہ تھی کہ گمراہ انسانوں سے دین حق کو قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں، اپنی بغاوت و سرکشی پر جمے رہیں تو انہیں شکست دے کر یا ہلاک کر کے دین حق کو سربلند اور دین باطل کو نگوں سار کر دیا جائے ـــــ ہمارے نزدیک اس بنیادی سوال کی دوسری شق ہی صحیح ہے۔ ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ انبیاء کرام کو مبعوث کرنے کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ وہ خود مشرکانہ نظام میں زندگی بسر کرتے رہیں یا اس نظام کے تحت زندگی گزارنے والی ایک ایسی جماعت تیار کر دیں جو بتوں کے بجائے صرف خدا کو سجدے کرنے کا حق رکھتی ہو، بلکہ اللہ انہیں اس لیے بھیجتا رہا ہے کہ دین شرک مغلوب اور دین توحید غالب ہو، ایک ایسی آزاد فضا اور ایک ایسا پاکیزہ ماحول پیدا ہو جس میں دین حق کی مکمل پیروی کی جا سکے اور اس پیروی میں کوئی طاقت مزاحم نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے کفر و شرک کی طاقت کے مقابلے میں اپنے رسولوں کو جب بھی بھیجا ہے اپنی مدد کا وعدہ کر کے بھیجا ہے اور کش مکش حق و باطل کے ہر نازک موڑ پر تسلی دے کر ان کے حوصلوں کو برقرار رکھا ہے۔

ہمارے اس دعوے پر پورا قرآن گواہ ہے لیکن تمام آیتوں کا استقصا ایک طویل کام ہے اس لیے ہم اختصار کے ساتھ چار قسم کی آیتوں سے چند دلائل یہاں پیش کریں گے۔

(۱) وہ آیتیں جن میں عمومی طور پر تمام رسولوں سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ہم تمہیں کفار پر غالب کریں گے

(۲) وہ آیتیں جن میں مخصوص طور پر حضرت موسیٰ و ہارون سے اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔
(۳) وہ آیتیں جن میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔
(۴) وہ آیتیں جن میں امت مسلمہ سے اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

پہلی دلیل

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (الصافات ر۵)	اور اپنے بندوں یعنی رسولوں کے حق میں ہمارا فیصلہ پہلے ہی صادر ہو چکا ہے، بلاشبہ وہ لوگ ہیں جن کی مدد کی جائے گی اور بلاشبہ ہمارا ہی لشکر غالب رہے گا۔

یہ آیتیں کئی حقیقتوں کی واضح نشان دہی کر رہی ہیں۔
(ا) تمام رسولوں سے یہ اللہ تعالیٰ کا غیر متبدل وعدہ اور اس کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ وہ باطل پرست طاقتوں کے مقابلے میں ان کی مدد کرے گا۔ (ب) رسولوں اور ان پر ایمان لانے والے داعیان حق کی حیثیت ایسے واعظوں کی نہیں ہوتی جن کا کام وعظ کہنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے بلکہ ان کی حیثیت فرماں روائے کائنات کے لشکر کی ہوتی ہے جو اس کے باغیوں کے خلاف صف آرا ہوتا ہے۔ (ج) رسول جس دین اور جس پیغام کی تبلیغ پر مامور ہوتے ہیں اس کی حیثیت کسی ایسی سفارش اور نصیحت کی نہیں ہوتی جسے رد کر دینے کے بعد اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے بلکہ ایک ایسے فرمان شاہی کی ہوتی ہے جس کے انکار کو بادشاہ اپنے خلاف بغاوت اور چیلنج سمجھتا ہے۔ (د) باغی لشکر کے مقابلے میں آخر کار بادشاہ کی وفادار فوج ہی غالب، کامیاب اور فاتح ہوتی ہے۔

دوسری دلیل

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (المجادلہ ر۳)	اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ یقیناً میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ قوی اور زبردست ہے۔

اس آیت میں بھی تمام رسولوں سے حتمی وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ غالب ہوں گے بلکہ اس میں صراحت کے

...اللہ نے اپنے آپ کو بھی باطل پرستوں کے مقابلے میں ایک فریق کی حیثیت سے ظاہر فرمایا ہے۔ یہ رسولوں اور ان کے ماننے والوں کے لیے اتنی بڑی بشارت ہے جو ان کے حوصلوں کو ناقابل شکست بنا دیتی ہے۔

دوسری دلیل

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝

(ابراہیم ۲)

اور آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے یا یہ کہ تم ہماری ملت میں پلٹ آؤ تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے اور یہ (وعدہ) اس کے لیے ہے جو میرے حضور میں (جواب دہی کے لیے) کھڑے ہونے اور میری وعید سے ڈرے۔

یہ آیتیں بتاتی ہیں کہ خدا کے باغی جب اپنے وقت کے رسولوں کو جلاوطن کرنے کی دھمکی دیتے تھے تو اس نازک وقت میں خدا اپنے وعدے کی تجدید فرماتا اور اپنے رسولوں سے کہتا کہ گھبراؤ نہیں، عنقریب یہ دھمکی دینے والے اپنے ملک سے خود مٹ جائیں گے اور اپنی زمین میں ہم تمہیں آباد کریں گے اور تمہیں اس کے وارث ہوگے۔ آیت کا آخری ٹکڑا بتاتا ہے کہ خدا کی نصرت وحمایت اور وارث زمین بنانے کا یہ وعدہ ہر اس گروہ کے لیے ہے جو آخرت کی بازپرس اور عذاب الٰہی سے ڈرتا ہوا اس طرح زندگی بسر کرے جس طرح اللہ کے رسولوں نے اپنی زندگیاں بسر کیں۔ (باقی)

ایک ضروری اعلان

ماہنامہ زندگی جب سے شائع ہو رہا ہے آج تک اس کا سالانہ چندہ نہیں بڑھایا گیا جبکہ ہند و پاک میں ۴۸ صفحات کا کوئی ماہانہ رسالہ پانچ روپیے سالانہ پر نہیں ملتا۔ لیکن اب ہمارا خسارہ اس حد پر پہنچ گیا ہے کہ چندہ بڑھائے بغیر چارہ نہیں اس لیے ہم بہت مجبور ہو کر یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اکتوبر ۱۹۶۸ء سے ماہنامہ زندگی کا سالانہ چندہ چھ روپیے اور ششماہی تین روپیے ہوگا۔ ہر شمارے کی قیمت ۶۰ پیسے ہوگی۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء سے پہلے جو لوگ خریدار ہوں گے انہیں موجودہ قیمت ہی پر رسالہ بھیجا جائے گا۔

منیجر زندگی، رامپور یو پی

جلد:- ۳۳
شمارہ:- ۲

ربیع الاول ۱۳۸۴ھ
اگست ۱۹۶۴ء

زندگی

(مدیر:- سید احمد قادری)

• خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور، یوپی
• زر سالانہ:- چھ روپے (۶ر) ششماہی:- تین روپیہ (۳ر) فی پرچہ پچاس پیسے
• ممالک غیر سے:- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں

منیجر ہفت روزہ شہاب c/۱۱ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک:- جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر:- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر:- احمد حسن۔ مطبع:- دہلی پرنٹنگ ورکس محلہ بنگلا آزاد دہلی
دفتر اشاعت:- دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(گزشتہ سے پیوستہ)

سید اسعد قادری

چوتھی دلیل

جب فراعین مصر کی بغاوت و سرکشی اور بنی اسرائیل پر ان کا ظلم حد سے تجاوز کر گیا تو ارادۂ الٰہی میں جنبش پیدا ہوئی وہ ارادہ کیا تھا اسے خود فرماں روائے کائنات کے الفاظ میں دیکھیے۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ	فرعون ملک مصر میں بہت چڑھ چڑھ رہا تھا
وَجَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ	اور اس نے وہاں لوگوں کے الگ الگ گروہ قرار
طَآئِفَۃً مِّنْھُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَھُمْ	دیے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو
وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَھُمْ اِنَّہٗ کَانَ	اس نے اس قدر کمزور سمجھ رکھا تھا کہ ان کے بیٹوں کو
مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ وَنُرِیْدُ	ذبح کرا دیتا اور ان کی عورتوں (بیٹیوں) کو زندہ
اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا	رکھتا۔ بلاشبہ وہ فسادیوں میں سے ایک فسادی تھا
فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَھُمْ اَئِمَّۃً	اور ہم نے ارادہ کیا کہ جو لوگ اس ملک میں کمزور سمجھے
وَّنَجْعَلَھُمُ الْوٰرِثِیْنَ ۝ وَنُمَکِّنَ	گئے تھے ان پر احسان کریں اور انہیں سردار و پیشوا بنائیں
لَھُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ	اور انہیں (سلطنت کا) وارث بنا دیں اور زمین میں
وَھَامٰنَ وَجُنُوْدَھُمَا مِنْھُمْ	ان کے اقتدار کو جما دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے
مَّا کَانُوْا یَحْذَرُوْنَ ۝	لشکروں کو بنی اسرائیل کی طرف سے جس بات کا خطرہ تھا
(القصص ۱)	وہ بنی اسرائیل ہی کے ہاتھ سے اُن کے سامنے لے آئیں

بنی اسرائیل پر احسان کرنا انہیں امامت و پیشوائی کے منصب پر فائز کرنا انہیں حکومت و سلطنت کا وارث بنانا زمین میں ان کے اقتدار کو جما دینا اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو مغلوب کرنا۔ یہ تھا وہ ارادہ جو سلطان کائنات نے کیا۔

اللہ کا یہ ارادہ کس طرح ظہور میں آیا؟ اس کی مفصل روداد آگے کی آیتوں اور قرآن کی دوسری سورتوں میں بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو رسالت و نبوت عطا کر کے انہیں اس مشن کی تکمیل پر مامور فرمایا گیا اور انہیں کے ہاتھوں ارادۂ الٰہی ظہور میں آیا۔

ایک طرف فرعون کی جبار و زور آور حکومت تھی اور دوسری طرف مغلوب بنی اسرائیل کی انتہائی بے بسی اور کمزوری تھی۔ ایسی قوم کے دو بے بس افراد کا اس عظیم و جاں گداز مشن پر بھیجا جانا سخت حیرت ناک بلکہ دہشت ناک واقعہ تھا شاید اسی لیے اللہ مالک الملک نے اس مشن پر بھیجتے وقت ہی ان دونوں سے جو صریح وعدہ فرمایا اس کے الفاظ بھی پڑھتے چلیے۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ	فرمایا۔ ہم تمہارے بھائی کو تمہارا قوتِ
وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا	بازو بنائیں گے اور تم دونوں کو ایسا غلبہ دیں گے
فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا ۚ بِآيَاتِنَا ۚ أَنْتُمَا	کہ فرعون کے لوگ تم تک پہنچ ہی نہ سکیں گے ہماری نشانیوں
وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُونَ ○	کے زور سے تم دونوں اور تمہاری پیروی کرنے والے
(القصص ۳۵)	ہی غالب رہیں گے۔

قرآن کی ان صراحتوں کو پڑھ کر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارون باطل کو مغلوب کر کے حق کو غالب کرنے کے مشن پر مامور نہ تھے اور کون یہ تصور کر سکتا ہے کہ رسالت و نبوت کے منصب سے حکومت و سلطنت کا تعلق محض ضمنی اور جزوی ہوتا ہے۔ ان آیتوں سے زیادہ واضح اور کس نص صریح کی ضرورت ہے جو یہ بتائے کہ انبیاء کرام کے مقصد بعثت میں غلبۂ حق اور حکومت و اقتدار کا حصول بھی داخل رہا ہے کیونکہ حکومت کے بغیر دین حق کی کامل پیروی ممکن ہی نہیں ہے۔

پانچویں دلیل

مکے میں دعوت اسلامی کے ابتدائی دور ہی میں یہ پُر جلال شاہی اعلان سُنا دیا گیا تھا۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ	عنقریب ان کا جتھا شکست کھا جائے گا اور

الْغٰلِبُوْنَ ٥ (القمر - ۴۵) یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مکے میں دعوت اسلامی کا رنگ کچھ اور تھا اور مدینہ پہنچ کر اس کا رنگ اچانک بالکل بدل گیا۔ مکے میں آخری نبی نے اپنے آپ کو اور اپنے ماننے والوں کو بس ایک واعظ و ناصح گروہ کی شکل میں پیش کیا تھا اور مدینہ پہنچ کر انھوں نے یکایک تلوار سونت لی۔ معلوم نہیں یہ چھوٹی سی آیت ان کی نگاہ سے گزری ہے یا نہیں۔ اس آیت نے ابتدا ہی میں مخاطبین قرآن پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ اسلام کی جو دعوت پیش کی جارہی ہے اس کی نوعیت کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ نہ مسلمانوں کو اس کے بارے میں کوئی غلط فہمی تھی اور نہ کفار و مشرکین کو۔ مسلمان بھی خوب جانتے تھے کہ دین حق کو غالب کرنے کے لیے جہاد بالسیف کا مرحلہ آکر رہے گا اور کفار بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ دعوت اسلامی ان کے تخت اقتدار کو الٹ دینے والی ہے۔

چھٹی دلیل

اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ	کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اس کے کناروں
نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۚ اَفَهُمُ	سے گھٹاتے چلے آرہے ہیں۔ پھر کیا وہی غالب
الْغٰلِبُوْنَ ٥ (انبیاء ۴۴)	رہیں گے۔

اس آیت میں مشرکوں سے کہا گیا ہے۔ کیا وہ دیکھتے نہیں کہ دین حق کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے اور دین باطل کا دائرہ سمٹتا جا رہا ہے کیا اس کے بعد بھی ان کے دل کی آنکھیں نہیں کھلتیں، کیا وہ محسوس نہیں کرتے کہ دعوت حق کے پیچھے کون سی طاقت کام کر رہی ہے۔ کیا وہ اب بھی اسی خیال خام میں پڑے ہیں کہ حق پرستوں کے مقابلے میں وہی غالب رہیں گے۔ کیا انھوں نے ہمارے رسول کے ڈراوے کو ایک بے اثر اور بے نتیجہ دھمکی سمجھ رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس استفہام انکاری نے پوری قوت کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا ہے کہ غالب محمد و اصحاب محمد ہی ہوں گے اور مغلوبیت ان لوگوں کے حصے میں آئے گی جو آج حق کے سامنے سینہ تان کر چل رہے ہیں۔

ساتویں دلیل

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ	بات یہ ہے کہ ہم حق کو (پتھر کی طرح) باطل
فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ	پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے پھر
وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا	دیکھتے دیکھتے ملیامیٹ ہو جاتا ہے اور تباہی ہے

تَخْلُقُوْنَ ۝ (انبیاء ر ۲) لیے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو

اس آیت نے استعارے کی زبان میں اس حق کی نوعیت واضح کردی جسے دے کر اللہ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تھا۔ کفار یہ سمجھتے تھے کہ یہ روئی کا پولا ہے جس کی مار سے ان کے دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ نے فرمایا یہ روئی کا پولا نہیں بلکہ پتھر کا گولا ہے جو تمہارے دین باطل کا سر توڑ کر رکھ دے گا۔ تم بے ہودہ اور لغو باتیں بنا کر خود اپنی تباہی کا سامان کر رہے ہو۔

آٹھویں دلیل

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ	اور یہ لوگ چلتے تھے کہ تمہارے قدم
مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا	اس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے
وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا	نکال باہر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے
قَلِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل ر ۸)	بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکیں گے۔

ہم نے اوپر تیسری دلیل میں سورۂ ابراہیم کی دو آیتیں نقل کر کے دکھایا ہے کہ جب منکرین حق اپنے وقت کے رسول کو جلاوطن کرنے کی دھمکی دیتے تھے تو ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ اپنی مدد کے وعدے کی تجدید فرماتا۔ بنی اسرائیل کی اس آیت نے بتایا کہ جب کفار نے حضور کو مکے سے نکالنے کا ارادہ کیا تو اللہ نے اپنی سنت کے مطابق وعدے کی تجدید فرمائی۔ اس سے ایک طرف تو حضور کی ڈھارس بندھی اور دوسری طرف کفار مکہ کو بھی ہشیار کیا گیا لیکن اگلوں کی طرح انھوں نے بھی اس دھمکی کی پروا نہ کی اور حضور مکے سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ کا وعدہ اور وعید دونوں ہی کس طرح ظہور میں آئے۔ سورۂ انفال میں آپ کے خلاف کفار مکہ کے مکر کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ
لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ	منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ
وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ	تجھے قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں
وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝	وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا
(انفال ر ۴)	تھا اور اللہ کی چال سب سے بڑھ کر ہوتی ہے

ایک لمبی داستان کو چند الفاظ میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس کو تفصیل کے ساتھ یہاں نقل کرنے کی ضرورت

نہیں۔ آیت کا آخری ٹکڑا قابل غور ہے۔ جو یہ بتاتا ہے کہ اللہ نے اپنے رسولوں سے امداد کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ اسے کس طرح پورا کرتا رہا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا اس طرح کی تمام آیتیں پیش کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ یہ چند آیتیں بھی پوری وضاحت سے اعلان کر رہی ہیں کہ اللہ تعالے ہمیشہ اپنے رسولوں کو اس مقصد سے بھیجتا رہا ہے کہ ان کے ذریعہ باطل کو شکست دے اور حق کو غالب کرے۔

اوپر کی آیتوں میں بھی یہ موجود ہے کہ جو وعدہ رسولوں سے کیا گیا ہے وہی ان پر ایمان لانے والوں سے بھی کیا گیا ہے لیکن مزید وضاحت کے لیے چند ایسی آیتیں بھی پیش کی جا رہی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ ایمان لانے والوں کا ذکر ہے یا جن میں اصل مخاطب مومن گروہ ہی ہے۔

آٹھویں دلیل

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ	بلاشبہ ہم اپنے رسولوں اور مومنوں کی مدد
اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ	کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور مدد کریں گے جس
يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ (المومن ر۶)	دن گواہ کھڑے ہوں گے (یعنی قیامت کے دن)

دنیا کی زندگی میں رسولوں اور مومنوں سے جس مدد کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا ذکر اوپر کی آیتوں میں گزر چکا اور اس مدد کی تفصیلات سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ حزب الشیطان کے مقابلے میں حزب اللہ کو کامیاب کرنا۔ یہ ہے ان تفصیلات کا خلاصہ اور اس مدد کی نوعیت کا بیان آگے کی آیتوں میں بھی آ رہا ہے۔

نویں دلیل

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ	دل شکستہ نہ ہو غم نہ کرو۔ تمہیں سربلند
الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آل عمران)	رہو گے اگر مومن ہو۔

اس آیت نے وعدۂ نصرت کی نوعیت یہ بتائی کہ اللہ مومنوں (اگر وہ سچے مومن ہوں) کو سربلند اور کافروں کو نگوں سار کرے گا۔

دسویں دلیل

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ	اور جو اللہ، اس کے رسول اور مومنوں
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ	کی رفاقت اختیار کرے گا تو اسے معلوم ہو کہ

الغالبون ٥ (المائدہ ۵ ر ۵۶) اللہ ہی کی جماعت غالب ہونے والی ہے۔

اس آیت کا اسلوب بیان قابلِ غور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی جماعت تو بنی ہی اس لیے ہے کہ وہ غالب ہو مثبت حال یہ ہے کہ جو لوگ اللہ رسول اور مومنوں کو اپنا دوست بنائیں اور ان کی رفاقت اختیار کریں غلبہ انہیں ہی حاصل ہوگا۔

حق و باطل کی کش مکش میں جو لوگ باطل کے ظاہری زور و قوت کو دیکھ کر کفار و مشرکین سے دوستی کے پینگ بڑھاتے یا یہود و نصاریٰ کی طرف مائل ہوتے یا نفاق و ارتداد کی روش اختیار کرتے ہیں وہ سخت احمق ہیں۔ اگر وہ غلبہ اور عزت و قوت چاہتے ہیں تو انہیں حزب اللہ کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ حقیقی غلبہ و عزت اسی گروہ کے لیے مقدر ہے۔

غلبہ و اقتدار کس لیے۔

باطل پرستوں کو مغلوب و نگوں سار کرنے اور حق پرستوں کو غالب و سربلند کرنے کی غرض کیا ہے اور کس لیے انہیں غلبہ و اقتدار بخشا جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے :۔

حق پرستوں کو غلبہ و اقتدار اس لیے بخشا جاتا ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا دین خود ساختہ ادیان پر غالب اور اسی کا نازل کیا ہوا قانونِ حیات نافذ و رائج ہو۔

انبیاء کرام کے مقصدِ بعثت کی جو بحث اوپر گزری اس میں یہ سوال و جواب اشارتاً و اجمالاً موجود ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہاں صراحتاً و تفصیلاً بھی کچھ عرض کریں۔ اس لیے کہ اس کے بغیر مقصدِ بعثت کی بحث مکمل نہیں ہو سکتی۔ پہلے چند آیتیں پیش کی جا رہی ہیں۔

دو آیتیں

سورۂ بقرہ رکوع ۲۶ - آیت ۲۱۳ اور ۲۱۴ سامنے رکھیے۔ ہم ان دو آیتوں کا صرف ترجمہ نقل کرتے ہیں

ابتداء میں تمام انسان ایک ہی دین و ملت پر تھے (پھر ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوا) تب اللہ نے اپنے نبی بھیجے جو بشارت اور ڈراوا سنانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں ان کے درمیان جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے۔ اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر

مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔

پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لائے انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔ ۲۱۳

پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے یہاں تک کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔ ۲۱۴

یہ دو آیتیں ہمارے سامنے صرف انبیاء کے مقصدِ بعثت ہی کو واضح نہیں کرتیں بلکہ دینِ حق جس جاں کاہ و جاں گسل مرحلوں سے گزر کر قائم و غالب ہوتا ہے اس کا بھی نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ان دو آیتوں سے مندرجہ ذیل چار باتیں بوضاحت معلوم ہوتی ہیں۔

(الف) دنیا میں بنی نوع انسان نے اپنا سفرِ حیات حق کی روشنی میں شروع کیا تھا حق کا علم پا لینے کی وجہ سے انسانی گروہ عرصۂ دراز تک ایک ہی ملت اور ایک ہی امت بنا رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ کچھ خود غرض لوگوں کی نفسانیت، ایک دوسرے پر زیادتی اور ذاتی مفاد کے جھگڑوں نے وحدت ملت کو پارہ پارہ کر دیا اور دینِ حق میں اختلافات پیدا کر دیے لیکن اللہ چونکہ رحمٰن و رحیم ہے اس لیے اس نے انسانوں کو تباہ و برباد ہونے کے لیے بے سہارا نہ چھوڑا بلکہ ان کی صلاح و فلاح کے لیے اپنے برگزیدہ بندے مبعوث کیے۔

(ب) تمام انبیاء و رسل کے ساتھ اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب برحق بھی ہوتی تھی جو عقائد و اعمال کے تمام اختلافات و نزاعات کے لیے قاضی اور حاکم کی حیثیت رکھتی تھی۔ انبیاء صرف اسی لیے نہیں بھیجے جاتے تھے کہ خوش خبری اور ڈراوا سنا دیں بلکہ انہیں کتاب برحق دے کر اس بات پر بھی مامور کیا جاتا تھا کہ وہ تمام اختلافات کو مٹا کر لوگوں کو پھر اسی دینِ حق پر جمع کریں جس میں اختلاف پیدا کر کے وہ الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ زندگی کا کوئی معاملہ بھی ہو صرف اس کتاب کو یہ حق ہوتا تھا کہ وہ اس کے صحیح یا غلط حق یا باطل ہونے کا فیصلہ کرے۔ اللہ کی کتابوں یعنی اس کے نازل کردہ قوانین و شرائع کی حاکمیت اور ان کی حیثیت کی مزید توضیح کے لیے سورۂ مائدہ کی آیات ۴۴ تا ۵۰ نیز آیات ۶۶ تا ۸۶ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

(ج) سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو مخاطب کر کے بتایا گیا ہے (باقی صفحہ ۶۲ پر)

امام ابو یوسف کا معاشی فکر

(۲)

(مولانا نجات اللہ صدیقی مسلم یونیورسٹی)

اوپر ہم نے صرف ایک مخصوص محصول کے سلسلے میں قاضی صاحب کے فکر کا جائزہ لیا ہے۔ قاضی صاحب نے اپنی کتاب میں دوسرے محاصل مثلاً زکوٰۃ، عشر و خمس، جزیہ اور محاصل چنگی پر بھی گفتگو کی ہے۔ یہاں ان بحثوں کا تفصیلی جائزہ لینے کی گنجائش نہیں لیکن بعض ایسے نکات کا ذکر مفید رہے گا جن کا تعلق محاصل کے بارے میں ان کے عام فکر سے ہے۔

اوپر نقل کی ہوئی عبارت سے یہ واضح ہے کہ ابو یوسف کے نزدیک شرعاً ضروری ہے کہ خراج کی شرحیں کاشتکاروں کے لیے قابل برداشت ہوں، اور ان کی زمینوں کی پیداوار آسانی سے ان کا بار اٹھا سکتی ہو۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ شرحیں ہلکی ہونی چاہییں کیونکہ ہلکی شرحیں آبادی اور خوش حالی میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں[1]

دوسرا اصول جس پر انھوں نے زور دیا ہے یہ ہے کہ ان محاصل کی شرحیں مرکزی حکومت کی طرف سے متعین ہونی چاہییں۔ مقامی عمال حکومت اور محصلین خراج کو ان میں کمی بیشی کا اختیار نہیں ہونا چاہیے[2] مقامی افسروں کو اپنی طرف سے خراج میں اضافہ کرنے، کوئی اور محصول عائد کرنے، یا کسی عنوان سے مزید رقمیں یا غلہ وصول کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس ضمن میں وہ عمال حکومت کے لیے رعایا سے تحفے قبول کرنے کو بھی سختی سے منع کرتے ہیں[3]

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۴۲

[2] ایضاً صفحہ ۹۲، ۹۶، ۱۲۸، ۱۳۰

[3] ایضاً صفحہ ۱۲۵

محاصل کے ہلکے اور قابل برداشت ہونے اور ان کے متعین ہونے کے ساتھ تیسرا اصول یہ ہے کہ ان کو سہولت اور نرمی کے ساتھ وصول کیا جائے۔ فصل تیار ہو جانے پر اس میں سے سرکاری حصہ وصول کرنے کا کام جلد از جلد انجام پا جانا چاہیے تاکہ غلہ کھلیانوں میں خراب نہ ہو، کاشتکاروں کا حرج نہ ہو اور ان کی زرعی سرگرمیاں متاثر نہ ہوں۔ غلہ تقسیم کرتے وقت ناپ تول ٹھیک پیمانوں کے ذریعے انصاف کے ساتھ کی جانی چاہیے۔ کاشتکاروں کی حق تلفی نہیں ہونی چاہیے۔ ضروری ہے کہ تقسیم پیمانوں کے ذریعہ ہو، تخمینے پر مبنی نہ ہو۔[1]

انھوں نے محاصل کی تحصیل میں سختی، بالخصوص مار پیٹ اور ایذا دہی سے کام لینے کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی ہے اور خلیفہ کو بار بار تاکید کی ہے کہ اس قسم کی زیادتیوں کا سد باب کریں۔[2]

ابو یوسف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ محاصل کی تحصیل پر بہت دیانت دار اور قابل اعتماد افراد مامور کیے جائیں جو اسلامی قانون کا علم بھی رکھتے ہوں۔[3] ان کو معقول مشاہرے دیے جائیں۔[4] ان کے طرز عمل پر کڑی نگرانی رکھی جائے۔ جو محصل یا والی کسی بدعنوانی کا مرتکب ہو اس کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ جس افسر کے خلاف خیانت، غبن یا کسی بدکرداری کا الزام تحقیق کے ساتھ ثابت ہو جائے اسے برطرف کر دیا جائے اور آئندہ اسے کبھی کوئی عہدہ نہ دیا جائے۔[5]

محاصل کی تعیین، تخفیف، ان کی تحصیل میں نرمی سے کام لینے، اور محصلین کے لیے امانت و دیانت اور علم کی ضرورت پر زور دیتے وقت قاضی ابو یوسف نے ایک طرف تو آثار و احادیث سے استناد کیا ہے اور دوسری طرف مفاد عامہ اور انسانی حقوق کا حوالہ دے کر ان اصولوں کی اہمیت جتلائی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ انہیں اصولوں کی پابندی میں معاشرے کی مادی اور روحانی فلاح بھی مضمر ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"عدل پر قائم رہنے، مظلوم کے ساتھ انصاف کرنے اور ظلم و جور سے پرہیز کرنے میں جو اجر دیا اجر ہے اس کے ماسوا اس سے ملک کی خوش حالی میں اضافہ ہوتا ہے اور خراج کی آمدنی بڑھتی

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۲۹-۱۳۰ [2] ایضاً ص ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۷، ۱۴۹ [3] ایضاً ص ۱۲۷-۱۲۸

[4] ایضاً ص ۱۳۲ [5] ایضاً ص ۱۳۲-۱۳۳

ہے۔ برکت عدل کے ساتھ وابستہ ہے، ظلم و جور کے ساتھ برکت ختم ہو جاتی ہے۔ جو خراج ظلم و زیادتی کے ساتھ جمع کیا جاتا ہے اس سے ملک تباہ و بدحال ہو جاتے ہیں[1]۔

۲۔ غلہ کا نرخ اور اس کی رسد

زرعی زمینوں کے محاصل پر گفتگو کے ضمن میں ابو یوسف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نرخ ایک سطح پر نہیں قائم رہتا بلکہ اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے، لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں:

"ارزانی اور گرانی کی کوئی متعین حد نہیں ہے جسے معلوم کیا جا سکے۔ یہ (نرخ کا) معاملہ اوپر آسمان سے طے ہوتا ہے، نہیں معلوم کہ یہ کس طرح طے پاتا ہے۔ ارزانی، غلہ کی فراوانی کے سبب نہیں ہوتی، نہ گرانی اس کی قلت کے سبب ہوتی ہے۔ نرخ کی ارزانی اور گرانی اللہ کے فیصلے اور اس کے حکم کے تحت ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ غلہ فراواں ہو مگر گراں ہو اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کم ہو مگر سستا ہو[2]۔"

غالباً عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ غلہ کی گرانی اور ارزانی صرف اس کی رسد کی کمی بیشی پر منحصر ہے جب غلہ زیادہ ہوتا ہے تو اس کا نرخ گر جاتا ہے، جب کم ہوتا ہے تو نرخ چڑھ جاتا ہے۔ قاضی صاحب نے اس نظریے کی تردید کی ہے۔ ان کی تردید کی بنیاد ان کا یہ مشاہدہ ہے کہ بسا اوقات غلہ فراواں ہونے کے باوجود بھی گراں ہوتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی رسد کم ہو مگر نرخ ارزاں ہو۔ اس مشاہدہ کو وہ اس بات کی کافی دلیل خیال کرتے ہیں کہ غلے کے نرخ کے گھٹنے بڑھنے کا انحصار صرف اس کی رسد یا پیداوار پر نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو گراں نرخ کے ساتھ ہمیشہ غلہ کی رسد کی کمی اور ارزاں نرخ کے ساتھ ہمیشہ رسد کی فراوانی نظر آتی۔ چونکہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایسا نہیں لہذا عام خیال کو صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا نہ اس پر کسی سماجی پالیسی مثلاً نظام محاصل کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

جیسا کہ سیاق و سباق سے ظاہر ہے اس نکتہ کا ذکر اس بحث کے ضمن میں آیا ہے کہ متعین نقد رقم کی شکل میں محصول وصول کرنا مناسب ہے کہ نہیں۔ اس بحث کے لیے اتنا کافی تھا کہ غلہ کے نرخ اور اس کی پیداوار کے باہمی ربط پر گفتگو کی جائے۔ قاضی صاحب کے نزدیک غلہ کے نرخ (یا درہم کی قوت خرید) اور غلہ کی رسد اور پیداوار کے درمیان کوئی مضبوط اور مطلق ربط نہیں پایا جاتا۔ اسی حقیقت کو انھوں نے اپنی اس رائے کی بنیاد بنایا ہے کہ متعین نقد رقم کی صورت میں لگان

---

[1] کتاب الخراج ص۱۳۲ [2] ایضاً ص۴۸

تحصیل وصول کرنا انصاف کے تقاضوں کو نہیں پورا کر سکتا کیونکہ متعین کی ہوئی رقم کبھی زیادہ غلہ کے برابر ہوگی اور یہ کہنا ممکن نہیں کہ پہلی شکل پیداوار کی کمی اور دوسری شکل پیداوار کی کثرت سے وابستہ ہے[1]

چونکہ غلہ کے نرخ کا مسئلہ محض ضمناً سامنے آیا تھا لہذا ابو یوسف نے اس پر مزید بحث نہیں کی ہے' نہ انھوں نے اس کا گہرا تجزیہ کیا ہے' انھوں نے نہ تو رسد کے بالمقابل طلب کے حالات کی طرف توجہ کی ہے' نہ آمدنیوں میں کمی بیشی یا معاشرے میں مقدار زر کی کمی بیشی اور نرخ کے درمیان کوئی ربط تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ بات یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کافی نہیں کہ ان عوامل پر ان کی نظر نہیں ہے۔ اس کی دلیل' علاوہ اس بات کے کہ ان کا اصل موضوع نرخ کے تعین کا مسئلہ نہیں ہے' یہ ہے کہ انھوں نے اس ضمن میں احتکار کرنے والوں کی سرگرمیوں کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہے جب کہ وہ اور ان سے پہلے کے فقہاء اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ احتکار کے نتیجہ میں نرخ گراں ہو جاتا ہے' مزید برآں ان سطروں سے ذرا پہلے' یہ خیال ظاہر کرتے وقت کہ متعین نقد رقم کی شکل میں زرعی محصول وصول کرنا خلاف عدل ہے' وہ یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ اس سلسلے میں چند دوسرے عوامل کو بھی دخل حاصل ہے۔

ان باتوں کے پیش نظر' اور ان کے اس بیان کو سامنے رکھتے ہوئے کہ "نہیں معلوم کہ یہ کس طرح طے پاتا ہے" ہم یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ان کے نزدیک نرخ کا انحصار صرف اس کی رسد پر نہیں' وہ اس سلسلے میں بعض دوسرے عوامل کو بھی دخیل سمجھتے ہیں' مگر ان عوامل کا احاطہ نہیں کر سکے ہیں۔ اس رائے کو تجزیاتی اعتبار سے بہت وقیع نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابو یوسف کو اس باب میں نہ تو اپنے علمی مآخذ سے کوئی واضح رہنمائی ملی تھی' نہ وہ ارسطو کے تجزیے سے باخبر تھے (جو خود ناقص تھا اور رسد و طلب کے تعامل پر مبنی تعیین نرخ کا نظریہ نہیں پیش کر سکا تھا)[2] رسد اور طلب کے باہمی تعامل سے نرخ کی تعیین کا نظریہ ابو یوسف کے صدیوں بعد باقاعدہ شکل اختیار کر سکا[3] خود مسلمان مفکرین میں ان کے بعد آنے والے علماء مثلاً ابن تیمیہ[3] اور ابن خلدون[4] کے یہاں ہمیں ان سے بہتر تجزیہ ملتا ہے۔

---

[1] شمپیٹر بحوالہ صفحہ

[2] جہاں تک تعیین نرخ کے طریق کے بارے میں نظریہ کا سوال ہے اٹھارویں صدی سے قبل کوئی بات قابل ذکر نہیں۔ شمپیٹر بحوالہ صفحہ ۳۰۵

[3] ملاحظہ ہو ان کا رسالہ الحسبۃ فی الاسلام

[4] عبدالرحمٰن ابن خلدون، مقدمہ فصل فی اسعار المدن اور فصل فی المعاش و وجوہ من الکسب و الصنائع اور دوسری متعلق فصلیں۔

۴۔ ترقیاتی اسکیموں کی لاگت کس طرح پوری کی جائے۔

ابو یوسف نے کتاب الخراج کے ابتدائی صفحات میں اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ سلامی ریاست کے سربراہ کی ذمہ داری ہے کہ اپنے شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن کوشش کرے ہ ملک کے معاشی فلاح کو اسلامی ریاست کا ایک مقصد قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ لیفہ کو ایسے مشورے دیے ہیں جن کا مقصد عوام کی مادی فلاح و بہبود ہے۔ چنانچہ انھوں نے خلیفہ کو مختلف رقیاتی کاموں کا بھی مشورہ دیا ہے۔ دوسری صدی ہجری میں اسلامی مملکت کی معیشت ایک زرعی معیشت تھی۔ ابو یوسف نے ہارون الرشید کو مشورہ دیا ہے کہ وہ نہریں تعمیر کرائیں اور پرانی اور از کار رفتہ نہروں کی مرمت اور صفائی کروا کے ان کو پھر سے جاری کریں[1] سیلاب کی روک تھام کے لیے بند تعمیر کریں[2]۔ زیر آب زمینوں کی بازیافت کا اہتمام کریں[3] اور ہر وہ اقدام کریں جس میں کاشتکاروں کی بہبود مضمر ہو[4]

یہاں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو نہ کی جائے گی۔ ہماری بحث اس ضمن میں پیدا ہونے والے ایک مخصوص مسئلہ تک محدود ہوگی یعنی ان ترقیاتی اسکیموں کی لاگت کس طرح پوری کی جائے گی؟ ان سے متعلق جملہ اخراجات ریاست کے عام خزانے سے پورے کیے جائیں گے (جس میں خراج اور چنگی وغیرہ محاصل کی آمدنی جمع ہوتی تھی) یا ان افراد سے بھی کچھ وصول کیا جائے گا جن کو ان اسکیموں سے فائدہ پہنچنے والا ہو؟ ابو یوسف نے اس مسئلے پر بحث کی ہے اور اس سلسلے میں ایک اصول تجویز کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"میری رائے ہے کہ آپ خراج کے افسروں کو ہدایت کر دیں کہ جب ان کی عملداری کے کچھ لوگ ان کے پاس آکر یہ بتائیں کہ ان کے علاقے میں بہت سی قدیم نہریں ہیں جو اب ناکارہ ہو گئی ہیں۔ اور (نہر کے کسی جگہ بند ہو جانے کی وجہ سے) بہت سی زمینیں زیر آب آگئی ہیں یا دلدل بن گئی ہیں۔ اور یہ کہ اگر وہ ان کی کھدائی اور صفائی کروا دیں اور ان میں از سر نو پانی جاری ہو جائے تو یہ ناکارہ زمینیں آباد کر لی جائیں گی اور اس طرح خراج کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ تو ان کی یہ عرض داشت آپ کو ارسال کر دی جائے۔ پھر آپ کسی معتمد علیہ دیانت دار، صاحب صلاح و تقویٰ

---

[1] کتاب الخراج ص۱۱۰ اور ص۱۲۰-۱۲۴

[2] ایضاً ص۱۱۰ اور ۱۱۹

[3] ایضاً ص۱۲۰

[4] ایضاً ص۱۱۰

آدمی کو اس بارے میں جائزہ لینے کے لیے بھیجیے۔ یہ آدمی اس علاقے کے ثقہ، واقف کار اور صاحب بصیرت لوگوں سے معلومات حاصل کرے اور باہر کے تجربہ کار اور صاحب رائے افراد سے بھی مشورہ کرے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اس (جائزہ لینے والے) آدمی کو کوششوں سے اپنے ذاتی نفع کی ترویج یا نقصان کی تلافی نہ مقصود ہو۔ اگر سب کی یہ رائے ہو کہ اس اسکیم کو زیر عمل لانے میں فائدہ ہے اور خراج کی آمدنی میں بھی اضافہ کی توقع ہے تو آپ ان نہروں کی کھدائی اور صفائی کا حکم جاری کر دیجیے اور اس کام کے سارے مصارف کا بار بیت المال پر ڈالیے۔ ان اخراجات کا بار اس علاقے کے باشندوں پر نہ ڈالیے کیونکہ ان لوگوں کا خوش حال رہنا ان کے برباد ہو جانے سے بہتر ہے۔ اور ان کا آباد رہنا اس سے بہتر ہے کہ وہ مفلس ہو کر (ادائے خراج سے) معذور ہو جائیں۔

"اپنی زمینوں اور نہروں کی درستی اور ترقی کے سلسلے میں اہل خراج کے ہر ایسے مطالبے کو پورا کیا جانا چاہیے جس سے ان کے مفادات و مصالح کی ترویج ہوتی نظر آئے بشرطیکہ اس اسکیم پر عمل کرنے سے اس علاقے کے گرد و پیش کے دوسرے گاؤں اور قصبات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر ان کا مطالبہ پورا کرنے سے دوسروں کی پیداوار کم ہو جانے اور خراج کی آمدنی میں کمی ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اسے نہیں پورا کرنا چاہیے۔

"باشندگان سواد کو اگر اپنی ان بڑی نہروں کی کھدائی اور صفائی کی ضرورت پیش آئے جو دجلہ و فرات سے نکالی گئی ہیں تو آپ ان کی کھدائی اور صفائی کروا دیجیے۔ اس کے اخراجات کا بار بیت المال اور اہل خراج دونوں پر ڈالا جائے گا۔ سارا بار اہل خراج پر ڈال دینا صحیح نہ ہوگا۔

"رہیں وہ چھوٹی نہریں جن کے ذریعے لوگ اپنے کھیتوں، باغات، نخلستانوں، انگور کی کیاریوں، یا ترکاری کے کھیتوں وغیرہ تک پانی لے جاتے ہیں تو ان کی کھدائی اور صفائی کے اخراجات ان لوگوں کو خود برداشت کرنے ہوں گے۔ بیت المال پر اس سلسلے میں کوئی بار نہ ڈالا جائے گا۔

"دجلہ و فرات اور دوسرے بڑے دریاؤں پر گھاٹ، بند اور پانی نکالنے کی جگہوں کی تعمیر اور مرمت پر کئے والے مصارف کا پورا بار بیت المال پر ڈالا جائے گا۔ اہل خراج پر اس سلسلے میں کوئی بار نہ ڈالا جائے گا۔ کیونکہ یہ سارے مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے امور ہیں، اور ان کے مصالح کا تحفظ تمام تر امام کے ذمے ہے کیونکہ زمینوں کی بربادی کے اسباب ایسے ہی ہوتے ہیں[1] اور ان کی

[1] یعنی بند کا پھٹ جانا یا پانی کا نکاس بند ہو جانا (صدیقی)

بربادی کا برا اثر خراج کی آمدنی پر پڑتا ہے۔ لہٰذا ان سے متعلق تمام اخراجات بیت المال سے پورے کیے جائیں گے۔

"ان مصارف پر مال خرچ کرنے کا اختیار ایسے ہی ذمہ دار کے ہاتھ میں دیجیے جو خوف خدا رکھتا ہو، جس کی امانت داری قابل اطمینان اور جس کا مسلک قابل تعریف ہو اور جو اللہ کی رضا کے لیے اس سلسلے میں وہ کام کرے جو اسے کرنا چاہیے۔ خائن اور جائز و ناجائز میں کوئی تمیز کیے بغیر کام کرنے والوں کو ذمہ داری نہ سونپیے۔ ایسا آدمی بیت المال کا روپیہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے اڑا لے گا، خطرے کے مقامات کی مرمت نہیں کرائے گا، یا ان پر کچا کام کرا کے انہیں مستحکم نہیں بنائے گا۔ تا آں کہ وہاں سے پانی پھوٹ پڑے گا اور عوام کے غلے، مکانات اور ان کی پوری پوری بستیاں ڈوب کر تباہ ہو جائیں گی۔

"ذمہ دار مقرر کر دینے کے بعد آپ کسی دوسرے آدمی کو اس ذمہ دار کی کارکردگی کا جائزہ لینے پر مامور کیجیے جو معائنہ کرے کہ یہ ذمہ دار خطرے کے مقامات پر کیا کام کروا رہا ہے۔ کن قابل مرمت جگہوں پر اس نے کام نہ لگانے کا فیصلہ کیا ہے، کن مرمت شدہ جگہوں سے پانی پھوٹ پڑتا ہے اور ایسا ہونے کی وجہ کیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہاں پر کام لگوا کر جو اجرت دی گئی وہ بے نتیجہ ضائع گئی اور مرمت ناکارہ ثابت ہوئی۔ اس جائزے کے بعد آپ کو جو رپورٹ ملے متعلقہ افسر کے ساتھ اسی کے مطابق سلوک کیجیے۔ اس کے کام کی تعریف کیجیے یا اس کی مذمت کیجیے اور اس کے خلاف تادیبی کارروائی کیجیے۔[1]

ایک دوسرے مقام پر دجلہ و فرات اور ان جیسے دوسرے دریاؤں سے آبپاشی کے حق پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"دجلہ اور فرات اور ان جیسے تمام بڑے دریاؤں اور وادیوں میں سارے مسلمان یکساں شریک ہیں۔ ان سے وہ سینچائی کے لیے بھی پانی لے سکتے ہیں اور اپنے مویشیوں اور جانوروں کے پینے کے لیے بھی۔ کسی کو انہیں روکنے کا حق نہیں۔ ہر گروہ کو اپنی اراضی کھجوروں اور دوسرے درختوں کو سیراب

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۱۳۱-۱۳۲ توسین کے درمیان کی عبارت وضاحت مفہوم کی خاطر مترجم نے بڑھائی ہے

کرنے کا حق ہے۔ پانی کو کسی کے لیے مخصوص کرنے اور کسی سے روک لینے کا طریقہ غلط ہے۔

اگر کوئی اس بڑے دریا سے نہر نکال کر اپنی زمین تک لے جانا چاہے تو اگر ایسا کرنے سے دریا کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اسے ایسا کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ البتہ اگر کسی مضرت کا اندیشہ نہ ہو تو اسے ایسا کرنے دیا جائے گا۔

اگر یہ بڑے دریا جو سارے مسلمانوں کے لیے عام ہیں مرمت یا کھدائی کے محتاج ہوں تو اس کی ذمہ داری امام کے سر ہوگی۔

اگر ان کے بند ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو تو ان کی مرمت اور درستی بھی امام کے ذمہ ہوگی۔[1]

ان عبارتوں کی روشنی میں آب پاشی کے لیے نہروں کی تعمیر، مرمت اور صفائی پر آنے والے اخراجات کے بارے میں امام ابو یوسف کی رائے کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ دجلہ و فرات اور دوسرے دریاؤں کو آب پاشی کے قابل بنائے رکھنا، ان پر بند گھاٹ اور آب پاشی کے لیے پانی نکالنے کی جگہیں تعمیر کرنا اور ان کو اچھی حالت میں رکھنا ریاست کے ذمے ہے۔ ان کاموں کی پوری لاگت سرکاری خزانے سے ادا کی جائے گی۔

۲۔ خراجی زمینوں کی آب پاشی کے لیے بالخصوص ایسے علاقوں میں جہاں نہروں کے ذریعے پانی نہ پہنچنے سے زمینیں بے کار پڑی ہوں حسب ضرورت نہریں کھدوانا اور پرانی نہروں کی مرمت اور صفائی کرانا بھی ریاست کے ذمے ہے اور ان کے اخراجات بھی بیت المال سے پورے کیے جائیں گے۔

۳۔ دوآبہ دجلہ و فرات میں بڑے دریاؤں سے نکالی ہوئی نہریں، جن میں پانی جاری ہو، اگر کھدائی مرمت اور صفائی کی محتاج ہوں تو یہ کام بھی ریاست انجام دے گی۔ البتہ ان کے اخراجات ریاست کے خزانے اور ان باشندوں کے درمیان تقسیم کر دیے جائیں گے جن کو ان نہروں سے فائدہ پہنچتا ہو۔

۴۔ ان بڑی نہروں کے پانی کو اپنے کھیتوں اور باغات تک پہنچانے کے لیے لوگ جو چھوٹی نہریں اور نالیاں تعمیر کرنا چاہیں ان کی لاگت خود ان لوگوں کو پوری کرنی ہوگی۔

لاگت کی تقسیم اور اس سلسلے میں مختلف قسم کی نہروں کے درمیان تفریق کرنے میں قاضی صاحب نے جو اصول سامنے رکھے ہیں وہ واضح ہیں۔ کسی اسکیم کی لاگت ان لوگوں کے ذمے ہے جن کو اس سے فائدہ پہنچتا

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۱۱۰

فائدہ عام ہے وہاں لاگت کی ذمہ داری بھی عام ہے اور عوام کے مرکزی خزانے کی حیثیت میں یہ عام مشترکہ بیت المال پر ڈالی گئی ہے۔ مذکورۂ بالا پہلی قسم اسی اصول کے تحت آتی ہے۔ چوتھی قسم کی نہروں کے فوائد چونکہ مخصوص افراد تک محدود ہوں گے لہذا ان کی لاگت بھی انہیں کے ذمہ ڈالی گئی ہے۔

لاگت کی ذمہ داری عائد کرنے میں دوسرا اصول یہ مدنظر رکھا گیا ہے کہ متعلقہ افراد کو اس اسکیم سے اتنا مالی فائدہ پہنچ رہا ہو کہ وہ بآسانی اس کے اخراجات کا بار برداشت کرلیں۔ دوسری اور تیسری قسم کی نہروں کے درمیان تفریق اسی لیے برتی گئی ہے۔ اہل خراج کو آباد اور خوش حال رکھنا حکومت کا ایک مقصد قرار دیا گیا ہے اور اسی مقصد کے تحت دوسری قسم کی نہروں کی پوری لاگت بیت المال کے ذمے ڈالی گئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان نہروں کی تعمیر کے بعد بہت سی ایسی زمینیں زیر کاشت لائی جاسکیں گی جو ان کے بغیر افتادہ پڑی رہتی ہیں۔ ان زمینوں کے زیر کاشت آنے سے مجوزہ نظام مقاسمہ کے تحت خراج کی آمدنی میں معتدبہ اضافے کی متوقع ہے۔ چونکہ نہروں کی تعمیر سے پہلے نہ یہ زمینیں زیر کاشت تھیں نہ ان کے مالکوں کو ان کے ذریعے کوئی آمدنی ہو رہی تھی لہذا ان پر اخراجات کا بار نہیں ڈالا گیا ہے اس کے برعکس تیسری قسم کی نہروں میں پانی جاری تھا اور لوگ عملاً ان سے فائدہ اٹھا کر کاشت کرتے اور نفع حاصل کرتے تھے۔ اس آمدنی کے پیش نظر ان کے لیے بآسانی ممکن تھا کہ ان نہروں کی درستی پر آنے والے اخراجات کا ایک حصہ خود پورا کرسکیں۔ ان نہروں کی مرمت اور صفائی کے پورے اخراجات ریاست کے ذمے اس لیے نہیں ڈالے گئے کہ اس عمل سے خراج کی آمدنی میں کوئی نیا معتدبہ اضافہ نہیں متوقع ہے' ان کی مرمت اور صفائی خراج کی موجودہ آمدنی کو بحال رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اور اس کی مناسبت سے ان پر آنے والے اخراجات کا ایک حصہ ریاست کو پورا کرنا چاہیے۔

ترقیاتی اخراجات کی ذمہ داری کی یہ تقسیم ابو یوسف کی بصیرت اور انصاف پسندی کا ثبوت ہے انھوں نے عام کاشتکاروں کے مفاد کے ساتھ اس بات کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ کس قسم کی نہروں سے کس کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے اور کون اخراجات کی ذمہ داری اٹھانے کی استطاعت رکھتا ہے۔ استفادہ اور استطاعت کی اس متوازن رعایت کے ساتھ انھوں نے دوسری اور تیسری قسم کی نہروں کے درمیان جو تفریق برتی ہے وہ ان کی معاشی بصیرت پر گواہ ہے اگر وہ پہلی اور دوسری قسم کی نہروں کی لاگت اہل خراج کے ذمے ڈالتے تو زرعی ترقی کے اس اہم کام میں رکاوٹ پیش آتی' اور اگر تیسری قسم کی نہروں کی مرمت اور صفائی تمام تر

ریاست کے ذمے رکھتے تو نہ صرف یہ کہ اس پر بے جا بار پڑتا بلکہ کاشتکار ان نہروں کی صفائی اور حفاظت کی طرف سے بے پروا ہو جاتے۔ اس طرح انھوں نے پہلی قسم کی نہروں میں اس بنیاد پر تفریق برتی ہے کہ اول الذکر کا افادہ عام ہے اور آخر الذکر کا افادہ متعین افراد اور گروہوں تک محدود ہے۔ اخراجات کی ذمہ داری تقسیم کرتے وقت انھوں نے اس فرق کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ مسئلے کے ان تمام پہلوؤں پر اگر ان کی نظر نہ ہوتی تو وہ اتنا متوازن فارمولا تجویز کر سکتے۔

اس بحث کا یہ پہلو خاص طور پر قابل غور ہے کہ ترقیاتی اخراجات کا بار ریاست کے ذمے ڈالتے وقت ابو یوسف اس آمدنی کا حوالہ دیتے ہیں جو ان زمینوں کے خراج سے حکومت کو ہوتی ہے۔ رعایا کے سلسلے میں حکومت کی ذمہ داریاں گناتے وقت اس سے وصول کیے جانے والے محاصل کے حوالے ابو یوسف نے بار بار دیے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک حکومت کا یہ حق کہ وہ اپنے شہریوں سے محاصل وصول کر سکتی ہے کوئی مطلق حق نہیں بلکہ ایک بامقصد حق ہے جس کے ساتھ کچھ فرائض بھی وابستہ ہیں۔ زرعی زمینوں کی پیداوار سے محصول وصول کرنے کا حق متقاضی ہے کہ ان زمینوں کو سیلاب یا پانی کی کمی کی وجہ سے برباد ہونے سے بچایا جائے اور ان کی آب پاشی کے لیے نہریں تعمیر کی جائیں۔

بحیثیت مجموعی ہم یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مالیات عامہ (Public Finance) سے تعلق رکھنے والے مسائل میں ابو یوسف کا فکر بہت پختہ اور بلند ہے وہ حکومت کی آمدنی اور اس کے اخراجات کو کسی محدود زاویۂ نگاہ سے نہیں دیکھتے بلکہ اسے فلاح عامہ اور ملک کی معاشی بہبود و ترقی سے تعلق رکھنے والا ایک اہم شعبہ سمجھتے ہیں۔ آمدنی کے ایک ذریعے کے طور پر محاصل کا جائزہ لیتے وقت وہ اس کے ہر اہم پہلو پر غور کرتے ہیں۔ محصول کن لوگوں سے لیا جائے، کتنا لیا جائے، کس طرح وصول کیا جائے اور وصول کرنے والے کن صفات کے حامل ہوں، ان سب پہلوؤں پر انھوں نے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس طرح انھوں نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ حکومت کی آمدنی کن مدات پر صرف کی جانی چاہیے، کن لوگوں کے ذریعے صرف کرائی جانی چاہیے۔ ان مصارف کی نگرانی اور اس بات کا اہتمام کہ جس کام پر مال صرف کیا جائے وہ ٹھیک طور پر انجام پائے، کس طرح کیا جانا چاہیے۔ ان اخراجات میں وہ جہاں فوجیوں کی تنخواہوں اور سرحدوں کے استحکام کو شامل کرتے ہیں وہاں زرعی معیشت کو ترقی دینے والی اسکیموں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ جگہ کی قلت کے باعث ہم زکاۃ و عشر سے

ہونے والی آمدنی اور اس کے مصارف کے سلسلے میں ابو یوسف کے مشوروں کا جائزہ نہیں لے سکے ہیں ان کے ان مشوروں کے مطالعے سے ہماری اس رائے کو مزید سند ملتی ہے کہ وہ حکومت کے اخراجات کو فلاح عامہ کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ریاست کی ذمہ داریوں کے بارے میں ان کا تصور فلاحی ریاست کا تصور ہے اور ان کا تصور فلاح ایک جامع تصور ہے جس میں جس طرح عوام کی مادی اور معاشی بہبود، ان کو ظلم و جور سے بچانا اور آزادی کے ساتھ باعزت زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کرنا شامل ہے اسی طرح ان کی اخلاقی تطہیر اور روحانی تطہیر کا اہتمام بھی شامل ہے۔

مالیات عامہ سے متعلق جن بحثوں کا مطالعہ ہم نے پہلے اور تیسرے عنوانات کے تحت کیا ہے ان سے ابو یوسف کی تجزیاتی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اوپر ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ تجزیہ صرف اسباب و عوامل کی تعیین میں منحصر نہیں، اثرات و نتائج کی نشان دہی بھی ایک تجزیاتی عمل ہے۔ نظام محاصل پر گفتگو کرتے وقت ابو یوسف نے اس امر کی نشان دہی کی ہے کہ زمین کے رقبے کی بنیاد پر متعین کیا جانے والا محصول زرعی توسیع میں مانع ہوتا ہے جب کہ پیداوار کی شرکت پر مبنی محصول اس رکاوٹ کو دور کر دیتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ غلہ کے نرخ کی تبدیلی متعین محصول کے بار کو کم یا زیادہ کرتی رہتی ہے جب کہ متناسب محصول (Proportional tax) کے بار پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ انھوں نے ترقیاتی اسکیموں کی لاگت کی تقسیم کا جو فارمولا تجویز کیا ہے وہ ان اسکیموں کے فائدے اور اس افادے سے پیدا ہونے والی استطاعت کے تجزیے پر مبنی ہے۔

اس مختصر مقالے میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ ہم مالیات عامہ کے بارے میں ابو یوسف کے اس بلند فکر کا موازنہ ان کے زمانے اور اس کے بعد کے ان مفکرین سے کریں جو اسلامی مملکت کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں گذرے ہیں لیکن معاشی فکر کی جو تاریخیں ہمارے سامنے ہیں ان کی روشنی میں ہم یہ رائے پورے اطمینان کے ساتھ ظاہر کر سکتے ہیں کہ مقاصد کی یہ بلندی، سماجی قدروں کا یہ شعور، نظر کی یہ وسعت اور مالیات عامہ کے وظائف کا اتنا جامع تصور ان کے صدیوں بعد تک بھی مغرب و مشرق کے کسی مفکر کے یہاں نہیں ملتا۔

(ختم شد)

پردہ

(مولانا محمد یوسف، اصلاحی)

قرآن کے نزدیک انسان کی تمام تر اہمیت محض اس بنا پر ہے کہ وہ ایک اخلاقی وجود رکھتا ہے اس کے نزدیک انسان کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کا جوہر اخلاق و عصمت ہے، وہ اس کی حفاظت پر انتہائی زور دیتا ہے اور ہرگز برداشت نہیں کرتا کہ اس آبگینے کو ٹھیس لگے۔

برائی کی قوتوں کو دبانے، شہوانی خواہشات کو قابو میں رکھنے، غلط رجحانات کو روکنے اور پاکیزہ جذبات کو پروان چڑھانے کے لیے اس نے جو روشن اصول اور موثر تدبیریں بتائی ہیں، ان سے بہتر اصولوں اور تدبیروں کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ثبوت میں تاریخ کے صفحات سے وہ روشن نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے جب صحابۂ کرام انہیں اصولوں پر بنے ہوئے ایک ایسے معاشرے کی برکتوں سے مالا مال تھے، جو انسانیت کے لیے رحمت و سکون کا گہوارہ، جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے ایک مستحکم قلعہ، تعمیر و ترقی کے لیے ایک آزاد اور حوصلہ افزا ماحول، اور خوش حالی و کامرانی کے لیے ایک ضمانت تھا۔

قرآن حکیم، خدائے عالم الغیب اور علیم بذات الصدور کا خوف اور آخرت کی جواب دہی کا یقین پیدا کر کے دل میں وہ ایسے پہرہ دار بٹھا دیتا ہے جو ہر وقت انسان کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ نہ صرف گناہ کی وادیوں میں بھٹکنے سے روکتے ہیں، بلکہ اخلاق فاضلہ کی بلندیوں پر چڑھنے کے لیے برابر قوت بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ پھر وہ ہر جوان مرد اور عورت کو نکاح کی تاکید کر کے تمام شہوانی جذبات اور رجحانات کے لیے ایک پاکیزہ مرکز فراہم کرتا ہے کہ یہ عظیم قوت سوسائٹی کی تعمیر و ترقی میں کام آئے۔ زنا اور بے عصمتی کو ایک بدترین اخلاقی، معاشرتی اور قانونی جرم قرار دیتا ہے اور اس کے لیے انتہائی عبرت ناک اور لرزہ خیز سزا تجویز کر کے اس دروازے کو بند کرنا چاہتا ہے جہاں سے ہلاکت خیز وبائیں انسانی تہذیب و تمدن پر حملہ آور

ہو کر اسے تباہ و برباد کرتی ہیں ۔

وہ مرد و عورت دونوں صنفوں کے لیے الگ الگ میدانِ عمل تجویز کرتا ہے، اور دونوں کے لیے ان کی قوت کار اور صلاحیتوں کے لحاظ سے الگ الگ وظائف اور فرائض قرار دیتا ہے، وہ دونوں کے آزادانہ اختلاط کو سختی کے ساتھ روکتا ہے، وہ پردے کو فرض قرار دیتا ہے، اس کو ایمان و اسلام کا صریح تقاضا بتاتا ہے، اور اس کی اہمیت اور حکمت جتانے کے لیے انتہائی زوردار اندازِ بیان اختیار کرتا ہے۔ سورۂ نور جس میں پردے کے تکمیلی احکام بیان کیے گئے ہیں اس کی تہمید پر غور کیجیے۔ لفظ لفظ سے قوت و جلال اور عظمت و اہمیت ٹپکتی ہے ۔

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (النور:۱)	یہ ایک سورۃ ہے جو ہم نے نازل کی ہے اور ہم نے اسے فرض کیا ہے، اور ہم نے اس میں کھلی کھلی ہدایتیں نازل کی ہیں تاکہ تم لوگ اس سے سبق لو۔

اس تمہید میں بار بار اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ یہ احکام اور ہدایتیں ہم نے نازل کی ہیں ۔ یہ کسی انسانی فکر کی پیداوار نہیں ہیں۔ اب اگر تم خدا پر واقعی ایمان رکھتے ہو، اور اس کے بھیجے ہوئے دین کو اپنا ضابطۂ حیات مانتے ہو، تو تمہارے ایمان و اسلام کا کھلا تقاضا یہ ہے کہ اس حکم کو دل و جان سے مانو، اصلاحِ معاشرہ کے یہ قوانین اور پردے کے یہ احکام محض مشورے یا سفارشات نہیں ہیں کہ تمہارا جی چاہے تو مانو، جی نہ چاہے تو نہ مانو بلکہ یہ تو انسانی تمدن کے بقا و ترقی اور صلاح و فلاح کے لیے وہ فرض اور قطعی احکام ہیں جن کا ماننا ہر مسلمان پر لازم ہے، اگر وہ واقعی مسلمان ہے اور اس سے انکار وہی کر سکتا ہے جس میں قرآن سے انکار کی ناپاک جرأت ہو، پردہ اسلامی معاشرت کی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور اس کے بغیر ایک منظم خاندان اور ایک اعلیٰ تہذیب کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

پردہ کا مقصد

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ	اور جب تم ازواجِ مطہرات سے کچھ مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو، پردے کا یہ طریقہ تمہارے اور ان کے دلوں کو برے خیالات سے پاک رکھنے کے لیے انتہائی

وَقُلُوْبِهِنَّ (الاحزاب ۵۳) طریقہ ہے۔

یہ آیت حجاب کہلاتی ہے، اس میں مسلمانوں کو پردے کا حکم بھی دیا گیا ہے اور پردے کی حکمت و مصلحت بھی سمجھائی گئی ہے۔

اس آیت کے نزول سے پہلے لوگ بے روک ٹوک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں آتے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو یہ بات بہت شاق تھی۔ کئی بار آپ نے رسول اللہ سے عرض بھی کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے یہاں اچھے برے ہر قسم کے لوگ آتے جاتے ہیں۔ کاش آپ ازواج مطہرات کو پردے کا حکم دے دیتے آخر کار یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں محرم رشتہ داروں کے سوا دوسرے مرد داخل نہ ہوں (احزاب ۵۵) اور جس کو بھی گھر کی خواتین سے کوئی کام ہو وہ پردے کے پیچھے سے بات کرے اس حکم کے بعد مسلم خواتین گھروں میں باپردہ رہنے لگیں۔ تمام زنانہ مکانوں میں پردے لٹکا دیے گئے اور محرم رشتہ داروں کے سوا دوسروں کا گھروں میں آنا جانا بند کر دیا گیا۔

پردے کا یہ طریقہ مسلم معاشرے میں رائج کیا گیا اس کی حکمت و مصلحت بتاتے ہوئے قرآن کہتا ہے

ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ — تمہارے اور ان عورتوں کے دلوں کی

وَقُلُوْبِهِنَّ — پاکی کے لیے یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے۔

مطلب یہ ہے، خواتین کا گھروں میں باپردہ رہنا۔ مردوں سے رو در رو بات نہ کرنا اور ان سے علیحدہ رہنا وہ پسندیدہ طریقہ ہے جو دونوں کے دلوں کو ناپاک خیالات اور ناجائز صنفی جذبات سے پاک رکھے گا۔

خدائے علیم و حکیم کے اس صاف اور صریح حکم کے بعد جو لوگ عورت و مرد کی مخلوط تعلیم مخلوط مجالس آزادانہ میل جول اور بے باکانہ دید و دید کے بے جا اصرار کرتے ہیں اور ان کے نزدیک دونوں صنفوں کے آزادانہ اختلاط سے دلوں کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں آتا وہ دراصل خدا کے علم و حکمت کو جھٹلاتے ہیں۔

دلوں کو پاک رکھنے، معاشرے کو صنفی آوارگی سے بچانے اور اخلاق و عصمت کو محفوظ رکھنے کے لیے یقیناً وہی طریقہ مناسب ترین ہے جس کو قرآن نے مناسب ترین کہا ہے اور اس کے خلاف سوچنا ایمان سے کھیلنا ہے۔

گھر کی چار دیواری میں رہو وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ — اپنے گھروں میں چین سے بیٹھی رہو

عورت کا حقیقی دائرۂ کار گھر کی چار دیواری ہے، گھر کی چار دیواری میں رہ کر ہی اسے اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے منصبی فرائض انجام دینے چاہییں۔ عام حالات میں اسے گھر کی چار دیواری سے باہر نہ نکلنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "عورت تو سراپا پردہ ہے جب وہ گھر سے نکلتی ہے تو اسے شیطان گھورتا ہے، اور وہ خدا کی رحمت سے قریب تر اسی وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے گھر میں ہو"

قرآن کے اس صاف اور صریح حکم کے ہوتے کوئی مسلمان کیسے جرأت کر سکتا ہے کہ وہ عورت کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکالے اور اصرار کرے کہ عورتیں گھر سے باہر رہ کر سوشل کاموں اور پبلک سرگرمیوں میں حصہ لیں، کالجوں میں لڑکوں کے ساتھ مل جل کر تعلیم پائیں اور کارخانوں، دفتروں اور حکومت کے ایوانوں میں مردوں کے دوش بدوش کام کریں۔

قرآنی احکام کے خلاف یہ بے جا جسارت وہی کر سکتا ہے جو یا تو سرے سے خدا کی کتاب کا منکر ہے یا پھر وہ منافق جو قرآن کا نام لے کر اپنے تعیشات کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے "قرآنی دین" کی عمارت کو ڈھانے کی ناپاک کوشش کرتا ہے۔

گھر سے نکلو تو چہرہ چھپا کر نکلو

یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (الاحزاب ۵۹)	اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں کو بتا دیجیے کہ (باہر نکلیں) تو اپنے (چہروں) پر پلو لٹکا کر (گھونگھٹ نکال) لیا کریں۔ اس طرح وہ آسانی کے ساتھ پہچان لی جایا کریں گی اور ستائی نہ جائیں گی۔ اور خدا بڑا ہی پردہ پوش اور مہربان ہے۔

عام حالات میں تو عورتوں کے لیے یہی حکم ہے کہ وہ گھر کی چار دیواری میں سکون کے ساتھ اپنے فطری دھندوں میں لگی رہیں لیکن اگر کبھی کسی ضرورت سے باہر نکلنا ناگزیر ہی ہو تو اپنے چہرے اور جسم کو اچھی طرح چھپا کر نکلیں۔

عرب میں قاعدہ تھا کہ شریف زادیاں جب باہر نکلتیں تو ایک بڑی چادر اپنے اوپر لپیٹ لیتیں تاکہ پورا جسم اور اس کی ساخت اچھی طرح چھپ سکے۔ اس چادر کو جلباب کہا جاتا تھا۔ پنجاب اور سرحد کے

دیہی علاقوں میں اب بھی اسی قسم کی چادروں کا عام رواج ہے اور اس کو "چیل" کہا جاتا ہے۔ یہ تقریباً کھاب کی طرح موٹے کپڑے کی ایک بڑی چادر ہوتی ہے جس میں پورا جسم اچھی طرح چھپ جاتا ہے ہمارے زمانے کا برقعہ بھی اسی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اور برقعے کی نقاب سے بھی وہی مقصد پورا ہوتا ہے جس کے لیے چہروں پر پلو کا ایک حصّہ لٹکانے کا حکم دیا گیا ہے۔

قرآن کا منشاء یہ ہے کہ شریف عورتیں جب گھر سے نکلیں تو اپنی حفاظت کا پوری طرح اہتمام کر لیا کریں کہ ہوسناک نگاہیں ان کے تعاقب کا تصور بھی نہ کر سکیں، اپنی چادر اچھی طرح اوڑھ لپیٹ لیں۔ چادر کا ایک حصہ سر سے چہرے پر لٹکا کر گھونگھٹ ڈال لیا کریں اور سر چہرہ اچھی طرح چھپا کر نکلیں۔ عہدِ صحابہ سے لے کر بعد تک کے تمام بڑے بڑے مفسرین نے آیت کا یہی مفہوم مراد لیا ہے اور چہرے کا چھپانا ضروری قرار دیا ہے۔ عربی لغت میں ان الفاظ کا اسی طرح استعمال موجود ہے۔ جب کسی عورت کے چہرے سے کپڑا سرک کر ہٹ جاتا ہے تو کہتے ہیں ادن ثوبك على وجهك اپنا کپڑا منہ پر ڈال کر چھپا لو۔

حضرت ابن عباس رضؓ سے جو قول منقول ہیں ان کا مفہوم بھی یہی ہے۔ فرماتے ہیں خدائے تعالیٰ نے خواتین کو حکم دیا ہے کہ جب کسی کام کے لیے وہ گھروں سے نکلیں تو اپنی چادروں سے اپنا سر اور منہ چھپائیں اور صرف ایک آنکھ کھلی رہے۔

ایک بار محمد بن سیرینؒ نے حضرت عبیدہ سلمانی سے اس آیت کی تشریح چاہی تو انھوں نے زبان سے کچھ بتانے کی بجائے اپنی چادر لی اور اس طرح اوڑھ کر دکھائی کہ سر چہرہ وغیرہ سب کچھ چھپا لیا اور صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔

علامہ زمخشری کشاف میں اور علامہ عبداللہ بن احمد نسفی مدارک التنزیل میں فرماتے ہیں: عورتیں اپنے اوپر چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں اور اس سے اپنے چہرے اور اپنے اطراف کو اچھی طرح ڈھانک لیں۔

حضرت ابن جریر فرماتے ہیں: شریف خواتین لونڈیوں کا سا لباس پہن کر گھروں سے باہر نہ نکلیں کہ ان کے چہرے اور سر کے بال کھلے ہوئے ہوں بلکہ انھیں چاہیے کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلّو لٹکا لیا کریں تاکہ کوئی بدکردار ان کو چھیڑنے کی جرأت نہ کر سکے۔ قرآن کے الفاظ اور مفسرین کی یہ تشریحات صاف صاف بتاتی ہیں کہ چہرے کا پردہ فرض ہے۔ دورِ رسالت میں جو پردہ مسلم معاشرے میں رائج تھا اس

میں چہرے کا پردہ لازمی تھا کسی جنگ میں ایک خاتون ام خلادؓ کے لڑکے شہید ہو گئے تھے وہ ان کے بارے میں معلومات کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں لیکن اس دل ہلا دینے والے حادثے کے باوجود ان کے چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا۔ بی بی اس وقت بھی تمہارے چہرے پر نقاب ہے۔ خاتون نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ ہاں میں نے بیٹا کھو دیا ہے اپنی حیا نہیں کھوئی ہے۔

حضرت عائشہؓ نے واقعۂ افک کی جو تفصیلات اپنی زبانی بیان فرمائی ہیں اس کی سندیں نہایت معتبر ہیں اس میں ان کا بیان ہے کہ جنگل سے واپسی پر جب میں نے دیکھا کہ قافلہ جا چکا ہے، تو میں وہیں بیٹھ گئی اور ایسی نیند آئی کہ میں وہیں پڑ کر سو گئی۔ صفوان بن معطل ادھر سے گزرے تو دور سے کسی کو پڑا ہوا دیکھ کر وہاں آگئے اور مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے۔ کیونکہ حجاب کے حکم سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکے تھے مجھے دیکھ کر جب انھوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا تو ان کی آواز سے یکایک میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنی چادر سے اپنا منہ چھپا لیا۔

حالت احرام کے سلسلے میں بھی حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر احرام کی حالت میں ہم لوگ مکہ کی طرف جا رہے تھے جب مسافر مرد ہمارے پاس سے گزرنے لگتے تو ہم اپنے سروں سے چادریں کھینچ کر اپنے منہ پر ڈال لیتے اور جب وہ گزر جاتے تو ہم لوگ پھر اپنا منہ کھول لیتے

بن ٹھن کر نہ گھومتی پھرو

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ	اور بناؤ سنگار نہ دکھاتی پھرو جس طرح پہلے جاہلیت کے دور میں اپنے حسن و سنگار کی نمائش کرتی تھیں۔
(احزاب ۳۳)	

آیت کی حقیقی منشا معلوم کرنے کے لیے دو لفظوں کی حقیقت سمجھنا ضروری ہے ایک تبرج اور دوسرے جاہلیت۔

تبرج کے مفہوم میں تین باتیں شامل ہیں۔

۱۔ اپنے چہرے اور جسم کی موزونیت اور حسن لوگوں کو دکھانا

۲۔ اپنے چمکتے زیوروں اور زرق برق لباس اور سامان آرائش کی نمائش کرنا

۳۔ اپنی چال ڈھال چٹک مٹک اور ناز و انداز سے اپنے کو نمایاں کرنا

جاہلیت سے مراد ہر وہ طرز فکر و عمل ہے جو اسلامی تہذیب و ثقافت، اسلامی اخلاق و آداب اور

اسلامی ذہنیت کے خلاف ہو۔

مطلب یہ ہے کہ عورتوں کا بن ٹھن کر باہر نکلنا چست اور عریاں لباس پہن کر اپنے جسموں کی نمائش کرنا چھم چھم کرتے زیوروں میں دل نوازی کی اداؤں کے ساتھ پھرنا اور پوڈروں اور غازوں سے پری پیکر بن کر مردوں کو دعوت نظارہ دینا وہ بدترین برائیاں ہیں جن میں لوگ اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں مبتلا تھے۔ اسلامی تہذیب و آداب اور اسلامی ذہنیت سے ان برائیوں کا کوئی تعلق نہیں اسلامی طرز معاشرت میں نہ صرف یہ کہ ان کی گنجائش نہیں بلکہ ان کے ہوتے اسلامی معاشرت کا تصور محال ہے۔

غیر مردوں سے کھرے لہجے میں بات کرو

اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا (الاحزاب ۳۲)

اگر تم برائی سے بچنا چاہتی ہو تو (غیر مردوں سے) دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ کوئی دل کا بیمار تم سے آس لگا بیٹھے بلکہ صاف سیدھی اور کھری کھری بات کرو۔

اسلام بلاضرورت عورتوں کا غیر مردوں سے ہمکلام ہونا پسند نہیں کرتا۔ ہاں اگر کوئی واقعی ضرورت پیش آجائے تو پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی اجازت دیتا ہے لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ لہجے میں کوئی شیرینی، آواز میں کوئی لوچ اور لگاوٹ نہ ہو کہ کوئی ہوس کا مارا غلط امید باندھ لے اور کسی ناروا اقدام کا خیال دل میں لائے، بلکہ سیدھے سادے انداز میں مطلب کی کھری اور مختصر بات کی جائے۔

غیر مردوں سے بلاضرورت بات چیت کرنا، لہجے میں گھلاوٹ اور آواز میں دانستہ لگاوٹ اور شیرینی پیدا کرنا اور غیر مردوں کے لیے غلط توقعات وابستہ کرنے کا موقع فراہم کرنا ان بدکار اور آبرو باختہ عورتوں کا کام ہے جن کے دل خدا کے خوف سے خالی ہوں اور جو شرم و حیا کی چادریں پھاڑ کر ننگی ہو چکی ہوں برائی سے نفرت کرنے والی اور شرم و غیرت کے جذبات رکھنے والی شریف اور خدا ترس خواتین کبھی بلاضرورت غیر مردوں کو اپنی آواز نہیں سناتیں اور اگر کبھی کوئی ضرورت پیش آ ہی جائے تو پوری احتیاط اور خدا ترسی کے ساتھ کھرے لہجے میں صاف سیدھی بات کرتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا ہے کہ عورت کی آواز بلاضرورت غیر مرد کو سنائی جائے۔ اسی لیے آپ نے عورت کو اذان دینے کی ممانعت

فرمائی ہے، اور اگر کوئی عورت امام کے پیچھے جماعت کی نماز میں ہو اور امام سے غلطی ہوجائے تو اُسے زبان سے سبحان اللہ کہنے کی اجازت نہیں دی ہے بلکہ ہدایت فرمائی ہے کہ امام کو متنبہ کرنے کے لیے ہاتھ پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کریں۔

زیوروں کی جھنکار نہ سنا و

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ (النور ۳۱)

اور اپنے پاؤں زمین پر اس طرح مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ ان کی چھپی ہوئی زینت (زیوروں کی جھنکار سے) لوگوں کو معلوم ہوجائے

مطلب یہ ہے شریف عورتیں جب کسی ضرورت سے گھروں سے نکلیں تو اس احتیاط کے ساتھ نکلیں کہ ان کی کوئی چیز غیروں کے شہوانی جذبات کو ابھارنے کا باعث نہ بنے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کو صرف زیوروں کی دل فریب جھنکار تک ہی محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ آپ نے فرمایا جو عورت خوشبو لگا کر راستے سے گزرے کہ لوگ اس کی خوشبو سے لذت لیں تو وہ ایسی اور ایسی ہے، ابوموسیٰ کہتے ہیں آپ نے ایسی عورت کے لیے بڑے ہی سخت الفاظ استعمال فرمائے۔

ایک بار حضرت ابوہریرہؓ کا گذر ایک عورت کے پاس سے ہوا جو مسجد سے نکل رہی تھی آپ کو محسوس ہوا کہ وہ خوشبو لگائے ہوئے ہے۔ آپ وہیں رک گئے اور اس سے کہا اے خدائے جبار کی بندی! کیا تو مسجد سے آرہی ہے؟ اس نے کہا، جی ہاں! آپ نے فرمایا۔ میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو عورت مسجد میں خوشبو لگا کر آئے اس کی نماز اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک وہ گھر جا کر جنابت کا غسل نہ کرلے۔

نگاہیں نیچی رکھو

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ

اور مومن عورتوں سے کہیے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

نگاہیں نیچی رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں ہر اس چیز سے نظریں بچائیں جس کا دیکھنا درست نہ ہو اتفاقاً اگر غیر مردوں کا سامنا ہو جائے تو فوراً نگاہ پھیرلیں، کسی مرد یا عورت کے ستر پر نظر پڑ جائے تو ایک دم نظر ہٹالیں، نظر کی آوارگی انتہائی فتنہ خیز ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیدہ بازی کو آنکھ کی زنا سے تعبیر کیا ہے۔ محرم مردوں کے سوا دوسرے مردوں کو نگاہ بھر کر دیکھنا کسی طرح صحیح نہیں، راستے چلتے یا کسی اور ضرورت سے وقتی طور پر نگاہ پڑنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس اجازت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ

میں اپنی نظر کو بے پابندی سے آزاد کرلیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کوئی مرد کسی مرد کے ستر کو نہ دیکھے اور کوئی عورت کسی عورت کے ستر کو نہ دیکھے۔

یوں تو نگاہیں نیچی رکھنے کے معاملے میں مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں احکام ہیں لیکن احادیث کے مطالعے سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے معاملے میں کسی قدر نرمی رکھی گئی ہے۔ مثلاً عورتیں جب مسجدوں بازاروں یا سفروں پر ہوتیں تو نقاب ڈالے رہتیں کہ غیر مردوں کی نگاہ نہ پڑے لیکن مردوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بھی اپنے چہروں پر ایسے موقعوں پر نقاب ڈال لیں کہ عورتیں انہیں نہ دیکھ سکیں لیکن یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس اجازت سے ضرورت کے وقت ہی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ اگر قصداً مردوں کو گھوریں گی تو خدا سے بغاوت کریں گی۔

اپنے ستر کی حفاظت کرو

وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ (النور ۳۱)	اور اپنے ستر کی حفاظت کرو۔

ستر کی حفاظت سے مقصود صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بدکاری سے بچو بلکہ مراد یہ ہے کہ ہر طرح ستر کی حفاظت کرو۔ عورت کا ستر منہ اور ہاتھ کے سوا پورا جسم ہے۔[1]

منہ اور ہاتھ کے علاوہ جسم کا کوئی حصہ بھی شوہر کے سوا کسی کے سامنے نہ کھولیں حتیٰ کہ اپنے باپ اور بھائی کے سامنے بھی کھولنے سے پرہیز کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو عورتوں کو ایسا لباس پہننے سے بھی سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے جو ایسا چست ہو جس میں سے جسم کی ساخت پوری طرح نمایاں ہو یا ایسا باریک ہو کہ بدن اندر سے جھلکے۔ ایک بار آپ کی سالی حضرت اسماء باریک کپڑے پہنے آپ کے سامنے آئیں تو آپ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا اسماء! جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ منہ اور ہاتھ کے علاوہ اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے۔ البتہ گھر کے کام کاج کرتے ہوئے جسم کے جن حصوں کا کھلنا ناگزیر ہو مثلاً کلائیاں یا پنڈلیوں کا کچھ حصہ تو باپ اور بھائی وغیرہ کے سامنے ان کے کھلنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک موقع پر تو آپ نے عورتوں کو سخت وعید سنائی ہے۔ آپ نے فرمایا وہ عورتیں جو کپڑے پہن کر بھی

---

[1] جسم کے وہ حصے جن کا چھپانا ضروری ہے عورتوں کا ستر منہ اور ہاتھ کے علاوہ پورا جسم ہے اور شوہر کے سوا کسی مرد کے سامنے اس کا کھولنا جائز نہیں۔ مرد کا ستر ناف سے گھٹنے تک ہے اور بیوی کے سوا کسی دوسری عورت کے سامنے اس کا کھولنا جائز نہیں۔

تی رہتی ہیں۔ دوسروں کو رجھاتی پھرتی ہیں اور خود بھی دوسروں پر ریجھتی ہیں۔ ناز سے ہلکے کھاتی اور گردن کو
ل دیتی چلتی ہیں۔ وہ نہ جنت میں داخل ہوں گی اور نہ جنت کی خوشبو سونگھ سکیں گی۔

اپنا بناؤ سنگار چھپائے رہو

وَلَا يُبْدِيْنَ	اور اپنے بناؤ سنگار کو ظاہر نہ ہونے
زِيْنَتَهُنَّ	دو۔ ہاں جو (تمہارے ارادے کے بغیر خود بخود)
اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا	ظاہر ہو جائے۔

زینت سے جسم کے وہ حصے بھی مراد ہیں جن میں مختلف قسم کی آرائشیں کی جاتی ہیں۔ مثلاً سر کے بال،
آنکھیں، گردن، کان، ہاتھ پاؤں وغیرہ اور وہ چیزیں بھی مراد ہیں جن سے بناؤ سنگار کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہاتھ
پاؤں، ناک، کان اور گلے کے خوشنما زیورات، خوبصورت دیدہ زیب کپڑے، سرمہ، مسی، مہندی وغیرہ
بناؤ سنگار اور زیب و زینت کا اظہار عورت کا فطری جذبہ ہے اور اگر شریف زادیاں گھروں
ں رہتے ہوئے محرم[1] رشتہ داروں کے حلقے میں زیب و زینت کا اظہار کریں تو قرآن روکتا نہیں لیکن وہ یہ
ہرگز برداشت نہیں کرتا کہ کوئی مومنہ بناؤ سنگار (make up) کر کے مردوں کو عام دعوتِ نظارہ
دے اور ان سے دادِ حسن لے۔ ہاں اگر کبھی اتفاقی طور پر قصد و ارادہ کے بغیر کسی زینت کا اظہار ہو جائے
اتفاق سے دوپٹہ سر سے ڈھلک جائے، گلا کھل جائے، یا ہاتھ پاؤں کی کسی زینت کا اظہار ہو جائے تو اس
طرح کے غیر اختیاری اظہار پر کوئی گرفت نہیں۔

سر سینہ دوپٹہ سے چھپائے رہو

وَلْيَضْرِبْنَ	اور اپنے سینوں پر دوپٹہ
بِخُمُرِهِنَّ	کے آنچل ڈالے رہیں
عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ	(النور۔ ۳۱)

عمومی طور پر زیب و زینت کے اظہار سے منع فرمانے کے بعد تاکید کی گئی کہ دوپٹے اوڑھے رہا
کریں اور سینوں پر آنچل ڈالے رہیں، تاکہ سر کے بال، کان اور گلے کے زیورات اور سینوں کا ابھار ظاہر
نہ ہونے پائے۔ جسم کے یہ حصے خصوصی طور پر صنف مخالف کے لیے انتہائی کشش رکھتے ہیں اور ان کے چھپانے
میں بے احتیاطی سے فتنے اٹھنے کے اندیشے زیادہ ہیں اس لیے ان کے چھپانے میں مبالغے سے کام لیا جائے۔

[1] جن محرم رشتہ داروں کے سامنے عورت اپنی زینت و آرائش کا اظہار کر سکتی ہے ان کی تفصیل آگے محرم رشتہ
دار عنوان سے آگے آرہی ہے۔

ہی قسم کی لاپرواہی اور کوتاہی نہ کی جائے

اس کے بعد پھر وہی الفاظ دہرائے گئے ہیں کہ "اپنی زینت کا اظہار نہ کرو"۔ اور ان محرم رشتہ داروں
عیین دی گئی ہے، جن کے حلقے میں اظہار زینت کی رخصت ہے۔ اس ترتیب بیان اور تاکید میں یہ
رہ بھی ہے کہ اگرچہ قانونی طور پر عورت کو محرم رشتہ داروں کے سامنے بناؤ سنگار اور اظہار زینت
اجازت ہے اور اس کو بے جا تنگی میں مبتلا نہیں کیا گیا ہے، لیکن جہاں تک سر گریبان اور سینے کا سوال
غیرت وحیا کا تقاضا یہی ہے کہ عورت قانونی رخصت کے باوجود عام حالات میں ان محرم رشتہ داروں
سامنے ان پر دوپٹہ لپیٹے رہے۔ ہاں اگر کبھی ضرورت یا اتفاق سے دوپٹہ اتارے ہوئے ہو اور ان
تہ داروں میں سے کسی کا سامنا ہو جائے تو بے جا تکلف اور پریشانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں البتہ
مستقل طور پر گھروں میں دوپٹہ اوڑھے بغیر بے تکلفی کے ساتھ، سر سینہ اور گریبان کھولے پھرنا کسی طرح مناسب
بن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ عورت صرف اپنے شوہر کے سامنے دوپٹہ اتار کر آسکتی ہے،

(خازن ص۳۴۶ جلد ۲)

جاہلیت کے زمانے میں عورتیں سروں پر ایک طرح کے کساوے سے باندھے رکھتی تھیں جن کی گرہ جوڑے
ی طرح پیچھے چوٹی پر لگائی جاتی تھی۔ سامنے گریبان کھلا رہتا تھا اور سینوں پر قمیص کے سوا اور کوئی کپڑا نہ ہوتا
ا۔ پیچھے دو دو تین چوٹیاں لہراتی تھیں۔

جب سورۂ نور کی یہ آیتیں نازل ہوئیں تو مسلمان عورتوں میں پردہ رائج کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ
رتیں اپنی زینت کو اچھی طرح چھپا سکیں، نہ یہ کہ اس کو اور زیادہ زینت وآرائش کا ذریعہ بنائیں۔ تفسیر خازن میں
ہے۔ "دوپٹے سینوں پر ڈالے رہیں تاکہ سر کے بال، گردن، زیور اور سینے کو چھپائے رکھیں۔ ظاہر ہے یہ مقصد
ارہ گز چوڑی اس باریک پٹی سے ہرگز پورا نہیں ہوسکتا جو بالوں کی آرائش، زیوروں کی جھلک اور سینے کے
ابھار کو چھپانے کے بجائے اور زیادہ پرکشش بنا کر نمایاں کرتی ہے، جسے آج کل کی خواتین گلے کا ہار بنا کر شرم
حیا کا مذاق اڑاتی ہیں۔

بوڑھی عورتیں چادر اتار سکتی ہیں

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ

اور جو عورتیں جوانی سے گزری بیٹھی ہیں جن کو نکاح کی کوئی امید نہ ہو وہ اگر اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں تو

اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ (النور ٦٠) ان پر کوئی گناہ نہیں

* القواعد من النساء سے مراد وہ عورتیں ہیں جو جوانی کی حد سے گزر کر سنِ یاس کو پہنچ چکی ہوں، جن کی جنسی خواہشات مر چکی ہوں اور جن کو دیکھ کر مردوں میں کوئی صنفی جذبہ پیدا نہ ہو سکتا ہو، وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہ گئی ہوں اور اب انہیں کسی کے نکاح میں جانے کی امید نہ ہو۔

ایسی سن رسیدہ عورتیں اگر اپنی چادر یا دوپٹہ اتار کر ننگے سر رہیں تو کوئی حرج نہیں۔

بشرطیکہ وہ بناؤ سنگار کی نمائش نہ کریں

غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِيْنَةٍ (النور) بشرطیکہ وہ اپنی زینت کی نمائش کرنے والی نہ ہوں۔

یعنی چادر اتارنے کی اجازت صرف ان بوڑھی عورتوں کے لیے ہے جن کے صنفی جذبات سرد پڑ چکے ہوں، جن میں بن ٹھن کر رہنے کا شوق ختم ہو چکا ہو، لیکن اگر ان میں ابھی نمائش حسن و جمال کا جذبہ باقی ہے تو پھر وہ اس رخصت سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں رکھتیں۔

بہتر یہی ہے کہ چادر اوڑھے رہیں

وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ (النور ٦٠) اور یہ اس سے بچیں تو یہ ان کے حق میں زیادہ بہتر ہے

بوڑھی عورتوں کو چادر اتارنے اور ننگے سر رہنے کی اجازت تو ہے، لیکن اگر وہ اس رعایت سے فائدہ نہ اٹھائیں، احتیاط کریں اور پردہ کے آداب کا پورا پورا خیال رکھیں تو یہ ان کے حق میں بہت زیادہ بہتر ہے۔

پردہ کے ان احکام کے ساتھ ساتھ قرآن نے مرد کو بھی کچھ بنیادی ہدایتیں دی ہیں، جن پر عمل کر کے پردہ کے وہ اخلاقی و معاشرتی مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جن کے لیے پردہ فرض کیا گیا ہے۔

مرد نگاہیں نیچی رکھیں

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النور ۳۰) اور مومن مردوں کو ہدایت کیجیے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

نگاہیں نیچی رکھنے سے مراد یہ ہے کہ کوئی مرد اپنی بیوی اور محرم خواتین کے علاوہ کسی اجنبی عورت پر نگاہیں نہ گاڑے، کسی کے ستر پر نظر نہ ڈالے اور ایسے تمام فحش مناظر سے نظر بچائے جو بے حیائی کے جذبات کو ابھارتے ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب کسی مسلمان کی نگاہ کسی عورت کے حسن و جمال پر پڑے اور وہ

اٹھائے تو اللہ تعالیٰ اس کی عبادتوں میں لذت پیدا فرما دیتا ہے۔ (مسند احمد)

آپ نے حضرت علی کو ہدایت فرمائی کہ کسی پر نظریں نہ جماؤ، پہلی نظر تو معاف ہے، مگر دوسری نظر معاف نہیں۔ حضرت جریر بن عبداللہ نے ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ! اگر اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کروں۔ آپ نے فرمایا فوراً نظر پھیر لو۔

دراصل نظر کی آوارگی تمام بے حیائیوں اور بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہے اس لیے قرآن نے تمام مسلمان مردوں کو یہ اصولی ہدایت دی کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھو، اور نظر کی آوارگی سے بچے رہو۔

اپنے ستر کی حفاظت کریں

وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ أَزْكٰى لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝ (النور ۳۰)

اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے زیادہ پاک بازی کی بات ہے جو کچھ یہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح واقف ہے۔

اس ہدایت کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ناجائز جنسی افعال سے بچو بلکہ یہ مقصود بھی ہے کہ اپنا ستر کسی دوسرے کے سامنے نہ کھولو۔ مرد کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ناف سے گھٹنے تک کا حصہ اپنی بیوی کے سوا کسی کے سامنے کھولے۔ شرم وحیا اور پاک بازی کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی اپنے ستر کی ہر طرح حفاظت کرے برہنگی اور عریانی سے پرہیز کرے اور کوئی ایسی بے احتیاطی نہ کرے جو جنسی آوارگی کی طرف لے جاسکتی ہو۔ قرآن نے مومن مرد اور عورت کی یہ بنیادی صفت بتائی ہے کہ وہ برہنگی اور عریانی اور آزاد شہوت رانی سے اپنے ستر کو محفوظ رکھتے ہیں۔

وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ .... أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيْمًا ۝

اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں .... ان کے لیے اللہ نے بخشش اور اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

انسان کا اخلاقی وجود (۱)

مکارمِ اخلاق کی تکمیل

بُرے اخلاق جن سے اجتناب کرنا چاہیے

(سید احمد قادری)

مکارمِ اخلاق کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک انسان اپنے آپ کو برے اخلاق سے پاک نہ کرے۔ اچھے اخلاق کے حصول اور بُرے اخلاق کی نفی سے مومن کا ایمان درجۂ کمال تک پہنچتا ہے۔ بنیادی مکارم اخلاق کی تفصیل گزر چکی اب بنیادی مساوی اخلاق (برے اخلاق) کی مختصر تشریح کی جا رہی ہے۔ سورہ نحل کی آیت ۹۰ نے انہیں بھی تین الفاظ میں سمیٹ لیا ہے۔ فحشاء، منکر، بغی۔ پوری آیت یہ ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ	اللہ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا
الْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی	حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و
وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَ	زیادتی سے منع کرتا ہے وہ تمہیں نصیحت
الْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۝	کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔

فحشاء، منکر اور بغی کی مختصر تشریح سے پہلے ایک دیدہ ور مفسر کی تفسیر کا اقتباس ذیل میں دیا جا رہا ہے:

پہلی چیز فحشاء ہے جس کا اطلاق تمام بے ہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو فحش ہے۔ مثلاً بخل، زنا، برہنگی و عریانی، عمل قوم لوط، محرمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گالیاں بکنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے۔ مثلاً جھوٹا پروپیگنڈہ، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر

ا؎ اس طویل مقالہ کی یہ دسویں قسط آخری قسط ہے

بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظرِ عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا، اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور ناز و ادا کی نمائش کرنا وغیرہ۔

دوسری چیز منکر ہے جس سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے بالعموم انسان برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور تمام شرائعِ الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے

تیسری چیز بغی ہے جس کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔

(تفہیم القرآن ج ۲)

جس طرح عدل، احسان اور صلہ رحمی کی تین بھلائیاں انفرادی طور پر افراد و اشخاص کو اور اجتماعی طور پر پورے معاشرے کو درست کرتی ہیں۔ اسی طرح فحشاء، منکر اور بغی کی تین برائیاں فرد اور جماعت کو خراب کرنے والی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے پیدائشی طور پر انسان کو جو قوتیں عطا فرمائی ہیں ان میں ایک قوت تو وہ ہے جس سے وہ اپنے لیے جلبِ منفعت کرتا ہے۔ یہی قوت اسے لذت، مسرت اور نفع بخش چیزوں کی تحصیل پر آمادہ کرتی ہے اس قوت کو فلاسفہ قوتِ شہوانیہ کہتے ہیں۔ دوسری قوت وہ ہے جس سے وہ دفعِ مضرت کرتا ہے۔ یہی قوت اسے تکلیف دہ اور نقصان رساں چیزوں کی مدافعت پر ابھارتی ہے، اس کو قوتِ غضبیہ کہا گیا ہے تیسری قوت وہ ہے جو اسے اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں بلند کرنے اور اونچا رکھنے پر اکساتی ہے اس کو قوتِ وہمیہ سے تعبیر کرتے ہیں ——— امام رازی کا خیال ہے کہ انسان قوتِ شہوانیہ کی بے اعتدالی سے فحشاء میں اور قوتِ غضبیہ کی بے اعتدالی سے منکر میں اور قوتِ وہمیہ کی بے اعتدالی سے بغی میں مبتلا ہوتا ہے۔ ان تین برائیوں سے روک کر اللہ نے انسان کو تینوں پیدائشی قوتوں کو حدِ اعتدال میں رکھنے کا حکم دیا ہے اور حدِ اعتدال کا معیار اسلامی شریعت ہے۔ جلبِ منفعت ہو یا دفعِ مضرت یا بلندیوں کے حصول کی خواہش ہر موقع پر دیکھنا پڑے گا کہ شریعت کس چیز کی اجازت دیتی ہے اور کس چیز سے روکتی ہے، اس کی ممانعت پر رک جانا ہی اعتدال کی حد ہے۔ اگر کوئی شخص اس حد پر نہیں رکتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اللہ کی دی ہوئی قوتوں پر قابو حاصل نہیں کیا ——— امام رازی کے خیال میں نکتہ آفرینی بے شک ہے لیکن

یہ تینوں الفاظ فحشاء، منکر، بغی۔ جہاں جہاں استعمال کیے گئے ہیں۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ فلسفیانہ تقسیم وحد بندی اطمینان بخش نہیں ہے۔ صحیح تر بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان تینوں بنیادی برائیوں کا صراحۃً ذکر کرکے ہر اس برائی سے روک دیا گیا ہے جس سے انفرادی و اجتماعی نظام میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مثلاً فحشاء کا اطلاق صرف ان ہی برائیوں پر ہو جن کا تعلق قوتِ شہوانیہ سے ہوتا ہے کیونکہ ہم شرعی استعمال میں ایسی برائی پر بھی فحش کا اطلاق دیکھتے ہیں جس کا تعلق قوتِ غضبیہ سے ہے بلکہ لغوی اطلاقات کے لحاظ سے بھی فحش، فاحشۃ اور فحشاء کے استعمال میں وسعت و عموم پایا جاتا ہے۔

فحشاء کے لغوی معنیٰ

مفردات امام راغب میں ہے:۔

الفحش والفحشاء	فحش، فحشاء اور فاحشہ ہر ایسے قبیح
والفاحشۃ ماعظم قبحہ من الافعال	قول و فعل کو کہتے ہیں جس کی قباحت اور برائی
والاقوال	بہت بڑھی ہوئی ہو۔

لسان العرب میں ہے:۔

الفحش والفحشاء والفاحشۃ۔	فحش، فحشاء اور فاحشہ قبیح قول و فعل کو
القبیح من القول والفعل وجمعہا	کہتے ہیں اس کی جمع فواحش ہے اور فحشاء فاحشہ
الفواحش والفحشاء اسم الفاحشۃ	کا اسم ہے۔
وفی الحدیث ان اللہ یبغض	اور حدیث میں ہے کہ اللہ فاحش اور
الفاحش المتفحش الفاحش ذوالفحش	متفحش سے نفرت کرتا ہے۔ فاحش تو وہ شخص ہے
والخنا من قول وفعل والمتفحش الذی	جس کے قول و فعل میں فحش پایا جاتا ہے اور متفحش وہ
یتکلف سب الناس ویتعمدہ وقد	ہے جو بالقصد اور بہ تکلف لوگوں کو برا بھلا کہتا ہے
تکرر ذکر الفحش والفاحشۃ والفاحش	حدیث میں فحش، فاحشہ اور فاحش کا بکثرت ذکر ہے
فی الحدیث وھو کل ما یشتد قبحہ من الذنوب والمعاصی	اور یہ ہر وہ گناہ ہے جس کا قبح شدید ہو۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ فحش، فحشاء اور فاحشہ کا اطلاق کتاب و سنت میں کن کن برائیوں پر کیا گیا ہے۔

زنا زنا ایک ایسی برائی ہے جس کے گناہ کبیرہ اور سخت قبیح برائی ہونے پر دنیا کے تمام مذاہب متفق ہیں اور

انسان جب اپنی فطرت کو مسخ نہ کرلیا ہو اس کے فعل بد ہونے میں شک وشبہ نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ فاحشہ بکثرت زنا کے معنی میں مستعمل ہے بلکہ زنا کا ایک نام فاحشہ بھی ہے۔ قرآن نے صراحۃً زنا کو فاحشہ کہا ہے :-

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل آیۃ ۳۲)

زنا کے قریب نہ پھٹکو بلاشبہ وہ فاحشہ (بہت برا فعل) ہے اور بڑا برا راستہ

"زنا کے قریب نہ جاؤ" حرمت زنا کے اس طرز تعبیر نے زنا کو تو حرام قرار دیا ہی اس کے ساتھ ساتھ کھلا اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا کہ انسان کو دواعی زنا سے بھی اجتناب کرنا چاہیے یعنی ہر ایسی چیز سے دور بھاگنا چاہیے جو زنا کی طرف لے جانے والی ہو۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ (نساء آیۃ ۱۵)

تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو۔

اس آیت میں بھی فاحشہ کا لفظ زنا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جاہلیت عرب میں زنا کی کثرت اس حد تک جا پہنچی تھی کہ بہت سے جاہل عرب اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ محرمات سے زنا کی شناعت وقباحت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زنا کے لیے قرآن میں فاحشہ کے ساتھ مقت کا لفظ بڑھایا گیا ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (نساء آیۃ ۲۲)

اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو مگر جو ہو چکا ہو چکا۔ بے شک یہ بہت برا فعل اور غضب الٰہی کا سبب اور برا چلن ہے

یہ بات معلوم ہے کہ زنا اسلامی قانون میں ایک شدید جرم ہے اور اس کی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔ سزا کی تفصیل جاننے کے لیے قرآن کی تفسیریں اور فقہ کی کتابیں پڑھنی چاہییں۔ جیسا کہ پہلے لغت کی تصریح گزر چکی کہ فاحشہ اور فحشاء دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں اس لیے فحشاء کا اطلاق بھی زنا پر ہوتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زنا کی انتہائی شدید ترغیب کے باوجود بچا لیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ

ایسا ہوا تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی

السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ (یوسف آیۃ ۲۴) (زنا) کو دور کر دیں۔

عملِ قومِ لوط

دنیا میں سب سے پہلی قوم جس کی صنفی انارکی، ہم جنسی کی لعنت تک جا پہنچی وہ قومِ لوط ہے۔ اس قوم کے مرد، مردوں سے اپنی صنفی شہوت کی آگ بجھانے لگے۔ چونکہ یہ غیر فطری فعل ہے اور یہ قوم سب سے پہلے اس کی مرتکب ہوئی اس لیے یہ لعنت اس کے نام کے ساتھ چپک کر رہ گئی اور اس فعل کو ظاہر کرنے کے لیے عملِ قومِ لوط کی تعبیر اختیار کر لی گئی۔ کوئی شخص اگر اس بدفعلی کا عادی ہو تو اسے لوطی کہنے لگے اور اس بدفعلی کا دوسرا نام لواطہ قرار پایا۔ اس بدفعلی کے فحشا اور فاحشہ ہونے میں کیا شبہ ہے۔ قرآن نے اس قوم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا:۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ	اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا پھر یاد
الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ	کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا۔ کیا تم ایسے
مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ	بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے
شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ	پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر
اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ	مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو حقیقت
(اعراف آیۃ ۸۰۔ ۸۱)	یہ ہے کہ تم بالکل حد سے گزر جانے والے لوگ ہو

شیطان جب کسی فرد یا کسی قوم کو اپنا آلۂ کار بنا کر اس سے کسی برائی و بدکاری کا ارتکاب کراتا ہے تو پھر وہ اسی قوم تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ اسے دنیا بھر میں پھیلانے کی کوشش کرتا ہے، چنانچہ سدوم اور عمورہ میں بسنے والی قوم کی یہ بدکاری بھی محدود نہ رہی اور آج تو یہ ایک وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے بلکہ یورپ کے بہت سے گندہ فطرت لوگ اس کی حمایت میں باضابطہ پروپگنڈا کر رہے ہیں۔ جس جرم کی پاداش میں قومِ لوط پر آسمان سے پتھر برسے اور اس کا پورا علاقہ تلپٹ کر دیا گیا، اس کی حرمت، شناعت اور قباحت میں اگر کسی کو شبہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے قومِ لوط ہی کی طرح اپنی فطرت کو مسخ کر لیا ہے۔ جس طرح اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی مملکت کو زنا سے پاک رکھنے کی سعی کرے اسی طرح اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اس بدکاری سے بھی اسے صاف رکھے۔ اسلامی شریعت میں اس جرم کی بھی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔ فقہائے امت کی اکثریت کے نزدیک اس کی سزا قتل ہے۔

برہنگی و عُریانی عورت و مرد کو زنا میں مبتلا کرنے والے جتنے محرکات ہیں ان میں شدید ترین محرک برہنگی و

عریانی اور بے برہنگی ہے۔ حیا و شرم انسان کی فطرت میں داخل ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام مہذب انسان ستر پوشی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اب اگر کوئی فرد برہنگی و عریانی اختیار کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بے حیا ہوگیا ہے اور بے حیائی کے بعد ہر برائی اس سے متوقع ہے لیکن شیطان کا کمال یہ ہے کہ وہ انسانوں کو نہ صرف یہ کہ اس بے حیائی میں مبتلا کرتا ہے بلکہ بعض اوقات وہ اسے مذہبی تقدس بھی عطا کر دیتا ہے۔ جاہلیت میں غیر قریشی قبیلوں کے بہت سے مرد و عورت کعبہ کا برہنہ ہو کر طواف کرتے تھے اور اس فعل کو ان کے نزدیک ایک مذہبی تقدس حاصل تھا۔ قرآن نے اس کا سخت انکار کیا اور اس فعل کو فاحشہ قرار دیا۔

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

(الاعراف آیۃ ۲۸)

یہ لوگ جب کوئی شرمناک کام کرتے تھے تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہو اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں۔

اس آیت میں فاحشہ اور فحشاء کا اطلاق برہنہ طواف پر کیا گیا ہے۔ اسلامی شریعت میں ستر پوشی واجب ہے۔ جن اعضاء کو چھپانا شرعاً ضروری ہے انہیں دوسروں کے سامنے کھولنا گناہ کبیرہ ہے۔ الا یہ کہ مجبوری کی حالت میں کسی طبیب اور ڈاکٹر کے سامنے کھولنے کی ضرورت پڑ جائے۔ آج ہم سب کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ زنا کو وبا کی طرح جن اسباب نے پھیلا دیا ہے ان میں برہنگی اور عریانی ایک بڑا سبب ہے۔ ایسا لباس جو جسم کے نشیب و فراز کو نمایاں کرے یا اتنا باریک ہو کہ ستر پوشی نہ کر سکے، عریانی ہی میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان معاشرے میں بھی اس طرح کے لباس عریانی کا رواج بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

بخل انسان کے مال میں اللہ اور بندوں کے جو واجب حقوق ہیں ان کو ادا نہ کرنا بخل ہے۔ اگر مال دار ہونے کے باوجود کوئی شخص زکوٰۃ نہیں دیتا، قربانی نہیں کرتا، صدقۂ فطر نہیں دیتا۔ اسی طرح جن رشتہ داروں کی کفالت اس پر واجب ہے ان کی کفالت نہیں کرتا تو ایسا شخص شرعی اصطلاح میں بخیل کہا جائے گا۔ بخل تمام شریف اور نیک فطرت انسانوں کے نزدیک سخت عیب اور کھلی ہوئی برائی ہے۔ یہ بخیل انسانی

معاشرے میں ایک مذموم اور ناپسندیدہ شخص سمجھا جاتا ہے۔ کلام عرب میں بخیل کے لیے فاحش کا لفظ مستعمل ہے اور قرآن میں بھی بخل پر فحشاء کا اطلاق موجود ہے۔ متعدد آیات میں مسلمانوں کو صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کا حکم اور ترغیب دینے کے بعد کہا گیا ہے :۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ	شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور
یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ	شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے
مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَ فَضْلًا ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ	مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے
عَلِیْمٌ ﴿۲۶۸﴾ (البقرہ ۲۶۸)	اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔

اس آیت میں فحشاء کا لفظ بخل کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ دین کو سربلند کرنے اور سربلند رکھنے کے لیے بھی مال کی ضرورت ہے۔ اگر عام طور سے مال دار صاحب نصاب مسلمان، اپنی مٹھی بند کرلیں، وہ نہ دین کی سربلندی کی راہ میں پیسے خرچ کریں اور نہ حاجت مند لوگوں کے مالی حقوق ادا کریں تو اس کا نتیجہ دینی و دنیوی ہلاکت کے سوا اور کیا نکلے گا۔ شیطان چونکہ مسلمانوں کا سخت ترین دشمن ہے اس لیے وہ مال داروں کو بخل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ اس آیت میں تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ کی مغفرت، اس کے فضل و کرم، اس کے وسیع خزانے اور محیط علم پر یقین و اعتماد کرکے اس شیطانی تسویل و ترغیب کو رد کر دینا چاہیے۔ اس کے بغیر فلاحِ دارین کا حصول ممکن نہیں ہے۔

تہمت زنا تہمتِ زنا پر بھی قرآن میں فاحشہ کا اطلاق کیا گیا ہے :۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ	جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں کے
فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا	گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک
وَالْاٰخِرَۃِ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النور ۱۹)	عذاب کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

جس طرح زنا ایک سخت برائی اور معاشرے کو بگاڑنے والی چیز ہے اسی طرح پاک باز مرد و عورت پر زنا کی تہمت بھی سخت برائی ہے اور اس سے بھی معاشرے میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس جرم کی بھی ایک سخت حد مقرر کی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مسلمان مرد یا عورت پر زنا کا اتہام لگائے اور پھر اسے چار گواہوں سے ثابت نہ کرسکے تو اسلامی عدالت ایسے شخص پر اسی کوڑوں کی حد جاری کرے گی۔ زنا کی حد قرآن میں سو کوڑے بیان کی گئی ہے اور قذف یعنی زنا کے اتہام کی حد اسی کوڑے۔ زنا کی حد سے صرف ۲۰ کوڑے کم لیکن اتنی

علاوہ ایسے شخص کو قرآن نے ایک اور سزا دی ہے اور وہ یہ کہ آئندہ کسی مقدمے میں اس کی گواہی قابلِ قبول نہ ہوگی۔ وہ سوسائٹی میں ایک ساقط الاعتبار شخص قرار پائے گا۔ یہ سزا کوڑوں کی سزا سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہمتِ زنا اللہ کے نزدیک کس درجے کی برائی ہے۔

راجح تفسیر کی بنا پر سورۂ نور کی مذکورہ بالا آیت میں فاحشہ کا لفظ تہمتِ زنا کے لیے استعمال ہوا ہے۔

بدکلامی و زباں درازی فاحشہ کا اطلاق بدکلامی اور زبان درازی پر بھی کیا گیا ہے۔ سورۂ طلاق میں ہے:

لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ	ان عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو
وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ	اور نہ وہ خود نکلیں الا یہ کہ وہ صریح بے حیائی
مُّبَيِّنَةٍ ۚ (طلاق، آیۃ ۱)	کریں۔

اس آیت میں یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ جس عورت کو طلاق دی گئی ہو اس کو عدت کے ختم ہونے تک شوہر ہی کے گھر میں قیام کرنا چاہیے، نہ شوہر کو حق ہے کہ اس کو اپنے گھر سے باہر نکالے اور نہ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی مرضی سے نکلے، ہاں اگر وہ عورت کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرے تو پھر اسے گھر سے نکال دینا جائز ہوگا۔ وہ فاحشۂ مبینہ (کھلی بے حیائی) کیا ہے؟ اس کے بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ ایک جماعت نے متعدد طریقوں سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس اس کی تفسیر بدکلامی و زباں درازی سے کرتے تھے اس کی تائید حضرت ابی بن کعب کی ایک قرأت سے بھی ہوتی ہے۔ وہ اس آیت میں إِلَّا أَنْ يَفْحُشْنَ عَلَيْكُمْ کی قرأت کرتے تھے یعنی ان کو گھر سے نکالنا اس وقت جائز ہوگا جب وہ تم سے بدکلامی و زباں درازی کرنے لگیں اور ہر وقت کی تو تو میں میں شروع ہو جائے۔

اس تفسیر کی تائید حضرت فاطمہ بنت قیس ؓ کے واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ طلاق کے بعد ان کو شوہر کے گھر سے نکلنے کی اس لیے اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ شوہر کے رشتہ داروں سے جھگڑنے لگی تھیں۔ فاحشہ مبینہ کے بارے میں دوسری تفسیریں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) بلا عذر مطلقہ عورت کا شوہر کے گھر سے نکل جانا ہی فاحشۂ مبینہ ہے۔ عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن المنذر، بیہقی، ابن مردویہ اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمر سے یہی تفسیر روایت ہے اور اسی کو سدی، ابن السائب، امام نخعی اور امام ابوحنیفہ نے اختیار کیا ہے۔

(۲) اس سے مراد زنا ہے۔ یہ تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے اور اسی کو قتادہ، حسن بصری، شعبی

زید بن اسلم ضحاک عکرمہ حماد لیث اور امام ابو یوسف نے اختیار کیا ہے۔

(۳) حضرت سعید بن المسیب کا خیال ہے کہ اس لفظ سے کوئی ایک برائی مراد نہیں ہے بلکہ ہر کھلی برائی مراد ہے۔ اوپر بیان کی ہوئی برائیوں کے علاوہ ان کے نزدیک ہر ایسی برائی مراد ہے جس پر حد ہے جیسے چوری وغیرہ۔ اسی رائے کو امام طبری نے اختیار کیا ہے۔

(۴) نشوز (شوہر کی نافرمانی) اور بدخلقی۔ یہ تفسیر حضرت عائشہ سے مروی ہے اور قتادہ کا بھی ایک قول ہے۔

ــــــ ان تفسیروں سے معلوم ہوا کہ حسب ذیل برائیوں پر فاحشہ کا اطلاق صحیح ہے۔

بدزبانی و بدکلامی۔ زنا۔ مطلقہ عورت کا بغیر عذر، عدت ختم ہونے سے پہلے شوہر کے گھر سے نکلنا۔ چوری۔ قذف (کسی پر زنا کا اتہام لگانا) شراب نوشی۔ نشوز اور بدخلقی

فواحش کی کلی تحریم

سورۂ نحل کی آیت ۹۰ کے علاوہ دوسری آیات میں بھی فواحش کی کلی تحریم فرمائی گئی ہے یعنی ہر صریح بے حیائی (فاحشہ) کو حرام قرار دیا گیا ہے:

سورۂ انعام کی آیت ۱۵۱ میں ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ	اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی

لَا تَقْرَبُوا کے صیغے نے تو یہ بتایا کہ ہر ایسی چیز سے بھی دور بھاگنا چاہیے جو کسی بے حیائی میں مبتلا کرنے والی ہو۔ اس میں بے حیائی پر ابھارنے والے اشعار، افسانے، ڈرامے، ناول، فلمیں اور عریاں تصاویر داخل ہیں۔ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ جلوت اور خلوت، ہر جگہ بے حیائی کے کاموں سے بھاگنا چاہیے۔ دوسری یہ کہ فواحش کا ارادہ بھی نہ کرنا چاہیے اس لیے کہ کسی بے حیائی کے کام کا ارادہ اور اس کی نیت چھپا ہوا فاحشہ ہے اور اس سے بھی مومن کے دل و دماغ کو پاک ہونا چاہیے۔ بے حیائی کے وسوسے اور محض خیال پر تو گرفت نہیں ہے لیکن اگر وہ خیال، ارادہ اور نیت بن جائے تو اس پر گرفت ہے۔

ــــــ سورۂ اعراف کی آیت ۳۳ میں فرمایا۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (اعراف آیۃ ۳۳)	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہو کہ میرے رب نے بے حیائی کے کام حرام کیے ہیں خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کوئی بھی اللہ سے زیادہ غیور نہیں ہے اسی وجہ سے اس نے بے حیائی کے کاموں کو حرام قرار دیا ہے۔ خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے۔

ایک بار حضرت سعد بن عبادہ نے فرمایا کہ اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو دیکھ لوں تو اس کو بلا تامل قتل کر دوں جب یہ بات حضور تک پہنچی تو آپ نے فرمایا۔

کیا تمہیں سعد کی غیرت پر تعجب ہے۔ واللہ میں سعد سے زیادہ غیرت مند ہوں۔ اللہ مجھ سے زیادہ غیور ہے۔ اسی وجہ سے اس نے ظاہری و باطنی ہر طرح کے فواحش کو حرام کیا ہے۔ (بخاری و مسلم)

سورۂ انعام و اعراف کی ان دو آیتوں نے زنا، تہمت زنا، عمل قوم لوط، چوری، شراب نوشی اور اس طرح کے دوسرے جرائم کی حرمت میں مزید تاکید پیدا کر دی کیونکہ ان جرائم کے فواحش ہونے میں کسی سلیم الفطرت انسان کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

احادیث میں

احادیث میں بھی فواحش کی قباحت و شناعت بکثرت آئی ہے۔ ان میں جن چیزوں پر صراحۃً فواحش کا اطلاق کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔

حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ زانی، چور اور شرابی کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو۔ صحابہ نے کہا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے آپ نے فرمایا۔ زنا، چوری اور شراب خواری "فواحش" ہیں اور یہ مستوجب سزا جرائم ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔ "بے شک ناگفتنی فواحش میں سے ہے۔" (تفسیر المنار ج ۸)

کسی کی تکلیف دہ بات کے جواب میں تعدی (زیادتی) اختیار کرنے پر بھی فحش کا اطلاق حدیث میں ملتا ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک بار کچھ یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا۔ "السام علیکم" (تم پر موت) آپ نے جواب میں فرمایا "علیکم" (تم لوگوں پر) حضرت عائشہ نے یہودیوں کے جواب میں کہا "تم پر موت اور اللہ کی لعنت اور اس کا غضب"۔ یہ سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "رک جاؤ اے عائشہ! نرمی اختیار کرو اور سختی اور فحش سے پرہیز کرو۔ انھوں نے عرض کی۔ کیا آپ نے

ان کی بات نہیں سنی ؟ آپ نے فرمایا ۔ کیا تم نے وہ بات نہیں سنی جو میں نے کہی ۔ میں نے ان کا قول ان پر پلٹ دیا ۔ ان کے بارے میں میری بات قبول کرلی جائے گی اور میرے بارے میں ان کی بات اللہ قبول نہیں فرمائے گا ۔ (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے چونکہ جواب میں اللہ کی لعنت اور غضب کا اضافہ کر دیا تھا ۔ اس لیے حضور نے تنبیہ فرمائی ۔ جواب میں جو تعدی (زیادتی) ہوگئی تھی اسی کو اس حدیث میں فحش کہا گیا ہے ۔

المنکر منکر وہ دوسری چیز ہے جس سے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو روکا ہے ۔ منکر کی تعریف لسان العرب میں یہ ہے :۔

کل ما قبحہ الشرع وحرمہ و کرھہ فھو منکر	ہر وہ چیز جسے شریعت نے قبیح ، حرام اور مکروہ قرار دیا ہو وہ منکر ہے ۔

منکر کی تعریف میں امام راغب نے اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ ہر وہ فعل جسے عقل صحیح قبیح قرار دیتی ہے وہ بھی منکر ہے ۔ اسی لیے منکر کا اطلاق ہر ایسی برائی پر بھی ہوتا ہے جسے لوگ عام طور پر برا جانتے ہیں لیکن اس کو جاننے کی اصل کسوٹی شریعت ہی ہے ۔ کیونکہ عقل میں خلل بھی ہوتا ہے اور خواہش نفس سے مغلوب عقل برائی کو بھلائی بھی قرار دے سکتی ہے ۔

لغوی حقیقت کے لحاظ سے اس لفظ میں جہالت و ناواقفیت اور عدم معرفت کا مفہوم پایا جاتا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر ایسا فعل جو عقل سلیم کے نزدیک غیر معروف مجہول اور اجنبی ہو منکر ہے اسی لیے لغت میں منکر کے لیے ضد المعروف کی تشریح بھی ملتی ہے یعنی منکر ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جو جانی پہچانی چیزوں کی ضد ہو ۔ معروف وہ ہے جسے ہم جانتے پہچانتے ہیں اور منکر وہ ہے جسے ہم نہیں جانتے ۔ یہ لغوی حقیقت قرآن میں کئی جگہ استعمال ہوئی ہے ۔ سورۂ یوسف میں ہے :۔

وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ ۝ (آیۃ ۵۸)	اور یوسف کے بھائی مصر آئے اور اس کے یہاں حاضر ہوئے اس نے انہیں پہچان لیا اور وہ لوگ اس سے ناآشنا تھے ۔

حضرت یوسف کے بھائیوں کو ان کا منکر اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے بھائی یوسف کو پہچان نہ سکے ۔

شریعت کی رو سے معروف کے دائرے میں ایمان و اسلام سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی نیکی تک داخل ہے

اسی طرح منکر کے احاطے میں کفر و شرک سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی برائی تک داخل ہے۔ منکر کا تعلق دل، زبان اور دوسرے اعضاء و جوارح سب سے ہے۔ برے عقائد و افکار، برے اعمال و افعال اور برے الفاظ و اقوال سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے بلکہ کسی چھپی ہوئی برائی کی ظاہری علامت کو بھی منکر کہتے ہیں۔ اس سلسلے کی چند آیتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ قوم لوط کے بارے میں کہا گیا ہے:۔

وَتَاتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنْكَرَ (العنکبوت ۲۹)	اور تم اپنی مجلسوں میں منکر کا ارتکاب کرتے ہو

امام احمد اور امام ترمذی وغیرہما نے حضرت ام ہانی سے روایت کی ہے۔

قالت سألت رسول الله صلی الله علیه وسلم عن قوله تعالیٰ وتاتون فی نادیکم المنکر قال یحذفون اهل الطریق ویسخرون منهم	کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وَتَاتُونَ فِي نَادِيكُمُ المنکر کی آیت کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا وہ راہ گیروں پر کنکری مارتے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔

اس حدیث میں جن دو چیزوں کو منکر کہا گیا ہے ان میں ایک کا تعلق فعل سے ہے اور دوسرے کا قول سے۔ اس آیت کی تفسیر میں مختلف ائمہ تفسیر کے حسب ذیل اقوال بھی ملتے ہیں۔
ہوا خارج کر کے ہنسنا۔ مینڈھے اور مرغ لڑانا۔ کبوتر بازی۔ سیٹی بجانا۔ گوپھن سے پھینک کر پتھر مارنا
بنی اسرائیل کے ملعون ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ (المائدہ ۷۹)	انھوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔

اس آیت میں منکر کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن مفسرین نے چند چیزوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔
(۱) سنیچر کے دن مچھلی کا شکار۔ (۲) رشوت خوری (۳) سود خوری۔ (۴) حرام چربی بیچ کر اس کی قیمت کا استعمال
سورۂ مجادلہ میں ظہار کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا

وَإِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ مُنكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُورًا (آیۃ ۲)	اور بے شک وہ ایک ناپسندیدہ اور جھوٹی بات بولتے ہیں۔

ظہار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّي (تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے) اس آیت میں ظہار کے الفاظ کو صراحۃً منکر اور جھوٹ کہا گیا ہے۔ (ظہار کے مسئلے کو فقہ کی کتابوں میں دیکھیے)

فحشاء اور منکر میں فرق

جن جن چیزوں پر فحشاء اور فاحشہ کا اطلاق ہوتا ہے اور جن جن چیزوں پر منکر کا اطلاق ہوتا ہے انہیں دیکھتے ہوئے بظاہر ان دونوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا لیکن فی الواقع ان دونوں میں فرق ہے۔ بات یہ ہے کہ کسی لفظ کے ایک معنی تو وہ ہوتے ہیں جس کے لیے وہ وضع کیا گیا ہو۔ یہی معنی اس لفظ کا حقیقی معنی ہوتا ہے اور پھر وہ لفظ کسی مناسبت کی وجہ سے بہت سے دوسرے معانی میں استعمال ہونے لگتا ہے۔ یہ دوسرے معانی حقیقی معانی نہیں ہوتے بلکہ مجازی ہوتے ہیں۔

فحشاء کے حقیقی معنی میں بے حیائی اور بے شرمی کا مفہوم پایا جاتا ہے اور منکر کے حقیقی معنی میں بے حیائی کا مفہوم داخل نہیں ہے بلکہ اس لفظ کی لغوی حقیقت میں عدم معرفت اور انکار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اسی حقیقی معنی کے لحاظ سے یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ اور اسی جہت سے منکر کا لفظ فحشاء کے مقابلے میں زیادہ عام ہے۔ ہر فحشاء منکر بھی ہو لیکن ضروری نہیں کہ ہر منکر پر فحشاء اور فاحشہ کا اطلاق بھی صحیح ہو۔ مثال کے طور پر جانوروں کو آپس میں لڑانا منکر تو ہے لیکن اس پر فاحشہ کا اطلاق صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

فحشاء و منکر سے بچنے کی تدبیر

انسان کے ساتھ اس کا اپنا نفس اور شیطان دو بڑے دشمن لگے ہوئے ہیں جو شرمناک اور برے کاموں کے ارتکاب پر اکساتے رہتے ہیں۔ شیطان کے بارے میں تو صراحۃ یہ کہا گیا ہے کہ وہ فحشاء و منکر کا حکم دیتا ہے۔ فَاِنَّہٗ یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (بلاشبہ شیطان فحشاء اور منکر کا حکم دیتا ہے) یہ بات سورۂ نور میں مسلمانوں کو شیطان کی پیروی سے روکتے ہوئے کہی گئی ہے ــــ ان دو دشمنوں کے اغوا اور ان کی ترغیب کے نتیجے سے انسان کس طرح بچے اور فحشاء و منکر سے استحفاظ کی تدبیر کیا ہو؟ قرآن نے اس سوال کے جواب میں نماز کو پیش کیا ہے۔ نماز وہ تدبیر ہے جس کے ذریعہ انسان شرمناک اور برے افعال سے اپنا دامن بچا سکتا ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ بلاشبہ نماز فحش اور برائی سے روکتی ہے (العنکبوت) نماز بے حیائیوں اور برائیوں سے کس طرح روکتی ہے اور کس نماز کا یہ خاصہ ہے اس کی تفصیل قسط (۵) میں کی جاچکی ہے۔ یہاں مزید اتنی بات اور لکھی جاتی ہے کہ یہ خاصہ ہر نماز کا نہیں ہے بلکہ اس نماز کا ہے جس میں یہ چار باتیں پائی جائیں۔

حضورِ قلب۔ خشوع۔ محافظت۔ مداومت

حضورِ قلب کے معنی یہ ہیں کہ نماز غافل دل کے ساتھ نہ پڑھی جائے بلکہ نمازی کا دل خدا کے دربار میں حاضر ہو اور اس کی نماز خدا کی یاد سے بھری ہوئی ہو۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۔ میری یاد کے لیے نماز قائم کرا کر

خشوع کے معنی یہ ہیں کہ نمازی کا دل، خدا کی عظمت و جلال کے سامنے جھکا ہوا ہو، وہ خدا کے سامنے اس طرح کھڑا ہو جیسے ایک حقیر غلام اپنے باجبروت آقا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ جو لوگ اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں (المومنون)

محافظت کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی تمام چیزوں سے اپنی نماز کی حفاظت کرے جو اسے خراب کرنے والی ہوں۔ نماز کے اندر بھی اور نماز سے باہر بھی۔ نیز یہ کہ ایسی تمام چیزوں کا التزام کرے جن سے وہ درجۂ تکمیل کو پہنچتی ہے ان میں سے ایک اہم چیز یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا التزام کیا جائے۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوٰتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ اور جو لوگ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔

مداومت کے معنی یہ ہیں کہ نماز پابندی کے ساتھ ہمیشہ پڑھی جائے ایسا نہ ہو کہ کبھی نماز پڑھی اور کبھی نہیں پڑھی۔ اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَائِمُوْنَ ۝ جو لوگ اپنی نماز پر قائم دائم رہتے ہیں (المعارج)

یہ ہے وہ نماز جو بے حیائیوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔ جن لوگوں کی نمازوں میں یہ صفات پائی جاتی ہیں آج بھی مشاہدہ ہے کہ ان سے دوسروں کے مقابلے میں فواحش کا ارتکاب بہت کم ہوتا ہے اور جو لوگ پنج وقتہ نمازیں بھی ادا کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فواحش و منکرات میں بھی مبتلا ہیں۔ ان کی نمازیں حقیقی نمازیں نہیں ہیں محض رسمی ہیں۔

البغی

تیسری چیز جس سے سورۂ نحل کی آیت ۹۰ میں روکا گیا ہے، بغی ہے۔ لغوی اعتبار سے بغی کی اصل اپنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ لسان العرب میں ہے :۔

اصل البغی مجاوزۃ الحد۔ لفظ بغی کی اصل حد سے تجاوز کرنا ہے۔ صحاح جوہری میں ہے۔ "کسی شے کی جو محدود مقدار مقرر ہے اس میں افراط پیدا کرنا اور اس مقررہ حد سے تجاوز کرنا بغی ہے" اسی لغوی معنی کے لحاظ سے کسی دوسرے شخص یا اشخاص کی جان، مال اور عزت و آبرو پر دست درازی کو بغی کہتے ہیں۔ اس لفظ کا غالب استعمال حقوق العباد میں دست درازی پر ہوتا ہے۔ اس آیت میں بھی بغی سے مراد ظلم و زیادتی اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ عام طور سے علیٰ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ ص میں ہے :۔

خَصْمَانِ بَغٰی بَعْضُنَا عَلٰی بَعْضٍ (آیت ۲۲) — ہم دو فریق ہیں، ہم میں سے بعض نے بعض پر زیادتی کی ہے

سورۂ قصص میں فرمایا گیا ہے :-

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰی فَبَغٰی عَلَیْهِمْ (آیۃ ۷۶) — قارون قوم موسیٰ کا ایک فرد تھا پھر اس نے ان کے مقابلے میں ظلم و زیادتی اختیار کی

سورۂ حجرات میں مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان جنگ ہو جانے کی صورت میں حکم دیتے ہوئے [illegible]

فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ (آیۃ ۹) — پس اگر ان میں ایک جماعت دوسری کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرے تو سرکش و ظالم جماعت سے لڑو۔

علیٰ کے صلہ کے بغیر بھی یہ لفظ سرکشی اور ظلم و زیادتی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں فرمایا :-

وَالَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ ۝ (آیۃ ۳۹) — اور وہ لوگ کہ جب ظلم و سرکشی سے دوچار ہوتے ہیں تو بدلہ لیتے ہیں۔

سورۂ نحل کے علاوہ ایک اور مقام پر بھی بغی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس مقام کو بھی یہاں سامنے رکھنا چاہیے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ (اعراف ۳۳) — کہہ دو کہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو حرام کیا ہے خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے اور اس نے گناہ کو حرام کیا ہے اور ناحق کی زیادتی کو۔

فواحش، اثم اور بغی کی تحریم جس ترتیب سے اس آیت میں ہے بے شک وہی ترتیب ہے جو سورۂ نحل کی آیۃ (۹۰) میں اختیار کی گئی ہے اور معنوی اعتبار سے دونوں آیتیں ایک دوسرے کی نظیر ہیں۔ بغی کے ساتھ بغیر [illegible] کی قید ایک واقعی اور تاکیدی قید ہے یعنی یہ واقعہ ہے کہ حقوق پر دست درازی، اپنی حد سے تجاوز اور ظلم [illegible] ہمیشہ ناحق ہی ہوتے ہیں جیسے ایک دوسرے مقام پر کہا گیا ہے وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ اور انبیاء کو بغیر حق کے قتل [illegible]

کرتے تھے۔ (بقرہ ۱۱) ظاہر ہے کہ انبیاء کا قتل ناحق ہی ہو سکتا تھا اس لیے یہ قید محض اظہار واقعہ کے لیے لگائی گئی ہے۔ میرے نزدیک بغی کے ساتھ بغیر الحق کی قید بھی اسی کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں بغی کا لفظ بغیر مفعول کے بہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے ظلم وسرکشی اور جائز حدود سے تجاوز ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اللہ کے فضل وکرم سے ہم آیت زیر بحث کے اوامر ونواہی کی مختصر توضیح وتشریح سے فارغ ہو گئے آخر میں ان اوامر ونواہی کے حسن ترتیب کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ اوامر کو عدل کے حکم سے شروع کیا گیا اور ایتاء ذی القربیٰ کے حکم پر ختم کیا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عدل واحسان کے دو عمومی حکم کے بعد حقوق العباد سے متعلق ایک خصوصی حکم دیا گیا ہے اسی طرح نواہی کی ابتدا فحشاء کی نہی سے کی گئی اور اس کو بغی کی نہی پر ختم کیا گیا۔ یہاں بھی فحشاء اور منکر کی دو عام ممانعتوں کے بعد حقوق العباد سے متعلق ایک خاص ممانعت کی گئی اس طرح خاص حکم اور خاص نہی سے حقوق العباد کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ اوامر کی ابتدا عدل اور نواہی کی انتہا ظلم وزیادتی (بغی) پر کرکے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ تمام نیکیوں کی اصل عدل ہے اور تمام برائیوں کی جڑ ظلم ہے۔ اسی کے ساتھ اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جب تک انسان بغی ترک نہ کرے وہ فحشاء ومنکر سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتا کیونکہ ہر فاحشہ اور ہر منکر کے ارتکاب کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی حد بندگی سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اس طرح بغی سے روک کر فحشاء ومنکر کے اصل سبب کی ممانعت کر دی گئی

تکمیلی فقرہ

يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو) اس جامع آیت کا تکمیلی فقرہ ہے۔ قرآن حکیم کا عام اسلوب یہ ہے کہ آیتوں کو ایسے فقروں پر ختم کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام ومطالبات کی حیثیت اور ان کی غرض وغایت واضح کر دیتے ہیں۔ احکام ومطالبات سننے اور جاننے کے بعد یہ تکمیلی فقرے انسان کے اندر انہیں ماننے اور ان پر عمل کرنے کا داعیہ اور بڑی ترغیب پیدا کرتے ہیں۔ یہ تکمیلی فقرہ ایک بات تو یہ واضح کرتا ہے کہ ان اوامر ونواہی کی حیثیت ونوعیت نصیحت اور خیر خواہی کی ہے، اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کی غرض وغایت یہ ہے کہ انسان سبق لے اور غفلت کی نیند سے بیدار ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام ومطالبات اس لیے نہیں ہیں کہ ان سے اس کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے بلکہ صرف اس لیے ہیں کہ ان سے اس کے بندوں کی زندگیاں سنورتی اور کامیاب ہوتی ہیں۔

اخبار و افکار :-

فرقہ پرست جماعتیں اور کانگریسی حکومت

جبل پور اور اس کے اطراف میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا اس کو دو امتیاز حاصل ہے' ایک یہ کہ مسلمان دشمن تنظیموں نے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دس بیس مسلمانوں کو قتل کرنے اور ان کی کچھ دکانوں اور مکانوں کو لوٹ کر جلانے کا جو چکر چلا رکھا تھا' اسے ناکافی سمجھا اور اس کے بعد انھوں نے مسلمان محلوں اور آبادیوں پر حملے کا ایسا منصوبہ بنایا جیسا منصوبہ کوئی فوج اپنے دشمنوں کے محفوظ مقامات کو تباہ کرنے کے لیے بناتی ہے۔ اس منصوبے کا پہلا نشانہ جبل پور بنا۔ یہی شہر شاید وہ پہلا "خوش قسمت شہر" ہے جہاں مسلمانوں کے پختہ اور مضبوط مکانوں کو تباہ کرنے کے لیے ڈائنامیٹ استعمال کیا گیا اور جسے اس وقت کے صوبائی وزیر اعلیٰ کی طرف سے شمشان بھومی کا لقب عطا ہوا۔ دوسرا امتیاز اسے یہ حاصل ہے کہ اس منظم حملے اور مسلمانوں کے ساتھ فرقہ پرستوں کی درندگی نے مرکزی حکومت کو، کم سے کم الفاظ کی حد تک۔ کافی بے چین کیا اور ملک کے امن پسند شہری بھی تلملا اٹھے۔ بھارت کے آں جہانی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو جبل پور تو تشریف نہیں لے جا سکے لیکن عرصے کے بعد جب وہاں سکون ہو گیا تو بھوپال میں انھوں نے ایک تقریر فرمائی جس کے الفاظ یہ ہیں:

جبل پور اور دیگر شہروں کے فسادات سے مجھے سخت افسوس ہوا ہے ـــــ مجھ کو بڑا افسوس ہے کہ فسادات کے دوران ایک کانگریسی کے خراش تک نہیں آئی وہ پردہ نشین عورتوں کی طرح گھر میں چھپے بیٹھے رہے ـــــ یہ کہنا غلط اور انتہائی کمینگی ہے کہ جبل پور میں ہندوؤں نے جو کچھ کیا وہ اپنی حفاظت کے لیے کیا ـــــ وہاں جو کچھ بھی ہوا فرقہ پرستوں کی پہلے سے کی ہوئی سازشوں کا نتیجہ تھا۔ میں یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ مصیبت زدہ جارح اور حملہ آور بھی ہو سکتا ہے ـــــ فسادات نے جو شکل اختیار کی وہ انتہائی خطرناک ہے ان فسادات نے مدھیہ پردیش کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا ہے۔

کچھ دوسرے ممتاز لیڈروں نے بھی فرقہ پرست جماعتوں پر لعنت ملامت کی اور خبریں آنے لگیں کہ مرکزی حکومت

فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی لگائے گی اور انہیں خلاف قانون قرار دے گی۔ کچھ دنوں کے بعد یہ خبر آگئی کہ ماہرین قانون کا ارشاد ہے کہ فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی لگانا مشکل ہے۔ اس لیے کہ فرقہ پرستی اور فرقہ پرست جماعتوں کی تعریف و تعیین بہت دشوار کام ہے۔ قصہ ختم ہوا اور بات آئی گئی ہوگئی مسلمان دشمن تنظیمیں پابندی کی خبر سن کر اور مرکزی حکومت کی پلٹ پھرت دیکھ کر ہنستی رہیں اس لیے کہ وہ راز درون پردہ سے واقف تھیں بلکہ وہ چندوسی، علی گڈھ، میرٹھ اور مالیگاؤں وغیرہ میں مسلمانوں پر ہاتھ صاف کرکے فرقہ پرستی کی تعریف و تعیین کو دشوار سے دشوار تر بناتی رہیں۔ قانون تعزیرات ہند میں ترمیم کا مسئلہ ہو یا فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی کی تجویز انہیں سب کی حقیقت معلوم ہے۔ اسی دوران کانگریسی حکومت نے قومی یک جہتی کمیشن اور متعدد کمیٹیاں قائم کی تھیں، فرقہ پرستی پر غور کرنے کے لیے جو کمیٹی بنی تھی اس کے چیرمین مسٹر اشوک مہتہ تھے۔ ابھی یہ کمیٹی کسی نتیجے پر پہنچی بھی نہ تھی کہ چین نے بھارت پر حملہ کردیا۔ اس حملے کے خلاف تمام ملک ہم آواز ہوگیا اور بھارت کے تمام فرقوں نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرۂ یک جہتی نے کمیٹی کو ایک مشکل کام سے نجات بخش دی اور فیصلہ کرلیا گیا کہ یہ کام تو گویا فضول ہی ہو رہا تھا۔ ملک میں تو قومی یک جہتی پہلے سے موجود تھی۔ یہاں نہ مسلم دشمن تنظیمیں تھیں، نہ لسانی و علاقائی جھگڑے، اس حملے نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ قومی یک جہتی جو ذرا دبی ہوئی تھی وہ ابھر کر سامنے آگئی اور اس کے بعد قومی یک جہتی کمیٹی نے اپنے پروگرام کی بساط لپیٹ کر رکھ دی۔ بہت سے افراد جماعتیں اور اخبار چیختے رہے کہ حکومت کا یہ فیصلہ صحیح نہیں ہے۔ اس ہنگامی اور وقتی یک جہتی سے دھوکا نہ کھانا چاہیے لیکن بقول ٹائمز آف انڈیا ایسے لوگوں کو "نا قابل علاج کج ذہن" کہا گیا۔

مرکزی حکومت نے اپنی راست ذہنی اور فیصلے کی اصابت و صحت کا حال اپنی آنکھوں سے مغربی بنگال، بہار، اڑیسہ اور مدھیہ پردیش کی حالیہ درندگی و بہیمیت میں دیکھ لیا۔ جبل پور میں تو صرف ڈائنامیٹ استعمال کیا گیا تھا، لیکن مغربی بنگال کے دیہاتوں کو آتشیں بم برسا کر خاک سیاہ کیا گیا اور جمشید پور، راورکیلا، سندرگڑھ میں ہزاروں ہزار مسلمانوں کو تہ تیغ اور سیکڑوں گھروں کو برباد کرکے وہ قیامت توڑی گئی جس نے جبل پور کو بھی بھلا دیا اور یہ بات بعید از امکان نہیں ہے کہ آئندہ فرقہ پرست تنظیمیں کہیں سے توپیں اور مشین گنیں بھی حاصل کرلیں اور ان ہتھیاروں سے بھارت کے مسلمانوں کی خبر لیں۔ بہرحال ان حملوں کے بعد پھر مرکزی حکومت میں نئی پلٹ پھرت پیدا ہوئی اور پھر فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی عائد کرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن پھر وہی ڈھاک

کے تین پات۔ نتیجہ جو سامنے آیا وہ یہ ہے :-

نئی دہلی - ۲۰ جون ـــــ مرکزی حکومت اب اس نتیجے پر پہنچ گئی ہے کہ ملک میں فرقہ وارانہ جماعتوں یا گروہوں پر قانونی پابندی لگانا ممکن نہیں ہے لیکن پھر بھی اس نے فرقہ وارانہ پارٹیوں اور گروہوں کی بیخ کنی کرنے کی تجویز کو بالکل ترک نہیں کیا ہے۔ اس مسئلے پر توجہ خاص طور سے مشرقی ہندوستان میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد مبذول ہوئی اور ایک مرحلے پر تو مرکزی سرکار داخلہ سنجیدگی سے اس بات پر غور کرنے لگی تھی کہ ۱۶ ویں آئینی ترمیمی بل کی منظوری سے تعزیرات ہند میں جو تبدیلی ہوتا ہے اس کے دائرے کو وسیع کر دے اس ترمیمی قانون کے ذریعے ہندوستان کی تقسیم یا اس کے کسی حصے کی علیحدگی کے مطالبے کو جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ اس وقت یہ دلیل دی جا رہی تھی کہ چونکہ فرقہ وارانہ منافرت پھیلانا بھی ملک کے اتحاد کو اسی طرح پارہ پارہ کرتا ہے جس طرح علیحدگی کا مطالبہ۔ اس لیے دونوں جرائم کو ایک ہی سطح پر سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ماہرین نے بڑی جستجو اور کھوج کے بعد یہ نکتہ پیدا کر لیا ہے کہ چونکہ کسی فرقہ وارانہ جماعت یا گروہ کی تعریف و تشریح وضاحت و خصوصیت سے نہیں ہو سکتی۔ اس لیے یہ اقدام عملاً بے کار اور ناقابل عمل ہوگا۔

یہ خبر ایک طرف تو تضاد بیانی کا دلچسپ نمونہ ہے اور دوسری طرف یہ اس بنیاد پر مرتب کی گئی ہے کہ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ فرقہ وارانہ پارٹیوں پر پابندی عائد کرنے کی طرف مرکزی حکومت کی توجہ مشرقی ہندوستان میں ہونے والے حالیہ فسادات کے بعد مبذول ہوئی ہے ایک خلاف واقعہ بات ہے، اس کی توجہ جبل پور کے فساد کے بعد مبذول ہوئی تھی' نیز یہ بات کہ ماہرین کی جس رائے پر حکومت اب مطمئن ہوئی ہے وہ بھی نئی نہیں ہے اس سے پہلے بھی اسی رائے کی بنا پر ارادہ ترک کیا گیا تھا۔ ماہرین نے اس سلسلے میں نہ کوئی جستجو کی ہے اور نیا کھوج لگایا ہے۔ تضاد بیانی کا نمونہ یہ ہے کہ جب فرقہ پرستانہ یا فرقہ وارانہ جماعت کی تعریف و تشریح نہیں ہو سکتی تو پھر آخر کس بنیاد پر بھارت میں فرقہ وارانہ جماعتوں کا وجود تسلیم کیا جا رہا ہے اور بار بار ان پر پابندی عائد کرنے کا ارادہ کر کے مجبوری کے اظہار کا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ اسی خبر میں ایک طرف تو یہ بات کہی گئی ہے کہ فرقہ وارانہ جماعتوں پر قانونی پابندی لگانا ممکن نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ حکومت نے فرقہ وارانہ جماعتوں کی بیخ کنی کی تجویز ترک نہیں کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت جب کسی جماعت کو فرقہ وارانہ قرار ہی نہیں دے سکتی تو پھر کس بنیاد پر اس کی بیخ کنی ہو

در کس طرح ہوگی۔ پھر تو یہاں کی کسی جماعت کے لیے فرقہ وار کا لفظ استعمال کرنا غلط بلکہ ظلم ہے۔

ایک تماشہ اور دکھایا گیا ہے۔ ۲۰ رجون کو مرکزی حکومت کا یہ فیصلہ شائع ہوا کہ فرقہ وارانہ جماعتوں پر قانونی پابندی لگانا ممکن نہیں ہے اور ۵ رجولائی کو اے پی جین کمیٹی کی سفارشات شائع کردی گئیں۔ یہ کمیٹی کانگریس پارلیمانی پارٹی کی عاملہ نے ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات سے پہلے مقرر کی تھی اور اس نے اپنی رپورٹ عام انتخابات سے قبل ۱۹۶۷ء میں پیش کردی تھی۔ اب کئی سال کے بعد یہ رپورٹ پارٹی کے سکریٹری مسٹر رگھوناتھ سنگھ نے شائع کی ہے۔ اب تک اس کمیٹی کی سفارشات پر عمل نہیں ہوا ہے۔ اس وقت اس پرانی رپورٹ کی اشاعت کا مقصد اور اس کی مصلحت کیا ہے؟ اس پر تو روزناموں کے ایڈیٹر حضرات اور ملک کے نیتا لوگ روشنی ڈالیں گے۔ مجھ جیسے شخص کے نزدیک تو یہ ایک تماشہ اور ایک گورکھ دھندا ہے جس کا چکر سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے چلایا جا رہا ہے۔ اس کمیٹی نے فرقہ وارانہ جماعتوں پر پابندی لگانے کی سفارش کی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ایسی جماعتوں کی تشریح بھی کی تھی لیکن ماہرین قانون نے شاید تشریح قبول نہیں فرمائی۔ کمیٹی نے لکھا ہے:۔

"ہم سب (کمیٹی کے ممبران) اس بات پر متفق ہیں کہ ان پارٹیوں کو جن کی سرگرمیوں سے ملک کے مختلف فرقوں اور طبقوں کے درمیان دشمنی یا نفرت پیدا ہوتی ہے یا جن کی وجہ سے کسی فرقے کے مذہب اور مذہبی اعتقادات کی توہین ہوتی ہے، مکمل طور سے ممنوع قرار دے دینا چاہیے اور ان کی سرگرمیوں کو غیر قانونی قرار دے دینا چاہیے۔

فرقہ پرست پارٹیوں کی یہ تعریف و تعیین اور یہ تشریح و توضیح بھی وزارت قانون اور ماہرین قانون کے نزدیک مبہم اور غیر واضح ہے۔ ایک جگہ کمیٹی نے مذہبی نام کی جماعتوں کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ بعض ایسی پارٹیاں بھی ہیں مثلاً جن سنگھ جو نام سے تو معصوم ہیں لیکن جن کی سرگرمیاں بعض ان پارٹیوں سے بھی نقصان دہ اور گھناؤنی ہیں جن کے نام فرقہ وارانہ ہیں۔ ہمارا اصل حقیقت سے تعلق زیادہ ہے اور مسئلہ کو زیادہ عملی طور سے حل کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ صرف پارٹی کا نام ہی اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

قومی آواز ۶ رجولائی ۱۹۷۲ء

غرض یہ کہ کمیٹی کی رپورٹ کسی ٹوکری میں ڈال دی گئی اور اب چار سال کے بعد اس کو نکال کر شائع کر دیا

گیا ہے کہ دیکھو یہ ہے کانگریسی حکومت جس نے ایسی رپورٹ اور ایسی زبردست سفارش کے باوجود کسی فرقہ پرست
جماعت پر پابندی عائد کرنا جمہوریت نوازی اور عدل پروری کے خلاف سمجھا لہذا اس کے گن گاؤ اور اس کا
احسان مانو۔

یادش بخیر قومی یک جہتی کمیشن کی باسی کڑھی میں پھر اُبال آیا ہے۔ مرکزی وزیر داخلہ اور صوبوں کے
وزرائے اعلیٰ میں ابھی جو ملاقات ہوئی ہے اس میں قومی یک جہتی کے پروگرام کو زندہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے
خبر بڑی مسرت انگیز ہے لیکن ساتھ ساتھ ایک دوسری خبر بھی پڑھتے چلیے۔ اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ وزرائے اعلیٰ
کی ملاقات کے دوران قومی یک جہتی کمیشن کے احیاء کی ضرورت بیان کرتے ہوئے وزیر داخلہ شری گلزاری لال
نے فرمایا۔ حکومت کی اطلاعات کے بموجب دونوں فرقوں میں ایسے لوگ سرگرم کار ہیں جو فرقہ وارانہ امن کو
غارت کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور ان پر کڑی نگاہ رکھنے کا حکومت نے ارادہ کر لیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے
کہ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو فرقہ وارانہ امن کو غارت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ وزیر داخلہ کا یہ
فرمان اتنی بڑی دھاندلی ہے کہ اس سائز کی دھاندلیاں کم وجود میں آتی ہیں۔ شاید وزیر داخلہ نے اپنے کو غیر فرقہ پرست
ثابت کرنے کے لیے مسلمانوں پر بھی فساد انگیزی کا الزام دھرنا ضروری سمجھا۔ یہ ایسا ہے جیسے کسی ہندو کو چوری
کرتے ہوئے گرفتار کر کے کوئی سپاہی تھانے لے جائے اور تھانیدار حکم دے کہ جاؤ کسی مسلمان کو بھی پکڑ لاؤ۔
ایک غریب مسلمان گرفتار ہو کر تھانے پہنچے اور سوال کرے کہ حضور میں کس قصور میں پکڑا گیا ہوں۔ تھانیدار صاحب
فرمائیں تم بھی اس ہندو کے ساتھ چوری میں شریک تھے۔ وہ کہے حضور! میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں اور
میں تو اس وقت ایک فرقہ پرست کے چھرے سے زخمی ہو کر سرکاری ہسپتال میں پڑا ہوا تھا۔ تھانیدار کہے۔ میں یہ
سب کچھ نہیں سننا چاہتا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں صرف ہندو پر چوری کا الزام لگا کر فرقہ پرست بن جاؤں؟ ——
یہ ہے وہ ذہن جو اس ملک کے لیے لعنت بنا ہوا ہے —— یہ تو ممکن ہے کہ ہمالہ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے
لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس ذہن کے ساتھ جارحیت اور فرقہ پرستی کو ختم کیا جا سکے —— میرا مشورہ ہے کہ حکومت
کو دل کڑا کر کے یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ بھارت میں ہندوؤں کی کوئی فرقہ پرست جماعت موجود نہیں ہے۔

مدینہ
۹ جولائی ۱۹۶۸ء

رسائل ومسائل

حضرت عثمانؓ پر آمریت کا الزام

سوال

آپ کا ماہنامہ مجلہ زندگی ماہ مارچ ۱۹۶۴ء بامرہ نواز ہوا۔ اشارات میں صفحہ ۸ پر آپ نے یہ تحریر فرمایا ہے:

"مطلق العنان بادشاہوں اور ڈکٹیٹروں نے اپنی آمریت کے خلاف کسی طاقت ور آواز یا تحریک کو کب برداشت کیا ہے کہ پاکستان کی آمریت اسے برداشت کرلیتی۔ آمریت جبر واستبداد ظلم وجبر قید وبند اور قتل وخون کے بغیر قائم ہی نہیں رہ سکتی۔"

آپ سے اس کے متعلق دریافت طلب گزارش یہ ہے کہ جہاں تک اسلام میں خلافت راشدہ کے دوران حضرت عثمان بن عفان کی خلافت کا تعلق ہے۔ کیا وہ آپ کی اس تحریر کے مطابق آمریت میں شمار کیے جانے کے لائق تھی یا نہیں جب کہ رسول اسلام صلعم کے حق گو صحابی حضرت ابوذر غفاری کی نظر بندی وجلاوطنی کا واقعہ الم نشرح ہے؟ بلاشک حضرت ابوذر غفاری کو حکومت کی بعض پالیسیوں سے حکم خدا ورسول کے مطابق اختلاف ضرور تھا جس کے متعلق حدود قانونی کے اندر رہ کر ناصحانہ عنوان سے وہ احتجاج کرتے تھے جو کسی طرح بھی سلب آزادی وجلاوطنی کا استحقاق پیدا نہیں کرسکتا تھا بالخصوص جبکہ ہر صحابی رسول کو علی العموم حق تاویل واجتہاد حاصل تھا تو پھر حضرت ابوذر جیسے معتمد صحابی رسول کو اس حق سے محروم کرکے ان کے اجتہاد کی بنا پر ان کو آخر کیوں قابل نظر بندی وجلاوطنی ٹھیرایا گیا۔ کیا یہ آپ کے خیال میں حضرت عثمان بن عفان کی جن کا شمار جانشین رسول اسلام میں تسلیم شدہ ہے' آمریت اور مطلق العنان حکمرانی نہ تھی؟

جواب: ——— میں نے مارچ کے اشارات میں آمریت سے متعلق جو عبارت لکھی ہے۔ حضرت عثمانؓ کی

خلافت اس کی مصداق نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ جس حکومت کا حکمران اور اس کا تمام نظم و نسق کتاب و سنت کا پابند ہو جس میں اللہ کے نازل کیے ہوئے قوانین پوری طرح نافذ ہوں اور جس کے کارندے نیابتِ الٰہی کا فریضہ انجام دے رہے ہوں، ایک ایسی حکومت و خلافت پر مطلق العنان بادشاہت اور ڈکٹیٹر شپ کا اطلاق آخر کس منطق کی رو سے صحیح ہو گا، اسلامی حکومت کا سب سے اعلیٰ اور مثالی نمونہ خلافت راشدہ ہی تو ہے جسے غیر مسلم بھی تسلیم کرتے ہیں اگر اس پر آپ مطلق العنان بادشاہت اور آمریت کا اطلاق صحیح سمجھتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آج تک اس دنیا کے کسی گوشے میں کبھی بھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی اور اسلام کی پوری تاریخ ایک بڑے صفر کی حیثیت رکھتی ہے کیا واقعی آپ اس نتیجے پر راضی ہیں۔ پھر یہ بھی سوچیے کہ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کے ساتھ زیادتی کی تھی تو کیا صرف ایک واقعہ کی بنا پر ان کو ڈکٹیٹر اور ان کی خلافت کو آمریت کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ بات آپ کے نزدیک قرین انصاف ہے؟

اب اس جزئی واقعہ کو دیکھیے جس کا حوالہ آپ نے دیا ہے۔ میں انتہائی اختصار سے اس کو یہاں پیش کرتا ہوں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو جس بنا پر شام سے مدینہ آنا پڑا اور پھر مدینے سے نکل کر ربذہ میں قیام پذیر ہونا پڑا وہ کیا تھی؟ حضرت ابوذرؓ فرماتے تھے کہ ضرورت سے زیادہ مال رکھنا ناجائز ہے۔ ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ اپنی ضرورت سے زیادہ مال وجوہ خیر میں صرف کر دے اور اس کی ملکیت سے دست بردار ہو جائے۔ اگر دوسرے تمام صحابہ کی رائے سے ان کا یہ اختلاف اس حد تک رہتا جس حد تک دوسرے فقہی مسائل میں ان کے درمیان اختلافات تھے تو انھیں مقام ربذہ میں اپنی آخری زندگی تنہا بسر کرنے کی ضرورت نہ پڑتی لیکن مختلف وجوہ و اسباب سے انھوں نے اپنی اس منفرد رائے میں انتہائی شدت اختیار کی۔ باضابطہ اس کی تبلیغ شروع کی اور ضرورت سے زیادہ مال رکھنے والوں پر اس انداز میں ملامت کا آغاز کیا کہ شام میں ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور مجبور ہو کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ وقت کو اس کی رپورٹ بھیجی۔ حضرت عثمانؓ نے انھیں لکھا کہ پورے عزت و احترام کے ساتھ انھیں مدینہ روانہ کر دیا جائے۔ حضرت ابوذرؓ نے مدینہ پہنچ کر بھی اپنی تبلیغ اسی طرح جاری رکھی یہاں تک کہ مدینے میں بھی ایک شورش پیدا ہوئی۔ حضرت عثمانؓ نے انھیں بلایا اور ان کے سامنے دو باتیں رکھیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنی موجودہ شدت ترک کر کے ان کے پاس قیام کریں وہ ان کے تمام اخراجات کے کفیل ہوں گے لیکن حضرت ابوذرؓ نے یہ پیش کش رد کر دی، تب مجبور ہو کر انھوں نے دوسری بات یہ رکھی کہ اگر وہ چاہیں تو مدینے سے کہیں قریب ہی قیام کر لیں۔ انھوں نے بخوشی یہ دوسری بات مان لی اور اپنی پسند سے ربذہ میں مقیم ہو گئے۔ یہ ہے وہ واقعہ جسے گول مول رکھ کر آپ نے اپنا سوال مرتب کیا ہے۔

جان کر کوئی منصف مزاج آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ خلیفہ وقت نے حضرت ابوذرؓ کے ساتھ زیادتی کی تھی ۔
عثمان کی نرالی اجتہادی رائے کی وجہ سے شام اور مدینہ سے الگ نہیں کیا گیا بلکہ ان کے اس شدید
کی وجہ سے الگ کیا گیا جس نے ہنگامے کی کیفیت پیدا کر دی تھی اور پھر اجتہادی رائے بھی ایسی کہ اس وقت
کر آج تک وہ اپنی رائے میں منفرد ہیں ۔ نہ تو کسی دوسرے صحابی نے ان کی تائید کی اور نہ فقہائے اسلام
فقیہ نے ان کی رائے اختیار کی ۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے آپ کے (سائل شیعہ مذہب کے پیرو ہیں) ۔
یں بھی کوئی فقیہ ان کا ہم مسلک نہیں ہے ۔
پھر آپ نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اس وقت بڑے بڑے صحابہ یہاں تک کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے
ی حضرت ابوذر کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی تو کیا ان میں سے کسی نے بھی اس کے خلاف آواز بلند کی ؟ کسی نے بھی
حضرت عثمان سے یہ کہا کہ آپ ایک جلیل القدر صحابی کا بنیادی حق چھین رہے ہیں ۔ کیا آپ کے خیال میں حضرت عثمان
مریت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ شیر خدا تک خاموش رہنے پر مجبور ہو گئے ؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان کی آمریت صدر
کی آمریت سے بھی بڑھی ہوئی تھی جس کے خلاف میں نے اشارات میں اظہار خیال کیا تھا ——— جماعت اسلامی
ن کو خلاف قانون قرار دینے اور مولانا مودودی وغیرہ کی گرفتاری پر سیکڑوں اور ہزاروں افراد نے احتجاج
یکن حضرت ابوذر کی " نظر بندی " پر کسی ایک صحابی نے بھی زبان نہ کھولی ۔ کیا صحابۂ کرام کے بارے میں اس
ن کے لیے آپ کے پاس کوئی معقول بنیاد موجود ہے ؟ اس کے علاوہ حضرت ابوذر نے جو آپ کے نزدیک
کو صحابی ہیں ۔ حضرت عثمان سے یہ کیوں نہیں کہا کہ آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں اور میرے بنیادی
چھین رہے ہیں ۔ کیا آپ نے کسی تاریخ میں پڑھا ہے کہ انھوں نے اپنے ساتھ اس معاملے کو ظلم قرار دیا ہو ؟
ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہوئی تو پھر آپ کا اعتراض " مدعی سست گواہ چست " کے سوا اور کیا حیثیت رکھتا
حقیقت یہ ہے کہ خلیفۂ ثالث پر یہ الزام ان کے مخالفین کے ذہن کی جولانی ہے ۔ جب ان کے خلاف انھوں نے
تھا یا تو الزامات کی فہرست میں ایک الزام یہ بھی درج کر لیا جس شخص کی نرم مزاجی نے محاصرے کی حالت میں بھی
نہ اٹھائی اور جو تلاوت قرآن کرتا ہوا شہید ہو گیا اس پر آمریت کا الزام دنیا کا ایک بڑا عجوبہ ہے ۔

——— سید احمد قادری

صنوبر قد کا شہر — سہیل احمد زیدی۔ صفحات ۱۲۰۔ کتابت و طباعت بہتر۔ مجلد گرد پوش کے ساتھ قیمت دو روپیہ ۲۵ پیسے۔ ناشر: ادارۂ ادب اسلامی ہند۔ ٹانڈہ ضلع فیض آباد۔

جناب سہیل صاحب ادارۂ ادب اسلامی ہند کے ایک معروف شاعر ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام شائع کر کے ادارے نے تعمیری ادب کے ذخیرے میں ایک اچھا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب پر مقدمہ جناب ابن فرید ایم اے نے لکھا ہے۔ مقدمے کے اخیر میں لکھتے ہیں :-

"سہیل، نوجوان شاعر ہیں۔ وہ کم کہتے ہیں لیکن اچھا کہتے ہیں اس لیے ان سے مستقبل میں اچھی توقعات قائم رکھنا غلط نہ ہوگا۔ اس مجموعہ کو پیش کرتے ہوئے بھی ہمیں توقع ہے کہ وہ قبولیت عام حاصل کریں گے اور اپنے کلام کو مزید جلا بخشنے کے لیے کوشاں رہیں گے۔"

تبصرہ نگار نے یہ مختصر مجموعہ بالاستیعاب پڑھا ہے اور مجموعی طور پر جناب سہیل کی شاعری کے نئے آہنگ، ان کے پر یقین لہجے، جوش بیان، تشبیہ و استعارے کی زبان اور مناظر فطرت کی عکاسی سے متاثر ہوا ہے۔ وہ خود نوجوان ہیں یا نہیں، اس کا علم نہیں، لیکن ان کی شاعری ضرور نوجوان ہے جو نگاہوں کے سامنے ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی ان کی شاعری کا عنفوان شباب ہے

کھیتوں کی مانگ، کوہ کی چوٹی، نگار شہر   کرنوں کے آبشار سے دنیا چمک اٹھی
دل کی تپش، جبیں کی خلش، راہ کیے یاک   غم خانۂ حیات کی ہر شے چمک اٹھی

(صبح یقیں)

پتھر کی رگ رگ سے پھوٹی پانی کی پچکاری   ننھے ننھے قطروں میں ہے طوفاں کی تیاری
سہمے سمٹے پیڑ کھڑے ہیں سب پہ ہیبت طاری   آپس میں ملنے کی قوت ہم نے اب پہچانی

لہراتا، بل کھاتا بڑھتا چھل چھل کرتا پانی

(جھرنا)

گل کتنے عقیدت کے ارباب ہوس لائے — ہم دختر مریم ہیں دامن کو سمیٹے ہیں
اپنی سی بہت کوشش کی تند ہواؤں نے — ہم بنت خدیجہ ہیں چادر کو لپیٹے ہیں

(باعصمت)

مصالحت کی حریص مکڑی عجیب اک جال بُن رہی ہے
میں سوچتا ہوں ہوس کی دیوی کو چند لمحے پیار کر لوں
رہ وفا سخت جاں گسل ہے ٹھہر کے کچھ انتظار کر لوں
جنوں میں نقصاں ہے جان و دل کا خرد کو پابِ اعتبار کر لوں
اسی طرح کے طویل و دل کش ہزار ہا تار کھنچ گئے ہیں
میں ایسا محسوس کر رہا ہوں، میں ان میں محصور ہو گیا ہوں

(مصالحت)

لہو لہو ہے جبینِ وفا تو ہونے دو
صنم اور اہل صنم ہیں خفا تو ہونے دو
ہر اک قدم پہ کھڑی ہے قضا تو ہونے دو
یہ زندگی کا تقاضا ہے سر اٹھا کے چلو
عدو کے ہاتھ میں رہنے دو جبر کی شمشیر
گھٹی ہے ظلم سے مظلوم کی کہیں تو قیر
نہ ان کے خواب رہیں گے نہ خواب کی تعبیر
نہ دو روزہ سطوتِ دارا ہے سر اٹھا کے چلو

جو اشعار پسند آئے ہیں وہ سب کے سب یہی نہیں ہیں، بلکہ اور بھی ہیں۔ ان کے علاوہ اس مجموعے کی مندرجہ ذیل نظمیں بحیثیت مجموعی تبصرہ نگار کو زیادہ پسند آئیں۔
صبحِ یقیں۔ جھرنا۔ مصالحت۔ اعتراف۔ برف باری۔ ملاقات۔ وقت

"صنوبروں کا شہر" اس مجموعے کی سب سے لمبی نظم ہے اور شاید اس نظم کی پسندیدگی کی وجہ سے شاعر نے

مجموعے کا نام بھی یہی رکھا ہے لیکن تبصرہ نگار کے نزدیک یہ نظم لفظی و معنوی دونوں لحاظ سے اس مجموعے کی
کمزور نظم ہے۔ چند کمزوریوں کی طرف یہاں اشارے کیے جا رہے ہیں۔

اس نظم کا ایک مصرع ہے۔ "جو شان ہے شکوہ کی" ص۳۳ شکوہ کا لفظ بھی شان اور دبدبے
کے معنی میں مستعمل ہے اس لیے شکوہ کی شان ایک بے معنی ترکیب ہے۔ یہ دونوں لفظ ہمیشہ حرف عطف کے
استعمال ہوتے ہیں، اضافت کے ساتھ نہ فارسی میں مستعمل ہیں اور نہ اردو میں ۔۔۔ ایک شعر ہے ۔۔۔
"سفید برف گرتی ہے۔ کھلے بدن کی لاج کو۔ ص۳۱ یہ شعر موجودہ صورت میں بے معنی ہے۔ اسی صفحے کا پانچ
مصرع ناموزوں چھپا ہے۔ اسی صفحے کے ساتویں مصرع میں "کو" اور آٹھویں مصرع میں "بھی" ذوق شعر پر بار
ایک شعر ہے :۔ یہاں بھی رُت بدلتی ہے۔ بسنت اور پھاگ کی۔ ص۳۱ جہاں تک مجھے معلوم ہے پھاگ کوئی مو
نہیں ہے۔ پھاگ کھیلنا اور پھاگ گانا تو سنا تھا لیکن پھاگ کی رت بدلنے کے کیا معنی ہوں گے؟ ایک شعر ہے
"طلوع پر بھی جنگ ہے، غروب میں بھی جنگ ہے" چونکہ پہلے لکھ چکے ہیں کہ شمال میں بھی جنگ ہے۔ جنوب پر
بھی جنگ ہے۔ اس لیے "غروب میں بھی جنگ ہے" لکھ دیا چاہے کوئی معنی دے یا نہ دے۔ ص۲۴ پر ایک
بند یہ ہے ۔۔ بہار آئی ہے تو کیا جنونِ دل سے واسطہ
خیالِ زخم ہے، اگر بڑھا خدا نخواستہ

معلوم نہیں اس بند کا مفہوم کیا ہے؟ ۔۔۔۔ اس نظم کے علاوہ دوسری نظموں میں بھی اس طرح
کی کمزوریاں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مصرع ہے: "فرق حکم کی شکن" ص۴ شاعر نے فرق کے معنی پیشانی
سمجھا ہے حالانکہ فرق کے معنی سر اور مانگ کے آتے ہیں۔

تعمیر پسند ادیبوں کو زبان و بیان کی بے لگام آزادی میں ترقی پسند ادیبوں کی پیروی نہیں کرنی چاہیے
جناب سہیل کو زبان و بیان کی صحت اور اشعار کے درمیان ربط کی طرف خاص توجہ دینی چاہیے۔ اب جب کہ
غزل کے اشعار کی بے ربطی پر لوگ ناک بھوں چڑھا رہے ہیں اگر نظم کے اشعار بے ربط ہوں تو یہ بات بہت
نامناسب ہوگی ۔۔۔ طباعت کی بعض فاحش غلطیاں ہو گئی ہیں۔ ص۵ پر ہے۔ "پھوٹ نکلے ہر بن منہ سے شرار
بن مو کو کاتب نے "بن منہ" بنا دیا ہے۔

بحیثیت مجموعی سہیل صاحب کا یہ مجموعۂ کلام بہت امید افزا ہے اور ہم تعمیر پسند ادیبوں کو اس کے مطالعہ
مشورہ دیتے ہیں۔ (ع ق)

دستور العمل درسگاہ محمدی

منظور کردہ اراکین درسگاہ محمدی ۔ قصبہ رام پور ۔ ضلع گونڈہ صوبہ یوپی ۔

آج مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کی اہمیت سے کوئی ایسا مسلمان انکار نہیں کر سکتا جو یہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ نسل دین دار اور خدا پرست ہو ۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ۱۵ راگست ۱۹۶۲ء کو قصبہ رام پور میں درس گاہ محمدی کے نام سے ایک دینی تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا ہے اور اس کے سامنے ایک وسیع پروگرام ہے ۔ اس ادارے نے منظم طور پر کام کرنے کے لیے اپنا دستور العمل مرتب کیا ہے ۔ جو لوگ مسلمان بچوں کی تعلیم کا کام منظم طور پر کرنا چاہتے ہوں ان کے لیے اس دستور العمل کا مطالعہ مفید ہوگا ۔ اس درگاہ کی مجلس عاملہ نے "دعوت تعاون اور مخلصانہ اپیل" کے نام سے ایک چھوٹا سا پمفلٹ علیحدہ سے شائع کیا ہے ۔

امید ہے کہ مسلمان اس تعلیمی ادارے کے ساتھ تعاون کریں گے ۔ خلوص کے ساتھ جہاں کہیں بھی دینی تعلیم کا کوئی مدرسہ قائم ہوتا ہے وہاں تاریک ماحول میں گویا ایک چراغ روشن ہوتا ہے ۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس تعلیمی ادارے کو اپنے نیک مقاصد میں کامیاب کرے ۔

بکار اسعد گیلانی ۔ صفحات ۱۰۴ ، کاغذ ، کتابت ، طباعت بہتر ۔ ٹائٹل رنگین قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے ناشر :۔ ادارہ ادب اسلامی سرگودھا مغربی پاکستان ۔ بھارت میں مکتبہ تجلی دیوبند یوپی سے بھی مل سکتی ہے ۔

اسعد گیلانی جن کی متعدد کتابوں پر زندگی میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے ۔ ہمارے جانے بوجھے ادیب ہیں ۔ اسلام پسند ادیبوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو ادب میں "ابہام" کو پسند نہیں کرتا جو ایسے ادب کو اسلامی ادب نہیں کہتا جس پر اسلامی اقدار حیات کی واضح چھاپ نہ ہو اور جو "پروپیگنڈہ" اور "نعرہ بازی" کے الزام سے ڈر کر ادب کے کاغذی پھول نہیں تراشتا ۔ زیر تبصرہ کتاب افسانوی ادب کا کوئی مجموعہ نہیں ہے بلکہ تحریکی ادب سے تعلق رکھنے والے مضامین کا مجموعہ ہے ۔ اسعد گیلانی کے ان مضامین کا بیشتر حصہ ہفت روزہ "جہان نو" کراچی میں شائع ہو چکا ہے ۔ ان مضامین میں بھی ادیب کے دل کی گرمی الفاظ میں منتقل ہو گئی ہے ۔ چھوٹے موٹے مضامین کا یہ مجموعہ پڑھنے کے لائق ہے ۔

(مس)لمانوں کا مقصدِ حیات

از شمس پیرزادہ صفحات ۴۴ - کاغذ، طباعت، کتابت بہتر۔ قیمت ۲۵ پیسے
ناشر - مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند، سوئی والان - دہلی -

مسلمانوں کا مقصدِ حیات اور ان کی جدوجہد کا مرکز و محور کیا ہے ؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے صحیح
(جوا)ب پر ہماری انفرادی و اجتماعی حرکت و عمل کی صحت و اصابت موقوف ہے - جماعت اسلامی کے لٹریچر نے اس
(سوا)ل کا مفصل جواب کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کیا ہے - اس کی تفصیل اور مختلف گوشے جماعت کے وسیع
(لٹری)چر میں پھیلے ہوئے ہیں - ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک ایسا مختصر پمفلٹ ہونا چاہیے جسے تھوڑی دیر میں پڑھا
(جاس)کے اور جس کو پڑھ کر مسلمان اپنے مقصدِ حیات سے واقف ہو سکیں - اس ضرورت کے پیش نظر مولانا شمس پیرزادہ
نے یہ مختصر پمفلٹ مرتب کیا ہے - انھوں نے اس سلسلے کی تمام ضروری باتیں اختصار اور وضاحت کے ساتھ جمع
کر دی ہیں - میں اس پمفلٹ کے ذیلی عنوانات یہاں نقل کر رہا ہوں - اس سے پمفلٹ کے بارے میں سرسری اندازہ
(ہو جا)ئے گا -

عقل و شعور کا تقاضہ - زندگی کا اہم ترین مسئلہ - مادہ پرستی کے نتائج - انسانی زندگی کی حقیقت - مقصدِ حق
(و مقص)دِ باطل - فریضۂ زندگی - نصب العین - نصب العین کے تقاضے -

امید ہے کہ وہ لوگ بھی جو کم سے کم وقت میں کسی سنجیدہ بات کو جاننے کے خواہش مند ہیں ، قلت وقت
(کی) شکایت نہ کریں گے اور اس پمفلٹ سے ایک بڑے اہم اور بنیادی سوال کا جواب عقل و نقل کی روشنی میں
(پا) لیں گے -

فاضل مرتب نے ص۱۰ پر پرستش و اطاعت کی تشریح اور ان دونوں کے درمیان درجہ بندی جس انداز
سے کی ہے اس پر میرے نزدیک نظرثانی کی ضرورت ہے - پرستش کے لیے ایک خارجی ہیئت اور خارجی مظہر کی
ضرورت ہے اور عبادت کے لیے کوئی خارجی ہیئت ضروری نہیں - نماز پرستش ہے لیکن زکوٰۃ کو پرستش نہیں
کہا جائے گا حالانکہ وہ عبادت یقیناً ہے - فاضل مرتب کے لیے اتنا اشارہ کافی ہے تفصیل کی ضرورت نہیں -

---

(اند)ونیشیا

جناب شاہ جہین رزاقی ایم اے (عثمانیہ) صفحات ۲۰۰ مجلد گردپوش کے ساتھ قیمت نیولائن
سات روپیہ سفید کاغذ پر [illegible] روپیے - ناشر :- ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

انڈونیشیا پر اتنی مفصل کتاب شائع کر کے ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے بڑی مفید خدمت انجام دی ہے -

مرتب کتاب نے تو مسلم آبادی کے لحاظ سے انڈونیشیا کو دوسرا نمبر دیا ہے لیکن بعض لوگ اسلامی ممالک میں مسلم آبادی کے لحاظ سے اس کو سب سے بڑا ملک قرار دیتے ہیں۔ بہرحال اتنا تو متیقن ہے کہ پاکستان کے سوا کوئی دوسرا ملک اس لحاظ سے اس کا ہمسر نہیں ہے۔ اتنے بڑے اسلامی ملک کے بارے میں ہماری معلومات بہت سرسری اور معمولی تھیں۔ اس کتاب نے اس کمی کو پورا کیا اور اب ہم مرتب اور بڑی حد تک مفصل معلومات اس کتاب سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اردو زبان میں انڈونیشیا پر کوئی کتاب اس سے مفصل موجود نہیں ہے۔ فاضل مرتب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب بیس ابواب سیکڑوں ذیلی وعنوانات میں بٹی ہوئی ہے۔ اور دنیا کے اس عظیم مجمع الجزائر کا ایک اچھا نقشہ بھی کتاب میں الگ سے لگا ہوا ہے۔ ناشر نے اس کتاب کے تعارف میں لکھا ہے:-

"یہ کتاب انڈونیشیا کا ایک مکمل خاکہ ہے جس کے مختلف ابواب میں تاریخی تسلسل کے ساتھ اس ملک کے تمام حالات و واقعات نہایت خوبی سے قلم بند کیے گئے ہیں اور تمام اہم مسائل و تحریکات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔"

انڈونیشیا کی اسلامی تحریکوں اور حق و باطل کی اس کش مکش پر جو ہر اسلامی ملک کی طرح وہاں بھی برپا ہے ہمیں کم تفصیل ملتی ہے اور اس کتاب سے پوری صورت حال سامنے نہیں آتی۔ لیکن اس سے کتاب کی اپنی افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ کتاب ہر لائبریری میں رکھنے کے لائق ہے۔ (ع ق)

شرک کے اثرات انسانی زندگی پر مولانا حامد علی۔ صفحات ۴۸۔ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر قیمت مع محصول ڈاک چالیس نئے پیسے۔ ناشر:- ادارہ شہادت حق خیر نگر۔ میرٹھ۔ یوپی

ادارہ شہادت حق کے سلسلۂ مطبوعات کی یہ نویں کتاب ہے۔ اس کتاب کی فہرست عنوانات یہ ہے۔ فیصلے کا طریقہ۔ غیر علمی و غیر عقلی رجحان۔ انسانیت کی تذلیل۔ بے کرداری۔ خوف و یاس۔ احساس کہتری۔ انتشار فکر و عمل۔

ان عنوانات کے تحت مدلل طور پر مولانا نے یہ دکھایا ہے کہ انسانی زندگی پر شرک کے بہت ہی مضر اور خراب اثرات مترتب ہوتے ہیں اور انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ ادارۂ شہادت حق بہت مفید خدمت انجام دے رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو تقویت پہنچائی جائے۔ (ع ق)

مقالاتِ امینی مولانا محمد تقی امینی ۔ صفحات ۸۴ ۔ کاغذ کتابت و طباعت بہتر ۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے
ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ تجدید دین ۔ ہارڈنگ روڈ ۔ لکھنؤ ۔

بڑے سائز کے ۸۴ صفحات پر تین مقالات چھپے ہوئے ہیں جو فاضل مقالہ نگار نے دسمبر ۶۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے یونین ہال میں پڑھے تھے ۔ مقالات کے عنوانات یہ ہیں :۔ اجتہاد ۔ تدوینِ فقہ کی ضرورت ۔ فقہ کے اجتماعی مسائل ۔ ہر عنوان کے تحت متعدد ذیلی عنوانات ہیں ۔ یہ مقالات بھی پڑھنے کے لائق ہیں ۔ ملک کے جو دانشور اسلام سے دلچسپی رکھتے اور جدید مسائل کو اسلام کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے ان مقالات میں روشنی موجود ہے ۔

مولانا کی تحریر میں بعض الفاظ کا استعمال بری طرح کھٹکتا ہے ۔ مثال کے طور پر ایک جگہ انھوں نے "انگیز ہموائی" کی ترکیب استعمال کی ہے ۔ صفحہ ۳ معلوم نہیں یہ ہموائی کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں ۔ اسی طرح وہ جذب و انگیز کی ترکیب بہت استعمال کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں اس کا مفہوم واضح نہیں ہوتا ۔ ایک جگہ انھوں نے قابل گردن زدنی بھی لکھا ہے ۔ صفحہ گردن زدنی کے ساتھ قابل کا اضافہ صحیح نہیں ہے ۔ (ع ۔ ق)

بقیہ اشکالات) کہ اگلی امتوں نے اپنے وقت کے رسولوں اور خدا کی کتابوں کو اپنا قاضی و حاکم آسانی سے تسلیم نہیں کیا اور یہ راہ پھولوں کی سیج کبھی نہیں رہی ۔ یہ ہمیشہ کانٹوں سے بھری رہی ہے ۔ تم سے پہلے کے داعیانِ حق نے اس راہ میں ہر طرح کی مصیبتیں جھیلی ہیں اور دشمنانِ حق کے نرغے میں اس طرح ہلا مارے گئے ہیں کہ اہلِ ایمان کے ساتھ وقت کے رسول تک چیخ اٹھے ہیں ۔ پھر تم کس بنا پر یہ توقع رکھ سکتے ہو کہ جو کچھ تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے وہ تم پر نہیں گزرے گا ۔

(د) اللہ کے باغیوں سے کشمکش اور کتاب برحق کی اقامت و تنفیذ کی تمام سعی و جہد کا مقصود دخولِ جنت کا استحقاق ہے ۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ کے ٹکڑے سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد میں جان کھپانے والوں کا محرکِ عمل اور اصل مطمحِ نظر اللہ کی خوشنودی اور جنت کا حصول ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جنت کا حصول اقامت دین کی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہے ۔ خدا کے نازل کردہ قانون پر لوگوں کو جمع کرنے کی جدوجہد سے دامن کشی کے باوجود رضائے الٰہی اور جنت کے حصول کی توقع صحیح نہیں ہے ۔

ع ق

ایک ضروری اعلان

ماہنامہ زندگی جب سے شائع ہو رہا ہے آج تک اس کا سالانہ چندہ نہیں بڑھایا گیا جب کہ ہندوپاک میں ۶۴ صفحات کا کوئی ماہانہ رسالہ پانچ روپیہ سالانہ پر نہیں ملتا لیکن اب ہمارا خسارہ اس حد پر پہنچ گیا ہے کہ چندہ بڑھائے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے ہم بہت مجبور ہو کر یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اکتوبر ۱۹۷۶ء سے سالانہ چندہ چھ روپیہ اور ششماہی تین روپیہ ہوگا۔ ہر شمارے کی قیمت ۶۰ پیسے ہوگی۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء سے پہلے جو لوگ خریدار ہوں گے انہیں موجودہ قیمت ہی پر رسالہ بھیجا جائے گا۔

منیجر زندگی۔ رام پور۔ یوپی

شرائطِ ایجنسی

(۱) ایجنسی کم سے کم پانچ رسائل پر دی جائے گی۔

(۲) رسائل حسبِ ضرورت طلب کیے جائیں۔ اگر فروخت نہ ہوئے تو واپس نہیں لیے جائیں گے۔

(۳) کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔ البتہ پچاس یا زائد رسالوں کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی ہوگا۔

(۴) رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا۔ اور رجسٹری یا وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔

(۵) رقم ہر حال میں پیشگی آنی چاہیے یا پھر وی پی بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی کے مصارف زیادہ ہوں گے۔

منیجر رسالہ زندگی۔ رامپور۔ یوپی

ماہنامہ

زندگی رامپور

ربیع الآخر ۱۳۸۴ھ
ستمبر ۱۹۶۴ء

جلد :- ۳۳
شمارہ :- ۳

مدیر: سید احمد قادری

• خط وکتابت وارسال زر کا پتہ : منیجر زندگی رام پور۔ یوپی

• زرسالانہ :- پانچ روپیہ ـــ شش ماہی :- تین روپیہ ـ فی پرچہ :- پچاس پیسے۔

• ـــــ ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں۔

منیجر ہفت روزہ "شہاب" C/۱۱ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر:- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر:- احمد حسن۔ مطبع:- دہلی پرنٹنگ ورکس، بنگلہ آنا دخان، رامپور
مقام اشاعت:- دفتر زندگی۔ رام پور۔ یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ

اشارات

(گزشتہ سے پیوستہ)

سید احمد قادری

تیسری آیت

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا	ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے
بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا	ساتھ بھیجا اور ان پر کتاب اور میزانِ عدل نازل کی
مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ	تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں اور ہم نے
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا	لوہا اتارا اس میں سخت جنگ کا سامان ہے اور لوگوں
الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ	کے لیے اس میں کچھ دوسرے فائدے ہیں اور اس لیے
وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ	کہ اللہ جان لے کہ بن دیکھے کون اس کی اور اس کے
مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ	رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ بلاشبہ اللہ قوی اور
قَوِیٌّ عَزِيْزٌ ۝ (الحدید ۲۵)	زبردست ہے۔

کتاب کے ساتھ میزان نازل کرنے کا ذکر سورۂ شوریٰ آیت ۱۷ میں بھی ہے۔ سورۂ حدید کی اس آیت کا اسلوب ایسا ہے جس نے نہ صرف انبیاءؑ کے مشن کو واضح کر دیا ہے بلکہ خاص حالات میں اس مشن کو کامیاب کرنے کے آخری مرحلے اور عام حالات میں اس کو قائم رکھنے کی ضروری تدبیر کی طرف بھی رہنمائی کی ہے۔

پہلے ٹکڑے میں اللہ رب العالمین نے فرمایا ہے کہ ہم اپنے رسولوں کو کتاب و میزان کے ساتھ اس لیے بھیجتے رہے ہیں کہ ظالم انسان ظلم کی روش ترک کر کے عدل و انصاف کی روش پر قائم ہو جائیں۔ ظالموں کا عدل و انصاف کی روش پر قائم ہو جانا اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اقامتِ عدل کی سعی کی جائے اس لیے دوسرے ٹکڑے میں جس حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عدل و انصاف پر قائم ہونا اور قائم رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے

بلکہ اس کے لیے انتہائی جد و جہد لازمی اور آخری تدبیر کے طور پر قوت کا استعمال بھی ضروری ہے۔ لوہے کی تخلیق کے تین اغراض بیان کیے گئے ہیں ایک یہ کہ اس سے آلات حرب اور سامان جنگ تیار کیے جاتے ہیں۔ دوسری یہ کہ آلات حرب کے علاوہ اس میں کچھ دوسرے منافع بھی ہیں اور تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کو دیکھے بغیر کون لوگ اس قوت کو اس کے دین اور اس کے رسولوں کی مدد میں صرف کرتے ہیں۔

اس آیت سے بھی بصراحت معلوم ہوا کہ رسولوں کی بعثت کا مقصد دنیا سے ظلم و جور کا استیصال اور عدل و انصاف کا قیام رہا ہے اور عدل و انصاف کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے سلطانِ قائم بالسیف (اقتدار جو بزور طاقت ظلم کی بیخ کنی کرتا ہے) کا وجود ضروری ہے۔

کیا اقامت دین کا نصب العین اس کے سوا کوئی اور مفہوم رکھتا ہے؟ کیا اس آیت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اللہ کے دین کی مدد کرکے اس کو ادیانِ باطلہ پر غالب کرنا بعثت انبیاء کا مقصد تھا؟ اور دین حق کو غالب کرنے کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اللہ کا بھیجا ہوا نظام عدل قائم ہو اور اس کے قوانین نافذ ہوں اور اس کی مکمل پیروی کی راہ میں کوئی مزاحم طاقت باقی نہ رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن سمجھ کر پڑھنے کے باوجود کوئی مسلمان دین کے جامد اور محدود نقطۂ نظر پر کس طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔

اس آیت کے آخر میں اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ فرما کر مجاہدین حق کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس نے تمہیں جہاد کا حکم دے کر اور اپنے دین کی امداد کا شرف عطا کرکے تم پر احسان کیا ہے اور تمہارے لیے مراتب عالیہ کا دروازہ کھولا ہے۔ ورنہ وہ کسی کا محتاج نہیں چنانچہ اس نے اپنی قدرت قاہرہ سے کتنی ہی سرکش قوموں کو ہلاک کرکے اپنے وفادار بندوں کو غلبہ عطا کیا ہے۔

مفسر ابن کثیر کی ایک عبارت

کتاب برحق کی تنفیذ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے ماننے والوں کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی مزید توثیق و توضیح کے لیے میں نے گزشتہ قسط میں سورۂ مائدہ کے رکوع سات کی طرف متوجہ کیا تھا جس میں کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کو کافر، ظالم اور فاسق کہا گیا ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کے بعد وہ رکوع ذیل کی آیت پر ختم ہوا ہے:-

اَفَحُکْمَ الْجَاهِلِیَّةِ یَبْغُوْنَ ۝	کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور
وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُکْمًا لِّقَوْمٍ	ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں اللہ سے بہتر

یُوقِنُونَ ۝ (مائدہ ۵۰) حکم کس کا ہے

اس آیت کے تحت مفسر ابن کثیر نے یہ چونکا دینے والی عبارت لکھی ہے :-

ينكر تعالى على من خرج عن حكم الله المحكم المشتمل على كل خير الناهي عن كل شر وعدل الى ما سواه من الآراء والأهواء والاصطلاحات التي وضعها الرجال بلا مستند من شريعة الله كما كان اهل الجاهلية يحكمون به من الضلالات والجهالات مما يضعونها بآرائهم واهوائهم وكما يحكم به التتار من السياسات الملكية الماخوذة عن ملكهم جنكز خان الذي وضع لهم الياسق وهو عبارة عن كتاب مجموع من احكام قد اقتبسها عن شرائع شتى من اليهودية والنصرانية والملة الاسلامية وغيرها وفيها كثير من الاحكام اخذها من مجرد نظره وهواه فصارت في بنيه شرعا متبعا يقدمونها

اللہ تعالیٰ اس آیت میں ان لوگوں پر انکار کر رہا ہے جو اللہ کے اس محکم فیصلہ و قانون سے الگ ہو جائیں جو ہر خیر پر مشتمل اور ہر شر سے روکنے والا ہے اور اس کے بدلے میں لوگوں کی ایسی خواہشات آراء اور اصطلاحات اختیار کر لیں جن کی اللہ کی شریعت میں کوئی سند اور دلیل موجود نہ ہو جس طرح اہل جاہلیت اپنی خواہشات اور آراء سے گھڑی ہوئی گمراہیوں اور جہالتوں کے مطابق زندگی کے معاملات کے فیصلے کیا کرتے تھے اور جس طرح تاتاری ان ملکی سیاستوں کے مطابق فیصلے کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے بادشاہ چنگیز خاں سے اخذ کیے ہیں چنگیز خاں کی سیاسات ملکی عبارت ہے اس مجموعۂ احکام سے جو یاسق نے اس کے لیے مرتب کیا تھا اس میں یہودی نصرانی اسلامی اور دوسری شریعتوں سے احکام لیے گئے ہیں اور اس میں بہت سے احکام ایسے ہیں جو محض مرتب مجموعہ کے غور و فکر اور اس کی خواہشات کا نتیجہ ہیں۔ یہ مجموعۂ احکام اب اس کے خاندان کے مسلمان سلاطین و حکام کے نزدیک وہ اصل شریعت ہے جس کا وہ اتباع کرتے ہیں۔ اس مجموعے کے احکام کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے احکام پر مقدم رکھتے ہیں۔ اور جو ایسا کرے وہ کافر ہے

علی الحکم بکتاب اللہ وسنۃ رسول اللہ	اس سے اس وقت تک مقاتلہ واجب ہے جب تک
صلی اللہ علیہ وسلم فمن فعل ذالک	وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف پلٹ نہ
فهو کافر یجب قتالہ حتی یرجع الی حکم اللہ ورسولہ	آئے اور چھوٹے بڑے معاملے میں انہیں کے مطابق
فلا یحکم سواہ فی قلیل ولا کثیر	فیصلے نہ کرنے لگے۔

جو لوگ دین اسلام کے سیاسی پہلو کو اس کا ایک حقیر اور ضمنی جزو سمجھتے ہیں انہیں قرآن کی مندرجہ بالا آیتوں پر غور کرنا چاہیے کیونکہ یہ آیتیں تو دین کے سیاسی پہلو کو کفر و اسلام کی کسوٹی قرار دے رہی ہیں۔ اس حقیقت سے مطالعہ کے لیے سورۂ مائدہ کا رکوع سات اور اس کا سیاق و سباق بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

چوتھی آیت

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى	وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور
وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ	دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر
كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا	غالب کرے اور (اس حقیقت پر) اللہ کی گواہی
(الفتح ۲۸)	کافی ہے۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ حدید کی آیتوں نے بالعموم تمام انبیاء کرام کے مقصد بعثت کو واضح کیا اور سورۂ فتح کی اس آیت نے بالخصوص خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت بعثت صریح الفاظ میں ہمیں بتائی ہے اور ٹھیک یہی غرض و غایت سورۂ توبہ آیت ۳۳ اور سورۂ صف آیت ۹ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

جو بات دوسرے اسلوب بیان میں سورۂ انبیاء کی آیت ۸ ا بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ اور سورۂ السبا کی آیت ۴۹ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۱ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا میں بتائی گئی تھی ٹھیک وہی بات التوبہ، الفتح اور الصف کی آیتوں میں اس صراحت کے ساتھ دہرائی گئی ہے کہ بعثت محمدی کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ دین حق کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کر دیا جائے۔

آیت الفتح کے آخری ٹکڑے وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا نے واضح کیا کہ بعثت محمدی کی اس غرض و غایت پر اللہ کی گواہی کافی ہے کیونکہ ان کو رسول بنا کر اسی نے بھیجا ہے اور وہی جانتا ہے کہ انہیں بھیجنے کی غرض و غایت کیا ہے ـــــ اب اگر تمام دنیا مل کر بھی یہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ نہیں تھا تو اس کی بات قابل سماعت نہ ہوگی۔

چوتھی آیت

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ)

مقرر کرد برائے شما از آئین آنچہ امر کرده بود باقامت آں نوح را وانچہ وحی فرستادیم بسوئے تو وانچہ امر کردیم باقامت آں ابراہیم و موسیٰ و عیسےٰ باین مضمون کہ قائم کنید دین را و متفرق مشوید درآں۔

فارسی کا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ہے۔ اس فارسی ترجمے کا اردو ترجمہ یہ ہے:۔

تمہارے لیے وہ آئین مقرر کیا جس کی اقامت کا حکم دیا تھا نوح کو اور جس کے لیے ہم نے وحی بھیجی ہے تمہاری طرف اور جس کی اقامت کا ہم نے حکم دیا ابراہیم اور موسے اور عیسیٰ کو باین مضمون کہ قائم کرو دین کو اور اس میں تفرق نہ ہو۔

اس آیت نے غلبۂ دین کی تمام تعبیرات و تفصیلات کو "اقامت دین" کی ایک جامع اصطلاح میں اکٹھا کر دیا ہے۔ یہ چونکہ ایک مختصر اور جامع اصطلاح ہے اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک تمام علمائے امت، دین اسلام کی ترویج و تنفیذ کے لیے یہی اصطلاح استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔

اس آیت نے چند بہت بڑے درجے کے انبیاء و رسل کے نام لے کر یہ حقیقت واضح کر دی کہ یہ سب کے سب اس لیے بھیجے گئے تھے کہ اللہ کا بھیجا ہوا دین قائم کریں۔ اقامت دین ہی ان سب کا مقصد تھا۔ تمام انبیاء سے مدد کا وعدہ، اللہ کے باغیوں کی شکست اور مغلوبیت اور وفاداران حق کی غالبیت و فتح کی غرض اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اللہ کا دین قائم اور غالب ہو۔ یہی وہ مقصد وحید تھا جس کے لیے انبیاء بھیجے جاتے رہے اور جن کا سلسلہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا۔

ایک شبہے کا ازالہ

اگر کوئی سوال کرے کہ سورۂ شوریٰ کی اس آیت میں "الدین" سے کیا مراد ہے؟ آیا اس سے صرف اصول دین مراد ہیں یا اصول دین کے ساتھ شریعتیں بھی مراد ہیں، اگر صرف اصولِ دین مراد ہیں تو اس سے مکمل دین اسلام کی اقامت کا حکم کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے اور اگر شریعتیں بھی مراد ہیں تو اشکال یہ پیش آتا ہے کہ جب شریعتیں مختلف رہی ہیں تو پھر آیت میں مذکور تمام انبیاء کو ایک ہی شریعت کی اقامت کا حکم دینا کس طرح صحیح ہوگا۔

اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ آیت میں یہ شبہہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ پیدا ہوتا نہیں ہے اس لیے کہ اس

آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ ہم نے نوح، محمد، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو یہ حکم دیا کہ دین قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہر نبی کو اسی دین کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے جو اس پر نازل ہوا۔ اللہ کا فرشتہ ہر ایک پر الگ الگ وحی لایا۔ الگ الگ کتابیں نازل ہوئیں، الگ الگ ہدایتیں اور پیغامات بھیجے گئے۔ ایسا نہیں ہوا ہے کہ صرف ایک کتاب نازل ہوئی ہو اور ہر نبی کے ہاتھ میں وہی کتاب دے دی گئی ہو۔

اوپر قرآن کی آیتیں پیش کر کے تھوڑی تفصیل سے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ہر رسول پر کتاب برحق اور میزان عدل اس لیے نازل کی گئی تھی کہ لوگ عدل و انصاف کی روش پر قائم ہوں اور ان کے درمیان تمام من گھڑت اختلافات ختم کر دیے جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کتاب برحق میں کیا صرف اصول دین ہوتے تھے، شریعت نہیں ہوتی تھی؟ کیا وہ کتاب تمام انفرادی و اجتماعی احکام پر مشتمل نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کو صرف عقائد، نماز و زکوٰۃ اور اخلاق حسنہ کے بیان پر ختم کر دیا جاتا تھا؟ مثال کے طور پر کیا توریت میں اجتماعی زندگی کے احکام و قوانین نہیں بیان کیے گئے ہیں؟ کیا کوئی پڑھا لکھا آدمی اس طرح کی بات سوچ بھی سکتا ہے؟ معلوم ہوا کہ ہر نبی اس مجموعہ احکام کی اقامت کا مکلف ہوتا تھا جو اس پر نازل کیے جاتے تھے اور اسی مجموعہ احکام کو دین کہتے ہیں۔ شریعت دین سے کوئی الگ چیز نہیں ہوتی بلکہ اس میں داخل اور اس کا جز ہوتی ہے۔ پھر یہ بات کس منطق سے صحیح ہوگی کہ کل کی اقامت کا حکم دیا جائے اور جز اس سے خارج ہو۔

شریعتوں کے اختلاف سے جو اشکال پیش آتا ہے اس کو حل کرنے کے لیے یہ جاننا چاہیے کہ انبیاء کرام کی شریعتوں میں اختلاف کی نوعیت کیا ہے۔ اس علم کے بعد یہ اشکال دفع ہو جائے گا ـــــ بات یہ ہے کہ شریعتوں کے درمیان کوئی بنیادی اور اصولی اختلاف کبھی نہیں رہا ہے بلکہ محض جزوی و فرعی اختلافات رہے ہیں۔ جہاں تک ایسے احکام و امور کا تعلق ہے جو انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو درست کرنے کے لیے ضروری ہیں وہ تمام شریعتوں میں موجود رہے ہیں کوئی ایک شریعت بھی ان سے خالی نہیں رہی ہے اور ایسے تمام احکام اصل دین میں داخل ہوتے تھے اس سے خارج نہیں ہوتے تھے ـــــ مثال کے طور پر نماز ہر شریعت میں فرض رہی ہے، لیکن اس کے اوقات، ارکان اور ہیئتوں میں فرق رہا ہے۔ روزہ ہر شریعت میں فرض رہا ہے لیکن پورے ماہ رمضان کا روزہ شریعت محمدی میں فرض ہوا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے درمیان اقامت عدل، مظلوموں کی دادرسی، مجرموں کی تعزیر، منکرین حق سے جہاد تمام شریعتوں کے ضروری اجزاء رہے ہیں لیکن ان کے ضابطوں اور تفصیلات میں جزوی اختلافات رہے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ دینی احکام کے نہیں جزوی اختلافات کے لحاظ سے شریعتوں کے درمیان امتیاز قائم ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے الگ پہچانی جاتی ہیں مثلاً شریعت موسوی، شریعت عیسوی [illegible]

ایک مستقل بالذات شریعت ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی بنیادی اور اصولی اختلاف ہے

اس آیت کی تفسیر میں یہ جو لکھا گیا ہے کہ یہاں دین سے شرائع مراد نہیں ہیں تو اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ دینی احکام کی تفصیلات اور جزوی اختلافات مراد نہیں ہیں کیونکہ ہر نبی کو اپنے وقت کے لحاظ سے شرعی احکام جزوی اختلافات کے ساتھ بتائے جاتے تھے یہ مراد نہیں ہے کہ الدین سے نفس شریعت ہی خارج ہے۔ دین سے واقف کوئی شخص اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتا مفسرین کی تفسیر کے لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر پچھلے نبی کو اگلے نبی کے ان مخصوص جزوی احکام شرائع کی اقامت کا حکم نہیں دیا جاتا تھا جو اس پر نازل ہوئے۔ اس لیے کہ پچھلے نبی پر وقت کے لحاظ سے مخصوص جزوی احکام اگلے نازل ہوتے تھے اور وہ انہیں کی اقامت کا مکلف ہوتا تھا چنانچہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس شریعت کی اقامت کے مکلف ہیں جو آپ پر نازل ہوئی۔

چھٹی آیت

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (الحج: ۴۱)	یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے

اس آیت سے پہلے کی تین آیتیں ۳۸ تا ۴۰ بھی سامنے رہنی چاہییں۔ میں یہاں صرف اُن کے ترجمے نقل کر رہا ہوں۔

یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لاتے ہیں۔ یقیناً اللہ کسی خائن، کافر نعمت کو پسند نہیں کرتا (۳۸) اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے (۳۹) یہ وہ لوگ ہیں جو گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اتنا قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر اللہ ان لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جاتیں، اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔ (۴۰)

ان تین آیتوں میں اہل حق کی طرف سے مدافعت اور ان کی مدد کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو قتال کی اجازت دی گئی ہے اور اللہ نے اپنی یہ قدیم سنت بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ ہمیشہ اہل حق کو اہل باطل پر غلبہ عطا فرماتا رہا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو باطل پوری طرح چھا جاتا۔ یہاں تک کہ وہ عبادت گاہیں بھی مسمار کر ڈالی جاتیں جن میں اللہ واحد کا نام لیا جاتا اور اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آیت (۴۱) میں اہل حق کو زمین میں سلطنت اور اقتدار

(باقی صفحہ پر ملاحظہ ہو)

شارح:۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی
مترجم:۔ سید احمد شاہ

حضرت انسؓ کی دعا

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے جمع الجوامع میں ابو الشیخ اور ابن عساکر کے حوالے سے خادمِ رسول اللہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی مندرجہ ذیل دعا نقل کی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کے مکاتیب و رسائل میں ان کا رسالہ علاوہ اس دعا کی شرح ہے۔ اس دعا کے الفاظ بڑے دلکش اور پُر اثر ہیں۔ ہم نے حضرت شیخ کے اس رسالے کا صرف وہ حصہ لیا ہے جس کا تعلق دعائے انس کی شرح سے ہے۔

(مترجم)

بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى نَفْسِىْ وَدِيْنِىْ بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى اَهْلِىْ وَمَالِىْ وَوَلَدِىْ بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى مَا اَعْطَانِىَ اللّٰهُ اَللّٰهُ رَبِّىْ لَا اُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَاَعَزُّ وَاَجَلُّ وَاَعْظَمُ مِمَّا اَخَافُ وَاَحْذَرُ عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِىْ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّرِيْدٍ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِىَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اِنَّ وَلِيِّىَ اللّٰهُ الَّذِىْ نَزَّلَ الْكِتَابَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ

بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى نَفْسِىْ وَدِيْنِىْ ۔ میں اپنی جان اور اپنے دین کی حفاظت کے لیے اللہ کے نام کے ساتھ اسی کو پناہ بناتا ہوں۔

حفاظت و پناہ کے لیے جان و دین کی تخصیص کا سبب یہ ہے کہ ہر کمال کی تحصیل اور مبدء و معاد یعنی آغاز و انجام کی اصل یہی دو چیزیں ہیں۔ نیز یہ کہ دین پر جان کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی جان ہی تمام چیزوں

...کمال کی تحصیل کے لیے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر انسان کا وجود ہی ختم ہو جائے تو پھر کسی کمال کے ...ال کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا حرام اور اس کی بقا کے لیے سعی و جہد ...ب ہے۔

...سم اللّٰہ علیٰ اَھلی ومالی وَوَلَدِی میں اپنے اہل و مال اور اپنی اولاد کی حفاظت کے لیے بھی اللہ ہی کو پناہ بنا... ہوں

اپنی جان و ایمان کے استحفاظ کے بعد اہل، مال اور اولاد کے استحفاظ کی فکر بھی پیدا ہوئی کیونکہ یہ چیزیں جان و ...ان کی بقا کے ذرائع و وسائل اور ان کی معین و مددگار ہیں۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ پہلی بسم اللہ پر اکتفا نہ کر کے ...بارہ بسم اللہ کا ذکر یہ بتلانے کے لیے کیا گیا ہے کہ ان سب کا استحفاظ بھی ٹھیک اسی طرح مقصود ہے جس طرح ...ن و ایمان کا استحفاظ۔ مال و دولت کا ذکر جب مدح و استحسان کے موقع پر ہوتا ہے تو اس سے مراد مالِ حلال ...تا ہے اس لیے کہ مالِ حلال ہی وسیلۂ آخرت بنتا اور اس کی حفاظت سعادت و کمال کے حصول میں معاون ہوتی ہے ورنہ مالِ حرام تو انسان کے لیے وبال ہوتا ہے۔

وَلَدُ سے مراد اولاد ہے جس میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں داخل ہیں۔ اولاد کی موجودگی بھی دین و دولت کی ...ت و استحکام کا سبب ہے۔ بیٹا اگر لائق اور صالح ہو تو وہ دنیا و آخرت کی سعادت کا سبب بن جاتا ہے۔ ...دیث میں آیا ہے کہ تین چیزیں آدمی کے مرنے کے بعد بھی اسے فائدہ پہنچاتی ہیں۔ ایک علم دین جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہو۔ دوسری چیز رفاہِ عامہ کے کام جن سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچے۔ تیسری چیز فرزند صالح جو ماں باپ کے مرنے کے بعد ان کے لیے استغفار اور دعائے خیر کرے۔

بِسْمِ اللّٰہِ عَلٰی مَا اَعْطَانِیَ اللّٰہُ میں ان تمام چیزوں کی حفاظت کے لیے بھی جو اللہ نے مجھے عطا کی ہیں اسی کو پنا... ...ناتا ہوں۔

چند اہم نعمتوں کا خصوصی ذکر کرنے کے بعد یہ عام لفظ لایا گیا ہے تاکہ اس میں ہر قسم کی چھوٹی بڑی اور جزئی ...لی نعمتیں داخل ہو جائیں اس لیے کہ فی الحقیقت اللہ کی نعمتوں کا شمار ناممکن ہے۔ قرآن میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا	اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو اس
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ ۝	کا احاطہ نہ کر سکو گے بے شک انسان بڑا ظالم
(ابراھیم ر ۵)	اور بڑا ناشکرا ہے۔

انسان چونکہ ہمیشہ اپنے نفس پر ظلم اور خدا کی نعمتوں کی ناشکری کرتا رہتا ہے اس لیے اس کو بصیغۂ مبالغہ

ظالم اور ناشکرا کہا گیا ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ فرمایا گیا

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ (النحل ۱۸)

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو انہیں گن نہ سکو گے۔ بلاشبہ اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔

یہ بڑی تسکین بخش آیت ہے۔ اگر اس ناشکری و ناسپاسی کے باوجود اللہ کی مغفرت و رحمت نہ ہوتی تو انسان سخت مشکل میں گرفتار ہوجاتا اور اللہ کی مغفرت و رحمت بھی اسی کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ اصل یہی ہے، باقی سب ہیچ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ کوئی شخص بھی اللہ کے فضل و رحمت کے بغیر محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اس نعمت کا شکر ہمیں ادا کرنا چاہیے اور بے عملی کی زندگی بسر نہ کرنی چاہیے اس لیے کہ نیک عملی ہی سے اللہ کی رحمت اور اس کا فضل حاصل ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز شب میں اتنی دیر کھڑے رہتے کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا اور اس سے خون بہنے لگتا۔ صحابہ نے عرض کی۔ یا رسول اللہ آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیے گئے پھر آپ اتنی مشقت کیوں برداشت فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ نے مجھے بخش دیا اور اس کی مغفرت ایک عظیم نعمت ہے۔ اگر میں اس نعمت کا شکریہ نہ ادا کروں تو اس کا شکر گزار بندہ نہ بن سکوں گا۔ جب سید الاولین و آخرین صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی عبادت میں اتنی مشقت برداشت کی ہے تو پھر سوچو کہ ہمیں اور تمہیں کیا کرنا چاہیے۔

اَللّٰہُ رَبِّیْ لَا اُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا — اللہ ہی میرا رب ہے۔ میں کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا۔

انسان کو جو مصائب و حوادث پیش آتے ہیں ان کو دفع کرنے میں یہ کلمہ بڑی تاثیر رکھتا ہے۔ احادیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اس کلمے کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے تمام افعال کو پُر از حکمت و مصلحت سمجھے اور شرک خفی کے جال میں نہ پھنسے۔ اپنے نفع و نقصان میں کسی دوسرے کو مؤثر حقیقی نہ سمجھے اور یقین رکھے کہ اللہ جو کچھ کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے جس شخص نے اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کر دیے ہوں اور ہمیشہ اس کے لطف و کرم کا جویا اور اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے سمجھنا چاہیے کہ اس کے بارے میں خدا جو کچھ کرتا ہے اس کی مصلحت اسی میں ہے۔

دعا کے بارے میں ایک قیمتی تنبیہ — احادیث میں یہ جو آتا ہے کہ جو شخص یہ دعا کرے گا اس کی تمنا پوری

کا مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔ اس کی حقیقی مراد یہ ہے کہ دعا کرنے والا الفاظ دعا کے رنگ میں رنگا ہوا ہو اور
ہو رہے کے ساتھ دعا کے معانی جانتا اور اس کے تقاضوں سے متصف ہو ورنہ صرف زبان ہلانا اور اپنے جالیس کو
یت دینا کچھ زیادہ کفایت نہیں کرتا الا یہ کہ شارع کی نص سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس دعا کی خاصیت مجرد اس
کے الفاظ ادا کرنے سے حاصل ہوتی ہے معنی معلوم ہوں یا نہ ہوں لیکن اس تنبیہ کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ انسان
جب تک دعا کے معنی سے واقف اور اس کے تمام شرائط وحدود کا پابند نہ ہو جائے دعا کرنا چھوڑ دے۔ اس
لیے کہ اللہ کا فضل بہت وسیع ہے' وہ مجیب الدعوات (دعاؤں کو قبول کرنے والا) ہے اور وہ اپنے فضل سے
ایسے الفاظ کو بھی قبول فرما سکتا ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ انسان دعا اور عمل کرتے ہوئے معانی کو سمجھنے اور خلوص
پیدا کرنے کی فکر سے غافل نہ رہے ــــــ کچھ لوگوں نے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے کہا کہ جب ہم عمل
کرتے ہیں تو اس میں ریا داخل ہو جاتی ہے اور عمل چھوڑ دیتے ہیں تو بے کار ہو جاتے ہیں' ایسے حال میں ہمیں
کیا کرنا چاہیے۔ انھوں نے جواب دیا کہ عمل کرو اور ریا سے استغفار کرو بے کار بیٹھنا نادرست اور منافی
مصلحت ہے۔ اگر پابندی سے عمل اور استغفار جاری رہے تو اس کی برکت و نورانیت سے ان شاء اللہ اخلاص
بھی پیدا ہو جائے گا۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَ اَعَزُّ وَ اَجَلُّ وَ اَعْظَمُ مِمَّا اَخَافُ وَ اَحْذَرُ اللہ اس چیز سے
بزرگ تر اور غالب تر ہے جس سے میں ڈرتا اور اپنے بچاؤ کی فکر کرتا ہوں۔

ان کلمات کے ذریعہ ہر خوفناک و خطرناک شے کے مقابلے میں اللہ کی کبریائی' اس کی عزت و جلالت
اور اس کی عظمت کے دامن میں پناہ لی گئی ہے ــــ انسان کا نفس اپنی بے یقینی کی بنا پر غیر اللہ سے خوف و ہراس
محسوس کرتا ہے خصوصاً جب معاملہ جباروں اور زورآوروں سے پڑ جائے۔ کوئی ظالم حکومت اور جبار
طاقت نقصان پہنچانے پر تل جائے' ایسے موقع پر یہ کلمات انسان کے دل کو نور یقین سے بھر دیتے اور اسے
دلیر بنا دیتے ہیں' انسان اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ اے نفس خوف نہ کھا کیونکہ تیرا پروردگار
تیرے دشمن سے زیادہ قوی اور زیادہ زورآور ہے۔ ؎

دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر ست

تو بس مولیٰ تعالیٰ سے ڈر تاکہ سب تجھ سے ڈریں۔ جو اللہ سے ڈرتا ہے' ہر چیز اس سے ڈرتی ہے۔ ان
کلمات میں پوری تنبیہ موجود ہے کہ زورآور کے مقابلے میں انسان اپنے باطن کو اللہ کی کبریائی کے یقین سے بھر دے

تاکہ اس کی عظمت وجلالت کے نور میں دوسرے تمام لوگوں کی جباریت وقہاریت مضمحل اور روپوش ہو جائے۔

عَزَّ جَارُكَ تیرا ہمسایہ اور تیری پناہ لینے والا غالب ہے۔

اللہ کی کبریائی اور اس کی عظمت کے استحضار نے یہ حالت پیدا کی کہ پناہ لینے والا اپنے مالک کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اب اس سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ تیری پناہ لینے والے پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ اللہ کی ہمسائگی کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہمیشہ اس کی طرف متوجہ رہے اور اس کے دامن عزت وجلال کو مضبوطی سے تھام لے۔ اس کی بارگاہ عزت میں التجا کرنے والا کبھی مغلوب ومقہور نہیں ہوتا۔ ؎ عزیز تو خواری نہ بیند زکس

وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ اور تیری ثنا بزرگ وبرتر ہے۔

کوئی شخص تیری صفات کمال اور تیری قدرت لایزال کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو ضعیف کو قوی اور قوی کو ضعیف بناتا ہے۔ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ تیری صفت ہے

وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ اور تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔

اَللّٰهُمَّ أَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں اپنے نفس کی شرارت سے۔

چونکہ نفس تمام شرارتوں اور برائیوں کا منبع اور بے یقینی وبے ثباتی کا باعث ہے اس لیے اس کی بدی سے پناہ مانگی گئی ہے۔ جو برائی بھی انسان کو پہنچتی ہے اس کے نفس سے پہنچتی ہے اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔ رَبِّ لَا تَكِلْنِيْ إِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَلَا أَقَلَّ مِنْ ذٰلِكَ۔ پروردگار مجھے ایک لمحے کے لیے بھی میرے نفس کے ساتھ نہ چھوڑ، بلکہ اس سے کم وقت کے لیے بھی نہ چھوڑ!

مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھ اور میرا مشغلہ تیری عظمت کا مشاہدہ ہو تاکہ یک چشم زدن کے لیے بھی کسی غیر کی مجال نہ ہو کہ مجھ پر اثر انداز ہو سکے یا مجھ پر غلبہ پا سکے۔

وَمِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْطَانٍ مَرِيْدٍ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ اور میں تیری پناہ ڈھونڈھتا ہوں ہر راندۂ درگاہ شیطان اور ہر متکبر وگم راہ سلطان کے شر سے

چونکہ اغوا کرنے اور راہ حق سے بہکانے کا کام شیطان کے حوالے ہے اسی طرح وقت کی جابر وقہار حکومتیں بھی راہ حق کی دشمن اور خلق خدا پر مسلط ہیں اس لیے ان کے شر سے استعاذہ بھی واجبات وقت سے ہے۔ شیاطین دو قسم کے ہیں۔ شیاطین جن یعنی ابلیس اور اس کا لشکر۔ اور شیاطین انس یعنی ظالم حکمران اور ان کے مددگار۔ پہلے جملے سے پہلی قسم کے شیطان مراد ہیں اور دوسرے جملے سے دوسری قسم کے شیطان۔

جب تک انسان کی عقل نورِ یقین سے صفی و منورہ نہ ہو جائے ان دونوں شیطانوں کے خوف اور ان کے شر سے نجات نہیں ملتی۔ اپنے ایسے ہی بندوں کے بارے میں اللہ نے شیطان سے کہا ہے۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ۔ میرے خاص بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہیں۔ اور درحقیقت یہ استعاذہ بھی نفس ہی کے شر سے استعاذہ ہے اس لیے کہ جب تک انسان کا نفس مقہور و مغلوب نہ ہو ان شیطانوں کے تصرفات اور ان کے غلبہ سے نجات نہیں ملتی۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ	پس اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دو کہ اللہ
لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ	میرے لیے کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں
رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔	میرا بھروسہ اسی پر ہے اور وہ عرش عظیم کا رب ہے

یہ قرآن مجید کی ایک آیت ہے۔ اس میں حضرت حق سبحانہٗ وتعالےٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے کر فرما رہا ہے کہ اگر کافر پیٹھ پھیریں حق کی طرف رخ نہ کریں اور اس کو قبول کرنے سے اعراض کریں تو اے محمد! اے میرے محبوب اے میرے محفوظ و معصوم اتم کہہ دو کہ اللہ میرے لیے کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، میں نے اسی کو اپنے تمام معاملات سپرد کر دیے اور میں نے اسی کو اپنا وکیل بنا لیا ہے اور وہ عظیم تخت سلطنت کا مالک ہے ——— چونکہ گفتگو جباروں اور قہاروں کے شر کو دفع کرنے اور ان کے خوف کو دور کرنے کی چل رہی تھی اس لیے اس آیت پر اس کا خاتمہ بہت خوب ہے اور مقطعِ کلام کو مطلعِ کلام کے ساتھ بڑی مناسبت ہے۔ ان کے شر اور خوف کو دور کرنے کا بہترین علاج یہ ہے کہ انسان اللہ تعالےٰ کے قہر و عظمت کے مشاہدے میں غرق ہو جائے۔ اللہ کے عظیم تخت سلطنت کے احاطے میں پوری کائنات داخل ہے اس لیے اس کی عظمت اور اس کی پکڑ سے کوئی بھی باہر نہیں نکل سکتا۔

اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ	بلاشبہ میرا کارساز وہ اللہ ہے جس نے کتاب نازل
الْكِتٰبَ وَهُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ	کی اور وہ اپنے نیک بندوں کو دوست رکھتا ہے

جس نے کتاب نازل کی، اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے قرآن مجید میں دنیا و آخرت کے تمام امور کی تدبیر بتا دی ہے اور وہ نیک بندوں کو دوست رکھتا اور ان کے معاملات کی نگرانی کرتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب تک صالح نہ بنے اس بات کی توقع نہ رکھنی چاہیے کہ خدا کی دوستی و کارسازی اسے حاصل ہوگی۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝

اسلام میں خدا اور رسول کا تصور

(مولانا سید جلال الدین عمری)

(مذکورہ بالا عنوان سے میں نے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ ذیل کے صفحات میں اس کا مقدمہ دیا جا رہا ہے۔ اس سے کتاب کی نوعیت کسی قدر واضح ہو گی) - جلال الدین

ہمارا حال ہمارے ماضی سے بے حد مختلف ہے۔ یہ اختلاف علوم و فنون اور صنعت و تہذیب میں جس قدر نمایاں ہے اس سے کہیں زیادہ فکر و نظر کے طریقوں میں ظاہر ہو رہا ہے۔ ماضی میں خدا کو ایک حقیقت سمجھا جاتا تھا اور آج اسے ایک وہم خیال کیا جاتا ہے۔ پہلے انسان کا ایمان یہ تھا کہ خدا نے اسے پیدا کیا ہے اور اب اس کی 'تحقیق' یہ ہے کہ وہ بعض طبیعی اسباب کے نتیجے میں خود بخود پیدا ہو گیا ہے۔ پہلے اس کے نزدیک اخلاق و روحانیت کی بڑی اہمیت تھی اور اب وہ محض ایک ترقی یافتہ حیوان ہے، جس کی اخلاقیات بھی اس کی حیوانی خواہشات کے تابع ہیں۔ پہلے وہ خدا کی نافرمانی کو جرم سمجھتا تھا اور اب وہ خدا کی ہدایت کا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں پچھلے ادوار میں بھی خدا کی نافرمانی بہت ہوتی رہی ہے لیکن خدا کا انکار کم ہی ہوا ہے اور آج فکر و عمل کی دنیا میں ہر طرف خدا سے بغاوت برپا ہے۔ اسی بات کو ایک جملے میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ماضی کا رخ خدا پرستی کی طرف تھا اور حال کا رخ الحاد کی طرف ہے۔ موجودہ دور کی تہذیب، اس کی معاشرت، اس کی حکومت و سیاست، اس کا قانون اور اس کا تصورِ اخلاق ہر چیز خدا سے بے نیازی پر مبنی ہے۔ خدا کو زندگی سے اس طرح خارج کر دیا گیا ہے کہ کسی بھی موقع پر اور کسی بھی کام میں اس کا نام نہیں لیا جاتا۔

لیکن ظاہر ہے خدا کو ماننا یا نہ ماننا ایسا نہیں ہے جس کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ دنیا ان نتائج کو اچھی طرح دیکھ چکی ہے جو خدا کو ماننے یا انکار کرنے سے فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ خدا سے بغاوت کے نتیجے میں آج پوری انسانیت کو اتنے شدید صدمات اٹھانے پڑے ہیں اور زندگی کے ایک ایک میدان میں

اتنے زبردست نقصانات اسے پہنچ چکے ہیں کہ کوئی بھی ذہین سے ذہین انسان پہلے سے اس کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ موجودہ دَور کو خدا سے بغاوت کے جو تلخ تجربات ہوئے ہیں اگر الفاظ میں ان کی تصویر پیش کی جائے تو یقیناً وہ بہت ہی دل ہلا دینے والی ہوگی اور ساتھ ہی اس میں سنجیدہ ذہنوں کے لیے غور و فکر اور عبرت کا سامان بھی ہوگا۔

دوسری طرف تاریخ کو خدا پر ایمان لانے اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے تجربات بھی ہوئے ہیں۔ کوئی شخص مانے یا نہ مانے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت ہی قیمتی اور پاکیزہ تجربات ہیں۔ ان تجربات کو نظر انداز کرنا تاریخ کے ساتھ سخت ناانصافی اور انسانیت پر بہت بڑا ظلم ہے۔ خدا پر ایمان جب بھی انسان کی زندگی میں داخل ہوا ہے، اخلاق میں بلندی، تہذیب و معاشرت میں پاکیزگی اور معاملات میں دیانت داری پیدا ہوئی ہے۔ اور بحیثیت مجموعی پوری انسانی زندگی کو سکون اور چین نصیب ہوا ہے لیکن افسوس کہ تصویر کا یہ رخ مدت دراز سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے اور آج ضرورت ہے کہ پوری قوت کے ساتھ اسے ابھارا جائے۔

ظاہر ہے یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو صحیح معنی میں خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ان ہی کا فرض ہے کہ دورِ حاضر کی بغاوت کا سامنا کریں اور اس کا سر کچل دیں لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہے، جتنا الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ موجودہ دَور میں خدا سے بغاوت از خود نہیں پھوٹ پڑی بلکہ اس کے لیے اس کے علم برداروں نے زبردست محنت کی، اپنی بہترین قوتیں صرف کیں، اپنی جانیں کھپا دیں، رات دن اس کام میں لگے رہے۔ نئے نئے علوم ایجاد کیے اور ہر علم کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نہ خدا ہے اور نہ ہم اس کی ہدایت کے محتاج ہیں اور آج تک یہ سلسلہ پوری قوت اور شدت کے ساتھ جاری ہے۔ تب وہ انسانوں کو خدا سے دور کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ آج کا انسان خدا سے بغاوت کے لیے جس قدر مسلح ہے اس قدر شاید ہی کسی دور کا انسان مسلح رہا ہو۔

اس بغاوت کے مقابلے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم شب و روز محض یہ اعلان کرتے رہیں کہ خدا ہے اور وہی انسان کا معبودِ برحق ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر ہر میدان میں موجودہ دور کی فکری و عملی خامیاں نمایاں کی جائیں۔ جب تک ہم ان استدلالات کو رد نہیں کریں گے، جن پر اس دَور کی عمارت اٹھی ہے اس کی جگہ خدا پرستی کے دور کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ آج صرف یہی نہیں کہ دنیا خدا کی رہنمائی نہیں چاہتی بلکہ خدا کے وجود ہی سے انکار کر رہی ہے۔ آپ کو نعروں سے نہیں بلکہ دلائل و براہین کی قوت سے ثابت

کرنا ہوگا کہ خدا فی الواقع موجود ہے اور ہماری نجات اسی کی غلامی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اتنے اونچے کام کی صلاحیت ہر شخص میں نہیں ہوتی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمیں اس کی اہمیت کا احساس بھی نہیں ہے۔ کیونکہ انسان کے اندر کسی کمی کا احساس اسے بے چین کر دیتا ہے اور وہ اسے دور کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ ہماری علمی زندگی کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جس حد تک ہمارا فکری ارتقاء ہو چکا ہے ہم اس سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے اور ہمارے اندر دشمن کے نئے نئے فنون حرب سے واقفیت کا جذبہ نہیں ہے۔ آپ کا دشمن علم کے ہر گوشے میں تیار ہے اور آپ بغیر تیاری کے اس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے اس شان کے ساتھ آپ کبھی اپنے دشمن پر غالب نہیں آ سکتے۔ خدا کا حکم ہے کہ دشمن کے مقابلے میں جتنی بھی طاقت فراہم کر سکتے ہو کرو۔ لہٰذا ہم میں سے کوئی بھی شخص اپنی اس ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہو سکتا کہ اسے آخری حد تک تیاری کرنی ہے اور اپنی پوری قوت اس راہ میں لگانی ہے۔

آپ شاید میرے اس دعوے کو نہیں مانیں گے کہ موجودہ دور خدا سے بغاوت کا دور ہے اس لیے کہ ابھی بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی موجود ہے جو خدا کو مانتے اور اس کا نام لیتے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان میں بہت ہی کم ایسے ہیں جن کے ایمان کی کوئی علمی و عقلی بنیاد ہو۔ زیادہ لوگوں کے لیے خدا پر ایمان محض ماضی کا ایک ورثہ ہے۔ ابھی ان میں ماضی سے بغاوت کی جرأت نہیں ہے اس لیے آپ ان کو صاحبِ ایمان سمجھتے ہیں۔

ماضی کے اس یادگار "خدا کا جو ابھی تک بعض ذہنوں میں موجود ہے" کام رہ گیا ہے کہ جو لوگ اس سے دعائیں مانگیں، ان کی دعائیں سنے اور ان کی مرادیں پوری کرے۔ انسانوں پر اس کا زیادہ سے زیادہ یہ حق سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کے نام پر چند رسومات ادا کرتے رہیں۔ اس سے آگے نہ تو خدا کا کوئی کام ہے اور نہ کسی معاملے میں اس کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ چنانچہ آپ یہ تو دیکھ سکتے ہیں کہ خدا کا نام مسجدوں میں بھی لیا جاتا ہے، مندروں میں بھی لیا جاتا ہے۔ گرجاؤں اور کلیساؤں میں بھی لیا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھ سکتے کہ فی الواقع انسان خدا کا بندہ بن گیا ہو اور اس پر خدا کی فرماں روائی قائم ہو چکی ہو۔

پھر یہ کہ اگر کچھ لوگ علمی و عقلی بنیادوں پر خدا کو مانتے بھی ہیں تو موجودہ تہذیب و تمدن پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ آج جو نظریات انسان پر حکومت کر رہے ہیں، جن افکار کے تحت انسان کی ذہنی و فکری تعمیر

ہوتی ہے "جو علوم پڑھائے جاتے ہیں اور جن فنون کی تعلیم دی جاتی ہے وہ سب کے سب خدا سے بغاوت پر مبنی ہیں۔ بلا شبہ ہر ہر میدان میں اس بغاوت کا بہت ہی کامیاب جواب دیا جاسکتا ہے لیکن افسوس کہ وہ زبانیں اور قلم نہیں ہیں جو جواب دے سکیں۔ اگر کہیں سے خدا کے تصور کے حق میں کوئی آواز اٹھتی بھی ہے تو وہ اتنی کمزور ہوتی ہے کہ انکار خدا کے ہنگامے میں دب کر رہ جاتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خدا کے وجود پر کوئی ایسی دلیل نہیں دی جاسکتی جس کو رد نہ کیا جاسکے، جو بھی دلیل دی جائے گی اس کا کوئی نہ کوئی جواب ممکن ہوگا۔ اس لیے خدا کی ذات کو عقل اور منطق کا موضوع نہیں ہونا چاہیے۔ ایمان اطمینان قلب چاہتا ہے اور اطمینان کسی خارجی دلیل سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ انسان کے باطن سے ابھرتا ہے۔ جب انسان کا دل پکار اٹھے کہ خدا کا وجود محض مفروضہ نہیں ہے، جس کو وہم و خیال نے پیدا کیا ہو، بلکہ وہ ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا تو اسی کا نام ایمان ہے۔

میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ خدا کے وجود پر دی جانے والی ہر دلیل کا جواب ممکن ہے۔ میں بغیر کسی تامل کے کہوں گا کہ خالص علمی و عقلی بنیادوں پر خدا کا اس قدر پختہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ کسی بھی طرح اس کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ لیکن یقین اور اطمینان میں بڑا فرق ہے۔ میں اس فرق کو بیان و واضح کرنا چاہتا ہوں۔

ہر بات دو پہلو رکھتی ہے۔ وہ صحیح بھی ہوسکتی ہے اور اس کے غلط ہونے کا بھی امکان ہے۔ یقین اس واقعہ کا نام ہے کہ ان میں سے کسی ایک پہلو کا غالب امکان آپ کو حاصل ہوا ہے یا یوں کہیے کہ آپ نے اپنے ذہن میں ایک پہلو کو ترجیح دی ہے اور دوسرے پہلو کو رد کر دیا ہے۔ یہ کیفیت ان دلائل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو اس کے حق میں دیے جاتے ہیں۔ دلائل اگر مضبوط ہیں تو اس کے صحیح ہونے کا یقین ہوگا اور اگر کمزور ہیں تو اس کے غلط ہونے کا یقین ہوگا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ غور و فکر سے آپ خدا کا یقین حاصل کرسکتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ ان دلائل کو قوی پائیں گے جو خدا کے وجود پر دیے جاتے ہیں اور ان دلائل میں کوئی وزن محسوس نہیں کریں گے جو انکار خدا کے حق میں دیے جاتے ہیں۔

اطمینان کا درجہ یقین سے اونچا ہے۔ یقین انسان کو دلائل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے لیکن اطمینان کی کیفیت آپ کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ آپ اپنے جذبات و احساسات کو اس یقین پر قربان کردیں اور اپنے تمام سرمایۂ حیات کو دل کی آمادگی کے ساتھ اس یقین کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوجائیں۔ یقین کے بعد

اگر آپ کو اطمینان نصیب ہوا ہے تو یہ یقین صرف آپ کے گوشۂ دماغ میں بند ہو کر نہیں رہے گا بلکہ آپ کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگے گا۔ آپ خدا کے تصور سے سکون اور چین محسوس کریں گے اور آپ کی پوری زندگی پر خدا پرستی چھا جائے گی۔ آپ کا فکر آپ کا جذبہ بن جائے گا اور آپ خدا کو اپنے سے قریب محسوس کریں گے جس یقین کو آپ نے دلائل سے اخذ کیا ہے وہ آپ کے دل کی آواز میں تبدیل ہو جائے گا اور آپ کے جذبات آپ کے یقین میں گم ہو جائیں گے۔ یہ کیفیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ آپ خدا کے بارے میں حاصل شدہ یقین کو اپنی روح کی گہرائیوں میں جذب کر لیں اور اپنے جذبات و احساسات کو شعوری طور پر اس یقین سے ہم آہنگ بنا دیں۔

یہاں ہمیں اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اطمینان ایک قلبی کیفیت ہے۔ یہ کیفیت ہمیشہ دلیل کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات آپ کسی معاملے پر پوری طرح مطمئن ہونے کے باوجود اس کا کوئی معقول سبب نہیں بیان کر سکتے۔ اس نوعیت کے اطمینان سے آپ کو دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ کیونکہ جس اطمینان کے پیچھے دلیل نہ ہو وہ حقیقی اطمینان نہیں ہے۔ ایسا بہت دیکھا گیا ہے کہ انسان کا ذوق اور رجحان یا خاندان اور ماحول کے اثرات کسی ایسے خیال پر اس کے اندر اطمینان کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو ہرگز قابل اطمینان نہیں ہوتا۔ اس لیے ہر نظریہ دلائل کا محتاج ہے۔ اس کے قبول کرنے یا رد کرنے میں ہم دلائل سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

آپ جانتے ہیں کہ خدا کے بارے میں مختلف نظریات پھیلے ہوئے ہیں اور خدا تک پہنچنے کی بھی بہت سی راہیں تجویز کی جا چکی ہیں۔ ان نظریات میں سیاہی و سفیدی کا تعلق ہے اور ان راہوں میں ایک مشرق کی طرف لے جانے والی ہے تو دوسری مغرب کی سمت راہنمائی کرتی ہے۔ اس لیے اگر آپ ان میں سے ایک کو حق کہیں گے تو لازماً دوسرے کو باطل کہنا پڑے گا لیکن اس کے باوجود ہر نظریہ کا ماننے والا اس پر شرح صدر کا اظہار کرتا ہے اور ہر راہ کا راہی اپنے سفر پر مطمئن نظر آتا ہے۔ پھر ہمارے پاس کیا دلیل ہے کہ کسی کے اطمینان کو غلط کہیں؟ اس کی بنیاد صرف یہ ہو سکتی ہے کہ جو نظریہ مسلمات عقل کا ساتھ دے رہا ہو ہم اسے صحیح سمجھیں اور جو نظریہ ان مسلمات سے ٹکرا رہا ہو اسے باطل تصور کریں اور ان لوگوں کے اطمینان کو جھوٹا اطمینان قرار دیں جو باطل نظریات پر مطمئن ہو چکے ہیں۔

لیکن خدا کے بارے میں غور و فکر کرتے وقت ہمیں دو چیزوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ایک تو یہ کہ ہمارے

سوچنے کا انداز صحیح ہو کیونکہ غلط طرزِ فکر سے کبھی صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ خدا کے بارے میں ہمارے فکر کی پرواز ایک خاص حد تک ہی ہو سکتی ہے۔ اس سے آگے اس کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ تجربات گواہ ہیں کہ بڑے بڑے ہوش مند انسان اس وادی میں اس وقت کھو گئے جب کہ انھوں نے اپنی عقل کے حدود نہیں پہچانے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پیغمبروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ خدا کے پیغمبر ایک تو صحیح انداز فکر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہماری عقل جس منزل تک پہنچ چکی ہے اسے اس سے آگے ایک فطری ترتیب کے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے کتاب کا موضوع خدا کے ساتھ اس کا رسول بھی ہے۔ بلکہ کتاب کی ترتیب میں رسالت پر بحث الوہیت پر بحث سے مقدم ہے۔ پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ انسان خدا کی تلاش میں ناکام ہے۔ اگر وہ خدا سے اپنا تعلق جوڑنا چاہتا ہے تو اسے رسول کی رسالت کو ماننا پڑے گا۔ پھر رسول جن دعووں کے ساتھ دنیا کے سامنے آتا ہے ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد رسول کی پہچان بتائی گئی ہے اور اسی بنیاد پر آخری رسول کی رسالت کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اس کتاب کا ایک حصہ ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں قرآن کے تصورِ خدا کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں خدا کی ذات و صفات، توحید، کائنات سے خدا کے تعلق اور خدا کی رضا و عدم رضا سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے آغاز میں اختصار کے ساتھ ان باطل نظریات پر تنقید ہے جو موجودہ دور کے خدا کے بارے میں مان رکھے ہیں۔ میں نے ان تمام مباحث میں اسلامی فکر کی تشریح کی ہے اور اس کے استدلالی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ ہر قدم پر میری پوری کوشش یہ رہی ہے کہ خالص علمی انداز میں اس موضوع پر اظہار خیال کروں اور صحیح صحیح نتائج پڑھنے والے کے سامنے رکھ دوں۔ لیکن اس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے کہیں غلطی نہیں کی ہے۔ جو بھی صاحب علم میری کسی غلطی کی نشان دہی کریں گے مجھے اس کے قبول کرنے میں ان شاء اللہ کبھی تامل نہ ہوگا۔

تصحیح

اگست ۶۲ء کے شمارے میں صفحہ ۵ پر پہلی سطر میں تَصِفُوْنَ کے بجائے تَصْنَعُوْنَ چھپ گیا ہے۔ خریدارانِ زندگی اس غلطی کو درست کرلیں۔

(ادارہ)

پردہ

(۲)

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

گھروں میں آنے جانے کے احکام

پردے کا حقیقی مقصود یہ ہے کہ معاشرہ پوری یکسوئی کے ساتھ اخلاقی فضا میں پروان چڑھے۔ اور وہ تمام محرکات دب جائیں جن سے جنسی جذبات آزادانہ ابھرتے ہیں اور معاشرہ اخلاقی پستی آوارگی اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہونے کے لیے قرآن حکیم نے عورتوں کو پردے کے احکام دینے کے ساتھ ساتھ مردوں پر بھی بعض پابندیاں عائد کی ہیں۔

اسلام سے پہلے اہل عرب بے تکلف حُيِّيتُمْ صَبَاحًا (صبح بخیر) حُيِّيتُمْ مَسَاءً (شام بخیر) کہتے ہوئے ایک دوسرے کے گھروں میں گھس جاتے تھے، اور اس بے احتیاطی کے نتیجے میں بسا اوقات گھر والوں پر نا دیدنی حالت میں نگاہیں پڑ جاتی تھیں ـــــ قرآن نے اس حالت کی اصلاح کے لیے گھروں میں آنے جانے سے متعلق بنیادی احکام دیے، اور یہ اصول مقرر فرمایا کہ ہر شخص کو اپنے رہنے کی جگہ میں تخلیے (Privacy) کا حق حاصل ہے، اور کسی دوسرے شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر اس کے تخلیے میں خلل انداز ہو۔

گھروں میں اجازت لیکر جاؤ

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا (النور ۲۷)

مومنو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو۔ جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو۔

صاحب خانہ کی رضا لینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو آنے والے کی آمد ناگوار نہ ہو، اور وہ بخوشی اس کو اجازت دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکم کے تحت یہ ہدایت بھی دی ہے کہ اپنے گھروں میں بھی جاؤ

لے کر داخل ہوا کرو۔ ایک شخص نے پوچھا اے اللہ کے رسول! کیا میں اپنی ماں کے پاس جاتے وقت بھی اجازت لوں؟ ارشاد فرمایا۔ کیوں نہیں۔ اس نے کہا میرے سوا کوئی ان کی خدمت کرنے والا نہیں، کیا ہر بار جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوں تو اجازت لیا کروں؟ حضور نے فرمایا۔ "کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھو؟"

پھر اسی حکم کی روشنی میں آپ نے دوسروں کے گھروں میں جھانکنے اور اجازت کے بغیر دوسروں کا خط پڑھنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ حضور کے خادم خاص حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک صاحب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے میں جھانکنے لگے۔ اس وقت حضور کے ہاتھ میں تیر تھا۔ آپ تیر لیے ہوئے اس کی طرف اس طرح بڑھے کہ اس کے پیٹ میں بھونک دیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ نبیؐ کا ارشاد ہے۔ "جس نے اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اس کے خط میں نظر دوڑائی وہ گویا آگ میں جھانکتا ہے۔

سلام کرکے داخل ہو

وَتُسَلِّمُوْا	اور (دوسروں کے گھر میں داخل نہ ہو)
عَلٰٓى اَهْلِهَا ؕ	جب تک ان پر سلام نہ بھیج لو۔ یہی طریقہ تمہارے
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ	حق میں بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس سے
تَذَكَّرُوْنَ ○ (النور۔ ۲۷)	سبق لوگے۔

مطلب یہ ہے کہ صاحب خانہ کی مرضی پانے اور اجازت حاصل کرنے کے بعد ایک دم مکان میں نہ گھس پڑو۔ بلکہ پہلے گھر والوں کو سلام کرو۔ ایک بار ایک صاحب کلدہ ابن حنبل ایک ضرورت سے نبیؐ کے پاس گئے اور سلام کیے بغیر یوں ہی جا بیٹھے۔ حضور نے ان سے فرمایا۔ "جاؤ، باہر جاؤ اور پھر السلام علیکم کہہ کر اندر آؤ۔"

حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عرض کرتے "السلام علیک یارسولَ اللہ اَیَدْخُلُ عُمَرُ (ابوداؤد) السلام علیکم یا رسول اللہ! کیا عمر آسکتا ہے؟

سلام خیر و برکت کا ذریعہ

فَاِذَا دَخَلْتُمْ	"جب گھروں میں داخل ہوا کرو تو اپنے
بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا	لوگوں کو سلام کرلیا کرو۔ دعائے خیر اللہ کی طرف
عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ	سے مقرر فرمائی ہوئی بڑی ہی برکت والی اور
مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً (النور۔ ۶۱)	پاکیزہ۔"

گھروں میں داخلے کے وقت سلام کرنا اپنے لوگوں کے لیے رحمت و سلامتی کی دعا تو ہے ہی، دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر گھر میں کوئی اجنبی عورت آئی ہوئی ہو تو وہ پردے میں ہو جائے گی۔ گھر کی عورتیں اگر اوڑھنیاں اتارے بے تکلف بیٹھی ہوں تو انہیں سنبھلنے کا موقع مل جائے گا۔ اسی لیے اس کو پاکیزہ طریقہ قرار دیا گیا۔

ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم خاص حضرت انسؓ کو سلام کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا "پیارے بیٹے! جب تم گھر میں داخل ہوا کرو تو سلام کر لیا کرو۔ یہ تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لیے خیر و برکت کا ذریعہ ہوگا۔"

گھر میں کوئی نہ ہو تو نہ جاؤ

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ (النور ۲۸)

پھر اگر ان گھروں میں کسی کو موجود نہ پاؤ تو اندر نہ جاؤ۔ ہاں اگر تمہیں اجازت دے دی گئی ہو۔

مطلب یہ ہے کہ کسی کے خالی گھر میں جا بیٹھنا جائز نہیں، ہاں اگر گھر والے نے یا اجازت دے رکھی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اجازت نہ ملے تو خوش دلی سے لوٹ آؤ

وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ (النور ۲۸)

اور اگر تم سے یہ کہا جائے کہ واپس ہو جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہی تمہارے لیے پاکیزہ طریقہ ہے۔

یعنی اگر گھر میں مرد موجود نہ ہوں اور گھر میں سے واپس لوٹنے کو کہا جائے یا مرد موجود ہوں لیکن کسی وجہ سے نہ ملنا چاہیں تو جانے والے کو خوش دلی سے واپس آ جانا چاہیے۔ ملاقات سے انکار پر برا ماننا اور وہیں ڈٹ کر کھڑے ہو جانا کہ میں تو مل کر ہی ٹلوں گا صحیح نہیں ہے۔

گھر والوں سے زیادہ سے زیادہ تین بار اجازت لیجیے اور جب تین بار پکارنے پر بھی کوئی جواب نہ آئے یا اجازت نہ ملے تو خوشی خوشی واپس آ جائیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار حضرت سعد بن عبادہ کے یہاں تشریف لے گئے اور السلام علیکم کہہ کر دو بار اجازت چاہی مگر اندر سے جواب نہ آیا۔ تیسری مرتبہ جواب نہ ملنے پر آپؐ واپس ہو گئے۔ حضرت سعدؓ اندر سے دوڑتے ہوئے آئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ! میں آپ کی آواز سن رہا تھا اور جان بوجھ کر آہستہ آہستہ جواب دے رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میرے لیے آپ کی زبان مبارک سے جتنی بار بھی رحمت و سلامتی کی دعا نکل جائے اچھا ہے۔"

رہائش گاہ نہ ہو بلا اجازت جا سکتے ہو

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ (النور ۲۹)

تمہارے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم ایسے گھروں میں بے روک ٹوک چلے جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے کی کوئی چیز ہو۔

یعنی جو مکانات کسی مخصوص شخص کی رہائش گاہ نہ ہوں وہاں تم بے تکلف جا سکتے ہو جیسے مسجد، مدرسہ، مسافر خانہ، ہوٹل، سرائے وغیرہ۔ جہاں لوگوں کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی اور ہر ایک کو جانے کی عام اجازت ہوتی ہے۔

تین وقت گھر کے بچے اور خادم بھی اجازت لیکر داخل ہوں

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (النور ۵۸)

مسلمانو! تمہارے مملوک[1] اور تمہارے وہ بچے[2] جو ابھی عقل کی حد کو نہیں پہنچے ہیں تین اوقات میں یہ لوگ بھی اجازت لے کر تمہارے پاس آیا کریں۔ (۱) صبح کی نماز سے پہلے۔ (۲) اور دوپہر کو جب کہ تم کپڑے اتار دیتے ہو۔ (۳) اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمہارے لیے پردے کے وقت ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ وہ بلا اجازت آئیں تو نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ ان پر۔ تمہیں ایک دوسرے کے پاس (کام کاج کے لیے) بار بار آنا ہی ہوتا ہے۔

گھر کے بچے اور خادم چونکہ کام کاج کے لیے بار بار آتے جاتے رہتے ہیں اس لیے ان پر یہ پابندی نہیں ہے کہ وہ جب بھی گھر میں آئیں اجازت لے کر آئیں، البتہ تین وقتوں میں ان کے لیے بھی لازم ہے کہ اجازت لے کر تمہارے پاس آئیں۔ ان تین وقتوں میں آدمی بالعموم تنہا یا بیویوں کے ساتھ ایسی حالتوں میں ہوتا ہے جن میں گھر کے بچوں اور خادموں کا اچانک آ جانا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ قرآن نے ان اوقات کو عورات سے تعبیر کیا ہے۔ عورت کا

---

[1] یعنی غلام اور باندی، گھر کے دوسرے خادموں کا حکم بھی یہی ہوگا چاہے وہ بالغ ہوں یا نابالغ۔

[2] یہ نابالغ بچے خواہ لڑکی ہوں یا لڑکا۔

لفظ عربی میں اس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جس کا کھل جانا آدمی کے لیے باعث شرم ہو یا جس کا اظہار ہو جانا
کو ناگوار ہو۔

اسی لیے یہ تاکید کی گئی کہ گھر کے بچوں اور خادموں کو یہ تربیت دو اور ہدایت کرو کہ وہ جب ان
اوقات میں تمہارے سونے کی جگہ یا تمہارے تخلیہ کے مقامات میں آنا چاہیں تو لازماً اجازت لے کر آئیں تا
نامناسب حالت میں تم پر ان کی نظر نہ پڑے۔

بالغ بچے بڑوں کی طرح اجازت لیکر آئیں

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور ۵۹)

اور جب تمہارے بچے عقل کی حد کو پہنچ جائیں تو انہیں اسی طرح اجازت لیکر (گھروں میں) آنا چاہیے جس طرح ان کے بڑے اجازت لیتے رہے ہیں۔

بچہ جب تک بالغ نہیں ہے وہ تین اوقات[1] کے علاوہ بے روک ٹوک آ سکتا ہے۔ ہر بار داخل ہو
کے لیے اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں لیکن جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کے لیے وہی حکم ہوگا جو اس
پہلے بالغوں کے لیے بیان ہو چکا ہے، یعنی اجازت لیکر داخل ہوں۔

جو بچے نئے نئے جوان ہوتے ہیں، ان کے معاملے میں عام طور پر لوگ احتیاط نہیں کرتے اور پردے
وہ حدود ملحوظ نہیں رکھتے جو شریعت نے بیان کیے ہیں، اور یہ کہہ کر معاملے کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتے
ارے یہ تو سامنے کا بچہ ہے، ہمارے سامنے ہی تو پیدا ہوا۔ دن بھر گھر میں دوڑا دوڑا پھرتا تھا۔ محلہ کا بچہ۔
یا اگر وہ لڑکی ہے تو ان کے والدین بے احتیاطی برتتے ہیں اور یہ کہتے ہیں، ان کے سامنے کی بچی ہے،
کی گودیوں کی کھلائی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ انتہائی خطرناک غلطی ہے۔

بچہ چاہے محلہ کا ہو یا رشتہ دار کا۔ جوان ہونے کے بعد اگر وہ غیر محرم ہے تو اس سے اسی طرح پر
کرنا چاہیے جس طرح غیر محرموں سے کیا جاتا ہے۔ اور اگر وہ لڑکی ہے تو اس کے معاملے میں تو اور زیادہ
ہونی چاہیے۔

رشتہ داروں سے پردہ

پردے کے احکام و حدود جاننے کے لیے مردوں سے رشتہ کی نوعیت اور تعلق
حیثیت کا جاننا ضروری ہے۔

---

[1] وہی تین اوقات جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ صبح کی نماز سے پہلے، دوپہر، اور عشاء کے بعد

اس لحاظ سے مرد تین طرح کے ہو سکتے ہیں۔

۱۔ وہ اجنبی مرد جن سے عورت کا کوئی رشتہ نہ ہو، ان سے عورت کو مکمل پردہ کرنا چاہیے۔ نہ صرف یہ کہ عورت ان سے اپنا جسم چھپائے بلکہ بلا ضرورت ان کو اپنی آواز بھی نہ سنائے۔

۲۔ وہ محرم رشتہ دار جن سے ابدی حرمت کا رشتہ ہے، ان کے سامنے عورت اپنی پوری زینت کے ساتھ آزادی سے آ سکتی ہے۔ جیسے باپ، بھائی، بیٹا، خسر، بھانجا، بھتیجا، داماد اور رضاعی رشتہ دار وغیرہ اور شوہر سے تو زینت کے چھپانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

۳۔ وہ غیر محرم رشتہ دار جن سے ابدی حرمت کا رشتہ نہیں ہے یعنی جن سے ایک کنواری یا بیوہ کا نکاح جائز ہے۔ یہ نہ تو بالکل اجنبیوں کے حکم میں ہیں کہ ان سے غیروں کی طرح مکمل پردہ کیا جائے اور نہ محرم رشتہ داروں ہی کے حکم میں ہیں کہ ان کے سامنے عورت بے تکلف اپنی زینت کے ساتھ آئے۔ ان سے پردے کے صحیح صحیح حدود کیا ہوں؟ اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے جو رہنمائی ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان سے پردے کے حدود کا تعین فریقین کے حالات، عمر، رشتوں کی نوعیت، ان کا پس منظر اور خاندانی تعلقات وغیرہ کے لحاظ سے ہی ہوگا۔

حضرت اسماءؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی تھیں لیکن آخر وقت تک نبی علیہ السلام کے سامنے آتی رہیں[1]۔ اسی طرح حضرت ام ہانیؓ جو ابو طالب کی بیٹی اور آپ کی چچازاد بہن تھیں ہمیشہ آپ کے سامنے آتی رہیں[2]۔ لیکن اسی کے ساتھ دورِ رسالت کا یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ اپنے بیٹے فضل کو اور آپ کے ایک چچازاد بھائی ربیعہ بن حارث اپنے بیٹے عبدالمطلب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ کہہ کر بھیجتے ہیں کہ اب تم جوان ہو گئے ہو۔ جب تک تمہیں روزگار نہ ملے تمہاری شادیاں نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جا کر روزگار کے لیے کہو۔ یہ دونوں حضرت زینبؓ کے مکان پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ حضرت زینبؓ فضل کی حقیقی پھوپھی زاد بہن ہیں اور عبدالمطلب کے والد ربیعہ بن حارث سے بھی ان کا وہی رشتہ ہے لیکن حضرت زینبؓ ان دونوں کے سامنے نہیں آتیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان کے ساتھ پردے کے پیچھے سے بات کرتی ہیں[3]۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الحج [2] ابوداؤد کتاب الصوم [3] ابوداؤد کتاب الخراج

محرم رشتہ دار محرم رشتہ دار وہ ہیں جن سے ابدی حرمت کا رشتہ ہے۔ قرآن حکیم نے ان سے پردہ نہ کرنے کی اجازت دی ہے۔ یعنی ان کے سامنے عورت اپنی آرائش و زیبائش کے ساتھ آزادی سے آسکتی ہے۔ قرآن حکیم نے ان کی جو فہرست دی ہے اس میں چچا، ماموں، داماد اور رضاعی رشتہ داروں کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فہرست کا جو مطلب سمجھا ہے اور اس سے جو اصول اخذ فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ جن جن رشتہ داروں سے ایک عورت کا نکاح حرام ہے وہ سب اسی آیت کے حکم میں داخل ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے تمام مرد خواہ وہ غیر ہوں یا رشتہ دار ان کے سامنے نہ تو عورت اپنی آرائش اور زیبائش کا اظہار کرے اور نہ ان کے جسم سے اپنا جسم مس ہونے دے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاحیات کبھی کسی عورت کے جسم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آپ عورتوں سے بیعت بھی لیتے تو صرف زبانی عہد و پیمان ہوتا۔

قرآن نے محرم رشتہ داروں کی یہ فہرست النور آیت ۳۱ میں دی ہے۔

شوہر وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ — اور اپنا بناؤ سنگار ظاہر نہ کریں مگر اپنے "شوہر" کے سامنے

عورت کو جن رشتہ داروں کے سامنے اظہار زینت کی اجازت دی گئی ہے ان میں شوہر کا بھی ذکر ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس معاملے میں شوہر اور یہ دوسرے رشتہ دار یکساں ہیں۔ ظاہر ہے عورت جن زینتوں کا اظہار اپنے شوہر کے سامنے کر سکتی ہے دوسروں کے سامنے نہیں کر سکتی۔ پھر شوہر کے سامنے وہ اپنے قصد و ارادے سے ہر طرح کی آرائش و زیبائش کا اظہار کرتی ہے اور شریعت اس کے ارادے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے لیکن دوسرے محرم رشتہ داروں کے سامنے اظہار زینت کی جو اجازت ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ عورت ان کے درمیان بے تکلفی کے ساتھ آزادی سے رہے شریعت اس کو بے جا تکلف اور تنگی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی البتہ شریعت عورت کی فطری حیا کو نشو و نما دے کر اس کے لیے حیا کی فطری چادر ضرور مہیا کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ عورت اس چادر سے ہر موقع پر مناسب کام لے۔

باپ أَوْ آبَائِهِنَّ — یا اپنے "باپ" کے سامنے

آباء کے مفہوم میں دادا، پردادا، نانا، پرنانا سب شامل ہیں۔

خسر أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ — یا اپنے "خسر" کے سامنے

شوہر کے دادا' پردادا اور نانا' پرنانا کا بھی یہی حکم ہے۔

بیٹے اَوْ اَبْنَآءِ ھِنَّ یا اپنے "بیٹوں" کے سامنے

بیٹوں میں پوتے' پرپوتے اور نواسے' پرنواسے سب شامل ہیں اور اس معاملے میں سگے سوتیلے کا بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ نیز داماد کا بھی یہی حکم ہے۔

سوتیلے بیٹے اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِھِنَّ یا اپنے "شوہروں کے بیٹوں" کے سامنے

بھائی اَوْ اِخْوَانِھِنَّ یا اپنے "بھائیوں" کے سامنے

بھائیوں میں سگے' سوتیلے' اور ماں جائے بھائی سب شامل ہیں۔

بھتیجے اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِھِنَّ یا اپنے "بھائیوں کے بیٹوں" کے سامنے

بھائی کے پوتے' پرپوتے اور نواسے' پرنواسے بھی اسی حکم میں ہیں۔

بھانجے اَوْ بَنِیْٓ اَخَوٰتِھِنَّ یا اپنی "بہنوں کے بیٹوں" کے سامنے

بہن کے پوتے' پرپوتے اور نواسے اور پرنواسے کا بھی یہی حکم ہے۔ پھر بھائی یا بہن سے تینوں قسم کے بھائی اور بہن مراد ہیں۔ یعنی اخیافی اور علاتی بہن بھائیوں کا بھی یہی حکم ہے۔

یہاں تک تو محرم رشتہ داروں کا ذکر تھا۔ آگے بعض ان لوگوں کا ذکر ہے جو رشتہ دار تو نہیں ہیں لیکن گھریلو زندگی میں ان سے ہمہ وقتی تعلقات ناگزیر ہیں۔ قرآن نے عورت کو بے جا تنگی میں مبتلا نہیں کیا ہے بلکہ ان کے سامنے بھی اظہارِ زینت کی اجازت دی ہے کیونکہ ان کے سامنے آنے میں پردے کی مصلحتیں مجروح نہیں ہوتیں

میل جول کی عورتیں اَوْ نِسَآءِ ھِنَّ یا اپنی میل جول کی عورتوں کے سامنے

اپنی عورتوں سے میل جول کی وہ عورتیں مراد ہیں' جو جانی پہچانی ہوں' گھر کے کام کاج میں حصہ لینے والی ہوں اور جو باحیا' شریف' پاک باز اور نیک اطوار ہوں۔ ایسی ہی عورتوں سے مسلم خواتین آزادی کے ساتھ بے تکلف ہو سکتی ہیں۔ اور جو عورتیں' آوارہ' بے حیا اور بداطوار ہوں' ان سے مسلمان خواتین کو پردہ ہی کرنا چاہیے۔ رہیں وہ عورتیں جن کے اخلاق و تہذیب کے بارے میں کچھ علم نہ ہو تو ان سے ویسا ہی پردہ ہونا چاہیے جیسا نامحرم رشتہ داروں سے ہوتا ہے یعنی ہاتھ اور چہرے کے علاوہ پورا جسم اور اس کی زینت ان سے چھپانی چاہیے۔

مملوک لونڈی اور غلام اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ یا اپنے مملوک[1] کے سامنے

یعنی وہ لونڈی اور غلام جو عورت کی ملکیت میں ہو۔

زیردست مغفل خدمتگار اَوِ التَّابِعِيْنَ یا ان زیردست مردوں کے سامنے جو

غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

قرآن کے ان الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم مردوں کے سوا عورت جس مرد کے سامنے اپنی آرائش کے ساتھ بے تکلف آسکتی ہے۔ اس میں دو باتیں پائی جانی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ وہ محکوم اور زیردست ہو۔ دوسرے یہ کہ جنسی خواہش نہ رکھتا ہو۔ یعنی وہ سیدھے سادھے بے وقوف مرد جو اپنی محکومی، زیردستی، فقر و مسکنت، بڑھاپے، جسمانی کمزوری یا عقلی فتور کی بنا پر یہ طاقت و ہمت نہ رکھتے ہوں کہ گھر کی خواتین پر نگاہ اٹھا سکیں اور کوئی برا خیال دل میں لاسکیں۔ لیکن اگر کسی مرد میں مردانہ کمزوری کے باوجود جنسی خواہش دبی ہوئی ہو اور وہ عورتوں سے دلچسپی رکھتا ہو تو اس کے سامنے خواتین کو اظہار زینت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مدینے میں ایک مخنث تھا جو گھروں میں آتا جاتا تھا اور خواتین اسے غیر اولی الاربہ میں شمار کرکے اپنے ہاں آنے دیتی تھیں۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلمہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو وہ مخنث حضرت ام سلمہؓ کے بھائی عبداللہ ابن امیہ سے گفتگو کررہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اگر طائف فتح ہوجائے تو غیلان ثقفی کی بیٹی بادیہ کو ضرور حاصل کرنا، اور پھر اس نے بادیہ کے جسم اور حسن کی ایسی تعریف کی کہ اس کے پوشیدہ اعضاء تک کی خوبیاں بیان کر ڈالیں۔ آپ نے سنا تو فرمایا "خدا کے دشمن! تو نے تو اس میں نظریں گاڑ دیں" پھر آپ نے حکم دیا کہ آئندہ یہ گھروں میں نہ آنے پائے اس سے پردہ کرو۔ اس روشنی میں سوچیے تو معلوم ہوگا کہ تہذیب جدید سے متاثر عورتیں جن خانساماں بیروں اور جوان جوان نوکروں کے سامنے آتی ہیں۔ وہ ہرگز قرآنی احکام کا احترام نہیں کرتیں، وہ شریعت کی اتباع میں نہیں بلکہ خواہشات کی اتباع میں لگی ہوئی ہیں۔

نسوانی باتوں سے ناواقف لڑکے اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ یا ان لڑکوں کے سامنے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں (باقی صفحہ ۳۲)

---

[1] حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، مجاہدؒ، حسن بصریؒ اور امام ابوحنیفہؒ مملوک سے صرف باندیاں مراد لیتے ہیں اور ان کے نزدیک غلام سے پردہ کرنا ضروری ہے۔ لیکن حضرت عائشہؓ، ام سلمہؓ اور بعض ائمہ اہل بیت کا مسلک یہ ہے کہ اس سے باندی اور غلام دونوں مراد ہیں۔ ان کے نزدیک عورت غلام کے سامنے اظہار زینت کرسکتی ہے۔

قرآن و سنّت کا اخلاق

ڈاکٹر محمد عبد الحق انصاری ایم اے

"ابتدائے اسلام میں اخلاقی فکر کا ارتقاء" کے عنوان سے ایک قیمتی مقالہ مجلہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں چھپا ہے۔ ہم بشکریہ معاصر اس کا ایک حصہ زندگی میں شائع کر رہے ہیں

(ادارہ)

قرآن و سنت کی نظر میں زندگی دو مرحلوں میں منقسم ہے۔ مگر دونوں مرحلے ایک دوسرے کے ساتھ بے حد مربوط ہیں۔ ایک موت سے پہلے کا مرحلہ اور دوسرا موت کے بعد کا۔ بلاشبہہ موت ایک عظیم تغیر ہے لیکن زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی۔ دوسری زندگی یقیناً ایک نئی زندگی ہوتی ہے لیکن پہلی زندگی کے منافی ہوتی ہے اور اس سے یکسر مختلف۔ دراصل زندگی ایک وحدت اور ایک تسلسل ہے۔ اس وحدت و تسلسل کا تقاضا ہے کہ زندگی کا خیر اعظم نہ صرف اس دنیا سے متعلق ہو اور نہ محض اس دنیا سے بلکہ دونوں کی بھلائی پر حاوی ہو۔ قرآن مجید نے اہل ایمان کو جو تعلیم دی ہے وہ یہ ہے :-

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی	اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی
الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ	عطا فرمائیے اور آخرت میں بھی۔ اور ہم کو آگ
النَّارِ ۝	کے عذاب سے محفوظ رکھیے۔

اس تعلیم نے دنیا کی بھلائی کو بھی مطلوب بنا دیا ہے اس لیے کہ اسلام نے خیر کا جو تصور پیش کیا ہے دنیا کی فلاح اس کا جزو لاینفک ہے۔ قرآن و سنت میں زندگی کے مختلف پہلوؤں (سماجی، معاشی اور سیاسی) کی تعمیر و اصلاح کا جو اہتمام ملتا ہے وہ اس حقیقت پر شاہد ہے۔ اسلامی آئیڈیل کسی ایسے فرد کا آئیڈیل نہیں ہے جو سماج سے الگ رہتا ہو بلکہ ایسے فرد کا ہے جو سماج کا فعال اور سرگرم کارکن ہے۔ انسان کی ذاتی

زندگی اور سماجی زندگی دونوں کو قرآن وسنت میں ایک کل سمجھا گیا ہے۔ چناں چہ قرآن وسنت کا تصور فلاح انفرادی ہی نہیں بلکہ سماجی بھی ہے۔ حیات دنیا میں سماج کی جو اہمیت ہے وہ تو ہے ہی آخرت کی زندگی کا نقشہ بھی جو قرآن وسنت میں ملتا ہے وہ بالکل انفرادی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی سماجی زندگی ہے[1]۔ اسلام میں جو اہمیت سماجی تعلقات، جماعتی فرائض اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور جہاد کو حاصل ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام کا خیر کا تصور اجتماعی ہے۔ سماج سے گریز یا اجتماعی فلاح سے بے تعلقی کو ایک جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس کی اجازت صرف ان انتہائی حالات میں دی گئی ہے جن میں دینی فرائض وارکان کی ادائگی ناممکن ہو جاتی ہے مگر ایسے حالات میں بھی ظلم وفساد کے خلاف جہاد کو رسول اللہؐ نے ہمیشہ عزیمت ہی قرار دیا ہے[2]۔

اگرچہ دنیا وآخرت دونوں کی بھلائی فی نفسہ مقصود ہے لیکن آخرت کی بھلائی کو دنیا کی بھلائی کے مقابلے میں ترجیح حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فلاح دنیا فی نفسہ مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں چند روزہ ہے۔ مزید یہ کہ دنیا کی زندگی دو اعتبار سے محدود ہے۔ ایک یہ کہ اس میں دین کے بہت سے حقائق کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ اس میں اعمال کے پورے نتائج برآمد نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اس دوگونہ حقیقت کے نتیجے میں

---

[1] قرآن مجید واضح طور پر بتاتا ہے کہ ایک خاندان کے افراد آباء، ابناء اور ازواج جنت میں ایک ساتھ رکھے جائیں گے بشرطیکہ وہ صالح ہوں۔ (۱۳: ۲۳، ۴۰: ۸، ۵۲: ۲۱) قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ رفقاء اور اصحاب اجتماعی طور پر رہیں گے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی بغض نہ ہوگا ایک دوسرے کو تحیات پیش کریں گے۔ (۱۵: ۴۵-۴۷) ان کا معاشرہ برائیوں سے پاک اور باہمی الفت ومحبت سے سرشار ہوگا۔ (۷۸: ۳۵، ۵۶: ۲۵-۲۶، ۱۰: ۱۰) چونکہ جنت کی زندگی مثالی زندگی ہوگی۔ لازم ہے کہ اس میں انسان کے سماجی جذبات کی تسکین کا موقع ہو۔

[2] اس مفہوم کی حدیثیں بہت ہیں۔ یہاں صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔ رسول اللہؐ سے سوال کیا گیا کون لوگ سب سے بہتر ہیں؟ فرمایا۔ "وہ جو خدا کی راہ میں جان ومال سے جہاد کرتے ہیں۔" پھر سوال کیا گیا ان کے بعد کون لوگ بہتر ہیں؟ فرمایا وہ لوگ جو تنہا پہاڑوں پر رہتے ہیں اور اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔

(امام نووی، ریاض الصالحین، باب استحباب العزلۃ عند فساد الناس والزمان بحوالہ بخاری ومسلم)

دنیا کی زندگی ایک آزمائش ہے۔ چونکہ انسان کی آزمائش اس میں ہے کہ وہ زمین پر خدا کی خلافت کے فرائض انجام دے اس لیے دنیا کی بھلائی آخرت کی بھلائی کے لیے شرط لازم بن جاتی ہے۔ دنیا کی بھلائی سے بے اعتنائی آخرت کی فلاح کے امکانات ختم کر سکتی ہے۔

قرآن و سنت کے خیر میں جسم و روح دونوں کی رعایت ہے۔ بعد کی فکر نے جسم و روح اور مادی و روحانی خیر میں جو تضاد نمایاں کیا ہے اس کی تائید قرآن مجید سے نہیں ہوتی۔ حسی لذات اور روحانی مسرتیں دونوں ہی خیر کا جز ہیں۔ جسمانی لذتوں میں فی الحقیقت کوئی برائی نہیں ہے۔ دنیا فی نفسہ نہ بھلی ہے اور نہ بری۔ اس کی بھلائی اور برائی اس طریقۂ زندگی پر منحصر ہے جسے انسان اختیار کرتا ہے۔ مسیحیت کا یہ تصور کہ زمین پر انسان کا وجود سقوط کے ہم معنی ہے اور گناہ اول کی سزا ہے اسلامی عقیدے کے منافی ہے۔ قرآن مجید حیات دنیا کی تعمیر اصلاح کو سعادت کا لازمی جزو قرار دیتا ہے۔ اسلام میں نہ ترک دنیا کی کوئی گنجائش ہے اور نہ دنیا کی لذتوں سے بالکل دست کش ہونا جائز۔ قرآن مجید نے رہبانیت کو بدعت قرار دیا ہے[1] اور رسول اللہ نے اسے اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔ "لا رهبانية في الاسلام"[2]

قرآن و سنت نے جو آئیڈیل پیش کیا ہے اس میں انسانی شخصیت کی کسی جز کی نفی نہیں کی گئی ہے عقل و وجدان، ذوق و تخیل، جذبہ و احساس سب کو اس کے صحیح مقام پر رکھا گیا ہے۔ اگرچہ فرد کی زندگیوں میں ان عناصر کی اضافی اہمیت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے لیکن انفرادی حالات اور صلاحیتوں کی رعایت کے باوجود اسلام نے یہ کبھی پسند نہیں کیا کہ ایک جز کو دوسرے جز پر قربان کر دیا جائے یا زندگی کے ایک پہلو کو اس قدر ابھارا جائے کہ دوسرا پہلو کچل کر رہ جائے۔ خدا کے رسول نے اس امر کی طرف خصوصی توجہ فرمائی ہے کہ آپ کے اصحاب زندگی کے کسی پہلو کو ایک خاص حد سے زیادہ نہ دبائیں[3]

اسلامی آئیڈیل میں جذبہ اور عمل، فکر اور احساس، روح اور جسم کا ایک حسین امتزاج ہے۔ مثال کے طور پر محبت کو لیجیے۔ اسلامی آئیڈیل میں حبِ الٰہی کو جو بلند مقام حاصل ہے وہ ظاہر ہے مگر جس محبت کی تعریف قرآن و سنت میں آتی ہے وہ نرا جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ قوت ہے جو ان گوناگوں اعمال کی محرک ہوتی ہے جو اسلام کو پسند اور مطلوب ہیں۔

---

[1] قرآن مجید (۵۷: ۲۷) [2] مسند دارمی باب النکاح۔ [3] امام نووی نے اعتدال و توسط کے ذیل میں بہت سی حدیثیں پیش کی ہیں۔ ریاض الصالحین، باب الاقتصاد فی الطاعۃ

مسلمان کی زندگی ذمہ داری اور جواب دہی کے ایک گہرے احساس سے سرشار ہوتی ہے۔ یہ
کہ ہر فرد کو جسم و دماغ کے ہر فعل کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہونا ہے اس کے شعور پر حاوی رہتا ہے
کے نتیجے میں اس کی پوری زندگی خواہ وہ ذاتی ہو یا سماجی ایک فریضہ بن جاتی ہے مگر مسلمان اس فریضے کو خا
سے ڈالا ہوا ایک بار نہیں سمجھتا بلکہ یہ تو اس کے داخلی احساس ذمہ داری کی ترقی یافتہ اور فعال صورت ہے
انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ناممکن ہے کہ ذمہ داری اور جواب دہی کا یہ گہرا شعور اسلا
تصورِ خیر کو متاثر نہ کرے۔

خدا کے ساتھ انسان کا تعلق اگرچہ بہت وسیع ہے لیکن اس تعلق کا ایک مخصوص پہلو بھی ہے جس میں نما
اور دعا ذکر و فکر وغیرہ اعمال شامل ہیں۔ زندگی کے آئیڈیل میں عام انسانی اخلاق کے علاوہ تعلق باللہ کا یہ
پہلو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان ابتدا میں تعلق باللہ کے مختلف طریقے اخلاقاً واجب سمجھ کر اختیار کرتا ہے
مگر روحانی ترقی کی بلند منزلوں میں یہ طریقے اور اعمال تقاضائے طبیعت بن جاتے ہیں اور جواب دہی اور
کی جگہ ارادت و محبت لے لیتے ہیں۔

قرآن و سنت کے اخلاق کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں اخلاق کے متعین اصول و ضوابط ملتے ہیں!
سے یہ مطلوب ہوتا ہے کہ وہ ان اصولوں کی پابندی کرے۔ بظاہر اس کو اخلاق کا فقہی تصور کہا جا سکتا ہے لیکن
اسلامی اخلاق اس تصور سے بہت مختلف ہے۔ اسلامی اخلاق میں فرد کا محض یہ کام نہیں ہے کہ وہ قرآن و سنت
کے اخلاقی احکام حفظ کرے اور بغیر کسی غور و فکر کے انہیں جوں کا توں اپنے حالات پر منطبق کر دے۔ قرآن و سنت
عموماً جو اخلاقی اصول و ضوابط ملتے ہیں وہ بہت عام ہیں مثال کے طور پر

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ	بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور
وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ	اہل قرابت کو دینے کا حکم دیتا ہے او فحش، منکر
وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ (۱۶ : ۹۰)	اور ظلم سے منع کرتا ہے۔

اس ہدایت پر عمل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان کو مثلاً یہ معلوم ہو کہ عدل کے کیا معنی ہیں۔ اگرچہ فر
کو عدل کے مفہوم کی تعیین میں قرآن و سنت سے بیش قیمت ہدایت ملے گی لیکن بدلتے ہوئے حالات میں عدل
تقاضے معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ غور و فکر کی ضرورت پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ضرورت زندگی کے ارتقاء ا
نئے نئے حالات کے ظہور سے بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ کسی موقع

صحیح طرزِ عمل متعین کرنے کے لیے عموماً کسی ایک اصول سے منطقی استنباط کرنے کا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ مختلف اصولوں کے تقاضوں کو تولنا اور ان کے نتائج کو پرکھنا اور جانچنا پڑتا ہے۔

کسی موقع پر صحیح طرزِ عمل متعین کرنے کے لیے نتائج اور عواقب کو ملحوظ رکھنا قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت مثلاً اس اصول کی نشان دہی کرتی ہے۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ	نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لینا چاہیے
عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ	اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہیے تاکہ پچھتانے اور
مَلُومًا مَّحْسُورًا (۱۷ : ۲۹)	تہی دست ہونے کی نوبت نہ آئے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ متوقع نتائج کی سنگینیت حرام کے ارتکاب کو جائز قرار دے دیتی ہے جیسا کہ بعض شدید حالات میں لحمِ خنزیر یا شراب کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے یا جیسا کہ قتل ناحق کو روکنے کے لیے غلط بیانی کی یا دوسروں کو شر سے محفوظ رکھنے کے لیے غیبت کی یا روایات کی صحت معلوم کرنے کے لیے تجسس کی یا باہمی تعلقات کی اصلاح کے لیے کذب کی اجازت دی گئی ہے[1]

قرآن و سنت کی نظر میں وہ عمل صائب نہیں ہے جو اس کی ہدایت کے بظاہر مطابق ہو بلکہ اس عمل کا محرک بھی صحیح ہونا ضروری ہے۔ "انما الاعمال بالنیات" مشہور حدیث ہے۔ وہی اعمال حقیقت میں صائب اور حسن ہیں جو خدا کی رضا کے لیے کیے جائیں لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر نیت درست ہو تو اعمال بھی لازماً صحیح ہوں گے۔ نیت کی صحت کے ساتھ عمل کا اخلاقی اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس دوسری شرط کی ایک شق یہ بھی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ عمل اپنے نتائج اور عواقب کے اعتبار سے صائب اور حسن ہو۔ رضائے الٰہی کے صحیح معنی اور عام اخلاقی محرکات سے اس کا تعلق وغیرہ ایسے سوالات ہیں جو اگرچہ قرآن و سنت کے اخلاقی نظریہ کے فہمِ کامل کے لیے نہایت ضروری ہیں مگر ان پر گفتگو کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

اعمال کی ذمہ داری کے بارے میں قرآن مجید کا نظریہ قابلِ تحقیق ہے۔ اشاعرہ کسی فعلِ حسن کے سلسلے میں انسان کو

---

[1] اضطرار کی حالت میں لحمِ خنزیر کے استعمال کی اجازت قرآن مجید میں ہے۔ (۶ : ۱۴۶ ؛ ۵ : ۳ ؛ ۲ : ۱۷۳) شراب کے استعمال کی اجازت فقہ کا مشہور مسئلہ ہے۔ ناحق قتل سے بچانے کے لیے جھوٹ کی اجازت کے لیے ملاحظہ ہو امام غزالی۔ احیاء العلوم دار الکتب العربیۃ الکبریٰ ۳ : ۱۱۹-۱۲۱ اور امام نووی۔ ریاض الصالحین، باب بیان ما یجوز من الکذب۔ غیبت کے جائز مواقع کے سلسلے میں ملاحظہ ہو ریاض الصالحین، باب بیان ما یباح من الغیبۃ

اس لیے ذمہ دار سمجھتے ہیں کہ شرع نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔ معتزلہ انسان کو اس لیے ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ یہ عقل کا حکم ہے۔ دونوں گروہوں کے نظریات ان کے مابعد الطبیعیاتی اور دینی تصورات سے اس قدر مربوط ہیں کہ آزادانہ طریقے سے اس سوال پر قرآن وسنت کا موقف متعین نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر قرآن مجید کی آیات دونوں ہی خیالات کی تائید کرتی ہیں اور غالباً صحیح نظریہ ان دونوں نظریات کا امتزاج ہوگا۔ ایسی آیات تو بے شمار ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں اور فلاں عمل کو واجب قرار دیا ہے اور فلاں عمل یا شے کو حرام کر دیا ہے۔ دوسرے نظریے کی تائید میں یہ آیت بہت واضح ہے وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ (۷۵ : ۲) نفس لوامہ یا ضمیر کے وجود کی تصدیق سے یہ بات لازم آتی ہے کہ انسان کے اندر ایک قوت ایسی ہے جو شر کے ارتکاب پر ملامت کرتی ہے اور جب شر پر ملامت کرتی ہے تو خیر کا حکم بھی دے سکتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت کے چند آیات کے بعد ہی یہ آیت ملتی ہے۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝ (انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ رکھتا ہے اگرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے۔)

خیر و شر، صائب و غیر صائب کے علم کے بارے میں بھی قرآن مجید کا نقطۂ نظر اشاعرہ اور معتزلہ کے نظریات کے درمیان معلوم ہوتا ہے۔ حسن و قبح کے علم کا انحصار نہ تو محض شرع پر ہے اور نہ عقل ہی ان کے ادراک کے لیے کافی ہے۔ قرآن وسنت کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں اشاعرہ کے اس نظریے کی تائید کی ضرورت نہیں ہے کہ بعض حسن و قبح کا علم شرع سے ہوتا ہے۔ مگر معتزلہ کی اس رائے کے حق میں کہ بعض حسن و قبح کا علم عقل سے ہوتا ہے صرف دو آیتیں پیش کی جا رہی ہیں۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝	قسم ہے (انسان کے) نفس کی کہ اسے درست
فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ (۹۱ : ۷-۸)	بنایا اور اس کو اس کی نیکی اور بدی الہام کر دی

ایک حدیث بھی اسی نظریے کی تائید میں بہت واضح ہے۔

يَا وَابِصَةُ اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے
اسْتَفْتِ نَفْسَكَ الْبِرُّ مَا اطْمَاَنَّ اِلَيْهِ	وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کرو اور اپنے نفس سے
الْقَلْبُ وَاطْمَاَنَّتْ اِلَيْهِ النَّفْسُ وَالْاِثْمُ	فتویٰ لیا کرو نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں
مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ وَتَرَدَّدَ فِي	طمانیت پیدا ہو اور گناہ وہ ہے دل میں کھٹکے

النَّفْسِ وَإِنْ أَفْتَاكَ النَّاسُ — اور نفس کو اضطراب میں ڈال دے اگرچہ لوگ
(مسند احمد بن حنبل ۴: ۲۲۸) — تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں۔

ان دونوں نظریات کی تطبیق کے لیے یہ حدیث قابلِ غور ہے :۔

ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے ایک مثال بیان کی ہے ایک راستہ سیدھا ہے اور اس کے دونوں طرف دیواریں ہیں اور دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں اور دروازوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور راستے کے سرے پر ایک داعی کھڑا ہوا ہے جو پکار کر کہتا ہے، سیدھے راستے پر چلے جاؤ، اِدھر اُدھر منہ نہ کرو۔ اور اس داعی کے علاوہ ایک داعی اور ہے جب کوئی بندہ ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولنا چاہتا ہے تو دوسرا داعی پکار کر کہتا ہے کہ افسوس ہے تجھ پر اس کو نہ کھول۔ اگر تو اس کو کھولے گا، اس کے اندر داخل ہو جائے گا۔

یہ مثال بیان کر کے اس کی تفسیر اس طرح فرمائی : سیدھا راستہ تو اسلام ہے اور دیواروں کے دروازوں سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں خدا نے حرام قرار دیا ہے اور ان کے پردوں سے مراد اللہ کے حدود ہیں اور وہ داعی جو راستے کے سرے پر کھڑا ہے۔ قرآن ہے اور وہ دوسرا داعی اللہ کا واعظ ہے جو ہر مومن کے دل میں موجود ہے۔ (مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ احمد ترمذی اور بیہقی)

انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اس حقیقت کی وضاحت مختلف آیات میں کی گئی ہے :۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (۷۴: ۳۸) — ہر شخص اپنے اعمال کے بارے میں ماخوذ ہوگا۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ إِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۴۰: ۱۷) — آج ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے گا آج (کسی پر) کوئی ظلم نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

انسانی ذمہ داری کے اس نظریے کے خلاف بعض گروہوں نے قرآن مجید کی وہ آیات نقل کی ہیں جن میں خدا کی غیر محدود قدرت کا ذکر آیا ہے مگر اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہییں۔ یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت والی آیات انسانی ذمہ داری کی تائید کرنے والی آیات سے متضاد ہیں زیادہ سے زیادہ ایک استخراجی نتیجہ ہے۔ قرآن مجید نے اعمال انسانی کی ذمہ داری کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کی ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب کبھی انسانوں نے اپنے اعمالِ بد کی ذمہ داری خدا پر ڈالی ہے اور اس کے لیے خدا کے غیر محدود علم و

قدرت کا سہارا لیا ہے تو اللہ نے اس عمل کو محض تخمین اور اٹکل ہی قرار دیا ہے ۔

سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ کَذٰلِکَ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ حَتّٰی ذَاقُوْا بَاْسَنَا قُلْ ھَلْ عِنْدَکُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْہُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ٥

(۶ : ۱۴۹)

جن لوگوں نے شرک کا رویہ اختیار کیا ہے وہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ کسی چیز کو (اپنی رائے) سے حرام ٹھہراتے سو (دیکھو) اسی طرح ان لوگوں نے بھی (سچائی کو) جھٹلایا تھا جو ان لوگوں سے پہلے گزر چکے ہیں یہاں تک کہ انہیں (بالآخر) ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا (اے پیغمبر!) تم کہو کہ کیا تمہارے پاس علم کی روشنی ہے جسے ہمارے پاس پیش کر سکتے ہو؟ اصل یہ ہے کہ تم پیروی نہیں کرتے ہو مگر وہم اور اٹکل کی اور تم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو کہ بے سمجھے بوجھے باتیں بنانے والے ہو۔

قرآن و سنت کے اخلاق کے یہ چند بنیادی نکات ہیں۔ رسول خدا کی زندگی اس آئیڈیل کی کامل تصویر تھی آپ نے قرآن مجید کے اخلاقی اصولوں کو زندگی کے سارے شعبوں میں نافذ فرمایا۔ ذاتی زندگی ہو یا سماجی، قومی مسائل ہوں یا بین الاقوامی، آپ نے ان اصولوں پر ان کی نئی تشکیل کی ۔

بقیہ "پردہ") یعنی وہ کم عمر لڑکے جن میں ابھی صنفی احساسات بیدار نہ ہوئے ہوں، اس تعریف کی رو سے خواتین صرف انہی لڑکوں کے سامنے زینت و زیبائش کے ساتھ آسکتی ہیں جن کی عمر دس بارہ برس سے زیادہ نہ ہو اس سے زیادہ عمر کے لڑکے اگرچہ بالغ نہ ہوں لیکن ان میں جنسی احساسات بیدار ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور ان کے معاملہ میں احتیاط برتنا ضروری ہے ۔

جنّت، جہنّم اور تناسُخ

(ہندوستان کی قدیم مذہبی کتابوں میں۔)

جناب سلطان مبین صاحب ایم اے (سنسکرت)

عالم اجداد میں زندگی کے بارے میں آرین لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد "پتر لوک" جاتا ہے۔ آگ کی وساطت سے مردہ کو اس دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ وہاں "یم" کی نگرانی میں پتر اجداد راحت کی زندگی گزارتے ہیں۔ یگیہ و نذر کے موقع پر اجداد دیوتاؤں کے ساتھ یگیہ کی سرزمین پر آتے ہیں اور نذر تناول کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ اپنی شہرت و رواج کی وجہ سے کسی شہادت کا محتاج نہیں۔ بعض تشریحوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گنہگار تاریک اور اندھیری دنیا میں سزا پاتے ہیں۔ ویدوں میں بہشت کا عقیدہ قدرے روشن نمایاں ہے۔ البتہ دوزخ کا عقیدہ دھندلا ہے۔ مگر بعد کے ادب میں بہشت و دوزخ کا عقیدہ اتنا ابھر آتا ہے کہ خدا پرست ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ الہامی عقیدہ کہاں سے آیا ہے۔ ویدوں میں اس کے آثار ضرور ہیں مگر بہشت و دوزخ کے عقیدے کو وہیں پوری قوت کے ساتھ نمایاں ہونا چاہیے تھا۔ آخر وہ مہابھارت اور پورانوں میں کیوں ایمانیات کے ستون اور زندگی کی روشنی کے مینار بنے۔ یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ویدوں میں عقیدہ آخرت پر زندگی کی تعمیر کی کوشش کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ جبکہ مہابھارت اور پورانوں میں اس کی صریح کوشش کی گئی ہے۔ زاویۂ نظر کی اس تبدیلی کو ہم کسی گم نام رسول کی کوششوں کا نتیجہ کہنے کے لیے مجبور ہیں۔ حضرات بدھ و مہابیر کی تعلیمات کی طرف جنت و جہنم کو منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ ان کا انکار تردید ذات باری بھلا جنت و جہنم کے متحمل کیونکر ہو سکتے ہیں۔ بلاشبہ ہم بدھ کے مقدس ادب "پٹک" میں جنت و دوزخ کی بڑی دل گداز تفصیل پاتے ہیں۔ مگر بدھ مذہب کے مزاج شناس بودھی متکلمین و عقلاء اس کو نتیجہ تحریف بتاتے ہیں۔

واقعہ یوں ہے کہ تناسخ اور جنت وجہنم کے عقائد ایک دوسرے سے متناقض ہیں۔ تناسخ کا عقیدہ زیادہ تر ملحد فلسفیوں کا عقیدہ ہے اور جنت وجہنم وحی والہام کا نتیجہ ہے۔ ملحد فلسفی نہایت آسانی سے یہ کہہ لیتے تھے کہ جس طرح پانی اور مٹی کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ سورج اور ستارے اگتے اور ڈوبتے رہتے ہیں۔ اسی طرح انسان قالب بدلتا رہتا ہے اور جسم بدلتا رہتا ہے۔ زندگی کا یہ ایک طبعی عمل ہے۔ انسانی زندگی پر بھی یہی قانون لاگو ہے۔ تناسخ کی اس تشریح نے بڑے بڑے خدا ترس لوگوں کو گم راہ کر دیا اور جنت وجہنم کے ماننے والے اس تشریح کے سامنے سپر انداختہ ہو گئے اور انھوں نے اس کو قبول کر لینے ہی میں خیر سمجھی۔

اگر آپ ذرا بھی غور کریں گے تو اس نتیجے پر فوراً پہنچ جائیں گے کہ ایک بڑے سے بڑا گنہگار وسفاک زیادہ سے زیادہ جانور، کیڑا اور مگھس پات ہو کر آخر اپنے کیے کی کیا سزا پاتا ہے؟ یہ عقیدہ تو زندگی کو بے باک و سرمست بنانے کے لیے شیطان نے سجھایا ہے۔ تناسخ ہمارا بگاڑ ہی کیا سکتا ہے۔ کوئی بھی جنم پا کر ہم حواس شکم اور صنفیات کی لذتوں سے بے بہرہ نہیں ہو سکیں گے۔ اس طرح تناسخ ہماری زندگی کو غیر سنجیدہ بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔

ہندوستان میں بھی جنت وجہنم اور تناسخ کو متضاد سمجھا جاتا رہا ہے۔ ویدوں میں جنت وجہنم کے آثار ہم واضح طور پر پاتے ہیں مگر تناسخ کا نشان وپتہ یکسر نہیں ملتا۔ خوش قسمتی سے ہم کو رامائن کا ایک سیاق ایسا مل سکا ہے جس سے ان دونوں کے تضاد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پھر اس تضاد کو شری سوامی دیانند جی نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ آنجہانی تناسخ پر ایمان رکھتے تھے اور جنت و دوزخ کا مذاق اڑاتے تھے۔ آج کل کے بڑے بودھی فاضل شری راہل جی بھی اپنے "پٹک" کے مقدمے میں عقیدہ تناسخ کی وکالت فرماتے ہیں۔ اور بودھ ادب میں پائی جانے والی جہنم وجنت کی تفصیلات کو تحریف واضافہ بتلاتے ہیں۔ (دیکھیے ستیارتھ پرکاش مصنفہ سوامی دیانند جی اور مقدمہ ہندی ترجمہ ہنے پٹاک وجھم لکائے مترجمہ راہل سنکر اپن)

ذیل میں متذکرہ رامائن کا سیاق دے رہا ہوں۔ مندرجہ سطور اس وقت کی ہیں جب شری رام چندر جی کو لوٹانے کے لیے وشوامتر رشی اور جابالی رشی بھرت جی کی معیت میں گئے۔ جابالی رام چندر جی کے سامنے زندگی کی دنیا دارانہ تشریح کرتے ہوئے آں جناب کو لوٹنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اجودھیا کانڈ، رامائن ۱۰۸: ۲۔

۲۔ رام آپ ذہین اور معزز شخص کا ذہن معمولی آدمی کے ذہن کی طرح نہ ہو۔ رامائن: اجودھیا ۱۰۸: ۲

۳۔ کون شخص کس کا بھائی ہے۔ کون کس کا قرابت دار ہے۔ آدمی تنہا پیدا ہوتا ہے اور تنہا مر جاتا ہے۔

۴۔ اس لیے ماں باپ سے جو دل لگاتا ہے اس کو پاگل سمجھنا چاہیے۔ کوئی کسی کا نہیں ہے۔

۵۔ جیسے دوسرے گاؤں کو جانے والا آدمی باہر قیام کرتا ہے۔ اس قیام گاہ کو چھوڑ کر دوسرے دن کوچ کر جاتا ہے [1]

۶۔ اس طرح آدمیوں کے ماں باپ گھر اور دولت صرف سرائے ہی ہیں۔ رام بھلے آدمی یہاں نہیں لگاتے۔

۷۔ بہترین انسان! باپ کی سلطنت کو چھوڑ کر تکلیف دہ ویرانے اور ناہموار خارزار میں قیام کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔

۸۔ بھری پری اجودھیا میں خود کو تخت نشین کریں۔ وہ نگری موکشادہ (عورت کی طرح) آپ کا انتظار کر رہی ہے

۹۔ شہزادے! آپ اجودھیا میں شاہانہ عیش و عشرت سے محظوظ ہوتے ہوئے جنت میں اندر کی طرح زندگی گزاریں۔

۱۰۔ دشرتھ آپ کے کچھ نہ تھے۔ آپ بھی ان کے کچھ نہ تھے۔ وہ غیر تھے۔ آپ غیر ہیں۔ اس لیے وہ کریں جو کہا جاتا ہے

۱۱۔ باپ صرف تخم ہی ہے۔ جانداروں کا نطفہ و خون حائضہ کے ملنے کے ملنے سے آدمی کی پیدائش ہوتی ہے۔

۱۲۔ راجہ وہاں چلے گئے جہاں ان کو جانا تھا۔ جانداروں کی یہی فطرت ہے۔ آپ فضول ہی تکلیف اٹھاتے ہیں۔

۱۳۔ جو لوگ دولت اور دھرم کے لیے کوشاں ہیں ان پر مجھے ترس آتا ہے۔ وہ تکلیف جھیلتے ہیں اور مر کر بربادی پاتے ہیں [2]

۱۴۔ یہ مردہ آدمی آٹھواں (تیجہ، دسواں، چہلم کی طرح) سے خداوند اجداد میں جا ملتا ہے۔ یہ اناج کا اسراف ہے۔ مردہ بھلا کیا کھائے گا۔

۱۵۔ اگر دوسرے کا کھایا ہوا دوسرے کے جسم میں جاتا ہے تو پردیس جانے والے کے لیے "نذر" دے دینی چاہیے اور اس کے لیے زادِ راہ کی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔

۱۶۔ ذہین آدمیوں نے خیرات کی تعریف میں کتابیں لکھی ہیں کہ یگیہ کرو، دان دو، برت رکھو، تپ کرو اور گھربار چھوڑ دو

---

[1] مقابلہ کیجیے:۔ آدمی جس طرح پرانے کپڑوں کو چھوڑ کر دوسرے نئے کپڑے پہن لیتا ہے۔ اسی طرح روح پرانے جسم کو چھوڑ کر نئے جسم کو قبول کر لیتی ہے۔ گیتا: ۲ : ۲۲

[2] شلوک ۳، ۴، ۵، ۶، ۱۰، ۱۱ اور ۱۳ الحاد اور رہبانیت دونوں کی ترغیب کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ دونوں طرز زندگی کی دو انتہائی حدیں ہیں۔ مگر کیا الحاد و رہبانیت میں حد مشترک بھی ہے؟

وہ خدائے تعالیٰ نہیں ہے یہ ذہن میں بٹھالو۔ جو سامنے موجود ہے اس کو بر تو غیب کو پیٹھ پیچھے ڈال دو۔

مذکورہ بالا شلوک ۵، ۶ میں اگر تناسخ کی طرف اشارہ ہے تو پھر اس عقیدے سے دنیاداری کو خدا ملتی ہے۔ پھر تناسخ پر الحاد کی اتنی بڑی چھاپ پڑی ہے کہ بھاگوت پران یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ بھاگوت: ۳: ۳۰: ۴

۴۔ اس دنیا میں جاندار جیسے جس جنم میں جاتا ہے اس اس جنم میں وہ مسرت پاتا ہے اور اس سے اچاٹ نہیں ہوتا۔ بھاگوت: ۳: ۳۰: ۴

۵۔ خداوند کی مایا (فریب) سے دوزخ کی خوشیوں پر ریجھا ہوا، دوزخ میں پڑا ہوا آدمی اپنے جسم کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ : ۳: ۳۰: ۵

عوام جہنم و جنت اور برے جنم اور بھلے جنم کو مترادف سمجھ کر اس تضاد کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ متقدمین جنت کو عارضی اور مکتی کو دائمی مانتے ہیں۔ مگر ہر سال کنوار کے مہینے میں "پتر پکش" میں پتروں کو پانی اور کھانے کی نذروں کا تحفہ اور پندرہویں کو "پتری وسرجن" "وداع اجداد" کی تقریبیں تناسخ کے عقیدے کی تکذیب اور ویدوں کے عالم اجداد کی تصدیق کرتی ہیں۔ غرض خدا پرستی اور دنیاداری کے ان دونوں عقیدوں میں فرق و تضاد کو بھلا کر دونوں کو ایک ہی لڑی میں سمونے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ امتزاج اضداد کی پہلی مثال ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم صرف گیتا کے حوالے پر اکتفا کرتے ہیں۔ شری کرشن جی ارجن کو لڑائی پر آمادہ کرنے کے لیے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

روح جس طرح اس جسم میں بچپن، جوانی اور پیری کو پہنچتی ہے۔ اسی طرح وہ دوسرے جسم کو پالیتی ہے سمجھدار یہاں فریب نہیں کھاتا۔ گیتا[1]: ۲: ۱۳

آدمی جس طرح پرانے کپڑوں کو چھوڑ کر دوسرے نئے کپڑے پہن لیتا ہے۔ اس طرح پرانے جسم کو چھوڑ کر نئے جسم کو قبول کر لیتی ہے۔ گیتا[2] ۲: ۲۲

ارجن! خوش قسمت کشتری ہی ایسی لڑائی کا موقع پاتے ہیں جو کہ خود بخود قریب آگئے ہوئے جنت کا دروازہ ہے۔ گیتا[3]: ۲: ۳۲

تو (لڑائی میں) مر کر جنت کو پائے گا۔ فتح پانے پر زمین سے بہرہ ور ہوگا۔ اس لیے ارجن! جنگ کا فیصلہ کر کے اٹھو۔ گیتا[4]: ۲: ۳۷

---

[1] مہابھارت بھیشم پرب ۲۶: ۱۳، [2] ۲۶: ۲۲ [3] ۲: ۳۲، [4] ۲: ۳۷

ہر چند کہ ہندو مذہب کے ادب میں جزا و سزا اور جنت و جہنم کے آثار و شواہد بکثرت موجود ہیں جنت جہنم کا جادو بدھ ادب کے سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ شاید ہندو اور بدھ مذہب دونوں نامۂ اعمال تک کے قائل نظر آتے ہیں۔ مگر قیامت کے عقیدے کو فلسفیانہ تعبیر میں پھنس کر بھلا دیا گیا ہے۔ ہندو مذہب میں "پرلے" سے وہ مفہوم مراد نہیں ہے جو اہل کتاب اور اہل اسلام قیامت 'حشر و نشر' سے مراد لیتے ہیں۔ ہندو ادب میں "پرلے" (प्रलय) ایک منطقی ضرورت ہے۔ عالم کی قوتوں میں جب پژمردگی اور اضمحلال آ جائے گا تب تمام عالم ذرات کی شکل میں بدل جائے گا کہیں سیلاب یا آگ سے بھی فنا کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس طرح جملہ اجسام ذرات میں تحلیل ہو جائیں گے۔ زندگیاں چشمۂ حیات میں مل جائیں گی۔ ارواح روح اعظم میں جذب ہو جائیں گی جیو آتما پرماتما میں مل کر فنا ہو جائیں گے۔ بندہ خدا سے مل جائے گا۔ اس طرح زندگی کی سبھی حدود و قیود مٹ جائیں گے اور خود زندگی بھی فنائے محض کے گھاٹ اتر جائے گی۔ پرلے کی یہ تعبیر بھی الحاد کی ایک خوشگوار تھپکی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ سورگ، نرک، پرلے اور آواگون کو یک جا جمع کرنا بہرحال امتزاج اضداد ہی قرار دیا جائیگا۔

ایک ضروری اعلان

گزشتہ شماروں میں یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ اکتوبر ۱۹۶۶ء سے ماہنامہ زندگی کا سالانہ چندہ چھ روپیہ اور فی شمارہ ساٹھ پیسے ہوگا۔ یہ ستمبر ۱۹۶۶ء کا شمارہ ہے اس لیے آئندہ اکتوبر ۱۹۶۶ء کے شمارے سے زندگی کا سالانہ چندہ چھ روپیہ اور فی شمارہ ۶۰ پیسے کر دیا گیا ہے۔ ایجنٹ حضرات اور انفرادی خریدار مہربانی کرکے اس کو نوٹ کرلیں۔

منیجر ماہنامہ "زندگی" رام پور۔ یوپی

شرائط ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم پانچ رسائل پر دی جائے گی۔

۲۔ رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں۔ اگر فروخت نہ ہوئے تو واپس نہیں لیے جائیں گے۔

۳۔ کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا۔ البتہ پچاس یا زائد رسالوں کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی ہوگا۔

۴۔ رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری یا وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔

۵۔ رقم بہرحال پیشگی آنی چاہیے یا پھر وی پی بھیجنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی کے مصارف زیادہ ہوں گے۔

منیجر رسالہ "زندگی" رام پور۔ یوپی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

ترجمہ سید احمد قادری

گمراہ صوفیوں کی اصلاح

مقصد تک پہنچنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ انسان اس راستے کو جانتا پہچانتا ہو جس پر چل کر مقصد تک پہنچا ہے۔ دوسری یہ کہ عملاً رہروی اختیار کرے اور اس راہ پر چل پڑے۔ رہروی کا طریقہ کیا ہو یہ بھی راہ دانی و راہ شناسی میں داخل ہے۔ اس لیے کہ جس نے راہ دکھائی ہے اس نے رہروی کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ مقصد تک پہنچانے والی راہ کو راہ راست ہونا چاہیے تاکہ وہ یقین کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچائے اور بسرعت و بسہولت پہنچائے۔ ٹیڑھے راستے میں طرح طرح کی آفت و مصیبت بھی ہے اور یہ یقین بھی نہیں کہ وہ منزل تک پہنچا دے گا۔

راہِ راست' اللہ کی عبادت ہے | قرآن مجید کی نص نے بتا دیا ہے کہ راہِ راست عبادت ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْهُ — اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ○ — بھی ہے لہٰذا اسی کی بندگی کرو یہی سیدھا راستہ ہے

اگر کوئی شخص عبادت کے سوا کسی اور چیز کو راہ راست سمجھتا ہے تو غلط سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو ضلالت و الحاد کے بھنور میں ڈالتا ہے۔ راہ دکھانے والے اور اس پر چلنے کا طریقہ بتانے والے اللہ کے رسول ہیں۔ (ان کی پاک ارواح پر' ان کے مقدس اہلِ بیت پر اور ان کے عالی قدر صحابہ پر سو ہزار درود و سلام) دوسرے تمام لوگ ان کی پیروی کرنے والے ہیں۔ جس نے ان کی پیروی کی اور ان کی ہدایات و تعلیمات پر چلا وہ منزل مقصود تک پہنچا۔ باقی تمام چیزیں گمراہی اور محل خوف و خطر ہیں۔

کسانے کہ زیں راہ برگشتہ اند — برفتند و بسیار سرگشتہ اند

جو لوگ اس راستے سے برگشتہ ہو گئے ہیں انہیں دوسری راہوں میں سرگشتگی و گمرہی کے سوا کچھ نہیں ملا ہے

ہمارے زمانے کے صوفیوں کی اصل آفت | ہمارے زمانے کے سالکوں اور صوفیوں کی آفت یہ ہے کہ

وہ راہ راست سے ناواقف ہیں۔ اتباع شریعت کی اصل راہ پر نہیں چل رہے ہیں، وہ نئے نئے طریقوں پر عمل پیرا اور نئی نئی راہوں کے مسافر ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ ان میں کے بعض جہالت اور محض اپنے میلان طبع کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ اشتباہ والتباس میں گرفتار ہیں۔ کچھ لوگوں پر سکر اور غلبۂ حال کی کیفیت طاری ہے اور بعضوں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ اگلوں نے اپنے امراض کے علاج کے لیے کچھ طریقے جاری کیے تھے جو اسی وقت کے ساتھ مخصوص اور انہیں کے مناسب حال تھے لیکن پچھلوں نے ان طریقوں کی اتباع و پیروی کو لازم قرار دے کر یہ اعتقاد جما لیا کہ طاعات و عبادات اور شریعت کے احکام ظاہر کے مشغلے اور ارباب ظاہر کی عادتیں ہیں، درویشوں کی مشغولیاں دوسری ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ یہ تمام عبادات و احکام عوام کی ہدایت کے لیے ہیں اور خواص کا طریقہ ان سے الگ ہے۔ کہتے ہیں کہ نماز، روزہ بیوہ عورتوں کا کام ہے، مردوں کا کام کچھ اور ہے۔ ان نادانوں کی غلطی اور غفلت کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے کہ یہ تمام مشغلے اور یہ تمام کام کس کے بیان کردہ اور کس کے مقرر کردہ ہیں اور ان کے نتائج و فوائد کیا ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ انبیاء علیہم السلام بالخصوص سید المرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیہم کی بعثت کا مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل ہے۔ وہ اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ خلق خدا کی ہدایت کریں اور بندگان خدا کو صلاح و فلاح کی سیدھی راہ دکھائیں۔ ان حضرات نے جو افعال و اعمال کیے ہیں اور جو راستے دکھائے ہیں اگر وہ خدا تک پہنچانے والے اور اس سے قریب کرنے والے نہیں ہیں تو پھر دوسرا کون سا راستہ ایسا ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ایسے لوگ کہاں اور کتنے ہیں؟ جو ان افعال و اعمال کو تمام شرط و حدود اور مشاہدہ و مراقبہ کے ساتھ انجام دیں جیسا کہ فرمایا گیا ہے۔ الاحسان ان تعبد ربک کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (احسان یہ ہے کہ تم اپنے رب کی اس طرح عبادت کرو جیسے اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے) اس راہ کو ان کی تعلیم کے مطابق طے کرنے والے کتنے ہیں؟

عبادات سے اعراض کی ایک اور وجہ

اہل بطالت نے یہ عبادتیں شرائط و حدود کے ساتھ ادا نہ کیں اس لیے ان کے نتائج و ثمرات سے محروم رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ان عبادات ہی کے بارے میں سست اعتقادی، تردد اور انکار کی روش اختیار کر لی اور ابدی محرومی کے گڑھے میں جا گرے۔ ان کوتاہ نظروں کو چاہیے کہ اگر وہ اپنی کوتاہی کی وجہ سے اس دنیا میں عبادات کے انوار و تجلیات سے محروم رہ گئے ہیں تو کم سے کم دائرۂ ایمان سے خارج نہ ہوں، ان کو جاننا چاہیے کہ یہ عبادتیں

کس کی مقرر کی ہوئی ہیں اور آخرت میں ان کا بدلہ اور نتیجہ کیا ہے ۔ قرآن کہتا ہے ۔

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (السجدہ)

(رات کو نماز کے لیے) ان کے پہلو بستروں سے الگ ہوتے ہیں وہ اپنے رب سے خوف و امید کے ساتھ دعا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں تو کوئی بھی نہیں جانتا کہ لوگوں کے اعمال کے بدلے میں کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لیے پردۂ غیب میں موجود ہے ۔

جنت کی تمام نعمتوں کو اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اعمال ہی کی جزا قرار دیا ہے ۔ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

ایک ایمان افروز نکتہ عزیزمن! اصل چیز ایمان و عمل ہے ۔ یہی چیز اس دنیا میں فضائے دل کو روشن کرتی عبادت گزار کو عبادتوں کا لذت شناس بناتی، اس کے سامنے بہشتی نعمتوں کے نمونے پیش کرتی ۔ مولیٰ تعالےٰ کا مشاہدہ کراتی اور ذوق و شوق میں بصیرت پیدا کر کے ظلمت کفر کو محو کرتی ہے اور پھر یہی نور اُس عالم (آخرت) میں مکمل تر، وسیع تر اور لطیف تر ہو کر وہاں کے ملک بے پایاں اور فضائے بے کراں پر محیط ہو جائے گا ۔ عبادت گزار عیاناً نعیم جنت سے ہم کنار ہو کر خدائے بے مثل و بے نظیر کو سر کی آنکھوں سے دیکھے گا حجاب درمیانی اٹھ جائے گا اور کوئی پردہ باقی نہ رہے گا ۔

دوسری غلطی دوسری غلطی جو ان خطا کاروں کی وہ یہ ہے کہ انھوں نے آغاز عمل کو ایمان کامل پر موقوف کر دیا ہے ۔ کہتے ہیں کہ جب تک یقین حاصل نہ ہو جائے کہ ان اعمال کی حقیقت کیا ہے ہم عمل نہیں کریں گے ۔ جہل و نادانی کے دیو نے ان کی راہ ماردی ہے اور یہ ظلمت و بطالت کی قبر میں بے کار و معطل پڑے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں ۔ اس صورت میں نہ عمل ہوگا اور نہ ایمان خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ○ (دُنیا میں بھی گھاٹا اور آخرت میں بھی، یہ کھلا ہوا گھاٹا ہے) یہ نہیں جانتے کہ ایمان کی نورانیت عمل سے قوت حاصل کرتی ہے جس طرح توفیق عمل ایمان سے بڑھتی ہے ۔ ہر دو نور ایک دوسرے کے عکس گیر اور لازم و ملزوم ہیں ۔ اور فی الحقیقت نور ایک ہی ہے ۔ دل میں ہو تو تصدیق، زبان پر آئے تو اقرار

ور اعضاء و جوارح میں سرایت کرے تو عمل۔ نُورٌ عَلٰی نُورٍ یَہْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَاءُ (نور بالائے نور۔ اللہ جس کی چاہتا ہے اپنے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

صحیح طرزِ عمل

پہلے اسی اجمالی و تقلیدی ایمان کے ساتھ عمل شروع کرنا چاہیے اور بساطِ توفیق پر قدم رکھنا چاہیے تاکہ رفتہ رفتہ پورا وجود نورانی ہو جائے اور ظلمتِ تقلید نورِ تحقیق سے بدل جائے اور ایمان کی تفصیلی صورتیں پردۂ اجمال سے جلوہ گر ہو جائیں۔

بات ضبط سے باہر نکل گئی۔ مقصودِ بیان یہ ہے کہ اللہ کے رسول ہادی و معلم ہیں۔ انھوں نے دینِ حق کی راہ دکھائی ہے اور احکامِ دین کی تلقین فرمائی ہے۔ ان کا علم حاصل کر کے ان پر عمل کرنا چاہیے۔ تعلیماتِ رسول کے علاوہ جو کچھ ہے اگر وہی ہے جو آپ نے فرمایا ــــ یا اگر کچھ باتیں ایسی ہیں جو تعلیماتِ نبوی کی شرح کرتی اور اس کی تقویت و ترویج اور افزائشِ حسن و جمال کا باعث بنتی ہیں تو مبارک ہیں باقی تمام باتیں لغو، بے کار اور وبال ہیں۔

(مکتوب ۳۲ کے اقتباسات)

رسائل و مسائل

سجدۂ سہو کے چند مسائل

سوال

اتفاقاً نماز مغرب میں امام صاحب سے سہواً قعدۂ اولیٰ ترک ہوگیا اور وہ سیدھے قیام میں چلے گئے
پھر کسی مقتدی کے سبحان اللہ کہنے پر وہ قیام سے قعدۂ اولیٰ کی طرف لوٹ گئے۔ نماز کے بعد بعضوں نے
کہا کہ بغیر لوٹے سجدۂ سہو سے نماز کی تکمیل ہوجاتی مگر بعض حضرات نے نماز کو قطعی طور پر فاسد بتایا۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ نماز دوبارہ پڑھی گئی۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:۔

(۱) قعدۂ اولیٰ سہواً ترک کر کے اگر امام سیدھا کھڑا ہوجائے اس کے بعد سے خود یاد آجائے یا
مقتدی تنبیہ کرے تو اس کو کیا کرنا چاہیے؟

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں کن مواقع پر سہو ہوا ہے اور ان مواقع پر حضورؐ نے کیا عمل فرمایا ہے؟

(۳) اگر امام سیدھا کھڑا ہوجانے کے بعد پھر بیٹھ جائے تو کیا اس سے نماز فاسد ہوجاتی ہے اور
اس کو دہرانا ضروری ہے۔

جواب

(۱) کوئی شخص تنہا نماز پڑھ رہا ہو یا کسی جماعت کا امام ہو دونوں صورتوں میں اگر وہ قعدۂ اولیٰ سہواً
ترک کر کے سیدھا کھڑا ہوجائے تو اب اس کو بیٹھنا نہیں چاہیے بلکہ قعدۂ اخیرہ کے بعد سجدۂ سہو کر کے نماز پوری
کر لینی چاہیے۔ یہی طریقہ سنت کے مطابق ہے جس کی تھوڑی تفصیل سوال ۲ کے جواب میں آرہی ہے۔ ہاں اگر
وہ پوری طرح کھڑا نہ ہوا ہو اور ابھی اثنا میں اسے خود یاد آجائے یا مقتدی تنبیہ کرے تو بیٹھ جانا چاہیے۔ اس
صورت میں سجدۂ سہو کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے چار مواقع پر نماز میں سہو ہوا ہے۔

پہلا موقع عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار ظہر کی نماز میں آپ سے قعدۂ اولیٰ سہواً ترک ہوگیا اور آپ تیسری رکعت میں کھڑے ہوگئے۔ جب پوری نماز پڑھ چکے تو سہو کے دو سجدے کرکے اس کمی کی تلافی فرمادی۔ علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ اس حدیث کے بعض طریقوں میں یہ بات بھی ہے کہ جب آپ کھڑے ہوگئے تو مقتدی صحابہ نے سبحان اللہ کہہ کر یاد دلایا لیکن حضورؐ نہ بیٹھے بلکہ اشارے سے فرمایا کہ تم بھی کھڑے ہوجاؤ ــــ اس کی تاکید مزید دو روایتوں سے ہوتی ہے۔ مسند احمد اور ترمذی میں ہے کہ ایک بار مغیرہ بن شعبہؓ نے نماز پڑھائی اور قعدہ اولیٰ ترک ہوگیا۔ مقتدیوں نے سبحان اللہ کہہ کر ان کو متنبہ کیا تو انھوں نے اشارے سے کہا کہ تم لوگ بھی کھڑے ہوجاؤ۔ نماز پوری کرکے انھوں نے سہو کے دو سجدے کیے اور کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک بار اسی طرح عمل فرمایا تھا۔ دوسری روایت بیہقی کی ہے:- ایک بار عقبہ بن عامر جہنیؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور مقتدیوں نے سبحان اللہ، سبحان اللہ کہہ کر تنبیہ کی لیکن انھوں نے نماز جاری رکھی اور آخر میں سجدۂ سہو کے بعد جب فارغ ہوئے تو کہا "تمہاری تسبیح (سبحان اللہ) میں نے سنی تھی۔ تم چاہتے تھے کہ میں بیٹھ جاؤں لیکن سنت وہی ہے جو میں نے کیا۔"

دوسرا موقع ایک بار عصر کی نماز میں آپ نے دو رکعتوں کے بعد ہی سلام پھیر دیا۔ پھر حضرت ذوالیدینؓ کے توجہ دلانے پر آپ نے باقی دو رکعتیں ادا فرمائیں اور سجدۂ سہو کیا۔

تیسرا موقع حضرت عمران بن حصینؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک بار آپ نے عصر کی نماز میں تین رکعتوں کے بعد سلام پھیر دیا۔ پھر توجہ دلانے پر ایک رکعت ادا کرکے سجدۂ سہو کیا۔

چوتھا موقع حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک بار آپ نے پانچ رکعتیں پڑھ لیں پھر توجہ دلانے پر سہو کے دو سجدے کیے۔ یہی چار مواقع ہیں جن میں حضورؐ سے نماز میں سہو ہوا ہے۔ میں نے ان صحیح احادیث کی تفصیلات چھوڑ کر مختصراً اصل بات یہاں لکھ دی ہے۔

(۳) تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ سیدھا کھڑا ہوکر بیٹھ جانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ سجدہ سہو کر لینے سے مکمل ہوجاتی ہے۔ فقہ حنفی کا صحیح قول یہی ہے اور جمہور فقہاء کا مسلک بھی یہی ہے۔ فقہائے احناف کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ اس سے نماز فاسد ہوجاتی ہے لیکن اس قول کی کوئی تشفی بخش دلیل نہیں ہے۔ تیسری رکعت میں کھڑے ہونے کے بعد پھر بیٹھ جانا خلاف سنت ضرور ہے لیکن اس سے نماز کے فاسد و باطل ہوجانے

کی کوئی توجیہ نہیں ہے۔

قربانی کا ثواب

سوال

یہاں ایک .... نے عید اضحیٰ کے موقع پر تمام لوگوں میں اس بات کی کافی تشہیر کی کہ جو صاحب بھی قربانی نہ دے سکتے ہوں ان کا ایک سال تک بال رکھنا اور پھر نماز عید کے بعد سر منڈوا ڈالنا ایسا عمل ہے کہ ہر بال کے عوض ایک قربانی کا ثواب ملے گا۔ چنانچہ ان کے بعض ساتھیوں نے یہی عمل کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسی کوئی بات احادیث صحیحہ سے ثابت ہے؟

جواب

اس طرح کی کوئی بات جہاں تک مجھے علم ہے احادیث ضعیفہ سے بھی ثابت نہیں ہے۔ احادیث صحیحہ سے کیا ثابت ہوگی۔ جن صاحب نے یہ بات مشہور کی ہے انھوں نے ناواقفیت سے ایسا کیا ہوگا۔ کم از کم ان کو اپنے گروہ کے علماء سے دریافت کر لینا چاہیے تھا۔ بہرحال ایک سال تک بال رکھ کر دوسرے سال نماز عید اضحیٰ کے بعد بال منڈوانا اور ہر بال کے عوض ایک قربانی کے ثواب کا خیال، ایک بدعت ہے جس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے

سوال:-

یہاں عام طور پر لوگ اپنے اعزہ واقرباء کو صلہ رحمی کے طور پر زکوٰۃ دیتے ہیں حالانکہ زکوٰۃ اور صلہ رحمی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اعزہ کو زکوٰۃ دینے سے وہ ادا ہو جاتی ہے؟

جواب

اپنے مستحق زکوٰۃ اعزہ واقارب کو زکوٰۃ دینا جائز ہے بلکہ ان کو دینے سے صدقہ اور صلہ رحمی دونوں کا ثواب ملتا ہے۔ یہ بات صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ البتہ صلہ رحمی کے لیے صرف زکوٰۃ کی رقم مخصوص نہیں کرنی چاہیے بلکہ اگر گنجائش ہو تو دوسرے مال سے ان کی مدد کرنی چاہیے لیکن اگر گنجائش نہ ہو صرف زکوٰۃ ہو گی

رقم سے کوئی شخص ان کی مدد کرسکتا ہو تو محتاج و ضرورت مند رشتہ دار بدرجۂ اولیٰ اس کے مستحق ہیں۔ فقہاء نے ایسے رشتہ داروں کی تقسیم کردی ہے جن کو کوئی شخص اپنی زکوٰۃ دے سکتا ہے اور جن کو نہیں دے سکتا مثلاً ماں باپ، دادا، دادی، بیٹے، بیٹیاں اور ان کی اولاد کو اپنی زکوٰۃ دینا صحیح نہیں ہے اور بھائی چچا خالو، ماموں اور داماد وغیرہم کو اپنی زکوٰۃ دے سکتا ہے۔

مقدارِ زکوٰۃ اور حولانِ حول

سوال

یہاں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے ایک تعلیم یافتہ مقیم ہیں۔ بحمداللہ متشرع ہیں، صوم و صلوٰۃ اور دیگر احکام شرعیہ کے نہایت پابند ہیں ۔۔۔ "ان کا کہنا ہے کہ میں ملازمت کرتا ہوں، میرے پاس روپیے ماہانہ پس انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر ایسا کیا جائے کہ جتنے روپیوں پر بارہ مہینے پورے ہوچکے ہیں ان کی سال کی اور جتنے پر گیارہ، دس، نو، آٹھ، چھ، پانچ وغیرہ مہینے پورے ہوچکے ہیں، ان کی اتنے ہی مہینوں کی زکوٰۃ دے دیا کریں۔ جن روپیوں پر سال گزر چکا ہے ان کی ۲ ½ فی صد اور باقی روپیوں کی بلحاظ مدت کم کرکے زکوٰۃ ادا کرنے میں کیا قباحت ہے؟"

ان سے عرض کیا گیا اور بہشتی زیور میں دکھایا گیا کہ درمیان سال میں جتنے روپیوں کا اضافہ ہوا ہو ان کو بھی اس اصل رقم کے ساتھ ملاکر زکوٰۃ دی جائے گی جن پر حولانِ حول ہوچکا ہے لیکن وہ تشفی بخش جواب چاہتے ہیں۔ اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلہ کی آپ وضاحت فرمادیں تاکہ ان کی تشفی ہوجائے۔

جواب

آپ نے بہشتی زیور کے حوالے سے جو مسئلہ ان کو بتایا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اسی پر ان کو عمل کرنا چاہیے عمل کو اپنی تشفی پر موقوف نہ رکھنا چاہیے۔ آپ کی خواہش کے مطابق میں یہاں توضیح کے لیے چند سطریں لکھتا ہوں، خدا کرے میں اپنی بات اچھی طرح پیش کرسکوں۔

علیگ صاحب نے جس خیال کا اظہار کیا ہے اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ وہ ۲ ½ فی صد زکوٰۃ کا سبب بارہ مہینوں کو سمجھ رہے ہیں حالانکہ بات یہ نہیں ہے۔ اس کو مہینوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو زکوٰۃ کی وہ مقدار ہے جو نصاب پر شریعت نے عائد کی ہے اس کو حولانِ حول یعنی بارہ مہینے پورے ہوجانے سے تعلق نہیں ہے۔ فرض کیجیے

کوئی شخص یکم اگست کو سو روپیہ کا مالک ہوا اور وہ چاہتا ہے کہ فوراً اسی دن اس کی زکوٰۃ ادا کر دے تو شرعاً اس کو اجازت ہے وہ ادا کر سکتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کتنی زکوٰۃ ادا کرے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو پورے ڈھائی روپیے دینے پڑیں گے حالانکہ ابھی ان روپیوں پر ایک دن بھی نہیں گزرا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقدار زکوٰۃ کو مہینوں سے تعلق نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ نصاب کا مالک ہو جانے کے بعد زکوٰۃ تو فوراً واجب ہو جاتی ہے لیکن شریعت نے صاحب نصاب کی سہولت کے لیے یہ شرط لگا دی ہے کہ اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی سال گزر جانے کے بعد ہوگی۔ اس اثنا میں حکومت کو یا کسی کو اس سے مطالبے کا حق نہیں ہے۔ نفس زکوٰۃ کا واجب ہونا الگ چیز ہے اور اس کی ادائیگی کا واجب ہونا دوسری چیز ہے۔ البتہ چونکہ نصاب کا مالک ہونے کے بعد زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اس لیے کوئی صاحب نصاب بطور خود حولان حول سے پہلے زکوٰۃ دینی چاہے تو دے سکتا ہے ——— ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے دو سال کی زکوٰۃ ایک ساتھ وصول کر لی تھی ——— حضورؐ کا ایسا کرنا دو باتوں کی دلیل ہے۔ ایک یہ کہ نصاب کا مالک ہو جانے کے بعد زکوٰۃ فوراً واجب ہو جاتی ہے ورنہ آئندہ سال کی زکوٰۃ وصول کرنا صحیح نہ ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ حولان حول سے پہلے زکوٰۃ کی ادائیگی صحیح ہے ——— اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہم میں سے کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ مہینوں کے حساب سے زکوٰۃ کی مقدار کو کم کرے کیونکہ مقدار زکوٰۃ کی تعیین میں حولان حول کو دخل نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ایک نصاب مکمل ہونے کے بعد سال کے اندر جو اضافہ ہوگا اس کو اس نصاب کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ کیوں دینی ہوگی؟ اس اضافے کا سال الگ سے شمار کیوں نہیں کیا جائے گا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر نصاب کا الگ الگ سال شمار کیا جائے تو انسان سخت دشواری میں گرفتار ہو جائے گا۔

فرض کیجیے ایک شخص چالیس روپیوں کا مالک ہو کر ماہ رجب میں صاحب نصاب ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس نصاب کا سال ماہ رجب سے شروع ہوگا۔ اس کے بعد مثال کے طور پر ہر ماہ دس روپیے پس انداز ہوتے ہیں تو چار ماہ کے بعد ایک دوسرا نصاب مکمل ہوگا اس کا سال نئے سرے سے حساب کرنا پڑے گا۔ اسی طرح چار ماہ کے بعد ایک تیسرا نصاب مکمل ہوا اور اس کا حساب الگ چلا۔ اب بتائیے کہ وہ شخص حساب کتاب کی کتنی دشواریوں میں مبتلا ہوگا ——— اور اگر اس پس انداز میں کمی بیشی ہوتی ہے تو پھر نصاب کی تکمیل کا خیال اور تکمیل کے بعد سال گزرنے کا حساب مزید دشواریوں اور پریشانیوں کا سبب بنے گا ——— انہیں دشواریوں اور پریشانیوں سے بچانے کے لیے شرعی حکم یہ ہے کہ ایک نصاب کی تکمیل کے بعد سال کے اندر روپیوں کا جتنا اضافہ بھی ہوگا اصل نصاب کے ساتھ ملا کر اس کی زکوٰۃ دی جائے گی اس اضافہ پر سال گزرنے کی شرط نہیں

تنقید و تبصرہ

سیرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء
از سید محمد الحسنی صفحات ۴۲۲۔ کاغذ کتابت طباعت عمدہ مجلد گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت چھ روپیہ۔ ناشر: مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی رہنمائی و نگرانی میں مولانا سید محمد الحسنی نے یہ ایک ایسی کتاب مرتب کی ہے جسے پڑھ کر مرتب سے بڑی توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اس کتاب میں جوش عقیدت کی فراوانی اور جذبات کی شدت رچی بسی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود سنجیدگی، تحقیق اور وقار کا سر رشتہ مرتب کے ہاتھ سے چھوٹا نہیں ہے۔ مولانا ابوالحسن نے اس کتاب پر مقدمہ بھی لکھا ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> "کتاب جامع بھی ہے، موثر بھی ہے، دل آویز بھی، وہ نہ صرف ایک عظیم و برگزیدہ شخصیت کی سوانح ہے بلکہ ایک عظیم تحریک کی تاریخ بھی ہے، ایک معاشرے کی تصویر بھی ہے اور ایک پورے دور کی حکاسی بھی۔ ماضی کی سرگزشت بھی ہے اور مستقبل کا وہ خواب بھی جو خدا کے ایک برگزیدہ روحانی ہمت بندہ نے دیکھا تھا اور جس کی تعبیر پورے طور پر ابھی ظاہر نہیں ہوئی اور یہ اس عظیم ادارے کے فرزندوں اور ذمہ داروں کا فرض ہے کہ اس خواب کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔

اس تحریر میں صاحب سوانح اور ندوۃ العلماء کے لیے کتنی عقیدت و محبت اور کس قدر جوش پوشیدہ ہے۔ یہی عقیدت و محبت اور یہی جوش کسی تحریک کا وہ سرمایہ ہے جس کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ شکر ہے کہ مولانا کا یہ جوش اور ان کی یہ عقیدت مرتب کتاب میں بھی منتقل ہو گئی ہے بلکہ انھوں نے بڑی حد تک مولانا کا اسلوب تحریر اور طرز بیان بھی اپنا لیا ہے کہیں کہیں تو یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ مولانا سید ابوالحسن علی لکھ رہے ہیں یا ان کے نوجوان بھتیجے مولانا سید محمد الحسنی۔

مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کو ایک صاحب سلسلہ بزرگ اور بانیٔ ندوہ کی حیثیت سے تبصرہ نگار جانتا تھا لیکن اتنی تفصیلی واقفیت نہ تھی جو اس کتاب سے حاصل ہوئی۔ اس سے یہ تفصیل معلوم ہوا کہ سلوک و ارشاد کے علاوہ حضرت مولانا کی زندگی کے تین بڑے کارنامے تھے۔ ایک صالح تحریک کی تاسیس و تعمیر، ایک طالح تحریک کی تحریب و تردید اور ایک محرف مذہب اور اس کے ماننے والوں کی نقاب کشائی۔ صالح تحریک ندوۃ العلماء ہے۔ طالح تحریک قادیانیت ہے اور محرف مذہب عیسائیت ہے۔ مولانا کی زندگی کا ہر کارنامہ اچھی خاصی تفصیل و تحقیق کے ساتھ اس کتاب میں آگیا ہے۔ قادیانیت امت مسلمہ کے لیے ایک کینسر کی حیثیت رکھتی ہے اور جب تک اس ہزار پا کی گرفت سے اسے نجات نہیں ملتی یہ پوری طرح صحت مند نہیں ہو سکتی ـــ قادیانیت درحقیقت عیسائیت، یا عیسائی حکومت کے ظلِ عاطفت میں پروان چڑھی ہے اس لیے اس کی کید اور مکاریوں سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا مونگیری رحمۃ اللہ علیہ پر اپنی رحمتوں کا مینہ برسائے کہ انھوں نے ان دونوں کی قلعی کھولی ہے اور ان دونوں کے بارے میں ایسی پرُ از معلومات اور محقق کتابیں لکھی ہیں جن سے ہم بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ زیر تبصرہ کتاب کا باب دوم "ردِّ عیسائیت" اور باب پنجم "قادیانیت کا مقابلہ" اس سلسلے میں قیمتی معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ قادیانیت کے مقابلے کے لیے حضرت مولانا کا جوش و خروش، انہماک اور دلچسپی کا حال جاننے کے لیے تو پورا باب پڑھنے کی ضرورت ہے۔ میں یہاں صرف ایک اقتباس نقل کرتا ہوں وہ اپنے ایک مرید حاجی لیاقت حسین بھاگلپوری کو ایک مفصل خط کے آخر میں لکھتے ہیں :۔

> تم کو چاہیے کہ اپنے تمام گاؤں کے بھائیوں اور جو لوگ تمہارے زیر اثر ہیں ان کو اس کام میں نظام کے ساتھ متوجہ کرو۔ یہ میری تحریر معمولی نہیں ہے۔ یہ کام تو خدا چاہے ہوگا اور ضرور ہوگا۔ دیکھیے کہ کون اس خدائی کام کو انجام دیتا ہے اور کون اس سے محروم رہتا ہے۔" (صفحہ ۳۰۵)

اس پرجوش اور موثر عبارت سے ان کا انہماک تو معلوم ہوتا ہی ہے اس سے دو قیمتی باتیں اور معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ کوئی بڑا کام نظام یعنی انتظام اور نظم و ضبط کے بغیر اچھی طرح انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اور دوسری یہ کہ خدا کا کام وہ کام ہے جس کی انجام دہی خدا پر احسان نہیں بلکہ اپنی سعادت ہے۔ خدا ہماری مدد کا محتاج نہیں، اس کا کام تو ہو کر رہتا ہے۔ اس سے پہلو تہی خود ہماری بدبختی و محرومی ہے۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی   منت شناس ازو کہ بخدمت گزاشتت

باب چہارم تحریک ندوۃ العلماء کے بارے میں ہے اور سب سے زیادہ مفصل ہے۔ مولانا مونگیری اور علامہ شبلی

یہ اختلاف کا حصہ ایک تکلیف دہ حصہ ہے۔ اس کی جو تفصیل فاضل مرتب نے مرتب کی ہے اس پر کوئی تنقید
کا کام نہیں اس لیے کہ میں حقیقتِ حال سے ناواقف ہوں لیکن سب کچھ پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا
مونگیری سے جذباتی و روحانی عقیدت کی وجہ سے مرتب کا قلم ان کی طرف جھک گیا ہے۔ جہاں تک تبصرہ نگار کی
معلومات کا تعلق ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کو آج جو علمی عظمت حاصل ہے اس میں علامہ شبلی کا حصہ مولانا مونگیری
سے زیادہ ہے۔ اللہ دونوں ہی پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔

یہ کتاب ہندوستان میں مسلمانوں کے ایک اہم دَور کی عکاس ہے اس لیے تمام اہلِ علم کے مطالعے کے
لائق ہے۔ (ع-ق)

DIPLOMACY IN ISLAM (انگریزی)

اسلام میں حکمتِ عملی :- ازجناب افضل اقبال صاحب۔ صفحات ۱۵۶۔ قیمت

دس روپیہ ---- شائع کردہ :- انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر۔ کلب روڈ۔ لاہور۔

یہ کتاب اس بات کا دعویٰ ہے کہ رسولِ آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی میں
جہاں ہر قسم کی اعلیٰ ترین انسانی خوبیاں جلوہ گر دکھائی دیتی ہیں وہاں حکمتِ عملی کا جوہر بھی بہترین معیار پر صاف
نظر آتا ہے۔

۱۔ ابتدائی دَور کے خاص مذاکرات۔

۲۔ وفود کی روانگی اور وفود سے ملاقات۔

۳۔ اخلاقیاتی حکمتِ عملی

ہر عنوان کے ذیل میں حضورؐ کی حکمتِ عملی پر مشتمل تاریخی واقعات خالص محققانہ آب و رنگ میں پیش کیے
گئے ہیں جن میں تیس چالیس چیدہ چیدہ واقعات کا انتخاب شامل ہے۔ کتاب کا آغاز جسٹس ایس اے رحمان صاحب
کے مختصر پیش لفظ سے ہوتا ہے جس کے بعد خود مصنف کے قلم سے دس صفحات کا ایک پُرمغز دیباچہ ہے۔ اور
آخر میں تشریحی اشارات اور ضروری حوالوں کے علاوہ ایک جامع و مفید انڈکس بھی موجود ہے۔

کتاب کے نام "ڈپلومیسی ان اسلام" کے نیچے یہ تشریحی سطور دی گئی ہیں۔
ایک مقالہ جس میں بتایا گیا ہے کہ فنِ مذاکرات کو پیغمبرِ اسلام نے کس زاویے سے دیکھا اور نشوونما دیا۔

دیباچہ میں بھی حکمت عملی کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس کے معنی مذاکرات، مصالحت، مداخلت اور قول فیصل کی شکل میں معاملات کو حل کرنا ہیں۔

دیباچہ میں حکمت عملی کا تاریخی جائزہ لے کر یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ اسلام کی روشنی سے پہلے سیاست و حکمت کی دنیا میں کیسی تاریکی چھائی تھی۔ انسانیت کے مسخ شدہ، تنگ نظرانہ اور تاریک اندیشانہ تصورات حکمت عملی کی پشت پر بھی زہر افشانیاں کرنے میں مصروف تھے۔ اس وقت حکمت عملی پر کوئی ایسی اخلاقی گرفت نہ تھی جس میں معاملات کو ہوشمندی کے ساتھ ساتھ دیانت کے خطوط پر سلجھانا ضروری خیال کیا جاتا ہو۔ ایک شائستہ قوم بھی صرف اپنی قوم اور اپنوں کے ساتھ اخلاقی معاملہ کرنا پسند کرتی تھی لیکن جوں ہی دوسری قوم اور بیگانوں سے سابقہ پڑتا تو حکمت عملی کے ماہر اخلاق و کردار کی سطح سے اتر کر جوڑ توڑ اور عقلی ہتھکنڈے بازیوں کی پستیوں میں گھس جانے کو کوئی عیب نہ سمجھتے تھے۔ آج بھی جب کہ اخلاق و اقدار کے بلند بانگ نعروں کی گونج سے انسانی دنیا جھنجھنا رہی ہے۔ ہاں آج بھی "ڈپلومیسی" کا عملی ریکارڈ اخلاقی لحاظ سے اس قدر "بے قید" ہے کہ اس کے ساتھ من مانی شاطرانہ چالوں کا خیال آنا لازمی سا ہے۔

مصنف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے نور سے "ڈپلومیسی" کا ایک صاف ستھرا تصور پیش کرنے کی کوشش کی۔ ایک ڈپلومیسی جس میں دماغ کی جولانیاں تنہا نہیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ دل کا نور اور روح کا نکھار بھی شامل ہے۔ ہوشمندانہ حق کوشی بھی ہے اور حق کوشانہ ہوشمندی بھی۔ حکمت عملی کا یہ اسوۂ حسنہ دیکھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے کہ جب دل اور دماغ ـــ اخلاق و ادراک ـــ تدبر اور تقویٰ کے دو آتشے سے حکمت عملی کا خمیر اٹھتا ہے تو کیسے کیسے لاینحل مسئلے حل ہو جاتے ہیں اور کیسے کیسے نازک و دشوار عقدے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ دیانت، پاس عہد اور راست گوئی کو حکمت عملی کے لیے بے جوڑ سمجھنے والوں کو یہ کتاب چونکا دینے کی طاقت رکھتی ہے۔

مصنف کا یہ التزام قابل قدر ہے کہ انھوں نے حضورؐ کی حکمت عملی کا یہ رخ اس زاویے سے پیش کیا ہے کہ آپ کی بہترین سوجھ بوجھ کے دوش بدوش آپ کی اخلاقی جاذبیت کی جھلک بھی صاف نظر آتی رہے۔ ورنہ اندیشہ تھا کہ پڑھنے والا آپ کو ایک اعلیٰ ترین "ڈپلومیٹ" سمجھنے کے بعد یہ سوچنے لگے کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ حکمت عملی کے بل پر کیا۔ یہ تصور آپ کی پیغمبرانہ شخصیت کو نظروں سے اوجھل کر دیتا تو بڑی ٹریجڈی ہوتی ـــ شکر ہے کہ مصنف جس ڈھنگ سے موضوع کو لے کر چلے ہیں وہاں اس قسم کا اندیشہ ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک

جگہ پہنچ کر تو مصنف کی آواز بالکل صاف اور غیر مشتبہ انداز سے یہ حقیقت فاش کر دیتی ہے کہ :۔

ان وفود کا تذکرہ کرتے ہوئے جن سے رسول نے ملاقات کی اور ان سفارتوں کے ذکر میں جن کو آپ نے روانہ کیا ہم نے تجزیہ و تحلیل کا اسلوب اس لیے استعمال کیا ہے تاکہ مختلف واقعات کی اہمیت ذہن نشین ہو سکے لیکن یہ یاد رہے کہ محمد تجزیہ و تحلیل کے انداز پر نہیں وجدانی انداز میں سوچا کرتے تھے بے شک و شبہ آپ ان تمام عوامل سے باخبر تھے جن کو ہم نے شمار کیا ہے لیکن ان کو اپنے سوچ بچار میں علیحدہ علیحدہ کیے بغیر آپ میں یہ اہلیت تھی کہ اس طریق کار کا فیصلہ فرمالیں جو ان عوامل کا شافی جواب ہو۔ آپ کا انداز قدرتی طور پر ایک موقع شناس، جنگی مفکر اور منطقی کے بجائے ایک فیضان یافتہ رسول کا انداز ہے۔" (صفحہ ۶۲)

آگے چل کر اخلاقیاتی حکمت عملی کے باب میں مصنف نے دل کھول کر حضور کی اخلاقی عظمتوں کو سیاست و حکمت عملی کے افق پر جلوہ گر کیا ہے۔ اس مقام پر مسائل حیات اور معاملات دین و دنیا کی کیسی کیسی گتھیاں ــــ کیسی کیسی نازک ترین گھاٹیاں دکھائی دیتی ہیں جو قدم قدم پر داؤں پیچ اور جوڑ توڑ کے شاطرانہ طریقوں کو استعمال کرنے کی ترغیب دلاتی نظر آتی ہیں اور جن کو ایک بے نظیر، عظیم ترین اخلاقی استحکام کے بغیر دیانت و حق کوشی کے اصول سے حل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ مصنف نے بڑے درد مندانہ خلوص کے آہنگ میں رسول خدا کی اخلاقی شخصیت کی کہانی سنائی ہے اور اس شخصیت کا بہترین و مفصل تعارف کرانے کی منزل دشوار سر کی ہے۔

آخر کتاب میں جو نوٹ دیے گئے ہیں ان میں کتاب کے اہم مقامات کے تاریخی حوالوں نے اس تصنیف کا علمی وزن بڑھا دیا ہے لیکن حیرت ہے کہ ایک اہم ترین واقعہ کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ یہ واقعہ طائف کے اس وفد سے تعلق رکھتا ہے جس نے آکر بعض احکام اسلامیہ سے استثنار کی شرائط کے ساتھ قبول اسلام کی درخواست پیش کی تھی اور جن کے متعلق یہ کتاب بتاتی ہے کہ رسول اللہ نے ان کو زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ فرما دیا تھا۔ اگرچہ کتاب یہ بھی بتاتی ہے کہ اس حکمت عملی کا ثمرہ خاطر خواہ نکلا اور دو سال کے اندر یہ لوگ برضا و رغبت تمام احکام اسلامی کو اپنانے پر آمادہ ہو گئے لیکن یہ استثنار منظور فرما لیا ایک ایسا انوکھا اور غیر معمولی مسئلہ ہے کہ اس کو حوالہ دیے بغیر لکھ دینا بہت بڑی کمی ہے۔ جب تک مصنف خود کوئی حوالہ نہ دیں ان کے اس بیان پر کیا بحث کی جا سکتی ہے۔

ایک اور بات جو نہ جانے کیوں شدت سے محسوس ہوئی حالانکہ وہ بظاہر معمولی سی بات نظر آتی ہے یہ ہو کہ

حضورؐ کے اسمِ گرامی کے ساتھ کسی بھی جگہ "صلی اللہ علیہ وسلم" کا انگریزی ترجمہ نہیں دیا گیا۔ حالانکہ انگریزی میں مسلمان اہلِ قلم معمولاً اس کا التزام رکھتے ہیں اور کم از کم (Peace on him) کا مختصر سا ٹکڑا ضرور استعمال کرتے ہیں۔ سب جگہ نہیں، کہیں کہیں تو اس "ادب رسالت" کی چاشنی حاصل ہونی چاہیے تھی۔

ان چند چھوٹی چھوٹی فروگزاشتوں کو چھوڑ کر یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ مصنف موصوف نے دماغ ہی سے نہیں بلکہ دل سے بھی اس تحقیقی تصنیف میں جگر کاوی کی ہے۔ معلومات کی روشنی ـــ زبان و اسلوب کی لطافت و روانی، جذبات کی تپش ـــ افکار کی گہرائیاں اور ترتیب و تجزیے کی مشاقی ـــ وہ کون سی شے ہے جو یہاں موجود نہیں۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مطالعہ کی مستحق ہے۔ استفادے کے قابل ہے اور اس قابل ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہوتا کہ غیر مسلم دنیا حکمت عملی کے زندہ موضوع کے زاویوں سے رسول آخر الزماں کی عظمت کا سراغ پا سکے۔ ش۔ ن

بقیہ اشارات

بخشنے کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ اس آیت میں خلفائے راشدین کی تعریف بھی ہے اور خلافت راشدہ یا اسلامی حکومت کے مقاصد و فرائض بھی متعین کر دیے گئے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی چار کلیات نے اپنے اندر تمام جزئیات کو سمیٹ لیا ہے۔

مسلمانوں کے جن حکمرانوں نے خلوص کے ساتھ اس آیت کو اپنی حکومت کا نصب العین بنایا ہے انہیں کی حکومت درحقیقت اسلامی حکومت بنی ہے اور جنھوں نے اس سے غفلت برتی ہے۔ ان کی حکومت خلافت راشدہ سے دور ہو گئی ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جب خلیفہ بنائے گئے تو انھوں نے اس آیت کو نہ صرف یہ کہ اپنے سامنے رکھا بلکہ اپنے ایک خطبے میں اس کی تفسیر بھی فرمائی۔

قال الصباح بن سوادۃ	صبلح بن سوادہ کندی کہتے ہیں کہ میں نے
الکندی سمعت عمر بن عبد العزیز	حضرت عمر بن العزیز کو خطبہ دیتے ہوئے سنا وہ خطبے
یخطب وھو یقول اَلَّذِیْنَ اِنْ	میں اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ کی پوری
مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ الاٰیۃ ثم قال	آیت پڑھ رہے تھے۔ پھر اس کے بعد انھوں نے فرمایا
الا انھا لیست علی الوالی وحدہ ولکن	یہ آیت صرف والی و حاکم ہی پر ذمہ داری نہیں ڈالتی

على الوالي والمولى عليه الا انبئكم بما	بلکہ حاکم اور اس کے ماتحت دونوں پر ذمہ داریاں
لكم على الوالي من ذالكم وبما للوالي	عائد کرتی ہے۔ میں بتاتا ہوں کہ حاکم پر تمہارا حق کیا
عليكم منه ان لكم على الوالي من ذالكم	ہے اور تم پر حاکم کا حق کیا ہے۔ تمہارا حاکم پر حق یہ ہے
ان يأخذ بحقوق الله عليكم	کہ وہ تم سے اللہ کے حقوق وصول کرے اور تم میں سے
وان يأخذ لبعضكم من بعض وان	بعض کا حق جو دوسرے پر ہو اسے بھی وصول کرے
يهديكم للتي هي اقوم ما استطاع	اور بحد استطاعت سیدھی راہ کی طرف تمہاری رہنمائی
وان عليكم من ذالك الطاعة غير	کرے اور تم پر حاکم کا حق یہ ہے کہ اس کی ایسی اطاعت
المبزوزة ولا المستكرهة بها ولا المخالف	کرو جو خوش دلی سے ہو نہ تو وہ کراہت و جبر کے
سرها علانيتها (ابن کثیر جلد ۳)	ساتھ ہو اور نہ منافقانہ ہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو جو اقتدار بخشتا ہے اس کی غرض و غایت اقامت عدل و اقامت دین کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔ یہ بات بھی پوری طرح واضح ہو گئی کہ غلبہ و اقتدار اور اقامت دین کے درمیان موقوف اور موقوف علیہ کے سوا دوسری کوئی نسبت نہیں پائی جاتی۔ اسلامی حکومت کے بغیر خدا کا اتارا ہوا دین بتمام و کمال قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اس موقوف علیہ کو حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی کی تحصیل کے لیے اللہ نے کبھی اپنی قوت قاہرہ سے منکرین حق کو پامال کیا ہے اور کبھی اپنے وفاداروں کو جہاد کا حکم دے کر ان کی مدد فرمائی ہے اور منکرین حق کے مقابلے میں انہیں سربلند کیا ہے۔

چند احادیث

(۱) پہلی حدیث جو میں یہاں نقل کر رہا ہوں، اس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں دو جگہ روایت کیا ہے۔ کتاب التفسیر اور کتاب البیوع۔ صحیح بخاری کے علاوہ یہ حدیث انھوں نے الادب المفرد باب الانبساط الی الناس میں بھی روایت کی ہے۔ امام احمد اور امام طبرانی نے بھی یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ امام دارمی نے حضرت کعبؓ اور عبداللہ بن سلامؓ سے اس کو روایت کیا ہے۔ میں الفاظ کتاب التفسیر سے نقل کر رہا ہوں اور ترجمہ وہ نقل کر رہا ہوں جو علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبی جلد سوم میں کیا ہے:-

عن عبد الله بن عمرو بن العاص	حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے کہا۔ قرآن کی یہ آیت
رضی الله عنهما ان هذه الاية التي في	کہ اے پیغمبر ہم نے تجھ کو گواہ اور خوش خبری سنانے

القرآن یا ایہا النبی انا ارسلناک شاھدا ومبشرا ونذیرا قال فی التوراۃ یا ایہا النبی انا ارسلناک شاھدا ومبشرا ونذیرا وحرزا للامیین انت عبدی ورسولی سمیتک المتوکل لیس بفظ ولا غلیظ ولا سخاب فی الاسواق ولا یدفع السیئۃ بالسیئۃ ولکن یعفو ویصفح ولن یقبضہ حتی یقیم بہ الملۃ العوجاء بان یقولوا لا الہ الا اللہ فیفتح بہا اعینا عمیا واذانا صما وقلوبا غلفا

والا بنا کر اور امیوں کا حامی و ملجا بنا کر بھیجا تو میرا بندہ ہے اور میرا رسول ہے اور میں نے تیرا نام خدا پر بھروسہ رکھنے والا رکھا وہ سخت اور سنگدل نہ ہوگا اور بازاروں میں شور نہ کریگا۔ وہ برائی کے بدلے برائی نہ کرے گا بلکہ عفو اور درگزر کرے گا اور اس وقت تک خدا اس کی روح قبض نہ کرے گا جب تک آپ کے ذریعہ وہ کج دین کو سیدھا نہ کرے گا کہ لوگ کہنے لگیں کہ وہ ایک خدا ہے اس کے سوا کوئی نہیں پس وہ اس دین سے اندھی آنکھوں بہرے کانوں اور نافہم دلوں کو کھول دے گا۔

اس حدیث سے بصراحت یہ بات معلوم ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے سیکڑوں سال پہلے تو میں بھی آپ کے مقصدِ بعثت کے لیے اقامت دین ہی کی تعبیر اختیار کی گئی تھی اور اس میں یہ پیشین گوئی اور اللہ کا موجود تھا کہ جب تک آپ اپنے مشن کو پورا نہ کرلیں آپ کی وفات نہ ہوگی۔ نیز اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہو کہ اقامت دین کا جو کام آپ کے سپرد ہوا تھا وہ آپ کی بعثت سے لے کر وفات تک محیط ہے۔ مکے میں آپ نے دعو اسلامی کا جو کام انجام دیا وہ بھی کج دین کو سیدھا کرنے کے لیے تھا اور مدینے آکر آپ نے منکرین حق سے جو جہاد با کیا وہ بھی کج دین کو سیدھا کرنے ہی کے لیے تھا اس طرح یہ حدیث اقامتِ دین کے مفہوم پر بھی روشنی ڈالتی ہے او سورۂ فتح اور سورۂ شوریٰ کی جو آیتیں پیش کی گئی ہیں یہ حدیث ان آیتوں کی ایک اچھی شرح ہے۔

(۲) امام بخاری نے حضرت معاویہ سے یہ حدیث روایت کی ہے:۔

انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان ھذا الامر فی قریش لا یعادیہم احد الا کبہ اللہ علی وجہہ ما اقاموا الدین۔ (باب مناقب قریش)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ خلافت قریش میں اس وقت تک باقی رہے گی جب تک وہ اقامت دین کرتے رہیں گے جو کوئی بھی ان سے دشمنی کرے گا اللہ اس کو منہ کے بل گرا دے گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دین اسلام کی پیروی اور اس کے احکام و قوانین کی ترویج و تنفیذ کے لیے اقامت دین ہی کی اصطلاح استعمال کی ہے اسی کے ہم معنی حدیث حضرت ابوبکر صدیق سے بھی مروی ہے۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں۔

وقد ورد فی حدیث ابی بکر	حضرت ابوبکر صدیق کی حدیث میں بھی اسی
الصدیق نظیر ما وقع فی حدیث معاویۃ	طرح کی بات کہی گئی ہے جو حدیث معاویہ میں ہے اس کا
ذکرہ محمد بن اسحاق فی الکتاب الکبیر	ذکر محمد بن اسحاق نے الکتاب الکبیر میں کیا ہے انھوں نے
فذکر قصۃ سقیفۃ بنی ساعدۃ وبیعۃ	سقیفہ بنی ساعدہ اور حضرت ابوبکر کی بیعت کا واقعہ
ابی بکر فیہا فقال ابوبکر وان ھذا	لکھا ہے اور اسی میں یہ ہے کہ حضرت ابوبکر نے فرمایا
الامر فی قریش ما اطاعوا	یہ خلافت قریش میں اس وقت تک باقی رہے گی
اللہ واستقاموا	جب تک وہ اللہ کی اطاعت کرتے اور اس کے حکم پر
علی امرہ (فتح الباری کتاب الاحکام جلد ۱۳)	جمے رہیں۔

بخاری کی اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ امرائے قریش جب تک اقامت دین کرتے رہیں گے خلافت ان کے اندر باقی رہے گی اور ان کا ہر دشمن منہ کی کھائے گا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر وہ دین کو قائم نہیں رکھیں گے اور اس فریضے سے غفلت برتیں گے تو کمزور ہو جائیں گے اور خلافت ان سے چھن جائے گی یا کم سے کم یہ کہ وہ اسلامی خلافت کے مستحق باقی نہ رہیں گے۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہوا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود امت مسلمہ کو دین اسلام پر قائم رکھنے کا ذریعہ کیا ہے اور یہ امت کس طرح اسلام پر باقی رہے گی اور جب تک اس سوال کا جواب نہ ملے تصویر کا دوسرا رخ واضح نہ ہوگا۔ احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ یہ سوال آج پیدا نہیں ہوا بلکہ حضور کے بعد خلافت صدیقی ہی میں پیدا ہوا تھا اور صدیق اکبر نے اس کا جواب بھی عنایت فرمایا تھا۔ یہ سوال و جواب ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔

(۴) امام بخاری نے قیس بن ابی حازم سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر قبیلہ احمس کی ایک عورت کے پاس گئے ان کا نام زینب تھا انھوں نے دیکھا کہ وہ کچھ بولتی نہیں ہے۔ پوچھا یہ کیوں باتیں نہیں کرتی لوگوں نے کہا انھوں نے یہ نذر مانی ہے کہ حج ختم ہونے سے پہلے کسی سے باتیں نہ کریں گی۔ آپ نے زینب سے کہا باتیں کرو اس لیے کہ چپ کا حج جائز نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کا عمل ہے۔ یہ سن کر انھوں نے گفتگو شروع کی۔ پوچھا آپ کون ہیں؟ کہا

میں مہاجرین کے گروہ کا ایک فرد ہوں۔ پھر پوچھا: مہاجرین کے کس قبیلے سے تعلق ہے؟ کہا: قریش سے۔ پھر پوچھا: قریش کی کس شاخ سے تعلق ہے؟ آپ نے فرمایا: تم تو بہت سوال کرنے والی عورت ہو۔ میں ابوبکر ہوں۔ اس کے بعد ان سے جو سوال و جواب ہوا اس کے الفاظ یہ ہیں:-

قَالَتْ مَا بَقَاؤُنَا عَلَى هٰذَا الْأَمْرِ الصَّالِحِ الَّذِي جَاءَ اللّٰهُ بِهِ بَعْدَ الْجَاهِلِيَّةِ قَالَ بَقَاؤُكُمْ عَلَيْهِ مَا اسْتَقَامَتْ بِكُمْ أَئِمَّتُكُمْ (بخاری جلد ۱ باب ایام الجاہلیۃ)

خاتون نے پوچھا کہ جاہلیت کے بعد یہ جو صالح دین اللہ نے ہمیں عطا فرمایا ہے ہم کب تک اس پر قائم رہیں گے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: تم اس دین پر اس وقت تک قائم رہو گے جب تک تمہارے ائمہ خود دین پر قائم رہیں گے اور تمہیں قائم رکھیں گے۔

اس سوال و جواب پر غور کیجیے۔ سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "مَا أَقَامُوا الدِّيْنَ" اور حضرت ابوبکر کا ارشاد "ما استقامت بکم ائمتکم" میں الفاظ کے لحاظ سے تو فرق ضرور ہے لیکن مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ حضرت ابوبکر کے جواب نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ امامت صالحہ یا خلافت راشدہ کے بغیر امت مسلمہ اسلام پر باقی نہیں رہ سکتی۔ عرب خاتون کے سوال میں "الامر الصالح" کا جو لفظ آیا ہے اس کی تشریح حافظ ابن حجر نے یہ کی ہے:-

ای دین الاسلام وما اشتمل علیه من العدل واجتماع الکلمة ونصر المظلوم ووضع کل شیئ فی محله (فتح - جلد ۷)

یعنی امر صالح سے مراد ہے دین اسلام اور یہ دین عدل و انصاف، وحدت کلمہ، مظلوم کی مدد اور ہر شے کو اپنے مقام و محل پر رکھنے کی جن خوبیوں پر مشتمل ہے وہ سب اس سے مراد ہیں۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ خاتون نے جو بات پوچھی تھی وہ یہ تھی کہ جاہلیت کے کفر و شرک، انتشار کلمہ اور ہر طرح کے ظلم و جور کے بعد اللہ نے جو دین حق عطا فرمایا ہے اور جو عدل و انصاف، وحدت کلمہ، مظلوم کی مدد اور زندگی کے تمام معاملات میں حسن ترتیب کی خوبیوں پر مشتمل ہے، ہم ایک امت کی حیثیت سے اس مکمل دین پر کب تک قائم رہیں گے اور اس پر قائم رہنے کی صورت کیا ہوگی؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ یہ ہے کہ جب تک حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی جو خود اسلام کے احکام و قوانین پر عمل پیرا رہیں گے اور ساتھ ہی اپنے ماتحت بندگان خدا کو ان پر چلاتے رہیں گے تم اس مکمل دین پر قائم رہو گے، تمہارا کلمہ ایک ہوگا، تم ایک ہاتھ

بنے رہو گے تمہارے معاشرے میں ہر طرف عدل و انصاف کا راج ہو گا اور تمہاری زندگی کی کل سیدھی رہے گی
یہ حکومت اسلامیہ، یہ امامت صالحہ، یہ خلافت راشدہ تمہارے اس مکمل دین پر قائم رہنے کا واحد ذریعہ ہے۔
یہ بات جو انھوں نے فرمائی اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت اسلامی، اسلام کے بہت سارے اجتماعی احکام کی موقوف علیہ ہے اس کے بغیر ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عوام الناس کا وہی دین ہوتا ہے جو ان کے ملوک و امراء کا دین ہے۔ وہ زندگی کے معاملات میں انہیں کی پیروی کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے جواب کی تشریح میں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے:۔

ای لان الناس علی دین ملوکھم	یہ اس لیے کہ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر
فمن حاد من الائمۃ عن الحال	ہوتے ہیں تو ائمہ و حکام میں سے جو بھی حق کی راہ سے
مال و امال	ہٹے گا وہ باطل کی طرف مائل ہو گا اور دوسروں کو
(فتح الباری جلد ۷)	بھی مائل کرے گا۔

جو لوگ غلط فہمی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام پر عمل کرنے کے لیے حکومت ضروری نہیں یا حکومت، مطلوب نہیں انہیں اس سوال و جواب پر غور کرنا چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ کے جواب کی صرف عقل و نقل ہی تصدیق نہیں کرتے بلکہ ہماری پوری تاریخ اس کی سچائی پر گواہ ہے۔
اس پوری بحث سے جو چیز نکھر کر سامنے آئی وہ یہ ہے کہ اقامت دین یعنی دین اسلام کی مکمل پیروی کے لیے امامت صالحہ کا وجود انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ دین کی اقامت اس پر موقوف ہے۔

(۴) عن ابن مسعود قال من	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر
کان مستنا فلیستن بمن قد	کوئی شخص کسی شخص کی پیروی کرنی ہی چاہے تو اسے
مات فان الحی لا یومن علیہ	اس کی پیروی کرنی چاہیے جو وفات پا چکا اس لیے کہ
اولئک اصحاب محمد صلی اللہ	زندہ انسان کے بارے میں یہ اطمینان نہیں ہو سکتا
علیہ وسلم کانوا افضل ھذہ	کہ وہ فتنے میں مبتلا نہ ہو گا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ
الامۃ ابرھا قلوبا واعمقھا علما	اصحاب (جو وفات پا چکے) اس امت کے سب سے
واقلھا تکلفا اختارھم	زیادہ فضیلت رکھنے والے لوگوں میں تھے ان کے دل
اللہ لصحبۃ نبیہ ولاقامۃ دینہ	سب سے زیادہ نیک، ان کا علم سب سے زیادہ گہرا،

فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوهم على اثرهم وتمسكوا بما استطعتم من اخلاقهم وسيرهم فانهم كانوا على الهدى المستقيم

(مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

ان کی زندگیاں تکلف سے خالی تھیں۔ اللہ نے انہیں اپنے نبی کی رفاقت اور اپنے دین کی اقامت کے لیے منتخب فرمایا تو اے لوگو! ان کے فضل و شرف کو پہچانو، ان کے نشان قدم کی پیروی کرو اور حسب استطاعت ان کے اخلاق اور ان کی سیرتوں کو مضبوطی سے تھامو اس لیے کہ وہ ہدایت کے سیدھے رستے پر تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (م ۳۲ھ) کی یہ حدیث متعدد پہلوؤں سے قابل غور ہے۔ راقم الحروف نے ماہنامہ زندگی ستمبر ۲۶ء کے شمارے میں اس پر تھوڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہاں اس تفصیل کا اعادہ مقصود نہیں ہے۔ یہاں موضوع بحث کے لحاظ سے صرف ایک ٹکڑے اختارهم الله بصحبة نبيه ولاقامة دينه کی طرف توجہ دلانی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھ مل کر صحابہ کرام نے مکے اور مدینے میں جو وسیع الاطراف کارنامے انجام دیے اور دعوت و تبلیغ سے لے کر بدر و حنین کے معرکوں تک نیز مظلومی و مغلوبی سے لے کر غلبہ و حکومت تک جو کچھ بھی کیا اس کے لیے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے صرف اقامت دین کی تعبیر اختیار کی اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف یہ تعبیر قرآنی نص "ان اقیموا الدین" سے ماخوذ ہے اور دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے مشن کے لیے اس سے جامع ترین اور واضح ترین کوئی دوسری تعبیر نہیں ہو سکتی۔

اس حدیث کا یہ پہلو بھی سامنے رہنا چاہیے کہ جب مدینے میں ریاست کی تشکیل اور بدر و حنین کے معرکے بھی اقامت دین میں داخل ہیں اور یقیناً داخل ہیں تو جماعت اسلامی ہند کے دستور میں اس کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے وہ بالکل درست ہے۔

(باقی)

ایک ضروری اعلان

آپ کی سہولت کے پیش نظر ہم نے مکتبہ زندگی کانتی کی کتابوں کے ساتھ اب مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی اور مکتبہ الحسنات رامپور کی تمام کتابوں کی فروخت کا انتظام بھی کر لیا ہے۔ اب ان مکتبوں کی تمام کتابیں آپ ہمارے یہاں سے خرید سکتے ہیں

تمام خریدار (۱) پانچ روپیہ یا زائد کی کتابیں خریدنے اور رقم پیشگی منی آرڈر سے بھیجنے پر ڈاک خرچ معاف

وی پی سے کتابیں طلب کرنے کی صورت میں ڈاک خرچ اور وی پی فیس بذمہ خریدار۔

(۲) ۱۰ روپیہ کی کتابیں خریدنے اور ڈاک خرچ ادا کرنے پر رسالہ زندگی ایک سال کے لیے مفت۔ ۵ روپیہ کی کتابیں خریدنے اور ڈاک خرچ ادا کرنے پر ہندی ماہنامہ کانتی ایک سال مفت بھیجا جائے گا۔

تاجروں کو وہی کمیشن دیا جائے گا جو مرکزی مکتبہ اور مکتبہ الحسنات دیتا ہے

کچھ ہماری کتابوں کے نام

۱۔ وشونایک (ہندی) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ 1.00

۲۔ ایک کہانی (ہندی) (ہندی کہانیوں کا مجموعہ) 1.00

۳۔ انسان اپنے آپ کو پہچان (ہندی) .20

۴۔ نماز اور اس کے اذکار (اردو) .62

یہ کتابیں بھی ہم سے طلب فرمائیں

رسالہ دینیات، خطبات اول تا پنجم، اسلام کا نظام حیات، دین حق، شہادت حق، اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر
.31 .31 .37 .50 2/34 1/50

تنقیحات، اسلام ایک نظر میں، اساس دین کی تعمیر، فریضۂ اقامت دین، حقیقت نفاق، اعتدال کی راہ
1/75 1/50 1/70 3/50 2/50 3/-

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟، مرتد کی سزا، سود حصۂ اول، سود حصۂ دوم، پردہ
3/50 3/- 3/- .75 .37

حقوق الزوجین، اسلام اور ضبط ولادت، لباس کا مسئلہ، سرمایہ داری اور اشتراکیت، دعوت اسلامی
1/- .75 .19 .75 1/50

انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل، رسائل و مسائل حصۂ اول، جماعت اسلامی کی دعوت، تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں
.37 .25 1/- .37

کارکنان تحریک اسلامی کے لیے اہم ہدایتیں، بناؤ بگاڑ، دعوت اسلامی میں خواتین کا حصہ، مسلم خواتین سے اسلام کے مطالبات
.25 .25 .30 .50

آؤ دین سیکھیں، دین کی خدمت، حیات طیبہ، راہ عمل، قرآنی قصے مکمل —— مکتبہ زندگی و کانتی رامپور یو۔ پی

زندگی رامپور

جلد:- ۳۳
شمارہ:- ۴

جمادی الاولیٰ [illegible]
اکتوبر [illegible]

مدیر:- سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ: ——— منیجر زندگی، رام پور۔ یوپی
● زر سالانہ:- چھ روپے ، ششماہی:- تین روپے ، فی پرچہ:- ۶۰ پیسے
● ممالک غیر سے:- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسیدیں حاصل فرمائیں
منیجر ہفت روزہ شہاب ۵/۱۱ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور پاکستان
مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر:- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر: محمد حسن [illegible] ۔ دلی پرنٹنگ [illegible]
مقام اشاعت:- دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(گزشتہ سے پیوستہ)

(سید احمد قادری)

اوپر جو حدیثیں گزریں ان سے دو باتیں واضح ہوئیں، ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اقامت دین کے لیے ہوئی تھی اور دوسری یہ کہ اقامت دین کی جامع اصطلاح صرف قرآن میں نہیں بلکہ احادیث و آثار میں بھی استعمال ہوئی ہے۔

اسلامی مشن کی کامیابی

ہم قرآن کی آیتیں پیش کر کے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ دعوت اسلامی کے ابتدائی دور ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے دی تھی کہ معاندین اسلام کو شکست ہوگی اور اسلام غالب ہو کر رہے گا اس لیے کہ وہ غالب ہونے ہی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اب ہم دو حدیثیں پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں بھی یہ بات صحابہ کرام پر واضح کر دی تھی۔

(۱) عن خباب بن الارت قال	خباب بن الارتؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ
شکونا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ	صلی اللہ علیہ وسلم سے (اپنے مصائب) کی شکایت
وسلم وھو متوسد بردۃ لہ فی	کی جب کہ آپ کعبہ کے سائے میں اپنی ایک چادر سے
ظل الکعبۃ قلنا لہ الا تستنصر	تکیہ لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا کیا آپ ہمارے
لنا الا تدعو اللہ لنا قال	لیے (اب بھی) اللہ سے مدد نہ مانگیں گے، کیا آپ
کان الرجل فیمن قبلکم	ہمارے لیے دعا نہ کریں گے۔ آپ نے فرمایا تم سے
یحفر لہ فی الارض فیجعل فیہ	پہلے کے لوگوں میں ہر مومن کا حال یہ تھا کہ اس کے
فیجاء بالمنشار فیوضع علی راسہ	لیے زمین میں گڑھا کھود کر اس میں [illegible]

لیکن مدینہ پہنچ کر اچانک وہ حکومت و ریاست بن جاتا۔ ... خیال کی نشر و اشاعت کے پیچھے دو مقاصد کام
کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کے دلوں میں بھی یہ عقیدہ اتار دیا جائے کہ دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں
ہیں۔ دین کو سیاست سے تعلق نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ مکے میں اسلام نعوذ باللہ منافقت کا لبادہ اوڑھے رہا
مکہ میں وہ بھیگی بلی بنا رہا لوگوں کو صرف خدا کی پوجا کی طرف بلاتا رہا اور مدینہ پہنچ کر جب کچھ طاقت حاصل ہو گئی
تو یک بیک اس نے آنکھیں بدل دیں اور شمشیر بکف ہو کے چاروں طرف مشرکین پر ٹوٹ پڑا۔

ان دو مقاصد میں جو حاصل ہو جائے مستشرقین اور پادری کامیاب ہو جائیں گے۔ دوسرے طویل تر
مقصد میں تو وہ کم کامیاب ہوئے ہیں لیکن پہلے مقصد میں انھوں نے اچھی خاصی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ ان کے
پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اکثریت دین کو ایک پرائیوٹ معاملہ اور اسے سیاست
سے الگ سمجھنے لگی ہے۔

مکی آیتیں (جن کا ذکر گزشتہ قسطوں میں گزرا) اور اس معنی کی حدیثیں بغیر کسی اشتباہ کے واضح کر رہی
ہیں کہ دعوت اسلامی کی منزل مقصود کیا تھی اور مشرکین و مومنین کے درمیان جو کشمکش برپا ہوئی تھی اس کا انجام
کیا ہونے والا تھا۔ مشرکین بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اسلام کی دعوت محض پوجا پاٹ کی دعوت نہیں ہے اور مومنین پر بھی
انھوں نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ تم نے جو دین قبول کیا ہے اس کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔

(۲) اسی معنی کی ایک حدیث حضرت عدی بن حاتم سے روایت کی گئی ہے۔ میں یہاں صرف اس کا ترجمہ
پیش کرتا ہوں:-

حضرت عدی بن حاتمؓ کہتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے سامنے میں ایک شخص آئے
اور انھوں نے فقر و فاقہ کی شکایت کی پھر ایک دوسرے شخص آئے اور انھوں نے رہزنی یعنی راستوں کے غیر محفوظ
ہونے کی شکایت کی۔ تب آپ نے حضرت عدی سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے عدی! کیا تم نے حیرہ (عراق کا
ایک مقام) دیکھا ہے؟ میں نے کہا۔ دیکھا تو نہیں ہے لیکن اس کے بارے میں سنا ہے
آپ نے فرمایا۔ اگر تمہاری زندگی طویل ہوئی تو تم یقیناً دیکھو گے کہ ایک ہودج نشین عورت حیرہ سے
سفر کرے گی اور کعبہ کا طواف کرے گی اور راستے میں اس کو اللہ کے سوا اور کسی کا خوف نہ ہوگا۔ حضرت
عدی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہا کہ قبیلہ طی کے وہ ڈاکو اور لٹیرے کہاں چلے جائیں گے
جنھوں نے عراق و حجاز کے راستوں کو اپنی رہزنی اور قتل و غارت سے پرآشوب بنا رکھا ہے۔ ... کے بعد

نبی ﷺ نے عدی سے فرمایا ۔ اگر تمہاری زندگی طویل ہوئی تو تم بالیقین دیکھ لو گے کہ کسریٰ کے خزانے فتح کر لیے گئے ۔ میں نے تعجب سے پوچھا ۔ کیا کسریٰ بن ہرمز؟ آپ نے فرمایا ۔ ہاں کسریٰ بن ہرمز ۔ پھر آپ نے فرمایا اگر تمہاری زندگی طویل ہوئی تو تم بالیقین یہ دیکھ لو گے کہ کوئی شخص اپنی ہتھیلی میں سونا چاندی بھر کر نکلے گا کہ کوئی اس کو قبول کرے لیکن اس کو قبول کرنے والا کوئی نہ ملے گا ۔

(بخاری باب دلائل النبوۃ)

اسلام کے غلبہ و اقتدار اور اس کی کامیابی سے متعلق حضور ﷺ کی یہ تمام پیشین گوئیاں، واقعات بن کر دنیا کے سامنے آچکی ہیں ۔ اس حدیث سے ایک دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ حضور ﷺ کے بعد بھی جو غلبہ و اقتدار اور جو فتح و کامرانی مسلمانوں کو نصیب ہوئی وہ اسی دعوت کا فیضان اور اسی مشن کی تکمیل تھی جسے لے کر آپ مبعوث ہوئے تھے ۔

اقامتِ دین، اقامتِ قرآن کا نام ہے

اقامتِ دین کے مفہوم پر گزشتہ صفحات میں کافی روشنی ڈالی گئی ہے اب ہم دو حدیثیں پیش کرتے ہیں جن سے اس کے مفہوم کی وسعت پر مزید روشنی پڑتی ہے ۔

(۱) عن یحیی بن حصین قال سمعت جدتی تحدث انها سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یخطب فی حجة الوداع وهو یقول ولو استعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب الله فاسمعوا له واطیعوا (مسلم کتاب الامارۃ)

یحییٰ بن حصین کہتے ہیں کہ میں نے اپنی دادی کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے خطبے میں یہ فرماتے ہوئے سنا آپ نے فرمایا اور اگر تم پر کوئی غلام حاکم بنا دیا جائے اور وہ تمہاری رہنمائی کتاب اللہ کے مطابق کرے تو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو ۔

(۲) یہی مضمون کی حدیث ابن ماجہ نے ان الفاظ میں روایت کی ہے ۔

عن ام الحصین قالت سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول ان امر علیکم عبد حبشی مجدع فاسمعوا له واطیعوا ما قادکم [illegible]

حضرت ام الحصین کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگر کوئی کان کٹا حبشی غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے تو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو جب تک کہ وہ تم کو [illegible]

حاصلِ بحث

اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کا حاصل یہ ہے:۔

(۱) انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ وہ [illegible] کو ڈرا دھمکا کر اپنا کام ختم کر دیں اور صرف یہی نہ تھا کہ وہ غیر اللہ کو سجدہ کرنے، ان کی دہائی دینے اور ان سے مدد طلب کرنے سے تو لوگوں کو منع کر دیں لیکن زندگی کے دوسرے معاملات میں ان کی شریعت سازی [illegible] نہ کریں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں میزانِ عدل اور کتابِ برحق دے کر اس لیے بھیجا رہا ہے کہ اس کے بندوں کی پوری زندگی اس دین کے مطابق بسر ہو جو اس نے نازل کیا ہے۔

(۲) اللہ کے پیغام اور اس کی کتابِ برحق کی حیثیت کسی ایسی سفارش کی نہ تھی جس کو رد کر دینے پر دنیا میں کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے بلکہ اس کی حیثیت فرمانِ شاہی کی تھی جس کا انکار خدا کے خلاف بغاوت اور [illegible] کے مترادف تھا اور اس کا وعدہ یہ تھا کہ وہ دینِ باطل کے حامیوں کو مغلوب و سرنگوں بنایا اور دینِ حق کے حامیوں کو غالب و سربلند کرے گا۔

(۳) رسولوں اور ان کے ماننے والوں کو نجات دینے اور انھیں غلبہ و اقتدار عطا کرنے کی غرض و غایت یہ تھی کہ اس کا بھیجا ہوا دین غالب اور قائم ہو کیونکہ غلبہ و اقتدار شریعتِ الٰہی کی تنفیذ کے لیے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ باطل اقتدار کو ختم کیے بغیر دینِ حق کی مکمل پیروی ممکن نہیں ہے۔

(۴) اصل دین جس پر تمام انبیاء متفق رہے ہیں صرف عقائد و عبادات اور اخلاقِ حسنہ نہیں ہیں بلکہ وہ تمام انفرادی و اجتماعی احکام بھی ہیں جن پر فرد اور معاشرے کی اصلاح موقوف ہے۔ ان میں شرک و بدعت کے خلاف جہاد، لوگوں کے درمیان اقامتِ عدل اور مجرموں کی تعزیر کے احکام بھی داخل ہیں۔ مختلف شرائع کے درمیان اختلاف محض جزوی رہا ہے، ان کے درمیان بنیادی و جوہری اختلاف نہ تھا۔

(۵) انبیاء کے مقصدِ بعثت کے لیے اقامتِ دین کی جامع اصطلاح صرف قرآن ہی میں استعمال نہیں ہوئی ہے بلکہ احادیث و آثار میں بھی استعمال کی گئی ہے اور علمائے امت برابر استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں۔ [illegible]

(۶) اللہ کا بھیجا ہوا دین محض [illegible]

(۷) [illegible] اقامتِ دین کے معنی اقامتِ قرآن کے ہیں جب تک قرآن [illegible]

تمام قوانین نافذ نہ ہو جائیں اقامت دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

ان تمام نکات کے دلائل تھوڑی تفصیل کے ساتھ تحریر کیے جا چکے ہیں اور اس سلسلے میں کتاب و سنت کے نصوص پیش کیے گئے ہیں۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں نے جو آیتیں پیش کی ہیں ان کے معنی و مفہوم سے متعلق مفسرین کی عبارتیں بہت کم نقل کی ہیں اور ایسا میں نے قصداً بالقصد کیا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر میں ان کی عبارتیں نقل کرتا تو پیش نظر کتاب بہت ضخیم ہو جاتی۔ یہ بات نہیں ہے کہ میں نے مستند تفسیریں پڑھی نہ ہوں اور جو کچھ لکھا ہو بطور خود لکھا ہو بلکہ میں نے جو کچھ لکھا ہے مستند تفسیریں پڑھ کر لکھا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ آیتیں اپنے معنی و مفہوم پر خود اتنی صراحت سے دلالت کرتی ہیں کہ کسی تفسیری عبارت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایسی آیتوں سے تعرض ہی نہیں کیا ہے جن میں کسی گہرے استنباط کی حاجت ہو۔ اس کے علاوہ اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ کھلے ذہن سے مسئلے پر غور کرنا چاہیں ان کے سامنے دلائل آ جائیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو ماننا نہ چاہیں، یا جن کے نزدیک دلیل وہی ہوتی ہے جسے وہ دلیل قرار دیں۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے لوگ میرے پیش نظر نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ باقی آئندہ

شرائطِ ایجنسی

(۱) ایجنسی کم از کم ۵ پرچوں پر دی جائے گی۔

(۲) ‎-/5‎ ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے۔

(۳) ۵ سے ۵۰ پرچوں تک 25% کمیشن دیا جائے گا۔ البتہ ۵۰ سے زائد رسالوں پر کمیشن 33% دیا جائے گا۔

(۴) رسالے کی روانگی کا خرچ دفتر برداشت کرے گا۔ رجسٹری اور وی پی (V.P) کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔

(۵) ہر ماہ کا بل باقاعدگی سے ادا کرنا چاہیے

منیجر رسالہ "زندگی" رامپور۔ یوپی

والدین کا ادب کرنا

وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (بنی اسرائیل ۲۳)

اور اُن سے ادب و احترام کی بات کہو۔

یعنی گفتگو میں ان کی عظمت اور اپنے مقام فرزندی کا خیال رکھو۔ ایک بار حضرت عبداللہؓ نے ابن عباس سے پوچھا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ جہنم سے دور رہیں اور جنت میں داخل ہوں۔ ابن عباس نے کہا۔ کیوں نہیں۔ خدا کی قسم یہی چاہتا ہوں۔ حضرت ابن عمرؓ نے پوچھا "آپ کے والدین زندہ ہیں؟ ابن عباس نے کہا جی ہاں میری والدہ زندہ ہیں۔ ابن عمرؓ نے ارشاد فرمایا۔ اگر آپ ان کے ساتھ نرمی سے بات چیت کریں اور ان کے کھانے پینے کا خیال رکھیں، تو آپ ضرور جنت میں جائیں گے۔ بشرطیکہ آپ کبیرہ گناہوں سے بچتے رہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ نے ایک بار دو آدمیوں کو دیکھا۔ ایک سے پوچھا۔ یہ دوسرے تمہارے کون ہیں؟ اس نے کہا یہ میرے والد ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ دیکھو نہ ان کا نام لینا۔ نہ کبھی ان سے آگے آگے چلنا، اور نہ کبھی ان سے پہلے بیٹھنا۔

والدین پر خرچ کرنا

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۰ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ (البقرہ: ۲۱۵)

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں۔ ہم کیا خرچ کریں۔ ان سے کہہ دیجیے تم جو مال بھی خرچ کرو پس اس کے پہلے مستحق والدین ہیں۔

یعنی خدا کی مرضی کے مطابق اس کی راہ میں تم جو بھی خرچ کرو۔ وہ اس سے باخبر ہے، وہ ضرور تمہیں اجر دے گا۔ لیکن یہ ضرور خیال رکھو کہ سوسائٹی میں تمہارے مال کے جو مستحقین ہیں ان میں سب سے پہلا حق والدین کا ہے۔

والدین کی مرضی کا لحاظ رکھنا

اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا (بنی اسرائیل ۲۳)

اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو تم انہیں اُف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکیاں دو۔

یوں تو جوانی ہو یا بڑھاپا ہر عمر میں والدین کے ساتھ نرمی اور عاجزی سے پیش آنا چاہیے

لیکن بڑھاپے میں اس امر کی خصوصی تاکید اس لیے ہے کہ اس عمر میں کمزوری کے باعث بات کی برداشت کم ہوجاتی ہے، مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہوجاتا ہے اور زندگی کی ان آخری گھڑیوں میں اپنی اہمیت کا احساس بڑھ جاتا ہے اس لیے اس دور میں خاص طور پر تاکید ہے کہ ان کے ساتھ عاجزی اور نرمی کا اہتمام کیا جائے اور ہر ہر بات میں ان کی مرضی اور مزاج کا خیال رکھا جائے۔

انکساری سے پیش آنا

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (بنی اسرائیل ۲۴)

اور عاجزی اور انکساری سے ان کے سامنے جھکے رہو۔

"عاجزی سے جھکنے" کے مفہوم میں ادب و احترام، عقیدت و محبت، اطاعت و خدمت سب کچھ داخل ہے

والدین کے لیے دعا کرنا

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (بنی اسرائیل ۲۴)

اور دعا کرو کہ پروردگار ان دونوں کے حال پر رحم فرما جس طرح انھوں نے بچپن میں میری پرورش فرمائی تھی۔

یعنی اے پروردگار! بچپن میں جب میں انتہائی بے بس و مجبور تھا اور ان کی سرپرستی اور پرورش کا انتہائی ضرورتمند تھا۔ انھوں نے جس رحمت و جاں فشانی اور شفقت و محبت سے میری پرورش فرمائی وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ پروردگار! آج یہ بڑھاپے کی بے بسی اور کمزوری میں مجھ سے زیادہ خود شفقت و رحمت اور سرپرستی کے محتاج ہیں ـــــ خدایا ان کی سرپرستی فرما اور ان کے حال زار پر رحم کی نظر کر

ماں کا حق زیادہ ہے

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ (لقمٰن: ۱۴)

اور ہم نے انسان کو والدین کے حق ماننے کی تاکید کی ہے۔ (خاص طور پر ماں کے حق کی کہ) اس کی ماں اس کو اٹھائے اٹھائے پھری ۔کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا (الاحقاف: ۱۵)

اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کی تاکید کی ہے (خاص طور پر ماں کے ساتھ) کہ اس کی ماں اس کو تکلیف کے ساتھ اٹھائے پھری اور پھر پیدائش کے وقت دکھ اٹھایا

بچوں کی پرورش میں بلاشبہہ والد کو بھی دکھ اٹھانے پڑتے ہیں، لیکن ان دکھوں کو ماں کے دکھوں سے کوئی نسبت ہی نہیں ۔۔۔ قرآن نے دونوں کے ساتھ نیک سلوک کی تاکید کرتے ہوئے ماں کے دکھوں کا ذکر کرکے انتہائی لطیف انداز میں ماں کی خدمت و اطاعت پر ابھارا ہے اور ماں کے ساتھ بھلائی کرنے کے لیے جذبۂ احسان مندی کو ابھارنے کا نفسیاتی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔

ماں کا خصوصی احسان

وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ (لقمٰن: ۱۴) — اور دو برس میں بچے کا دودھ چھڑانا ہے۔

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (الاحقاف: ۱۵) — اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت ۳۰ مہینے ہیں۔

پہلی آیت میں دودھ چھڑانے کی مدت دو سال بتائی گئی ہے اور دوسری آیت میں حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے بتائی گئی ہے، دونوں آیتوں کے [illegible] میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے کہ تیس مہینوں میں چھ مہینے مدت حمل کے بھی شامل ہیں جو حمل کی کم سے کم مدت ہے۔ دودھ پلانا، ماں کا ایک اور خصوصی احسان ہے۔ اس کا تذکرہ بھی ایک لطیف اشارہ ہے کہ ماں تمہاری خدمت و اطاعت کی خصوصی مستحق ہے۔

اطاعت والدین کی حد

وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (عنکبوت: ۸)

اور اگر وہ دونوں تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ شرک کرو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی واقعی علم و دلیل نہیں ہے تو ہرگز ان کا کہنا نہ مانو۔۔۔ میرے ہی پاس تم سب کو پلٹ کر آنا ہے، پس میں تم میں سے ہر ایک کو بتا دوں گا کہ تم دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہو۔

یہ تو حقیقت ہے کہ خدا کے بعد سب سے بڑا حق ماں باپ کا ہے اور خدا کے بعد انہی کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے لیکن والدین کی یہ اطاعت خدا کی اطاعت کے تحت ہے نہ کہ اس سے آزاد۔ اگر سوء اتفاق سے کسی کے والدین شرک اور نافرمانی پر مجبور کرنے لگیں تو ان کی اطاعت ہرگز نہ کی جائے۔ خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔ ماں باپ کی اطاعت اسی حد تک کی جائے گی جہاں خدا کی نافرمانی نہ

مشرک والدین کے ساتھ حسن سلوک

وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (لقمان: ۱۵)

اور اگر وہ دونوں تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ شرک کرو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی واقعی علم و دلیل نہیں ہے تو ہرگز ان کا کہا نہ مانو اور نیک سلوک کرتے رہو دنیا کی زندگی میں البتہ پیروی صرف اس کے راستے کی کرو جو میری طرف رجوع ہو۔ پھر میرے ہی پاس تم سب کو پلٹ کر آنا ہے۔ اس وقت میں تم سب کو بتا دوں گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔

خدا کی نافرمانی کے معاملے میں ان کی اطاعت سے انکار کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اب ان کا کوئی حق ہی نہ رہا۔ دنیا کی زندگی میں ان کے ساتھ نیک سلوک، ان کی خدمت، ان کی ضروریات کا بہرحال خیال رکھنا ہوگا۔ پھر آخر کار سب کو خدا ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ وہاں ہر ایک کو اس کے کیے کے مطابق جزا یا سزا لازماً ملے گی۔

باپ دادا کی اندھی تقلید جہالت ہے

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ (البقرہ: ۱۷۰)

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کی پیروی کرو تو (ڈھٹائی سے) جواب دیتے ہیں نہیں بلکہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو بھی ان کی اندھی پیروی کیے ہی جائیں گے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی پیروی کرو جو خدا نے نازل فرمایا ہے اور اس رسول کی اطاعت کرو تو وہ جواب

أَبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝

(المائدہ : ۱۰۴)

دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے تو کیا یہ اندھی تقلید ہی کیے جائیں گے. خواہ ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور صحیح راہ سے بالکل بے خبر ہوں۔

نادانستہ نافرمانی

رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِنْ تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا ۝

(بنی اسرائیل : ۲۵)

تمہارا رب اس سے اچھی طرح واقف ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ اگر تم نیک اور سعادت مند بن کر رہو تو خدا صحیح رویے کی طرف پلٹ آنے والوں کے لیے بہت درگزر فرمانے والا ہے۔

اوابین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے قصوروں پر متنبہ ہوتے ہی صحیح رویے کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا تو تمہارے دل کے جذبات کو دیکھتا ہے۔ اگر تم نیک اور سعادت مند بن کر رہنا چاہتے ہو اور پھر کبھی نادانستہ تم سے کوئی نافرمانی ہو جاتی ہے تو وہ تمہاری پکڑ نہ فرمائے گا وہ تو بہت زیادہ درگزر فرمانے والا ہے۔ اگر بندہ اپنے قصور پر متنبہ ہوتے ہی صحیح رویے کی طرف پلٹ آئے۔

اولاد اور نسل کے حقوق

جس طرح اولاد پر والدین کے کچھ حقوق ہیں اسی طرح والدین پر بھی اولاد اور نسل کے کچھ حقوق ہیں جنہیں ادا کیے بغیر ایسا معاشرہ ہرگز وجود میں نہیں آ سکتا جس سے صلاح و فلاح کی توقع کی جا سکے۔ اور جس پر کسی اعلیٰ تمدن کی عمارت اٹھائی جا سکے۔

نسل کی حفاظت کرو

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا ۝

اور اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی حقیقت یہ ہے کہ نسل کشی بہت ہی بڑا گناہ ہے

یہ آیت نسل کشی کو عظیم ترین گناہ قرار دیتی ہے اور اس کی رو سے قتل اولاد کی تمام ہی شکلیں ناجائز قرار

پاتی ہیں۔ خواہ وہ اسقاطِ حمل ہو یا منعِ حمل، یا مرد و عورت کا آپریشن، خدا نے جن روحوں کو اس سرزمین پر جسمانی لباس دینا طے کیا ہے، ان کے رزق کا سامان بھی اس نے خشکی اور تری میں پھیلا رکھا ہے۔ اب یہ انسان کی انتہائی پستی، کم ہمتی اور بدعقلی ہے کہ وہ افزائشِ رزق کے اسباب مہیا کرنے اور تلاشِ رزق کی محنت اور کاوش کرنے سے توجہ چراتا ہے لیکن رزق کی کمی کی دہائی دے کر نسل کشی جیسے بدترین جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور انسانی معاشرے کی جڑیں کاٹتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ پیدا ہونے والوں میں کون سا وجود معاشرے کو کن کن ترقیوں اور سربلندیوں کی راہ سجھائے گا۔ اور رزق کے کن کن پوشیدہ خزانوں کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوگا۔ قرآن شریف ہرگز اسے گوارا نہیں کرتا کہ انسان اس بدترین لعنت میں گرفتار ہو کر اپنی موت کا سامان کرے۔ وہ پرزور تعلیم دیتا ہے کہ نسلِ انسانی کی حفاظت کرو اور رزق کے لیے خدا پر بھروسہ رکھو۔ آخر تمہیں رزق کون دے رہا ہے، جو خدا تمہیں رزق دے رہا ہے وہی خدا ان کو بھی رزق دے گا۔

اولاد کو جہنم کی آگ سے بچاؤ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا

مسلمانو! اپنے آپ کو اور گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

ماں باپ پر اولاد کا سب سے بڑا حق یہی ہے کہ وہ انہیں تعلیم و تربیت سے آراستہ کریں تاکہ وہ اپنی زندگی کا مقصد پہچان سکیں، ان کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو اور وہ آخرت کے عذاب سے بچنے کی فکر کر سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ باپ کا اپنی اولاد کے لیے بہترین تحفہ یہی ہے کہ وہ اسے بہترین تعلیم و تربیت سے آراستہ کرے۔

اولاد کے لیے دعا

وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي (احقاف)

اور میری اولاد میں صلاح و تقویٰ دے۔

ایک مومن کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کی اولاد نیک اٹھے اور اس کے ذریعے دنیا میں نیکی پھیلے۔ چنانچہ ایک مومن اس کے لیے ہر ممکن تدبیر بھی کرتا ہے اور پھر خدا سے دعائیں بھی کرتا ہے اس لیے کہ ہر کام، خدا کی نصرت اور توفیق ہی پر موقوف ہے۔

اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک

فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا (مریم ۲۶)

پس تم کھاؤ، پیو، اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو

یہ تسکین و تسلی کا وہ کلمہ ہے جو حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت حضرت مریمؑ سے کہا گیا تھا۔

اولاد کی آرزو کس لیے؟

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَھَنَ	زکریاؑ نے عرض کیا پروردگار! میری
الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ	ہڈیاں تک گھل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک
الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَکُنْ	اٹھا ہے اور میں تجھ سے مانگ کر کبھی نامراد نہیں
بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا ○ وَ	رہا۔(پروردگار!) مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں
اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ	کی برائی کا خوف ہے، اور میری بیوی بانجھ ہے
وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا	تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما دے
فَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا	جو میری میراث بھی پائے اور آلِ یعقوبؑ کی میراث بھی
یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ	پائے۔اور پروردگار! اس کو اپنا پسندیدہ
رَبِّ رَضِیًّا ○ (مریم: ۴، ۵، ۶)	بندہ بنا۔

ایک مومن اولاد کی آرزو کس لیے کرتا ہے؟ اس لیے نہیں کہ اس کے بعد وہ جائداد کا وارث بنے اس کی جمع کی ہوئی دولت کا مالک ہو، بلکہ اس کی دلی آرزو صرف یہ ہوتی ہے، کہ میرے بعد میری اولاد بھی اس دین اور پیغام کی علمبردار بنے جس کے لیے میں نے اپنی زندگی کھپائی۔

رشتہ داروں کے حقوق

والدین کے بعد سب سے اہم حق رشتہ داروں کا ہے۔آدمی کی پرورش و پرداخت میں والدین کے بعد سب سے بڑا حصہ عزیز و اقارب ہی کا ہوتا ہے۔ان ہی کی شفقت و محبت، تعاون و ہمدردی اور حمایت و پشت پناہی میں آدمی پروان چڑھتا ہے ـــــ پھر کوئی ذی شعور ان کے حقوق سے کیوں کر غفلت برت سکتا ہے ـــــ؟ ان کے حقوق خدا نے مقرر فرمائے ہیں، اور بار بار تاکید فرمائی ہے کہ ان سے بے نیازی نہ دکھاؤ۔ ان کے حقوق سے غفلت خدا کی نافرمانی اور معصیت ہے، اور ان کے حقوق کی نگہداشت دراصل خدا کی فرماں برداری

صلہ رحمی

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ	اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر
تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ	تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو، اور
(النساء: ۱)	قرابت کے رشتوں کو بگاڑنے سے بچو

خدا نے انسان کو اپنی خاندانی، معاشرتی اور تمدنی ضرورتوں میں دوسرے انسانوں کے تعاون، مدد اور

سہارے کا محتاج بنایا ہے اور تعلقات کی قربت کے باعث وہ رشتہ داروں کے تعاون، مدد اور ہمدردی کا اور زیادہ محتاج ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ وہ ہمیشہ ان کے حقوق کی حفاظت کرے، صلہ رحمی کرے اور کسی وقت بھی قطع رحم یا بدسلوکی کا معاملہ نہ کرے۔

رشتوں کو جوڑے رکھو

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (الرعد: ۲۱)

اور (اصحاب عقل) ان رشتوں کو جوڑے رکھتے ہیں جن کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

خدائی احکام پر ایمان لانے والے مومنین کی امتیازی خوبیوں میں سے ایک اہم خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے امکان بھر ان تمام رشتوں کو جوڑے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جن کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور کبھی ان کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔

رشتے داروں کے حقوق ادا کرو

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (بنی اسرائیل ۲۶)

رشتہ داروں کا حق ادا کرو

یہاں حق سے مراد ہر قسم کا حق ہے۔ مالی، اخلاقی، معاشرتی، اس کا مطلب یہ ہے کہ رشتہ دار کا کوئی حق مارنا براہ راست خدا کے حکم سے سرتابی کرنا ہے۔

رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرو

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ[illegible]

اللہ عدل اور احسان اور رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کا حکم دیتا ہے

عدل سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کے حقوق میں توازن و تناسب قائم کیا جائے اور ہر ایک کو اس کا ٹھیک ٹھیک حق بے لاگ طریقہ پر دیا جائے۔

احسان یہ ہے کہ خود کم پر راضی رہ کر دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دیا جائے اور ہر ایک کے ساتھ فیاضی اور فراخ دلی کا معاملہ کیا جائے۔

عدل و احسان دو ایسی بنیادی خوبیاں ہیں جن پر پورے انسانی معاشرے کی درستی کا انحصار ہے۔ اس لیے اجتماعی زندگی کے تمام معاملات میں ان خوبیوں کی روح جاری و ساری رہنی چاہیے اور ہر ایک کے ساتھ عدل و احسان کا معاملہ کرنا چاہیے۔ خاص کر رشتہ داروں کے معاملہ میں تو آدمی کو اور بھی زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ کیونکہ عام لوگوں کے مقابلہ میں وہ ہمارے سلوک، تعاون اور امداد کے زیادہ مستحق ہیں۔ ہمارے مال پر

[illegible]

ان کی مہلک بڑھ جاتی ہے۔ انھیں اپنی امت سے پیار ہی ایسا تھا ہیں مصائب کے دوست بھی گرنا پڑتا ہو
اور طعنے اور باتیں بھی کتنی پڑتی ہیں لیکن سخت ترین حالات میں بھی ان کا اپنی امت کے بارے میں یہی قول ہوتا
ہے کہ خدایا! یہ نہیں جانتے یہ نہیں سمجھتے۔ کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی خیر و صلاح کی کوئی بات نیکی اور بھلائی
کا کوئی حق دکھائی دیتا ہے یہ سب انھیں جندگوں کی بے غرض اور بے لوث خدمات کا عکس ہے جسے چاہے
ہم ہزار بار کہیں کہ یہ ہمارا عمل ہے لیکن حقیقت میں اس کا حق اشاعت انہیں کو پہنچتا ہے۔

ہمارے سامنے گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی سیرت مقدسہ کے تفصیلی حالات نہیں ہیں لیکن ہمارے نبی
کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر قابل ذکر واقعہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ آپ کی پوری
زندگی سامنے رکھ کر اگر ہم اس کا تجزیہ کریں تو اس کا ماحصل یہ نکلے گا کہ ایک بچہ یتیمی کی حالت میں پیدا ہوتا ہے
اسے اپنے باپ کی شفقت و محبت کا کوئی حصہ نہیں پہنچا۔ وہ اپنے جن بزرگوں کے زیر سایہ پرورش پاتا ہے
وہ اس سے ہمدردانہ اور مشفقانہ سلوک بھی کرتے ہیں لیکن وہ محبت جو کسی بچے کو اپنے باپ ہی سے مل سکتی
ہے وہ اسے نصیب نہیں۔ اسے اپنی ماں کی محبت تو حاصل ہے لیکن اس کا آغوش اسے حاصل نہیں اور بچپن کے
کئی سال ماں اور دوسرے عزیزوں سے دور کسی گاؤں میں گزر جاتے ہیں اور جب وہ اس قابل ہوتا ہے
کہ اپنے عزیزوں میں آکر رہے تو ماں ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جاتی ہے

اس بچہ کو ہم جوانی میں دیکھتے ہیں کہ وہ کمزوروں اور بے کسوں کی خدمت میں سرگرم ہے۔ اس کی کسی
سے لڑائی نہیں وہ ہر ایک کا دوست ہے البتہ برے افعال سے اسے اجتناب ہے۔ وہ اگر ایسے لوگوں سے
ملتا بھی ہے جن کے افعال ناپسندیدہ ہیں تو ان کے افعال کا وہ اثر قبول نہیں کرتا اور اس کے زمانے میں
تو ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے جن کے افعال پسندیدہ ہوں۔ وہ دیانت دار راست گو آشتی پسند
اور مہذب جانا ہے کیا ایسا شخص اس قابل نہیں ہے کہ اس سے محبت کی جائے؟ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے
محبت کرنے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ ہاں البتہ خود اس کے دل میں سارے بنی نوع انسان کی محبت
ہے پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جب وہ [illegible] عمر کو پہنچتا ہے تو اپنی قوم بلکہ پوری انسانیت کی دعا [illegible]
وہ اپنے بچپن سے دیکھتا آیا تھا اس کے قلب کو [illegible] اور اس کی [illegible]
اس [illegible] وہ انسانیت کو [illegible] [illegible]

اور جب وہ یہ ساری باتیں [illegible] سوچتا ہے کہ آنکھوں کا اندھا [illegible] ہے کہ ان [illegible] کا ایک
ان جانوروں کو انسان کی شکل میں کیسے لایا جائے گا تو ہدایت کی روشنی ۔ ایک صبح اس پر نمودار ہوتی ہے
اور اس سے کہتی ہے کہ اپنے رب کا نام لے کر کوشش کر کے دیکھو۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں کچھ اجنبی نہ تھے کہ لوگ انھیں نہ جانتے ہوں، لوگ انھیں خوب جانتے
تھے اور اچھی طرح پہچانتے تھے کہ آپ کس سیرت و کردار کے مالک ہیں۔ انھیں اس کا اقرار بھی تھا کہ آپ سچے ہیں،
امین ہیں، اپنے پرائے سب کے کام آنے والے ہیں، پھر اس وقت کی اونچی سوسائٹی کے وہ سارے عیوب جنھیں
لوگ اپنی بے غیرتی کے سبب سے چھپانا بھی پسند نہیں کرتے تھے، آپ ان سب سے پاک ہیں۔ لیکن اس کے باوجود
وہ آپ کی باتیں سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ تیرہ سال کی مسلسل صبر آزما مدت میں آپ کو دن کے ایک چوتھائی
حصہ برابر بھی تو اطمینان و سکون نصیب نہ ہو سکا۔ دل خراش باتیں، توہین آمیز سلوک، ایذا پہنچانے والا رویہ،
استہزا آمیز فقرے، غرض مردم آزاری کی وہ کون سی قسم تھی جو آپ کے لیے روا رکھی گئی ہو۔ اور آپ ہیں کہ کبھی
گوشوں اور تاریکیوں میں اپنے کمزور ساتھیوں کے ساتھ عبادتِ الٰہی میں مشغول ہیں۔ کبھی شعب ابی طالب میں کئی
کئی سال اذیت ناک تنہائی میں گزار دیتے ہیں اور شہر کا کوئی شخص دو بات کرنے کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ کبھی
ہجوم ابتلا و آزمائش میں گھرے ہوئے ساتھیوں کو سر چھپانے کے لیے ترک وطن کا مشورہ دیتے ہیں اور خود سارے
مصائب و تکلیفات کا ہدف بننا قبول فرماتے ہیں۔

پھر ایک طویل مدت کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کا خلوص اور آپ کی بے غرض محبت برگ و بار لاتی ہے۔
اب آپ کو ایک ایسا ٹھکانا مل گیا ہے جہاں آپ اپنے گنے چنے ساتھیوں کے ساتھ اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں۔
لیکن ابھی آپ تعمیرِ آشیانہ سے فارغ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ دشمنوں کا ہجوم آپ کو گھیر لیتا ہے۔ آپ سے لڑائیاں
لڑی جاتی ہیں، آپ کی جان لینے کی خفیہ تدبیریں کی جاتی ہیں، آپ کے ناموس پر بہتان لگائے جاتے ہیں، آپ کو
بدنام کیا جاتا ہے لیکن آپ ہر حال میں صبر و شکر کا رویہ اختیار کیے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کا مشن پورا
ہو [illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible] بے چین ہو گیا۔ ساتھیوں سے پوچھا
کیا تم میں سے کسی نے اسے تکلیف پہنچائی ہے؟ ایک صاحب نے ان کے گھونسلے سے انڈا نکالنے کا اقرار کیا۔ آپ نے انھیں حکم دیا کہ جاؤ فوراً اسے وہیں رکھ دو جہاں سے اٹھایا ہے۔

اسی طرح ایک صحابی آپ کی خدمت میں اس صورت سے حاضر ہوئے کہ چادر سے چھپے ہوئے ہاتھ میں کسی پرندے کے بچے تھے۔ آپ نے دریافت کیا تو عرض کیا کہ جھاڑی سے آواز آ رہی تھی جا کر دیکھا تو یہ بچے تھے۔ میں جب ان کو نکال کر لانے لگا تو ان بچوں کی ماں میرے سر پر منڈلانے لگی۔ آپ نے انھیں واپس بھیجا اور کہا کہ جا کر ان بچوں کو ان کے گھونسلے میں رکھ آؤ۔

ایک دفعہ راستے میں ایک ایسا اونٹ نظر سے گزرا جو چارہ نہ ملنے کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گیا تھا۔ آپ نے افسوس کا اظہار کیا اور ساتھیوں سے کہا خبردار ان بے زبانوں کے متعلق خدا [illegible]

اسی طرح ایک بار ایک انصاری کے باغ میں آپ تشریف لے گئے وہاں آپ نے ایک ایسے اونٹ کو دیکھا جو بھوک کی شدت سے بلبلا رہا تھا۔ آپ نے شفقت سے اس پر ہاتھ پھیرا۔ پھر لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک صاحب نے بتایا کہ فلاں انصاری کا ہے۔ آپ نے ان کو بلا کر فرمایا کہ کیا تم اس جانور کے معاملے میں خدا سے نہیں ڈرتے؟

ہمیں کسی مذہب میں درختوں کے حقوق کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں ملتی لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھل دار درخت کاٹنے سے منع فرمایا ہے۔ اسی طرح سایہ دار درخت کے نیچے رفعِ حاجت سے منع فرمایا۔

حدود اللہ میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی جا سکتی۔ آپ مبعوث ہی اس لیے ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے حدود لوگوں کو بتائیں اور ان کے احکام کو جاری فرمائیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب کبھی کوئی معاملہ آپ کے پاس آیا جہاں حد جاری کرنے کی نوبت آگئی ہے تو آپ کی طبعی شفقت و رحمت اور اس کے نفاذ میں سخت کش مکش ہوئی ہے اور اگرچہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے کبھی اپنے طبعی کیفیات کو حدود اللہ کے درمیان آڑے نہیں آنے دیا لیکن طبیعت کی نرمی اور دل کی شفقت کا بار بار یہی تقاضا ہوتا کہ مجرم کو شک کا فائدہ پہنچ جائے [illegible] [illegible] [illegible]

گو مجھے بچپن یا دہلات ہونے کے بعد وہ پڑھائی کا زمانہ جاہلیت میں مجھے بہت شوق تھا اس کے علاوہ سے
گی ہے۔ مجھے بار بار وسوسے آتے رہتے ہیں جو دل و دماغ میں گونجتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی بہت ہی گندے قسم کے
وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر میں ان پر عمل کروں تو گناہ کبیرہ لازم آئے۔ یہ وسوسے سوہان روح بنے ہوئے
ہیں۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو خیالات پر پابندی لگاتا ہے اور اس لیے میں ان خیالات سے سخت
الجھن میں گرفتار ہوں۔ کبھی یہ وسوسے اتنے ذلیل قسم کے ہوتے ہوتے ہیں کہ کفر سے کم کوئی نقصان کے لیے نہیں کہا
جا سکتا۔ کبھی تو پریشانی بڑھ جاتی ہے کہ جی چاہتا ہے۔ اگر معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھے آگ سے پناہ دیگا
— تو میں آمادہ ہوں کہ میرا سر ایک پتھر پر رکھ کر دوسرے پتھر سے اسے کچل دیا جائے تاکہ وہ سر جس میں اس قدر
گندے خیالات بھرے ہوئے ہیں پاش پاش ہو جائے — کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گا
— آپ یہ بتائیے کہ کیا میری یہ زندگی معصیت کی زندگی ہے؟ مجھے بتائیے کہ اس حال میں میرے ایمان
کا اعتبار ہے یا نہیں؟ کیا اس سلسلے میں آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے؟ میں نے اپنے اندرونی
حالات صاف صاف آپ کے سامنے اس لیے رکھے ہیں کہ مجھے کوئی ایسا علاج بتائیے جس پر عمل کر کے میں خدا
کی ناراضی سے بچ سکوں۔ مجھے بتائیے کہ اس وقت میرا درجہ اسلام میں کیا ہے؟ اور اس خبیث چیز کو دور
کرنے کے لیے میں کیا کروں؟

جواب

آپ کے مفصل خط سے آپ کے ذہنی و قلبی اضطراب کا حال معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس اضطراب
کو دور فرمائے۔ آپ نے اپنی جو کیفیت لکھی ہے، بحمد اللہ وہ بہت اچھی ہے۔ آپ اپنے کو پریشان نہ کریں۔ اللہ
تعالیٰ کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے آپ کو توبہ کی توفیق بخشی اور آپ کی زندگی سدھر گئی۔

اس وقت خراب وسوسوں کی کثرت سے آپ کو جو پریشانی لاحق ہے اس کے کئی اسباب ہیں۔ پہلا سبب
گندہ ماحول ہے جس نے نہ جانے کتنے نوجوانوں کو صرف گندے خیالات ہی میں نہیں بلکہ گندے اعمال میں مبتلا کر رکھا ہے
سینماؤں کے ہیجان انگیز مناظر، پبلک مقامات پر عورتوں کی عریاں و نیم عریاں قد آدم تصویریں اور فحش قسم کے فلمی
گانے معصیت و بے حیائی کی وہ بھڑکتی ہوئی چنگاریاں ہیں جو متاع عفت و عصمت اور طہارت قلب و نظر کو
بھسم کیے دے رہی ہیں۔ آپ کے وسوسوں کا دوسرا سبب شیطان کا اغوا اور نفس کی ریشہ دوانیاں ہیں اور تیسرا
سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیماری کی وجہ سے دماغ ابھی تک طاقت ور نہ ہوا ہو۔ اگر عام جسمانی ضعف محسوس کیا جاتا

[illegible] کو دور کرنے کا

طریقہ یہ ہے کہ پہلی طرح اجتناب کیجیے [illegible] فرائض و واجبات کی ادائگی اور تلاوت قرآن اور اچھی کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رکھیے، نیز حسنِ اخلاق کو بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کیجیے، نوجوانوں کو حکمت و شفقت کے ساتھ بتائیے کہ سنیما اور اس کے ذریعہ اخلاق باختگی پھیلا کر انسان کی کتنی قیمتی متاع کو تباہ کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی وسوسے آئیں تو انہیں آنے دیجیے ان کی طرف دھیان نہ دیجیے، ان کی پروا نہ کیجیے۔ آپ ان کی طرف دھیان نہ دیں گے تو وہ بہت کم آئیں گے۔ انسان کی قدرت میں یہ نہیں ہے کہ وہ خراب قسم کے وسوسوں کا آنا بند کر سکے۔ اس کی قدرت میں جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ان کی پیدائش کے اسباب پر قابو حاصل کرے یعنی گندہ ادب خدا سے پھیرنے والا لٹریچر نہ پڑھے۔ قصداً غلط گانے نہ سنے اور ایسی تمام چیزوں سے اجتناب کرے جو ذہن کو بھٹکانے والی ہوں۔ وسوسے آئیں تو انہیں دماغ سے نکال دے۔ شیطان اور نفس کی شرارتوں سے پناہ مانگے اور خدا کی طرف متوجہ رہے۔ اس کے بعد اس کو وسوسوں سے کچھ نقصان نہ پہنچے گا بلکہ انہیں دور کرنے کا مجاہدہ ان شاء اللہ اس کے درجات کو بلند کرے گا۔

وسوسوں کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث بڑی تسلی بخش ہے:۔

وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار چند صحابہ نے حضورؐ سے کہا ’’یا رسول اللہ! ہم اپنے نفس میں ایسی باتیں پاتے ہیں کہ ان کو بولنے کے مقابلے میں زیادہ پسند ہے کہ ہم آگ میں جل کر کوئلہ بن جائیں یا ہمیں آسمان سے زمین پر پھینک دیا جائے۔ حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا:۔ یہ تو صریح ایمان کی علامت ہے۔

وسوسوں کے بارے میں آپ نے اپنا جو احساس لکھا ہے اس کو پڑھ کر مجھے یہ حدیث یاد آگئی۔ آپ بھی اس حدیث سے تسکین حاصل کریں۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا وسوسوں کے بارے میں عرض کیا گیا کیونکہ ان کا شرعی حکم یہ ہے کہ وہ قابلِ مواخذہ نہیں ہیں لیکن اگر وسوسے خیالات [illegible] میں بدل جائیں [illegible] دماغ میں جڑ پکڑ لیں یا کسی برائی کا [illegible] اور [illegible] کہ اگر موقع ملا تو ہم وہ برائی کریں گے تو اب یہ چیز قابلِ مواخذہ ہو جائے [illegible]

[illegible]

دماغ کو اس قدر مصروف رکھیے کہ برے خیالات کو آنے کا موقع ہی نہ ملے [illegible]
بھرے ہوئے تصور اور اپنے انجام کی فکر کو دوسری تمام چیزوں پر غالب کیجیے اور یہ چیز عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ اچھے خیالات کو محض خیالات کی حد تک باقی نہ رکھیے بلکہ ان کے مطابق عمل شروع کر دیجیے اور مسلسل عمل کیے جائیے۔ اچھے اعمال پر مداومت ایمان و یقین کی کیفیات میں اضافہ کرتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ وسوسے ہوں یا برے خیالات یا برے ارادے سب کا علاج یہ ہے کہ ہم سب اپنے آپ کو اچھے خیالات و اعمال میں اس قدر مشغول کر دیں کہ برے خیالات و اعمال کی فرصت ہی باقی نہ رہے۔ مخلص مسلمان کے اندر یہ خرابیاں بے عملی یا اپنے اوقات کو ایسی چیزوں میں صرف کرنے سے پیدا ہوتی ہیں جو فکر آخرت کو بھگانے والی ہیں ــــ مریض اگر اپنے مرض سے پریشان ہو لیکن مرض کو دور کرنے والے علاج سے غفلت برتے تو ظاہر ہے کہ مرض دور نہ ہوگا۔ بحمد اللہ آپ کا معاملہ تو صرف وسوسوں کی حد تک ہے اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، انہیں اپنے دماغ سے جھٹک دیجیے اور میدان عمل میں ایک مجاہد کی طرح زندگی بسر کیجیے۔

آخر میں دو باتیں بطور مشورہ اور بھی عرض کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ آپ بکثرت درج ذیل مختصر دعا اس کے معنی کے تصور کے ساتھ پڑھا کیجیے ان شاء اللہ اس سے فائدہ ہوگا۔

اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ	اے اللہ! میرے دل میں وہ باتیں ڈال
وَاَعِذْنِيْ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ وَشَرِّ	جو مجھے ہدایت و فلاح تک پہنچانے والی ہوں اور
الشَّيْطَانِ	مجھے میرے نفس کی شرارت اور شیطان کی
	شرارت سے نجات دے۔

دوسری یہ کہ سونے کے وقت سورۃ اخلاص (قل ھو اللہ) اور معوذتین (سورۃ فلق و سورۃ ناس) پڑھ کر سویا کریں۔

مدیر زندگی

لکھنؤ کا مشاورتی اجتماع

۸؍ اور ۹؍ اگست ۱۹۶۴ء کو لکھنؤ میں جو مسلمانانِ ہند کا جو مشاورتی اجتماع ہوا وہ ان کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادیِ ہند کے بعد کا کیا سوال، اس سے پہلے بھی دور دور تک کسی ایسے اجتماع کا نشان نہیں ملتا۔ مذہبی عقائد و اعمال کے لحاظ سے بھی اور سیاسی مکاتب فکر کی جہت سے بھی اتنے مختلف الخیال فرقِ نمایاں افراد کا ایک جگہ جمع ہونا اور سر جوڑ کر امت مسلمہ کے مسائل پر غور کرنا بجائے خود بڑی خوش آیند اور مسرت بخش چیز ہے۔ دوسری چیز جسے جان کر ایک مسلمان کو بڑی خوشی ہوتی ہے، یہ تھی کہ پورے اجتماع پر دینی و مذہبی فضا چھائی رہی اور خدا سے غفلت کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ کسی ایسے نمایندہ اجتماع میں جس کے دائرۂ غور و فکر میں سیاست بھی داخل ہو اور جس میں ہر فکر و عمل کے لوگ موجود ہوں، یہ چیز عرصۂ دراز سے مفقود تھی۔ مسائل پر غور کرتے وقت اپنے مسلمان ہونے کا تصور اور آخرت کی بازپرس کا احساس ہمارے سیاسی اجتماعات سے تو جیسے رخصت ہی ہو چکا تھا۔ لکھنؤ کے اجتماع نے مسلمانوں کو یہ گم شدہ دولت پھر عطا کر دی ہے۔ تیسری چیز جس نے ذہن کو خاص متوجہ کیا وہ یہ رپورٹ تھی کہ تمام قراردادیں اتفاق رائے سے پاس ہوئیں۔ ان باتوں سے یہ توقع پیدا ہوتی ہے کہ ان شاء اللہ یہ اجتماع امت مسلمہ کے لیے فالِ نیک ثابت ہوگا۔ مایوسی کی تاریکی میں امید کی یہ کرن اپنی روشنی ضرور پھیلائے گی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا خطبۂ استقبالیہ بعض پہلوؤں سے اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا:

"اس وقت ہندستان کے نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اہل نظر کی نگاہیں آپ کے اس اجتماع پر لگی ہوئی ہیں اور [illegible] دیکھ رہی ہے کہ آپ ہم ہندستان کے مسلمانوں کا عزم [illegible] [illegible] [illegible]

بھی ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کا آغاز کرنے کے لیے آپ کے طرزِ عمل اور رویہ کے بارے میں کا تقرر ہے سب سے پہلے ہم کو یہ کہ ہم خدائے علام الغیوب کے روبرو ہیں جو ہمارے دلی جذبات و احساسات کیفیات اور ہماری نیتوں اور ارادوں کو بھی دیکھتا ہے اور جس سے ہماری کوئی چیز مخفی نہیں۔ یَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ۔ ہمیں اپنی مجلس کی کاروائی مشوروں اور سرگوشیوں بحثوں اور تجاویز کے دوران میں کسی وقت اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی دانا و بینا ذات ہماری نگراں ہے۔ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ .... إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے کہیں ایسا نہیں ہوتا کہ مشورہ تین کا ہو جہاں وہ چوتھا نہیں ہوتا اور نہ پانچ کا جہاں وہ چھٹا نہیں ہوتا اور نہ اس سے کم نہ زیادہ جہاں وہ ان کے ساتھ نہیں ہوتا پھر وہ قیامت کے دن ان کے اعمال کی خبر دے گا۔ بے شک اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔

اس وقت ہمیں سب سے زیادہ جس چیز سے پرہیز کرنا چاہیے وہ انتشار جماعتی انانیت گروہی عصبیت اور جذبۂ تفوق ہے۔ خدا ہم سب کو اس نازک ترین لمحہ پر ہمارے نفوس اور ہمارے دلوں کی بیماری اور بے راہ روی سے بچائے اور ہم کو ہمارے نفسوں کے حوالے نہ کرے۔

خطبۂ استقبالیہ میں اس طرح کی تذکیر و تنبیہ — جو بہت ضروری اور مفید تھی۔ دوسرے بہت سے استقبالیہ خطبوں میں جو میں نے پڑھے ہیں شاید ہی کہیں نظر سے گزری ہو۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے وطن سے باہر نہ نکلنے کا جو فیصلہ کیا ہے اس کے بارے میں مولانا کہتے ہیں :۔

ہم نے اس ملک میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور میں جب آپ کے سامنے یہ الفاظ کہتا ہوں تو میرا ضمیر خود میرے دل میں چٹکی لیتا ہے اور کہتا ہے کہ رہنے کا فیصلہ کیا معنی، ہم یہاں پیدا ہوئے اور یہاں ہماری موجودگی قائم و استوار رہا ہے اور رواں دواں گنگا سے زیادہ حقیقی اور پائیدار ہے۔ ہماری جڑ اس ہمالیہ اور قطب مینار سے زیادہ مضبوط ہے اور ہمارا حق اس سے زیادہ ثابت ہے جتنا ان قابل فخر یادگاروں کا جن کو ہماری ہی صلاحیتوں نے وجود بخشا۔ ہم یہاں کے ہر مسئلے کو حل کریں گے۔ ہم یہاں کی تہذیب یہاں کی ثقافت اور یہاں کے تمدن میں اس طرح پیوست ہیں کہ ہم کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ملک سے وفا [illegible] بار شکایت کریں گے، ہم ہزار بار روٹھیں گے اور منیں گے۔ ہم ہر ہندوستانی کا گریبان پکڑ سکتے ہیں اور [illegible]

دوسرے کو کبھی بیچ نہیں دیں گے کہ وہ [illegible] اور ہم کو یہاں اسی پر زندگی [illegible] ہم کو

اس ملک میں رہنا ہے اور تمام خصوصیات اور تشخصات کے ساتھ رہنا ہے۔ ہم اس ملک کو تباہی،

فرقہ واریت اور فسطائیت کے راستے پر کبھی دیکھ نہیں سکتے۔ ہم کو اس بات کا پورا یقین ہے اور ملک

آثار و قرائن اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ حالات زیادہ دیر تک نہیں رہیں گے۔ انسانیت [illegible]

جمہوریت، فسطائیت پر، علم جہالت پر اور بقائے باہم کا فطری جذبہ اور ملک کی سچی محبت، کوتاہ نظری

اور جذباتیت پر غالب آکر رہے گی۔

دراصل یہی عزم و یقین، یہی حوصلہ و ولولہ، یہی خود شناسی اور اس ملک میں امت مسلمہ کی یہی افادیت وہ چیز ہے جو ہمارے مسائل کے جنگل کو صاف کر سکتی ہے۔ اگر دس بیس لاکھ مسلمان بھی اس عزم و یقین کے ساتھ متحد ہو جائیں تو عزت و وقار کی منزل کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

لکھنؤ کنونشن کے داعی اور صدر جناب ڈاکٹر سید محمود کا خطبۂ صدارت بھی عزم و یقین اور اسلامی و ایمانی جذبے سے سرشار ہے۔ وہ اپنے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں:-

شکر اس خدائے برتر کا جس نے ہم سب کے مجتمع ہونے کے احساس کو ایک زندہ اور عملی شکل عنایت فرمائی۔ آج آپ کے سامنے اس نشست میں جمعیۃ علماء اور جماعت اسلامی، متحدہ محاذ اور دینی کونسل، کانگریس اور لیگ، دیوبندی، بریلوی، حنفی اور اہل حدیث، سنی اور شیعہ مختلف مکاتب فکر کے اصحاب جمع ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس اجتماع کو نظر بد سے بچائے اور ساتھ ہی ہم کو توفیق عطا کرے کہ اپنے کاموں کو کامیاب کرنے کے لیے اسی طرح سر ملا کر بیٹھ سکیں ۔۔۔ اور مبارک باد ایک دوسرے کو اس پر کہ پیش آمدہ مسائل پر غور و خوض کرنے اور کوئی متفقہ فیصلہ کرنے کی جو خواہش عرصے سے دلوں میں پرورش پا رہی تھی اسے بروئے کار لانے کا ہم ایک موقع نکال سکے۔

زمانہ ہر وقت نت نئے چیلنج پیش کرتا اور ایک زندہ گروہ سے زندگی کا ثبوت پیش کرنے کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔ جو گروہ اس چیلنج کو قبول کرتا اور ان سوالات کا جواب دیتے ہیں [illegible] اور جو [illegible] کا انکار کرتے یا ان کا مقابلہ کرنے کے بجائے فرار اور گریز کی راہ اختیار کرتے ہیں وہ [illegible] فنا ہو جاتے ہیں [illegible] ساتھ [illegible] کہ زمانے کے [illegible] [illegible]

[illegible] رب العالمین کے لیے جذبۂ [illegible] لکھنے والے کا خلوص اس کام [illegible] کی بصیرت اور [illegible] سے اس کی محبت بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کو ان کا [illegible] یاد دلاتے ہوئے کہا ہے:

یاد رکھیے جو انسانی گروہ جتنا عظیم ارادہ لے کر اٹھتا ہے اسی تناسب سے اپنے مزاج اور افکار و خیالات کو بھی کشادہ رکھنا ہوتا ہے کوئی بڑا کام کیا ہی نہیں جا سکتا جب تک کہ اپنا ذہن ٹھنڈا اور اپنا دل وسیع نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو خیر امت قرار دیا ہے، یہ محض کوئی لقب نہیں ہے جسے فخر و پندار کے طور پر استعمال کیا جائے بلکہ ذمہ داریوں اور فرائض کا ایک بوجھ ہے جو اس منصب کے واسطے آپ کے سر ڈال دیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب بھی ہم نے اپنی اس حیثیت کو فراموش کیا ہے اسی وقت تاریکیوں اور پریشانیوں نے ہم کو گھیر لیا ہے اس لیے میں آپ سے عرض کروں گا کہ اپنی اس حیثیت کو ہمیشہ نگاہ میں رکھنے کی کوشش کیجیے اور ایک نئے عزم و ارادے کے ساتھ آگے بڑھیے ایسے عزم و ارادے کے ساتھ جو قطب مینار سے زیادہ بلند، لال قلعہ سے زیادہ مستحکم و مضبوط، تاج محل سے زیادہ خوبصورت اور صاف ستھرا اور اس عظیم ملک سے زیادہ وسیع ہو۔

کاش اگر مسلمان اپنے خیر امت ہونے کی حیثیت اور اس کے فرائض یاد رکھتے تو پھر یہ کالے دن دیکھنے ہی کیوں پڑتے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بالکل صحیح بات کہی ہے کہ "جب بھی ہم نے اس حیثیت کو فراموش کیا ہے اسی وقت تاریکیوں اور پریشانیوں نے ہم کو گھیر لیا ہے" اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری امتوں اور قوموں کے درمیان "خیر امت" وہ امت ہوتی ہے جس کا اخلاق و کردار، جس کی انسانیت و شرافت، جس کا عدل و انصاف، جس کی ہمدردی و رحم دلی، جس کی نیکی و نیک خوئی اور بنی نوع انسان سے جس کی بے لوث محبت ساری دنیا کے لیے رحمت و برکت کا سبب ہوتی ہے، جس کسی نے بھی اس کے ان صفات کا تجربہ کر لیا ہو ممکن نہیں کہ وہ اسے اپنے سے کاٹ پھینکنے پر تیار ہو جائے۔ دوسری طرف اس کا اتحاد و اتفاق، اللہ پر اعتماد، اپنے مقصدِ زندگی سے عشق اور [illegible] ایک ایسی چٹان ہوتی ہے جس سے ٹکرانے والا خود پاش پاش ہو جاتا ہے۔

ان سطروں میں ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کو جو مشورہ دیا ہے، ہمارے مسائل کا حقیقی حل یہی ہے [illegible] قرار دا [illegible] ساری جد و جہد فضول ہے اگر اس مشورے پر خلوص کے ساتھ عمل کر کے [illegible]

قوت کا اصل سرچشمہ ہمارا ایمان اور ہماری اجتماعیت ہے اس سے صرفِ نظر کرنے کے بعد دنیا کی کوئی قوت اور کوئی تدبیر ہمیں عزت کا مقام نہیں دے سکتی۔ ہمارے سامنے سب سے بڑا کام یہی ہے کہ امتِ مسلمہ کو اس کی قوت کے اصل سرچشمے سے قریب کریں اور اسے ایسی تمام راہوں سے دور ہٹانے کی سعی کریں جو ایمان و اسلام اور اسلامی اجتماعیت سے الگ کرنے والی ہوں۔

ایک اور چیز جس نے راقم الحروف کو مسرت و اطمینان بخشا یہ ہے کہ خطبۂ صدارت اور کنونشن کی قراردادوں میں خاصی ہم آہنگی موجود ہے۔ اس دفعہ ایسا نہیں ہوا کہ خطبۂ صدارت کا رخ کچھ اور رہا اور تجویزوں کا رخ کچھ اور ہو۔ آج سے چند سال پہلے ایک کنونشن میں ڈاکٹر صاحب ہی نے خطبہ صدارت پڑھا تھا اور وہ بھی اسلامی جذبے سے معمور تھا لیکن اس وقت جو تجویزیں پاس کی گئی تھیں ان سے خطبے کی روح غائب تھی۔ میں نے ماہنامہ زندگی کے "اشارات" میں ڈاکٹر صاحب کے خطبے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:-

> اس خطبے کا آخری اور المناک پہلو یہ ہے کہ کنونشن کی منظور کردہ تجاویز سے اس کی روح بالکل غائب ہے مجھے اعتراف ہے کہ کسی اجتماع کے خطبۂ صدارت کے بنیادی نکات اور اس کی تجاویز میں ایسی عدم مطابقت آج تک میں نے نہیں دیکھی تھی بلکہ خطبۂ صدارت میں کہی ہوئی باتوں سے بالکل متضاد تجویزیں بھی منظور کی گئی ہے۔ (زندگی، اگست ۱۹۶۱ء)

شکر ہے کہ اس دفعہ ایسا نہیں ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ دہلی کنونشن اور لکھنؤ کنونشن کی ساخت میں بڑا بنیادی فرق موجود ہے۔ بعض ممتاز افراد نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ لکھنؤ کنونشن کا بھی وہی حشر ہوگا جو دہلی کنونشن کا ہوا تھا۔ "نشستند وگفتند وبرخاستند" میرا خیال ہے کہ انھوں نے یہ بات مسلمانوں سے ایک عام مایوسی کی وجہ سے بھی کہی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ انھوں نے دونوں کے بنیادی فرق، دونوں کی فضا اور دونوں کی تجاویز پر غور نہیں کیا۔ اگرچہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ لکھنؤ کنونشن کا انجام وہ نہ ہوگا جو دہلی کنونشن کا ہوا لیکن ہمیں بہرحال انتہائی چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اور اسے مفید بنانے کے لیے سخت محنت کرنی ہے۔ اس سلسلے میں چند باتیں بالکل سامنے کی معلوم ہوتی ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ محسوس ہوتی ہے کہ اس کنونشن سے جو فضا تیار ہوئی ہے اسے برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لیے قراردادوں پر عمل پیرا ہونے میں دیر نہ لگنی چاہیے۔ ۲۱ افراد کی جو مجلس مشاورت بننے والی ہے اسے بلا تاخیر بن جانا چاہیے۔ اس مجلس مشاورت کے انتخاب کی نزاکتیں اپنی جگہ ہیں لیکن جرأت کرکے ان سے جلد عہدہ برآ ہونے کی کوشش نہ کی گئی تو خطرہ ہے کہ عام مسلمانوں میں سرد مہری پیدا نہ ہو اور یہ کنونشن کے ذمہ داروں کے

ہے کسی طرح قابل برداشت نہیں ہونی چاہیے۔ جلد انتخاب ہو اور جلد اس کی نشست ہو اور کام شروع کر دیا جائے۔

دوسری بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ تمام ہندوستان میں دورے کر کے عام پبلک کو یہ بتایا جائے کہ کنونشن نے کیا کچھ پاس کیا ہے اور اس سلسلے میں عام مسلمانوں کا فریضہ کیا ہے۔ دیہاتوں میں بسنے والے مسلمانوں کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جانی چاہیے کہ ان کی ایک اجتماعی قیادت وجود میں آگئی ہے اور وہ ان کے مسائل کو خلوص کے ساتھ حل کرنا چاہتی ہے۔ قیادت کی عدم موجودگی کے احساس سے جو محرومیت ان کے اندر پیدا ہوگئی ہے اسے دور کرنے کی فوری کوشش ہونی چاہیے۔

تیسری بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ اس کنونشن کے اثر کو ختم کرنے والی کوششوں پر کڑی نظر رکھی جائے اور اسے نظر انداز نہ کیا جائے، چاہے یہ کوشش مسلمانوں کے چند افراد ہی کی طرف سے کیوں نہ کی جا رہی ہو۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو میر جعفر اور میر صادق سے بھی زیادہ ذلیل روش اختیار کیے ہوئے اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے پوری طرح دوسروں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ ان کی اس معاملے میں ہر طرح مدد کی جائے گی کہ وہ کنونشن کے اثر کو ختم کریں اور مسلمانوں کو انتشار اور بے کسی کی راہوں پر دوڑاتے رہیں۔ دین و مذہب اور مسلمانوں کے تشخص اور ان کی انفرادیت سے صرف یہی نہیں کہ انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ ان چیزوں کو ختم کرنے میں وہ جن سنگھیوں اور مہاسبھائیوں جیسی سرگرمی دکھا رہے ہیں۔ مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یورپ سے درآمد شدہ نیشلزم پر بڑے خلوص کے ساتھ یقین رکھتے ہیں لیکن ان کا خلوص مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔

چوتھی بات یہ کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر میں جو اتفاق پیدا ہوا ہے اسے ہر قیمت پر باقی رکھنے کی پوری کوشش جاری رہنی چاہیے۔

مدیر
۵ ستمبر ۱۹۶۸ء

آدھی کتاب

م۔ نسیم صفحات ۸۰ کاغذ، کتابت، طباعت اوسط، قیمت ایک روپیہ۔ ناشر: ادارہ ادب اسلامی ہند۔ ٹانڈہ۔ ضلع فیض آباد۔ یوپی۔

یہ "آدھی کتاب" ادارۂ ادب اسلامی ہند کی ایک اور دلکش پیشکش ہے۔ جناب م۔ نسیم تحریک ادب اسلامی کے ممتاز ادیب ہیں۔ ان کے افسانے اور طنز و مزاح سے بھرے ہوئے ادب پارے عام طور سے پسند کیے گئے ہیں اور پسند کیے جاتے ہیں۔ ظرافت و لطافت ان کے مزاج کا جزو ہے اس لیے طنزیہ و مزاحیہ خاکے، افسانے اور مضامین لکھنے میں انھیں کسی تکلف اور تصنع کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ آدھی کتاب ان کے طنزیہ و مزاحیہ نگارشات کا مختصر مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ درج ذیل سات تحریروں پر مشتمل ہے۔

اس کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہوگا — تذکرہ — جدھر دیکھتا ہوں — وہ بخیل — ہدایت نامہ مجھ تماشائی — ڈکشنا اسم، فعل، حرف۔

پیروڈی ہو، یا طنزیہ افسانہ یا خاکہ یا مضمون، ہر تحریر دلچسپ ہے اور بے مقصد کوئی بھی نہیں، ہر طنز اور ہر مزاح میں کوئی نہ کوئی بہت ہی سنجیدہ مقصد چھپا ہوا ہے۔

صاحب کتاب نے "بھلائی کی بات" کے عنوان سے ایک مختصر، دلچسپ اور تیکھا پیش لفظ لکھا ہے۔ ابتدا میں لکھتے ہیں:۔

"اگر مجھے آپ سے کچھ دشمنی ہے تو میں بڑے خلوص سے یہ دعا کروں گا کہ خدا آپ کو مقدموں کا چسکہ لگا دے۔ اس بددعا کا مارا پانی بھی نہیں مانگ سکتا — یا مانگے گا تو عدالت کے در پر اور نا قدری کی شکست پر آخر میں لکھتے ہیں:—

"میں اپنے آن بیٹے قصور پر کہ "آدھی" حرکت پر ابھی تک نادم نہیں ہوں۔ مگر نا قدری کی زحمت سے مایوس

نہیں ہوں گے۔

اس تنبیہ کے بعد کوئی پیشہ ور ناقد بھی مشکل ہی سے نقد و نظر کی ہمت کر سکے گا اور میرے لیے تو ایک اور مشکل ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تحریر میں تو حضرت مصنف کا لوہا مانا ہی جاتا تھا اب تقریر میں بھی انھوں نے اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ تحریر تو تحریر اگر کہیں انھوں نے اپنی تقریر میں بھی ناقد پر دو چار جملے ارشاد فرما دیے تو رہی سہی عزت بھی گئی اس لیے ان کے "احتساب" کی طرح نقد و نظر فی الحال" باقی کتاب" کے ظہور تک ملتوی۔ اپنا پیش لفظ انھوں نے اس عبارت پر ختم کیا ہے:۔

"جس طرح چاند میں بھی عیب ہے۔ ہم لکھنے والوں میں بھی ایک آدھ خوبی ہے۔ جب ہم لکھ لیتے ہیں تب ہی تولنے والا وزن کے پیمانے بناتا ہے۔ انسان نے دوڑنا تو ابتدا سے شروع کر دیا تھا لیکن فاصلے کو گز میں اور کلومیٹر میں ناپنے کی سمجھ بعد میں بہت بعد میں پیدا ہوئی۔"

یہ بات شاید پیش لفظ نگار نے اپنے مضمون "ڈرنا، اسم، فعل، حرف" کے ماتحت لکھی ہے ورنہ وہ سوچ سکتے تھے کہ لکھنے والے بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور دوڑنے والے بہت دور تک دوڑ چکے ہیں اس لیے وزن کے پیمانے بھی بن چکے ہیں اور متعدد سائز کے گز بھی ایجاد ہو چکے ہیں۔ اب مصنفین کے ارشاد فرمانے کے بعد پیمانہ بنانے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ آدھی کتاب، پہلے سے بنے ہوئے پیمانے میں ناپ بھی سکتی ہے اور تل بھی سکتی ہے ۔۔۔ ارے یہ تو میں تنقید کی طرف بھاگنے لگا۔ صاحب کتاب معاف فرمائیں۔ اوپر میں جو وعدہ کر چکا ہوں اسے بھولنے لگا تھا۔

مختصر بات یہ ہے کہ آدھی کتاب ان لوگوں کے پڑھنے کے لائق بھی ہے جو تنقید کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور وہ لوگ بھی اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں جو کسی کتاب کو پڑھ کر صرف مسکرا دیتے ہیں یا منہ بسور کر اسے بند کر دیتے ہیں۔

مطلع وطن حصہ اول

سید علی مہدی رضوی ایم اے۔ ایل ایل بی ایڈوکیٹ۔ صفحات ۱۶۰، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ مجلد گرد پوش کے ساتھ قیمت پانچ روپیے۔ ملنے کا پتہ:۔ سید علی مہدی رضوی نامی منزل۔ بلرام پور ضلع گونڈہ۔

جناب سید علی مہدی رضوی نے اپنی شعری صلاحیت ہندستان کی منظوم تاریخ مرتب کرنے میں لگا دی ہے وہ ہندو پیریڈ مکمل کر چکے ہیں۔ اس پیریڈ کی تاریخ تقریباً پانچ ہزار اشعار میں آئی ہے لیکن زیر تبصرہ کتاب میں طوالت کے خوف سے انھوں نے تمام اشعار شائع نہیں کیے ہیں۔ اس کی وجہ سے بعض مقامات پر ابہام پیدا ہو گیا ہے

ندو پیریڈ کے بعد دو مسلم پیریڈ، برٹش پیریڈ اور موجودہ دور کی تاریخ بھی اشعار میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس کتاب
کے آخر میں انھوں نے مسلم دور کی ایک جھلک دکھانے کے لیے بھی چند اشعار شائع کیے ہیں۔ اشعار میں تاریخ
کی ترتیب آسان کام نہیں ہے اس کے لیے کلام پر بڑی قدرت کی ضرورت ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ
ہوتا ہے کہ قدرت نے انہیں کلام پر اچھی خاصی قدرت عطا کی ہے اور مشق سے یہ قدرت بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

تاریخی نقطہ سے اس کتاب پر میں کوئی ایسی رائے ظاہر نہیں کر سکتا جس پر خود مجھے اعتماد ہو اس لیے کہ ہندو
پریڈ کا کوئی تفصیلی مطالعہ میں نے نہیں کیا ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کتاب لائق مطالعہ ہے۔
متعدد مقامات پر شاعر نے اس قدر برجستہ رواں اور شعریت بدوش اشعار لکھے ہیں کہ ان کی شعری صلاحیت کا
اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

پوری کتاب بالاستیعاب پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا لیکن اکثر حصہ نظر سے گزرا ہے کہیں کہیں طبیعت میں کھٹک
سی پیدا ہوئی۔ ایسے چند مقامات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں تاکہ فاضل مصنف ان پر غور کریں۔

ص۱۱ پر ایک مصرع ہے۔ "عورتوں کو جیتے جی دم توڑنا آیا نہ تھا۔" جیتے جی دم توڑنا بے معنی سی بات ہے۔
ص۱۲ پر ایک مصرع ہے "پاؤں پلنے تھے مسافر کو چلانے کے لیے" یہ مصرع بچکانہ ہے۔ اسی صفحہ پر ہے "رنگ رنگ
کتری کو دور کرنے کے لیے" معلوم نہیں یہ رنگ کتری کیا چیز ہے۔ ص۱۳ پر "یہ اگر ہنس دیں تو درد زندگی بھی ہنس پڑے"
درد کی جگہ پر اگر زخم کا لفظ ہوتا تو بہتر تھا۔ ص۱۴ "پیچھے ہو مارتا بن گل بدا ماں ہو گیا" یہ بڑا غیر شاعرانہ مصرع ہے
اس میں پیچھے کا لفظ بھرتی کا ہے اور "ہو مارتا" ذوق لطیف پر بوجھ بن گیا ہے۔ ص۱۶ پر "جن کے ہاتھوں پر تھے فن
تیر اندازی کے فن" یہاں جمع کا استعمال بلا ضرورت ہے اور ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ "تیر اندازی کا فن" ہونا چاہیے۔
ص۲۵ "ہر یا ہینچے دارو کا فسانہ یاد ہے" یہ مصرع ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔ ص۲۹ "ہو عمل ظاہر عمل خیر عمل ہیں ہو عمل"
معلوم نہیں یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔ ص۳۶ "اپنے مرکز سے چلے آنا تھا ان کو دور میں" دور میں چلے آنے کا مطلب
کیا ہے؟ ص۴۵ جانور کی طرح سے کھاتے تھے چوپائے کا گوشت۔ ایک تھا ان کے لیے بکری ہو یا گائے کا گوشت"

جہاں تک تبصرہ نگار کو علم ہے مطلقاً جانور کا لفظ بول کر اس سے درندہ مراد نہیں لیا جاتا۔
لیکن شاعر نے لکھا یہاں جانور سے درندہ ہی مراد لیا ہے' ورنہ یہ مصرع معنوی حیثیت سے عجیب ہوگا۔ نیز
کہ گوشت کھانے والے انسانوں کو جانور یا درندہ کہنا مصنف نے کس طرح پسند کیا؟ گوشت نہ کھانے والے
ہندو بھی کیا اپنے آباؤ اجداد کے لیے یہ لفظ پسند کریں گے ؟ بحیثیت مجموعی منظوم

لائق مطالعہ ہے۔

کائنات میں انسان کا مقام
(اسلامی نقطۂ نظر سے)

تالیف مولانا محمد تقی امینی۔ صفحات ۳۶۔ کتابت طباعت بہتر
قیمت آٹھ آنے ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ تجدید دین۔ ہارڈنگ روڈ
لکھنؤ۔ یوپی

یہ پمفلٹ مولانا محمد تقی امینی کا وہ مقالہ ہے جو جنوری ۶۳ء میں تھیالوجیکل سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی دعوت پر یونین ہال میں پڑھا گیا تھا۔ کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے؟ اس مسئلے کی اہمیت و نزاکت واضح کرنے کے بعد فاضل مقالہ نگار نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس سوال کا جواب دیا ہے اور کائنات میں انسان کے مقام کی تعیین کی ہے۔ یہ پمفلٹ کالجوں کے طلبا اور جدید تعلیم یافتہ دانشوروں کے لیے بالخصوص مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

مکتبہ الحسنات " رام پور کی کچھ کتابیں

آؤ دین سیکھیں ۔ دین کی باتیں ۔ اسلام کی تعلیم ۔ نماز ۔ ایمان کی اہمیت ۔ دین کی خدمت ۔ دین کی حفاظت

1/- 1/25 1/- 60 1/25 1/75 1/75

آسان تفسیر ۔ حیات طیبہ ۔ راہِ عمل ۔ حلیۃ النبی ـــ ان کے علاوہ کہانیوں کی تمام کتابیں بھی مل سکتی ہیں ـــ

1/- 17.5 3/50 1/50 5/20

دار المصنفین اعظم گڈھ کی مندرجہ ذیل کتابیں بھی ہم سے طلب فرمائیں ۔

سیرت النبی جلد اول تا ششم ۔ خلفائے راشدین ۔ سیر الصحابہ اوّل تا ہفتم ۔ تاریخ اسلام اول تا چہارم ۔ مختصر تاریخ ہند

3/- 26/- 5/50 65/-

ہندستان کی کہانی ۔ الفاروق ۔ الغزالی ۔ المامون ۔ تاریخ دعوت و عزیمت اول ۔ دوم ۔ سیرت عمر بن عبد العزیز

1/50 6/- 3/75 5/25 8/- 1/25 3/-

سیرت عائشہ ۔ امام رازی ۔ مقالات شبلی اول تا ہشتم ۔ ارض القرآن اول، دوم ۔ رحمت عالم ۔

1/75 3/50 4/50 6/- 5/-

تفصیلات کے لیے لکھیں

منیجر مکتبہ زندگی و کائنات رامپور ۔ یوپی

دیہاتی معالج

ہمدرد دواخانہ (وقف)

دہلی ـــ کانپور ـــ پٹنہ

جمادی الاخری ۱۳۸۴ھ
نومبر ۱۹۶۴ء

زندگی

جلد: ۳۳
شمارہ: ۵

مدیر:- سید احمد قادری

• خط وکتابت وارسال زر کا پتہ: منیجر زندگی، رام پور۔ یوپی

• زر سالانہ:- چھ روپیے۔ شش ماہی:- تین روپیہ فی پرچہ:- ۶۰ پیسے

• ممالک غیر سے:- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں۔
منیجر ہفت روزہ شہاب ۲/۱۱ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ [illegible] سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر: احمد حسن۔ مطبع: دہلی پرنٹنگ ورکس۔ [illegible]
مقام اشاعت: دفتر زندگی، رام پور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گزشتہ سے پیوستہ

سید احمد قادری

امتِ مسلمہ کا نصب العین

یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہر نبی کی امت کا مقصدِ زیست، فریضۂ حیات اور نصب العین وہی ہوتا ہے جو خود اس نبی کا رہا ہے۔ نبی کی وفات کے بعد اس پر ایمان لانے والے لوگ اس بات کے ذمہ دار ہوتے ہیں کہ وہ اس مشن کو جاری رکھیں جس کے لیے اللہ نے اپنا رسول مبعوث کیا تھا۔ ہم تفصیل سے یہ لکھ چکے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد اقامتِ دین اور اظہارِ دین تھا۔ اس لیے خود بخود یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ امت مسلمہ کا فریضۂ حیات اور نصب العین بھی اقامتِ دین ہی ہو سکتا ہے کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ہم اقامتِ دین کے مفہوم پر بھی تفصیل سے لکھ چکے لیکن تمام بنی نوعِ انسان کے مقصدِ وجود کے بارے میں بالعموم اور امتِ مسلمہ کے منصبِ حیات کے بارے میں بالخصوص قرآن کریم نے اجمال پر اکتفا نہیں کیا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کی تفصیل بھی سامنے آجائے۔

انسان اس زمین پر اللہ کا نائب ہے

دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ اس اہم سوال کا صحیح جواب وہ ابتدائی سرا ہے کہ یہ اگر گم ہو جائے تو پھر زندگی کی گتھی الجھتی ہی چلی جاتی ہے اور انسان کی زندگی کا رویہ بگڑتا ہی چلا جاتا ہے اور اگر اسے یہ ابتدائی سوال جانے اور شعور کے ساتھ وہ مضبوطی سے اس کو تھامے تو اس کی زندگی کی گتھی سلجھ جاتی اور وہ اپنے کمالِ ارتقا تک پہنچ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں اس سوال کا صحیح جواب عطا کیا ہے اور اگر وہ عطا نہ کرتا تو انسانوں کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا جس سے وہ صحیح جواب تک پہنچ سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان کی حیثیت اس زمین پر خلیفۃ اللہ کی ہے وہ خدا کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس کا فریضۂ حیات کارِ خلافت کی انجام دہی ہے خلیفہ خدا

کہ اس سانحے سورۂ بقرہ کے چوتھے رکوع میں پردہ اٹھایا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ اِنِّیْ جَاعِلٌ — اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں

فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً — سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں

سورۂ بقرہ آیت ۳۰ تا ۳۹ کا متن اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ ہم یہاں صرف ترجمہ نقل کرتے ہیں:۔

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں،
انھوں نے کہا۔ کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خوں ریزی کرے اور ہم تو
تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہی ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہی ہیں؟ اس نے کہا۔ میں جانتا ہوں جو تم نہیں
جانتے (۳۰) اور اس نے سکھا دیے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے
ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام سے آگاہ کرو (۳۱) انھوں نے کہا تو پاک ہے، ہمیں تو تو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے
سوا کوئی علم نہیں، بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے۔ (۳۲) کہا، اے آدم! ان کو بتاؤ ان چیزوں کے نام
تو جب اس نے بتلائے ان کو ان چیزوں کے نام تو اس نے کہا۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین
کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے تھے (۳۳)
اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے، اس نے
انکار کیا اور گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے بن گیا۔ (۳۴) اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی دونوں
رہو جنت میں اور اس میں سے کھاؤ فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ
ظالموں میں سے بن جاؤ گے (۳۵) تو شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور ان کو نکلوا چھوڑا۔ اس عیش و
آرام سے جس میں وہ تھے، اور ہم نے کہا کہ اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے لیے ایک
خاص وقت تک زمین میں رہنا بسنا اور رکھانا پینا ہے۔ (۳۶) پھر آدم نے پا لیے اپنے رب کی طرف سے
چند کلمات، تو اس نے ان کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے (۳۷)
ہم نے کہا اترو یہاں سے سب، تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت
کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (۳۸) اور جو کفر کریں گے اور
جھٹلائیں گے ہماری آیات کو وہی لوگ دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۳۹)
سورۂ بقرہ کی ان آیات میں [illegible] انسان کی حیثیت [illegible]

کے لیے بے حد اہم ہیں۔ ان آیتوں کے تمام مشتملات و مضمرات پر گفتگو مقصود نہیں۔ زیر بحث مسئلے سے متعلق ٹکڑے کی تشریح یہاں کرنی ہے۔ آیت کے پہلے ٹکڑے کی تفسیر میں مولانا صدر الدین اصلاحی لکھتے ہیں:۔

"خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کی ملک میں اس کے سونپے ہوئے اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی منشاء کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشاء کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کیے ہوئے اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کے منشاء کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب نمک حرامی، غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

"یہ آیت بتاتی ہے کہ انسان اس زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ یہ منصب خلافت اس کے تاج عظمت کا وہ درخشاں گوہر ہے جو کسی بھی مخلوق کو نہیں بخشا گیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے سلسلۂ بیان میں اس بے نظیر نعمت کا ذکر بھی ایک خاص اہتمام سے فرمایا۔ پھر اسی کی جناب سے ملائکہ کے سامنے تخلیق آدم سے پہلے ہی اس کے ارادے کا ذکر اور وہ بھی اسی منصب خلافت ہی کا نام لے کر اس کی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ شاید انسان کے اس ذی شرف کا اس سے اونچا تخیل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اب انسان کی جس طرح یہ خود ناشناسی اور اپنی آپ تحقیر ہے کہ وہ ان مخلوقات کے آگے سر نیاز خم کر دے جن پر اس کو نیابتی آقائی اور حکمرانی کا مقام بخشا گیا ہے اسی طرح اس کی یہ خود فریبی اور خیانت اور غداری ہوگی کہ وہ اپنے اصل مالک کی مرضیات سے بے نیاز ہو کر من مانے طریقے سے زندگی بسر کرنے لگے۔

اس سلسلے میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی اصل حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوع انسانی کی تاریخ کا وہ باب پیش کر دیا گیا ہے جس کے معلوم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسر نہیں ہے۔ اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ ان نتائج سے بہت زیادہ قیمتی اور نفع بخش ہیں جنہیں زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر اور محض قیاس سے ڈھانچے کھڑے کر کے اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"

تفسیر القرآن، زندگی، جلد ۵، شمارہ ۲، دسمبر ۵۰ء

آیت (۳۰) کے دوسرے ٹکڑے قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:۔

قرآن مجید کی اصطلاح میں فساد فی الارض کا مفہوم یہ ہے کہ زمین کا نظم و نسق اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کے مطابق چلانے کے بجائے اس کو کسی اور طریقے پر چلایا جائے، خدا کی شریعت کی نافرمانی کی جائے اور اپنی خواہش کی پیروی کی جائے۔ زمین کے اصلی حکمران کی مرضی نظر انداز کی جائے اور خود اپنی مرضی چلائی جائے۔ یہ چیز بجائے خود فساد فی الارض اور بغاوت ہے۔ عام اس سے کہ یہ دیدہ دانستی اور سرکشی کے ساتھ واقع ہو یا کسی فکر و فلسفہ کے تحت پر امن طریقے پر۔ اس زمین کا اصلی حکمران اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کی حیثیت اس کے اندر اصل حکمران کی نہیں بلکہ اصل حکمران کے نائب کی ہے۔ اس وجہ سے اس زمین کے امن و عدل کا انحصار اس چیز پر ہے کہ اس کے ہر گوشے میں خدائی قانون ہی چلے۔ اگر اس کے کسی حصے میں خدا کا قانون باقی نہیں رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس حصے میں بغاوت پھوٹ رہی ہے اور یہ چیز اس پوری زمین کے لیے ایک خطرہ ہے۔

خوں ریزی فساد فی الارض کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب خدا کا قانون عدل باقی نہیں رہے گا تو لازماً اس کی جگہ انسان کی اپنی خواہشات کی فرماں روائی ہوگی۔ اس چیز کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی شخص کے بھی جان یا مال یا اس کی آبرو کے لیے کوئی ضمانت باقی نہیں رہے گی۔ کسی خاص خطۂ زمین کے مفسدین بالفرض کوئی ایسا نظام بنا بھی لیں جس میں باہمدگر ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے دیں تو اس سے وہ اپنے لیے تو ایک تحفظ کی شکل پیدا کر لیں گے لیکن دوسروں کے لیے وہ بدستور خطرہ ہی بنے رہیں گے۔ ان کی مثال ڈاکوؤں کے ایک جتھے کی ہوگی جس کے افراد نے آپس میں تو یہ سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے کے جان و مال پر دست درازی نہیں کریں گے لیکن اس جتھے سے باہر والوں کے جان و مال کو ان کی چیرہ دستیوں سے بچانے والی کوئی چیز بھی نہیں ہوگی۔ تمام عالم انسانی اور پورے کرۂ ارضی کے تحفظ کی ضمانت صرف خدا کا قانون ہی دے سکتا ہے جو سب کے جان و مال کی حفاظت کرتا ہے اور سب کو یکساں پابند کرتا اور یکساں آزادی بخشتا ہے۔

فرشتوں نے انسان کے بارے میں اس اندیشے کا اظہار اس کے خلیفہ ہونے کی بنا پر کیا اس لیے کہ خلیفہ کے لفظ کے اندر یہ چیز بھی ہوتی ہے کہ اس کو ایک خاص حد کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار تفویض ہوں گے۔ فرشتوں نے محسوس کیا کہ اختیار کو استعمال کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کو پا کر انسان [illegible] ہے۔

ہیں کہ مجھ سے زیادہ فہم قرآن رکھنے والے دو علماء کے یہ طویل اقتباسات اس لیے نقل کیے ہیں کہ میرے نزدیک بات مسلمہ کے نظریۂ حیات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے انسان کے منصب خلافت کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے اس کو نہ سمجھنے یا اس کا انکار کرنے والے اچھے اچھے ذہین افراد مسلمانوں کا رویہ زندگی بھی بہت ہی محدود اور ناقص ہو کر رہ جاتا ہے۔

نیابتِ الٰہی کس چیز میں؟

یہ دوسرا اہم سوال ہے جو اس مقام پر سامنے آتا ہے اور اس پر غور کر لینا بھی نہایت ضروری ہے۔ اس سوال پر غور نہ کرنے کی وجہ سے کچھ لوگوں کو لفظ "عبادت" کا مفہوم سمجھنے میں بھی الجھن پیش آتی ہے۔ اوپر جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں ان میں اس سوال کا جواب موجود ہے لیکن نمایاں نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اس سوال کو نمایاں کر کے اس کا جواب دیا جائے اور بتایا جائے کہ انسان کو خلافت ارضی کس مقصد سے عطا کی گئی ہے۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کسی کو نائب مقرر کرنے کا مطلب کیا ہوتا ہے اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جو کام اصل کو انجام دینے چاہیے تھے وہ اب اس کا مقرر کردہ نائب انجام دے گا اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجیے۔

اس دنیا میں خدا کا فرماں بردار بندہ بہت سے کام کرتا ہے، مثلاً وہ خدا کو پوجتا ہے، اس کی پرستش کرتا ہے اس کے سامنے رکوع اور اس کے حضور سجدے کرتا ہے، اس کی تسبیح و تقدیس میں رطب اللسان رہتا ہے اور اس کے سامنے انتہائی عاجزی و نیازمندی کے ساتھ دست سوال دراز کرتا ہے لیکن کیا ان کاموں میں وہ خدا کا خلیفہ اور نائب ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا کیونکہ خلافت اللہ کی نیابت ہے اور ان کاموں میں اس کی نیابت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پرستش مخلوق کا خاصہ ہے، خدا کی صفت نہیں۔ اللہ کی ذات اس سے بری ہے اسی طرح انسان کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے اور دوسری بشری حاجات پوری کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں میں وہ خدا کا نائب نہیں ہے تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کس چیز میں خدا کا خلیفہ ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس زمین پر خدا کے احکام کی "تنفیذ" لوگوں کے درمیان اقامت عدل اور دنیا کے انتظام کی اصلاح میں خدا کا نائب ہے اور اسی مقصد سے اسے خلافت ارضی عطا کی گئی ہے۔ فرشتوں پر انسان کو جو فضیلت حاصل ہے اسی خلافت ارضی اور اس سے متعلق علم جامع علمی کی وجہ سے ہے جو اللہ نے صرف انسان کو عطا فرمایا ہے ورنہ جہاں تک خدا کی پرستش اور اس کی تسبیح و تقدیس کا تعلق ہے فرشتے انسان سے بہت آگے ہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانی سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۳۰ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو ہر ایک چیز کا نام مع اس کی حقیقت اور خاصیت کے اور نفع و نقصان کے تعلیم فرما دیا اور یہ علم ان کے دل میں بلا واسطہ کلام القا کر دیا کیونکہ بدون اس کمالِ علمی کے خلافت اور دنیا پر حکومت کیونکر ممکن ہے۔ اس کے بعد ملائکہ کو اس حکمت پر مطلع کرنے کی وجہ سے ملائکہ سے امور مذکورہ کا سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنی اس بات پر کہ تم کارِ خلافت انجام دے سکتے ہو سچے ہو تو ان چیزوں کے نام و احوال بتاؤ۔ لیکن انھوں نے اپنے عجز و قصور کا اقرار کیا اور خوب سمجھ گئے کہ بدون اس علم عام کے کوئی کارِ خلافت زمین میں نہیں کر سکتا اور اس علم عام سے قدرِ قلیل ہم کو اگر حاصل ہوا بھی تو اتنی بات سے ہم قابلِ خلافت نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ کر کہا کہ تیرے علم و حکمت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

آیت کے فائدے میں لکھتے ہیں:۔

اس سے علم کی فضیلت عبادت پر ثابت ہوئی۔ دیکھیے عبادت میں ملائکہ اس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ معصوم، مگر علم میں چونکہ انسان سے کم ہیں اس لیے مرتبۂ خلافت انسان کو عطا ہوا اور ملائکہ نے بھی اس کو تسلیم کر لیا۔ اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے، کیونکہ عبادت تو خاصہ مخلوق ہے، خدا کی صفت نہیں۔ البتہ علم، خدائے تعالیٰ کی صفت اعلیٰ ہے اس لیے قابلِ خلافت یہی ہوئے کیونکہ ہر خلیفہ میں اپنے مستخلف منہ کا کمال ہونا ضروری ہے۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ ہمارے قدیم مفسرین کیا کہتے ہیں۔ امام بغوی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

والمراد بالخليفة ههنا آدم وسماه خليفة لانه خلف الجن اي جاء بعدهم وقيل لانه يخلفه غيره والصحيح انه خليفة الله في ارضه لاقامة احكامه وتنفيذ قضاياه (معالم التنزيل)

اس آیت میں خلیفہ سے مراد آدمؑ ہیں اور ان کو خلیفہ اس لیے کہا گیا کہ وہ جنات کے بعد ان کے جانشین بنائے گئے ہیں، اور ایک قول یہ ہے کہ ان کو خلیفہ اس لیے کہا گیا کہ دوسرے لوگ ان کے جانشین ہونے والے تھے اور صحیح بات یہ ہے کہ حضرت آدمؑ اللہ کی زمین میں اس کے احکام کی اقامت اور اس کے فیصلوں کی تنفیذ کے لیے اللہ کے خلیفہ تھے۔

تفسیر ماجدی میں بھی [illegible] ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

والصحیح انہ انما سمی خلیفۃ لانہ خلیفۃ اللہ فی ارضہ لاقامۃ حدودہ وتنفیذ قضایاہ (لباب التاویل)

اور صحیح قول یہ ہے کہ حضرت آدم خلیفہ اس لیے موسوم ہوئے کہ وہ اللہ کی زمین میں اس کے حدود کی اقامت اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے اللہ کے خلیفہ تھے۔

"خلیفۃ" کی تفسیر جلالین میں یہ ہے :۔

یخلفنی فی تنفیذ احکامی فیہا وھو آدم (جلالین)

وہ زمین پر میرے احکام کو نافذ کرنے میں میری نیابت کرے گا اور وہ خلیفہ آدم ہیں

تفسیر بیضاوی کی عبارت یہ ہے :۔

والخلیفۃ من یخلف غیرہ وینوب منابہ والمراد بہ آدم علیہ السلام لانہ کان خلیفۃ اللہ فی ارضہ وکذالک کل نبی استخلفہم فی عمارۃ الارض وسیاسۃ الناس وتکمیل نفوسہم وتنفیذ امرہ فیہم لا لحاجۃ بہ تعالیٰ الی من ینوبہ بل لقصور المستخلف علیہ عن قبول فیضہ وتلقی امرہ بغیر وسط (بیضاوی)

اور خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو دوسرے کا قائم مقام اور اس کا نائب ہو اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں اس لیے کہ وہ زمین میں اللہ کے خلیفہ تھے اور اسی طرح ہر نبی اللہ کے خلیفہ تھے اللہ نے تمام انبیاء کو زمین کی آبادی، لوگوں کے امور کی تدبیر، ان کے نفوس کی تکمیل اور ان پر احکام الٰہی کی تنفیذ کے لیے اپنا خلیفہ بنایا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اللہ کسی نائب کا محتاج ہے بلکہ اس لیے کہ جن لوگوں پر اس نے اپنا نائب مقرر کیا وہ بلا واسطہ اس کے احکام اور اس کے فیض کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

اسی طرح کی عبارت روح المعانی میں بھی ہے، جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں :۔

(خلیفۃ) انہ خلیفۃ اللہ فی ارضہ وکذا کل نبی الخ (روح المعانی)

آدم زمین میں اللہ کے خلیفہ تھے اور اسی طرح تمام انبیاء اللہ کے خلیفہ تھے۔

مفسرین کرام کی ان عبارتوں سے پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ نہ صرف حضرت آدم

(باقی صفحہ پر ملاحظہ ہو)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دو باتیں

مولانا جلیل احسن، ندوی

امام طبرانی نے اپنی کتاب معجم میں ایک حدیث روایت کی ہے جس کے الفاظ درج ذیل ہیں۔ آپ نے یہ حدیث دورِ اول کے مسلمانوں ——— صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ——— کے سامنے ارشاد فرمائی جو دینی لحاظ سے بہت اونچے مقام پر فائز تھے۔ اور جن کی سوسائٹی نہایت صالح بن چکی تھی۔ آپ نے ان کے سامنے بعد میں رونما ہونے والی خرابیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا۔

كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا طَغَىٰ
نِسَاؤُكُمْ وَفَسَقَ شَبَابُكُمْ
وَتَرَكْتُمْ جِهَادَكُمْ؟
قَالُوا وَإِنَّ ذَالِكَ لَكَائِنٌ
يَا رَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ نَعَمْ
وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ وَأَشَدُّ
مِنْهُ سَيَكُوْنُ قَالُوا وَمَا
أَشَدُّ مِنْهُ يَا رَسُوْلَ اللهِ
قَالَ كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا لَمْ
تَأْمُرُوا بِالْمَعْرُوْفِ وَلَمْ تَنْهَوْا
عَنِ الْمُنْكَرِ قَالُوا وَكَائِنٌ
ذَالِكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ قَالَ

تمہارا حال کیا ہوگا جب تمہاری عورتیں سرکش
ہو جائیں گی اور تمہارے نوجوان بگڑ جائیں گے
اور تم جہاد چھوڑ بیٹھو گے (صحابہ نے حیرت زدہ
ہو کر) کہا کہ اے اللہ کے رسول! کیا یہ خرابیاں
بھی امت میں رونما ہونے والی ہیں؟ آپ نے
فرمایا۔ ہاں یہ خرابیاں پیدا ہوں گی اور قسم ہے
اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے
اس سے زیادہ آفت اور شدید خرابی رونما ہوگی
صحابہ نے پوچھا اے اللہ کے رسول! اس سے
زیادہ [illegible] خرابی کیا ہوگی؟ آپ
نے فرمایا تمہارا کیا حال ہوگا جب تم لوگوں کو
نیک باتوں کا حکم [illegible] اور برائیوں

نَعَمْ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ وَاَشَدُّ مِنْهُ سَيَكُوْنُ قَالَ كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا رَاَيْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْكَرًا وَالْمُنْكَرَ مَعْرُوْفًا قَالُوْا اَوَكَائِنٌ ذٰلِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ نَعَمْ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ وَاَشَدُّ مِنْهُ سَيَكُوْنُ قَالَ كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا اَمَرْتُمْ بِالْمُنْكَرِ وَنَهَيْتُمْ عَنِ الْمَعْرُوْفِ قَالُوْا اَوَكَائِنٌ ذٰلِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ نَعَمْ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ وَاَشَدُّ مِنْهُ سَيَكُوْنُ يَقُوْلُ اللّٰهُ بِيْ حَلَفْتُ لَاُتِيْحَنَّ لَهُمْ فِتْنَةً مَتَنَ هَتَ الْحَلِيْمَ حَيْرَانَ۔

(معجم طبرانی)

برائیوں سے نہ روکو گے۔ لوگوں نے پوچھا۔ اے اللہ کے رسول! امت میں یہ خرابی بھی رونما ہوگی۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں! اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اس سے بھی شدید تر خرابی رونما ہوگی۔ آپ نے فرمایا۔ تمہارا کیا حال ہوگا جب تم بھلائی اور نیکی کو بدی اور برائی تصور کرنے لگو گے اور برائی تمہاری نظر میں نیکی اور اچھائی بن جائے گی۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا یہ بات بھی ہونے والی ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں! اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اس سے سخت تر خرابی رونما ہوگی۔ آپ نے فرمایا تمہارا کیا حال ہوگا جب تم لوگوں کو برائی اختیار کرنے کا مشورہ اور حکم دوگے اور بھلائی اور نیکی اختیار کرنے سے لوگوں کو روکو گے۔ لوگوں نے سوال کیا کہ کیا یہ بھی امت کے اندر ہونے والا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سے بھی سخت تر خرابی پیدا ہوگی۔ (اس کے بعد آپ نے فرمایا) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تب میں ان کے لیے ایسے ایسے فتنے اٹھاؤں گا کہ ان کے بڑے بڑے دانشمند بھی سر پکڑ جائیں گے۔

یہ حدیث اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے جب عورتیں جن کے اوپر سوسائٹی کا دارومدار ہے وہ خدا سے بغاوت کریں گی اور جب مسلم نوجوانوں کا طبقہ خراب ہو جائے گا اور جب خدا کے دین کی تبلیغ اور حفاظت اور اس کے

لیے جان و مال کی قربانیاں دینے کا جذبہ سرد پڑ جائے گا۔ اور جب لوگوں کی نظر میں نیکی بدی بن جائے گی اور برائی نیکی کی جگہ لے لے گی اور جب اس سے آگے بڑھ کر خدا کی ناپسندیدہ باتوں کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا جانے لگے گا اور نیکی اختیار کرنے سے روکا جانے لگے گا تب خدا کی طرف سے مسلمانوں پر ایسے ایسے فتنے برسیں گے جن کے نتیجے میں ان کے بڑے بڑے عقلاء اور دانش مند مدبر بھی چکرا جائیں گے کہ ان فتنوں سے چھٹکارا پانے کی کیا تدبیر کریں۔

یہ حدیث ہم مسلمانوں کو ٹھہر کر سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ اگر ہمارے اندر یہ خرابیاں ہیں تو ضروری ہے کہ ان سے ہم اپنی سوسائٹی کو پاک کرنے کی کوشش میں لگ جائیں ورنہ ہم ہر روز نئے فتنے سے دوچار ہوتے رہیں گے۔ اور مختلف قسم کی مشکلات میں گھرتے چلے جائیں گے۔ اور ہماری کوئی تدبیر ان مشکلات کو حل نہ کر سکے گی۔

(۲)

عن سعید بن زید قال:- قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قُتِلَ دُوْنَ مَالِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ دَمِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ دِیْنِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ اَھْلِہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ (ترمذی، ابن ماجہ، ترغیب و ترہیب)

حضرت سعید بن زیدؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو (مسلمان) اپنے مال کو بچانے کے سلسلہ میں قتل ہو جائے تو وہ شہید ہے اور جو اپنی جان بچانے کے سلسلے میں مار ڈالا جائے وہ بھی شہید ہے، اور جو اپنے دین کی حمایت و نصرت میں قتل کر دیا گیا وہ بھی شہید ہے، اور جو اپنی بیوی بچوں اور گھر کے دوسرے لوگوں کی حفاظت اور بچاؤ کے سلسلے میں قتل کیا گیا وہ بھی شہید ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ بالا ارشاد سے مسلمانوں کو حسب ذیل ہدایات ملتی ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کی زندگی قرآن مجید کے محور پر گردش کرتی ہے اور قرآن نے ان کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نصب العین دیا ہے، وہ از روئے قرآن اس بات کے پابند ہیں کہ جہاں رہیں وہاں وہ لوگوں کے لیے رحمت ثابت ہوں، ان کی زندگی خیر و صلاح کی زندگی ہو، اس لیے وہ شر و فساد، قتل و غارت گری، لوٹ اور اغوا، عصمت دری کے مرتکب نہ ہوں گے۔ اگر وہ اسلام لاتے ہیں تو لازماً دوسرے انسانوں کی جان و مال اور آبرو کے محافظ ہوں گے۔

۲۔ ایمان [illegible] زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور قیمتی متاع ہے۔ اس کی وجہ سے مومن کی حیثیت اس کی جان، اس کا گھر، اس کی جائداد اور جملہ سامانِ زیست قیمتی بن جاتے ہیں اور قیمتی چیز کو کوئی یوں برباد ہونے نہیں دے سکتا۔ اللہ کو بھی یہ بات پسند نہیں کہ جو چیزیں ایمان کی وجہ سے قیمتی ہو گئی ہیں انہیں یونہی برباد ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

۳۔ یہ حقیقت ہر مسلمان کو ہر وقت پیش نظر رکھنی چاہیے اور ہر حالت میں مستحضر رہنی چاہیے کہ اس کا گھر، اس کی زمین و جائداد، اس کے گھر کا جملہ سامان اور بیوی بچے اور دوسرے متعلقین جو اس کے زیر کفالت ہیں ازروئے کتاب و سنت وہ ان کا امین و محافظ ہے۔ اسے یہ حق نہیں ہے کہ خود ان کو برباد کرنے کے درپے ہو اور نہ وہ اس کا مجاز ہے کہ اپنی ان ساری امانتوں کو چوروں، ڈاکوؤں اور بلوائیوں اور فسادیوں کے لیے خوانِ یغما اور لقمۂ تر بننے کے لیے چھوڑ دے۔

۴۔ شہادت مسلمان کی سب سے بڑی تمنا ہوتی ہے اور شہید کا مرتبہ و مقام بہت اونچا ہے، عالمِ آخرت میں وہ جس اعزاز و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اس کا تصور اس دنیا میں کوئی ذہن نہیں کر سکتا اور علماء نے کہا ہے کہ جو دل شہادت کی تمنا سے خالی ہے اس میں ایمان نہیں اور شہید وہی نہیں ہوتا جو اسلامی اصولوں کے مطابق لڑی جانے والی لڑائی میں مارا جائے بلکہ وہ بھی مرتبۂ شہادت پاتا ہے جو بلوائیوں اور فسادیوں سے اپنے مال اور گھر اور بیوی بچوں کو بچانے کی خاطر لڑتا ہے اور مارا جاتا ہے۔

اوپر کی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہ ہدایت دی ہے کہ مومن روباہ صفت نہیں ہوتا۔ اگر کسی وقت کوئی فسادی آدمی یا فسادی ذہنیت کا کوئی گروہ تیری جان لینے، تیرے گھر بار کو جلانے اور لوٹنے، تیرے بیوی بچوں کو قتل کرنے، اغوا کرنے اور عصمت لوٹنے کے لیے بڑھے تو تجھے اپنی جان لے کر بھاگنا نہیں ہے بلکہ جان کو ہتھیلی پر رکھ کر مقابلہ کر! اگر تو اس مقابلے میں مارا گیا تو تیری موت "موت" نہ ہوگی بلکہ شہادت ہوگی جو مومن کی سب سے بڑی آرزو ہے۔ اور اگر تو مقابلے سے بھاگا تو خدا کا غصہ تجھ پر بھڑکے گا اور جو خدا کو اپنی بزدلی سے غصہ دلائے تو اس کی جان ۔۔ جسے وہ لے کر بھاگا ہے ۔۔ کہاں بچ سکتی ہے اور تاریخ سے پوچھو ایسی بزدل جان کبھی بچی ہے؟

تذکیر القرآن

مولانا جلیل احسن ندوی
جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، ضلع اعظم گڑھ

جناب مولانا جلیل احسن ندوی کا مطالعۂ قرآن وسیع ہے اور سالہا سال سے ان کے اوقات کا بڑا حصہ قرآن کریم کی تعلیم اور اس کے گہرے مطالعے ہی میں صرف ہو رہا ہے۔ ہم بڑی خوشی سے ان کی یہ مختصر تذکیر شائع کر رہے ہیں۔

مولانا نے امید دلائی ہے کہ ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ (ادارہ)

طٰسٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ
الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ نَتْلُوْا
عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَ
فِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝
اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ
وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا
يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ
يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ
نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ
مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَنُرِيْدُ
اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ

اس سورہ کا نام طٰسٓمّٓ ہے۔ یہ روشن کتاب (قرآن) کی آیتیں ہیں۔ ہم آپ کو (اے پیغمبرؐ) موسیٰؑ اور فرعون کی ٹھیک ٹھیک سرگزشت لوگوں (کی تسلی) کے لیے سناتے ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ بے شک فرعون سرزمین (مصر) میں جبار و متکبر بن گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں (رعایا) کو مختلف حیثیت قسموں میں بانٹ دیا تھا۔ وہ ان میں سے ایک گروہ (ابراہیمی مسلمانوں) کو دباتا اور ان کا زور توڑتا۔ ان کے لڑکوں کو ذبح کرتا اور عورتوں کو زندہ چھوڑتا۔ بلاشبہ وہ خدا کی اس زمین میں فساد کرنے والوں میں سے تھا (اس کا مقصد تو ابراہیمی اسلام اور ان کی نسل کو ختم کر دینا تھا)

اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ	اور ہمارا فیصلہ یہ تھا کہ ہم ان لوگوں کو اپنے فضل سے نواز
وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ	جن کا مصر میں زور توڑا جا رہا تھا اور ان کو ائمہ قرار دیں
الْوَارِثِينَ ۝ وَنُمَكِّنَ	اور ان کو علم نبوت کا وارث بنائیں اور ان کو زمین میں
لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ	حکومت و اقتدار بخشیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے
وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ	لشکر کو وہ (انجام) دکھا دیں جس سے بچنے کے لیے وہ سب
مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ	تدبیریں کر رہے تھے (چنانچہ ہمارا فیصلہ ہی نافذ ہوا اور
(القصص ۱ تا ۶)	فرعون اور حکیم خود فرعونیوں پر الٹ پڑی)۔

اوپر جو آیتیں پیش کی گئی ہیں وہ سورۂ قصص کی آیتیں ہیں جو مکی دورِ دعوت کے سخت ترین مرحلے میں نازل ہوئی۔ اس سورہ میں مسلمانوں کو یہ حقیقت ذہن نشین کرائی جا رہی ہے کہ رحمٰن کی رحمت تمہارے حصے میں آئے گی اور وقت کے جبار و متکبر جو تم پر توحید اختیار کرنے کے جرم میں مصائب توڑ رہے ہیں وہ بالآخر ناکام و نامراد ہوں گے۔ ان کا عددی تفوق، ان کی معاشی خوش حالی اور ان کا اقتدار ان کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔ جو نظریاتی عقائد کی کشمکش برپا ہے اس میں فیصلہ تمہارے حق میں ہوگا اور وقت کے فراعنہ بالآخر شکست سے دوچار ہوں گے۔ اس سورہ میں اہل ایمان کو بتایا جا رہا ہے کہ اس کائنات کی اصل فرماں روا طاقت اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا فیصلہ نافذ ہوتا اور اسی کا حکم چلتا ہے، اور اس کے فیصلے و ارادے سے اگر کسی کا فیصلہ و ارادہ ٹکراتا ہے تو وہ پاش پاش ہو کر رہتا ہے۔ چاہے اس کے پیچھے کتنی ہی بڑی طاقت ہو اور خواہ وہ کتنے ہی بڑے ذرائع و وسائل سے مسلح ہو۔ اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں فرعون اور قارون کی مثال دی ہے۔ فرعون بہت عظیم الشان عسکری طاقت رکھتا تھا، اس کی سلطنت نہایت وسیع و عریض تھی اور وسائل و ذرائع بہت تھے اور بنی اسرائیل (ابراہیمی تہذیب کے علم بردار، توحیدی عقیدہ رکھنے والے خاندانِ یعقوب سے تعلق رکھنے والے مسلمان) اس کی رعایا تھے۔ تورات کی تصریح کے مطابق ملکی آبادی کا دس فی صدی، فرعون اور اس کے ظالم وزراء نے فیصلہ کیا کہ ان ابراہیمیوں کو کسی طرح اپنی مشرکانہ تہذیب میں ضم کر لیں۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ تب انھوں نے ان اسرائیلی مسلمانوں کی نسل کو بتدریج حکمت کے ساتھ ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر تورات کا یہ اقتباس بہ غور پڑھیے:۔

تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسف کو نہیں جانتا تھا اور اس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ

دیکھو اسرائیلی ہم سے زیادہ اور قوی ہو گئے ہیں، سو آؤ ہم ان کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں۔ اس لیے انھوں نے ان پر بیگار لینے والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے کر انھیں ستائیں۔ سو انھوں نے فرعون کے لیے ذخیرے کے شہر پتوم اور رعمسیس بنائے .... اور مصریوں نے بنی اسرائیل پر تشدد کر کے ان سے کام کرایا اور انھوں نے ان سے سخت محنت سے گارا اور اینٹ بنوا بنوا کر اور کھیت میں ہر قسم کی خدمت لے کر ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی سب خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے تشدد کی تھیں .... تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی (مسلمان) دائیوں سے باتیں کیں اور کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے تم بچہ جناؤ اور تم ان کو پتھر کی بیٹھکوں پر بیٹھے دیکھو تو اگر بیٹا ہو تو اسے مار ڈالنا اور اگر وہ بیٹی ہو تو وہ جیتی رہے۔"

(خروج، پہلا باب، آیات ۹ تا ۱۸)

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ

حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد مصر میں قوم پرستانہ انقلاب آیا جس کے نتیجے میں مصریوں کی قومی حکومت برسر اقتدار آئی۔ یہ لوگ قبطی کہلاتے ہیں، اور فرعون اسی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ عام طور پر یہ لوگ حضرت یوسف علیہ السلام پر ایمان نہ لائے تھے۔ ان قبطیوں کے ہاتھ میں جب حکومت آئی، تو انھوں نے اسرائیلی مسلمانوں کا زور حکمت کے ساتھ توڑنے کی اسکیم بنائی، انہیں سماجی پستی میں دھکیلا جانے لگا، انھیں مزدوری اور دوسرے ادنیٰ درجے کے کاموں کے لیے مخصوص کیا گیا۔ پھر معاملہ اس سے آگے بڑھا اور یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ ان کی تعداد مختلف پرحکمت طریقوں سے گھٹائی جائے۔ چنانچہ اب لڑکے ذبح کیے جانے لگے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑتے تاکہ آہستہ آہستہ ان کی عورتیں قبطیوں۔ حاکم قوم کے تصرف میں آتی جائیں اور ان سے قبطی نسل اٹھے اور علماء تفسیر جن کی نظر اسرائیلی لٹریچر پر ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ قوم پرستانہ انقلاب حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کے سو سال بعد ہوا تھا۔ اس نئی قومی حکومت نے پہلے تو بنی اسرائیل کو ان کی زرخیز زمینوں اور ان کے مکانات اور جائدادوں سے محروم کیا، پھر حکومت کے تمام عہدوں سے بے دخل کیا۔ پھر مزید پستی میں گرانے کے لیے اور قوتوں کو ختم کرنے کے لیے [illegible] سخت محنت کے کام ان سے لیے جانے لگے۔ پھر قتل اولاد کا شاہی فرمان جاری ہوا۔

اوپر کے اقتباس میں [illegible] دائیوں کا ذکر ہے [illegible]

رکھتے ہی [illegible] اور وہ تیا
نیل میں پھینک دیا کرتی ہیں۔ غالباً ایسا اس لیے کیا گیا کہ عورتیں رقیق القلب ہوتی ہیں اس لیے ان سے فرض بہ
آسانی سے کرایا جا سکتا ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ فرعون ظالم کو یہ خیال آیا ہو کہ آخر یہ دائیاں بھی اسی قوم
نسل اور دینی تعلق رکھتی ہیں جس کی نسل کو ختم کرنا پیش نظر ہے۔ یہاں پر یہ بات بھی نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ قرآن
میں یذبح ابناءکم وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔ اطفالهم کا لفظ قرآن میں کہیں نہیں آیا ہے۔ ابناء جمع ہے ابن کی
جس کے معنی ہیں بیٹا۔ اس میں بچے تو آ سکتے ہیں مگر یہاں صرف وہی مراد ہیں اس کی کوئی واضح دلیل مجھے نہیں ملی۔
البتہ بائبل میں بچوں ہی کا ذکر آیا ہے جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں گزرا، اور ہماری تفسیری کتابوں میں بھی ذبح
اطفال ہی کا ذکر آتا ہے لیکن مجھے اب خیال ہوتا ہے کہ ابناء بنی اسرائیل سے ان کے ہر قسم کے ذکور مراد ہیں۔
جس میں بچے بھی شامل ہیں۔ کسی قوم کی نسل کو بتدریج حکمت کے ساتھ ختم کرنے کی صرف یہی شکل نہیں ہے کہ
پیدائش کے بعد بچوں کو ہلاک کیا جائے بلکہ یہ بھی اس کی شکل — سہل الحصول شکل — ہے کہ اس قوم کے
مرد افراد قتل کیے جائیں۔ ایسے حالات میں اسرائیلی قبطی فرقہ وارانہ فسادات کا وقوع کیا آپ مستبعد خیال
کرتے ہیں؟

اوپر ہم نے بائبل کی عبارت محض اس لیے نقل کی ہے کہ آیات میں جس تاریخی واقعہ کا ذکر آیا ہے اس
کی مزید وضاحت ہو جائے۔ ورنہ جہاں تک تسلی اور تثبیت کا تعلق ہے یہ آیتیں بالکل واضح ہیں۔ مکی مسلمانوں
کو بتایا جا رہا ہے کہ اپنے موقف پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہو۔ کار دعوت میں صبر کے ساتھ لگے رہو۔ اپنے دین و
ایمان کو سینے سے چمٹائے رہو۔ ظلم و ستم کے جو پہاڑ تم پر ایمان لانے کے جرم میں توڑے جا رہے ہیں ان کے
مقابلے میں تم ضبط و تحمل اور صبر و استقامت کے پہاڑ بن جاؤ۔ اللہ کی مدد آنے والی ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا
کہ تم سے پہلے اسرائیلی مسلمانوں کے ساتھ ان کے رب نے کیا معاملہ کیا؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ان کے رب نے صبر و
استقامت علی الحق کا انہیں کیا صلہ دیا؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ فرعون اور اس کی پوری جنگی قوت بحر قلزم میں کس
طرح تباہ ہوئی؟ اور کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے بعد پھر قبطی قوم کو اٹھنا نصیب نہیں ہوا اور ہمیشہ وہ اس پار
کی قوموں کے غلام بنتے آ رہے ہیں؟ اور کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہی اسرائیلی مظلوم مسلمان آخرکار مصر و شام
عراق و فلسطین وغیرہ وسیع علاقے کے وارث بنے۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا ... اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور (ضعیف) سمجھے جاتے تھے

يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ
وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا
فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ
الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ
بِمَا صَبَرُوا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ
يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا
يَعْرِشُونَ (اعراف، ۱۳۷)

جاتا تھا، مبارک سرزمین (فلسطین) کے ساتھ اس کے
مشرقی اور مغربی علاقوں کا وارث بنا دیا اور (اے
پیغمبر) تمہارے رب کا بہترین وعدہ بنی اسرائیل کے
لیے پورا ہوا ان کے صبر کے صلے میں، اور فرعون اور فرعونیوں
کے (قصور و محلات اور جنگی و صنعتی کارخانے) جو وہ بناتے
تھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا، اور انگور جسے وہ ٹٹیوں پر
چڑھاتے تباہ کر ڈالا۔

یعنی اقتدار اور اس کے تمام مظاہر، معاشی خوش حالی اور اس کے تمام ذرائع و وسائل تباہ ہو گئے۔ فَأَخْرَجْنَاهُم مِّن جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَكُنُوزٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ۝ كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِي إِسْرَائِيلَ (شعراء) ہم نے فرعون اور فرعونیوں کو بے دخل کر دیا۔ باغوں اور چشموں سے، اور خزانوں اور بہترین جگہ سے، اور یہ واقعہ یوں ہے ایسا ہی ہوا جیسا ہم کہہ رہے ہیں اور ان چیزوں کا وارث بنایا بنی اسرائیل کو۔ مظلوم بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے کیوں زمین کی وراثت بخشی؟ یہ اس لیے ہوا کہ جس مقدار سے فرعونی مظالم کی شدت بڑھتی رہی، اسی مقدار سے مظلوموں کا حق پر جماؤ بڑھتا رہا۔ سوز اندروں بڑھتا رہا، اللہ کے حضور رونا اور گڑگڑانا بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ مظلومی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور ظالموں کو جو مہلت اللہ کی طرف سے ملی تھی ختم ہو گئی تب اللہ کے طاقتور ہاتھ نے قبطی مشرکوں کو پکڑا اور وہ بالکل بجھ کر رہ گئے اور کہیں سے ان کو مدد نہ ملی۔ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ۔ پس ان پر نہ تو آسمان نے نوحہ کیا اور نہ ان کے لیے زمین ہی نے آنسو بہائے اور نہ انہیں مزید مہلت ملی۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

سید جلال الدین عمری

اس مضمون کی چار قسطیں اس سے پہلے 'زندگی' مارچ تا جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر غیر مسلموں میں دعوتِ دین کا کام بھی ہے اور مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کا کام بھی۔ اس کے پہلے جزو پر جون ۱۹۴۸ء کے شمارے میں لکھ چکا ہوں۔ اب اس کے دوسرے جزو پر گفتگو کی جا رہی ہے

جلال الدین

دعوت و تبلیغ اور تنظیم و تربیت کے درمیان بہت ہی گہرا ربط ہے۔ بظاہر یہ دو کام ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی کام کے دو رُخ ہیں کیونکہ یہ ایک ہی نظریے کے تحت انجام پاتے ہیں۔ دعوت جس نظریے کی اساس پر اٹھتی ہے اسی نظریے کی اساس پر تنظیم بھی وجود میں آتی ہے۔ ایک خدا پرست دنیا کو خدا پرستی کی دعوت دے گا اور خدا پرستی کی اساس پر اپنی جماعت کی تشکیل کرے گا۔ اس کے برخلاف جو شخص خدا کا منکر ہوگا وہ انکارِ خدا کی تبلیغ کرے گا اور اسی بنیاد پر اس کے ماننے والوں کی تنظیم بھی ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ دعوت کے مخاطب وہ لوگ نہیں ہوتے جو تنظیم کے مخاطب ہوتے ہیں لیکن خطاب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہوتا ہے۔ اس لیے امتِ مسلمہ جو کام اپنے دائرے سے باہر کرنا چاہتی ہے اسے وہ کام اپنے دائرے کے اندر بھی کرنا ہوگا، بلکہ وہ دوسروں پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام کرنے سے پہلے خود اپنے آپ کو معروف کا حکم دے گی اور منکر سے باز رکھے گی۔ اگر وہ اپنے اوپر معروف کو قائم نہ کرے اور اپنے آپ کو منکر سے نہ روکے تو دوسروں کو صحیح معنی میں نہ تو معروف کا حکم دے سکتی ہے اور نہ منکر سے منع کر سکتی ہے۔ ہم یہاں امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر اسی حیثیت سے بحث کرنا چاہتے ہیں کہ وہ امت کی داخلی اصلاح اور تربیت کا کام ہے۔

دنیا کا کوئی گروہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس کا ہر فرد برائیوں سے یکسر پاک اور صلاح و تقویٰ کے سب

ہے جے معیار پر ہو۔ ہر جماعت میں اچھے اور برے دونوں طرح کے انسان ہوتے ہیں، جماعت کے نیک صالح افراد کا یہ فرض ہے کہ بروں کی اصلاح کریں اور ان کو راہ راست پر لے چلیں۔ اگر انھیں سفاس میں کوتاہی کی تو برائی عام ہوگی اور پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دے گی کسی قوم کے عروج کا زمانہ وہ ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی سے برائیوں کو دور کرتی رہتی ہے اور اپنی اخلاقی قوت میں ہر وقت اضافہ کرتی رہتی ہے جس جماعت میں اچھوں کی تعداد بروں کی تعداد سے زیادہ ہو اور برائی صرف چند گوشوں میں محدود ہو خدائے تعالیٰ اسے زمین پر باقی رکھتا اور اس کے لیے ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ لیکن اگر بروں کی تعداد اچھوں کی تعداد پر غالب آگئی ہے اور زندگی کے ہر گوشے میں بدی پھیل گئی ہے تو خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ زوال کی طرف بڑھنے لگتی ہے اور دھیرے دھیرے ختم ہو جاتی ہے۔ اس تباہی و بربادی میں وقت لگ سکتا ہے اور بالعموم لگتا ہی ہے لیکن کوئی بدکردار قوم اس سے بالکلیہ محفوظ نہیں رہ سکتی۔ یہی حقیقت قرآن کریم کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے:۔

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ	اس فتنے سے ڈرو جو مخصوص طور پر تم میں
الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ	سے صرف ان ہی لوگوں کو نہیں لاحق ہوگا جنھوں
خَاصَّةً	نے ظلم کیا ہے (بلکہ وہ عام ہوگا اور اس کی زد
(الانفال: ۲۵)	میں سب ہی آجائیں گے)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:۔

مَا مِنْ قَوْمٍ يُعْمَلُ فِيهِمْ	جس کسی قوم میں خدا کی نافرمانی کی جاتی رہے
بِالْمَعَاصِي ثُمَّ يَقْدِرُونَ عَلَى أَنْ	اور اس میں ایسے لوگ موجود ہوں جو اس کو بدل
يُغَيِّرُوا ثُمَّ لَا يُغَيِّرُوا إِلَّا يُوشِكُ	سکتے ہوں اور پھر وہ نہ بدلیں تو بہت جلد اللہ تعالیٰ
أَنْ يَعُمَّهُمُ اللَّهُ مِنْهُ بِعِقَابٍ[1]	ان پر اپنا عام عذاب بھیج دے گا۔

آپ سے زینب بنت جحشؓ نے پوچھا۔ أَنَهْلِكُ وَفِينَا الصَّالِحُونَ؟ کیا ہم ہلاک ہو جائیں گے جب کہ ہمارے اندر نیک لوگ موجود ہوں گے؟ آپ نے جواب دیا۔ نَعَمْ إِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ[2] ہاں جبکہ بدی بہت بڑھ جائے

---

[1] ابوداؤد کتاب الملاحم باب الامر والنہی۔ و روی الترمذی والنسائی بمعناہ

[2] بخاری کتاب الفتن باب ویل للعرب من شر قد اقترب۔ مسلم کتاب الفتن واشراط الساعۃ

قرآن نے مختلف و ق پیغمبروں کی داستان کئی کئی بار بیان کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کسی قوم میں دعوت حق اٹھتی ہے تو وہ دو گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ اصحاب غرض اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اصحاب اخلاص آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیتے ہیں اور وہ ان کے دل و دماغ میں پوری طرح اتر جاتی ہے۔ ان کے ایک ایک عمل سے اس کا اظہار ہوتا ہے اور وہ پوری وفاداری کے ساتھ اس کی خدمت کرتے ہیں۔ وہ اس کے لیے ہر طرح کی مشقتیں برداشت کرتے ہیں حتیٰ کہ ان کی زندگی اور موت اسی کے لیے اور صرف اسی کے لیے ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ حالت زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہتی۔ رفتہ رفتہ باعمل انسانوں کی جگہ بے عمل افراد لینے لگتے ہیں۔ ان کی زندگی نفاق کا شکار ہو جاتی ہے اور وہ خدا کا نام لینے کے باوجود خدا سے دور ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے چند پیغمبروں کے ذکر کے بعد ایک جگہ کہا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ	پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے
أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ	جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات کی پیروی
(مریم: ۵۹)	کی۔

اپنے اسلاف کے یہ بدترین جانشین دعوت حق کے لیے باعث رسوائی ہوتے ہیں' ان کا وجود اسلامی جماعت کے لیے اس کے کھلے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور کبھی ہوتا بھی ہے۔ ان کی اصلاح کی کوشش کرنا ان کے غلط اثرات کو پھیلنے سے روکنا ان لوگوں کا کام ہے جو صحیح معنوں میں خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر کسی کے اندر اس اصلاح کی تڑپ نہیں ہے اور وہ اس کو بدلنے کے لیے بے چین نہیں ہے تو اس کا ایمان خطرے میں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

ما من نبی بعثه الله تعالیٰ فی	مجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جس امت میں بھی
امة قبلی الا کان له من امته	اپنا کوئی نبی بھیجا تو اس امت میں اس کے ایسے مددگار
حواریون واصحاب یاخذون	اور ساتھی ضرور رہے جو اس کے بتائے ہوئے طریقے
بسنته ویقتدون بامره ثم انها	پر عمل کرتے اور اس کے احکام کی اتباع کرتے۔
تخلف من بعدهم خلوف یقولون	پھر ان کے ایسے برے جانشین پیدا ہونے لگے جو ایسی
ما لا یفعلون ویفعلون ما لا یؤمرون	وہ کہتے جن پر خود عمل نہیں کرتے اور کام وہ کرتے
فمن جاهدهم بیده فهو مومن	جن کا ان کو حکم نہیں دیا جاتا۔ جو ان سے ہاتھ سے

ومن جاهدهم بلسانه فهو	اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے
مومن ومن جاهدهم بقلبه فهو	نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس
مومن وليس وراء ذالك من	نے ان سے اپنے دل سے جہاد کیا وہ مومن ہے۔
الايمان حبة	اگر یہ بھی نہیں ہے تو ایمان رائی کے دانے کے برابر
خردل[1]	بھی نہیں ہے۔

بگڑے ہوئے ماحول میں نیک سے نیک آدمی کے بھی راہ راست سے ہٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس سے نجات کی صورت صرف یہ ہے کہ آدمی اس ماحول سے پوری قوت کے ساتھ اور مسلسل جنگ کرتا ہے شر کے مقابلے میں خیر کا داعی بن جائے اور جہاں کوئی خرابی نظر آئے اس کی اصلاح کے لیے دوڑ پڑے۔ اگر اس میں اس نے کوتاہی کی تو ماحول کے غلط اثرات خود اس کی ذات پر پڑنے لگیں گے اور وہ بگاڑ سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔ بسا اوقات انسان یہ دیکھ کر اصلاح کی کوشش چھوڑ دیتا ہے کہ اس کی بات سنی نہیں جاتی اور اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا' حالانکہ اس میں خود اس کا ذاتی نقصان ہے۔ جب آدمی بدی کے مقابلے میں شکست کھا کر اصلاح کی کوشش چھوڑ دیتا ہے تو فطری طور پر اس کے دل میں برائیوں کے خلاف وہ نفرت بھی باقی نہیں رہتی جو فی الواقع ہونی چاہیے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ ان سے مانوس ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ برائیوں سے شدید نفرت کرنے والا انسان خود ان ہی میں لت پت ہو جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں برائیاں پھیلنے لگیں تو ابتدا میں نیک لوگ ان برائیوں کو ٹوکتے تھے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی تنقید کارگر نہیں ہو رہی ہے تو انھوں نے تنقید چھوڑ دی اور ان ہی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگے۔ لیکن بروں کی صحبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ برائی سے نفرت جو ایک مومن کا سرمایہ ہوتی ہے ان کے دلوں سے ختم ہو گئی۔ اب ان میں ایسے افراد نہیں رہے جو بدی کو بدی کہتے اور اس پر نکیر کرتے۔ جب یہ حالت ہو گئی تو خدا کی نظر عنایت ان سے پھر گئی اور وہ اس کی لعنت کے مستحق قرار پائے۔ ابوداؤد کی روایت ہے:-

قال رسول الله صلى الله عليه	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل
وسلم: ان اول ما دخل النقص على	میں نقص کی ابتداء یوں ہوئی کہ ایک

[1] مسلم کتاب الایمان باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان

بنی اسرائیل کان الرجل یلقی	آدمی دوسرے آدمی سے (جو مرتکب جرم ہوتا)
الرجل فیقول یا ھذا اتق اللہ دع	ملاقات کرتا اور اسے سمجھاتا کہ اے اللہ کے بندے
ما تصنع فانہ لا یحل لک ثم	خدا سے ڈرو اور اپنے اس غلط کام کو چھوڑ دو کیونکہ
یلقاہ من الغد فلا یمنعہ	یہ تیرے لیے جائز نہیں ہے (لیکن اس نصیحت کا اس
ذالک ان یکون اکیلہ وشریبہ	پر کوئی اثر نہیں پڑتا) اب یہ ناصح اس سے دوسرے
وقعیدہ فلما فعلوا ذالک	دن ملتا تو اس کی معصیت اسے اس چیز سے نہیں
ضرب اللہ قلوب بعضھم	روکتی تھی کہ وہ اس کا ہم پیالہ وہم نوالہ وہم مجلس
علی بعض ثم قال لعن الذین	بن جائے۔ جب یہ حال ہوا تو اللہ نے سب کے
کفروا من بنی اسرائیل	دل ایک سے کر دیے۔ اس کے بعد آپ نے قرآن
علی لسان داؤد وعیسی	کی آیت پڑھی کہ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں
ابن مریم[1]	نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان
	سے لعنت کی گئی۔

قرآن نے بنی اسرائیل کے علماء اور برسر اقتدار گروہ کی مذمت کی ہے کہ اللہ نے ان کو اصلاحِ امت کا اونچا مقام دیا تھا لیکن وہ اپنی ذمہ داریوں سے غافل تھے۔ عوام ان کے سامنے معصیت کی زندگی گزار رہے تھے، ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کر رہے تھے اور حرام و حلال سے بے نیاز ہو چکے تھے لیکن وہ اس صورتحال کو بدلنے کی قطعاً کوشش نہیں کر رہے تھے۔

وَتَرٰی کَثِیْرًا مِّنْھُمْ	اور تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے
یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ	کہ وہ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں اور
وَاَکْلِھِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ	حرام مال کے کھانے میں ایک دوسرے سے سبقت
لَوْلَا یَنْھٰھُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ	لے جاتے ہیں۔ یقیناً بہت ہی برا ہے جو یہ کر رہے
عَنْ قَوْلِھِمُ الْاِثْمَ وَاَکْلِھِمُ	ہیں۔ ان کو ان کے مشائخ اور علماء جھوٹ بولنے اور
السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا	مال حرام کھانے سے کیوں نہیں منع کرتے۔ یقیناً بہت

[1] ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب الامر والنھی ورد الترمذی بمعناہ

يَصْنَعُونَ ○ (المائدہ ۵: ۶۲-۶۳) برا کارنامہ ہے جو وہ انجام دے رہے ہیں۔

ان آیات کے ذیل میں امام رازیؒ فرماتے ہیں:-

ان اللہ تعالیٰ استبعد من اهل الکتاب انهم ما نهوا سفلتهم و عوامهم عن المعاصی و ذالک یدل علی ان تارك النهی عن المنکر بمنزلة مرتکبه لانه تعالیٰ ذم الفریقین فی هذه الآیة علی لفظ واحد[1]	اللہ تعالیٰ نے علماء اہل کتاب سے یہ بات بعید سمجھی ہے کہ انہوں نے اپنے نیچے کے لوگوں اور عوام کو معاصی سے منع نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ منکر سے نہ روکنے والا بھی منکر کا ارتکاب کرنے والے ہی کے درجے میں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دونوں گروہوں کی ایک ہی قسم کے الفاظ میں مذمت کی ہے۔

امام رازی اور دوسرے مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن نے منکر کا ارتکاب کرنے والوں کے بارے میں اتنا سخت انداز اختیار نہیں کیا ہے جتنا سخت کہ منکر سے منع نہ کرنے والوں کے بارے میں اختیار کیا ہے۔

قرآن نے ان آیات میں علماء بنی اسرائیل پر جو تنقید کی ہے اس کا مقصد امت مسلمہ کو خوش کرنا نہیں ہے اس میں امت کے اہل علم کو بتایا گیا ہے کہ وہ بھی خدا کی اسی تنقید کا نشانہ ہوں گے اگر اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہو جائیں اور اصلاح امت کا کام چھوڑ بیٹھیں۔ خدا کو نہ تو کسی سے کوئی ذاتی تعلق ہے کہ اس کی کمزوریوں کے باوجود اس سے محبت کرے اور نہ کسی سے اسے ذاتی عداوت اور دشمنی ہے کہ اس کی خوبیوں کے باوجود اس سے نفرت کرے۔ اسی وجہ سے حق پرست علماء نے ہمیشہ اس آیت کو اپنے حق میں زبردست تنبیہ سمجھا ہے۔ ابن جریرؒ فرماتے ہیں:-

کان العلماء یقولون ما فی القرآن آیة اشد توبیخا للعلماء من هذه الآیة ولا اخوف علیهم منها	علماء کہا کرتے تھے کہ قرآن میں کوئی بھی آیت ایسی نہیں ہے جس میں اصحاب علم کے لیے اس سے سخت توبیخ ہو اور نہ کوئی آیت ایسی ہے جو ان کے لیے اس سے زیادہ خوف کا باعث ہو۔

اس آیت کے بارے میں یہی بات حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ضحاکؒ اور عطاءؒ تابعی نے کہی ہے۔[2]

---

[1] تفسیر کبیر ج ۳ ص ۴۳۴ [2] جامع البیان فی تفسیر القرآن ج ۶ ص ۱۴۸

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے قومی بگاڑ اور تباہی کے ذکر کے بعد امت کو ہدایت کی ہے کہ :

ہاں قسم خدا کی تم ضرور معروف کا حکم دو	کلا واللہ لتامرن بالمعروف
اور منکر سے روکو۔ ظالم کا ہاتھ پکڑلو	ولتنھون عن المنکر ولتاخذن علی
اور اس کو مجبور کرکے حق کی طرف پھیر دو۔	ید الظالم ولتاطرنہ علی الحق اطرا[1]

امر بالمعروف ونہی عن المنکر اصلاح امت اور دین کو بگاڑ سے بچانے کا زبردست کام ہے تاریخ بتاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں جو پیغمبر آئے تھے ان میں سے بعض کی تعلیمات بالکل مٹ گئیں اور بعض کی تعلیمات میں خود ان کے ماننے والوں نے ایسی تحریف کردی کہ وہ حق و باطل کا مجموعہ بن کر رہ گئیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو آخری بار خدا کا دین ملا ہے۔ اس دین کو خدائے تعالیٰ قیامت تک باقی رکھنا چاہتا ہے' اس لیے وہ ہر دور میں اس کے محافظ پیدا کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی پیدا کرتا رہے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس دین کے ماننے والوں میں بھی بہت سی دینی و اخلاقی خرابیاں پیدا ہوں گی اور وہ غلط کاری میں پچھلی امتوں کے نقش قدم پر چلیں گے' لیکن اس کے باوجود ان میں ایک گروہ ایسا ضرور موجود ہوگا جو دین کو اس کی صحیح شکل میں باقی رکھے گا۔ دین پر حملے خواہ اس کے ماننے والوں کی طرف سے ہوں یا اس کا انکار کرنے والوں کی طرف سے وہ ان کا مقابلہ کرے گا اور دین کو بگاڑنے کی جو بھی کوششیں ہوں گی وہ ان کو ناکام بنا دے گا۔ اس کی زبان سچائی کی ترجمان ہوگی اور وہ باطل پرستوں کے مقابلے میں حق کا اظہار کرتا رہے گا۔ اس راہ میں نہ تو وہ پست ہمت ہوگا اور نہ کوئی اسے مرعوب کرسکے گا۔ وہ دین کی خاطر ہر محاذ پر لڑے گا اور بڑی سے بڑی قربانیاں دیتا رہے گا۔ جو کوئی اس گروہ کی حمایت میں نہیں کھڑا ہوگا وہ خود رسوا ہوگا اور جو ان کی مخالفت کرے گا وہ نامراد ہوگا۔

میری امت میں قیامت تک ایک ایسی	لا تزال طائفۃ من امتی
جماعت ضرور موجود رہے گی جو اللہ کے حکم پر قائم	قائمۃ بامر اللہ لا یضرھم من خذلھم
رہے گی جو اس کو چھوڑ دے یا اس کی مخالفت کرے	او خالفھم حتی یاتی امر اللہ وھم
وہ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور وہ غالب	ظاھرون علی الناس[2]
رہے گی۔	

[1] ابوداؤد' کتاب الملاحم' باب الامر والنہی [2] مسلم' کتاب الامارۃ' باب قولہ لا تزال طائفۃ من امتی الخ

امام بخاری کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جس جماعت کا ذکر ہے وہ اہل علم کی جماعت ہے[1] امام نووی نے اس حدیث کو زیادہ وسیع معنی میں لیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

یحتمل ان تکون هذه الطائفة مفرقة	ممکن ہے کہ یہ جماعت اہل ایمان کے مختلف
بین انواع المؤمنین منهم شجعان	طبقات کے درمیان منقسم ہو جن میں بہادر
مقاتلون ومنهم فقهاء ومنهم	لڑنے والے مجاہد سپاہی بھی ہوں۔ فقہاء و محدثین بھی
محدثون ومنهم زهاد وآمرون	ہوں، زہاد و خدا پرست بھی ہوں، معروف کا حکم
بالمعروف والناهون عن المنكر	دینے والے اور منکر سے روکنے والے بھی ہوں۔
ومنهم اهل انواع اخرى من الخير	علاوہ ان کے اور دوسری بھلائیوں کے کرنے والے
ولا يلزم ان يكونوا مجتمعين	بھی ہوں۔ حدیث سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ وہ سب
بل قد يكونون متفرقين في	کے سب کسی ایک ہی خطہ میں جمع ہوں بلکہ وہ زمین کے
اقطار الارض[2]	مختلف حصوں میں ہو سکتے ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

یحمل هذا العلم من کل خلف	ہر پشت کے عادل لوگ اس علم (دین) کے
عدوله ینفون عنه تحریف الغالین	حامل ہوں گے۔ جو حد سے بڑھنے والوں کی تحریف
وانتحال المبطلین وتاویل	کو، باطل پرستوں کے غلط دعووں کو اور جاہلوں کی
الجاهلین[3]	تاویلوں کو مٹاتے رہیں گے۔

اسی کام کو آپ نے تجدید امت کا بھی نام دیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

ان الله یبعث لهذه الامة علی	اس امت کے لیے خدائے تعالیٰ یقیناً ایسے
رأس کل مائة سنة من یجدد	اشخاص پیدا کرتا رہے گا جو اس امت کی بھلائی
لها دینها[4]	کے لیے اس کے دین کی تجدید کرتے رہیں گے۔

ایک حدیث میں آپ نے خوشخبری دی ہے کہ اس امت کے دور آخر میں بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو امر بالمعروف

[illegible]

[illegible]

ونہی عن المنکر کا فرض انجام دیں گے اور دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ کرتے رہیں گے۔

سیکون فی آخر ھذہ الامۃ	اس امت کے آخر میں ایسے لوگ ہوں گے
قوم لھم مثل اجر اولھم یامرون	جن کو اس امت کے اگلوں کا سا اجر ملے گا۔ وہ
بالمعروف وینھون عن المنکر	معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے
ویقاتلون الفتن[1]	اور فتنوں کا مقابلہ کریں گے۔

یہی بات آپ نے ان الفاظ میں بھی کہی ہے۔

ان امتی لا تجتمع علی ضلالۃ[2]	میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی۔

پچھلی امتیں راہ راست سے بھٹک گئیں، ان کی تعلیمات ختم ہو گئیں، ان کی کتابیں محرف ہو گئیں حتیٰ کہ ان میں سے بہت سی صفحۂ زمین سے مٹ گئیں لیکن آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو دیکھیے کہ وہ زندہ ہے اور اپنے تمام سرمایۂ دین کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ حالانکہ وہ اپنی زندگی کے چودہ سو سال میں بارہا ایسے حالات سے گزر چکی ہے کہ ان حالات میں عقل کہتی ہے کہ اسے لازماً مٹ جانا چاہیے تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیوں نہیں مٹی؟ اس کا حقیقی سبب تو خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ امت باقی رہے گی اور اس کا ظاہری سبب امت کا وہ بہترین داخلی نظام ہے جو کسی بھی بگاڑ کو زیادہ دنوں تک اپنے اندر برداشت نہیں کر سکتا۔ جہاں کوئی بگاڑ پیدا ہوا وہاں اس کی اصلاحی قوتیں ابھر آتی ہیں اور اس کو دور کر دیتی ہیں۔ جب بھی اس دین کے خلاف فتنوں نے سر اٹھایا اس کو کچلنے کے لیے مردان کار سامنے آ گئے اور انھوں نے اسے ختم کر کے چھوڑا۔ ورنہ اس دین پر اندر اور باہر سے ایسے حملے ہوتے رہے ہیں کہ وہ بالکل مسخ ہو چکا ہوتا اور اسے پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ آج نہ صرف یہ کہ تعلیمات دین اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہیں بلکہ ان کی ترجمانی کرنے والے بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ ایسا بہت دیکھا گیا ہے کہ کسی قوم کی سیاسی موت کے ساتھ اس کی فکری موت بھی واقع ہو جاتی ہے، اس کے فکر کے سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں اور اس کی صحیح ترجمانی کرنے والے تلاش کے باوجود نہیں ملتے، لیکن اس امت پر سیاسی زوال آیا اور اب بھی وہ بڑی حد تک سیاسی زوال سے گزر رہی ہے لیکن اس کے باوجود اس کا دینی ذخیرہ اور اس کی تعلیمات جوں کا توں باقی ہے۔ یہ اس کے داخلی نظام کے استحکام کی زبردست دلیل ہے۔ اگر اس میں زندگی کی زبردست قوت موجود نہ ہوتی تو سیاسی زوال کے ساتھ اس کا فکری سرمایہ بھی ختم ہو چکا ہوتا۔ امت کے داخلی نظام کو مستحکم رکھنے کے لیے قرآن و حدیث نے یہ تعلیم دی ہے کہ امت کا ایک فرد ایک

[1] رواہ البیہقی (مشکوٰۃ کتاب الفتن، باب ثواب ہذہ الامۃ) [2] ترمذی، ابواب الفتن باب فی لزوم الجماعۃ۔ ابن ماجہ، ابواب الفتن باب السواد الاعظم

غلط روی کی جرأت نہ کرے تو وہ ان افراد کو آگے بڑھ کر راستے سے روک دیں اور وہ اسے راہِ راست پر لے آئیں۔ اگر اس میں کوتاہی کی گئی تو پوری امت بگڑ جائے گی۔ اس امت میں جو بگاڑ اور خرابی پیدا ہو اس کی اصلاح کی ذمہ داری کسی خاص گروہ پر نہیں ہے بلکہ خود امت کو اپنی اصلاح کرنی ہے۔ اس کا ہر شخص دوسرے کا بہی خواہ اور خیر اندیش ہے وہ جس طرح اپنے نفس کی اصلاح و تربیت کی فکر کرتا ہے اسی طرح اسے اپنے بھائیوں کی اصلاح کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ حضرت تمیم داری فرماتے ہیں:-

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الدین النصیحۃ قلنا لمن قال للہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتہم[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دین اخلاص اور خیر خواہی کا نام ہے۔ ہم نے پوچھا خیر خواہی اور اخلاص کس کے ساتھ؟ آپ نے جواب دیا، خدا کے ساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے ائمہ اور مسلم عوام کے ساتھ

دین کو قبول کرنے کے نتیجے میں انسان کے اندر جو پاکیزہ جذبات ابھرتے ہیں اس حدیث میں ان کو بہترین انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ حدیث میں جس خیر خواہی اور اخلاص کا ذکر ہے اس کے دو پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ آدمی کے ایمان و عقیدے اور اس کی ذاتی اصلاح و تربیت سے متعلق ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں دعوت کے اس وسیع کام کو بیان کیا گیا ہے جو ایک مسلمان کو امت کے اندر اور باہر انجام دینا ہے۔ اس طرح یہ حدیث دین اور اس کے تمام مطالبات کو ایک خاص انداز میں ہمارے سامنے رکھ رہی ہے۔ اسی وجہ سے محدثین نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے۔ امام نووی نے اپنے پیش رو علماء کی تشریحات کو سامنے رکھتے ہوئے اس حدیث کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

"خدا کے ساتھ خیر خواہی کا مفہوم یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اس کی صفات میں تحریف نہ کی جائے بلکہ ان کو جوں کا توں قبول کیا جائے۔ اس کو تمام صفات کمال سے متصف اور تمام نقائص سے پاک مانا جائے۔ ہر معاملے میں اس کی اطاعت کی جائے اور اس کی نافرمانی سے اجتناب کیا جائے، کسی سے محبت بھی اسی کے لیے کی جائے اور نفرت بھی اسی کے لیے کی جائے، جو اس کا دوست ہو اسے اپنا دوست اور جو اس کا دشمن ہو اسے اپنا دشمن سمجھا جائے اور جو اس کا منکر اور باغی ہو ضرورت پڑنے

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان الدین النصیحۃ

کسی سے جہاد کیا جائے اس کی نعمتوں کا دل سے اعتراف کیا جائے [illegible]

ساتھ خیر خواہی کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کی جو صفات اور بیان ہوئی ہیں ان کی طرف لوگوں

کو دعوت دی جائے اور ان کو نرمی اور لطف و محبت سے آمادہ کیا جائے کہ وہ اللہ کی وحدانیت پر ایمان لے آئیں :

خدا کی کتاب کے ساتھ خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ اس پر اس حیثیت سے ایمان رکھا جائے کہ وہ خدا کا نازل کردہ

کلام ہے اور ہر انسانی تحریر و تقریر سے بالکل مختلف اور ممتاز ہے۔ وہ ایسا کلام ہے کہ اس جیسے کلام پر کوئی

بھی شخص قادر نہیں ہو سکتا۔ خدا کی کتاب کے ساتھ یہ بھی خیر خواہی ہے کہ اس کی تعظیم کی جائے خشوع و خضوع

کے ساتھ اس کی تلاوت کی جائے، اس کے احکام سے واقفیت حاصل کی جائے اس کے علوم و امثال کو

سمجھا جائے، اس کے مواعظ سے نصیحت حاصل کی جائے، اس کے عجائبات میں تفکر کیا جائے۔ اس کے محکمات

پر عمل کیا جائے اور اس کے متشابہات کو بے چون و چرا تسلیم کیا جائے اور اس کے تمام احکام اور ان کی

قسموں کی تحقیق کی جائے نیز اس کے ساتھ خیر خواہی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کے علوم کو پھیلایا جائے

اور اس کی طرف دنیا کو دعوت دی جائے۔

خدا کے رسول کے ساتھ خیر خواہی کے مفہوم میں یہ باتیں شامل ہیں۔ آپ کی رسالت کی تصدیق، آپ کی

تعلیمات پر ایمان، آپ کے احکام کی اطاعت، آپ کی زندگی میں اور آپ کے وصال کے بعد آپ کی نصرت و

حمایت، جو آپ کا دشمن ہو اس سے دشمنی اور جو آپ کا دوست ہو اس سے دوستی، آپ کی توقیر، آپ کے

حقوق کی تعظیم، آپ کی سنت کا احیاء، آپ کی دعوت کی توسیع، آپ کی شریعت کی نشر و اشاعت، اس پر

جو الزام لگایا جائے اسے دور کرنا، اس کے علوم کو پھیلانا، اس کے معانی میں غور و فکر کرنا، لوگوں کو اس کی

طرف دعوت دینا، احتیاط اور سلیقہ سے اس کا سیکھنا اور سکھانا، بغیر علم کے اس کے بارے میں گفتگو سے

پرہیز کرنا، حاملین شریعت کا ادب و احترام کرنا وغیرہ۔ اسی طرح یہ بھی آپ کے ساتھ خیر خواہی ہے کہ آپ کے اخلاق

اپنے اندر پیدا کیے جائیں، آپ کے بتائے ہوئے آداب اختیار کیے جائیں، آپ کے اصحاب اور اہل بیت سے

محبت کی جائے اور اصحاب بدعت سے دور رہا جائے۔

ائمہ مسلمین کے ساتھ خیر خواہی میں یہ باتیں شامل ہیں: حق میں ان کا تعاون اور اطاعت، نرمی اور

بوقت ضرورت سختی کے ساتھ ان کو نصیحت، ان کی [illegible] سے اجتناب [illegible]

ان سے انکار کرنا، مسلمانوں کے جو معاملات ان تک نہیں پہنچ رہے ہیں انہیں ان تک پہنچانا، ان کے خلاف بغیر کسی معقول وجہ کے بغاوت نہ کرنا، لوگوں کو ان کی اطاعت پر ابھارنا وغیرہ۔ خطابی نے لکھا ہے کہ ائمہ مسلمین سے علماء دین بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ حسن ظن رکھا جائے اور احکام دین میں ان کی اتباع کی جائے۔

عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ جن امور میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے ان کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے، ان کی تکلیفوں کو دور کیا جائے، وہ دین و دنیا کی جن چیزوں سے ناواقف ہیں ان سے انہیں واقف کیا جائے، زبان ہی سے نہیں بلکہ عمل سے ان کی راہنمائی کی جائے، ان کے عیوب کی پردہ پوشی کی جائے، اور ان کی کمزوریوں کو دور کیا جائے، ان پر حسد نہ کیا جائے، ان کے لیے وہی چیز پسند کی جائے جو اپنے لیے پسند ہو اور جو چیز اپنے لیے ناپسند ہو وہ ان کے لیے بھی ناپسند کی جائے، ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے، ان کے اندر اعلیٰ اخلاق پیدا کرائے جائیں اور ان کو خدا کی اطاعت پر ابھارا جائے۔[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کو اتنی اہمیت دی ہے کہ بعض اوقات صحابہ سے اس کے لیے آپ نے خصوصی عہد و پیمان لیا ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہ فرماتے ہیں:

بایعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر مسلمان کے
علی النصح لکل مسلم[2]	ساتھ خیر خواہی کے لیے بیعت کی ہے۔

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اصلاح امت اور مسلمانوں کے ساتھ نصح و خیر خواہی کا فرض کس قدر غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔

---

[1] شرح مسلم ج ۱ ص ۵۴۔ [2] مسلم کتاب الایمان، باب بیان ان الدین النصیحۃ۔

زکوٰۃ و صدقات

مولانا محمد یوسف اصلاحی

زکوٰۃ کی حقیقت محض یہی نہیں ہے کہ وہ ناداروں کی کفالت کا ایک ذریعہ ہے بلکہ وہ نماز کے بعد دو
اہم ترین عبادت اور دین کا ضروری رکن ہے جس کے بغیر دین و ایمان کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لغت میں زکوٰۃ
معنی' پاک ہونا' بڑھنا اور نشوونما پانا' —— رضائے الٰہی کی طلب میں جب آدمی اپنا محبوب مال خوشی خوشی خر
کرتا ہے' تو اس سے انسان کے اندرون میں ایک جلا پیدا ہوتی ہے' مادی کثافتوں اور دنیوی محبتوں سے دا
پاک ہوتا ہے' روح میں پاکیزگی' بالیدگی اور ترقی ہوتی ہے اور قلب میں خدا کی محبت راسخ ہوتی ہے ——
زکوٰۃ دینا اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ زکوٰۃ دینے والے کے دل میں خدا کی محبت موجود ہے اور خود یہ عمل
کی محبت کو بڑھانے کا بھی موثر ترین ذریعہ ہے۔ اسی روح اور حقیقت کے پیش نظر قرآن نے زکوٰۃ کے لیے صد
اور انفاق فی سبیل اللہ کے معنی خیز الفاظ بھی استعمال کیے ہیں' صدقہ' صدق سے ہے جس کے معنی ہیں سچائی او خا
یعنی صدقہ اس بات کی دلیل ہے کہ صدقہ دینے والے کے دل میں سچائی اور خلوص ہے' اور خود صدقہ اس میں ا
کا بھی ذریعہ ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کے معنی ہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا یعنی خدا کی رضا کے لیے خرچ کرنا۔ ا
زکوٰۃ کی حقیقی روح کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے۔

چونکہ قرآن کی نظر اصل حقیقت اور روح پر ہوتی ہے اس لیے وہ ان تینوں لفظوں کو ایک ہی مفہوم میں آ
کرتا ہے' اور تینوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔ خدا کی رضا کے لیے آدمی جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ زکوٰۃ بھی
صدقہ بھی اور انفاق فی سبیل اللہ بھی' اصل روح کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں' البتہ فقہ کے اعتبار سے
ان میں فرق ہے[1]

---

[1] فقہ کی رو سے زکوٰۃ اور نفلی خیرات و صدقات میں فرق ہے۔ فقہی اصطلاح میں زکوٰۃ اس صدقے کا نام ہے
قانونی طور پر فرض ہے' اور کم سے کم اتنا خرچ کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے بلکہ اس کے بغیر اس کا دین و ایمان معتبر
(باقی اگلے صفحہ پر)

دین میں زکوٰۃ کی اہمیت یہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ نماز کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے، اور ایمان کے بعد نماز و زکوٰۃ کا ذکر اولین مطالبے کے طور پر اس طرح کیا گیا ہے کہ پورا دین الٰہی ان دو اہم ارکان سے عبارت معلوم ہوتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے۔ اسلام کے احکام پر اگر آپ غور فرمائیں تو اصولی طور پر ان کی دو ہی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ احکام جن کا تعلق خدا کے حقوق سے ہے اور ایک وہ جن کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے۔ خدا سے بندگی کا تعلق استوار رکھنا اور بندوں کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کرنا یہی کل دین ہے، اسی روح کو جذب کرنے اور اس کے مطابق پوری زندگی کو ڈھالنے کے لیے نماز اور زکوٰۃ فرض کی گئی ہے۔

غور کیجیے جو شخص مسجد میں بندگی کے انتہائی گہرے جذبات سے اپنے دل و دماغ سمیت اپنے پورے وجود کو خدا کے آگے ڈال دے، وہ مسجد کے باہر خدا کے حقوق سے کیسے غفلت برت سکتا ہے، اور جو شخص خدا کو خوش کرنے کے لیے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی خدا کے نادار بندوں پر خوشی خوشی لٹا کر اطمینان و سکون محسوس کرے۔ وہ بندگان خدا کے دوسرے حقوق سے کیوں کر غافل ہو سکتا ہے۔

قرآن نے زکوٰۃ نہ دینے والوں کو حقیقی علم سے محروم اور آخرت فراموش قرار دیا ہے اور یہ صراحت کی ہے کہ زکوٰۃ نہ دینا کفر اور شرک کی علامت ہے، اور زکوٰۃ سے غافل لوگوں کو ایسی دردناک سزاؤں کی وعید سنائی ہے جن کے تصور ہی سے دل کانپنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف زکوٰۃ ادا کرنے کو ایمان کی لازمی علامت اور قطعی شہادت قرار دیا ہے، اور ایسے مومنین کو پاکیزہ زندگی، اجر عظیم، خیر و برکت، حکمت، اطمینان و سکون اور جنت کی بیش بہا نعمتوں کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔

زکوٰۃ پچھلے انبیاء کے دین میں

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلٰوةِ وَإِيتَاءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ ۝ (الانبیاء ۷۳)	اور ہم نے ان سب کو پیشوا بنایا جو ہماری ہدایت سے رہنمائی کرتے تھے، اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعے نیک کام کرنے، نماز کا اہتمام کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی۔ اور یہ سب ہمارے عبادت گزار بندے تھے۔

(بقیہ حاشیہ) نہیں ہے۔ اور زکوٰۃ کے علاوہ آدمی خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ شریعت کی نظر میں پسندیدہ اور مطلوب ہے تربیت و تزکیہ کے لیے ضروری بھی اور دین سے شغف پیدا کرنے کے لیے لازمی بھی، لیکن بہر حال فرض نہیں ہے۔ مقالہ ما نطور ... کی ترغیب ... صدقہ ... سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سے چند آیات پہلے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا تذکرہ ہے کہ خدا نے ان کو اسلام کتاب دی جو حق و باطل میں فرق کرنے والی کسوٹی، راہِ حق دکھانے والی روشنی اور انسانیت کو اپنی صحیح حیثیت یاد دلانے والی تھی ۔۔۔۔ پھر تفصیل کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کا فکر انگیز مکالمہ نقل کیا گیا ہے۔ پھر خدا کے اس احسان کا ذکر ہے کہ خدا نے اپنے حکم سے اس بھڑکتی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ اسی ضمن میں حضرت لوطؑ اور حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا ذکر ہے اور پھر یہ آیت ہے کہ ہم نے ان سب ہی انبیاء کو نیک کاموں اور نماز و زکوٰۃ کی ہدایت کی یعنی ان تمام پچھلے انبیاء کے دین میں زکوٰۃ فرض رہی ہے اور ہمیشہ سے اس اہم عبادت کی ہدایت کی جاتی رہی ہے ۔

بنی اسرائیل سے عہد

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا ٱللَّهَ وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَقُولُوا۟ لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ (البقرہ ۸۳)

یاد کرو، بنی اسرائیل سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کرنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔

بنی اسرائیل سے جو عہد و میثاق لیا گیا تھا قرآن میں جگہ جگہ اس کا ذکر ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس عہد کی جو دفعات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ "نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو" ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان سے لیے گئے عہد کا تذکرہ کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ ان کی نصرت، ان کے گناہوں کی معافی، ان کا جنت میں داخلہ اس بات پر منحصر ہے کہ یہ آنے والے نبیؐ کی دعوت کو قبول کریں، ان کی مدد کریں، نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ دیں۔

وَقَالَ ٱللَّهُ إِنِّى مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَيْتُمُ ٱلزَّكَوٰةَ وَءَامَنتُم بِرُسُلِى وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ ٱللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّأُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ (المائدہ ۱۲)

اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا تھا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے، تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے دور کر دوں گا اور تم کو ایسی جنتوں میں داخل کروں گا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وصیت سورۂ مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنا تعارف کراتے ہوئے صراحت کی ہے کہ خداوند عالم نے مجھے یہ وصیت فرمائی ہے کہ جب تک بقید حیات رہوں نماز قائم رکھوں اور زکوٰۃ ادا کرتا رہوں۔

وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ	اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ نماز اور
مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ (مریم: ۳۱)	زکوٰۃ کا اہتمام کروں جب تک میں زندہ رہوں،

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہوئے وضاحت فرمائی کہ خدا نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا اور مجھے مامور کیا ہے کہ میں تازیست ان دونوں عبادتوں کا اہتمام کروں گا۔ منصب نبوت پر سرفراز کیے جانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ خدائی ہدایت کے تحت قیام نماز اور ادائے زکوٰۃ کا اہتمام کیا جائے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تاکید

وَكَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ	اور حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) اپنے
	گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید
بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ	کیا کرتے تھے اور وہ اپنے رب کے نزدیک
رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (مریم: ۵۵)	بڑے ہی پسندیدہ انسان تھے۔

یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے دین میں بھی یہ دو بنیادی عبادتیں فرض تھیں اور وہ منصبی فریضے کے طور پر اپنے متعلقین کو ان دونوں کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔

زکوٰۃ سے غفلت، ہدایت سے محرومی

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝	ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے جو
	غیب میں رہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں، نماز قائم
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ	کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرۃ: ۳-۲)	میں سے (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

زکوٰۃ کی اہمیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اللہ کی کتاب سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے یہ ایک لازمی صفت ہے اس صفت کے بغیر آدمی ہدایت سے محروم رہتا ہے۔ خود غرض، تنگ دل، مال کا بندہ اور وہ حریص بخیل جو اپنے مقصد کی خاطر کچھ قربان نہ کر سکے، اس لائق نہیں کہ اسے ہدایت کی دولت ملے۔ ہدایت کی راہ پر وہی لوگ چل سکتے ہیں جو کشادہ دل، فیاض اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کے لیے فراخ دست ہوں، خدا کے دیے ہوئے

...کو خوشی خوشی اس دین پر قربان کر سکے ہوں جس دین پر وہ ایمان لائیں۔

...کوٰۃ — ایمان کی لازمی علامت

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ...

قرآن ہدایت و بشارت ہے ان مومنوں کے لیے جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور یہی لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں

قرآن کی آیتیں یقیناً ہدایت اور بشارت کے لیے نازل ہوئی ہیں لیکن عملی دنیا میں فی الواقع اس کی ہدایت سے ...ا لوگ فیضیاب ہوتے ہیں اور وہی لوگ اس کی خوش خبریوں کے مستحق ہوتے ہیں جو سچے دل سے اس پر ایمان لائیں ...محسوسات کی اس دنیا میں ایمان کی لازمی علامت نماز اور زکوٰۃ ہے۔

...زکوٰۃ — تقویٰ کی نشانی

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (الاعراف ۱۵۶)

میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو خدا کا تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔ اور یہی لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرۃ ۲-۳)

(قرآن حکیم) ہدایت ہے ان لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لائے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

خدا کی کتاب پر وہی لوگ ایمان لاتے ہیں جن کے دلوں میں تقوے کی بنیادی خوبی موجود ہو اور اس کی نشانی ...ہے کہ آدمی خدا کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر سکے۔ اور اس کے مال میں خدا اور بندوں کے جو حقوق مقرر کیے گئے ...ہیں انہیں خوشی خوشی ادا کر سکے۔

...زکوٰۃ — دعوی ایمان کی تصدیق

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝

سچے اہل ایمان تو وہی ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان بڑھ جاتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز قائم

اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۝ — کرتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں یہی درحقیقت سچے مومن ہیں۔

ایمان محض زبانی دعوے کا نام نہیں ہے بلکہ سچے مومن تو وہ ہیں کہ خدا کا ذکر سن کر ان کے دل لرزنے لگیں اللہ کی آیتیں سن کر ان کے ایمان میں اضافہ ہو اور وہ ہر حال میں خدا پر بھروسہ رکھیں ——— اور اس کی تصدیق خاص طور پر اس بات سے ہو گی کہ ان کی زندگی میں دو بنیادی عمل پائے جائیں۔ ایک نماز کا اہتمام، دوسرے خدا کی راہ میں مال کا خرچ کرنا۔

زکوٰۃ ——— اور شہادت

ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ — اس نے پہلے ہی سے تمہارا نام مسلم رکھا تھا، اور اسی کام کے پیش نظر تاکہ رسول تم پر گواہ بنیں اور تم لوگوں پر گواہ بنو ——— پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، اور اللہ سے تعلق مضبوط رکھو۔

امت مسلمہ کے اٹھائے جانے اور اس خطاب سے نوازے جانے کا مقصود یہ ہے کہ وہ نبی کے بعد شہادت حق کا گراں ترین فریضہ انجام دیں۔ رسول نے جس طرح اپنے قول و عمل سے ان تک پورا دین پہنچایا ہے یہ اپنے قول و عمل سے اسی طرح دوسروں تک دین حق پہنچائیں۔ اس گراں ترین فریضے کو انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو تین امتیازی اعمال سے آراستہ کرلیں۔ نماز کی اقامت، زکوٰۃ کی ادائگی اور خدا سے تعلق کی مضبوطی۔

زکوٰۃ کی روح یہ ہے کہ آپ خدا کی ذات ہی کو اپنی محبتوں کا مرکز بنائیں اس کے خلاف ہر محبت کو دل سے کھرچ پھینکیں۔ بندگان خدا کے حقوق کا تحفظ کریں، ان کے ساتھ ہر حال میں عدل و انصاف، فیاضی اور ایثار کی بنیاد پر سلوک کا شعور رکھیں ——— غور کیجیے اس کیفیت کو جذب کیے بغیر نہ تو آدمی خدا سے تعلق کو مضبوط کر سکتا ہے اور نہ شہادت حق کی اس گراں ترین ذمہ داری کو پورا کر سکتا ہے جس کے لیے اس کو مسلم کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ زکوٰۃ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کرتی ہے اور خود اپنے شہادت بھی ہے۔

زکوٰۃ ——— رحمت کا ذریعہ

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ — اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم

وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (النور۔ ۵۶) کیا جائے۔

یعنی خدا کی رحمت کا مستحق بنانے والی چیزیں تین ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی اور رسول کی اطاعت

زکوٰۃ — فلاح کا ذریعہ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوْنَ (المؤمنون: ۱-۴)

بلاشبہ فلاح یاب ہوگئے ایمان والے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں، لغویات سے منہ موڑے رہتے ہیں اور زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں۔

زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس تزکیے کے عمل پر پوری طرح کاربند ہیں۔ اپنے مالوں میں سے خدا کا حق نکال کر اپنا مال بھی پاک کر لیتے ہیں اور اپنے دل کو بھی۔ زرپرستی، دنیا پرستی اور اس طرح کے دوسرے گندے جذبات سے پاک کر لیتے ہیں اور پھر اس تزکیۂ قلب کا اثر لازماً ان کے دماغ اخلاق، کردار ہر چیز پر پڑتا ہے — اور اس طرح یہ تزکیہ کا طریقِ عمل ان کی پوری زندگی کو پاک صاف کر دیتا ہے۔ — اور ان کی یہ صاف ستھری زندگی گویا اسی دنیا میں اس بات کی شہادت ہے کہ وہ فلاح یاب ہو گئے اور خدا نے ان کو اپنی جنت کے لیے قبول فرمالیا۔

زکوٰۃ، گھاٹے سے محفوظ تجارت

اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً یَّرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ لِیُوَفِّیَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ (الفاطر: ۲۹، ۳۰)

جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے، نماز کی پابندی کرتے، اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کھلے چھپے خرچ کرتے ہیں جو اس تجارت کے امیدوار ہیں جس میں گھاٹے کا کوئی اندیشہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کو پورا پورا بدلہ دے گا اور اپنے فضل سے کچھ زیادہ ہی دے گا۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی درگذر کرنے والا اور بڑا ہی قدر دان ہے

دنیا کی محدود زندگی اور اس کا سازوسامان ہی آدمی کا کل سرمایہ ہے۔ قرآن اس کو جان و مال سے تعبیر کرتا ہے، کافر اس جان و مال کی پونجی کو دنیوی مقاصد اور مادی منفعتوں میں لگاتا ہے، اور مومن اس سرمایہ کو خدا کی رضا اور آخرت کے ابدی انعام کی راہ میں لگاتا ہے — قرآن اس معاملہ کو تجارت سے تعبیر کرتا ہے۔ اور کہتا ہے جو لوگ دنیا اور اس کی زوال پذیر نعمتوں کو ہی سب کچھ سمجھ کر جان و مال کی پونجی اسی میں لگا دیتے ہیں

وہ بڑے گھاٹے کی تجارت کرتے ہیں۔ وہ حقیر، فانی اور محدود فائدہ حاصل کرنے کے لیے ایسی پونجی لگاتے ہیں جو انتہائی قیمتی بلکہ انمول ہے جو صرف ایک ہی بار ملتی ہے، اور ایک بار چھٹنے کے بعد پھر کبھی نہیں ملتی — ایسی تجارت ایسی ہے جس کا موقع صرف ایک ہی بار ملتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ اس اصل سرمایہ کو خدا کی خوشنودی اور آخرت کی ابدی زندگی کی راحتوں کو حاصل کرنے میں لگاتے ہیں — وہ درحقیقت ایک ایسی کامیاب تجارت کر رہے ہیں جو تباہی کے کھٹکے سے محفوظ اور نقصان کے اندیشوں سے پاک ہے۔ نماز اور زکوٰۃ جان و مال کی وسیع قربانیوں کی نمائندگی کرنے والی دو عبادتیں ہیں اور ان کی پابندی اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی نے جان و مال کے عظیم سرمایہ کو کامیاب تجارت میں لگا رکھا ہے۔ ایسی تجارت جس میں خریدار خود اللہ تعالیٰ ہے جو نفع دینے میں اتنا فراخ دست ہے جس کا صحیح تصور بھی انسان نہیں کرسکتا۔ سورۂ توبہ میں ہے "بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کے جان و مال اس عوض میں خرید لیے ہیں کہ ان کے لیے جنت ہے۔ غور کیجیے، محدود اور فانی جان و مال کے مقابلے میں لافانی اور غیر محدود نعمتوں والی جنت کتنی نفع بخش اور کامیاب ہے یہ تجارت۔

زکوٰۃ کا عظیم اجر

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ — جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ

اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ — کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے

اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ — ایک دانہ بویا جائے، اور اس سے سات بالیں

سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ — نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں، اسی طرح اللہ

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ — جس کے عمل کو چاہتا ہے، بڑھاتا ہے، وہ فراخ

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (البقرۃ: ۲۶۱) — دست اور علیم ہے۔

زکوٰۃ کے زبردست اجر و ثواب کو ایک ایمان افروز تمثیل سے واضح کیا گیا ہے، ہمارا بارہا کا تجربہ ہے کہ ہم اپنی جھولی کا ایک دانہ جو خاک میں ملاتے ہیں، وہ سیکڑوں دانے بن کر ہمیں واپس مل جاتا ہے، اور ہماری جھولی بھر جاتی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جو خدا اس دنیا میں ایک دانے کو سیکڑوں گنا بڑھا کر ہماری جھولی بار بار بھرتا ہے کیا آخرت کے اجر کی توقع میں ہم اس کی راہ میں کچھ صرف کریں تو وہ اسے ضائع کر دے گا؟ یقیناً وہ ہمیں اس کا بے پایاں اجر دے گا۔ ہم جس قدر خلوص اور جس گہرے جذبے سے اس کی راہ میں قربان کریں گے۔ وہ فراخ دست اور باخبر خدا اسی لحاظ سے ہمارے عمل کو بڑھا چڑھا کر ہمیں ایسے زبردست انعام سے نوازے گا جن کا اس دنیا میں ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ بلاشبہ زکوٰۃ کا اصل اجر تو ہمیں آخرت کی ابدی زندگی ہی میں ملے گا لیکن اس کی

برکتوں سے ہماری دنیوی زندگی بھی محروم نہ رہے گی۔

زکوٰۃ اور سود کے معاشی اور اخلاقی نتائج

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (البقرۃ ۲۷۶)

اللہ تعالیٰ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو ونما دیتا ہے۔

زکوٰۃ وصدقات میں آدمی محنت سے کمایا ہوا اپنا مال صرف کرتا ہے اور سود میں سمیٹ سمیٹ کر جمع کرتا ہے، بظاہر سود سے دولت بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے اور صدقات وخیرات سے گھٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن قرآن یہ حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے، سود سے دولت گھٹتی اور سمٹتی ہے اور صدقات وخیرات سے بڑھتی ہے۔ صدقات وخیرات انسانیت کے حق میں رحمت اور سود ایک بدترین لعنت ہے۔ سود، سنگدلی خود غرضی، بخل اور تنگ دلی کا نتیجہ اور انہیں مذموم صفات کو نشو ونما دینے کا ذریعہ ہے۔ اس کے برعکس زکوٰۃ وصدقات عالی ظرفی، فراخ دلی، فیاضی اور ہمدردی کا نتیجہ اور انہی محمود صفات کو پروان چڑھانے کا ذریعہ ہیں۔

وہ سوسائٹی کبھی خوش حالی اور ترقی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی جس میں یہ مذموم صفات بڑھیں اور پوری دولت چند خود غرض، سنگدل اور دولت پرست افراد میں سمٹ اور سکڑ کر رہ جائے اس کے برخلاف وہ سوسائٹی جس میں دولت کی مناسب تقسیم ہو اور سب کو دولت سے فائدہ اٹھانے اور دولت کو بڑھانے کے یکساں مواقع میسر ہوں اور پوری سوسائٹی کی قوت بازو اور دل ودماغ سوسائٹی کو خوش حال بنانے اور ترقی دینے میں لگے ہوئے ہوں اور مجموعی طور پر انسانوں کی وحدت جس خیر وبرکت خوش حالی اور ترقی سے ہم کنار ہوگی سودی نظام میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ دولت کا دائرہ آمد وصرف جتنا وسیع ہوگا۔ اور اس سے فائدہ اٹھانے، پیدا کرنے اور بڑھانے میں جتنی زیادہ قوتیں مصروف عمل ہوں گی اتنا ہی دولت میں اضافہ ہوگا۔

یہ حقیقت ایک اور آیت میں اس طرح بیان کی گئی ہے :-

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ	جو سود تم دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں
اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ	شامل ہو کر وہ بڑھ جائے اللہ کے نزدیک وہ نہیں
وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ	بڑھتا اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل
وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ	کرنے کے ارادے سے دیتے ہو، ای کے
(الروم ۳۹)	دینے والے درحقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ اگر کوئی مومن راہِ خدا میں ایک کھجور بھی صدقہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے بڑھا کر احد پہاڑ کے برابر کر دیتا ہے۔

زکوٰۃ کا اجر ابدی اطمینان

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرۃ ۲۷۷)

جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اور زکوٰۃ دیں ان کا اجر بلاشبہ ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کسی رنج کا موقع۔

یعنی نہ تو ان کو یہ اندیشہ ہوگا کہ کہیں آخرت کی یہ نعمتیں ختم نہ ہو جائیں کیونکہ وہ تو دائمی ہوں گی اور نہ یہ غم ہی ہوگا کہ ان کی پچھلی زندگی ضائع گئی کیونکہ وہ ایمان نماز اور زکوٰۃ کے صلے میں ابدی سکون اور دائمی اطمینان سے ہمکنار ہوں گے۔

زکوٰۃ کا صلہ جنت

لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنتُم بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّأُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (المائدۃ ۱۲)

اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی مدد کی اور خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تم سے تمہاری برائیاں دور کر دوں گا اور تم کو ایسی جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

مغفرت اور حکمت

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (البقرۃ ۲: ۲۶۸، ۲۶۹)

شیطان تمہیں فقر و ناداری سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے مگر اللہ تمہیں اپنی مغفرت اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور علم والا ہے جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ اور جس کو حکمت ملی اس کو درحقیقت بہت بڑی دولت مل گئی۔

حکمت مومن کی سب سے بڑی دولت اور سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ یہ وہ قوت ہے جس سے مومن زندگی

کی ہر ضرورت اور ہر موڑ پر صحیح فیصلہ کرتا ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچ کر صحیح راہ اختیار کرتا ہے۔ زندگی کی پیچ در پیچ راہوں میں اور پیچیدہ سے پیچیدہ حالات میں اس وقت کی بدولت وہ بہرحال صحیح فیصلہ پر پہنچتا ہے، اور حق پر قائم رہتا ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے جس کو حکمت کی دولت مل گئی حقیقت میں اس کو بہت بڑی دولت مل گئی۔

تزکیۂ نفس

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ — اے نبی! آپ ان کے مالوں میں سے
صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ — صدقہ لے کر انہیں پاک کیجیے اور (نیکی کی راہ
وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبۃ: ۱۰۳) — میں) انہیں بڑھائیے۔

زکوٰۃ اللہ تعالیٰ نے جن مقاصد کے لیے فرض کی ہے ان میں اہم ترین اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ نفس کا تزکیہ ہو جائے بخل و حرص اور دنیا پرستی کے تمام برے جذبات سے دل پاک ہو۔ خدا کی محبت اور خوف پیدا ہو اور روحانی ترقیوں کی راہ آسان ہو، زکوٰۃ کے اسی بنیادی مقصد کی وضاحت ایک دوسرے موقع پر اس طرح کی گئی ہے۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ — اور جہنم کی آگ سے وہ آدمی دور رکھا
يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ — جائے گا جو اللہ سے بہت زیادہ ڈرنے والا ہے جو دوسروں
(اللیل: ۱۷، ۱۸) — کو محض اس لیے مال دیتا ہو کہ (اس کا دل بخل و حرص سے) پاک ہو جائے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی اصل غایت شخصی تزکیہ ہے، وہ قلوب کی صفائی اور تزکیۂ نفس کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ تمام برائیوں کی جڑ دنیا پرستی ہے، اور دنیا کی طرف کھینچنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ خطرناک دل کش اور طاقتور چیز مال و دولت ہے۔ اسی لیے اس کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے حق میں فتنہ قرار دیا ہے۔ زکوٰۃ کا عمل زر پرستی کے تمام گندے جذبات سے دل کو پاک کر کے خدا کی محبت بڑھاتا ہے اور نیکی کی راہ پر بڑھنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ زکوٰۃ محض دنیا پرستی کے جذبات کو فنا کرنے ہی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ خدا پرستی کے جذبات پیدا کرنے کا بھی ذریعہ ہے۔ زکوٰۃ دینے والا دراصل اسی جذبے سے اپنی تجوری کا منہ کھولتا ہے کہ خدا کی رضا حاصل ہو اور دل دنیا پرستی کے تمام مذموم جذبات سے پاک ہو کر خالص خدا پرستی کے جذبات سے مزین ہو۔

خدا کا تقرب

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ — اور انہی دیہاتیوں میں کچھ ایسے لوگ بھی
يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ — ہیں جو خدا اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں اور جو

وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (التوبۃ: ۹۹)

کچھ (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے تقرب اور رسول کی طرف سے رحمت کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں سن رکھو کہ یہ ضرور ان کے لیے خدا کے تقرب کا ذریعہ ہے' اور اللہ تعالیٰ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی بخشنے والا اور بڑا ہی رحم فرمانے والا ہے۔

ناداروں کی کفالت

وَفِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (المعارج)

اور مومنین کے مالوں میں مانگنے والوں اور ناداروں کا حق ہوتا ہے۔

یعنی مومنین کا تصور یہ ہوتا ہے کہ خدا کا دیا ہوا مال محض اس لیے نہیں ہے کہ ہم دادِ عیش دیں بلکہ اس میں سوسائٹی کے ناداروں' غریبوں اور ضرورتمندوں کا حق ہے' اور ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کا حق ادا کر کے ہی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ خدا نے ہمیں مال و دولت والا بنا کر انفاق و صدقے کی ترغیب اسی لیے دی ہے کہ ہم تہی دستوں اور محتاجوں کی کفالت کریں یعنی زکوٰۃ کا ایک ضروری مقصد یہ بھی ہے کہ غریبوں اور حاجتمندوں کی کفالت ہو۔ سورۂ بقرہ میں ہے:۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِی الرِّقَابِ (البقرۃ: ۱۷۷)

اور وہ اپنا مال باوجود محبوب ہونے کے رشتہ داروں اور یتیموں پر مسکینوں اور مسافروں پر مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر خرچ کرتا ہے اور غلاموں کی رہائی میں صرف کرتا ہے

یعنی مومن کو خدا نے زکوٰۃ و صدقات کا جو حکم دیا ہے اس کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے تنگدست محتاجوں اور ضرورتمندوں کی ضرورتیں پوری ہو سکیں اور معاشرے کے تمام ہی افراد مال و دولت سے فائدہ اٹھا کر اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کر سکیں اور اس طرح اجتماعی زندگی کامیاب اور پرسکون بن سکے۔

خدا کے دین کی مدد

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ

نکلو خدا کی راہ میں خواہ ہلکے ہو یا بوجھل اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور

وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (التوبۃ ۴۱) ۔ جانوں سے جہاد کرو ۔

ہلکے اور بوجھل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خواہ تمہارے پاس مال و اسباب اور سامان کی فراوانی ہو یا تم تہی دست ہو، تمہارے پاس طاقت و قوت ہو یا تم کمزور و ضعیف ہو، غرض تم جس حال میں بھی ہو خدا کی راہ میں نکلو اور اس کے دین کو سربلند کرنے اور کفر کا زور توڑنے کے لیے اپنا جان و مال قربان کرو۔ خدا کی راہ میں مال و دولت خرچ کرنے کا ایک زریں موقع اور بلند ترین مقصد یہی ہے کہ اس کے دین کو غالب اور قائم کرنے کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان میں کشادہ دلی کے ساتھ بیش از بیش خرچ کیا جائے۔

زکوٰۃ کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ دولت کے ذریعے خدا کے دین کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے۔ اسی لیے اسلام نے زکوٰۃ کے اجتماعی نظام کو ضروری قرار دیا ہے۔

راہِ خدا میں نہ دینا ہلاکت ہے

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ

خدا کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے مراد دینِ حق کو غالب اور سربلند کرنے کی جدوجہد میں خرچ کرنا ہے۔ دین کے اجتماعی تقاضوں اور قیامِ دین کی کوششوں میں مالی قربانیاں دینے سے جی چرانا اور ذاتی مفاد کو عزیز رکھنا بدترین قسم کی خودغرضی تو ہے ہی ہلاکت بھی ہے۔ دین سے ترقی اور دینی مفاد میں خرچ نہ کرنا اور شخصی مفاد کو ترجیح دینا دراصل اپنی ہلاکت اور تباہی کو دعوت دینا ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں بھی مغلوب اور ذلیل ہوں گے اور آخرت میں بھی تباہ و برباد ہوں گے۔

زکوٰۃ نہ دینے کا دردناک عذاب

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ

اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا ۔۔۔ (اور کہا جائے گا) ۔۔۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے

فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (توبہ ۹: ۳۴، ۳۵)
یہ جمع کر رکھا تھا۔ لو اب اپنی جمع کی ہوئی دولت کا مزہ چکھو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہولناک عذاب کی تصویر اس طرح بیان فرمائی ہے۔ جس شخص کے پاس سونا چاندی ہو اور وہ اس میں سے خدا کا حق نہ ادا کرے تو قیامت کے دن اس کے لیے آگ کی تختیاں تیار کی جائیں گی پھر ان تختیوں کو جہنم کی آگ میں خوب تپایا جائے گا پھر ان سے اس شخص کی پیشانی، پہلو اور پیٹھ کو داغا جائے گا اور اسی طرح بار بار ان تختیوں کو تپا تپا کر داغا جاتا رہے گا۔ اور قیامت کے پورے دن عذاب کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور قیامت کے دن کی یہ مدت پچاس ہزار سال ہوگی۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ایک اور لرزہ خیز عذاب کا ذکر کیا گیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو خدا نے مال دیا اور پھر اس نے اس کی زکوٰۃ نہیں دی تو اس کا مال قیامت کے روز ایک انتہائی زہریلے سانپ کی شکل اختیار کرے گا جس کے سر پر دو سیاہ نقطے ہوں گے اور وہ اس کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ پھر اس کے دونوں جبڑوں کو یہ سانپ پکڑے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ آل عمران کی یہ آیت پڑھی۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ	جن لوگوں کو خدا نے اپنے فضل سے نوازا
بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ	ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال
خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ	میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے، نہیں
سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ	یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے، جو کچھ وہ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے
(آل عمران: ۱۸۰)	روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔

ہمارے ہفتہ وار اجتماعات

(یہ تحریر حلقۂ مرکز رامپور کے ایک ہفتہ وار اجتماع کے لیے لکھی گئی اور اس میں پڑھی گئی۔)

زبانی تذکیر یا عمومی ہدایات کی خدمت میرے لیے ایک بہت مشکل کام رہی ہے، آج بھی مجھے یہ مشکل خدمت انجام دینی ہے۔ اس اجتماع میں آپ کے سامنے اظہارِ خیال کے لیے جب میں نے غور کیا تو دو سوالات ذہن میں پیدا ہوئے۔ ایک یہ کہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں، باتیں تو وہی ہیں جو سب کو معلوم ہیں، انھیں باتوں کی تکرار کا کیا فائدہ؟ دوسرے یہ کہ آپ کے سامنے کیا کہوں اور کس طرح کہوں۔ میرے دل نے اس سوال کا جواب یہ دیا کہ ہم اپنے اجتماعات میں اصلاً اضافۂ معلومات کے لیے جمع نہیں ہوتے بلکہ اپنی تربیت کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ ہماری روح بھی ہمارے جسم کی طرح غذا اور ایندھن کی محتاج ہے۔ یہ پانچ وقت کی نمازیں، یہ رمضان کے روزے، یہ اپنے مال کی زکوٰۃ، یہ کعبہ کا حج، یہ تلاوتِ قرآن، یہ مطالعۂ احادیث اور یہ مجالسِ ذکر و تذکیر — یہ سب چیزیں ہماری روح کو ایندھن اور غذا مہیا کرتی ہیں۔ ہمارا قلب ایک ایسی بھٹی اور ایک ایسی انگیٹھی ہے جس میں اللہ پر ایمان اور اس کی محبت کی آگ روشن ہے۔ یہ آگ اپنا ایندھن مانگتی ہے۔ اگر اسے مہیا نہ کیا جائے تو ٹھنڈی ہونے لگتی ہے اور زیادہ غفلت برتی جائے تو بجھ بھی سکتی ہے۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ذَالِکَ

یہ شیطان، یہ نفس اور یہ دنیوی تعلقات اس بھٹی کو سرد کرنے میں لگے ہوئے ہیں انھیں کی وجہ سے ایمان میں ضعف اور کمی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایمان تمہارے دلوں میں اسی طرح کہنہ ہو جاتا ہے جس طرح کپڑا پرانا ہو جاتا ہے لہٰذا اللہ سے دعا کیا کرو کہ وہ تمہارے دلوں میں ایمان کو تازگی بخشتا رہے" — اسی طرح کی بات حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے ایمان کی تجدید کیا کرو۔ پوچھا گیا۔ یا رسول اللہ ہم کس طرح اپنے ایمانوں کی تجدید کریں، فرمایا: کلمۂ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ بکثرت پڑھا کرو۔ یہی بات حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی گئی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دل بھی زنگ آلود

ہیا جس طرح پانی کے اثر سے لوہے میں زنگ لگتا ہے۔ پوچھا گیا۔ یا رسول اللہ! اس زنگ کو دور
ذریعہ کیا ہے؟ فرمایا۔ موت کو بکثرت یاد کرنا اور تلاوت قرآن۔

مجالس ذکر و تذکیر کی اہمیت و ضرورت کا حال یہ ہے کہ صحابۂ کرام تک اس کے محتاج تھے حالانکہ وہ
، اولین مخاطب تھے اور پورے شعور کے ساتھ اس کی تلاوت کرتے تھے، وہ رسول کے صحبت یافتہ تھے
ہدانگی کے ساتھ اس سے مستفید ہوتے تھے، لیکن اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف لے جا کر
یر فرماتے تھے۔ صحابۂ کرام بھی ایک دوسرے کی تذکیر کی خدمت انجام دیتے تھے۔ ایک بار لوگوں نے
بداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ ہفتے میں ایک بار تذکیر کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ روزانہ
ت فرمائیں۔ انھوں نے فرمایا۔ میں ایسا کرتا لیکن اندیشہ یہ ہے کہ تم لوگ اکتا نہ جاؤ۔ نبی صلی اللہ علیہ
ر روز تذکیر نہ فرماتے تھے بلکہ ہماری اکتاہٹ کا خیال رکھتے اور کبھی کبھی تذکیر فرماتے۔ تذکیر کی یہی ضرورت
ی بنا پر بعض صحابہ اپنے کسی دوسرے ساتھی سے کہتے۔ تعال نؤمن ساعۃ۔ آؤ تھوڑی دیر
ن لائیں یعنی اپنے ایمان کو تازہ کریں لیکن روح کو غذا دینے والی یہ تمام چیزیں اسی وقت فائدہ پہنچاتی
ان سے فائدہ اٹھانے کا قصد ہو۔ اللہ پر ایمان اور اس کی محبت ایک شعوری حقیقت ہے اس لیے
) کو ایندھن اور غذا بنانے کے لیے بھی شعور کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارا اپنا کام ہے کہ ہم ان سے فائدہ اٹھائیں
ں؟ ـــــ دل کے اس جواب پر میرا ذہن اپنی ایک شکایت کی طرف منتقل ہو گیا۔ شکایت تھی کہ اب
یہ اجتماعات ہمیں فائدہ کیوں نہیں پہنچاتے یہ ہمارے دل کی بھٹی کو گرم کیوں نہیں کرتے۔ خیال آیا کہ اس کی
، یہ تو نہیں کہ ہم نے ان اجتماعات کی اصل ضرورت اور ان کی نوعیت کو بھلا دیا ہو، کہیں ایسا تو نہیں کہ
معلومات کے لیے جمع ہوتے ہیں اور جب کوئی نئی بات نہ ملتی ہو تو مایوس ہو جاتے ہوں، کہیں ایسا تو نہیں
ہ عن بے شعوری کے ساتھ استعمال ہو رہا ہو جس کی وجہ سے وہ ہمارے دلوں کو گرم نہ کر رہا ہو۔ یہ چند
یا جن پر ہمیں غور کرنا چاہیے اور ہر شخص کو اپنا جائزہ خود لینا چاہیے۔

ج کی تذکیر پر سوچتے وقت دوسرا سوال یہ سامنے آیا کہ تو جو خود محتاج تربیت ہے تجھے اپنے سے بہتر
ہایات دیتے ہوئے شرم نہیں آتی، تجھے اس کا حق کہاں سے مل گیا ہے۔ یہ سوال ہمیشہ مجھے اس کام سے
لئے بچا کرتا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی اپنے اوپر جبر کرکے دو وجہ سے یہ خدمت انجام دیتا ہوں۔ ایک یہ
سے مجھے خود اپنا جائزہ لینے کا موقع مل جاتا ہے، اپنی نا اہلیاں اور کوتاہیاں یاد آ جاتی ہیں، آنکھیں

یا نکلیں یا کوئی دل پر جو دستک دیتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سوچتا ہوں اصل میں ہم سب کا ادراک اللہ تعالیٰ
ہے' ہدایات دینا تو اس کا حق اور اس کے رسول کا کام ہے اور ان کی ہدایتیں کتاب و سنت میں محفوظ ہیں
میرا کام تو بس اتنا ہے کہ کبھی قرآن و حدیث سامنے رکھ کر ترجمہ سنا دوں اور کبھی زبان کا انہیں باتوں کو دہرا دوں
بلاشبہ کہنے والے کی شخصیت بھی ایک موثر عامل ہے لیکن حق و صداقت اور علم و حکمت شخصیتوں کے محتاج
نہیں شاید اسی حقیقت کو ذہن میں لانے کے لیے کہا گیا تھا:

انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال۔ — وہ بات دیکھو جو کہی گئی قائل کو نہ دیکھو کہ کس نے کہی

اور ہم مسلمان تو وہ خوش قسمت لوگ ہیں کہ ہمیں ہر وقت مَنْ قال کی طرف نظر جانے کے مواقع بھی
حاصل ہیں۔ قرآن ہمارے سامنے ہے اور کتب احادیث ہمارے پاس ہیں — ہم قرآن پڑھیں اور ما قال
کے ساتھ مَن قال پر بھی اپنی نظریں جما دیں تو اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات جمال و جلال اور اپنی تمام عظمت
جبروت کے ساتھ ہمارے دلوں کے قریب محسوس ہوگا اور ما قال کی تاثیر بے انتہا بڑھ جائے گی —
ہم حدیثیں پڑھیں اور ما قال کے ساتھ من قال کی طرف اپنے تصور کی باگ موڑ دیں تو ہم مدینۃ النبی میں جا پہنچیں
اور سیدنا محمد عربی فداہ امی و ابی اپنی تمام شفقت و رحمت' اپنے تمام اخلاق و کردار اور اپنی تمام عبدیت و
رسالت کے ساتھ ہمارے سامنے آ کھڑے ہوں گے اور ما قال کی اہمیت و افادیت اور دلکشی میں
ہزار گنا اضافہ ہو جائے گا۔

ایک اور پہلو سے بھی میں نے غور کیا۔ اگر ہمارے دل کی بھٹی گرم ہو اور ہم شعور کے ساتھ کوئی آیت' یا کوئی
حدیث یا آخرت کو یاد دلانے والی کوئی بات سن لیں تو ہماری گرم بھٹی بھڑک اٹھے گی۔ قرآن پڑھنے والا یا حدیث
سنانے والا یا آخرت کی بات بتانے والا کوئی شخص بھی ہو — گرم بارود پر چنگاری کوئی بھی پھینک دے وہ
بھڑک اٹھے گی۔ وہ یہ نہیں دیکھے گی کہ چنگاری زید نے پھینکی یا عمر نے۔

اپنے ان احساسات کے اظہار کے بعد آج کی صحبت میں آپ سے کہنے کی غرض دو باتیں میرے پاس ہیں
ایک یہ کہ اپنے نصب العین کو واقعی نصب العین بنا لیجیے۔ انہیں پیش نظر رکھیے' ان پر جم جائیے اور دوسری یہ کہ
اپنی اجتماعیت کو مضبوط سے مضبوط تر بنا لیجیے۔

ہندوستان میں مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں اور ان کی وجہ سے ہمیں جو کچھ کرنا پڑ رہا ہے اس میں ان ہما

اندیشہ ہو سکتا ہے کہ کہیں ہم اپنے نصب العین کو بھول نہ جائیں یا کسی اور چیز کو اپنی منزل مقصود نہ سمجھنے لگیں اس لیے بڑی ضرورت ہے کہ اپنے مقصدِ حیات ، اقامتِ دین پر نظر بھی رہے اور کسی مرحلے میں یہ نظر سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

اس کے بعد دوسری سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ جس مقصد کی بنیاد پر ہماری اجتماعیت تعمیر ہوئی ہے اس میں روز بروز استحکام پیدا ہوتا چلا جائے۔ ایسی تمام باتوں سے ہمیں پرہیز کرنا چاہیے جن سے اجتماعیت کمزور ہوتی ہے اور ایسی تمام باتیں اختیار کرنی چاہئیں جن سے اس میں مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

اجتماعیت کو مستحکم کرنے والی بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ سب کی تفصیل مقصود نہیں۔ مثال کے طور پر صرف دو چیزوں کا ذکر کرتا ہوں:۔

اطاعتِ امر اور حسنِ ظن۔ معروف میں اطاعت اسلام کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے اس لیے غیر معروف میں اطاعت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہم جب کسی اجتماعیت کو برقرار رکھنے اور اس کو مستحکم کرنے کے لیے یہ لفظ بولتے ہیں تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جماعتی نظم و نسق، ڈسپلن اور جماعتی فرائض کی انجام دہی میں امیر کے احکام کی پیروی کی جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار نہ کیا جائے، معقولیت کے ساتھ بحث نہ کی جائے یا اپنی ذات سے متعلق کوئی معقول عذر نہ پیش کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان مراحل کے بعد جب بات طے ہو جائے اور حکم دے دیا جائے تو پھر پوری خوش دلی کے ساتھ اطاعت کی جائے خواہ جو بات طے ہوئی ہو یا جو حکم دیا گیا ہو وہ ہماری رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ہر عاقل یہ سمجھتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ اس کے بغیر استحکام تو دور کی چیز ہے کوئی اجتماعیت برقرار بھی نہیں رہ سکتی ——— حسنِ ظن سے ہماری مراد یہ ہے کہ جماعتی مسائل میں دوسری کی رایوں کو ٹھیک اسی طرح نیک نیتی پر محمول سمجھا جائے جس طرح کوئی شخص اپنی رائے کے بارے میں خیال رکھتا ہے۔ یہ چیز آپس میں اعتماد پیدا کرتی ہے اور باہمی اعتماد کے بغیر اجتماعیت میں استحکام نہیں آ سکتا۔

اجتماعیت کو کمزور کرنے والی بھی بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں لیکن مثال کے طور پر دو چیزیں پیش کرتا ہوں اطاعتِ امر میں کمی اور بدگمانی۔ یہ دونوں باتیں اوپر کہی ہوئی دو باتوں کی ضد ہیں اس لیے ان کی تشریح غیر ضروری ہے۔

جاوید احمد غامدی

مذہب

کمیونسٹ پارٹی کے دل میں کھٹکتا ہوا ایک کانٹا

(۲)

از وائی میرن ———— ترجمہ :- ش۔ن عثمانی

تشدد کی بے اثری

ادھر چند برسوں میں اپنی اس کوشش میں کہ مذہبی اعتقادات کا پھیلاؤ روک دیا جائے سویت حکام تعزیراتی اقدامات کا وسیع تر استعمال کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ اقدامات ——— جن میں اعلیٰ سطح کی شہ پر سویت عوام کے کیے گئے فیصلوں کی بنیاد پر کلیساؤں کا بند کیا جانا اور جن کا عام طور سے ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے وہی الزام لگا کر مذہبی فرقوں کے لیڈروں اور پیروؤں، پادریوں کی گرفتاری بھی شامل ہیں ——— ان سب اقدامات نے مذہبی جذبات اور مذہبی سرگرمیوں میں اوس ڈالنے کے بجائے ان میں کسی قدر مزید جولانی ہی پیدا کر دی ہے۔ جیسا کہ ایلچیف کہتا ہے :-

"سوویت عوام کی اچھی خاصی تعداد خاص حد تک مذہب کے زیر اثر ہے اور کلیساؤں میں برابر حاضری دیتی اور مذہبی تقریبات پر عمل پیرا ہوتے چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ تصویر بارہا سامنے آتی ہے کہ کلیساؤں اور مذہبی فرقوں کا شمار تو گھٹ رہا ہے مگر جن مذہبی طریقوں پر عمل ہوتا ہے ان کی گنتی باہم کچھ اونچی ہوئی ہے"۔ کمیونسٹ ۱۹۶۲ء

ان کی مذہب دشمن مہم میں سوویت لیڈروں کو جن عقدہ دشوار کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ان لوگوں کے بیانات سے واشگاف ہوتا ہے جو اس مہم کے کرتا دھرتا ہیں۔ چنانچہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے نظریاتی کمیشن کی وسیع عمومی میٹنگ منعقدہ نومبر سال گزشتہ نے مندرجہ ذیل "کروہ حقائق" کو ریکارڈ کیا ہے :-

"........ ایک طرف مذہب کے ساتھ فیاضانہ سلوک ——— اس کے ان نمائندوں کے لیے گرویدہ کرنے کا انداز جو سوویت قانون کی خلاف ورزیاں کر رہے ہیں ——— اور دوسری طرف

کیا ہے ـــ اور جس کے نتیجے میں وہ فوری مسلسل آمد و رفت ہوئی ہے اور غیر ملکی مسلم تنظیموں کے نمائندوں نے
سوویت وسطی ایشیائی جمہوریتوں کی سیاحت کی ہے ۔

اس ذیل میں ایک بڑی اہمیت والا واقعہ عالمی مذاہب کی کونسل کی مجلس منتظمہ کے اجلاس کا اس سال
فروری میں آوڈیسہ میں انعقاد تھا۔ میٹرو پولیٹن نکوڈیم جو ماسکو اور ۃ اسقف کے شعبۂ تعلقات خارجہ کلیسا کے
چیئرمین ہیں۔ اس اجلاس کے نظم و نسق اور بیرونی مہمانوں کی پذیرائی کے انچارج تھے ۔ اگرچہ سوویت سرکاری پریس
میں ایسے واقعات کا معمولاً کوئی چرچا نہیں کیا جاتا لیکن شدہ شدہ ملک کی آبادی کے علم میں یہ واقعات آجاتے
ہیں۔ اس اجلاس میں جو مسیحی ایکتا اور عیسائی دنیا کے عالمگیر ارتقائے مزید کے مسائل پر غور و فکر کے لیے منعقد ہوا
تھا یہ فیصلہ کیا گیا کہ اقوام متحدہ میں انسانی حقوق کے کمیشن کو مذہبی آزادی اور مذہبی رواداری کے مسئلہ تحفظ پر
ایک تجویز ارسال کی جائے ـــ جو اس واقعہ کے پیش نظر بہت زیادہ معنی خیز تھا کہ یہ اجلاس ایک ایسے ملک میں
منعقد ہو رہا تھا جہاں برابر مذہب کو کچلا جا رہا ہے ۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ اس کے بعد ایک پریس کانفرنس
میں جرمن اناجیلی کلیسا کے اسقف للجے نے سوویت روس میں الحادی پالیسی کی غیر یقینی حالت کی طرف توجہ مبذول
کرائی اور زور دیا کہ اگر اشتراکی لیڈر مذہب دشمن سرگرمیوں کو نظریاتی بحث و مباحثہ تک محدود کر دینے پر
سوچنے کو تیار ہوں تو میں ذاتی طور پر روس میں کلیسا کے مستقبل کے متعلق کچھ اندیشہ نہیں رکھتا۔

نوجوانوں میں مذہب کا اثر

اسقف للجے کی یہ رجائیت معقولیت پر مبنی محسوس ہوتی ہے کیونکہ گزشتہ چند
ماہ کے دوران میں سوویت پریس آرتھوڈاکسی کلیسا کے جونیر کلیسائی عملے میں نوجوان
لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور نوجوانوں میں مذہبی جذبہ موجزن ہونے کا تذکرہ کھلم کھلا کرتا رہا ہے

جریدہ "نوکائے ریلیجیا" اور اخبار "کاسومول سکایا پراودا" نے مطالبہ
کیا کہ کلیسائی گروہ میں اس کے اندر بہت سے نوجوانوں کی موجودگی کے پیش نظر الحادی مہم چلائی جائے۔ جریدہ مذکور
ایسے نوجوان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ پادریوں کی بات کرتا ہے جنہوں نے دور افتادہ دیہاتی علاقوں میں روحانی کام کیا
اور کو بہتر بنا رکھا ہے۔ وہ ایک ایسے قابل اور ذی صلاحیت نوجوان فرد کا واقعہ نمونہ دیتا ہے جس نے

---

۱۸ فروری ۱۹۶۶ء - SUDDEUTSCHE - ZEITUNG - MUNICH

ص ۱۵، ۱۲ ۱۹۶۳ء - NAUKA-I-RELIGIYA

۲۲ نومبر ۱۹۶۳ء - KAMSOMOL SKAYA-PRAVDA

ہ وہ کارپات ماریا اور زنا کرنے کے ایک کلیسائی حلقے میں جا شامل ہوا ہے

"KAMSOMOLS KAYA-PRAWDA" اخبار نے بتایا کہ کس طرح ایک نوجوان شخص وادی یورال
نیکل اسکول میں خالصتاً اس غرض سے داخل ہوا کہ کلیساؤں کی تعمیر کا کام سیکھ جائے اور یہ کہ SUERDLOSK
ندوں نے اپنی "علمی بے بضاعتی" کے باعث حامیان بتپسمہ مسیحی نوجوانوں سے مباحثہ میں نظریاتی ہزیمت اٹھائی
اخبار نے قدرے استعجاب کے ساتھ اعتراف کیا کہ گروہی عصبیت رکھنے والے یہ نوجوان ایک مثالی انداز
سوویت فوج میں خدمات بجالاتے ہیں کیونکہ وہ سگریٹ نوشی نہیں کرتے — شراب نہیں پیتے یا نامناسب
استعمال نہیں کرتے —— اور اخبار مذکور نے نوجوانوں کے طبقے کو انتباہ کیا کہ "یہ لوگ جب یہ کہتے
تے ہیں تو انتہائی گمراہ ہوتے ہیں کہ "کمیونزم تو وہی کچھ سکھاتا ہے جو مذہب سکھاتا ہے"۔ اس کے
ن اخبار نے ایک اشتراکی ممبر کے خط پر بحث کی جس نے استفسار کیا تھا کہ سوویت روس میں گروہی میلان
نے والی حرکت و عمل ممنوع کیوں ہے اور کس لیے مذہبی فرقوں کے اراکین کو بار بار مجبور کیا جاتا ہے
وہ چھپ چھپ کر عبادت کریں" جریدہ "MOLODOI-KOMMUNIST" ماسکو یونیورسٹی کے قانون
یک ایسے طالب علم کا واقعہ پیش کرتا ہے جو اپنے فالتو اوقات میں قدیم معتقدین مذہب کے لیے کلیسا کے
م کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

س کی فوج میں مذہب کا اثر

سپہ سالار فوج اپی شیف فوج اور بحری بیڑوں کے سربراہ نے ان
سپاہیوں اور ملاحوں کی الحادی تربیت پر زور دیا "جو مذہب کی
ن سے ہوش باختہ ہو گئے ہیں" اور اعلان کیا کہ جماعتی کام کی "ایک سطحی شدہ کمزوری کی وجہ سے یہ حقیقت
ہ اب بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ "فوج میں کام کرنے کے بعد بھی ایک نوجوان خدا پر ایمان رکھنے والا ہی رہتا
ہے" آئی سخے۔ بیگرامین مارشل سوویت یونین نے یہ الزام لگاتے ہوئے فوجی رنگروٹوں میں مذہب کے ہمہ گیر

NAUKA-I-RELIGIYA ۱۹۶۳ء نمبر ۱۲ صفحہ ۹۱-۹۵

KOMSOMOLSKAYA-PRAVDA ۲۰ دسمبر ۱۹۶۳ء ــــــ ایضاً

ایضاً ۵ فروری ۱۹۶۳ء

MOLODOI-KOMMUNIST ۱۹۶۳ء اپریل صفحہ ۶۳

NAUKA-I-RELIGIYA ۱۹۶۴ء نمبر ۱ صفحہ ۲۲-۲۳

اثرات کے بارے میں زیادہ حقیقت کے ساتھ [illegible]

" یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ بعض علاقوں میں نوجوان فوج میں شامل ہونے کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو ان کو اشتراکی تنظیموں کی طرف سے نہیں بلکہ مقامی پادریوں کے ذریعہ الوداع کہا جاتا ہے ۔۔۔ یہ لوگ ان نام نہاد خوشیوں کو ذرا آگے اور اعلیٰ پارٹیوں میں شراب کا دور چلتا ہے جو زار روس کے زمانے کی فوجی بھرتی کی یاد تازہ کرتا ہے ۔۔۔ یہ کوئی مجبوری نہیں کہ وہ لوگ جو اپنی تعلیم کے اثرات میں سے گزرتے ہوئے فوج میں آتے ہیں ان کا انتشار کچھ ایسا ہے کہ ہتھیار اٹھانا ایک سنگین گناہ ہے"[1]

نوجوانوں میں مذہب

جوان سال سوویت تعقل پسندوں میں بھی مذہب پھیلتا جا رہا ہے۔ ایجیٹ غمناک انداز میں پوچھتا ہے

" لیکن ان تعقل پسندوں کا تمدنی ضمیر کہاں چلا گیا ہے جو کام کے وقت ملحد بننے کا سوانگ رچاتے ہیں مگر گھر پر مذہبی رسوم سرانجام دیتے ہیں ۔ کلیسا جاتے ہیں ۔۔۔ اپنے بچوں کو بپتسمہ دینے کی تقریب مناتے ہیں اور ایک مذہبی پادری کے ہاتھوں اپنی شادی کا انعقاد عمل میں لاتے ہیں؟"[2]

ایجیٹ نوجوان لوگوں میں آرتھوڈاکس کلیسا اور دیگر مذہبی فرقوں کی روز افزوں سرگرمیوں کو شد و مد کے ساتھ بیان کرتا ہے:۔

" ان فرقوں میں بطور خاص طبقاتی عصبیت رکھنے والے فرقوں میں ۔۔۔ جوانوں کو اپنا نشانہ بنا کر خصوصی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں ۔۔۔ محبت کی شامیں ۔۔۔ آرکسٹرا اور سرود کلیسا کی محفلیں ۔۔۔ سیاحتیں ۔۔۔ PVATIGORSKIJI KISLAVODSK علاقوں میں BAPTIST گروہ کے لوگ پابندی کے ساتھ نوجوانوں کے لیے مسیحی تعلیم کے حلقے اور سال نو کی شام کی پارٹیاں منعقد کرتے ہیں جن میں مذہبی گیت گائے جاتے ہیں اور مذہبی مواد پر ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ نونہالوں اور نوجوانوں کو مذہب کی سمت میں کھینچنے کے لیے کلیسائی لوگ والدین پر اپنے اثرات کی گرفت تیز تر کر رہے ہیں"[3]

تعلیم گاہوں پر خصوصی توجہ کی ضرورت

اس کے بعد ہی ایجیٹ اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے ۔

---

[1] [illegible] - MOLODAYA-GVARDIYA نمبر ۲ ص [illegible]

[2] [illegible] - KOMMUNIST نمبر ۱ ص [illegible]

"ہمارے کام کی سب سے بڑی کمزوری اسکول بچوں کی الحادی تعلیم کی طرف سے کم توجہی ہے
جس کے نتیجے میں خاص طور سے خاندانی بزرگوں کے زیر سایہ نئی نسل پروان چڑھتی ہے۔ حقائق ثابت
کرتے ہیں کہ بقائے مذہب کا خصوصی مرکز خاندان ہے اور یہ کہ بچوں اور نوخیز جوانوں کو مذہب کے نام
پر اکٹھا بنائے جانے کے فائدے ایسے بڈھے بوڑھوں سے اثر پذیری میں ملتے ہیں جن کا ایمان خدا پر ہے
بہت سی جگہوں پر تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے اسکول عمر کے لڑکے کلیسا میں اعتراف گناہ اور عشائے
ربانی کی تقریبات میں دوسرے دنوں سے زیادہ شریک ہو رہے ہیں۔[1]

نظریاتی کمیشن کے اجلاس نومبر میں یہ بات سامنے آئی کہ اونچے درجے کے سوویت سائنسدان ان کوششوں
کے خلاف سرد مقاومت کامل کر رہے ہیں جو ان لوگوں کو مذہب دشمن اقدامات میں الجھانے کے لیے ہوتی ہیں۔ مخصوص
ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے وزیر V. P. ELUTIN نے شکایت کی کہ اعلیٰ تعلیم کی بعض خاص درس گاہوں میں
وزارت کے مخصوص ہدایت نامے کے باوجود سائنسی الحاد کے مبادیات کا نصاب پڑھایا نہیں جاتا ہے۔[2]

لیتھونیا کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سکریٹری برکاؤس کاس نے شکایت کی۔

".....بعض چوٹی کے سائنسدان مذہب کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کو ضروری اہمیت نہیں
دیتے حتیٰ کہ PANIE Z سوسائٹی میں شامل ہو چکنے کے بعد بھی ان کی طرف سے کوئی عملی سرگرمی ظاہر نہیں
ہوتی۔ ممتاز سائنس دان چپ سادھے ہوئے ہیں اور اہل کلیسا اس پر قیاس آرائیاں کرتے ہیں ——
سوچو تو! اہل کلیسا معتقدین مذہب سے کہتے ہیں: "سائنس دان مذہب کے خلاف میدان میں نہیں نکلتے
اور سچ پوچھو تو یہی وہ لوگ ہیں جو خوب جانتے ہیں کہ حقیقت حال ہے کیا؟"[3] (باقی)

---

[1] KOMMUNIST ۱۹۶۳ء نمبر ۱ صفحہ ۳۶

[2] NAUKA-I-RELIGIYA ۱۹۶۳ء نمبر ۱ صفحہ ۳۳   [3] ایضاً صفحہ ۲۳

مسلمانوں پر منظّم حملوں کی ایک توجیہ

اکتوبر کے پہلے ہفتے میں بہار کے معزز ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک اجتماع بہار ریاستی رہبر کمیٹی برائے جمہوری کنونشن کی زیرنگرانی ایم۔ ایل۔ اے کلب پٹنہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نوراللہ ایم ایل سی نے کہا :-

فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا لیکن اصل چیز غور کرنے کی یہ ہے کہ ان فسادات کے پیچھے ان لوگوں کا ہاتھ ہے جو ملک کے نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں اور سوشلزم اور سیکولرزم کو ختم کر دینا چاہتے ہیں اس لیے جو لوگ ترقی پسند ہیں انہیں قیام امن کے مسئلے پر غور کرنا چاہیے ورنہ ملک کا بڑھتا ہوا قدم پیچھے ہٹ جائے گا۔ یہ فسادات مذہبی جھگڑے نہیں بلکہ سیاسی لڑائیاں ہیں۔ آخر اس وقت اس ملک میں فساد کیوں نہیں ہوا جب کہ ہندوستان میں صرف چند سو یا چند ہزار مسلمان تھے اور آج بھی پڑوسی ہندو ریاست نیپال میں مسلمان شانتی اور امن سے کیوں رہ رہے ہیں۔ ابھی مجھ سے بعض مسلمانوں نے کہا کہ ہم ہندوستان چھوڑ کر نیپال جا بسیں گے اس لیے کہ وہاں مسلمانوں پر کوئی ظلم نہیں ہوتا ان حقیقتوں پر اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب پالیٹکس درمیان میں آتی ہے تب ہی فساد برپا ہوتے ہیں۔ پچھلے سترہ برس سے اس ملک میں جو نصاب تعلیم پڑھا جا رہا ہے اس میں فرقہ پرستی کو ابھارنے والے مواد موجود ہیں۔ فرقہ پرستی ملک کی ترقی کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس لیے ملک کے تمام ہی بہی خواہوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایمان داری کے ساتھ اس مسئلے پر غور کریں اور اسی لیے جمعیۃ علماء نے جمہوری کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

قومی آواز، ۵ اکتوبر ۱۹۶۴ء

مولانا نوراللہ صاحب ایم ایل سی کی یہ تقریر پڑھ کر مولانا عبدالماجد دریابادی کی زبان میں "قومی آواز" اور "صدق" نے کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس تقریر کے مضمرات کی توضیح اور اس کا مفصل تجزیہ موجب طوالت ہے۔ یہ محض اشاروں میں چند سوالات اور مختصر تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) مولانا کہتے ہیں کہ یہ فسادات مذہبی جھگڑے نہیں بلکہ سیاسی لڑائیاں ہیں اور ان کے پیچھے ان لوگوں کا ہاتھ ہے جو ملک کے نظام کو بدلنا اور سوشلزم اور سیکولرزم کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے اس پر جو دلیل دی ہے اس پر بعد کو گفتگو ہوگی پہلے یہ عرض کر دوں کہ اسی اجتماع میں مولانا کے بھائی مولانا منت اللہ صاحب امیر شریعت صوبہ بہار نے ان فسادات کو "منظم حملہ" اور "نسل کشی" قرار دیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف مسلمانوں کی نسل کشی سے ملک کے نظام کی تبدیلی اور سوشلزم اور سیکولرزم کے خاتمے کا کیا تعلق ہے؟ اگر اس کا جواب یہ ہو کہ مسلمان چونکہ کانگریس کو ووٹ دیتے ہیں اس لیے ان کو ختم کیا جا رہا ہے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کانگریس کو ووٹ تو ہندو بھی دیتے ہیں، سکھ، بودھ، اور عیسائی بھی دیتے ہیں۔ اور اگر یہ سب ووٹ نہ دیں تو کانگریس کبھی جیت ہی نہیں سکتی تو پھر منظم حملوں کی "سیاست" کا نشانہ صرف مسلمان کیوں بنتے ہیں؟ یہ سیاست کی کون سی قسم ہے؟ اور سیاست کی یہ قسم دنیا بھر میں صرف ہمارے ہی ملک بھارت میں کیوں پائی جاتی ہے! دنیا کے ہر مہذب اور آزاد ملک میں مختلف سیاسی پارٹیاں موجود ہیں اور ہر پارٹی دوسری پارٹی کو شکست دے کر حکومت پر قبضہ کرنا چاہتی ہے لیکن سیاست کی یہ قسم کہیں نہیں پائی جاتی کہ کوئی پارٹی اپنے ملک کی کسی اقلیت پر اس لیے منظم حملے شروع کر دے کہ اس نے کسی دوسری پارٹی کو ووٹ کیوں دیے پھر یہ بات بھی بعید از عقل ہے کہ کوئی پارٹی جب کہ اس کے ہاتھ میں حکومت بھی نہ ہو کسی گروہ کو قتل کر کے، انہیں لوٹ کر اور انہیں بے آبرو کر کے اس بات کی متوقع ہو کہ اس گروہ کے لوگ اس کے بکس میں اپنا ووٹ ڈالیں گے، اس لیے مسلمانوں پر منظم حملوں کو سیاسی کھیل قرار دینے کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا اچھا ہوتا کہ مولانا ان پیدا ہونے والے سوالات اور شبہات کو بھی اپنی تقریر میں حل کر دیتے۔ اس کے علاوہ مجھے یاد نہیں کہ آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو سے لے کر کانگریس کے دوسرے بڑے بڑے چوٹی کے نیتاؤں نے وہ بات کہی ہو جو مولانا کہہ رہے ہیں۔ ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ مسلمانوں پر حملے کانگریس کو شکست دینے کی سیاسی لڑائی ہے، بلکہ کسی نے اس کو جارحانہ قوم پرستی کہا اور کسی نے مذہبی جنون و بے عقلی قرار دیا۔ اور ابھی ابھی مسلمانوں پر جو قیامت توڑی گئی ہے اس کو بھارت کے وزیر داخلہ نے پاکستان کا رد عمل کہا ہے۔ وہ بات تو پورے زور و شور سے مسلمان قوم پرست ہی کہتے رہتے ہیں جو مولانا نے فرمائی ہے۔ آخر اس راز سے بھی تو کبھی پردہ اٹھانا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے؟

(۲) مولانا نے اپنے دعوے کی دلیل میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ [illegible] جو سیکولرزم کے سر پر [illegible]
[illegible]

ان کی دلیل کا صاف جواب یہ ہے کہ جب ہندستان میں صرف چند سو یا چند ہزار مسلمان تھے تو انہیں امن اور تحفظ جان و مال اس لیے نصیب تھا کہ اس وقت یہاں سیکولرزم کا ملغ نہ تھا، بلکہ خالص ہندو راج تھا اور نیپال میں آج مسلمان اسی لیے محفوظ ہیں کہ وہ سیکولر حکومت نہیں بلکہ ہندو حکومت ہے۔ اب اگر مسلمان یہ کہیں کہ سیکولرزم ہی ان کے مصائب کی جڑ ہے تو مولانا کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ نیز یہ کہ جب ہندو مذہب بے قصوروں کے قتل کی اجازت نہیں دیتا تو پھر مسلمانوں کے قاتلوں کو اجازت کہاں سے مل رہی ہے؟ یقیناً مغربی سیاست سے۔ اور اس سیاست کے حمام میں کانگرس بھی اسی طرح ننگی ہے جس طرح دوسری سیاسی پارٹیاں۔ جب حقیقت یہ ہے تو ہندستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کو مغربی سیاست اور مغربی نظریات زندگی سے توبہ کرکے ملکی امن و امان کے مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔ کیا اچھا ہوتا کہ مولانا اس ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کو اس کے لیے تیار کر دیتے۔

(۳) ملک کے نصاب تعلیم پر مولانا نے جو تنقید کی ہے وہ بالکل سچی ہے لیکن اس سچی بات کی زد کس پر پڑ رہی ہے؟ کیا سترہ سال سے یہ نصاب تعلیم جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا کی نگرانی میں اور ان کے حکم سے جاری ہے؟ جب ایسا نہیں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک میں فرقہ پرستی کو ترقی دینے کا مجرم کون ہے؟ مجرم محض اس ڈنڈے کے زور سے جو اس کے ہاتھ میں ہے اپنے کو بے قصور کہنے لگے تو کیا اس سے حقیقت بدل جائیگی؟ جمہوری کنونشن کی تائید والے جلسے میں مولانا کی اس حق گوئی نے یہ واضح کر دیا کہ فرقہ پرستی کو ختم کرنا اس پارٹی کے بس کا روگ نہیں ہے جس کے وہ ممبر ہیں۔ خود ان کی تقریر کی روشنی میں وہ لوگ تو ہرگز ترقی پسند قرار نہیں پاتے جن کی نگرانی میں یہ زہریلا نصاب تعلیم جاری ہے۔ جو لا اینڈ آرڈر کے ذمہ دار ہیں اور جو آج تک مسلمانوں کے کسی ایک قاتل کو بھی سزا نہ دلوا سکے۔

یہ مولانا کی تقریر کا ایک مختصر تجزیہ ہے۔ قیام امن کے سلسلے میں ہمارے جو خیالات و نظریات ہیں، انھیں ہم زندگی کے صفحات میں واضح کر چکے ہیں۔ یہ تجزیہ اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ جمہوری کنونشن میں ان حقیقتوں پر ضرور غور کرنا چاہیے جن کی طرف اس میں اشارے کیے گئے ہیں۔

مدیر — ۲۰ر اکتوبر ۱۹۶۴ء

تنقید و تبصرہ

مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ صفحات ۲۰۰ کاغذ، کتابت و طباعت معیاری مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ قیمت:۔ پانچ روپیہ۔ ناشر: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ۔

مولانا کی یہ تصنیف ان کی ایک عربی تصنیف موقف العالم الاسلامی تجاہ الحضارۃ الغربیۃ کا اردو ایڈیشن ہے مولانا کی اس عربی تصنیف پر زندگی میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ اردو ایڈیشن متعدد اضافات و تفصیلات کی وجہ سے مولانا کی اس عربی تصنیف کے مقابلے میں ضخامت و افادیت دونوں لحاظ سے بڑھ گیا ہے۔ اس تصنیف میں بھی مولانا کی تمام تصنیفی خصوصیات موجود ہیں۔ یہ کتاب اسلامیت و مغربیت کی کش مکش کا علم حاصل کرنے کے لیے بہت مفید ہے۔ یہ تمام اہل علم کے مطالعے و لائبریریوں کی زینت بننے کے لائق ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے عقائد و اعمال کی واقفیت کے لیے تو یہ کتاب ایک حوالے کی کتاب بن گئی ہے مصطفیٰ کمال کے بارے میں یہ بات تو پہلے سے معلوم تھی کہ وہ مغربی تہذیب کے شیدائی اور آزاد خیال شخص تھے لیکن یہ بات اس کتاب سے معلوم ہوئی کہ وہ خدا تک کے قائل نہ تھے۔ مغرب پرستی کے میدان میں چونکہ ترکی ہی امام اول کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے ضرورت تھی کہ اس کی یہ تاریخ تفصیل سے لکھی جاتی۔ فاضل مؤلف نے اس سلسلے میں سب سے زیادہ تفصیلی حالات ترکی ہی کے لکھے ہیں۔

مولانا نے مغربی تہذیب کے شیدائیوں اور مقلدوں کی اس ٹیکنک کو بھی واضح کر دیا ہے جو اب زمانہ قریب سے انھوں نے اختیار کی ہے۔ پہلے جدید تہذیب کے مقابلے میں اسلام کی دقیانوسیت کا اظہار و اعلان کیا جاتا تھا لیکن یہ چیز مسلمانوں میں مقبول نہ ہو سکی اس لیے اب جدید تہذیب کے لوازم کو اسلامی بنانے کی کوشش شروع کی گئی ہے۔ آیات و احادیث کے ایسے معانی و مفاہیم بیان کیے جا رہے ہیں جو آج تک کسی پر منکشف نہ ہوئے تھے۔ اس طرح اسلام کا ایک نیا ایڈیشن تیار ہو رہا ہے۔ اس نئی فن کاری کا امام مصر ہے اور اب پاکستان کے

ردِ عمل منفی ہے. شارحین نے بھی اونچا مقام حاصل کر لیا ہے۔ فاضل مؤلف نے ان علماء کا ... بھی چاک کیا ہے۔ اندیشہ ہے کہ یہ کتاب اس فن کے اماموں کو پسند نہ آئے گی۔ بہرحال جو لوگ اس اسلام سے محبت کرتے ہیں جس کا نمونہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقدس ساتھیوں نے دکھایا تھا وہ اس کتاب کی قدر کریں گے۔

ہند و پاک میں جماعت اسلامی نے مغربی تہذیب کا چیلنج قبول کر کے اسلامی تہذیب کی سربلندی کے لیے جو کوشش کی ہے اور کر رہی ہے اس کتاب میں حسب دستور اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہم اس کتاب کا خیر مقدم کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ طبقے میں خصوصیت کے ساتھ اس کو پھیلایا جائے (ع-ق)

علاجِ خوف و حزن

تالیف ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب۔ صفحات ۲۸۰، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ قیمت:۔ غیر مجلد تین روپیے اور مجلد چار روپیے۔ ناشر:۔ مکتبہ دینیہ، دیوبند، یوپی

اس کتاب کا تعارف خود اس کتاب میں اس طرح کرایا گیا ہے:۔

"جس میں غم و حزن و خوف کے جذبات کی نفسیاتی تحلیل کی گئی ہے اور ان کے رفع کرنے کے لیے روحانی نفسیاتی طریقوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور جس میں حافظ ابن ابی الدنیا کے مشہور رسالہ الفرج بعد الشدۃ کا ترجمہ بھی شامل ہے اور ضمیمہ کے طور پر ادعیہ علمیہ اور استغاثات نافعہ کا نہایت مفید انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے"

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کا نام اہل علم کے درمیان غیر معروف نہیں ہے۔ آپ حیدرآباد کے ایک مشہور فلسفی اور صوفی ہیں۔ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے سابق پروفیسر و صدر شعبۂ فلسفہ ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے خود جو کچھ لکھا ہے اسے تو بہتر طور پر اہل علم سمجھ سکیں گے لیکن عوام کے لیے بھی اس کتاب میں ضمیمہ لگا دیا گیا ہے جس میں ختم خواجگان، ختم مجدد و شیخ احمد سرہندیؒ، ختم قادریہ وغیرہ کے قاعدے ضابطے بھی لکھ دیے گئے ہیں۔ اولاً ختمات سے تو کان آشنا تھے لیکن اس میں تبصرہ نگار کو ایک نئی چیز ملی اور وہ ہے صلوٰۃ کن فیکون۔

اس کتاب میں قرآن کی آیتیں بھی ہیں، احادیث بھی ہیں، بزرگوں کی زبان سے نکلی ہوئی دعائیں اور استغاثے بھی ہیں۔ فارسی کے اشعار بھی ہیں۔ میں پوری کتاب تو نہیں پڑھ سکا لیکن اجمالی نظر ڈالنے سے پتا چلا کہ یہ مروجہ تصوف اور اس کے اعمال و اشغال سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے زیادہ کام کی ہے۔ (ع-ق)

کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ اس مقدمے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کے معتقدین کو شاید پسند نہ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ فاضل مقدمہ نگار نے خود ہی معذرت پیش کر دی ہے، لکھتے ہیں :۔

"سر سید کا فکار و کردار کے جائزے سے غالباً نہ آپ مطمئن ہوں گے نہ متفق مگر اسے ایک نقطۂ نظر کی حیثیت سے مطالعہ فرمائیے۔"

فاضل مرتب نے اپنے نقطۂ نظر کی حیثیت سے جو کچھ لکھا ہے بڑی سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ لکھا ہے۔ اس لیے امید ہے کہ سر سید احمد خاں کے غالی معتقدین بھی اسے ٹھنڈے دل سے پڑھیں گے۔ اصل کتاب "سیرت فریدیہ" میں بھی بہت سی کام کی باتیں مل جاتی ہیں اور اس کی تاریخی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پاک اکیڈمی نے اسے دوبارہ شائع کر کے اچھا کام کیا ہے۔ (ع۔ق)

تہذیب الاخلاق

مدیر :۔ فرید الدین وکیل، صفحات ۶۴، چندہ سالانہ آٹھ روپیہ۔ فی پرچہ ۷۵ پیسے۔
ملنے کا پتہ :۔ دفتر تہذیب الاخلاق، محلہ بیریان۔ رام پور۔ یوپی

یہ ماہنامہ جناب فرید الدین صاحب وکیل کی ادارت میں نکلا ہے اور اب تک اس کے تین شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ کنز العمال مشہور مجموعۂ احادیث ہے۔ وکیل صاحب اپنی وکالت کی مصروفیتوں کے باوجود، عرصہ دراز سے اس کا اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ کتابی شکل میں ابھی اس ترجمے کی اشاعت کا انتظام نہیں ہو سکا ہے اس لیے وکیل صاحب نے اس کی اشاعت کی یہ شکل نکالی ہے۔ اصلاً یہ ماہنامہ اسی نیک مقصد سے نکالا گیا ہے۔ وکیل صاحب نے خود ہی "سخنہائے گفتنی" میں ترجمے کی تفصیل بتاتے ہوئے آخر میں لکھا ہے :۔

اشاعتِ حدیث کے سلسلے میں یہ خیال زیادہ کارآمد معلوم ہوا چنانچہ یہ رسالہ دراصل اشاعت حدیث کے واسطے ہی جاری کیا گیا ہے تاکہ قسط وار کتاب شائع ہو جائے۔"

احادیث کا ترجمہ ضمیمے کے طور پر آخر میں اس طرح شائع کیا جا رہا ہے کہ اس کو الگ کر کے جلد بندی کرائی جا سکے۔ پہلے شمارے میں کتابت و طباعت اور ترجمے کی جو غلطیاں ہو گئی تھیں دوسرے شمارے میں ان کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ وکیل صاحب اپنا ترجمہ مولانا عبدالوہاب خاں صاحب اور مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب کو بھی سنا دیتے ہیں۔ ترجمہ احادیث کے علاوہ وکیل صاحب کے کچھ مضامین بھی اس ماہنامے میں شائع ہو رہے ہیں۔

پچھلے شمارے میں ان کا ایک مضمون ہماری موجودہ بداخلاقیاں اور ان کے اسباب شائع ہوا ہے۔ اس کی بعض عبارتوں میں غلو کے مغالطات کی جھلک نظر آئی۔ وکیل صاحب نے لکھا ہے۔

"ہم اپنی اخلاقی پستی کے اسباب جانتے ہیں۔ دیانتداری نہیں برتیں گے اگر ایک تیسرے سب سے اہم سبب سے صرف نظر کر لیں اور وہ ہے انفرادی ملکیت اور اس کی لامحدودیت۔"

جس مقصد سے یہ رسالہ نکالا گیا ہے اور جو کام اس کے پیش نظر ہے اس سے اس عبارت کی مناسبت سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید بلا ارادہ یہ عبارت قلم سے نکل گئی ہے۔ احادیث کی روشنی میں انفرادی ملکیت کو اخلاقی پستی کا سبب قرار نہیں دیا جا سکتا چہ جائیکہ سب سے اہم سبب۔

وکیل صاحب کی خدمت میں ایک اور بات عرض کرنی ہے کہ رسالے کی زبان کی طرف خاص توجہ فرمائیں۔ آج کل زمانے میں اس ہی سبب" اور رکھنا کے بجائے " رکھانا " جیسے الفاظ بہت ناگوار محسوس ہوتے ہیں۔ بہرحال کنزالعمال کا ترجمہ ایک بڑا کام ہے اور اس بڑے کام کی اشاعت میں تعاون تعاون علی الخیر ہے۔ (ع۔ ق)

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ کی کتابیں

مقام سیرت: ۔ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم اے۔ پی ایچ ڈی کی اس کتاب میں سیرت محمدی کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ طرز بیان سادہ اور موثر کتابت اور طباعت دیدہ زیب۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۲۰۸ قیمت مجلد مع گرد پوش چار روپیہ پچاس پیسے

طوفان سے ساحل تک: ۔ از محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویلس)

اس کتاب میں مغربی زندگی کے اس طوفان کی تصویر پیش کی گئی ہے جس سے گزر کر محمد اسد صاحب اسلامی زندگی کے سکون کے ساحل تک پہنچے۔ کتاب میں مغربی تہذیب کی مکمل تصویر بھی ہے اور اسلامی معاشرے کی خصوصیات بھی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مفصل مقدمے کے ساتھ۔ کتابت طباعت معیاری کاغذ اعلیٰ قیمت مجلد ۔ پانچ روپے ۔

ہندوستانی مسلمان: ۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ قیمت: تین روپیہ پچاس پیسے۔

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر: ۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی قیمت ۔ چار روپیہ پچاس پیسے

نیا طوفان اور اس کا مقابلہ: ۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ قیمت ۔ ۳۷ پیسے

نشان راہ: ۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ قیمت ۶۲ پیسے

ملنے کا پتہ: ۔ مکتبہ زندگی و کائنات ۔ رام پور ۔ یوپی

(بقیہ: اشارات) بلکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو جو خلافت ارضی عطا کی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا۔

زمین کی آبادی، لوگوں کے لیے سیاست کی انجام دہی (یعنی ان کے تمام امور و معاملات کا انتظام

اور تدبیر) ان کے نفوس کی تکمیل۔ اللہ کے شرعی فیصلوں کی تنفیذ اور حدود الٰہی کی اقامت

اقامت دین کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے؟ ہم نے گزشتہ قسطوں میں قرآن و حدیث کے نصوص پیش کر کے بعثت انبیاء کے مقصد نہیں بلکہ تخلیق انسانی کا مقصد بھی اقامت دین ہی تھا۔

حضرت آدمؑ کے واسطے سے ان کی پوری ذریت قیامت تک کے لیے خلافت ارضی کی حامل ہے اس لیے نہ صرف امت مسلمہ بلکہ مقصدِ تخلیق کے لحاظ سے تمام بنی نوع انسان کا فریضۂ حیات اور اس کا مقصدِ وجود اقامت دین کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس زمین پر انسان بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ وہ خدا کے دین و شریعت اور اس کے آئین و قانون کی پابندی کرے اور اسی کے مطابق دنیا کا انتظام چلائے۔

(باقی آیندہ)

جلد :- ۳۳
شمارہ :- ۶

رجب ۱۳۸۴ھ
دسمبر ۱۹۶۴ء

زندگی رامپور

مدیر :- سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر زندگی، رام پور۔ یوپی

● زر سالانہ :- چھ روپیے — ششماہی :- تین روپیے — فی پرچہ :- ۶۰ پیسے

ممالک غیر سے بارہ ۱۲ شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں

منیجر ہفت روزہ شہاب ۱۱/ح شاہ عالم مارکیٹ، لاہور۔ پاکستان

مالک :- جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر :- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر :- احمد حسن۔ مطبع :- دہلی پرنٹنگ ورکس محلہ بنگلہ آزاد خاں رامپور

مقام اشاعت :- دفتر زندگی رامپور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مولانا ابو اللیث ندوی امیر جماعت اسلامی ہند

بار ہا ایسا ہوا ہے کہ بعض واقعات جب وہ پیش آتے ہیں تو عام ہنگاموں میں ان کی کوئی خاص وقعت یا اہمیت نہیں ہوتی لیکن بعد کو وہی واقعات اپنے اثرات ونتائج کی بنا پر نہایت اہم اور عظیم واقعات میں شمار ہونے لگتے اور تاریخ کا ایک اہم جز بن جاتے ہیں ۔

---

۸ ر ۹ ر اگست کو لکھنؤ میں ایک مختصر سا مسلم مشاورتی اجتماع منعقد ہوا تھا اس قلیل ترین مدت میں اس کے جو اثرات مختلف شکلوں میں سامنے آئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے کچھ ایسا اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ اجتماع بھی انشاء اللہ ایک ایسا ہی واقعہ ثابت ہوگا اور نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ ہندستان کی تاریخ میں بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا ۔

یہ اجتماع اپنی ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے کسی خاص اہمیت کا حامل شمار نہیں کیا جا سکتا ۔ جو لوگ اجتماع میں شریک ہوئے تھے ان کی تعداد ستر ہی سے زیادہ نہ تھی اور تھوڑے سے افراد کو چھوڑ کر وہ بالعموم ایسے ہی حضرات تھے جن کو شہرت یا دنیاوی وجاہت وغیرہ کے لحاظ سے کوئی خاص اونچا مقام حاصل نہیں ہے اور اجتماع کی کارروائیاں بھی کچھ اس طرح انجام پائیں کہ خود شہر لکھنؤ کے بہت سے لوگوں کو اس کی کوئی اطلاع بھی نہ ہو سکی ہوگی نہ کوئی جلوس نکلا اور نہ کسی قسم کا کوئی نعرہ بلند کیا گیا ۔ نہ پرجوش تقریریں ہوئیں اور نہ گرم گرم تجاویز پاس کی گئیں لیکن اس کے باوجود اس کے وزن اور اس کی اہمیت کا حال یہ ہے کہ اجتماع کے ختم ہوتے ہی ہر چہار طرف اس کے چرچے شروع ہو گئے ۔ ملکی پریس کا عمومی رویہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے بڑے سے بڑے اجتماعات تک کی خبروں کو نظر انداز کر دیا کرتا ہے لیکن اس موقع پر اس نے نہ صرف اس اجتماع کی خبریں شائع کیں بلکہ اس پر موافق یا مخالف تبصرے بھی کیے اور پارلیمنٹ تک میں بھی اس کے بارے میں سوال وجواب ہوا اور ملک سے باہر امریکہ و برطانیہ وغیرہ کے بڑے بڑے اخبارات نے بھی اس سے نمایاں طور سے

دل چسپی لی اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ کہنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ اس چھوٹے سے اجتماع نے ان کو جس طرح متاثر کیا ہے اس کی کوئی مثال ان کے بڑے سے بڑے اجتماعات میں بھی ملنی مشکل ہے۔ اس وقت جدھر دیکھیے یہ اجتماع ہی ان کا موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جہاں ان کی اکثریت اس سے خوش، اس کی کارروائیوں سے مطمئن اور مستقبل کے بارے میں اس سے ہر طرح پُرامید ہے وہیں ان کے کچھ افراد یا طبقے اس پر اظہارِ ناخوشی بھی کر رہے ہیں اور اس کی کارروائیوں پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہوئے اسے ہندستان اور مسلمانوں کے لیے ایک زبردست خطرہ بھی قرار دیے جا رہے ہیں۔ اجتماع اور اس کی کارروائیوں کے بارے میں یہ دونوں نقاط نظر ایک دوسرے سے خواہ کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں لیکن ان کے اظہار سے بہرحال اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس اجتماع نے لوگوں کے ذہن و دماغ پر غیر معمولی اثرات ڈالے ہیں اور اس کو نظرانداز کر دینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

مسلم مکاتبِ فکر کا اجتماع

اجتماع کی اس اہمیت کو دیکھ کر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے یہ مقام آخر کیوں حاصل ہوا۔ ہمارے خیال میں اس کے متعدد وجوہ ہو سکتے ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ اجتماع خواہ اپنے شرکا کی تعداد وغیرہ کے لحاظ سے کتنا ہی محدود مختصر اور کم حیثیت کیوں نہ رہا ہو لیکن اس کو ایک ایسی خصوصیت حاصل رہی ہے جو کم از کم تقسیم کے بعد مسلمانوں کے کسی بڑے سے بڑے اجتماع کو بھی حاصل نہ ہو سکی تھی اور وہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے تقریباً تمام مکاتبِ فکر اور ان کی قابلِ ذکر چھوٹی بڑی جماعتوں کا ایک نمائندہ اجتماع تھا۔ ہندستان کے مسلمان ایک مدتِ دراز سے جس افتراق و انتشار کے شکار ہو چکے ہیں اور اپنے معمولی معمولی اختلافات کی بنا پر جس طرح باہم ایک دوسرے سے دست بہ گریباں رہے ہیں اور بدقسمتی سے تقسیمِ ہند کے بعد کے مشکل دور میں بھی ان کی اس حالت میں کسی طرح کا کوئی تغیر رونما نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کون توقع کر سکتا تھا کہ ان کے اکابر اپنے باہمی اختلافات اور رنجشوں کو بھلا کر کسی ایک پلیٹ فارم پر تھوڑی دیر کے لیے بھی اکٹھا ہو سکتے ہیں اور اس سے آگے وہ کچھ باتیں اتفاق رائے سے بھی طے کر سکتے ہیں لیکن اللہ کے فضل سے یہ غیر متوقع بات بہرحال رونما ہو کر رہی وہ نہ صرف اکٹھا ہوئے بلکہ دو روز تک مسلسل باہم سر جوڑ کر بیٹھے اور اپنے حال و مستقبل کے بارے میں کچھ باتیں کسی اختلاف کے بغیر متفقہ طور سے طے کیں۔

مسلمانوں کا یہ بے نظیر اتحاد غیر متوقع طور پر ظہور پذیر ہونے کی بنا پر بجائے خود توجہ اور دل چسپی کا موجب ہو سکتا تھا لیکن اتحاد و اتفاق کے اندر ہمیشہ سے جو قوت مضمر ہے اس کا ہر موافق و مخالف پر اثر پڑنا بھی ناگزیر تھا اور اس موقع پر جس اتحاد و اتفاق کی داغ بیل ڈالی گئی وہ اپنی بعض خصوصیات میں خود مسلمانوں کے اپنے دوسرے مواقع کے

اتحاد واتفاق سے بہت کچھ مختلف بھی ہے مثلاً جیسا کہ اجتماع کے خطبوں اور قراردادوں سے واضح ہو رہا ہے اس کو اسلام اور اسلامی تعلیمات پر قائم و استوار کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لیے قوت و تاثیر کے لحاظ سے اس کا درجہ کہیں سے کہیں جا پہنچا ہے۔ اسلام ایک بہت بڑی طاقت ہے جس سے دوسرے لوگ بھی بخوبی واقف ہیں اور اسلام کی بدولت مسلمانوں کو رفعت و سربلندی کا جو مقام حاصل رہا ہے وہ تاریخ میں پوری طرح محفوظ ہے اس لیے اس چھوٹے سے اجتماع کو ملک اور بیرونِ ملک جو اہمیت دی گئی اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے اور مسلمانوں میں اس کے ساتھ جو غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اس میں بھی اتحاد و دعوت اتحاد اور رہنمایانِ اتحاد کی خصوصیت کا بڑا دخل ہے کیونکہ اسلام کے نام میں ان کے لیے اب بھی غیر معمولی کشش ہے اور اس سے بھی قطع نظر اس لحاظ سے بھی اس اجتماع اور اتحاد کی بڑی اہمیت ہے کہ یہ مسلمانوں کے عام اندازِ فکر میں ایک بڑی تبدیلی کا پتہ دیتا ہے تقسیم کے بعد مسلمان عام طور سے حکومت ہی پر تکیہ کیے تھے اور اپنے ہر دکھ درد کا مداوا اسی کی چوکھٹوں پر تلاش کرتے رہے ہیں اور مایوسیوں اور نامرادیوں سے بار بار دوچار ہونے کے بعد بھی اب تک اسی سے اپنی تمام تر امیدیں وابستہ کیے ہوئے رہے ہیں مگر پچھلے دنوں مشرقی ہند کے ایک وسیع علاقے میں وحشت و بربریت کا جو کھیل کھیلا گیا ہے اس نے نہ صرف ان علاقوں کے مسلمانوں کو بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، ان کو اپنا وجود تک بھی خطرے میں نظر آنے لگا ہے اور وہ اس بات کے لیے مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنے ماضی و حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں اور اس کے مطابق اپنے لیے کوئی نقشہ کار تجویز کریں چنانچہ لکھنؤ کے اجتماع کو ان کے اسی احساس کا ایک عملی ظہور سمجھنا چاہیے اور گو اس موقع پر ایک مجلس مشاورت کے قیام کے فیصلے کے علاوہ آئندہ کے لیے کوئی خاص و متعین لائحہ عمل طے نہیں کیا گیا ہے لیکن اس موقع پر جو تقریریں ہوئیں یا قراردادیں منظور کی گئی ہیں ان سے کم از کم یہ بات تو واضح ہی ہے کہ مسلمان اب تک جس روش پر گام زن تھے اس پر وہ ہرگز مطمئن نہیں ہیں اور اس کو بدل کر وہ کوئی اور روش اختیار کرنا چاہتے ہیں یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں نے اجتماعی طور پر حکومت کی غفلتوں اور کوتاہیوں کو تنقید و ملامت کا نشانہ بنایا اور اس میں ان لوگوں نے بھی کھل کر حصہ لیا جو زندگی بھر کانگریس ہی کی خدمت کرتے رہے ہیں

نیا جوش و عزم

مسلمان اس ملک میں چھ سات کروڑ کی تعداد میں آباد ہیں اور اکثریت کے مقابلے میں کچھ نہ ہونے پر بھی اپنے پاس بہت کچھ رکھتے ہیں اتنے بڑے اور ایسے گروہ کی بے اطمینانی اور آئندہ کے لیے ان کے اندیشے اور ان سے نمٹنے کے لیے ان کا عزم یا تیاریاں ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو کوئی شخص آسانی سے نظرانداز کر سکے جبکہ یہ صرف مسلمانوں کی اپنی قسمت ہی پر نہیں بلکہ ملک کے مستقبل پر بھی کسی نہ کسی نہج سے

اثرانداز ہوسکتی ہیں۔ اس لیے اجتماع اور اس کی کارروائیوں کا یہ رخ بھی ملکی پریس، حکومت اور بیرونی اخبارات کی اچھی خاصی دلچسپی اور توجہ کا موجب ہوسکتا ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے فسادات کے بعد قدرتاً ان میں باہمی اتحاد و اتفاق کی ضرورت کا شدید احساس ابھر آیا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی موجودہ مشکلات کا مقابلہ اپنی متحدہ قوت کے ساتھ ہی کرسکتے ہیں اور اس کے بغیر ہندستان میں ان کا وجود تک خطرے میں ہے اس لیے مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور مکاتب فکر کے نمائندوں کا اکٹھا ہونا ہی ان کے لیے ایک نوید جاں فزا ثابت ہوا ہے۔ ان کی مایوسیوں کے بادل چھٹنے لگے ہیں۔ اور ان میں ایک نیا جوش و عزم نمودار ہوا ہے۔ یہ اس اجتماع کی ایک اولیں لیکن بہت بڑی برکت ہے خدا کرے اس کی اور برکتیں جن کے ہم متوقع ہیں جلد ظہور میں آسکیں۔

رہے وہ مسلمان جو اس اجتماع اور اس کی کارروائیوں سے ناراض یا غیر مطمئن ہیں اور جن کو ملک و ملت کے لیے خطرات کے سوا ان میں کوئی بھلائی کا پہلو نظر نہیں آرہا ہے تو ہمارے خیال میں ان میں کچھ تو ایسے لوگ ہیں جن کی نیتوں میں غالباً کوئی فتور نہیں ہے۔ وہ نیک نیتی کے ساتھ ان کے بارے میں ایک رائے قائم کرنی چاہتے ہیں لیکن چونکہ ابھی تک آئندہ کاموں کے سلسلے میں کوئی واضح نقشہ ان کے سامنے نہیں آسکا ہے اس لیے وہ طرح طرح کے اندیشوں کا شکار ہو رہے ہیں ایسے لوگوں کو ہم ان کی تنقیدوں یا اعتراضات کے سلسلے میں ایک گونہ معذور سمجھ سکتے ہیں۔ البتہ وہ اس بات کے ضرور قصوروار ہیں کہ تنقید سے پہلے انھوں نے ضروری تحقیق کا حق ادا نہیں کیا کسی مفصل نقشہ کار کی عدم موجودگی میں بھی اجتماع کے خطبوں اور قراردادوں کو سامنے رکھ کر مجلس مشاورت کے آئندہ کاموں کے سلسلے میں ایک واضح تصور قائم کیا جاسکتا تھا اور اس تصور کے مطابق ہرگز اس کی گنجائش نہیں نکل سکتی کہ اس اجتماع یا اس کے فیصلوں کے مطابق جو کچھ کیا جارہا ہے اسے ملک و ملت کے لیے خطرہ قرار دیا جائے اور اگر بالفرض کوئی قطعی رائے قائم کرنے کے لیے آئندہ نقشہ کار کی تفصیلات کا جاننا ضروری تھا تو معقول بات یہی ہوسکتی تھی کہ توقف سے کام لیتے ہوئے اس کا انتظار کیا جاتا اور اس سے پہلے بدگمانیوں کو دل میں جگہ نہ دی جاتی اور نہ وثوق و قطعیت کے ساتھ پبلک میں ان کا اظہار کیا جاتا۔ بہرحال تنقید کرنے والوں میں کچھ تو ایسے معذور لوگ ہیں لیکن ان کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کے بارے میں بظاہر کسی حسن ظن کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ان کے گزشتہ اور موجودہ کارناموں سے قطع نظر ان کی تنقیدوں کے انداز سے ہی یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ ان کا مقصد کیا ہے وہ اجتماع کی کارروائیوں کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں ان کو غلط معنی پہنا رہے ہیں اور بہت سی باتیں اپنے طور سے گھڑ کر اس طرف منسوب کر رہے ہیں اور اس طرح صاف نظر آرہا ہے کہ وہ محض بدنام کرنے کے درپے ہیں اور ان کا مقصد ملک و ملت کی ہمدردی نہیں بلکہ خود اپنے ذاتی مفادات کا تحفظ ہے

کیونکہ ان پر یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ اجتماع کی بدولت مسلمانوں میں جو شعور و احساس بیدار ہو رہا ہے اس کے ساتھ اُمنڈ یہ کسی طرح ممکن نہ ہو سکے گا کہ مسلمانوں پر چاہے قیامت ہی کیوں نہ گزر جائے لیکن وہ ان پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالنے کے بھی روادار نہ ہوں اور پھر بھی وہ مسلمانوں کے ہمدرد و خیر خواہ بنے رہیں اور بہت سے لوگ تو اس خیال سے بھی یہ سب جرأتیں کر سکتے ہیں کہ یہ بعض اونچی بارگاہوں میں عزت و تقرب حاصل کرنے کا ایک بہترین موقع ہے اسے ہاتھ سے کیوں جانے دیا جائے۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں کی باتیں کسی التفات کے لائق نہیں ہیں لیکن کچھ باتوں کا پبلک کے ذہن و دماغ پر غلط اثر پڑ سکتا ہے اور شاید کچھ غیر مسلم یا حکومتی حلقوں پر ان کا کچھ غلط اثر پڑا بھی ہے یا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ باتیں اصلاً انہیں حلقوں ہی کی ہوں اور ہمارے یہ مسلمان بھائی پس آئینہ طوطی بن کر ان کو دہرا رہے ہوں اس لیے اختصار کے ساتھ ایک دو خاص باتوں کے سلسلے میں کچھ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے بقیہ باتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان پر گفتگو کر کے ناظرین کا وقت ضائع کیا جائے۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی اجتماع اور اس کی کارروائیوں کے بارے میں ایک بات یہ کہی جارہی ہے کہ اس کے نتیجے میں ہندو مسلم منافرت یا ان کے باہمی تعلقات میں کشیدگی راہ پا سکتی ہے یا فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو اس سے نقصان پہنچ سکتا ہے ہم نے سمجھنے کی بہت کوشش کی لیکن ہم یہ سمجھ نہیں سکے کہ اس بات کی آخر بنیاد کیا ہے۔ مسلمانوں کے سلسلے میں غیر مسلم پریس کا جو عام رویہ ہے وہ ظاہر ہے چناں چہ اُس کے پیش نظر اس پر کسی کو تعجب نہیں ہو سکتا کہ کچھ اخبارات میں اس اجتماع پر مخالفانہ تبصرے بھی شائع ہوئے ہیں لیکن جن لوگوں کی اخبارات پر نظر ہے ان کا عام تاثر یہ ہے کہ اس اجتماع کے سلسلے میں ان کا عام رویہ زیادہ مخالفانہ نہیں رہا ہے اور بعض اخبارات مثلاً ہندوستان ٹائمز نے تو ایک گونہ اس کی تائید میں اداریے لکھے ہیں۔ یہ انہی کا قول ہے کہ

> "مسلمان جس صورت حال سے دوچار کر دیے گئے ہیں۔ اس میں یہ کہنا کہ انہیں اپنی شکایات کا آزادانہ اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ ایک مہمل اور لغو بات ہوگی۔ ایک حقیقی ضرورت کو دبانے سے صرف غیر صحت بخش ہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں...... مسلمانوں کے لیے یہ بات کسی وقت ممکن ہو سکتی ہے کہ وہ دوسرے فرقوں کے ساتھ مل کر اپنے احتجاج کو وسیع بنا سکیں لیکن جہاں باشندوں کا ایک گروہ اپنے وجود اور مستقبل تک کو خطرے میں محسوس کر رہا ہو وہ ملک نہایت تنگ دل و تنگ نظر شمار کیا جائے گا جو ایک ایسے محدود اجتماع پر بھی ناک بھوں چڑھائے جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔"

علاوہ ازیں اجتماع کے بعد مجلس مشاورت کے ایک وفد نے خاص فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا ہے اس دورے

میں یہ بات ہر جگہ دیکھی گئی ہے کہ وفد کے استقبال میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی کثیر تعداد میں شریک رہے ہیں، ہر جگہ ان
کی مختلف پارٹیوں کے وفود نے وفد سے ملاقاتیں کرکے اس کے مقصد کو سراہا ہے اور اجتماعات میں وہ پورے ذوق و
شوق کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں بلکہ اکثر جگہ تو یہ اجتماعات کسی مشہور رونمایاں غیر مسلم ہی کی صدارت میں منعقد ہوئے
ہیں اور اس دورے کے موقع پر ہر جگہ ہندو مسلم اتحاد کی کچھ ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی کہ بہت سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو
یہ کہتے سنا گیا کہ دور خلافت کے ہندو مسلم اتحاد کی یاد تازہ ہوگئی ہے لیکن ان باتوں کو بھی چھوڑیئے۔ اس الزام یا اندیشے
کو جانچنے کا اصل معیار خود اجتماع کی اصل کارروائیاں ہی ہوسکتی ہیں لیکن ان کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا کوئی شخص
ایمان داری کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ان میں اس الزام یا اندیشے کی کوئی گنجائش ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس اجتماع کا
اصل محرک وہ فسادات تھے جو کچھ ہی دنوں قبل مشرقی ہند کے ایک وسیع علاقے میں پیش آئے تھے اور جو اتنے شدید اور
ہولناک تھے کہ اس علاقے کے مسلمانوں کی دنیا تو ان سے زیر و زبر ہو ہی گئی تھی ان سے ہندوستان کے دوسرے
علاقوں کے مسلمانوں کا سکون و اطمینان بھی درہم برہم ہوکر رہ گیا تھا۔ ایسے وقت میں یہ کوئی عجیب بات نہ ہوتی کہ
اجتماع میں ان فسادات کی لرزہ انگیز داستانیں سنائی جائیں اور اجتماع پر صرف غم و غصہ ہی کی فضا طاری رہتی لیکن
جو لوگ اجتماع میں شریک یا اس کی کارروائیوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اجتماع میں ماضی کی بجائے مستقبل
پر نگاہیں مرکوز تھیں اور شرکا پر غم و غصہ کی جگہ سنجیدگی و متانت اور غور و فکر کی کیفیات کا غلبہ تھا۔ فسادات کا
اگر کچھ تذکرہ ہوا بھی تو اشتعال انگیزی یا مبالغہ آرائی سے بچ کر واقعات کی صحیح ترجمانی کی حد تک اور وہ بھی محض اس
لیے کہ ان کو سامنے رکھ کر آئندہ کے لیے کچھ تعمیری باتیں سوچی جاسکیں۔ استقبالیہ اور صدارت کے خطبے بھی غور و فکر کی
دعوت پر مشتمل اور فسادات وغیرہ کی تفصیلات سے خالی تھے بلکہ محترم صدر اجتماع نے تو اپنے خطبے کے شروع ہی میں یہ ارشاد
فرما دیا تھا کہ جو کچھ پیش آچکا ہے اس کو دہرانے کی بجائے میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ان کا مداوا سوچنے پر
اپنی توجہ صرف کیجیے اور یہی بات قراردادوں میں بھی مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے دہرائی گئی ہے اور نفرت و
حقارت کی بجائے انہیں عفو و صفح سے کام لینے کا مشورہ دیا گیا اور فسادات سے متعلق قرارداد میں ان غیر مسلم ہندوؤں
یا اخبارات کی تحسین و ستائش بھی کی گئی جنھوں نے مظلوموں کی تائید و حمایت کی ہے اور ان کے رویے کو امید کی روشن
کرن قرار دیا گیا جس کی کھلی ہوئی مصلحت اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں میں غیر مسلموں یا انسانی فطرت کی طرف
سے مایوسی کا جذبہ فروغ نہ پاسکے۔ پھر اجتماع کے بعد وفد کے دورے کے موقع پر بھی ارکان وفد کی تقریروں اور گفتگوؤں
کا محور یہی سب خطوط رہے ہیں تو کیا ان باتوں کے بعد یہ کہنے کی کوئی گنجائش ہوسکتی ہے کہ اجتماع اور اس کی کارروائیوں

سے ہندو مسلم تعلقات کو نقصان پہنچا ہے لیکن اس کے باوجود یہ بات کہی جارہی ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کہنے والوں کے نزدیک مسلمان کسی مصیبت کے وقت بھی اکٹھا ہو کر اس کا کوئی مداوا تلاش کرنا چاہیں تو یہ بات بھی اکثریت کی ناخوشی کا موجب ہو سکتی ہے اور ان کے خیال میں اکثریت کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمان اپنی قسمت کلیۃً اس کے حوالے کر دیں اور اپنے حال و مستقبل سے خود کوئی سروکار نہ رکھیں حالانکہ کہنے والوں کا ذہن شاید اس طرف نہیں جاتا کہ اکثریت کے بارے میں اس طرح کا تصور قائم کرنا ان کو حد درجہ خود غرض یا بے رحم ثابت کرنے کے مترادف ہے اور ساتھ ہی وہ یہ معنی بھی رکھتا ہے کہ ملک کا دستور جس نے ہندستان میں مذہبی، تہذیبی اور لسانی اقلیتوں کا وجود نہ صرف یہ کہ تسلیم کیا ہے بلکہ ان کو اپنے حقوق کے سلسلے میں ضمانت بھی دی ہے، اکثریت کی مرضی کے بغیر اس پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ ہاں اگر یہ بات اکثریت کے مخصوص طبقوں کے بارے میں کہی جائے تو اس میں صداقت ہو سکتی ہے لیکن اس صورت میں بھی کہنے والوں کے لیے معقول بات یہی ہو سکتی ہے کہ ان حلقوں کو معقولیت کی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیں نہ یہ کہ ان کے کسی نامعقول رویے کو بہانہ بنا کر مسلمانوں کو ان کے ایک ایسے حق سے محروم کر دینا چاہیں جو ان کا ایک پیدائشی حق بھی ہے اور جس کی خود دستور نے بھی ضمانت دی ہے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان جو اس ملک میں دوسری سب سے بڑی اکثریت ہیں ان کے ہی کچھ لوگ ناصح مشفق بن کر ان کو یہ سبق پڑھانا چاہتے ہیں کہ ان کی خیریت اسی میں ہے کہ اپنے کو تمام تر اکثریت کے رحم و کرم کے حوالے کر دیں اور اپنے حال و مستقبل پر غور و خوض کرنے کی جرأت ہرگز نہ کریں حالانکہ یہ سبق خودکشی کی دعوت کے مترادف ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ مسلمان کسی بھی وقت اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح کی ایک بات یہ بھی کہی جارہی ہے کہ لکھنؤ کے اجتماع سے مسلمانوں میں قومی دھارے سے الگ رہنے کا رجحان پیدا ہوا ہے یہاں بھی ہمیں اپنے اس عجز و قصور کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ آج کل قومی دھارے کا لفظ بہت کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے لیکن ہم پر واضح نہیں ہو سکا ہے کہ یہ کس چیز کا نام ہے اور مسلمان اس سے کس طرح الگ تھلگ رہ رہے ہیں لیکن اس موقع پر ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے بلکہ اس کی بجائے مختصراً اس مسئلے پر گفتگو کرنی چاہتے ہیں کہ اجتماع لکھنؤ میں جو کچھ طے کیا گیا ہے کیا اس میں قوم و ملک کے لیے واقعی کسی مضرت کا کوئی پہلو ہے۔ ایک محب وطن کے نقطۂ نظر سے یہ پہلو بہرحال اہمیت رکھتا ہے اور اس نقطۂ نظر کے تحت ہر اس چیز کا ساتھ دینا ہرگز ضروری نہیں جس کا نام قومی دھارا رکھ لیا جائے بلکہ وہ اس کی تعیین اور نوعیت پر موقوف ہے۔

اجتماع کی کارروائیوں اور قراردادوں کو پڑھ جائیے۔ فسادات کے ذیل میں مسلمانوں کو جو مشورے دیے گئے ہیں ان کے ایک پہلو کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں جو تمام تر ملکی مفاد کے مطابق ہے اس ذیل کی بقیہ باتیں ان مسلمانوں کی تکالیف سے تعلق رکھتی ہیں جن کو فسادات سے طرح طرح کے نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں اور ان کے حل کی طرف حکومت کو توجہ دلائی گئی ہے یا فسادات کے موقع پر حکومت کے کارندوں سے جو غفلتیں یا کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں ان پر اظہار افسوس کیا گیا ہے تو کیا ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی ہے جس سے قوم و ملک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو؟ ۔کیا مسلمان اس ملک کے شہری نہیں ہیں اور حکومت ان کی اپنی حکومت نہیں ہے۔ پس اگر مسلمان اپنی شکایات کی طرف حکومت کو متوجہ کر رہے ہیں تو یہ کوئی قابل شکایت بات ہے یا حکومت اور اہل ملک کو اس پر ان کی تعریف کرنی چاہیے کہ ہر طرح کے ناگفتہ بہ حالات و مصائب سے دوچار ہونے کے بعد بھی انھوں نے حکومت سے اپنی امیدیں منقطع نہیں کیں۔ رہا حکومت کے کارندوں کی کوتاہیوں اور غفلتوں کا شکوہ تو کیا ملک کو اس سے فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ ان پر پردہ پڑا رہے پھر حکومت اور لوگوں کی آنکھیں کس طرح کھلیں گی اور آئندہ اصلاح کی کس طرح امید کی جا سکے گی؟ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آخر مسلمانوں ہی کے سلسلے میں یہ شکوہ شکایت قابل شکایت کیوں بن رہی ہے جبکہ بہت سے ممتاز و مشہور نیک دل ہندوؤں نے بھی مسلمانوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ذمہ داران حکومت کی کوتاہیوں اور غفلتوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ کیا اس معاملے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں امتیاز و تفریق سے کام لینے کی کسی لحاظ سے بھی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے اور امتیاز و تفریق کا یہ معاملہ کسی زبردست نفسیاتی مرض کا پتہ نہیں دیتا ہے؟

ہماری کوتاہیاں اجتماع کی کارروائیوں میں ایک ابھری ہوئی بات یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو اپنا جمود توڑنے اور ملکی حالات و مسائل میں پوری دل چسپی لینے کا مشورہ دیا گیا ہے تو کیا واقعتہً ملک کا فائدہ اسی میں ہے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ جمود میں مبتلا رہے اور ملکی حالات و مسائل سے کوئی دل چسپی نہ لے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اس مشورے پر ناک بھوں چڑھانے کی کوئی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کو ملکی حالات و مسائل میں حصہ لینے کا مشورہ دیتے وقت مسلمانوں کو یہ بات بھی یاد دلائی گئی ہے کہ وہ اسلام کے نام لیوا اور اس امت سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں جس کا خاص مشن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور جو اپنے پاس اصلاح و تعمیر کا ایک بہترین پروگرام بھی رکھتی ہے اس لیے وہ اپنی اس حیثیت کو کسی حال میں فراموش نہ کریں۔ غیر مسلموں میں جو لوگ پوری

طرح واقف نہیں ہیں کہ اسلام کیا ہے اور ایک سچے مسلمان کی خصوصیات کیا ہیں یا اس بارے میں کسی سوءِ ظن کا شکار ہوں وہ تو یقیناً مشورے کے اس جزء سے کچھ اندیشوں کا شکار رہ سکتے ہیں اور اس کے لیے ہم ان سے زیادہ خود اپنے کو قصور وار سمجھتے ہیں کیونکہ حقیقۃً یہ ہماری ہی کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ ہم نے اپنے بھائی بندوں کو اسلام کے صحیح مفہوم سے اب تک آگاہ نہیں کیا یا اپنے طرزِ عمل سے انہیں غلط فہمیوں میں مبتلا ہونے کا موقع دیا ہے لیکن اس مشورے سے انہیں کوئی وحشت یا الجھن نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے لازمی معنی یہ نہیں ہیں کہ مسلمان ہر معاملے میں اپنا الگ اور متوازی کیمپ قائم کریں گے۔ اسلام ایک وسیع اور زمانے کے ساتھ چلنے والا مذہب ہے اور وہ اپنے ماننے والوں میں صحیح جمہوریت اور وسعت و رواداری کے حقیقی جذبات کی پرورش کرتا ہے اور ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ اگر مسلمانوں نے صدقِ دل سے اجتماع کے مشوروں پر عمل درآمد کیا تو ان شاء اللہ تھوڑے ہی عرصے بعد ہمارے برادرانِ وطن کو بھی نظر آجائے گا کہ وہ مشورے اور ان پر عمل درآمد خود ملک کے لیے کن کن پہلوؤں سے کتنا مفید ہے۔ اسلام نسل و نسب اور ذات پات وغیرہ کی تفریق کا قائل نہیں ہے۔ وہ تمام بنی نوعِ انسان کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دے کر ان کو ایک رشتۂ اخوت میں منسلک کرنا چاہتا ہے اور ان کے درمیان امتیاز و افضلیت کی بنیاد صرف تقویٰ و خداترسی کو ٹھہراتا ہے۔ وہ خداترسی اور آخرت طلبی کا جذبہ پیدا کر کے انسانوں کو صحیح معنوں میں انسان بناتا ہے قلب و نظر کو وسعت اور اخلاق کو پاکیزگی اور گہرائی عطا کرتا ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جن کا ہمارا ملک اس وقت ہر چیز سے زیادہ محتاج ہے اور یہ پہلو تو بہرحال اہلِ ملک کی نگاہ میں رہنا چاہیے کہ وہ مسلمان جو برائے نام ہی مسلمان نہ ہوں بلکہ اسلام کو اپنی عملی زندگی میں اپنا لیں ملک کے لیے ایسے نام نہاد مسلمانوں سے بہرصورت بہتر ثابت ہوں گے جو برادرانِ وطن کو خوش کرنے کے لیے ہر الٹی سیدھی بات کہنے کے لیے ہر آن آمادہ رہتے ہیں۔ اول الذکر کبھی دھوکہ اور فریب سے کام نہیں لے سکتے اور مؤخر الذکر کے لیے سب کچھ آسان ہے۔

مجلسِ مشاورت کی تشکیل ان امور کے بعد اجتماع کی کارروائیوں میں سب سے اہم کارروائی مجلسِ مشاورت کا قیام ہے جس سے قومی دھارے کے نام لیواؤں کو شاید خاص طور سے فکر و تشویش لاحق ہو سکتی ہے لیکن اجتماع کی کارروائیوں پر جو بحث گزر چکی ہے اس کو سامنے رکھ کر اس مجلس کے بارے میں بھی کوئی رائے بآسانی قائم کی جاسکتی ہے کیونکہ اس کے قیام کی اول غرض انہی قراردادوں کو زیرِ عمل لانا ہے جو اجتماع میں پاس کی گئی ہیں اور اس کا دوسرا مقصد فوری مسائل پر غور و خوض کر کے ان کے سلسلے میں مناسب تدابیر اختیار کرنا ہے جو ایک محدود نوعیت کا کام ہے اور ظاہر ہے وہ کام اسی روح و جذبہ کی پابندی کے ساتھ انجام

دیا جائے گا جس کا اظہار اجتماع کے خطبوں اور قراردادوں سے ہو رہا ہے چنانچہ مجلس نے اپنے کام کی ابتدا جس انداز سے کی ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔ وفد کے پہلے دورے کی روداد اخبارات میں شائع ہو چکی ہے جس کا حوالہ ہم بھی اوپر دے چکے ہیں اس لیے اس مجلس کا قیام کسی کے لیے خواہ مخواہ کسی تشویش و اضطراب کا موجب نہیں ہونا چاہیے لیکن اگر یہ تشویش و اضطراب ہی کسی کے لیے موجب تسکین ہو سکتا ہے تو ظاہر ہے اس کا ازالہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے لیکن ایسے حضرات کو یہ بات اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مسلمان ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے اپنی تمام تر ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے تیار ہیں البتہ وہ اس کے لیے کسی قیمت پر آمادہ نہیں ہو سکتے کہ وہ اپنے مخصوص امتیازات وخصوصیات کو چھوڑ کر اپنی ہستی کو اکثریت میں ضم کر دیں ان کو اپنا دین ہر حال میں عزیز ہے اور وہ ہندستان میں مسلمان ہی بن کر زندہ رہنا اور مرنا چاہتے ہیں اور اگر اس کا نام قومی دھارے سے علیحدہ رہنا ہے تو انھیں یہ طعنہ بھی منظور ہے لیکن دینے والوں کو یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ ایسا بے محل طعنہ جمہوریت کی روح وشان کے منافی اور ایک ایسی جارحانہ قوم پرستانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہے جو کسی بھی ملک میں اس کے لیے مفید ثابت نہیں ہوا ہے

ان ضمنی باتوں سے فارغ ہو کر اب پھر اصل موضوع کی طرف آئیے ۔ میں نے عرض کیا تھا کہ لکھنؤ کے اجتماع کو ملک کے اندر یا بیرون ملک جو وزن اور اہمیت بھی حاصل ہوئی ہے اس میں دو باتوں کا خاص دخل ہے ۔ اول اس اتحاد واتفاق کو جس کا غیر معمولی اور غیر متوقع مظاہرہ اس موقع پر ہوا اور دوسرے مسلمانوں کے عمومی انداز فکر میں ایک خاص تبدیلی یا اس کے رجحان کو جو اجتماع کی کارروائیوں سے نمایاں ہو رہا تھا یعنی یہ کہ مسلمان اپنی موجودہ روش کو چھوڑ کر اپنا مستقبل کچھ نئے انداز سے سنوارنا چاہتے ہیں جس میں اسلام اور اسلامی تعلیمات بطور اساس ان کے سامنے ہوں گی

ابھی اصل کام باقی ہے

لیکن یہاں میں اپنا یہ احساس بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے خیال میں یہ اتحاد واتفاق اور انداز فکر کی یہ تبدیلی یا اس کا رجحان ابھی کسی ٹھوس بنیاد پر قائم نہیں ہو سکے ہیں اور ان کو پائیدار و مستحکم بنانے کے لیے ابھی ہمیں بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے ۔

اتحاد واتفاق کے پہلو سے لکھنؤ کے اجتماع کی کامیابی کو میں بھی ایک بڑی کامیابی سمجھتا ہوں ۔ یہ واقعہ ہے کہ بہ حالات موجودہ ہم اس سے زیادہ کی توکیا اس کی بھی توقع نہیں کر سکتے تھے اور یہ محض اللہ کا فضل ہے کہ گو وہ اجتماع ایک محدود و مختصر پیمانے ہی پر منعقد ہوا لیکن اس کو مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی حاصل

ہوئی اور عام مسلمانوں نے بھی اس کو اپنا نمائندہ اجتماع ہی سمجھا۔ یہاں تک کہ اس کے بعد مسلمانوں کے کسی اور بڑے اجتماع کی جس کا خیال بہتوں کے دلوں میں تھا اب سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھی جا رہی ہے۔ اسی طرح اجتماع کے بعد وفد کے دورے کے موقع پر مسلمانوں نے اپنے جس جوش و خروش اور اپنے باہمی اتحاد و یک جہتی کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ میرے لیے بھی کچھ پہلوؤں سے خاصا اطمینان بخش ثابت ہوا ہے اور اس سے مستقبل کے بارے میں میں نے بہت کچھ امیدیں قائم کی ہیں لیکن غالباً یہ کوئی پسندیدہ بات نہ ہوگی کہ ہم اپنی خواہشات کو واقعات کا جامہ پہنانے لگیں یا اپنی نگاہوں کو صرف ظاہر اور سطح تک محدود رکھیں اور اندر اتر کر حقیقت حال کا جائزہ نہ لیں۔ اس کا تو لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم خواہ مخواہ کچھ خوش گمانیوں میں مبتلا ہو کر اس موقع پر جو کچھ کرنا ہے اس سے بھی غافل ہو جائیں گے۔ بہرحال میں صاف طور سے عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اجتماع کے موقع پر یا اس کے بعد دورے کے وقت مسلمانوں کے جس اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ ہوا ہے وہ میرے اپنے خیال کے مطابق بہت سے پہلوؤں سے انتہائی خوش آیند ہونے کے باوجود پوری طرح اطمینان بخش نہیں ہے جس کے کچھ وجوہ مختصراً یہ ہیں:۔

بے اطمینانی کے وجوہ

۱۔ اس اجتماع کے انعقاد میں مختلف محرکات کو دخل ہو سکتا ہے لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ اس کا اصل محرک وہ فسادات ہی تھے جو اس سے تھوڑے عرصہ پہلے مشرقی ہند کے ایک وسیع علاقے میں پیش آچکے تھے اور جس نے اپنی ہولناکیوں کی بدولت تمام مسلمانان ہند میں خوف اور اضطراب و تشویش کی ایک لہر دوڑا دی تھی چنانچہ اجتماع کا خاص اور اہم ریزولیشن ان فسادات ہی سے متعلق ہے اور حکومت کے ذمہ داروں سے ملنے، ان کو میمورنڈم پیش کرنے بلکہ دوروں تک کے فیصلے میں فسادات اور ان کے متعلقات ہی بطور خاص پیش نظر رہے ہیں اور اسی بنا پر مجلس کی طرف سے جو میمورنڈم پیش کیا گیا ہے اس کا تمام تر تعلق فسادات اور ان کی تدابیر ہی سے ہے اور دوروں کے لیے سب سے پہلے فساد زدہ علاقوں ہی کو ترجیح دی گئی ہے۔ بنابریں اجتماع میں اتحاد و یک جہتی کا جو مظاہرہ ہوا ہے اس کو بہت گہرے معنی پہنانا غالباً کوئی حقیقت پسندانہ کام نہ ہوگا۔ مصیبت اور خوف کا تو خاصہ ہی یہ ہے کہ اس میں لوگ اپنے باہمی اختلافات تھوڑی دیر کے لیے بھول جایا کرتے ہیں۔ اور ان میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و ہمدردی کا جذبہ ابھر آیا کرتا ہے بلکہ جو لوگ ان میں گرفتار نہ ہوں۔ وہ بھی اپنے جذبۂ ہمدردی سے مجبور ہو کر یا اظہار ہمدردی کے طور پر ان کا ساتھ دینے لگتے ہیں لیکن یہ باتیں وقتی ہی ہوتی ہیں اور مصیبت یا اس کے احساس کے ختم یا کم ہوتے ہی ختم یا کم ہو جاتی ہیں اور کون

کہہ سکتا ہے کہ خدانخواستہ مشرقی ہندہی کے درجہ و پیمانہ کے فسادات ہندستان میں ہمیشہ ہوتے ہی رہیں گے ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اجتماع لکھنؤ کے اتحاد و یک جہتی کو بعینہٖ اس پر قیاس کیا جائے کیونکہ اس میں بعض او ر باتوں کو بھی دخل رہا ہے۔ لیکن فسادات کے پس منظر میں اس کے انعقاد کی وجہ سے ان کا جو قدرتی اثر اس اجتماع کے ماحول اور کارروائیوں پر مرتب ہو سکتا تھا اسے بہرحال ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے اور یہی بات فساد زدہ علاقوں کے مظاہرہ اتحاد و یک جہتی کے سلسلے میں بھی پیش نظر رہنی چاہیے ۔

۲۔اس اجتماع میں اگرچہ مسلمانوں کی تمام مشہور اور بڑی جماعتوں اور ان کے نمایاں مکاتب فکر کے نمائندے شریک ہوئے تھے اور ان کی شرکت کے بعد عام مسلمانوں نے اس کو اپنا نمائندہ اجتماع ہی سمجھا ہے اور اس پر پوری طرح مطمئن معلوم ہو رہے ہیں اور اعتراض و شکایات کا کلیۃً خاتمہ تو شاید ممکن بھی نہیں ہے لیکن بعض مکاتب فکر اور حلقہ ہائے اثر کی نمائندگی چاہے جس وجہ سے بھی ہو اس اجتماع میں نہیں ہو سکی تھی ۔ اور ان کی طرف سے بعد میں شکایات بھی سننے میں آئی ہیں اور اجتماع اور اس کی کارروائیوں سے ان کی طرف سے علانیہ بے اطمینانی یا اختلاف کا اظہار بھی کیا گیا ہے جس کو عام مسلمانوں کی تائید و قبول عام کے بعد بہت زیادہ اہمیت دینے کی تو ضرورت نہیں ہے اور مسلمانوں میں ان کو کوئی خاص مقام بھی حاصل نہیں ہے اور ان میں سے بعض حلقے تو ایسے ہیں کہ ہم ان سے مخالفت کے علاوہ اور کسی چیز کی توقع کر ہی نہیں سکتے لیکن بہرحال اپنے موجودہ اتحاد کی طرف سے نا ضرورت حسن ظن و اعتماد کی بنا پر اس کا قوی اندیشہ ہے کہ یہ شکایات و مخالفتیں آئندہ رفع ہونے کی بجائے کچھ نئے بال و پر نکالیں اور پھر ان کو دور کرنے یا ان کا مقابلہ کرنے میں زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ مسلمانوں کے اندر اور ان سے باہر ایسے مفسد، شر پسند یا مفاد پرست عناصر موجود ہیں جو ان کو آلہ کار بنا کر ان سے مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کا کام بآسانی لے سکتے ہیں

۳۔مختلف جماعتوں اور مکاتب فکر کے جو نمائندے اجتماع میں شریک ہوئے تھے ان کے بارے میں حسن ظن رکھنا کہ ان کے باہمی اختلافات ختم ہو چکے ہیں یا اس سے بھی کم یہ کہ انھوں نے اپنے مابین کچھ بنیادی مشترک امور طے کر لیے ہیں اور ان کے لیے باہم متفق ہو چکے ہیں میرے نزدیک ایک خام خیالی سے زیادہ کچھ نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ اجتماع نہ اس مقصد کے لیے بلایا گیا تھا اور نہ اس طرح کے مسائل پر وہاں کوئی بات چیت ہوئی۔ اجتماع کا خاص موضوع جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں فسادات اور ان سے متعلق مسائل ہی رہے ہیں اور یہ وہ مسئلہ ہے جس کے ضمن کی اکثر باتیں ایسی ہیں کہ ان کے سلسلے میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے مابین اختلاف کی بہت کم گنجائش ہے بلکہ یہ تو وہ مسئلہ ہے کہ اس کے

مختلف پہلوؤں کے سلسلے میں غیر مسلموں کے کچھ حلقوں کا نقطۂ نظر بھی مسلمانوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہو سکتا ہے اس لیے اجتماع کے موقع پر جو اتحاد دیکھنے میں آیا ہے اس کو اس بات کی علامت قرار دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں یا ان کی مختلف جماعتوں اور مکاتب فکر کے مابین کوئی بڑا اتحاد قائم ہو گیا ہے یا ان کے اب سارے اختلافات ختم ہو چکے ہیں۔

۴۔ اس ضمن کی آخری اور اہم بات یہ ہے کہ اتحاد و اتفاق کے پہلو سے جس چیز کی اہمیت سب سے زیادہ محسوس کی جا سکتی ہے وہ ایک مستقل مجلس مشاورت کا قیام ہے اور غالباً اتحاد و اتفاق کے بارے میں بہت سے لوگوں کی خوش گمانیاں اسی پر مبنی ہیں لیکن یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ اجتماع کی قرار داد کے مطابق خود یہ مجلس نہایت محدود مقاصد کے لیے وجود میں آئی ہے یعنی

۱۔ اجتماع کی منظور کی ہوئی تجویزوں کو بروئے کار لانا اور

۲۔ پیش آنے والے فوری مسائل کے بارے میں باہمی مشوروں سے مناسب تدابیر اختیار کرنا۔

اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان متعین و محدود مقاصد کے لیے جو مجلس وجود میں آئی ہے اس کا دائرۂ کار بہر حال محدود ہی ہوگا اور اس کو کسی طرح بھی یہ وسعت نہیں دی جا سکتی کہ ملت کے جملہ مسائل اس میں شامل ہو سکیں پہلے مقصد کے لحاظ سے مجلس کو جو کچھ کرنا ہے اس کا بڑا حصہ تو گویا مکمل ہو چکا ہے۔ کیونکہ اکثر تجویزیں ایسی ہی ہیں کہ وہ پاس ہوتے ہی اپنا مقصد پورا کر چکیں۔ مثلاً اظہار تشکر، تعزیت، یا تائید و مذمت وغیرہ کی تجویزیں اور بقیہ تجاویز کے مطابق جو کچھ کرنا ہے وہ بس محدود نوعیت کے کچھ کبھی کبھی پیش آنے والے اور کچھ بہر حال مستقلاً انجام دیے جانے کے قابل ایک دو کام ہیں یعنی بوقت ضرورت ارباب حکومت یا دورے کے لیے وفود کی تشکیل اور ہندو مسلم اتحاد اور یک جہتی کے لیے سعی و جہد۔ ہاں دوسرے مقصد کے تحت اس کا دائرہ کار کچھ زیادہ وسیع ہو سکتا ہے لیکن اس کی وضاحت جن لفظوں میں کی گئی ہے۔ ان کے پیش نظر ملت سے تعلق رکھنے والے کتنے ہی مسائل جو فوری نہ سمجھے جا سکیں خود بخود اس کے دائرے سے خارج ہو جائیں گے۔

جب صورت حال یہ ہے تو اس مجلس کے قیام کو مسلمانوں کے مابین اتحاد و یک جہتی کا بہت بڑا مظہر سمجھنا یا اس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر لینا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

اتحاد کو مستحکم بنانے کی ضرورت

اوپر کی یہ بحث جس میں میں نے مسلمانوں کے موجودہ اتحاد و اتفاق کو صحیح شکل میں پیش کرنے اور اس کے رخنوں اور کمزوریوں کو واضح کرنے

کی کوشش کی ہے اس سے کچھ لوگوں کو اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور بہت سے لوگ اس کو کچھ غلط فہمی بھی پہنا سکتے ہیں لیکن میں نے جان بوجھ کر یہ بحث چھیڑی ہے کیونکہ میرا احساس یہ ہے کہ اس اتحاد و تعاون کے بارے میں اگر حد سے زیادہ خوش گمانیاں قائم کر لی گئیں تو اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوگا کہ جب حقائق سے ٹکرا کر وہ پاش پاش ہو جائیں گی تو اس کا ردِ عمل نہایت شدید ہوگا۔ اس سے قدرۃً مسلمانوں میں سخت مایوسی پیدا ہوگی اور پھر عرصۂ دراز تک شاید اتحاد و اتفاق کا نام بھی نہیں لیا جا سکے گا اور دوسرا نتیجہ یہ کہ ان خوش گمانیوں کی بنا پر نہ موجودہ اتحاد و اتفاق کے کمزور پہلوؤں کی طرف ہماری توجہ ہو سکے گی اور نہ ان کی اصلاح کے لیے کوئی تدبیر اختیار کی جا سکے گی لیکن یہ بحث نامکمل رہے گی۔ اگر اس کے ساتھ حسبِ ذیل باتیں بھی سامنے نہ رکھی جائیں۔

اوپر چار باتیں میں نے موجودہ اتحاد و اتفاق کے غیر اطمینان بخش ہونے کے وجوہ کے طور پر بیان کی ہیں ان کو پیش کرنے سے میرا مدعا بس یہ ثابت کرنا ہے کہ موجودہ اتحاد غیر اطمینان بخش ہے نہ یہ کہ میں ان کی بنا پر مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق سے مایوس ہو جانے کو جائز سمجھتا ہوں۔ اس کے برعکس میرا خیال یہ ہے کہ تھوڑی سی محنت و توجہ سے ہم ان باتوں کو وجوہِ اطمینان کی شکل میں بھی بدل سکتے ہیں مثلاً نمبر ۱ کے مطابق مسلمانوں میں اس وقت اتحاد و یک جہتی کے جو جذبات پیدا ہوئے ہیں وہ ہمارے تجربے کے مطابق اگرچہ زیادہ تر فسادات کے رہینِ منت ہیں اور اس بنا پر ان کی بنیاد کمزور اور نا پائیدار ہے لیکن ان جذبات سے یہ فائدہ بآسانی اٹھایا جا سکتا ہے کہ وہ آئندہ زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو سکیں، دلوں کا گداز، غفلتوں پر پشیمانی اور رجوع الی اللہ وغیرہ کی جو کیفیتیں فسادات کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہیں وہ خواہ معمولی ہی درجہ کی کیوں نہ ہوں، ان سے کام لے کر ان کے دلوں میں ایمان و اسلام اور ان کی محبت کو پوری طرح راسخ کیا جا سکتا ہے جو حقیقی اتحاد و اتفاق کا سرچشمہ ہیں اور عام مسلمان فسادات کے بغیر عام حالات میں بھی اسے قبول کرنے کی کافی صلاحیتیں رکھتے ہیں، یہ خواص کا قصور ہے کہ ان سے کام نہیں لے رہے ہیں یا ان کی ان صلاحیتوں کو غلط مقاصد اور فروعی مسائل میں انہیں الجھا دینے یا آپس ہی میں انہیں لڑا دینے وغیرہ جیسے کاموں کے لیے استعمال کر رہے ہیں

اسی طرح ۲ کی بیان کردہ صورتِ حال کا علاج بھی بآسانی ممکن ہے جن حلقوں کو اجتماع میں نمائندگی نہ ملنے کی شکایت ہے، اپنے قصور کا اعتراف کر کے اگر واقعۃً یہی اس کا باعث ہو یا اپنی مجبوریوں اور مفادِ ملت وغیرہ کا حوالہ دے کر ان کو مطمئن کیا جا سکتا ہے اور جن لوگوں کو اجتماع کی کارروائیوں کے کسی پہلو سے بے اطمینانی یا اختلاف ہے اور بظاہر وہ خلوص پر مبنی ہے اسے سمجھ کر اس کا ازالہ کیا جا سکتا ہے اور شاید بے اطمینانی یا اختلاف کو رفع کرنے کا سب سے مؤثر اور کارآمد ذریعہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف ان کاموں کی ٹھیک ٹھیک وضاحت کر دی جائے جو مجلس انجام دینا

چاہتی ہے اور دوسری طرف ان کو ڈھنگ سے انجام دینے کی کوشش بھی کی جائے اِن شاء اللہ تھوڑے ہی عرصہ بعد کسی مخلص مسلمان کے لیے شکایت یا اختلاف کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہ جائے گی۔ رہے وہ مسلمان جن کو بہر حال میں اختلاف ہی کرنا ہے تو امت میں صحیح شعور و احساس بیدار ہو جانے کے بعد اِن شاء اللہ ان کا چراغ نہ جل سکے گا۔ وہ یا تو خود راہِ راست پر آ جائیں گے یا امت سے مایوس اور منقطع ہو کر اپنی دنیا کہیں اور بسانے کی فکر کریں گے اور بیرونی عناصر بھی ہماری موجودہ حالت ہی میں ہم سے کچھ فائدہ اٹھا لینے کی توقع کر سکتے ہیں۔ حالت درست ہو جانے کے بعد وہ اس کا حوصلہ نہ کر سکیں گے لیکن ظاہر ہے یہ سب کچھ سخت جد و جہد اور ایک طویل عرصہ کے بعد ہی ممکن ہو سکے گا۔

۳ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک تلخ حقیقت کا اظہار ہے جو اس لیے گوارا کیا گیا ہے کہ لوگ خواہ مخواہ اتحاد و اتفاق کو کوئی آسان کام نہ سمجھ لیں یا کسی غیر حقیقی خوش گمانی میں مبتلا نہ ہو جائیں لیکن اس حقیقت کے اظہار سے نہ میرا مدعا ہے اور نہ میں اس کی کوئی وجہ سمجھتا ہوں کہ لوگ اس کام کو ناممکن سمجھ بیٹھیں۔ اجتماع خواہ خاص طور سے مسلمانوں کی مختلف جماعتوں یا مکاتب فکر کے اختلافات رفع کرنے کے لیے نہ بلایا گیا ہو یا یہ مسئلہ وہاں زیر بحث نہ آیا ہو لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت عام مسلمانوں کے دل کی آواز یہی ہے کہ جس طرح بھی ہو یہ اختلافات رفع ہونے چاہییں اور اجتماع کے موقع پر بھی عام شرکاء کے دلوں میں اس کی خواہش موجزن رہی ہے جس کا اظہار ان کی زبانوں سے کسی نہ کسی طور پر ہوتا رہا ہے۔ اور خواص کی طرف سے بھی کم از کم اس جذبے کا تو ہر طرح اظہار ہی ہو رہا تھا کہ اپنے باہمی اختلافات کو آئندہ ہوا دینی نہیں ہے اور ان اختلافات کے باوجود انھیں مشترک امور میں مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ان کے اتفاق ہی سے اظہار تشکر کی قرارداد منظور ہوئی ہے جس میں اندرونی انتشار کے سدباب، اپنے باہمی اختلافات کو مٹانے اور اتحاد ملت کے لیے پیہم سعی کرتے رہنے کی بھی خاص طور سے اپیل کی گئی ہے اور اجتماع کے موقع پر ان کی طرف سے عملاً بھی اتحاد و یک جہتی کا اچھا خاصا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے آئندہ کے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں اس مقصد کے لیے مسلسل جد و جہد، احتیاط، ایثار اور ہر طرح کے شخصی اور گروہی جذبات و مفادات وغیرہ کی قربانی ضروری ہے۔

اتحاد کو الفاظ سے نہیں روکا جا سکتا

اب جہاں تک آخری دفعہ کا تعلق ہے اس میں جو بات کہی گئی ہے اس کی حیثیت متعلقہ قرارداد کی ایک حقیقت پسندانہ تعبیر کی ہے لیکن میرے

نزدیک اگر واقعی مختلف جماعتوں اور مکاتب فکر کے نمائندوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کا جذبہ پیدا ہو جائے تو تعین
دائرے سے باہر کام کرنے کے لیے متعلقہ دفعہ کے الفاظ کوئی روک نہیں بن سکیں گے۔ اصل چیز جذبہ ہی ہے نہ کہ
قرارداد کے الفاظ و تعبیرات اور تعین دائرے سے باہر کام کرنے کا جذبہ اور آمادگی پیدا ہو جائے تو الفاظ کی رکاوٹ
آسانی دور بھی کی جا سکتی ہے لیکن میں یہاں اپنے اس احساس کا اظہار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض حضرات
نے ابھی سے جو یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ مجلس مشاورت کے قیام کے بعد اب مختلف جماعتوں کے وجود کی کوئی ضرورت
باقی نہیں رہ گئی اور اب انہیں اپنا وجود ختم کر دینا چاہیے وہ اپنی اس طرح کی باتوں سے غالباً غیر شعوری طور پر
ہی مفادِ ملت اور خود اتحادِ ملت کے مقصد کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ کون مسلمان ہے جو ملت کو بمنزلہ ایک جسدِ واحد
یا بنیان مرصوص کے دیکھنے کی تمنا و آرزو نہ رکھتا ہو مگر خواہش و تمنا ایک علیحدہ چیز ہے اور واقعات و حقائق علیحدہ
اور ضروری نہیں کہ دونوں میں مطابقت ہی ہو۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجلس مشاورت ایک محدود و متعین مقصد کے
لیے وجود میں آئی ہے اور جن مقاصد کے لیے مسلمانوں میں مختلف جماعتیں کام کر رہی ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ
وسیع مقاصد ہیں بلکہ ان میں ایسی جماعتیں بھی ہیں جن کا تنہا اپنا دائرہ اس دائرے سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور یہ
بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ اجتماع کے وقت اور اس کے بعد یا وفد کے دورے کے موقع پر مسلمانوں نے اپنے
جس جوش و جذبہ یا اتحاد و یک جہتی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ابھی کسی بڑی اور مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہے اس لیے
اس کے حوالے یا مجلس مشاورت کے نام پر جس کے وجود میں آئے ہوئے ابھی دو ڈھائی ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے
ہیں پہلے سے قائم جماعتوں کو توڑنے کا مشورہ دینا کوئی عقلمندی یا دوراندیشی کی بات نہیں ہو سکتی۔ اس سے جو انتشار
اور ملت کے مختلف کاموں کے سلسلے میں جو خلا پیدا ہو گا اس کا اندازہ کر لینا کچھ دشوار نہیں ہے۔

نامناسب نہ ہوگا کہ میں یہاں اس بات کا بھی حوالہ دے دوں کہ غالباً انہی سب وجوہ کی بنا پر خود اجتماع
لکھنؤ کے موقع پر بھی کسی نے بھی موجودہ جماعتوں کو توڑنے کا کوئی سوال نہیں اٹھایا تھا بلکہ اس ضمن میں اگر کوئی بات
آئی بھی تھی تو یہ کہ ان کا اپنا اپنا علیحدہ وجود برقرار رہے گا البتہ کوشش یہ ہوگی کہ مشترکہ مسائل میں وہ ایک دوسرے
کا ساتھ دے سکیں۔ ہمارے خیال میں بحالات موجودہ اسے بھی بسا غنیمت سمجھنا چاہیے اس معاملے میں عجلت اور
بے صبری کا مظاہرہ سراسر نقصان ہی کا باعث ہوگا۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کسی نہ کسی جماعت سے وابستہ اور
اس سے گہرا جذباتی لگاؤ رکھتی ہے اور ان کی اپنی تاریخ و روایات بھی ہیں اس لیے ان کا تعلق منقطع کر دینا
کوئی آسان بات بھی نہیں ہے اور شاید ہی کسی کو اس سے انکار ہو سکے کہ اجتماع کی کامیابی اور مسلمانوں کے اندر

جوش و خروش پیدا کرنے میں بڑا دخل اس بات کو رہا ہے کہ مسلمانوں کی تمام قابل ذکر جماعتیں اس کی پشت پر تھیں۔
خدانخواستہ ایسا نہ ہوتا تو بڑے سے بڑے افرادی انفرادی کوششیں مل کر بھی اس درجہ نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی تھیں

نصب العین سے عشق پیدا کیجیے

اصل یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں جس اونچے درجے کا اتحاد اور یکجہتی دیکھنے کے خواہشمند ہیں وہ چشم زدن میں پیدا ہو جانے والی کوئی چیز نہیں ہے اور نہ محض اپیلوں اور کچھ وقتی مسائل کھڑے کر دینے سے وہ پیدا ہو سکتی ہے اس کو پیدا کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ان کے اندر کسی نصب العین سے گہرا عشق و محبت پیدا کیا جائے اور یہ نصب العین صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے اور یہ کام جتنا مشکل ہے ظاہر ہی ہے اس کا کچھ اندازہ اس بات ہی سے لگایا جا سکتا ہے کہ غیر اسلامی افکار و نظریات سے ان کی وابستگی یا دنیاوی مفادات سے ان کے عشق کا سوال تو الگ رہا آج ان میں اسلام ہی کے کتنے ایڈیشن رائج ہیں اور ان کے ساتھ ان کے تعلق و محبت کا کیا عالم ہے۔ پس اصل ضرورت ان کو صحیح اسلام اور اس کے صحیح تقاضوں سے واقف کرانا اور ان کے اندر ان کی صحیح محبت اور ان کے اتباع کا صحیح جذبہ پیدا کرنا ہے جس میں دوسروں تک اس کی تبلیغ بھی خود بخود داخل ہے لیکن چونکہ یہ کام ایک طویل عرصے کا طالب ہے اور اس کام کے معتدبہ حد تک انجام پانے سے پہلے مختلف جماعتوں کا وجود ناگزیر ہے اور ایک حد تک اس درمیانی وقفہ میں ایسی جماعتیں ضروری بھی ہیں جو اپنے اپنے طور پر اس کام میں حصہ لے رہی ہوں اس لیے کام کے ساتھ ہی مسلمانوں میں یہ ذہن بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اختلافات کو کم کرنے یا ان کو حدود کے اندر رکھنے کے ساتھ ساتھ حتی الوسع ان کو برداشت کرنے کی بھی کوشش کریں کہ اختلافات ہمیشہ محض نفسانیت وغیرہ ہی کا نتیجہ نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ نیک نیتی پر بھی مبنی ہو سکتے ہیں اور ان کا پیدا ہونا ایک فطری بات بھی ہے جس سے صالح سے صالح معاشرہ بھی خالی نہیں ہو سکتا البتہ ان کو اس بات کی طرف سے ضرور ہوشیار اور چوکنا رکھنے کی ضرورت ہے کہ کوئی شخص یا گروہ محض ضد یا کسی ذاتی یا گروہی فائدے کے لیے اپنی حرکتوں سے خواہ مخواہ امت میں انتشار اور پھوٹ پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اس کا یقیناً پوری قوت سے مقابلہ کرنا چاہیے کیونکہ کسی بھی فرد یا گروہ کے مقابلہ میں پوری امت کا مفاد ہر حال میں مقدم ہے۔

پائداری کا اصل راز

اب میں اختصار کے ساتھ اجتماع کی اہمیت کے دوسرے سبب کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں

میرے نزدیک یہ دوسرا سبب یعنی مسلمانوں میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کو اپنانے کا رجحان پیدا ہونا بھی وزن اور اہمیت پیدا کرنے کے لحاظ سے خواہ دوسرے ہی درجے پر کیوں نہ ہو لیکن ان دونوں کا اپنے اپنے

درے جو مقام و اہمیت حاصل ہے اس کے لحاظ سے وہ درجہ میں مقدم ہے کیونکہ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا
ان مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کا اصل سرچشمہ اسلام ہی ہے۔ اس بنا پر میرے نزدیک اس کی طرف پہلے سے
ہیں زیادہ توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس کے سلسلے میں بھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ رجحان ابھی
البتہ کسی ٹھوس بنیاد پر قائم نہیں ہے وہ زیادہ تر خارجی دباؤ و احساس عجز و مایوسی اور اپنی قدیم روش کے تلخ تجربا
ور ناکامیوں وغیرہ کے نتیجے کے طور پر ابھرا ہے نہ کہ کسی اندرونی محرک کی وجہ سے حالانکہ اس کی پائیداری کا دارومدا
اندرونی تحریک پر ہے۔ بہرحال وہ جیسا کچھ بھی ہے اسے غنیمت ہی سمجھنا چاہیے۔ البتہ اس کی ضرورت ہے کہ ان
کے اس رجحان کو صحیح راہ پر لگایا جائے اور صحیح بنیادوں پر اسے ان کے قلب میں راسخ کرنے کی کوشش کی جائے
ور اسے اتنا مضبوط بنا دیا جائے کہ فسادات وغیرہ کے بعد امن و سکون کے حالات میں بھی وہ اس پر قائم رہ سکیں
خطرات و مشکلات ان کے اندر تزلزل پیدا کر سکیں اور نہ اس عہد کی نت نئی غیر اسلامی تحریکات یا اس کے مرعوبا
بلند آہنگ انہیں اس سے برگشتہ کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے جو باتیں ضروری ہیں ان پر تفصیلی گفتگو تو کسی اور موقع
پر کی جاسکے گی۔ البتہ حسب ذیل باتوں کی طرف میں متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۔ ہمارے اجتماع کے خطبوں اور قراردادوں میں مسلمانوں کے نصب العین، ان کے منصب و مقام اور ذمہ داریوں کی یاددہانی تو ضرور کی گئی ہے لیکن چونکہ اصل مرکز توجہ فسادات اور ان سے متعلق مسائل ہی رہے ہیں اس لیے اجتماع میں ان کی تفصیل و وضاحت کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دی جاسکی۔ اب اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی ضرورت خاص طور سے اس لیے بھی ہے کہ اب تک مسلمان بالعموم اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں کچھ دوسرے ہی انداز سے سوچنے کے عادی رہے ہیں اس لیے اس نئی راہ پر چلنے کے لیے انہیں اس کے نشانات منزل، مراحل سفر اور ضروری زاد راہ وغیرہ کے بارے میں واضح معلومات کی تقریباً زیادہ ضرورت ہوگی۔

۲۔ اس مرحلے میں جبکہ اجتماعی طور سے ان میں اسلام کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کا جذبہ نیا نیا ابھر رہا ہے ان کے بارے میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے کہ ان کا ذہن غلط [illegible] کی آماجگاہ نہ بننے پائے۔ اسی غرض [illegible] باتوں سے احتراز کرنے کی ضرورت ہے جن سے ان کے ذہن میں اس [illegible] بھی پیدا ہو سکے کہ اس راہ پر چلنے کے سوا بھی ان کی فلاح و بہبود کا کوئی راستہ ہو سکتا ہے۔

[illegible] اسلام کے کسی جامع اور محدود تصور [illegible]
(باقی صفحہ [illegible] پر ملاحظہ ہو)

اسلامی معاشرے کی چند اقدار

مولانا ابوبکر اصلاحی

(۱) عن ابی ذر قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال أتدرون ای الاعمال احب الی اللہ تعالی قال قائل الصلوٰۃ و الزکوٰۃ وقال قائل الجہاد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان احب الاعمال الی اللہ تعالی الحب فی اللہ والبغض فی اللہ (احمد، ابوداؤد)

حضرت ابوذرؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالی کے نزدیک کون سا عمل زیادہ پسندیدہ ہے؟ ایک شخص نے کہا "نماز اور زکوٰۃ" اور ایک دوسرے شخص نے کہا "جہاد" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ ہی کے لیے محبت اور اللہ ہی کے لیے نفرت، اللہ تعالی کے نزدیک بہترین عمل ہے۔

- انسان کے حرکت و عمل کا کوئی محرک ہوا کرتا ہے ایسے بھی انسان پائے جاتے ہیں جن کے حرکت و عمل پسند و ناپسند اور ترک و اختیار کا محرک صرف یہی ہوتا ہے کہ انھیں دنیا میں آرام سے زندگی گذارنے جانا ہے اور ایسے بھی انسان پائے جاتے ہیں جو اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں لیکن ان کی محدود نظر قوم وطن اور اپنے خود ساختہ نظریات ہی پر جا کر رک جاتی ہے اور یہی چیزیں ان کی ہر سعی و عمل میں محرک کا کام دیتی ہیں مسلم اس لیے مسلم نہیں کہ اس کا تعلق کسی خاص قوم و وطن سے ہے یا اس نے کچھ انسانی نظریات کو اپنا لیا ہے بلکہ اس کا نام اس لیے مسلم رکھا گیا کہ اس نے اللہ تعالی ہی کو اپنا رب اور آقا تسلیم کیا ہے اور اسی کی فرمانبرداری کا عہد کیا ہے لہٰذا اس کی ہر حرکت و عمل کا محرک اللہ تعالی کی ذات ہوگی وہ کسی سے دوستی کرے گا تو اللہ کے لیے اور دشمنی کرے گا تو اللہ کے لیے کسی کو پسند کرے گا تو اس لیے کہ وہ اللہ کو محبوب ہے اور کسی سے نفرت

کرے گا تو اس لیے کہ وہ اللہ کو مبغوض ہے وہ کسی چیز کو اختیار کرے گا تو اس لیے کہ اس کے اختیار کرنے میں اللہ کی رضا ہے اور کسی چیز کو ترک کرے گا تو اس لیے کہ اس کے ترک نہ کرنے میں اللہ کا غضب ہے۔ مومن کے ہر ترک و اختیار کا محرک اللہ تعالیٰ کی ذات ہوگی، خواہ وہ ذاتی و خاندانی اصلاح کی کوششوں میں لگا ہو یا سماجی و معاشرتی سدھار میں منہمک، وہ قوم و وطن کے فائدے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہو یا بنے بنائے نظام کی جگہ صالح نظام برپا کرنے کی جدوجہد، غرضیکہ اس کی نظر اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے بتائے ہوئے معیار خیر و شر سے ہرگز نہ ہٹے گی۔

(۲) عن عبد الله بن مغفلٍ رضی الله عنہ قال رجل للنبی صلی الله علیہ وسلم یا رسول الله اِنّی لَاُحِبُّکَ فقال انظر ماذا تقول قال والله انی لاحبک ثلاث مرات فقال ان کُنْتَ تُحِبُّنِی فاعِدَّ للفقر تجفافا فان الفقر اسرع الی من یحبنی من السیل الی منتہاہ (ترمذی)

عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اے اللہ کے رسول! میں آپ سے محبت کرتا ہوں تو آپ نے فرمایا سوچ لو کیا کہہ رہے ہو؟ اس نے کہا خدا شاہد ہے کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور یہ بات تین بار دہرائی تو آپ نے فرمایا اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو محتاجی کے لیے ڈھال تیار کر لو کیونکہ جو مجھ سے محبت کرتا ہے اس کی طرف فقر بہت تیز دوڑ کر آتا ہے اس سیلاب سے زیادہ تیز جو ڈھلان کی طرف رواں دواں ہو۔

رسول کا مشن یہ ہوتا ہے کہ خدا پرستانہ زندگی اختیار کی جائے، حلال و حرام اور صحیح و غلط میں امتیاز برتا جائے، اس حق کو لوگوں تک پہنچایا جائے اور لوگوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسے نافذ کیا جائے۔ تو رسول سے دعوائے محبت کا تقاضا بھی یہی ہونا چاہیے کہ اس مشن کو اپنایا جائے۔

اب جو لوگ اس مشن کو اپنائیں گے وہ ایک طرف تو حلال و حرام اور صحیح و غلط میں امتیاز کریں گے اور دوسری طرف خدا پرستانہ زندگی کو اختیار کرنے کی لوگوں کو دعوت دیں گے اور لوگوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالیں گے تو حصول معاش کا دائرہ بھی تنگ ہوگا اور اس کے لیے وقت بھی کم بچ پایا جا سکے گا

یہ بگڑے ہوئے احوال میں معاش کا مسئلہ حل ہوتا ہی اس وقت ہے جبکہ حلال و حرام کی تمیز اٹھا دی جائے اور مال کے حصول میں اپنا سارا وقت جھونک دیا جائے۔

ایسی صورت میں لازماً مومن کو غربت و مفلسی اور محتاجی و فاقہ کشی کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہی بات ہے جس کی طرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے۔ اب چونکہ مومن کے شعور میں یہ بات رچی بسی ہوتی ہے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور دنیا اور اس کا ساز و سامان محض فتنہ، اس لیے یہاں کی غربت و مفلسی اور شدائد و مشکلات کو بڑی سہولت سے سہار لے جاتا ہے۔

(۳) عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ثلث من کن فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان ان یکون اللہ و رسولہ احب الیہ مما سواھما وان یحب المرء لا یحبہ الا للہ وان یکرہ ان یعود فی الکفر بعد ان انقذہ اللہ منہ کما یکرہ ان یقذف فی النار (متفق علیہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے اندر تین باتیں ہوں وہ ان کی وجہ سے ایمان کی مٹھاس پائے گا۔ (۱) اس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول دوسروں کے مقابلہ زیادہ محبوب ہوں۔ (۲) اس کی محبت اللہ کے لیے ہو۔ (۳) کفر سے محفوظ ہو جانے کے بعد اس میں دوبارہ لوٹنے کو ناپسند کرے جیسے اسے جہنم میں جانا ناپسند ہے۔

ایمان سے لطف اندوز وہی ہوگا جو اپنے دل کو اللہ و رسول کی محبت کا نشیمن بنائے اس حد تک کہ ہر شے کی محبت پر ان کی محبت غالب آجائے اور پھر اب کوئی چیز بھی ان سے زیادہ محبوب نہ رہے، اور اللہ کے بندوں سے تعلق جوڑنے کی بنیاد بھی اللہ کی ذات ہی ہو، اللہ ہی کے لیے لوگوں سے محبت کرے، اور تعلقات استوار کرے، اور آخر دم تک اس پر قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ احساس تازہ رہے کہ حق کو چھوڑ دینے کے بعد وہ نہایت خطرناک انجام سے دوچار ہوگا۔ مومن کے اندر یہ کیفیات قائم و دائم رہیں تو وہ یقیناً اس دنیا میں ایمان سے لذت آشنا ہوگا اور آخرت میں اس کے انجام سے لطف اندوز۔

(۴) عن معاذ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخذ بیدہ وقال یا معاذ واللہ

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اے معاذ خدا شاہد ہے کہ

انی لاحبك فسما وصیك یا معاذ لا تدعن فی دبر كل صلوٰۃ تقول اللھم اعنی علی ذكرك وشكرك وحسن عبادتك (ابو داؤد ونسائی)

میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ پھر اے معاذ! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کرو کہ اے اللہ اپنی یاد اپنے شکر اور اپنی بہترین بندگی کے سلسلے میں میری مدد فرما! اور دیکھو اسے ہرگز نہ چھوڑنا۔

اللہ و رسول سے محبت کرنے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی محبت کرنے لگتے ہیں جس پر "واللہ انی لاحبك" کے الفاظ شاہد ہیں۔ اس کے نتیجے میں یہ ہونا ہی چاہیے کہ مومن کا دل محبوب کی یاد اور جذبۂ احسان مندی سے بھرا ہوا ہو اور وہ اس بات کا حریص ہو کہ اپنی عملی زندگی اپنے محبوب و محسن کی اطاعت و وفاداری میں بسر کرے۔

(۵) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المرء علی دین خلیلہ فلینظر من یخالل (احمد، ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے تو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے۔

انسان کا جو نقطۂ نظر ہوتا ہے اور اس کی جو پسند ہوتی ہے اسی طرح کے لوگوں کو وہ پسند کرتا اور اپنی دوستی کے لیے ایسے ہی انسانوں کا انتخاب کرتا ہے، تو یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کسی کا نقطۂ نظر اور اس کی پسند و ناپسند کیا ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ اس کے دوست کون سے لوگ ہیں، اور اس نے اپنی رفاقت کے لیے کن لوگوں کا انتخاب کیا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ مومن اپنی دوستی و رفاقت کے لیے مومن صالح ہی کو منتخب کرے گا۔

(۶) عن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول قال اللہ تعالیٰ وجبت محبتی للمتحابین فی والمتجالسین فی والمتباذلین فی (مالک)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ میرے لیے باہم دوستی کرتے ہیں میرے ہی لیے باہم مل بیٹھتے ہیں اور میرے ہی لیے باہم لین دین کرتے ہیں ان کی میری محبت واجب ہوگی۔

جو لوگ اللہ کی رضا کے واسطے تعلقات جوڑتے ہیں ان کے بیچ تعلق یہ ہوتا ہے کہ ان [illegible]

جاگیا جائے اور مضبوط جتا بن کر خدا کے کلمے کو بلند کیا جائے" ایسے لوگوں سے اللہ کو محبت کرنی چاہیے چنانچہ اسی بات کی خوش خبری مالک اپنے حبیب پاک ؐ کی زبان سے سنا رہا ہے۔ سو وہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں جو اپنے لیے اس طریقے کا انتخاب کریں۔ آج دنیا پر ایسے ہی لوگوں کی تلاش ہے اور ایسوں ہی کے ذریعہ دنیا کو امن و اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔

(۷) عن اسماءَ بنتِ یزیدَ انها سَمِعَتْ رسولَ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم یقول اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بخیارکُمْ قالُوا بلٰی یا رسول اللّٰہ قال خیارُکم الذین اذا رُءُوا ذُکِرَ اللّٰہُ۔ (ابن ماجہ)	حضرت اسماء بنت یزید فرماتی ہیں کہ میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کیا میں تمہیں تم میں سب سے بہتر کی خبر دوں؟ صحابہ نے کہا ہاں ضرور بتائیں اے اللہ کے رسول۔ تو آپ نے فرمایا۔ تم میں بہتر وہ ہیں جنہیں دیکھ کر خدا یاد آئے۔

جنہیں اللہ سے محبت ہوتی ہے ان کی پوری کوشش ہوگی کہ اللہ ان سے خوش ہو، وہ ہر اس کام کو کریں گے جس سے اللہ خوش ہوتا ہے، ایسے تمام کاموں سے بچیں گے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہوں، وہ اپنے اخلاق کردار، معاملات، ظاہر و باطن سب کچھ اللہ کی مرضی کے مطابق ڈھالیں گے اور پھر یقیناً ایسے لوگوں کو دیکھ کر خدا یاد آئے گا۔ خدا ہم سب کو ایسا ہی بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

تذکیر القرآن

(مولانا جلیل احسن ندوی، جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ)

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ ۝

(بقرہ ۲ ر ۳۱)

اے مخاطب کیا تم نے ان لوگوں کو عبرت کی نظر سے نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود موت کے ڈر سے اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے؟ (جب انھوں نے ایسا کیا تو اللہ نے ان سے کہہ دیا جاؤ مر جاؤ۔ پھر (کچھ عرصہ کے بعد) انھیں زندگی بخشی۔ بلاشبہ اللہ لوگوں پر فضل فرمانے والا ہے لیکن بہت سے لوگ اس منعم کے شکر گزار نہیں ہوتے۔

اوپر جو آیت درج ہوئی ہے وہ سورۂ بقرہ، دوسرا پارہ رکوع ۳۱ کی پہلی آیت ہے۔ سورہ بقرہ مدنی سورت ہے اور بدر سے پہلے نازل ہوئی ہے جب کہ مشرکین مکہ مسلح مقابلہ کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جانی اور مالی ہر طرح کی قربانیاں دینے پر ابھارا ہے اور بتایا ہے کہ ابتلاء و آزمائش کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ ہر طرح کی قربانی دینی ہوگی، مال بھی خرچ کرنا ہوگا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلنا ہوگا۔ یاد رکھو اگر اپنے ذاتی مفاد و مصالح کو ترجیح دو گے۔ اگر اپنے باغوں اور کھیتوں کو سنوارنے اور بنانے میں مصروف رہوگے اور قربانیوں سے جی چراؤ گے تو اپنی ہلاکت و بربادی کو دعوت دو گے وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ۔ اپنے کو تباہی میں نہ ڈالو، اپنے ہاتھ تباہی کے اسباب کی طرف نہ بڑھاؤ [illegible] اور اگر تم نے [illegible] اور فراخ دلی کا ثبوت دیا تو یقیناً خدا کی مدد تمہیں ملے گی [illegible]

اور غلبہ نصیب ہوگا۔

یہاں جو آیت درج ہوئی ہے اس میں بنی اسرائیل — قرآنی مسلمانوں — کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ سے عبرت حاصل کرو، جب ان کی توحیدی اسپرٹ کمزور ہوگئی، جب خدا کا دین گھر کے طاقوں اور مسجد کے محرابوں کی زینت بن گیا جب خدا کا دین ان کی زندگیوں پر حکمراں نہ رہا، جب وہ دنیا کے عشق میں گرفتار ہوئے اور آخرت اور اس کی سعادتوں اور کامرانیوں کو بھلا بیٹھے اور فانی مفاد کو دینی مفاد اور ملی مصالح پر ترجیح دیئے گئے — تب خدا کے قانون کے مطابق ان کا قومی شیرازہ بکھر گیا۔ اتحاد کی جگہ افتراق و انتشار نے لی اور اجتماعی تنظیمی قوت پارہ پارہ ہوگئی۔ اپنی آپس کی سازشوں اور آویزشوں کا شکار ہوگئے۔ نَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ یعنی جب انھوں نے خدائی تعلیمات و ہدایات کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کے درمیان عداوت و بغض کی آگ بھڑکا دی۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کی مذہبی روح سرد پڑ گئی ہو اور اخلاقی پستی میں جا گری ہو، اور سیاسی انتشار میں مبتلا ہو اس پر باہر سے حملہ ہو جائے تو وہ لازماً بھاگ کھڑی ہوگی، اس کے اندر جمنے کا بل بوتا نہ ہوگا، یہ اس لیے کہ صبر و استقامت کا سرچشمہ دین ہے، طاقت و قوت کا منبع آسمانی کتاب ہے۔ تو اس سے بے رخی کے بعد اور کہاں سے طاقت آئے گی — چنانچہ پڑوس کی ایک مشرک قوم نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا، اور حملہ ہوتے ہی اسرائیلی ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے علاقے کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ حملہ آور فلسطینی فوجوں نے بڑی تباہی مچائی۔ اسرائیلیوں کی بہت بڑی تعداد ہلاک ہوئی اور بھگوڑی ذہنیت رکھنے والے بزدل عام طور پر ہلاک ہوتے ہی ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل پر بیس سال تک یہ سیاسی ملی موت طاری رہی۔ ظاہر ہے جو لوگ اپنے لیے موت پسند کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں موت ہی دیتا ہے اور حیات انھیں بخشتا ہے جو حیات چاہتے ہیں۔ جب بنی اسرائیل نے زندگی کی شاہراہ پر چلنے سے انکار کر دیا تب اللہ نے ان پر ملی موت طاری کر دی۔ (فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوتُوا) پھر جب ان کے اندر توبہ و انابت کا جذبہ ابھرا اور اپنے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کیا اور زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہوئے۔ تب اللہ نے [illegible] قومی زندگی بخشی۔ (ثُمَّ اَحْيَاهُمْ) — بنی اسرائیل کی موت اور ملی زندگی کی یہ تاریخ پوری [illegible] بکھری ہوئی ہے اور جس کا ذکر موجودہ توراۃ کے صحیفہ سموئیل میں بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ [illegible]

ہوتا ہے کہ فلسطینیوں کے حملے سے پہلے بنی اسرائیل کی مذہبی حالت کس درجہ بگڑ گئی تھی اور دینی جذبہ سرد پڑ جانے کی وجہ سے اجتماعی سیاسی تنظیم کا ڈھانچا ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ سخت پراگندگی اور انتشار کی حالت سے دوچار تھے۔ وہ بدعات، شرک اور مختلف قسم کی پستیوں میں مبتلا تھے۔ ایسی حالت میں جب باہر سے حملہ ہوا تو دشمن کے مقابلے میں چند گھنٹے بھی ٹھہر نہ سکے اور بڑی تعداد میں ہلاک ہوئے۔ صحیفہ سموئیل میں اس کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

"اور فلسطی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا اور وہاں نہایت بڑی خونریزی ہوئی کیونکہ تیس ہزار اسرائیلی پیادے وہاں کھیت آئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔"

خدا کا صندوق وہی ہے جس کو قرآن میں "تابوت سکینہ" کہا گیا ہے، اس کو ان کے یہاں قبلہ کی حیثیت حاصل تھی۔ نمازوں کے وقت اس صندوق کو آگے رکھتے اور لڑائیوں میں اسے اپنے ساتھ لے جاتے، اسے اپنے لیے نشان رحمت اور ذریعۂ قوت و اعتماد تصور کرتے تھے۔ اس کے چھن جانے کے بعد ان کا عزم و حوصلہ جاتا رہا۔ پھر عرصہ دراز کے بعد حضرت سموئیل کے زمانے میں ان کے اندر اصلاح و تجدید اور اقامت دین کی دعوت کا کام شروع ہوا جس کا تورات میں ذکر اس طرح آیا ہے۔

اور سموئیل نے اسرائیل کے سارے گھرانے سے کہا اگر تم اپنے سارے دل سے خداوند کی طرف رجوع لاتے ہو تو اجنبی دیوتاؤں اور عستارات کو اپنے بیچ سے دور کرو اور خداوند کے لیے اپنے دلوں کو مستعد کر کے فقط اسی کی عبادت کرو اور وہ فلستیوں کے ہاتھ سے تمہیں رہائی دے گا۔ تب بنی اسرائیل نے بعلیم اور عستارات کو دور کیا اور فقط خداوند کی عبادت کرنے لگے۔

چنانچہ جب بنی اسرائیل نے اجتماعی توبہ کی اور خدا کے دین کی مدد کے لیے اٹھے تب وہ اس قابل ہوئے کہ فلسطیوں سے اپنے چھینے ہوئے علاقے واپس لے سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی گروہ خدا کے دین کی مدد کے لیے بڑھتا ہے تب خدا کا ہاتھ اس کی مدد کے لیے بڑھتا ہے۔ بنی اسرائیل کی نئی دینی زندگی کا حال یہ ہوا کہ:

فلسطی مغلوب ہو گئے اور اسرائیل کی سرحد میں پھر نہ آئے اور سموئیل کی زندگی بھر خداوند کا ہاتھ فلستیوں کے خلاف رہا اور عقرون سے جات تک کے شہر جن کو فلستیوں نے اسرائیل سے لے لیا تھا وہ پھر

اسرائیلیوں کے قبضہ میں آ گئے اور اسرائیلیوں نے ان کی زراعتی عیں فلسطینیوں کے ہاتھ سے چھڑالی۔

یہ پورا واقعہ بیان کرنے سے مقصود مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے راز سے آشنا کرنا ہے۔ ان کو بتایا جا رہا ہے
کہ اگر وہ جسمانی موت سے ڈر گئے تو ان پر ذلت و خواری کی اجتماعی موت مسلط ہو کر رہے گی اور اگر وہ زندگی
کی راہ ــــ دینی راہ ــــ پر بڑھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ ان کو باعزت زندگی سے بہرہ ور فرمائے گا
اس دین پر جینے اور دین پر مرنے اور دینی راہ کھولنے کا اپنے اندر دم داعیہ پیدا کرو۔ ہر طرح کی قربانی
پیش کرنے کے لیے تیار رہو۔ ایک اچھی قیادت پر متفق ہو اور اپنے کو نظم و طاعت میں کسو۔ اپنے اندر صبر
پیدا کرو۔ خدا پر تمہیں کامل بھروسا ہو، نہ اپنی جان چراؤ، نہ اپنی جیبوں کو چھپاؤ، اور نہ اپنے مفاد کو دینی مفاد پر
ترجیح دو، تب دیکھو خدا کیا کرتا ہے، یقیناً اس کو اپنا حامی و مددگار پاؤ گے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ
عَلِیْمٌ۔ یقین کرو اللہ سننے والا جاننے والا ہے، وہ ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے اور ہر شخص کے بارے
میں جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے، کن مشکلات میں گھرا ہوا اسے پکار رہا ہے۔

(بقیہ اشارات) کی بجائے اس کے نہایت وسیع اور بڑی حد تک جامع تصور کا حامل نظر آ رہا ہے جیسا کہ خطبۂ
صدارت اور بعض قرار دادوں کے ان حصوں سے واضح ہوتا ہے جن میں مسلمانوں کی منصبی ذمہ داریوں کی طرف
اشارات کیے گئے ہیں، اور چونکہ عام مسلمانوں کا ذہن بالعموم اسلام کے جامد و محدود تصور ہی سے آشنا ہے اس
لیے اس تصور کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے مسلمانوں میں پھیلانے اور مقبول بنانے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی یا جمہوری کنونشن کی تائید میں جو قرار دادیں منظور ہوئی ہیں ان سے
مذکورہ خصوصیت کے علاوہ اس رجحان کے باشعور ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد و
یکجہتی کے لیے کوششیں کرنا دینی مفادات کے علاوہ خود فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے نقطۂ نظر
سے بھی ضروری ہے۔

لیکن یہ واضح بات ہے کہ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے بھی مسلمانوں کا متحد و متفق ہونا
ضروری ہے۔ اس لیے یہ کام اس پر مقدم ہے اور اس کا نقصان کسی طرح بھی گوارا نہیں کیا جانا چاہیے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر[1]

(سید جلال الدین عمری)

خدا کا دین اپنے انتہائی مخالف ماحول میں نازل ہوا۔ اس کا نظام وقت کے نظام سے اور اس کا مزاج وقت کے مزاج سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے نظریات ذہنوں پر چھائے ہوئے نظریات سے جدا تھے اس کا طریقہ کار عمل کی ان راہوں سے الگ تھا جن پر دنیا چل رہی تھی۔ لوگ اس سے نامانوس تھے اور اس کا نام سن کر گھبراتے تھے۔ جو باہمت نفوس اس کو قبول کرتے وہ اپنے حلقوں سے کٹ جاتے اور ماحول ان کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا لیکن آہستہ آہستہ ماحول میں تبدیلی پیدا ہوئی اور لوگ خدا کے دین سے مانوس ہونے لگے مختلف گروہوں سے افراد کھنچ کھنچ کر اس کی طرف آنے شروع ہوئے اور اس کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی گئیں اس کی خاطر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے بڑی قربانیاں دیں، ایسی قربانیاں کہ تاریخ ان کی مثال نہیں پیش کر سکتی۔ وہ بے سروسامان تھے، کمزور تھے اور گنتی میں چند تھے۔ اس کے بالمقابل ان کے دشمن ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ساز و سامان اور عددی قوت کے لحاظ سے بہت طاقتور تھے، لیکن اس کے باوجود آپ اور آپ کے صحابہ کبھی پست ہمت نہیں ہوئے۔ وہ صبر و ثبات کے ساتھ اپنے مخالفین کا مقابلہ کرتے رہے یہاں تک کہ ان پر غالب آگئے۔ یہ دور خدا کے دین کی خدمت اور اس کے نتائج دونوں پہلوؤں سے انسانیت کا بہترین دور تھا۔ اس میں ہر طرف خدا پرستی اور نیکی چھائی ہوئی تھی۔ حق غالب اور باطل مغلوب تھا۔ معروف کی حکومت تھی اور منکر سرنگوں تھا۔ بدی کی جگہ نیکی کی اور شر کی جگہ خیر کی فرماں روائی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح دعوت دین کا کام اعلیٰ پیمانے پر کیا تھا۔ اسی طرح تربیت و اصلاح امت کا کام بھی اعلیٰ پیمانہ پر کیا تھا

اس مبارک دور کے پاکیزہ اثرات آج بھی

---

[1] یہ مضمون مصنف کی کتاب دعوت و تبلیغ اور اصلاح امت سے متعلق بحث کا ایک حصہ ہے۔

بھی کئی ادوار تک باقی رہے اور پھر بتدریج کم ہوتے چلے گئے۔ یعنی امت اپنے دورِ صالحیت کے بعد بگاڑ کی طرف بڑھنے لگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ بصیرت نے بہت پہلے اس کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ آپ نے فرمایا

خیرکم قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم قال عمران فلا ادری قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد قرنہ مرتین او ثلاثا ثم یکون بعدہم قوم یشہدون ولا یستشہدون ویخونون ولا یؤتمنون وینذرون ولا یوفون ویظہر فیہم السمن[1]

تم میں سب سے اچھے لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں پھر وہ لوگ ہوں گے جو ان کے بعد آئیں گے۔ اس کے بعد وہ لوگ ہوں گے جو ان کے بعد آئیں گے۔ اس کے بعد وہ لوگ ہوں گے جو ان کے بھی بعد آئیں گے۔ حضرت عمرانؓ (راوی حدیث) نے کہا کہ مجھے یاد نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد دو زمانوں کا ذکر کیا یا تین زمانوں کا۔ آپ نے فرمایا ان ادوار کے بعد ایسے لوگ ہوں گے جو (آگے بڑھ بڑھ کر) گواہی دیں گے لیکن وہ گواہی کے لیے طلب نہیں کیے جائیں گے۔ وہ خیانت کریں گے اس لیے کوئی ان کے پاس امانت نہیں رکھے گا۔ وہ نذر مانیں گے لیکن نذر پوری نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا (تعیش) ظاہر ہوگا۔

امت کے لیے اس کا دورِ اول ایک اعلیٰ مثال اور بہترین نمونہ ہے۔ بعد کا جو دور اپنے اوصاف کے لحاظ سے اس سے جس قدر قریب ہوگا اس میں اتنی ہی خیر و خوبی موجود ہوگی۔ امت کے پہلے لوگوں کی تعریف بلاوجہ نہیں تھی بلکہ اس لیے وہ تعریف کے مستحق قرار پائے تھے کہ انھوں نے دین کی راہ میں زبردست قربانیاں دیں اور امت کی اصلاح و تربیت اور نصح و خیر خواہی سے غافل نہیں رہے۔ اگر یہ خوبیاں بعد کے کسی دور میں پائی جائیں تو بلا شبہہ وہ بھی قابلِ تعریف ہوگا۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں:

ان قرنہ انما فضل لانہم کانوا غرباء فی ایمانہم لکثرۃ الکفار وصبرہم علی

آپ کے دور کے لوگوں کو اس لیے فضیلت دی گئی کہ وہ اپنے ایمان میں اجنبی تھے کیونکہ کفار کی کثرت تھی۔ انھوں نے اس کی [illegible]

۱؎ بخاری، باب فضائل اصحاب النبیؐ۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب فضل الصحابۃ ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم

اذا عمروتمسكهم بدينهم
وان اواخر هذه الامة اذا
اقاموا الدين وتمسكوا به
وصبروا على طاعة ربهم لحين
ظهور الشر والفسق والهرج
والمعاصي والكبائر عانوا عنه
ذالك ايضا غرباء وزكت
اعمالهم في ذالك الوقت كما
زكت اعمال اوائلهم[1]

پر صبر کیا تھا اور اپنے دین پر مضبوطی سے ثابت قدم
رہے تھے۔ اس امت کے پچھلے لوگ بھی جب کہ بدی
اور فسق و فجور کا قتل و معاصی اور کبائر کا ظہور
ہوگا دین کو قائم کریں گے اور اسے مضبوطی سے
پکڑے رہیں گے اور خدا کی بندگی پر جمے رہیں گے
تو وہ بھی اپنے ماحول میں اجنبی بن جائیں گے اور
ان کے مراتب اعمال بھی اسی طرح اونچے ہو جائیں گے
جس طرح ان سے پہلوں کے مراتب اعمال اونچے
ہوئے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دین جس طرح اپنے دور آغاز میں اجنبی تھا اسی طرح بعد کے دو[ر] میں بھی وہ اجنبی بن جائے گا۔ بہت ہی مبارک ہیں وہ لوگ جو ان حالات میں دین پر قائم رہیں اور اس کی وجہ سے اپنے ماحول میں بے گانہ بن جائیں۔

بدأ الاسلام غريبا و
سيعود كما بدأ غريبا
فطوبى للغرباء[2]

اسلام کا آغاز اجنبیت کی حالت میں
ہوا اور پھر وہ اسی طرح اجنبیت کی حالت میں لوٹ
جائے گا جیسا کہ شروع ہوا۔ پس خوشخبری ہے
اجنبیوں کے لیے۔

بعد کے ادوار میں دین کے اجنبی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت جس طرح جاہلیت کا غلبہ تھا پھر جاہلیت کا غلبہ ہو جائے اور ہر طرف باطل کی فرماں روائی ہونے لگے۔ ذہنوں پر غلط افکار چھا جائیں اور صحیح فکر کے رکھنے اور اسے پیش کرنے والے اجنبیت میں چلے جائیں۔ بستی آبادیاں خدا کے چرچوں سے خالی ہو جائیں اور خدا کے دین پر عمل کرنے والے صفحۂ زمین پر تھوڑے سے رہ جائیں۔ بڑی بڑی بستیوں میں خدا کا [illegible] سے خالی ہو جائے۔ چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ

[1] [illegible]

[2] [illegible]

جن اجنبیوں کو آپ خوشخبری دے رہے ہیں وہ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا۔

اناس صالحون فی اناس	چند تھوڑے سے لوگ بہت سے برے
سوء کثیر من یعصیهم	انسانوں میں۔ ان کی نافرمانی کرنے والے ان کی
اکثر ممن یطیعهم[1]	اطاعت کرنے والوں سے زیادہ ہوں گے۔

یہ وہ خدا کے نیک بندے ہیں جو تاریکی میں روشنی کا چراغ جلاتے ہیں اور جن کے ہاتھوں دنیا میں اصلاح کا کام انجام پاتا ہے۔ یہ باطل کے غلبے سے ہراساں نہیں ہوتے بلکہ اس کی جگہ حق کو غالب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ ان کو پیغمبروں کا جانشین کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کے کام کی نوعیت ٹھیک وہی ہوتی ہے جو پیغمبروں کے کام کی ہوتی ہے۔ ان کے ذریعے بگڑے ہوئے انسانوں کو اسی طرح راہ ہدایت ملتی ہے جس طرح پیغمبروں کے ذریعہ ملتی ہے۔ اسی وجہ سے بعض احادیث میں غرباء (دین کی راہ میں اجنبی ہونے والے) کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

الذین یصلحون اذا افسد	اصلاح کا کام کرنے والے جب کہ لوگ بگاڑ
الناس[2]	پیدا کردیں۔

رسول اکرمؐ فرماتے ہیں کہ یہ مصلحین اپنے ماحول میں اجنبی ہوں گے، لوگوں کے لیے ان کے نظریات میں کوئی کشش نہ ہوگی ان کی باتیں دنیا کو نرالی معلوم ہوں گی اور ان کے اعمال اور طور و طریق نامانوس لگیں گے۔ ان کی راہ تنہائی کی راہ ہوگی اور ان کا کوئی ہمدم و ہم ساز نہیں ہوگا، لیکن اس کے باوجود وہ زندگی کے آخری لمحوں تک اپنا سفر جاری رکھیں گے اور یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔

علامہ ابن اثیر حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں۔

انه ای الاسلام کان	اسلام اپنے آغاز میں مسلمانوں کی قلت کی
فی اول امرہ کالغریب الوحید	وجہ سے اس تنہا اجنبی کی مانند تھا جس کے پاس اس
الذی لا اهل له عندہ لقلة	کے گھر کے لوگ نہ ہوں اور پھر وہ اجنبی ہو جائے گا
المسلمین یومئذ وسیعود	جیسا کہ پہلے تھا یعنی آخر زمانے میں مسلمان قلیت میں
غریبا کما کان ای یقل	ہو جائیں گے اور اس طرح (اکثریت کے درمیان)

[1] مسند احمد جلد ۲ ص ۱۷۷ [2] مسند احمد جلد ۴ ص ۷۳

المسلمون فی آخر الزمان	اجنبی بن جائیں گے (آپ نے فرمایا) پس خوش خبری
فیصیرون کالغرباء فطوبیٰ	ہے اجنبیوں کے لیے یعنی جنت ہے ان مسلمانوں
للغرباء ای الجنة اولئک	کے لیے جو اسلام کے دور آغاز میں تھے اور اس کے
المسلمین الذین کانوا	دور آخر میں ہوں گے خصوصیت کے ساتھ ان کے ذکر
فی الاسلام ویکونون فی آخرہ	کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے دور اول اور دور
وانما خصهم بها لصبرهم علیٰ اذی	آخر میں کفار کی ایذا رسانیوں پر صبر کیا اور دین
الکفار اولا وآخرا ولزومهم دین الاسلام[۱]	اسلام کو پکڑے رہے ۔

دین کے ان اجنبی مسافروں کو وہ تمام مشکلات پیش آئیں گی جو حق کے ہر راہی کو عموماً پیش آتی ہیں۔ ان کو ستایا جائے گا۔ ان پر طعن و تشنیع کے تیر برسائے جائیں گے، ان کی آسائش و راحت چھن جائے گی، ان کے حق میں چمن کے پھول کانٹوں میں تبدیل ہونے لگیں گے حتیٰ کہ زندگی بھر کے دوست ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ہوں گے اور خونی رشتہ دار جانی دشمن بن جائیں گے۔ ان کے لیے خدا کی زمین تنگ ہونے لگے گی اور وہ اپنے وطن میں غریب الدیار ہو جائیں گے، بلکہ ہو سکتا ہے کہ ان کو مظلومیت کے عالم میں گھر بار تک چھوڑنا پڑے۔ چنانچہ ایک حدیث میں 'غرباء' کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

النزاع من القبائل[۲]	قبیلوں سے نکل جانے والے

محدثین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد 'مہاجرین' ہیں۔ اس ایک لفظ سے اجنبیت اور مظلومیت کی تصویر پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔ اس سے آپ تصور کر سکتے ہیں کہ وہ کتنی کٹھن راہ تھی جس سے حق کے پہلے مسافر گزرے تھے اور جس سے بعد والوں کو گزرنا ہے۔

دین کی غربت کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود دین کے ماننے والے بے دینی کا شکار ہو جائیں۔ باطل کے سیلاب میں وہ اس طرح بہہ جائیں جس طرح خدا کے منکر بہہ جاتے ہیں۔ ان میں وہ ایمانی قوت باقی نہ رہے جو فتنوں کے مقابلے میں مرد مومن کو ثابت قدم رکھتی ہے۔ ان کے اندر ایسے اصحاب فکر کم سے کم تر ہو جائیں جو دین کی روشنی میں اپنے مسائل پر غور کرتے ہیں اور ایسے اصحاب عمل کی تعداد گھٹ جائے جو اپنے ہر اقدام سے پہلے دین کا نقطۂ نظر معلوم کریں اور اس کے مطابق اپنی راہ متعین کریں۔ بالفاظ دیگر دین کا نام لینے والے تو اکثریت میں ہوں لیکن صحیح

[۱] النہایۃ فی غریب الحدیث جلد ۳ صفحہ ۱۵۱ مادہ 'غرب'　　[۲] مسند احمد، جلد ۱ صفحہ ۳۹۸ ابن ماجہ کتاب الفتن باب بدأ الاسلام غریبا

دینی فکر کے حامل اور دین کی راہ پر چلنے والے اقلیت میں رہ جائیں۔ ظاہر ہے ان حالات میں خود دین کے ماننے والوں کے درمیان دین کے حقیقی خادموں اور اس کے سچے وفاداروں پر اجنبیت کا عالم چھا جائے گا لیکن خدا اور اس کے رسول کے نزدیک یہ اجنبیت بہت ہی مبارک اجنبیت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں اس اجنبیت کا بھی بیان موجود ہے۔ آپ سے لوگوں نے پوچھا کہ غرباء سے مراد کون ہیں؟ آپ نے جواب دیا:-

الذین یزیدون اذا نقص الناس[1] (یعنی غرباء وہ ہیں جو تقویٰ و خدا پرستی میں اس وقت آگے ہوں گے جب کہ دوسرے لوگ اس میں پیچھے ہوں گے) اس سے آگے آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ وہ نہ صرف خود صلاح یافتہ ہوں گے بلکہ اصلاح امت کا کام بھی انجام دیں گے۔

الذین یصلحون ما افسد	وہ افراد جو اس بگاڑ کی اصلاح کریں گے
الناس من سنتی[2]	جو میری سنت میں لوگ پیدا کردیں گے

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے

الذین یحیون سنتی و	وہ افراد جو میری سنت کو زندہ کریں گے
یعلمونہا الناس[3]	اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے۔

بعض محدثین نے اسی پہلو سے حدیث کی تشریح کی ہے۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں:-

اما انہ ما یذھب اھل	بے شک اسلام نہیں ختم ہو جائے گا بلکہ سنت
الاسلام ولکن یذھب اھل	کی پیروی کرنے والے ختم ہو جائیں گے یہاں تک کہ
السنۃ حتی ما یبقی فی البلد	پورے شہر میں سنت کی پیروی کرنے والوں میں سے
منھم الا رجل واحد	صرف ایک شخص رہ جائے گا۔

امام ابن قیمؒ نے اجنبیت کے اس پہلو پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"اہل اسلام عام لوگوں میں، اہل ایمان اسلام لانے والوں میں، اہل علم ایمان والوں میں اور اہل سنت جو سنت اور خواہشات و بدعات کے درمیان تمیز کرسکیں وہ بدعتیوں میں اجنبی ہیں اور سنت کی طرف بلانے والے اور مخالفین کی ایذا رسانیوں پر صبر کرنے والے تو ان سب سے زیادہ اجنبی ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہی اہل اللہ ہیں ان

---

[1] رواہ احمد (مدارج السالکین ج ۳ صفحہ ۱۲۲) [2] ترمذی، کتاب الایمان، باب ما جاء ان الاسلام بدء غریبا وسیعود غریبا
[3] مدارج السالکین، ج ۳ صفحہ ۱۲۲ [4] کشف الکربۃ فی وصف حال اہل الغربۃ لابن رجب حنبلی مطبوعہ مصر صفحہ ۔

کے لیے کوئی اجنبیت نہیں ہے۔ ان کی اجنبیت اس اکثریت کے درمیان ہے جس کے بارے میں خدا کا ارشاد ہے کہ اگر تم ان میں سے بیشتر کی جو زمین میں ہیں اتباع کروگے تو وہ تم کو خدا کے راستے سے پھیر دیں گے" گو یہ اکثریت میں ہیں لیکن خدا اس کے رسول اور اس کے دین سے اجنبی ہیں اور ان کی اجنبیت زیادہ وحشت انگیز ہے خواہ وہ کتنے ہی معروف و مشہور کیوں نہ ہوں اور لوگ ان کی طرف عقیدت سے اشارے ہی کیوں نہ کرتے ہوں۔"

چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں :۔

"......... ایک اجنبیت تو وہ ہے جو اللہ والوں اور اس کے رسول کی سنت کی اتباع کرنے والوں کو مخلوق کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ اجنبیت جن انسانوں کو لاحق ہو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف کی ہے۔

.... یہ اجنبیت (ضروری نہیں کہ پورے عالم پر چھا جائے بلکہ یہ) کسی جگہ ہو سکتی ہے اور کسی جگہ نہیں بھی ہو سکتی، کسی خاص وقت میں ہو سکتی ہے اور کسی وقت میں نہیں بھی ہو سکتی اور کسی قوم میں ہو سکتی ہے اور کسی قوم میں نہیں بھی ہو سکتی۔ لیکن بہر حال یہ وہ اجنبی ہیں جو قطعی طور پر خدا والے ہیں کیونکہ انھوں نے خدا کے سوا کسی کے دامن میں پناہ نہیں لی اور اس کے رسول کے سوا کسی دوسرے کی طرف اپنا انتساب نہیں کیا اور نہ تعلیمات رسول کے سوا کسی دوسری تعلیم کی طرف دنیا کو دعوت دی۔

اسی بحث میں آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

"وہ صحیح اسلام جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب قائم تھے آج اپنے وقت ظہور سے زیادہ اجنبی ہے گو کہ اس کی نشانیاں اور ظاہری رسوم معروف و مشہور ہیں حقیقی اسلام انتہائی بیگانہ اور اس پر عمل کرنے والے بے حد اجنبی ہیں۔ خیال کرو کہ ایک جماعت کیسے تھوڑی اور اجنبی نہ ہوگی ایسے بہتر فرقوں[1] کے درمیان جو اپنے متبعین بھی رکھتے ہیں اور جن کے پاس ریاست، منصب اور اقتدار بھی ہے۔ ان لوگوں کا بازار گرم ہی ہوتا ہے تعلیمات رسول کی مخالفت میں۔ کیونکہ آپ کی تعلیمات ٹکراتی ہیں ان کی خواہشات سے، ان کی لذتوں سے، دین کے بارے میں ان کے شکوک و شبہات سے جو کہ ان کے علم و فضیلت کی آخری حد ہیں اور ان کی شہوات نفسانی سے جو ان کے مقاصد اور ارادوں کی غایت ہیں۔ پس وہ مومن جو اتباع رسول کی راہ سے خدا کی طرف چل رہا ہو وہ ایسے لوگوں کے درمیان کیوں کر اجنبی نہ ہوگا جو اپنی خواہشات کے غلام اور حرص و ہوا کے تابع ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی رائے

---

[1] اشارہ ہے اس حدیث کی طرف جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت بہتر فرقوں میں بٹ جائے گی اور سب کے سب راہِ ضلالت پر ہوں گے سوائے ایک جماعت کے جو میرے اور میرے ساتھیوں کے راستے پر چلے گی۔

رود ہے۔

اسی سلسلے میں فرماتے ہیں :۔

"وہ مومن جسے اللہ نے اپنے دین کی بصیرت، اپنے رسول کی سنت کی سوجھ بوجھ اور اپنی کتاب کا فہم عطا کیا
ر ساتھ ہی اسے یہ بھی دکھا دیا ہے کہ لوگ کن خواہشات، بدعتوں اور گمراہیوں میں گرفتار ہیں اور کس طرح وہ
راط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ گام زن تھے۔ اگر وہ اس راہ
ا چاہے تو اسے جاہلوں اور اہلِ بدعت کی مذمت، ان کی طعن و تشنیع اور ان کی تحقیر و عیب چینی پر صبر کرنا ہوگا
وں کو اس سے نفرت دلائیں گے اور اس سے خوف زدہ کریں گے۔ ان کا سلوک اس کے ساتھ ٹھیک اسی
ہوگا جس طرح کفار اس کے متبوع اور امام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کرتے تھے۔ اگر وہ ان کو صراط مستقیم کی
۔ دعوت دے اور ان کی روش پر تنقید کرے تو ان کے درمیان قیامت برپا ہو جائے گی۔ وہ اس کے
ہر طرح کے مکر کریں گے۔ اس کے لیے دھوکے کے جال بچھائیں گے اور اپنی فوج لے کر اس کی دوڑ پڑیں گے۔ وہ ان
رمیان اپنے دین میں اجنبی ہوگا کیونکہ ان کا دین بگڑ چکا ہوگا۔ وہ اپنی اتباعِ سنت میں اجنبی ہوگا کیونکہ وہ بدعتوں
پٹے ہوئے ہوں گے۔ وہ اپنے صحیح عقیدے میں اجنبی ہوگا کیونکہ ان کے عقائد غلط اور باطل ہوں گے۔ وہ اپنی
وں میں اجنبی ہوگا کیونکہ ان کی نمازیں فاسد ہوں گی۔ وہ اپنے طریقے میں اجنبی ہوگا کیونکہ وہ غلط راہوں پر
رہے ہوں گے۔ وہ اپنے تعلق میں اجنبی ہوگا۔ کیونکہ وہ خدا کے رسول کی طرف منسوب ہوگا اور
پنے جھوٹے راہنماؤں کی طرف منسوب ہوں گے۔ وہ اپنی معاشرت میں اجنبی ہوگا کیونکہ وہ ان کی خواہشات کے
لرغم ان سے سلوک کرے گا مختصر یہ کہ وہ اپنی دنیا و آخرت کے تمام معاملات میں بالکل منفرد اور بے گانہ ہوگا
وئی مددگار اور معاون نہیں پائے گا۔ وہ جاہلوں کے درمیان عالم، اہل بدعت کے درمیان متبع سنت اور خواہشات
بدعتوں کی طرف بلانے والوں کے درمیان خدا اور اس کے رسول کی طرف بلانے والا ہوگا۔ وہ ایسے لوگوں کے
یان امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض انجام دینے والا ہوگا جن کے نزدیک معروف منکر اور منکر معروف
جائے گا۔"[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دین کی اجنبیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ دین کے ماننے والوں ہی کے درمیان
انہ ہو جائے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جو راستہ دکھایا تھا اس سے وہ بھٹک جائے۔ ان حالات

[1] مدارج السالکین، باب الغربۃ جلد ۳ ص ۱۲۳ تا ۱۲۶

ب آپ کی سنت پر قائم رہتے اور اسے زندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یقیناً وہ بہت ہی خوش قسمت ہیں
ال یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ سنت سے آپ کی زندگی کا کوئی خاص پہلو مراد نہیں ہے بلکہ وہ پورا طریقہ
مراد ہے جس پر آپ چل رہے تھے۔ بالفاظ دیگر جس نظام فکر وعمل کی طرف آپ نے دنیا کو دعوت دی،
الفظ اس نظام کا ترجمان ہے۔ آدمی صحیح معنوں میں متبع سنت اسی وقت ہوگا جب کہ وہ اس پورے
اتباع کرے۔ اس میں عقیدہ بھی شامل ہے اور عمل بھی۔ آپ کی تعلیمات پر ایمان ہو تو اس طرح ہو کہ وہ
وشبہات سے یکسر پاک ہو اور ان پر عمل ہو تو اس طرح ہو کہ کہیں نفسانی خواہشات کی آمیزش نہ ہونے پائے
ب حنبلی کہتے ہیں۔

اما السنة الکاملة فھی الطریقة	سنت کاملہ اس راستے کا نام ہے جو (عقائد
السالمة من الشبھات والشھوات	میں) شبہات سے اور (عمل میں) خواہشات سے محفوظ
کما قال الحسن ویونس بن عبید	ہے۔ جیسا کہ حسن بصریؒ، یونس بن عبیدؒ، سفیان ثوریؒ
وسفیان والفضیل وغیرھم[1]	اور فضیل بن عیاضؒ وغیرہم نے کہا ہے۔

دین کی اجنبیت کے دور کو حدیثوں میں دورِ فتن بھی کہا گیا ہے۔ کیونکہ یہ انسان کے فکر وعمل کی آزمائش کا دور
، اس میں ایسے زبردست فتنے ابھرتے ہیں کہ بعض اوقات بڑے باہمت اور مخلص اشخاص بھی اس سے
ح محفوظ نہیں رہ پاتے۔ وہ آندھی اور طوفان کی طرح اٹھتے ہیں اور عقائد واعمال کی عمارت کو متزلزل
یتے ہیں۔ اس امت پر بارہا دورِ فتن آتے اور اس کے دین وایمان کو آزماتے رہے ہیں۔ آج بھی وہ ایک
ت دورِ فتن سے گزر رہی ہے جس میں الحاد و دہریت نے اس کے نظریات وافکار، اخلاق وعبادات،
، معاشرت اور تمدن وسیاست کو امتحان میں ڈال رکھا ہے۔ اس امتحان میں کامیابی کا طریقہ پہلے بھی یہی
آج بھی یہی ہے کہ انسان اس راستے پر مضبوطی سے جما رہے جس پر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے
کے نقوش پا ثبت ہیں۔ آپ نے ایک مرتبہ خطبہ دیا۔ اس کا ایک ٹکڑا یہ تھا:۔

من یعش منکم بعدی فسیری	تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا
اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی	وہ بڑا اختلاف دیکھے گا۔ تو تم اس وقت میری سنت
وسنة الخلفاء الراشدین المھدیین	اور خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کو اپنے

[1] الکربة فی وصف حال اہل الغربة مطبوعہ مصر ص ۱۲

ثم عضوا بہا وعضوا علیہا	اور پر لازم کرلو اس پر مضبوطی سے جمے رہو اور اسے
بالنواجذ وایاکم ومحدثات	دانتوں سے پکڑلو۔ اور نئے نئے امور سے بچو۔
الامور فان کل محدثۃ بدعۃ	کیونکہ (دین میں) نئی بات بدعت ہے اور ہر
وکل بدعۃ ضلالۃ[1]	بدعت گمراہی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دورِ فتن میں بدعت سے بچنے، سنت پر قائم رہنے اور اسے زندہ کرنے کی فضیلت بیان کی ہے۔ ہم یہاں صرف دو روایتیں نقل کرتے ہیں جو اپنے مضمون میں بہت ہی واضح ہیں۔

(۱) من احیی سنۃ من سنتی قد	جس شخص نے میری سنتوں میں سے کسی ایسی سنت
امیتت بعدی فان لہ من	کو زندہ کیا جو میرے بعد مرچکی ہو تو اس کو ان سب
الاجر مثل اجر من عمل بہا	لوگوں کے اجر کے برابر اجر ملے گا جنہوں نے اس پر
من الناس لا ینقص من اجور	عمل کیا لیکن اس سے ان لوگوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں
الناس شیئا[2]	کی جائے گی۔
(۲) المتمسک بسنتی عند فساد	میری امت کے بگاڑ کے وقت میری سنت کے
امتی لہ اجر شہید[3]	تھامنے والے کو ایک شہید کا ثواب ہے۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی آئی ہے۔

من تمسک بسنتی عند	جو شخص میری امت کے بگاڑ کے زمانے میں
فساد امتی فلہ اجر مائۃ شہید[4]	میری سنت پر جما رہے اسے سو شہیدوں کا ثواب ہے

---

[1] رواہ احمد وابو داؤد والترمذی وابن ماجہ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب فی الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

[2] ابن ماجہ۔ مقدمہ، باب من احیی سنۃ قد امیتت۔ ترمذی، کتاب العلم، باب الاخذ بالسنۃ واجتناب البدعۃ۔ اس حدیث کے ایک راوی کثیر بن عبداللہ کو محدثین نے متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ حافظ منذری کہتے ہیں ولکن للحدیث شواہد۔ یعنی حدیث کی تائید میں دوسری روایتیں موجود ہیں۔ (الترغیب والترہیب جلد ۱ ص ـــ)

[3] رواہ الطبرانی۔ اس روایت کی سند کے بارے میں حافظ منذری کہتے ہیں لا باس بہ (الترغیب والترہیب ج ۱ ص ـــ) لیکن علامہ مناوی نے لکھا ہے اسنادہ حسن (التیسیر بشرح الجامع الصغیر ج ۲ ص ۴۵۲ مطبوعہ مصر)

[4] رواہ البیہقی (الترغیب والترہیب ج ۱ ص ـــ) اس حدیث کے راوی حسن بن قتیبہ کو محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ دیکھیے لسان المیزان ج ۲ ص ۲۴۶ مطبوعہ حیدرآباد

ان روایتوں سے جہاں اتباعِ سنت کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے وہاں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ احادیث میں بدعت کی شدید مذمت کیوں کی گئی ہے اور اسے ضلالت اور گمراہی کیوں قرار دیا گیا ہے۔ بدعت دراصل دین کی تحریف اور اس کے بگاڑ کا دوسرا نام ہے اس لیے زندگی کے جس گوشے میں بھی بدعت راہ پائے گی اس سے اصل دین یعنی سنت مٹ جائے گی۔

غضیف بن حارث ثمالیؓ کہتے ہیں:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ما احدث قوم بدعۃ الا رفع مثلها من السنۃ فتمسك بسنۃ خیر من احداث بدعۃ [1]	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی قوم کسی بدعت کو ایجاد کرتی ہے تو اس جیسی سنت (اس قوم کے درمیان سے) اٹھالی جاتی ہے۔ لہذا سنت کو مضبوطی سے پکڑے رہنا بدعت کے ایجاد کرنے سے بہت بہتر ہے

عبداللہ بن دیلمی[2] کہتے ہیں

بلغنی ان اول ذهاب الدین ترك السنۃ یذهب الدین سنۃ سنۃ كما یذهب الحبل قوۃ قوۃ [3]	مجھے یہ بات (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہنچی ہے کہ دین کے مٹنے کا آغاز سنت کو چھوڑنے سے ہوگا۔ دین اس طرح مٹے گا کہ ایک ایک سنت ختم ہوتی چلی جائیگی جیسے رسی کا ایک ایک بل نکل جاتا ہے اور وہ بکھر جاتی ہے

اسی وجہ سے ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ

من وقر صاحب بدعۃ فقد اعان علی هدم الاسلام [4]	جس شخص نے بدعتی کی تعظیم کی اس نے اسلام کے ڈھانے میں مدد دی۔

سنت کی راہ جس طرح دین کے آغاز میں اجنبی تھی اسی طرح آج بھی اجنبی ہے لیکن منزل ان ہی کی ہے جو ہر بدعت کو مٹانے اور سنت کی راہ پر چلنے کا عزم و حوصلہ رکھتے ہیں۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں:۔

كان من مضی من علمائنا یقولون الاعتصام بالسنۃ نجاۃ [5]	ہمارے پچھلے علماء کہا کرتے تھے کہ سنت کو پکڑے رہنے ہی میں نجات ہے۔

[1] مسند احمد ج ۴ ص ۱۰۵ [2] تابعی ہیں بعض لوگوں نے صحابہ میں شمار کیا ہے۔ تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۵۹ [3] دارمی، مقدمہ باب اتباع السنۃ۔ [4] رواہ البیہقی فی شعب الایمان مرسلاً (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب فی الاعتصام بالکتاب والسنۃ) [5] دارمی، مقدمہ، باب اتباع السنۃ

زکوٰۃ وصدقات

(۲)

(مولانا محمد یوسف اصلاحی)

زکوٰۃ کے آداب زکوٰۃ وصدقات خدا کی نظر میں فی الواقع اسی وقت مقبول اور موجب اجر وثواب قرار پاتے ہیں جب وہ قرآن کے بتائے ہوئے آداب وجذبات کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ خدا کی راہ میں کچھ دیتے وقت اپنے داخل کو ضرور ٹٹول لینا چاہیے کہ یہ پاکیزہ جذبات نشو ونما پا رہے ہیں یا نہیں

۱۔ محض خدا کی خوشنودی وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (البقرۃ: ۲۷۲) — اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اسی لیے تو کہ خدا کی خوشنودی حاصل ہو

زکوٰۃ کے سلسلے میں پہلی بات جس پر گہری نظر رکھنی چاہیے وہ یہ کہ محض اپنے خدا کی رضا کے لیے دی جائے اس کے سوا قطعاً کوئی محرک پیش نظر نہ رہے، جو لوگ محض خدا کی خوشنودی کے لیے اپنا دل پسند مال خوشی خوشی قربان کرتے ہیں۔ ان کے حسنِ عمل کی تمثیل قرآن نے بڑے ہی مؤثر اور فکر انگیز انداز میں فرمائی ہے۔

اخلاص نیت کی تمثیل وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا

اور جو لوگ محض خدا کی خوشنودی کے لیے دل کے پورے ثبات وقرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنے پھل لائے۔ اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو جائے

بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ (البقرہ: ۲۶۵) تم جو کچھ کرتے ہو سب خدا کی نظر میں ہے۔

"سطح مرتفع پر باغ ہونے" سے مراد یہ ہے کہ دل جو تمام جذبات اور ارادوں کا سرچشمہ ہے، اس کی سرزمین پاکیزہ کیفیات اور اخلاص سے اس طرح تیار ہو کہ اس میں زرخیزی اور نمو کی پوری قوت موجود ہو۔ "زور کی بارش" سے مراد وہ صدقہ وخیرات ہے جو انتہائی گہرے جذبات اور کمال درجے کے اخلاص سے دی جائے اور "ہلکی پھوار" سے مراد وہ صدقہ وخیرات ہے جس میں جذبات کی یہ شدت نہ رہی ہو۔

جس طرح اچھی اور زرخیز زمین میں لگا یا ہوا باغ بہرحال پھل لاتا ہے، خواہ اس پر تیز بارش ہو یا اس پر ہلکی پھوار ہی پڑ جائے ـــــ اسی طرح دل کی سرزمین میں اگنے والے "نیکی اور خیر" کے باغ کا حال ہے اگر دل کی سرزمین صالح ہے، اور خدا کی خوشنودی کے سوا کوئی دوسرا جذبہ اس کی قوت نمو کو تباہ نہیں کر رہا ہے، تو اس میں اگنے والا نیکیوں کا باغ بہرحال شاداب ہوگا۔ ایسے دل سے جو صدقات اور خیرات بھی کیے جائیں گے اور اخلاص وجذباتِ خیر کی جن کیفیتوں کے ساتھ بھی کیے جائیں گے بہرحال خدا کی نظر میں قدر کے لائق ہوں گے اور دینے والے کے حق میں خیر ہی ثابت ہوں گے۔

۲۔ ریا اور نمائش سے اجتناب

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرہ: ۲۷۱)

اگر تم اپنے صدقات علانیہ دو تو بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجتمندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ: ۲۶۴)

مومنو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور ایذا پہنچا کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ آخرت پر۔

نمود ونمائش اور ریا ایک ایسا بدترین جذبہ ہے جو اچھے سے اچھے عمل کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ کسی عمل کے نیک اور مقبول ہونے کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ محض خدا کی خوشنودی کی خاطر کیا گیا ہو، اور اس میں دکھاوا، شہرت اور نمود ونمائش بالکل نہ ہو۔ بے نیاز خدا کے دربار میں اس عمل کی کوئی قیمت نہیں جو محض اس کی رضا کے لیے نہ کیا گیا ہو ـــــ یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ جو عمل لوگوں کی خاطر کیا گیا ہے خدا سے اس کے اجر کا کیا سوال؟ اسی لیے قرآن نے نیت کے اخلاص پر بہت زور دیا ہے۔ بخاری کی ایک حدیث میں ہے۔ "قیامت کے روز

جب خدا کے سایے کے علاوہ کہیں سایہ نہ ہوگا۔ سات قسم کے لوگ عرش الٰہی کے سایے میں ہوں گے ان میں ایک وہ ہوگا جس نے خدا کی راہ میں اس طرح چھپا کر خرچ کیا ہوگا کہ بائیں ہاتھ کو یہ خبر نہ ہوگی کہ داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا[1]۔ جامع ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ قیامت میں خدا کے حضور سب سے پہلے تین آدمی حاضر کیے جائیں گے ان میں سے ایک سے خدا پوچھے گا "بتا میں نے تجھے دنیا میں مال و دولت سے نوازا تھا تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا پروردگار! میں تو دن رات تیری راہ میں خرچ کرتا رہا۔ خدا فرمائے گا تو جھوٹ بولتا ہے فرشتے بھی تائید میں کہیں گے تو جھوٹا ہے۔ پھر خدا کہے گا تو اس اس لیے خرچ کیا کرتا تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں ــ تو وہ کہا جا چکا۔ پھر یہ شخص ان لوگوں میں ہوگا جن پر سب سے پہلے جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی۔ ایک حدیث میں تو یہاں تک ہے کہ جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ دیا شرک کیا[2]۔

ریاکارانہ صدقے کی تمثیل

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ٥ (البقرۃ: ۲۶۴)

اس کے صدقے کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی ایسے (ریاکار) لوگ اپنے نزدیک صدقہ وخیرات کرکے جو نیکی کماتے ہیں اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا۔ اور اللہ تعالیٰ ناشکروں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔

چٹان سے ناشکرے آدمی کا وہ سخت دل مراد ہے جو رحم وکرم اور نیک نیتی کے جوہر سے بالکل خالی ہو، بارش سے مراد خیرات وصدقات ہیں اور مٹی کی ہلکی تہہ سے مراد نیکی کی ظاہری شکل ہے جو بس اوپر ہی اوپر دکھاوے کے لیے ہو۔

بلاشبہہ بارش کا کام یہ ہے کہ اس سے زمین لہلہا اٹھے لیکن جس نے زمین کو روئیدگی کی صفت سے محروم کر لیا ہو اور دل کی نرم زمین کو چٹان کی طرح سخت بنا لیا ہو، نہ اس میں خدا کی خوشنودی کا جذبہ ہو اور

---

[1] اس ذیل میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ فرض زکوٰۃ کا علانیہ دینا ہی افضل ہے تاکہ فرض کا پرچار ہو، یاد دہانی ہو اور لوگوں کو ترغیب ہو۔ البتہ نفلی صدقات چھپا کر ہی دینا افضل ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ قلب کی صفائی کا ذریعہ بن سکیں۔

[2] مسند احمد

نہ غریبوں اور محتاجوں پر رحم کھانے کا جذبہ اس پر محض دکھاوے کی نیکی سے مٹی کی ہلکی تہہ جما بھی دی جائے تو اس کو بارش سے کیا فائدہ؟ بارش کی پہلی بوچھاڑ ہی میں یہ مٹی کی تہہ بہہ جائے گی اور نیچے کی صاف چٹان نمودار ہو جائے گی وہ صدقہ جو خدا کے یہاں مقبول ہو اور دنیا میں خیر و برکت کا ذریعہ بنے اس کی تو اولین شرط ہی یہ ہے کہ وہ محض خدا کو خوش کرنے کے لیے دیا گیا ہو۔

۳۔ احسان برتری سے پرہیز

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝ (المؤمنون: ۶۰)

اور ان کا حال یہ ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے

اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ (المائدہ: ۵۵)

جو نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور حال یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔

مومن خدا کی راہ میں اپنی بساط بھر جو بھی تھوڑا یا بہت خرچ کرتا ہے کس فکر اور کن جذبات کے ساتھ خرچ کرتا ہے، یہ دونوں آیتیں اس کی پوری پوری تصویر کشی کرتی ہیں، اپنے صدقہ اور خیرات پر فخر و غرور کا اظہار، احساس برتری یا پندار تو کجا مومن تو دینے کے بعد بھی لرزاں و ترساں رہتا ہے کہ معلوم نہیں خدا کے یہاں میرا یہ صدقہ شرف قبولیت بھی حاصل کر سکے گا یا نہیں، میں واقعی صحیح جذبات اور صحیح آداب کے ساتھ خدا کی راہ میں دے بھی سکا ہوں یا نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں پہنچنے پر کچھ ملنے کے بجائے الٹی مجھ سے باز پرس ہو جائے۔ وہ جو کچھ دیتے ہیں تن کر اور غریبوں پر رعب جما کر نہیں دیتے بلکہ عاجزی کے جذبات کے ساتھ سر جھکا کر دیتے ہیں، غرور اور احساس برتری کے بجائے ان کے اندر عاجزی اور فروتنی ہوتی ہے۔

طلب شکر سے بیزاری

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ اِنَّا

اور باوجود یکہ انہیں خود کھانے کی خواہش اور ضرورت ہوتی ہے وہ اپنا کھانا ناداروں، یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں) ہم تمہیں محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ تم ہماری شکر گزاری کرو حقیقت تو یہ ہے کہ

نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا (الدھر: ۸-۱۰)

اپنے پروردگار سے اس دن کے لیے ڈرتے ہیں جو بہت ہی سخت اور پریشان کن ہوگا۔

افضل ترین صدقہ فی الواقع وہی ہے کہ جب آدمی کو خود اس کی خواہش بھی ہو اور ضرورت بھی اور پھر اپنی پرواہ کیے بغیر خدا کی محبت کے جوش میں دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد ہے:۔

"بہترین خیرات وہ ہے کہ جب تم خود تندرست بھی ہو اور خواہشمند بھی، مال دار ہونے کی خواہش بھی ہو احتیاج کا کھٹکا بھی لگا ہوا ہو۔"

خدا کی محبت کے ان گہرے جذبات اور کمال درجے کے ایثار کے باوجود مومن دینے کے بعد کبھی لینے ں سے اس بات کی خواہش نہیں رکھتا کہ وہ اس کا کوئی بدلہ دیں، احسان مانیں، اس کی بڑائی تسلیم کریں اور ں کے سامنے شکر کے جذبات پیش کردیں۔ مومن تو اس کے باوجود آخرت کے خوف سے کانپتا رہتا ہے اور نے دل کا احتساب کرتا رہتا ہے کہ وہ واقعی ہر چیز سے بے نیاز ہوکر محض اپنے خدا کو خوش کرنے کے لیے ے بھی سکا یا نہیں

احسان جتانے اور دکھ دینے سے پرہیز

الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم (البقرہ: ۲۶۲-۲۶۴)

جو لوگ اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرکے پھر احسان نہیں جتاتے اور نہ دکھ دیتے ہیں ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے اور ان کے لیے نہ کسی خوف کا موقع ہے اور نہ کسی غم کا۔ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز اور بُردبار ہے۔ اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر خاک میں نہ ملا دو۔

احسان جتانے سے مراد یہ ہے کہ صدقہ دینے والے کے دل میں کچھ اس طرح کے جذبات پلنے لگیں کہ لینے والے ں کے ممنونِ کرم رہیں، اس کے سامنے جھکے رہیں، اس کی ہاں میں ہاں ملائیں اور اس کی برتری اور بڑائی کو مانیں۔ اور

اگر وہ اس کے جا و بے جا جذبات کا لحاظ نہ رکھ سکیں تو یہ نہیں اپنا احسان جتا کر اور اپنے خیرات کی قوت سے دبا کر مجبور کرے، دکھ دینے سے مراد یہ ہے کہ محتاجوں اور ناداروں کے ساتھ ایسا ذلت آمیز سلوک کیا جائے جس سے ان کی خودداری اور عزت نفس کو ٹھیس لگے، ان کا دل ٹوٹے اور ان میں ذلت اور حقارت کے جذبات پیدا ہوں، قرآن نے صراحت کی کہ اس طرح کے گھٹیا جذبات صدقہ وخیرات کو تباہ کرکے رکھ دیتے ہیں۔ مومن کا طرز فکر تو یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کے محتاج بندوں کی ضرورتیں پوری کرکے اور ناداروں کا حق دے کر خدا کے آگے شکر اور عاجزی سے اور زیادہ جھک جاتا ہے کہ اس نے اپنی راہ میں کچھ خرچ کرنے کی قوت دی اور اپنے تہی دست بندوں کو ان کا حق پہنچانے کی توفیق بخشی۔

۶۔ نرمی کا سلوک

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۲۸)

اگر تم ان سے اعراض کرنے پر مجبور ہو جاؤ اپنے رب کے فضل کی توقع رکھتے ہوئے تو ان سے کوئی نرمی کی بات کہہ دیا کرو۔

وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ (الضحیٰ)

اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دو۔

اگر آدمی کسی وقت خود تنگ دستی کا شکار ہو جائے اور وہ اس لائق نہ ہو کہ کسی سائل اور حاجتمند کا سوال پورا کر سکے تو اس صورت میں بھی اس کے لیے یہ کسی طرح زیبا نہیں کہ وہ سائل کو جھڑک کر جواب دے، یا اکتا کر قطعی مایوسی اور بیزاری کا اظہار کرے۔ خدا سے فضل وکرم کی توقع رکھے اور یقین رکھے کہ خزانوں کا مالک خدا ہے وہ فراخی اور خوش حالی سے پھر نوازے گا۔ اور پھر اس کا دیا ہوا مال اسی کی راہ میں خرچ ہوگا۔ —— ان توقعات کے ساتھ سائل کو نہایت خوش خلاقی اور نرمی سے کوئی ایسا جواب دے کہ اس کا دل نہ ٹوٹے اور خاموشی کے ساتھ دعا دیتا ہوا رخصت ہو جائے۔

۷۔ کشادہ دلی

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ

(اللہ ان دولتمند منافقوں سے خوب واقف ہے) جو خوش دلی سے دینے والے مومنین کے صدقہ وخیرات پر باتیں چھانٹتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (خدا کی راہ میں دینے کے لیے) اس کے سوا کچھ نہیں ہے، جو وہ اپنے اوپر مشقت برداشت کرکے دیتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے

اَلِیۡمٌ ○ (التوبۃ: ۷۹) — ...والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِيۡعُوۡا وَاَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓٮِٕكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ○ اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا يُّضٰعِفۡهُ لَـكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ○ (التغابن: ۱۶، ۱۷)

پس اپنے امکان بھر اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، سنو، اور اطاعت کرو، اور راہ خدا میں خرچ کرو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے ——— اور جو شخص تنگ دلی سے بچا لیا گیا، تو ایسے ہی لوگ فلاح یاب ہیں۔ اگر تم خدا کو (کشادہ دلی اور اخلاص سے) قرض حسن دوگے تو وہ اس کو تمہارے لیے بڑھاتا چلا جائے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بڑا ہی قدر شناس اور بردبار ہے۔

مومن اپنی گنجائش کے مطابق خدا کی راہ میں جو بھی خرچ کرتا ہے پوری آمادگی، رغبت اور کشادہ دلی سے خرچ کرتا ہے، اور اگر وہ خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لیے کچھ نہیں پاتا تو اس کا دل روتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک منافق اگر کچھ راہِ خدا میں دیتا بھی ہے تو تنگ دلی اور کراہیت کے ساتھ (وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَھُمْ کٰرِھُوْنَ "اور راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو بادلِ ناخواستہ خرچ کرتے ہیں" ان کے ہاتھوں سے اگر کسی غریب کو کچھ پہنچتا ہے تو وہ دل کی چاہت سے خدا کی خوشنودی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ وہ تو زبردستی کا تاوان سمجھتے ہوئے بڑی تنگ دلی سے دیتے ہیں (وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا "ان بدویوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو راہِ خدا میں کچھ دیتے ہیں تو اسے اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں")

مومن کا امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں کشادہ دلی، سخاوت اور انتہائی شوق و رغبت کے ساتھ خرچ کرتا ہے۔ بخل اور تنگ دلی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اسی لیے فرمایا گیا۔ فلاح و کامرانی ان لوگوں کا حصہ ہے جو بخل اور تنگ دلی سے بچا لیے گئے۔

۸۔ حلال کمائی خرچ کرنا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ (البقرۃ: ۲۶۷)

ایمان والو! خدا کی راہ میں اپنی پاک کمائی خرچ کرو۔

زکوٰۃ اور صدقہ فی الواقع وہی ہے جو حلال اور پاک کمائی میں سے دیا گیا ہو، حرام مال میں سے دیا ہوا صدقہ

نہ تو صدقہ ہے اور نہ اس سے باقی ماندہ حرام مال پاک اور حلال ہو سکتا ہے۔ خدا کے رسول ﷺ نے فرمایا اللہ پاک ہے اور وہ صرف وہی صدقہ قبول فرماتا ہے جو پاک مال سے دیا گیا ہو۔ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا[1]

۹۔ بہترین مال خرچ کرنا وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْہُ تُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرہ ۲۶۷) اور ایسا نہ ہو کہ (خدا کی راہ میں) دینے کے لیے بُری سے بری چیز چھانٹنے لگو۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ (آل عمران ۹۲) تم ہرگز نیکی کو نہ پہنچ سکو گے جب تک وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جو تمہیں عزیز ہیں

مومن اپنی ابدی زندگی کے سکون و عیش کے لیے اپنی کمائی کا وہی حصہ محفوظ رکھتا ہے جو وہ خدا کی راہ میں خدا کی مرضی کے مطابق خرچ کرتا ہے۔ اس انداز فکر کے ہوتے وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ ختم ہونے والی زندگی کے لیے تو اپنی کمائی کا بہترین حصہ رکھے اور دائمی زندگی کے راحت و آرام کے لیے خراب سے خراب چھانٹے۔ مال کو خدا کی امانت سمجھنے والا یہ کیونکر کر سکتا ہے کہ اپنے لیے بہترین منتخب کرے اور دینے والے خدا کی راہ میں برے سے برا خرچ کرے۔

ایک فکر انگیز تمثیل جو صدقہ اور زکوٰۃ ان مومنانہ جذبات اور آداب سے خالی ہو اس پر اجر و انعام کا کیا سوال وہ تو خدا کی نظر میں صدقہ ہی نہیں ہے ——— اس کا انجام آخر کار حسرت و ندامت اور بے نتیجہ غم کے سوا کچھ نہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے ایک انتہائی فکر انگیز اور عبرت خیز تمثیل میں واضح فرمایا ہے۔

اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْھٰرُ لَہٗ فِیْھَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَہُ الْکِبَرُ وَلَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَھَآ اِعْصَارٌ فِیْہِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا ایک ہرا بھرا باغ ہو نہروں سے سیراب کھجوروں، انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا، اور وہ عین اس وقت ایک تیز گرم بگولے کی زد میں آکر جھلس جائے جبکہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کم سن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی باتیں تمہارے سامنے کھول کھول کر بیان کرتا ہے

[1] مسلم، کتاب الزکوٰۃ

تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (البقرہ: ۲۶۶) — تاکہ تم غور و فکر سے کام لو۔

آدمی جوانی بھر محنت و مشقت کرکے کماتا اور جمع کرتا ہے کہ وہ بڑھاپے میں اس وقت اس سے فائدہ اٹھائے جب کمانے کی قوتیں جواب دے چکی ہوں — لیکن غور کیجیے اس بوڑھے کی بے بسی پر جس نے جوانی میں ایک باغ لگایا اور جوانی بھر اس کی خدمت میں اس توقع پر لگا رہا کہ وہ بڑھاپے کی زندگی میں اس سے لطف اٹھائے گا لیکن بڑھاپے میں قدم رکھتے ہی اسے معلوم ہوا کہ جوانی بھر جس باغ کی خدمت میں وہ لگا رہا تھا وہ جل کر خاکستر ہو چکا ہے اور اب نہ تو نئے سرے سے باغ لگانے ہی کی سکت اور موقع ہے اور نہ ننھے بچے ہی اس لائق ہیں کہ بوڑھے باپ کی کچھ مدد کرسکیں۔ ٹھیک یہی کیفیت اس شخص کی ہوگی جس نے دنیا کی زندگی میں صدقات و خیرات اور نیکیوں کا باغ لگایا اور ساری عمر اس کی خدمت میں لگا رہا کہ آخرت کی زندگی میں وہ اس کے شیریں پھلوں سے لطف اندوز ہوگا لیکن وہاں پہنچتے ہی اسے معلوم ہوا کہ اس کا باغ بدنیتی اور دنیا پرستی کے جذبات سے جل کر تباہ ہو چکا ہے، نہ اب نئے سرے سے باغ لگانے کا موقع ہے اور نہ کہیں اور سے مدد ملنے کی کوئی توقع ہے۔ اندازہ تو کیجیے ایسے شخص کی حسرت اور مجبوری و بے کسی کا۔

زکوٰۃ کے مصارف

زکوٰۃ کی حقیقی روح، بنیادی مقاصد اور اہمیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن نے ان مدوں کی فہرست بھی بیان فرمائی جن میں زکوٰۃ کا مال صرف ہونا چاہیے۔ ان مصارف کے علاوہ اگر اپنی مرضی سے کوئی شخص زکوٰۃ کا مال صرف کرے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

فقیر إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ — زکوٰۃ کا مال تو صرف فقیروں کے لیے ہے

فقیر سے مراد وہ نادار ہیں جن کے پاس نہ مال و دولت ہو اور نہ کسب معاش کے لیے کوئی ذریعہ۔ اس میں بیوہ، یتیم، اپاہج، غیر معمولی مریض، غرض وہ سب لوگ شامل ہیں جو اپنی معیشت میں دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں۔

مسکین وَالْمَسَاكِينِ — مسکینوں کے لیے ہے۔

مسکینوں سے مراد وہ شریف غربا ہیں جو انتہائی تنگ دست اور مفلوک الحال ہوں، اپنی ضروریات کے مطابق — پانے سے عاجز ہوں، نہ تو انہیں ذرائع اور وسائل ہی مہیا ہوں اور نہ وہ اپنی خودداری سے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا چاہتے ہوں اور عام لوگ بھی اس لیے ان کی مدد نہ کر پا رہے ہوں کہ انہیں ان کی تنگی اور خستہ حالی کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا — یہ شریف غربا عام محتاجوں کے مقابلے میں زیادہ مدد کے مستحق ہیں۔

۳۔ کارکنانِ زکوٰۃ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا ۔۔۔ اور جو لوگ صدقات کے کام پر مامور ہیں ان کے لیے

کارکن سے مراد وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کا مال وصول کرنے، اس کی حفاظت کرنے، اس کا حساب کتاب رکھنے اور اس کی تقسیم وغیرہ کا نظم کرنے پر مامور ہوں۔ یہ چاہے فقیر و مسکین نہ ہوں ان کے مشاہرے بہرحال زکوٰۃ کے مال سے دیے جائیں گے۔

۴۔ مؤلفۃ القلوب وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ ۔۔۔ اور جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو ان کے لیے

اس سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جن پر مال صرف کر کے ان کی مخالفت کا جوش ٹھنڈا کیا جا سکے یا مخالفین میں سے توڑ کر ان کی حمایت حاصل کی جا سکے، یا اسلام کی طرف ان کو مائل کیا جا سکے۔ یا وہ نومسلم جن کو مال دیکر اسلام پر جمایا جا سکے۔

۵۔ غلاموں کی آزادی وَفِي الرِّقَابِ ۔۔۔ اور (یہ مال صرف کیا جاتا ہے) غلاموں کے آزاد کرانے میں

۶۔ قرض دار وَالْغَارِمِينَ ۔۔۔ قرض داروں کی مدد کرنے میں

یعنی وہ لوگ جو قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہوں خواہ برسرِ روزگار ہوں یا بے روزگار، بالکل نادار ہوں یا اپنی ضروریات کے لیے کچھ نہ کچھ رکھتے ہوں لیکن اپنی ضروریات سے بچا کر قرض ادا کرنے کی سکت نہ رکھتے ہوں ان کو زکوٰۃ کا مال دیا جا سکتا ہے۔

۷۔ خدا کی راہ میں وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ ۔۔۔ اور اللہ کی راہ میں

یعنی جہاد میں اور اس میں وہ تمام کوششیں بھی داخل ہو سکتی ہیں جو نظامِ کفر و طاغوت کو مٹا کر دینِ حق کو عملاً قائم اور غالب کرنے کے لیے کی جا رہی ہوں۔ اس جد و جہد میں خدا کے جو سپاہی لگے ہوئے ہوں، ان کی ضروریات زکوٰۃ سے پوری کی جا سکتی ہیں۔

۸۔ مسافر نوازی میں وَابْنِ السَّبِيلِ ۔۔۔ اور مسافر نوازی میں

یعنی جو لوگ سفر کی حالت میں ہوں اور کسی وجہ سے مدد کے محتاج ہو گئے ہوں خواہ وہ گھر کی زندگی میں دولت مند ہی کیوں نہ ہوں ایسے لوگوں کی مدد زکوٰۃ سے کی جا سکتی ہے۔

توضیح: فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (التوبہ: ۶۰) یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔

یعنی یہ مصارف خدا کے مقرر کردہ ہیں اس لیے فرضِ زکوٰۃ ادا کرنے والے نہ ان میں کمی بیشی کے مجاز ہیں اور نہ ان سے صرفِ نظر کر کے کچھ دوسرے مصارف کا انتخاب کرنے میں آزاد ہیں۔ رہے نفل صدقات تو ان میں آدمی حسبِ ضرورت اور مصلحت جس مد میں چاہے صرف کر سکتا ہے۔

تقریظ و انتقاد

جگر کی غزلیہ شاعری

(سید احمد قادری)

ڈائرکٹر مجلس ادب و ثقافت۔ بدرباغ علی گڈھ نے جناب اشفاق علی خاں صاحب ایڈوکیٹ شاہجہاں پور کی کتاب جگر کی غزلیہ شاعری شائع کی ہے۔ صفحات تین سو سے زیادہ۔ مجلد، رنگین گرد پوش اور قیمت ساڑھے تین روپیہ ہے۔

راقم الحروف نے یہ کتاب بڑی دل چسپی سے پڑھی اور جب اظہار خیال کرنے بیٹھا تو یہ تنقید و تبصرہ کی حدود سے تجاوز کر گیا اس لیے اسے ایک مقالے کی شکل میں شائع کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ ناشر اور مصنف دونوں ہی ٹھنڈے دل سے اسے پڑھیں گے اور اس پر غور کریں گے۔

اس کتاب پر سرسری نظر ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ یہ بڑی محنت سے لکھی گئی ہے۔ کلام جگر کا اتنی چھان بین شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔ اس کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف ایہام سے کام نہیں لیا گیا ہے، جو کچھ لکھا گیا ہے وضاحت اور صفائی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ایک عرصے کے بعد تنقید پر ایسی کتاب پڑھنے کو ملی جس کے انداز تحریر اور مباحث میں اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ نتیجہ ہے فاضل مصنف کی عربی اور فارسی سے واقفیت کا۔ اردو زبان کی شاعری پر انگریزی یا مغربی اصول نقد و نظر اصطلاحات اور اسلوب تحریر میں تنقید کرنا ایک فیشن بن گیا ہے۔ خوشی ہوئی کہ یہ کتاب اس بیرونی فیشن سے پاک ہے۔

فاضل ناقد کی یہ محنت و وضاحت فکر انگیز اور قابل قدر ہے لیکن اس کتاب کا نام جگر کی غزلیہ شاعری نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان و بیان کے جو اصول و قواعد خود وضع کیے ہیں اس کے لحاظ سے صرف غزلیہ شاعری ہی نہیں بلکہ محدود وہ۔ اردو زبان ہی قلم زد کر دی گئی ہے اور اب فاضل ناقد کا اصول

ابطہ کے مطابق ایک نئی اردو زبان بنی چاہیے۔ فاضل ناقد کے بیچھتر فی صدی اعتراضات کا ہدف صرف جگر کی شاعری نہیں بلکہ میر و میرزا سے لے کر اس وقت تک کی تمام غزلیہ شاعری ہے اور صرف شاعری ہی کیوں، خود اردو زبان ان کا نشانہ ہے۔ سامنے کی کتاب کا نام تو کچھ اور رکھنا چاہیے تھا۔ ہاں غلطیوں کی مثالیں وہ صرف جگر کے کلام سے پیش کرتے۔ یہ اس کتاب کی ایک معقول ترتیب ہوتی۔ معلوم نہیں فاضل مصنف نے اس کے خلاف کیوں کیا۔ پوری کتاب پر اظہار خیال ایک لمبا کام ہے اس کے لیے تنقید و تبصرہ کے صفحات کافی نہیں۔ ہم یہاں صرف چند چیزوں پر اظہار خیال کریں گے۔

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ الفاظ و تراکیب وغیرہ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کس چیز سے کیا جائے گا اساتذہ کے کلام سے یا ابت بعد کو مرتب کیے ہوئے قواعد زبان سے؟ یا فاضل مصنف کے بنائے ہوئے قواعد ضوابط سے؟ جہاں تک ہم جانتے ہیں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صحیح و غلط کے فیصلے میں اساتذہ کے کلام کو سند اور معیار کی حیثیت حاصل ہے لیکن فاضل ناقد کا خیال یہ ہے کہ محاورات میں تو بے شک ان کے کلام کو سند کی حیثیت حاصل ہوگی مگر ان کے علاوہ اور معاملوں میں قواعد کو اولیت حاصل ہوگی اور اساتذہ کے استعمال کی حیثیت ثانوی ہوگی۔ قاعدہ صحیح سمجھا جائے گا اور اگر استعمال اس کے خلاف ہے تو استعمال غلط جائے گا۔ اب سوال پیدا ہو رہا تھا کہ زبان کے قواعد آخر کس بنیاد پر بنائے جائیں گے اور ان کے صحت و سقم کا معیار کیا ہوگا؟ اس کا جواب مصنف نے یہ دیا ہے کہ قاعدوں کے صحیح و غلط ہونے کا معیار عقل ہے یہ جس قاعدے کو صحیح سمجھے وہ صحیح اور جس کو غلط سمجھے وہ غلط۔ فاضل مصنف کے اس نظریے کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو اردو زبان کے تار و پود بکھر جائیں یا دوسرے سے یہ کوئی زبان ہی باقی نہ رہے۔ ہر شخص یا خاندان کی ایک علیحدہ زبان وجود میں آ جائے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جس قاعدے کو مصنف کی عقل صحیح تسلیم کرتی ہے ضروری نہیں کہ دوسرے کی عقل بھی اسے صحیح تسلیم کرے اس لیے جس کی عقل میں جو قاعدہ صحیح ہوگا اسی کے مطابق وہ لفظ، ترکیب اور دوسری چیزیں استعمال کرنا شروع کر دے گا اور زبان چوں چوں کا مربہ بن کر رہ جائے گی۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں بکثرت یہ طریقہ استعمال کیا ہے کہ ایک قاعدہ خود وضع کیا اور پھر اس خود ساختہ قاعدے پر جگر کے کلام کی تنقید شروع کر دی۔ بلا شبہ یہ ایک بے مثال اصول تنقید ہے اور اگر دو چار ناقدوں نے یہ اصول پسند کر لیا تو پھر اساتذہ کی کسی کا کلام و منثور کتابی کی خیر نہیں ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے "الفاظ کا غلط تغیر" کے عنوان سے کئی صفحوں میں ایک قاعدہ تصنیف فرمایا ہے اور پھر جگر کے اشعار پر تنقید شروع کر دی ہے۔

جگر کا ایک شعر ہے

ہائے ری وہ عتاب میں ان کی ادائے اعتدال ... آنکھیں بھی سرخ سرخ سی چہرہ بھی لال لال سا

اس شعر پر ناقد نے یہ تنقید کی ہے کہ دوسرے مصرعے میں "سرخ سرخ اور لال لال" کا استعمال صحیح نہیں، اس لیے کہ انھوں نے جو قاعدہ تصنیف کیا ہے اس کی ایک شق یہ ہے کہ دو چیزوں کے لیے اگر ایک ہی بات بیان کرنی ہو تو اسے ایک ہی لفظ میں بیان کرنا چاہیے۔ یہاں آنکھوں اور چہرے کے لیے صرف یہ بیان کرنا ہے کہ ان کا رنگ سرخ ہے اس لیے شعر میں یا تو صرف سرخ سرخ ہوتا یا صرف لال لال۔ ایک کے لیے سرخ اور دوسرے کے لیے لال کا استعمال غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فاضل ناقد کے اس قاعدے اور اس تنقید کو پڑھ کر ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوتا ہے۔

مصنف یہ بھی نہیں سوچتے کہ جو قواعد انھوں نے آج اس کتاب میں وضع کیے ہیں، جگر یا کسی شاعر کا کلام اس کے مطابق کس طرح ہو سکتا تھا۔ وہ نئے نئے قاعدے وضع کرتے ہیں، نئے نئے مشورے دیتے ہیں اور پھر ان نئے قاعدوں اور نئے مشوروں کے مطابق جگر کے کلام کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں یعنی زمانۂ حال کے قاعدوں اور مشوروں کے مطابق زمانۂ ماضی کا کلام ہونا چاہیے تھا۔ حیرت ہے کہ اس قدر غیر معقول اصول تنقید کو انھوں نے معقول کس طرح سمجھ لیا۔ قاعدے وضع کرنے اور ان کے مطابق ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جگر کے اشعار کی تغلیط میں جو محنت انھوں نے صرف کی ہے وہ شاید ہی کسی شاعر یا ادیب کو اپیل کرے۔ مصنف کے قاعدے دھرے رہ جائیں گے اور زبان کا قافلہ اہلِ زبان اساتذہ کے بنائے ہوئے رستے پر چلتا رہے گا۔

ایک اور ضابطہ مصنف نے یہ بنایا ہے کہ عربی و فارسی کے وہ الفاظ جن کو شکل یا معنی کی ترمیم سے اردو میں استعمال کیا جاتا ہے ان پر ہندی کے ترکیبی قاعدوں کا نفاذ ہوگا ان پر فارسی کے قاعدے جاری نہیں ہوں گے۔ اس ضابطے نے سیکڑوں الفاظ کی فارسی ترکیب کو غلط قرار دے دیا۔ مثال کے طور پر لفظ قسمت کی قسمت کا ستارہ بھی گردش میں آگیا۔ اب اس لفظ کو فارسی ترکیب کے ساتھ استعمال کرنا غلط ہو گیا۔

عشق کی قسمتِ محرم الٰہی توبہ ... یا یہاں ناں بھی فراموش ہوئی جاتی ہے

اس پر یہ گل افشانی کی گئی ہے کہ "قسمت کے معنی عربی فارسی میں تقسیم کے ہیں۔ تقدیر کے معنی میں یہ مولّد ہے اس لیے فارسی قاعدے سے اس کی ترکیب غلط ہے۔" ملاحظہ کیجیے اب اساتذہ کے وہ سیکڑوں اشعار غلط ہو گئے جن میں فارسی ترکیب کے ساتھ یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مصنف کے نزدیک تو اپنے ضابطوں کے مقابلے میں

اساتذہ کی سند کا اعتبار نہیں لیکن میں دوسروں کے لیے دو ایک شعر یہاں نقل کرتا ہوں۔

داغ دہلوی کا شعر ہے ۔

کیجیے اے قسمتِ برگشتہ تلاش دشمن — دوست کو ڈھونڈتے ہیں ہم تو عدو ملتا ہے

داغ ہی کا ایک شعر اور ہے

نشاں مٹا تو مثالِ بے پستیِ قسمت — کہ نام بھی نہ ہمارا کبھی بلند ہوا

سیماب اکبرآبادی کہتے ہیں

ضبط سے ناآشنا ہم صبر سے بیگانہ ہم — انجمن میں ہیں شریکِ قسمتِ پروانہ ہم

ان اشعار سے معلوم ہوا کہ مصنف کا یہ ضابطہ بھی ان کی ایجاد ہے اور اساتذۂ زبان اس سے واقف نہیں ہیں۔ دوسری بات اس سلسلے میں یہ عرض کرنی ہے کہ لفظ قسمت کے بارے میں انھوں نے جو بات لکھی ہے وہ بہت سرسری اور تحقیق سے دور ہے۔ عربی اور فارسی میں قسمت کے معنی صرف تقسیم کے نہیں آتے۔ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں عربی لغات کے حوالوں سے اس لفظ پر پوری بحث کرتا لیکن اتنی بات تو فاضل ناقد کو المنجد سے بھی معلوم ہو سکتی تھی کہ قسمت کے معنی حصہ اور نصیب کے بھی آتے ہیں۔ القسمۃ: النصیب (المنجد) اور اسی معنی کے لحاظ سے اردو میں یہ لفظ تقدیر کے معنی میں مستعمل ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ خود لفظ تقدیر عربی زبان میں ٹھیک اسی معنی میں نہیں آتا جو اردو میں مستعمل ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ عربی زبان میں یہ الفاظ اپنے عام معنی میں مستعمل ہیں اور اردو میں ایک خاص معنی میں عموم و خصوص کے سوا اور کوئی فرق واقع نہیں ہے اس لیے ان الفاظ کو موردِ قرار دینا بھی محلِ نظر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی یہ بات کہ فارسی زبان میں قسمت صرف تقسیم کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے صحیح نہیں ہے۔ تقدیر نصیب قسمت اور مقدر کے جو معنی اردو میں مستعمل ہیں وہ فارسی ہی کے واسطے سے اردو میں آئے ہیں ہر لفظ کی سند پیش کرنا تو موجبِ طوالت ہے۔ میں قسمت کے لیے جامی کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

ہر کس از اقسامِ فطرت قسمتِ خود یافتند — زہد و رنداں جامۂ سالوس و جامی جام را

جب بات یہ ہے تو ان کے اپنے ایجاد کیے ہوئے ضابطے کے مطابق بھی اس لفظ کی فارسی ترکیب صحیح ہوگی

——— ناقد نے اپنے اس ضابطے کا شکار لفظ تنقید کو بھی بنایا ہے۔ جگر نے کہا ہے:

تنقید جس میں مصلحتِ خاص مضمر ہے — یہ جرم گر گناہ ہے کیے جا رہا ہوں میں

اس شعر پر اعتراض فرمایا گیا ہے۔

"نقد کے معنی تنقید عربی میں نہیں ہے اس لیے کسی لفظ کے ساتھ کسرۂ اضافت یا واو عطف یا فارسی و عربی کے کسی اور قاعدے سے اس کی ترکیب غلط ہے۔ تنہا استعمال کیا جائے تو جائز ہے لہٰذا جگر کے اس شعر میں تنقید حسن کی ترکیب غلط ہے" ۔ ص۔

یہ تو صحیح ہے کہ نقد کے معنی تنقید عربی میں نہیں ہے لیکن ایسے الفاظ کے لیے جو ضابطہ مصنف نے بنایا ہے اس کی صحت پر ان کے اپنے فیصلے کے سوا اور کیا دلیل ہے؟ اردو میں ایسے بیسیوں الفاظ فارسی ترکیب اور واوِ عطف کے ساتھ نثر و نظم میں مستعمل ہیں اور یہ استعمال خواص و عوام میں اس درجہ عام ہے کہ اب اس کو بدلنے کی سعی سعیِ لاحاصل کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔ اسی لفظ تنقید کا استعمال سیماب اکبرآبادی کے یہاں دیکھیے

سب مرے انجام پر آمادۂ تنقید ہیں   اور پھر ضامن نہیں ہوتا کوئی انجام کا

انہیں کا ایک شعر اور ہے :-

دل کی تنقید مناسب ہے نہ یوں تیور بدل   مدتوں نکھرا ہے تو آئینۂ دل دیکھ کر

تحریر و تقریر جیسے الفاظ بھی عربی معنی میں ہمارے درمیان مستعمل نہیں ہیں لیکن یہ بات ایک عجوبے بلکہ مضحکہ سے کم نہ ہوگی کہ ان کو واو عطف یا کسرۂ اضافت کے ساتھ استعمال نہ کرنے کی رائے دی جائے ۔

جگر کا ایک شعر ہے :-

مانا کہ محتسب بھی بڑا باشعور ہے   لیکن اسے نزاکتِ غم کی خبر کہاں

اس شعر کے بارے میں ارشاد ہے :-

"نازک فارسی کا لفظ ہے اس سے نزاکت کا اشتقاق عربی قاعدے سے غلط ہے، مگر نزاکت کا استعمال مفرد شکل میں کوئی کرے تو قابلِ مواخذہ نہیں، جگر نے اس کو ترکیب کے ساتھ استعمال کیا ہے جو غلط ہے" ۔ ص۔

مفرد شکل میں اس "غلط" لفظ کو استعمال کرنے کی اجازت ایڈوکیٹ صاحب نے دیدی یہ ان کی مہربانی ہے۔ یہ بات بھی وہ بتا دیتے تو بڑی عنایت ہوتی کہ یہ لفظ فارسی سے اردو میں آیا ہے یا اردو کے اہل زبان نے یہ غلط اشتقاق کیا ہے؟ اگر فارسی سے بعینہٖ منتقل ہوا ہے تو پھر ان کے اپنے ضابطے کے اعتبار سے بھی اس کی فارسی ترکیب کیوں غلط ہے؟ اور یہ بات ان کو نہیں دوسروں کو بتانے کی ہے کہ فارسی ترکیب کے ساتھ اس کا استعمال اردو زبان میں رائج ہے۔ داغ دہلوی کہتے ہیں :-

ابھی نزاکتِ رفتارِ یار باقی ہے　　　ابھی زمانۂ تا پائیدار باقی ہے۔

سیماب کا شعر ہے:-

ہو چکا ہوں بارہا مذبحِ نزاکت کا شہید　　　کر چکا ہوں امتحان قوتِ بازوئے دوست

فاضل ناقد مکتہ پر رقم طراز ہیں:-

"ہوس فارسی ہے، عربی قاعدے سے لام تعریف کا اضافہ کر کے اس سے بوالہوس بنانا لغت اور قواعد دونوں کی غلطی ہے۔ اس غلطی کی مثال میں جگر کے یہ شعر ملاحظہ ہوں:"

حسن کو سمجھا ہے کیا اے بوالہوس　　　حسن معنی بھی ہے، صورت ہی نہیں

یہ بات صحیح ہے کہ قواعد کی رو سے بوالہوس کا لفظ غلط ہے لیکن فاضل مصنف کی اصل مصیبت یہ ہے کہ وہ قواعد زبان کو منطقی کلیات کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔ تجربہ ان کو بتلائے گا کہ یہ خیال غلط ہے۔ بہت سے الفاظ خلاف قاعدہ رائج ہو جاتے ہیں اور زبان میں انہیں با قاعدہ الفاظ سے کم اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ ان مستثنیات سے زبان کو پاک کرنے کی خواہش تو کی جا سکتی ہے مگر پوری نہیں ہو سکتی۔ مستثنیٰ الفاظ کی صحت استعمال کا دار و مدار اساتذۂ زبان کا قبولِ عام ہے۔ اگر وہ عام طور سے اسے استعمال کرنے لگیں تو پھر ایسے الفاظ زبان کا جز بن جاتے ہیں۔ بوالہوس اور خواہشات جیسے الفاظ کو یہی درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ جگر اساتذۂ زبان کی پیروی کرتے تھے، فاضل ناقد کی نہیں۔ غالب کا یہ شعر ضرب المثل کی طرح رائج ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　　اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

فاضل مصنف ص ۴۰ پر لکھتے ہیں:-

"اردو میں دو حرف صلہ مستعمل ہیں۔ ایک فارسی کا "کہ" دوسرا ہندی کا "جو" مگر دونوں کو ایک حرف صلہ کے طور پر ایک ساتھ استعمال کرنا غلط ہے۔ نیز ایسا استعمال عشوا اور عجز شاعرانہ کی بھی مثال ہوتا ہے کیونکہ مفہوم جب ایک ہی سے پورا ہو جاتا ہے تو دوسرا محض وزن شعر پورا کرنے کے لیے آتا ہے اور اس لیے آتا ہے کہ شاعر اس کے سوا کسی اور اسلوب سے اپنا مفہوم ادا کرنے سے عاجز تھا۔ جگر کے ہاں اس صلاحیت کی بڑی فراوانی ہے۔"

ہائے وہ مستی اٹھی کہ جو جھیں ہے حضور　　　دل میں کتا ہے بنا آنکھوں سے ...

عشق ہے اس مقام پر کہ جہاں　　　زندگی نے شکست کھائی ہے

میں یہاں غالب کے صرف دو شعر پیش کرتا ہوں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں   جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

غالب کا پہلا شعر تو ضرب المثل کی طرح ہے اگرچہ جناب ناقد غالب کو اردو کا مجتہد شاعر کہنے کے باوجود ایک جگہ غصے میں لکھ چکے ہیں کہ غالب بیغمبر نہیں تھے۔ پھر بھی اس کی توقع نہیں کہ وہ غالب کو عاجز البیان شاعر سمجھتے ہوں گے

صفحہ ۹ پر لکھتے ہیں۔

"وہ وقت گیا جب اردو میں پورا پورا جملہ یا مصرع فارسی کا کہنا ایک صنعت سمجھا جاتا تھا اب یہ اسلوب مکروہ ترین غلطی ہے۔ اس غلطی کی مثال میں جگر کے کم سے کم یہ شعر دیکھیے"

اس کے بعد جگر کے چار شعر نقل کیے ہیں جن میں کا ایک یہ ہے۔

مقامِ عشق کی نیرنگیاں نہ پوچھ   کمالِ آگہی وسخت آگہی دشمن

سوال یہ ہے کہ وہ وقت کب گیا اور کہاں گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ جناب ناقد کے دماغ سے گم ہو گیا ہو۔ غالب و اقبال کو انھوں نے مجتہدین غزل میں شمار کیا ہے لیکن ان کی اس عبارت کی روشنی میں ان دونوں کی شاعری مضمون کے لحاظ سے چاہے جیسی کچھ ہو، زبان کے لحاظ سے مکروہ ترین شاعری قرار پائے گی۔ فاضل مصنف کی بعض عبارتیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے غصے کی آگ میں اپنے فہم و شعور کو بھی جھونک دیا ہے۔ فارسی تو فارسی، اہل علم شعراء نے اسی زمانے میں جس میں ہم سب سانس لے رہے ہیں اپنے اشعار میں عربی کے مصرعے کہے ہیں۔ میرے پاس اس وقت شعراء کے دیوان موجود نہیں ہیں۔ سیماب کا صرف ایک شعر حاضر ہے۔

سیماب مآل شوق معلوم   أم للإنسانِ ما تمنّٰی

پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ فارسی زبان کا استعمال صرف اردو نظم میں مکروہ ترین غلطی ہے یا اردو نثر میں بھی۔ فاضل مصنف نے اپنی اس کتاب میں جو اردو نثر میں ہے اس مکروہ ترین غلطی کا ارتکاب بار بار کیا ہے اور فارسی بھی ایسی کہ جس سے لوگ لغت دیکھے بغیر سمجھ بھی نہ سکیں گے۔ یہاں چند مثالیں دی جارہی ہیں۔ صفحہ ۳ پر جاتا ہے۔ "فن کی اس بحث کے نتیجے میں سرہ و ناسرہ کا فیصلہ میرا نہیں بلکہ فن کا ہے"۔ سرہ و ناسرہ کا اردو میں قطعی نامانوس فارسی فقرہ معلوم نہیں مکروہ ترین غلطی ہے یا نہیں۔ صفحہ ۱۳ پر ارشاد ہے "ان خیالات کو شعرا نا بیکا طور پر نا جانے کتنے لوگ مصنف کے اس شعر ادبی کو سمجھ لیں گے"۔ صفحہ ۱۳ پر رقم طراز ہیں "اس سے ان کے مزاج میں [illegible]

اور "پاس غلط کردۂ خود" کا رجحان ملتا ہے۔" معلوم نہیں اس فارسی محاورے کا استعمال محبوب ترین ہے یا مکروہ ترین
ص ۱۱۲ پر ہے، "اور اس لیے تمرکز معنی پر برا اثر پڑتا ہے۔" سمجھنا تو آگے رہا کتنے لوگ تمرکز کو صحیح تلفظ کے ساتھ
پڑھ لیں گے؟

یہ چند مثالیں یوں ہی بغیر کسی محنت کے سامنے آگئی ہیں۔ مصنف شاید اردو نثر میں فارسی جملوں اور محاوروں
کے استعمال کو مکروہ ترین غلطی نہیں سمجھتے یا اس کا حق انھوں نے اپنے لیے کسی عدالت سے مخصوص کرا لیا ہے۔

- فاضل مصنف نے جو اعتراضات کیے ہیں، یہ ان میں کا نمونہ از خروارے ہے ان کا تعلق تنہا جگر کی شاعری
سے نہیں ہے بلکہ پوری اردو زبان سے ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کا وہ رخ بھی دکھادوں جس کا تعلق
خاص طور پر جگر سے ہے۔ کچھ لکھنے سے پہلے دو باتیں صاف کردوں۔ ایک یہ کہ مجھے جگر مرحوم سے نہ کوئی عقیدت ہے
اور نہ میں ان سے کوئی ذاتی واقفیت رکھتا ہوں۔ پٹنے میں دو بار بس دور سے ان کی زیارت ہوئی ہے
دوسری بات یہ کہ میں نہ جگر کو بہت بڑا شاعر سمجھتا ہوں اور نہ انہیں زبان و بیان کے استاذ کا درجہ دیتا ہوں۔
میرے نزدیک وہ ایک اوسط درجے کے شاعر تھے جس کی شاعری میں ایک خاص کیف، مستی اور رجوعیت ہے
اور جس کی شاعری نے اردو غزل کو اس دور میں سنبھالا دیا ہے۔ ان کی شاعری نہ غلطیوں سے پاک ہے نہ غلطیوں
کا انبار۔ جب اعلیٰ درجے کے بڑے بڑے شعرا کا کلام غلطیوں سے بری نہیں تو جگر کا کلام کس طرح مبرا ہو سکتا تھا

کسی تنقید کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ناقد تعصب اور تحقیر و تنقیص کے جذبے سے پاک ہو۔ اگر یہ بات
واضح ہو جائے کہ لوگوں کی نگاہوں میں کسی کی وقعت کم کرنے کے لیے تنقید کے پاپڑ بیلے گئے ہیں تو پھر اس کی قیمت دو
کوڑی بھی نہیں رہتی۔ فاضل ناقد نے اس کتاب میں جگر کی وقعت کم کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کی
اس زیادتی نے مجھے یہ چند صفحات لکھنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے اردو زبان پر بھی ظلم کیا ہے اور جگر کے ساتھ بھی زیادتی
کی ہے۔ اردو زبان پر ظلم غیر شعوری طور پر ہوا ہے لیکن جگر کے ساتھ زیادتی کو غیر شعوری سمجھنا بہت مشکل ہے
میں چند زیادتیوں کی طرف یہاں اشارہ کروں گا۔

انھوں نے جگر کی شاعری پر جو ہتھوڑا چلایا ہے وہ یہ ہے:-

ان کے کلام کی سب سے نمایاں اور سب سے بڑی خصوصیت ان کی غلط گوئی ہے۔ ان کے
کلام میں غلطیوں اور کوتاہیوں کا دفتر بے پایاں ہے، غلطیوں کا جال ان کی شاعری کے ہیولا میں اس طرح
پھیلا ہوا ہے جس طرح انسان کے بدن میں شریانوں اور وریدوں کا جال۔ اگر آپ اس جال کو کاٹ دیں

تو ان کی شاعری کا بھی آپ کو ماتم کرنا ہوگا۔ "شعلہ طور" سے لے کر "آتش گل" تک عیوب کلام اور غلطی ہائے مضامین کا چمن کھلا ہوا ہے۔ علمائے فن نے اغلاط و عیوب کی جتنی قسمیں بیان کی ہیں اور جتنی ان سے رہ گئی ہیں ان دونوں کی اکثریت آپ کو جگر کے کلام میں مل جائے گی۔" صفحہ ۶-۵۹

یہ جناب ناقد کی صریح زیادتی ہے جو انھوں نے کلام جگر کے ساتھ کی ہے۔ سیاسی میدان میں تو سنا تھا کہ کوئی تنہا لیڈر اپنی بات کو پوری قوم کی بات قرار دیتا ہے۔ جناب ناقد نے یہ رسم ادبی میدان میں بھی جاری کی اس لیے کہ "علمائے فن" سے مراد صرف ان کی ذات گرامی ہے۔ اوپر میں نے جناب ناقد کے جو اعتراضات نقل کیے ہیں ان میں سے ایک اعتراض بھی ایسا نہیں ہے جس کی تائید "علمائے فن" کے کلام سے ہوتی ہو بلکہ غلطی صرف اس لیے غلطی ہے کہ جناب ناقد نے اسے غلطی قرار دیا ہے اور جو اعتراضات میں نے نقل نہیں کیے ہیں ان میں تقریباً فی صدی سے بھی زیادہ اعتراضات کا حال یہی ہے۔ "علمائے فن" کا ذکر صرف قاری کی رائے کو متاثر کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔

جناب ناقد کے تعصب کا حال یہ ہے کہ جہاں مجبور ہو کر کلام جگر کی کسی خوبی کا اعتراف کیا ہے وہاں بھی جگر سے اس کو چھیننے کی کوشش سے باز نہیں آئے ہیں۔ لکھتے ہیں

> جگر کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت جوش و سرمستی ہے اور یہی ان کے کلام کا سب سے بڑا حسن ہے جگر کے کلام کو اگر کوئی چیز زیادہ دنوں تک زندہ رکھ سکتی ہے تو وہ ان کی یہی خصوصیت ہے۔ اگر اس خصوصیت کو جگر کے کلام سے الگ کر لیا جائے تو جگر کے کلام میں کوئی جان نہیں رہتی لیکن ان کی یہ خصوصیت بھی ان کی ذاتی چیز نہیں ہے اسے داغ، اصغر اور حسرت ان تینوں کا مشترکہ پرتو سمجھنا چاہیے۔" صفحہ ۵

"لیکن" سے پہلے بھی جو کچھ لکھا ہے اس سے بے دلی مترشح ہے مگر جی نہ مانا تو لیکن کے بعد اس کو بھی ختم کر دیا۔ سب سے بڑی خصوصیت بھی داغ و اصغر و حسرت کے مشترکہ محاذ کے حوالے کر دی گئی۔ اور یہ جان لینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس مشترکہ محاذ میں حسرت سے جگر کو جو ترکہ ملا ہے وہ فسق و فجور کا ہے۔ مصنف نے صفحہ ۱۲ پر لکھا ہے۔ "فسق و فجور میں انھیں حسرت کے تغزل سے مدد ملی ہے۔" حسرت اگر زندہ ہوتے تو یہ پڑھ کر اپنا سر پیٹ لیتے جناب ناقد جگر پہ ذاتی حملے سے بھی باز نہیں آئے ہیں۔ غزلوں میں "پیارے" کا لفظ استعمال کرنے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> "معلوم نہیں اس لفظ کا استعمال وہ میر کی پیروی کے شوق میں کرتے ہیں یا ابتدائی صحبتوں کا اثر ہے۔" (صفحہ ۵)

وہ اعتراض کی دھن میں بعض اوقات یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اعتراض کس چیز پر کر رہے ہیں اور مثال میں کیا پیش کر رہے ہیں۔ اعتراض یہ ہے کہ جگر نے اسم ظرف "جہاں" کو جتنا کے موقع پر استعمال کیا ہے اور "جہاں" کے جواب میں "اتنا" کا لفظ متبوع جملے میں استعمال کیا ہے یہ بڑی فاحش غلطیاں ہیں"۔ اس غلطی کی مثال میں دو شعر پیش کیے جن میں کا پہلا یہ ہے :-

جہاں تک توڑتا جاتا ہوں رسمِ ظاہر و باطن — دلیلِ عاشقی اتنی ہی محکم ہوتی جاتی ہے

اس مثال کو غلط قرار دیا جائے یا یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جناب ناقد "جہاں" اور "جہاں تک" کے فرق سے ناواقف ہیں؟ "جہاں تک" "جس قدر" اور "جتنا" کے معنی میں اس قدر عام ہے کہ اسکول کے بچے بھی اس کو جانتے ہوں گے۔ جگر نے اس شعر میں "جہاں" کو جتنا کے معنی میں استعمال نہیں کیا ہے۔ "جہاں تک" کو کیا ہے۔ مثلاً ہم بولتے ہیں "جہاں تک مجھے معلوم ہے اس سوال کا جواب یہ ہے۔" کیا اس جملے میں "جہاں تک" ظرف زمان یا ظرف مکان کے لیے استعمال ہوا ہے؟ بات یہ ہے کہ جناب ناقد اعتراض کے جوش میں مثال پر غور نہیں کر سکے۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے جگر کی طرف غلط باتیں بھی منسوب کی ہیں۔ ص۱۲۱ پر لکھتے ہیں :-

"جگر کا ایک شعر ہے

سن کے بھی ڈگمگاتے ہیں قدم — عشق کرتا ہے جہاں درائیاں

اس میں یہ "درائیاں" کیا؟ خدا جانے یہ درانا کی گت بنی ہے یا یہ کوئی اور ہی گت ہے، درائی اور اس کی جمع درائیاں دونوں بے معنی ہیں۔"

جناب ناقد کا یہ اعتراض جب میں نے پڑھا تو ان کے بارے میں میری رائے بہت ہی متاثر ہوئی اس لیے کہ تھوڑی سی فارسی جاننے والا بھی یہ سمجھ لیتا کہ جگر نے درائیاں نہیں لکھا ہوگا دارائیاں لکھا ہوگا۔ یہ طباعت کی غلطی معلوم ہوتی ہے لیکن جب شعلہ طور کی طرف مراجعت کی تو اس میں صاف دارائیاں ہی چھپا ہوا ہے۔ میرے سامنے مکتبہ جامعہ دہلی کا چھپا ہوا نسخہ ہے۔ "باقیات الصالحات" یعنی ضمیمہ کلام دورِ حاضر کے عنوان سے جو حصہ ہے اس کے ص۲ سطر ۶ میں جس کا جی چاہے دیکھ لے کہ درائیاں چھپا ہوا ہے یا دارائیاں۔ اب کوئی بتائے کہ فاضل ناقد کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے دوسری غلط بات جو انھوں نے منسوب کی ہے وہ یہ ہے :-

"اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے کا شوق اس قدر زوروں پر ہے کہ "ہائے رے" کی بگڑی ہوئی شکل "ہارے" کے استعمال سے بھی باز نہ رہے۔" ہائے رے" میں ہی کیا کم ابتذال تھا" ہارے" نے تو غضب ہی کر دیا

ہر چند کہ تھمتے نہیں آنسو صفت شمع ـــ بارے تری محفل کا سماں دیکھ رہے ہیں

ص۲۱۱

یہ اعتراض پڑھ کر میں نے سوچا کہ جگر نے یہ کیا لفظ استعمال کر دیا ہے۔ تسلی کے لیے شعلۂ طور کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ جگر نے "ہارے" نہیں لکھا بلکہ "بارے" لکھا ہے اور بارے بالکل صاف چھپا ہوا ہے اور لطف یہ ہے کہ خود جگر نے اس لفظ پر ایک نوٹ بھی لکھا ہے کہ "یہ محاورہ اس وقت متروک نہ تھا جب شعر کہا گیا، لیکن اب متروک ہے" جگر کو اس کی کیا خبر تھی کہ کوئی علامۂ وقت ناقد اس کو ہارے بنائیں گے پھر اس کو ہائے رے کی بگڑی ہوئی شکل قرار دیں گے اور پھر اس کی ہنسی اڑائیں گے۔ بارے ایک فارسی محاورہ ہے جس کے معنی "مگر" اور "خیر" کے آتے ہیں۔ داغ نے بھی یہ محاورہ استعمال کیا ہے :-

سنتے ہیں داغ کل وہ آئے تھے ـــ بارے اب تو سلوک باہم ہے

جگر پر غصے کا عالم یہ ہے کہ ان کی تعریف کرنے والے بھی مصنف کی زد سے بچ نہیں سکے ہیں۔ جگر کے "شوقِ تکرار" کی مذمت کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"اس قسم کی تکرار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا نسبی سلسلہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نثر سے ملتا ہے ص۵۴"

ایک جگہ اور جگر کی عروضی غلطیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

جگر صاحب بھی ترنم کے دیوتا تھے، ان کی موسیقی نے ہزاروں مشاعرے جیتے، لاکھوں دلوں میں گھر کیا ان کی شاعری کی عزت کو آسمان کا ہم پلہ کر دیا مگر اس دیوتا کے پجاریوں کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ "گاہ گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش" جگر صاحب کا دامنِ کمال عروضی غلطیوں سے بھی داغدار ہے"

(ص۲۷۹)

اس عبارت میں خود مصنف کی رائے کے مطابق ایک مکروہ ترین غلطی یہ ہے کہ انھوں نے فارسی سے بھرا ہوا مصرع استعمال کر ڈالا ہے جس کا زمانہ بقول ناقد گزر چکا ہے۔ دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ مصنف نے جگر کی عروضی غلطیوں کے بارے میں محترمی عبدالودود صاحب بار ایٹ لا پٹنہ سے مراجعت فرمائیں۔

جناب ناقد کی یہ کار روائیاں دیکھ کر اور یہ عبارتیں پڑھ کر قاری کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس شاعر سے ان کا دل صاف نہیں ہے جس کے کلام پر وہ تنقید کرنے بیٹھے ہیں۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ تنقید کا محرک، شاعر کو لوگوں کی نگاہوں سے

گرانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد تنقید، تنقید باقی نہیں رہتی، صرف تنقیص اور تحقیر ہو جاتی ہے۔ جناب ناقد نے جگر کے بہت سے اشعار کو مہمل، بے کار، ناموزوں، ناتمام و ناقص قرار دیا ہے۔ اب اس کی گنجائش بالکل نہیں ہے کہ میں دو چار مثالیں بھی پیش کروں اور اس سلسلے میں انھوں نے جس ذہنیت و ذہانت کا ثبوت دیا ہے اسے واضح کروں۔ محض نمونے کے طور پر ایک مثال پیش کر رہا ہوں۔ ناقد کے نزدیک ناتمام اشعار میں سے ایک شعر یہ ہے:-

ہوا کا اس طرف ان کی نقابِ رخ الٹ دینا ادھر ایک آک لہو کی بوند کا سرشار ہو جانا

اس شعر کے بارے میں جناب ناقد تحریر فرماتے ہیں:-

"ان" کو غزل کی روایات کی رعایت سے حسن کے متعلقات "نقاب رخ" وغیرہ کی موجودگی میں محبوب کا قائم مقام تسلیم کر لیجیے مگر دوسرے مصرع کے تنہا "ادھر" سے عاشق یا متکلم ہی کیوں سمجھا جائے کیا کسی اور کے لہو کی بوند سرشار نہیں ہو سکتی۔ ص۱۴۲

پہلے تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ہاں کسی اور کے لہو کی بوند بھی سرشار ہو سکتی ہے لیکن کسی وکالت خانے میں یا کسی مجسٹریٹ کی عدالت میں، اگر جگر زندہ ہوتے تو کہتے۔ "شعر مرا بو کالت خانہ کہ برد" اس کے بعد سوال یہ ہے کہ رعایت کرکے "ان" کو کس کے محبوب کا قائم مقام تسلیم کیا جائے؟ متکلم کے محبوب کا یا کسی اور شخص کے؟ اگر پہلے مصرع میں "ان" سے مراد متکلم کا محبوب ہے تو دوسرے مصرع میں "ادھر" سے کوئی دوسرا شخص کس طرح مراد ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص متکلم کے سوا کسی اور کو مراد لیتا ہے تو دلیل اور قرینے کا سوال اس سے کیا جانا چاہیے نہ کہ متکلم سے۔ متکلم شعر میں اپنے محبوب کا واقعہ بیان کر رہا ہے یا کسی دوسرے کے محبوب کا؟ دونوں مصرعے غزل کی روایات کے مطابق ہیں، صرف پہلا مصرع نہیں۔

اس کتاب کے ناشر نے جناب ناقد کو ابوالکلام، شبلی، سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر اقبال کا نعم البدل قرار دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کتاب نے اس کا کوئی ثبوت مہیا نہیں کیا ـــــ چونکہ ناشر نے سید سلیمان ندوی کا نام بھی لیا ہے اس لیے میں اپنے تبصرے کو انہیں کی رائے پر ختم کرتا ہوں جو انھوں نے جگر کی شاعری کے بارے میں دی ہے۔

"جگر شاعر ہے مگر کیا شاعر؟ تنہا شاعر بلکہ ہمہ شاعر، ان کا یہ طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ۔ لکھنؤ اور دہلی دونوں حکومتوں سے آزاد، موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، ہر تکلف تعقل اور آورد سے پاک، طلسم الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا، موجودہ شعراء میں آنکھ

اس وصف میں اگر کوئی شریک ہے تو وہ فانی ہے۔ سادگی اور بے تکلفی حسرت کی بھی خصوصیت ہے مگر اس کی سادگی میں کشش ہے بناؤ نہیں۔ جگر کا کمال یہ ہے کہ سادگی اور تکلف کی ہر شان سے بے نیازی کے باوجود اس میں بے حد فطری آرائش اور راز خود نمائش حسن ہے۔

معنوی لحاظ سے جگر جہاں کھڑا ہے تنہا کھڑا ہے۔ سرمستی اور سرشاری، تاثر اور دل نگاری اس کے ہر مصرع کی جان ہے" شعلۂ طور ص۵ -۴

بہرحال جگر کی غزلیہ شاعری "معتقدین جگر کے لیے بھی کئی پہلوؤں سے قابل قدر ہے۔ اس پہلو سے بھی کہ جگر کے مرتبۂ شاعری کو گرانے کی اس شخص نے کوشش کی ہے جس کی ذات میں بقول ناشر کتاب ابوالکلام، شبلی، سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر اقبال سب جمع ہوگئے ہیں۔ اس پہلو سے بھی کہ اس میں جگر کے کلام کا بڑا وسیع جائزہ لیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ فاضل مصنف نے جگر کے اوزان و بحور تک شمار کر ڈالے ہیں۔ ان کی یہ محنت کلام جگر کے مطالعہ و تحقیق میں بہت قیمتی امداد بہم پہنچائے گی اور اس پہلو سے بھی کہ اس میں عمومی طور پر شعر و شاعری اور زبان کے بارے میں بہت سی کام کی باتیں آگئی ہیں جن کا مطالعہ مفید ہے اس لیے میں کلام جگر سے بالخصوص اور شعر و شاعری سے بالعموم دلچسپی رکھنے والوں سے اس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتا ہوں۔

ایک ضروری اعلان

آپ کی سہولت کے پیش نظر ہم نے مکتبہ زندگی و کانتی کی کتابوں کے ساتھ اب مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی مکتبہ رامپور، دارالمصنفین اعظم گڈھ اور ادارۂ تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ کی کتابوں کی فروخت کا بھی انتظام کرلیا۔ اب ان مکتبوں کی تمام کتابیں بھی آپ ہم سے طلب فرما سکتے ہیں۔

عام خریدار

(۱) پانچ روپیہ یا زائد کی کتابیں خریدنے اور رقم پیشگی منی آرڈر سے بھیجنے پر ڈاک خرچ معاف۔ ۱ سے کتابیں طلب کرنے کی صورت میں ڈاک خرچ معاف اور ۷۶ نفیس بذمہ خریدار

(۲) -/۱۸ کی کتابیں خریدنے اور ڈاک خرچ ادا کرنے پر رسالہ زندگی ایک سال کے لیے مفت تفہیم القرآن دوسری کتابیں خریدنے پر رعایت دی جائے گی۔

(۳) -/۱۵ کی کتابیں خریدنے اور ڈاک خرچ ادا کرنے پر ہندی ماہنامہ کانتی ایک سال کے لیے مفت۔

نوٹ:- اوپر کی تمام سہولتیں مکتبہ زندگی و کانتی، مکتبہ الحسنات اور مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند کی کتابوں جاسکیں گی۔

کچھ ہماری کتابوں کے نام

۱۔ وشونایک (ہندی) (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ) -/۱۰

۲۔ ایک کہانی (ہندی) (ہندی کتابوں کا مجموعہ) -/۱۰

۳۔ انسان اپنے آپ کو پہچان (ہندی) ۲۰ء

۴۔ نماز اور اس کے اذکار ۶۲ء

یہ کتابیں بھی ہم سے طلب فرمائیں

رسالہ دینیات 3/50 ۔ خطبات اول تا پنجم 2/50 ۔ اسلام کا نظام حیات 3/- ۔ تنقیحات 50 ۔ اسلام ایک نظر میں 2/37 ۔ اساس دین کی تعمیر 1/50

فریضۂ اقامت دین 75 ۔ حقیقت نفاق 1/50 ۔ اعتدال کی راہ 3/50 ۔ سود اول 3 ۔ دوم 3/- ۔ پردہ 1/5 ۔ حقوق الزوجین 1/50 ۔ اسلام اور ضبط ولادت 1/70

رسائل و مسائل حصہ اول 3/50 ۔ تفہیمات اول مجلد 1/50 ۔ تفہیمات دوم مجلد 6/50 ۔ تجدید و احیائے دین 5/50 ۔ مسلمانان ہند کا لائحۂ عمل 5/-

تفہیم القرآن جلد اول مجلد 17/- ۔ جلد دوم مجلد 15/- ۔ جلد سوم مجلد 12/-

جماعت اسلامی ہند کی درسیات کی تمام کتابیں بھی ہم سے منگائی جاسکتی ہیں

تصحیح

گزشتہ شمارے میں صفحہ ۵۰ پر ایک عبارت چھوٹ گئی ہے - اصل عبارت یہ ہے :-

"بعثت انبیاء کے مقصد پر جو گفتگو کی ہے وہ فقہاء کرام کی عبارتوں کے عین مطابق ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف بعثت انبیاء کا مقصد نہیں بلکہ"

(ادارہ)